کائناتِ نجم

جلد

اوّل

شاعرِ اہلبیتؑ

بہ

علّامہ نجم آفندی

(حیات، شخصیت، فن، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام)

تحقیق و تدوین اور تنقید

بہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

Kaenat-E-Najam

VoL-I

Shair-e-Ehlebait

Allama Najam Afandi

by

Dr. Syed Taghi Abedi

SHAHID PUBLICATIONS
2253 DARYA GANJ NEW DELHI-110002

کائناتِ نجمؔ

جلد اوّل

شاعرِ اہلبیتؑ

علاّمہ نجمؔ آفندی

(حیات، شخصیت، فن، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام)

تحقیق و تدوین اور تنقید

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

جملہ حقوق بحق مرتّب محفوظ

کتاب	:	**کائناتِ نجم (جلد دوم)**
تحقیق وتدوین اور تنقید	:	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
سنہ اشاعت	:	2006ء
تعداد	:	1000
کمپوزنگ	:	افراح کمپیوٹر سنٹر نئی دہلی۔25
ایڈیشن	:	اوّل
ناشر	:	شاہد پبلی کیشنز، 2253 دریا گنج، نئی دہلی۔110002
باہتمام	:	**ڈاکٹر شاہد حسین**، نئی دہلی

ملنے کے پتے

فہرست

جلد اوّل

باب اوّل

			صفحہ نمبر
1.	رَو میں ہے رخشِ عمر		13
2.	انتساب		15
3.	مقدمہ ''کس کس سے سوال کروں؟''	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	17
4.	نجم آفندی کا زندگی نامہ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	21
5.	مکتوب بنام سیّد تقی عابدی	جناب سیّد باقر زیدی	41
6.	خودنوشت سوانح حیات	علامہ نجم آفندی	43
7.	جب آتش جوان تھا	علامہ نجم آفندی	54
8.	ڈائری کے چند اوراق کا عکس	علامہ نجم آفندی	59
9.	جناب سلطان جمیل نسیم کے نام خط کا عکس	علامہ نجم آفندی	61
10.	نجم آفندی کے نام جوشؔ ملیح آبادی کے خط کا عکس		63
11.	غزلیں بخطِ نجم آفندی	علامہ نجم آفندی	64
12.	نجم آفندی تصویروں میں		68
13.	نجم آفندی مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں		69
14.	تعداد کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ		109
15.	تصانیف نجم کے عکس		111

باب دوم

حیات، شخصیت، فنِ شاعری

			صفحہ نمبر
1.	نجم آفندی (نایاب تحریر)	سیّد العلماء مولانا علی نقی نقوی	125
2.	نجم آفندی۔ ایک مطالعہ	جناب ضیاء الحسن موسوی	131
3.	نجم آفندی کا اسلوب شاعری	جناب راحت حسین ناصری	142
4.	شاعرِ اہلِ بیتؑ اور ان کے پیغامات	ڈاکٹر سیّد علی مومن	151
5.	علامہ نجم آفندی کی نثر نگاری	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	183
6.	نجم آفندی کی ہندی شاعری	امیر امام حُر	189
7.	شاعرِ اہلِ بیتؑ علامہ نجم آفندی	سیّد باقر حسن زیدی	195
8.	نجم آفندی کا تابندہ کلام	ڈاکٹر شیخ انصار حسین	203
9.	نجم آفندی کی عزائیہ شاعری	ڈاکٹر نظیر حنین زیدی	209
10.	نجم آفندی اپنے خطوط کے آئینے میں	شمشاد حسین رضوی	213
11.	نجم آفندی اور پاکستان	سیّد ہاشم رضا	224
12.	نجم آفندی پاکستان میں	علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی	229
13.	شاعرِ اہلِ بیتؑ حضرت نجم آفندی	جناب کسر نفسی منہاس	241
14.	علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن	ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر	246
15.	نجم درخشندہ	جناب واصف عابدی، سہارنپوری	263
16.	نجم آفندی کی شخصیت	جناب سیّد معز الدین قادری ملتانی	266
17.	تعارف نجم آفندی	جناب قدر عریضی	284

باب سوم

			صفحہ نمبر
1.	منتخب اشعار	(1130) عدد	293
2.	نجم آفندی کے مقطعوں کا گلدستہ	(430) عدد	364

باب چہارم

1.	غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	399
2.	آسمانِ شعر و ادب کے نجم	جناب اختر انصاری اکبر آبادی	417
3.	نجم آفندی کی غزل گوئی	ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی	422
4.	نجم کی غزلیں	محترمہ ثمین فاطمہ	435
5.	منتخب اشعار غزلیات	(268) عدد	439
6.	فہرست غزلیات	(195) عدد	459
7.	مطبوعہ غزلیات	1 الیٰ 49 (49) غزلیات	469
8.	غیر مطبوعہ غزلیات	50 الیٰ 195 (145) غزلیات	498

باب پنجم

رباعیات (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) (591)عدد

			صفحہ نمبر
.1	حمدیہ رباعیات	(2) عدد	568
.2	نعتیہ رباعیات	(31) عدد	569
.3	منقبتی رباعیات	(99) عدد	574
.4	قرآنی رباعیات	(2) عدد	587
.5	غدیری رباعیات	(9) عدد	588
.6	ولائی رباعیات	(26)عدد	590
.7	عزائی رباعیات	(7)عدد	594
.8	رباعیات مباہلہ	(3) عدد	596
.9	عشقیہ رباعیات	(10) عدد	597
.10	فکری رباعیات	(89) عدد	599
.11	قومی رباعیات	(93) عدد	611
.12	اخلاقی رباعیات	(72)عدد	623
.13	سماجی رباعیات	(28)عدد	633
.14	رباعیات واعظ	(12)عدد	637
.15	متفرق رباعیات	(26) عدد	639
.16	رباعیات شاعر	(29) عدد	643
.17	ذاتی رباعیات	(49) عدد	647
.18	فارسی رباعیات	(4) عدد	654

باب ششم

قطعات (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) (498)عدد

			صفحہ نمبر
.1	حمدیہ قطعہ	(1)عدد	658
.2	نعتیہ قطعات	(3) عدد	659
.3	منقبتی قطعات	(103)عدد	660
.4	اخلاقی قطعات	(25)عدد	674
.5	قومی قطعات	(71)عدد	678
.6	قطعات واعظ	(11)عدد	688
.7	ذاتی قطعات	(33) عدد	690
.8	قرآنی قطعات	(3) عدد	695
.9	عزائی قطعات	(7) عدد	696
.10	فکری قطعات	(26) عدد	698
.11	قطعات شاعر	(8) عدد	702
.12	ولائی قطعات	(12)عدد	704
.13	سماجی قطعات	(146)عدد	706
.14	غدیری قطعات	(7) عدد	725
.15	تصوفی قطعات	(2) عدد	726
.16	فارسی قطعات	(2) عدد	727
.17	متفرق قطعات	(40)عدد	728

باب ہفتم

			صفحہ نمبر
1.	حجم آفندی کی نعت نگاری	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	737
2.	نعتوں کی فہرست		751
1.	انسان کے خاکی پیکر میں اب شافعِ محشر آتے ہیں		752
2.	اے وہ کہ تیرے نور کو عنواں بنا دیا		753
3.	دردِ دل کیا کہیں رستہ میں پڑا ملتا ہے		755
4.	محمدؐ پر خدا کی شانِ وحدت ناز کرتی ہے		757
5.	چمکا جو عرب دیس کی قسمت کا ستارا		759
6.	گروہِ انبیاؑ کے سیّد و سردار کیا کہنا		762
7.	جان ہے تیری امانت دل برائے مصطفےٰؐ		763
8.	کلمہ گو کیوں کر نہ ہوں شیدائے آلِ مصطفےٰؐ		764
9.	محمدؐ کائناتِ دو جہاں میں کار فرما ہے		765
10.	کیا نعت میں لے نغمے کی بڑھی سرکار عالم دوصلی علیٰ		767
11.	نمازِ دردِ دل پڑھنی ہے پیغمبرؐ کی مدحت سے		769
12.	حرا کا غار ہے فانوس کس شمعِ حقیت کا		771
13.	محمدؐ کی حقیقت دونوں عالم کی رگِ جاں ہے		773
14.	تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوش نما ستارے		775
15.	اے نورِ چراغ آفرینش اے روحِ نفاخ آفرینش		778
16.	کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں		779

باب ہشتم

1.	حجم آفندی کی منقبت	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	783
2.	منتخب اشعار		801
3.	قصائد اور منقبتیں	(81) عدد	809

جلد دوم

باب اوّل

			صفحہ نمبر
1.	عجم کے سلاموں کی آفاقی قدریں	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	953
2.	منتخب اشعار سلام	(220) عدد	973
3.	سلام (مطبوعہ و غیر مطبوعہ)	(107) عدد	989

باب دوم

1.	فتح مبین کا اجمالی خاکہ	ڈاکٹر مقام حسین جعفری	1089
2.	فتح مبین (مرثیہ)	ع: جب لے لیا حسینؑ نے میدان کربلا (64) بند	1101
3.	مقدمہ مرثیہ معراج فکر	پروفیسر سیّد احتشام حسین	1125
4.	معراج فکر (مرثیہ)	ع: صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ (73) بند	1133
5.	مرثیہ غیر مطبوعہ	ع: دنیا کی ہر روش کا ہے انجام انقلاب (72) بند	1161

باب سوم

			صفحہ نمبر
1.	انقلابی نوحوں کا پروردگار	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	1193
2.	عجم کے نوحوں کا تجزیہ	پروین شاکر	1202
3.	عجم آفندی کے نوحے	پروفیسر محمد کمال الدین ہمدانی	1211
4.	جدید نوحہ کا موجد	جناب افضال حسین نقوی	1227
5.	منتخب اشعار	(133) عدد	1239
6.	نوحے (مطبوعہ وغیر مطبوعہ)	(144) عدد	

باب چہارم

1.	تاثرات زیارات (زیارتی سفر)	عجم آفندی	1427
1.	عرض داشت	(9) اشعار	1433
2.	بصرہ سے نجف تک	(15) اشعار	1434
3.	در نجف پر	(11) اشعار	1435
4.	خلوص فکر	(19) اشعار	1436
5.	حضوری میں	(11) اشعار	1438
6.	بارگاہ کج کلاہ قمر بنی ہاشم میں	(11) اشعار	1439
7.	بارگاہ نیرین	(6) اشعار	1440
8.	جلوہ گاہ سامرہ	(5) اشعار	1441
9.	سرداب میں ایک سجدۂ فکریہ	(9) اشعار	1442
10.	متفرق قطعات (15) عدد	(30) اشعار	1443

باب پنجم

			صفحہ نمبر
1.	تجم آفندی کا ہندی کلام	(18)عدد	1449
1.	کربل نگری	(145) اشعار	1451
2.	اسلام پوتھی	(158) اشعار	1456
3.	جگت گرو	(9) اشعار	1463
4.	کھیون ہارا	(12) اشعار	1464
5.	دکھ کا ساگر	(11) اشعار	1465
6.	پریم پنتھی	(11) اشعار	1466
7.	دھرم پربت	(14)اشعار	1467
8.	حسینی سیوا	(11)اشعار	1468
9.	پریم کہانی	(11)اشعار	1469
10.	ست کی سیوا	(16)اشعار	1470
11.	ست جگ کا ستارہ	(26) اشعار	1471
12.	درشن کا اجالا	(12) اشعار	1473
13.	قیدی کا راگ	(6) اشعار	1474
14.	کوچ کا ڈنکا باجت ہے	(7) اشعار	1475
15.	آؤ سہیلی جیل چلیں	(8) اشعار	1476
16.	پنتھ نارا کے دن	(7) اشعار	1477
17.	حسینی درشن	(12)اشعار	1478
18.	پردیسی	(12)اشعار	1479

باب ششم

			صفحہ نمبر
1.	سرمایہ داری کے خلاف پہلی آواز	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	1481
2.	منتخب اشعار	(45) عدد	1493
3.	متفرق نظمیں اور غزلیں (مطبوعہ و غیر مطبوعہ)	(83) عدد	1497

باب ہفتم

1.	نثری شہ پارے	نجم آفندی	1583
	1. لغات المذہب (لغت)		1585
	2. حسین اور ہندوستان کا سمبندھ (تحقیقی تحریر)		1637
	3. شہیدوں کی باتیں (اقوال اور مکالمے)		1649
	4. ترقی کی برکتیں (اقتباسات)		1685
	5. نفس اللہ (زندگی نامہ علی ابن ابی طالبؑ)		1697
	6. چور ماموں (افسانہ)		1717
	7. بندۂ خدا (مذہبی ناول) (اقتباس)		1739

کتابیات ——— 1741

رَو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	**سیّد تقی حسن عابدی**
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلّص	:	تقی
والد کا نام	:	سیّد سبط نبی عابدی منصف (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ) ایف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ) ایف آر سی پی (کنیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری اور ادبی تحقیق
شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کنیڈا
شریک حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا اور مرتضیٰ)
تصانیف	:	شہید (1982ء) جوشِ مودّت۔ گلشن رویا۔ اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء۔ رموز شاعری۔ اظہار حق۔ مجتہد نظم مرزا دبیرؔ۔ طالع مہر۔ سلکِ سلام دبیرؔ۔ تجزیہ یادگار انیسؔ۔ ابواب المصائب۔ ذکر دُر باران۔ عروسِ سخن۔ مصحفِ فارسی دبیرؔ۔ مثنویاتِ دبیرؔ۔ کائناتِ جمؔ۔
زیر تالیف	:	تجزیہ شکوہ جواب شکوہ۔ رباعیات دبیرؔ۔ فانی شناسی۔ مصحفِ تاریخ گوئی۔ روپؔ کنوار کماری۔ تعشق لکھنوی۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

دردِ دل

کس کس سے سوال کروں ؟

علاّمہ نجم آفندی نے کہا تھا :

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

① اردو کے مشاہیر شعرائے غزل نے نجم کی قدر دانی کیوں نہ کی؟
(195) عمدہ اور اعلیٰ ترین غزلوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟
کیا 1955ء کا آل انڈیا مشاعرہ یاد نہیں جس میں نجم نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا؟

② اردو کے ترقی پسند تحریک کے نمائندوں نے کیوں نجم کو نظر انداز کیا؟ اردو ادب میں کسان، مزدور، مزدوری اور سرمایہ داروں کے خلاف نظموں میں پہلی آواز علاّمہ اقبال اور جوش سے قبل نجم کے سوا کس نے بلند کی؟ اگر بقول سلیمان ندوی، حسرت موہانی اسلامی اور سوشلسٹ رجحان رکھ کر بیسویں صدی کے ابوذر غفاری ہو سکتے ہیں اور تحریک کے بھی پسندیدہ شاعر رہ سکتے ہیں تو نجم کی مسلمانی کیوں برداشت نہ ہوئی ؟

③ نعت کے پرستاروں نے صدہا نعتیہ آبدار اشعار اور سولہ سے زیادہ نعتوں کو کیوں طاقِ نسیاں کے سپرد کیا؟
کیا نجم کے اس شعر میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

④ کیوں افسانہ نویسوں نے عمدہ افسانہ ''چور ماموں'' نہیں پڑھا؟ کیوں ناول نگاروں نے تخلیقی شاہکار ناول ''بندۂ خدا'' کو فراموش کیا؟

شریک حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

⑤ اردو میں کتنے شاعر ہیں جنھوں نے نجم کی طرح چھ سو سے زیادہ عمدہ رباعیاں لکھیں؟ کیوں اردو رباعیات لکھنؤ کے پی ایچ ڈی (Ph.d) کے مقالے میں نجم کا نام تک نہیں؟ جبکہ پانچ اور دس رباعی کہنے والے افراد کا ذکر آب وتاب کے ساتھ ہے۔ کیا اس قسم کے مقالوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

⑥ شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب دے کر محبانِ اہلِ بیتؑ کیوں نجم سے غافل ہوگئے؟ مولویوں، خطیبوں نے منبر سے کیوں ان کا پیغام نہیں پہنچایا؟ سلاموں، نوحوں، مرثیوں کو لے کر دوسرے انقادی کلام کو کیوں تلف کردیا؟ کراچی میں اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں کیوں صرف بیس (20) پچیس (25) افراد شریک ہوئے؟

⑦ کیوں نجم کے کلام کو محبانِ اہلِ بیتؑ، گروہانِ نوحہ خوان، پرستارانِ نجم، شاگردانِ رشید، عزیزو اقربا نے انتقال کے تیس (30) برسوں میں بھی شائع نہیں کیا؟ اگرچہ نجم نے کہا تھا:

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

⑧ اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس بیسویں صدی کے عظیم شاعر سے کیوں غفلت برتی؟ نجم کے (12799) اشعار، (195) غزلیں، (591) رباعیات، (498) قطعات، (16) نعتیں، (81) قصائد، (107) سلام، (144) نوحے، (83) متفرقات کے علاوہ (3) مرثیے، (18) ہندی کلام کے آثار اور کئی نثری کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں:

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لئے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

میں نے حقیقت کو پیش کیا ہے:

نجم بہتر ہے تصنّع کی دلآویزی سے
⑨ تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

کانگریس، مسلم لیگ اور دوسرے قومی سیاسی عہدے داروں نے ایسے وطن دوست شاعر کو وطن کی محبت میں کیا دیا؟ جبکہ

ع: منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کائناتِ نجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے۔ صرف گردشِ اوراق شرط ہے۔ شاید یہ میری نجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو۔ یہ ایک خوشگوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں کائناتِ نجم کو دریافت کرسکا:

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

خیر اندیش

سیّد تقی عابدی

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علاّمہ نجمؔ آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209 بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

مطبوعاتِ نجم

مرزا اجمل حسین نجم آفندی

وِلادت 1893ء وَفات 1975ء

ہاتھ رُکتے ہی نہیں ہیں ماتمِ شبیر سے
استفادہ کر رہا ہوں موت کی تاخیر سے نجم آفندی

شاعر ہوں جن کا نجم وہ ہیں وجہِ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

حضرت بزم آفندی (والد بزرگوار نجم آفندی)

ایک دن عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

جناب سہیل آفندی (فرزند علامہ نجم آفندی) مقیم حیدرآباد دکن

علامہ نجم آفندی کے بھائی کوکب آفندی اپنی بیگم اور دونوں بیٹیوں، چندن زیدی بیگم اور باقر زیدی کے ساتھ

علامہ نجم آفندی، جناب باقر زیدی (داماد) اور کوکب آفندی (برادر) کے ہمراہ

علامہ نجم آفندی لکھنؤ کے عالم خطیب اور شاعر کے ساتھ

دائیں سے بائیں، جناب عبدالحسین خاور نوری، جناب مرتضیٰ حسین للن، نجم آفندی، سید محمد اطہر ظاہری

علامہ نجم آفندی علمائے ادب اور شعرا کے ساتھ	مقام حیدرآباد دکن
علامہ نجم آفندی علمائے ادب اور شعراء کے ساتھ	علامہ کے داماد شاہد حیدری سید ھے جانب قدر عریضی کے بعد۔ مقام حیدرآباد دکن
علامہ نجم آفندی بمبئی میں مشاعرہ پڑھتے ہوئے	
علامہ نجم آفندی آل انڈیا مشاعرہ دہلی میں پڑھتے ہوئے۔ برابر میں راجندر سنگھ بیدی بیٹھے ہیں	
علامہ نجم آفندی شعراء اور شاگردوں کے ساتھ۔ مقام حیدرآباد دکن دسمبر 1967ء	
علامہ نجم آفندی اراکین انجمن پنجتن شاہ گنج آگرہ کے ساتھ۔ مقام کراچی	
علامہ نجم آفندی بارگاہ جعفریہ کراچی میں 18/ ذی الحجہ ''غدیر خم'' کی محفل میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ سخن فتح پوری اور زاہد فتح پوری بھی بیٹھے ہیں	
علامہ نجم آفندی امام بارگاہِ جعفریہ میں جشن عید غدیر پڑھ رہے ہیں	
علامہ نجم آفندی کراچی میں غدیر خم پڑھتے ہوئے	
علام نجم آفندی مشہور نوحہ خواں کاظم علی کے ساتھ	
علامہ نجم آفندی ماتمی جلوس میں نوحہ خواں کیپٹن عباس عابدی اور صمصام علی گوہر کے ساتھ	

جناب سلطان نسیم جمیل فرزند مرحوم صبا اکبر آبادی کے مکتوب کا جواب

سید العلماء مولانا علی نقی قبلہ کے نایاب مضمون کا ایک صفحہ

نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر

نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر نمونہ غزل بخط شاعر

علامہ نجم آفندی اپنی یادداشتوں کو ڈائری میں محفوظ کرتے تھے (ڈائری سے دو صفحات)

علامہ اپنے قصاید اور نوحوں کی بیاضوں میں اپنے پوتے، پوتیوں، نواسے اور نواسیوں کی تاریخ ولادت کا مل محفوظ کر دیتے تھے۔

علامہ کے مطبوعہ غیر مرثیہ کے چند بند (بخطِ نجم آفندی)

حضرت جوش ملیح آبادی کے ایک مختصر خط کا عکس حضرت نجم مرحوم کے نام

باب اوّل

نجمؔ آفندی کا زندگی نامہ

نجمؔ آفندی کا زندگی نامہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی
مکتوب	سید باقر زیدی
خودنوشت سوانح حیات	نجمؔ آفندی
جب آتش جواں تھا	نجمؔ آفندی
ڈائری کے چند اوراق کے عکس	نجمؔ آفندی
جناب سلطان جمیل نسیم کے نام خط کا عکس	
نجمؔ آفندی کے نام جوشؔ ملیح آبادی کے خط کا عکس	
غزل بخط نجمؔ آفندی	

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم آفندی کا زندگی نامہ

نام مرزا تجمل حسین
تخلص نجم۔ نجمی
شہرت نجم آفندی
گھریلو نام نادر مرزا

تاریخ ولادت: رمضان 1330 ہجری مطابق 1893ء

مقام ولادت: اکبر آباد (آگرہ) کٹرہ حاجی حسن جو پیپل منڈی کے پیچھے واقع ہے۔

والد مرزا عاشق حسین بزم آفندی۔ معروف شاعر اپنے سگے ماموں سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی متوفی 1880ء کے شاگرد رہے۔ ان کی پیدائش 1860ء میں کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں ہوئی۔ شادی آغا حسین صاحب صاحبِ دیوان شاعر کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی۔ آپ بزم تخلص کرتے تھے۔ معروف غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ بزم آفندی کا انتقال 23 مارچ 1953ء کو ہوا۔

دادا مرزا عباس ملیح جو مرزا نجف علی بلیغ کے فرزند تھے جو مرزا فصیح مشہور مرثیہ گو شاعر کے حقیقی بھائی تھے۔ اسی لیے تو نجم آفندی نے مرزا فصیح کی میراث پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

نجم میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیح
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

پردادا: مرزا ہادی علی فیض آبادی۔ مرزا ہادی علی کے تین فرزند تھے۔ (1) مرزا جعفر علی فصیح

(2)مرزا نجف علی بلیغ(3)مرزا فصیح۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کے پر دادا ہادی علی فیض آبادی حضرت عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن جب ان کے بزرگ بلاد ایران میں رہنے لگے تو وہاں ''مرزا'' مشہور ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد ان کے بزرگ شاہجہاں آباد (دہلی) میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

معز الدین قادری اسرار و افکار میں لکھتے ہیں۔نجم آفندی کے پر دادا مرزا ہادی علی فیض آباد کے محلّہ ''مغل پورہ'' میں رہتے تھے چنانچہ نجم آفندی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ در و دیوار

اجداد: نجم آفندی کے اجداد ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔

بھائی بہن: دو بھائی (1) مرزا اعجاز حسین مرحوم اکیس برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یہ عمر میں نجم سے بڑے تھے۔

(2)مرزا سلیمان کوکب آفندی، چھوٹے بھائی جن کی صاحبزادی مشہور مرثیہ نگار شاعر باقر زیدی کی شریک حیات ہیں ۔ ایک بہن شہزادی فرطیس بانو اختر جہاں کج کلاہ پروین پیدائش 1901 جو بزم آفندی کی دوسری انگریز بیوی کے بطن سے تھیں۔ پروین کج کلاہ عمدہ شاعرہ تھیں۔

شریکِ حیات: 1958ء میں گلے کی کینسر سے انتقال کر گئیں۔ کانپور کے ایک معزز گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔

اولاد: (1) پانچ لڑکے۔جن میں چار لڑکے عباس، کامران، تاجدار اور تسلیم بچپن میں مر گئے اور اکلوتے بیٹے ہمایوں مرزا المتخلص سہیل آفندی حیات ہیں اور حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں۔

(2) سات لڑکیاں۔ ایک بیٹی کا کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری لڑکی ناکتخدا تھی۔ دو بیٹیاں شادی کے بعد پاکستان چلی گئیں اور دو بیٹیاں ہندوستان میں مقیم رہیں۔

تعلیم وتربیت: 1- نجم آفندی کی اردو اور فارسی تعلیم گھر پر ہوئی۔

2- قرآن مجید اپنے چچا مرزا ہادی علی سے پڑھا

3- مفید عام اسکول آگرہ سے انگریزی میں مڈل پاس کیا۔ اس اسکول میں اردو فارسی مولوی سلامت اللہ سے اور انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راج کمار سے پڑھی۔

4- اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کو اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔''

5- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستان دبیر میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی اردو، فارسی اور عربی اچھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں۔

6- ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر وفن میں لکھا۔ ''اردو فارسی کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن محض قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کو عربی تعلیم کا حصول سمجھ کر مالک رام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو مغالطہ ہوا ہے۔ خود نجم آفندی نے اپنے خط میں عربی نہ پڑھ سکنے کے بارے میں لکھا ہے۔

7- اردو فارسی اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انھیں گھر پر عام طور سے انگریزی ناول کو بھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

8- نجم آفندی شمشاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں ''میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوگی مگر کم از کم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی میری نظر سے گزری ہیں۔

شکل وصورت: شکل وصورت تصویر سے ظاہر ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ نجم آفندی کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ بدن چھریرہ، رنگت سرخ و سپید تھی۔ چہرہ گول خوبصورت ناک اور باریک ہونٹ کے ساتھ بڑے کان اور سر بھی نسبتاً بڑا تھا۔ آخری عمر میں بال بہت کم رہ گئے تھے۔ خشخشی داڑھی جو مونچھوں سے متصل تھی۔ آواز رعب دار اور چہرے پر

ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔

وضع اور لباس: نجم آفندی نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ مشرقی روایات کے پاسدار اور اسلامی تہذیب کے نمونہ تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ساقی جوش نمبر میں لکھا۔ ''حضرت نجم آفندی جو اس قدر دین دار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلافِ شرع سمجھتے ہیں۔''

نجم آفندی کے لباس میں سادگی تھی۔ وہ عام طور پر سفید شیروانی، سفید پائجامہ، مخمل کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھار کالی شیروانی پر شال اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں معمولی سلیپر یا جوتا ہوتا۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی رکھتے تھے۔ عینک صرف حسبِ ضرورت لگاتے۔

غذا و خوراک: نجم آفندی کم خوراک تھے۔ دیسی گھی اور گڑ سے شدید رغبت تھی۔ ان کی گھی اور گڑ کی چاہت کی کئی داستانیں لوگوں نے بیان کی ہیں۔

سیرت و کردار: ہم نجم آفندی کی سیرت اور عالی کردار کے ساتھ عجز و انکساری کا مختصر خاکہ معز الدین قادری اور ذاکر حسین فاروقی کی تحریروں سے پیش کرتے ہیں۔ اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری نے لکھا ہے۔ ''خاندانی روایات مذہبی تعلیم و تربیت اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوش قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی و تمنا نے ان کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنادیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقائد پر خودسختی کے ساتھ کاربند ہیں لیکن سیرت و کردار میں کہیں بھی ''ملاپن'' یا پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سوانگ موجود نہیں۔ بُردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے

میری تلاش راہ پر ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل میری گردِ راہ کی

بقول جوش ملیح آبادی۔ جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، باپ بیٹے میں زمین و آسمان کا

فرق تھا ۔ وہ ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ان کو رنگینی کبھی چھو کر نہیں گئی تھی ۔ وہ سراپا رند تھے اور یہ سرتا بہ قدم متقی اور خشک قسم کے متقی تھے ۔

دبستانِ دبیر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بیان کرتے ہیں: ''مروّت وضع داری ، ایفائے وعدہ، حُسنِ معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خوبیاں ہیں جو ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ نجم صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے تھے وہ تا حیات ان پر کاربند رہے اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی کامیاب زندگی'' قابل رشک موت'' کی ضامن بن گئی ۔ بقول خود:

کچھ شعر جو منقبت میں کہہ لاتا ہے
اس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہل بیت کہلاتا ہے

شغل و ملازمت:

1- ریلوے محکمہ میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت نجم کی عمر بیس سال تھی۔

2- پھر دہلی میں ملازمت کی۔

3- کالکا اسٹیشن اور غازی پور اسٹیشن پر کچھ عرصہ ملازم ہوئے۔

4- تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہو کر ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور تلاش معاش میں ردولی پہنچے اور کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔

5- جونیئر پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار سے منسلک ہوئے ۔ ان کے سپرد پرنس کے کلام کی اصلاح تھی ۔ تنخواہ بھی اس کام کی پاتے تھے۔ نجم کی ماہانہ تنخواہ دوسو روپے ماہوار تھی ۔

6- دربار سے علاحدہ ہو کر مالی پریشانیوں میں بسر کی اور اپنی خودداری کو نبھانے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چھتہ بازار حیدرآباد میں جوتوں کی دکان تک کھولی ۔

تف برتو اے چرخ پیر کہ شاعرِ اہل بیتؑ کو اتنی بڑی قوم تنگ دستی میں سہارا نہ دے سکی جبکہ تمام قوم اور تاجر ان کے کلام سے روحانی اور اقتصادی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی لیے تو اپنے خطوط میں اس طرح گلہ کیا ''آج ہندوستان میں تبت سے راس کماری تک میرے نوحے پڑھے جا رہے ہیں لیکن مالی فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں'' 'کاروان ماتم' لاہور والوں نے میری اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کر لی ہے۔ لکھا تو جواب تک نہیں دیتے۔ یہ قدر دانی ہو رہی ہے۔ ہم تکلیف اٹھا رہے ہیں اور یہ نفع کما رہے ہیں۔''

شاعری کا آغاز: ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا غزل گوئی سے کی۔ شاہ نیاز وارثی کی غزل پر مصرعے لگائے

زہے عزّو جلالی بو ترابی فخرِ انسانی
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائی شیرِ یزدانی

پہلا مشاعرہ: جس مشاعرے سے نجم کی شاعری کا تعارف ہوا وہ خود ان کے گھر کے سامنے منعقد کیا گیا تھا جس میں اکابر شعرا نے شرکت کی تھی۔ نجم کی غزل کا مطلع تھا:

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور ایک میلی سی چادر دیکھتے

شاگردی: شاعری کے آغاز میں اپنے والد بزمؔ آفندی کی شاگردی کی لیکن بہت جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

صحبت اساتذہ: نجم آفندی کو گھریلو ماحول کے علاوہ اپنے دہلی کے قیام کے دوران نواب سائلؔ دہلوی، بے خودؔ دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحرؔ، منشی امیر اللہ تسلیمؔ، شوکت علی میرٹھی، عبدالرؤف عشرتؔ، ناصر علی خاں مچھلی شہری اور وقارؔ کانپوری جیسے شعرا شامل تھے۔ انھیں اساتذہ نے نجم کی شعری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہیں اس نوجوان شاعر کو صدر مشاعرہ بنایا تو کہیں راجہ پنڈ راول نے ان کی شاہکار نظم کو (1800) سو روپیوں میں خرید کر یہ رقم یتیم خانہ کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ کبھی محفل مقاصدہ میں صفیؔ لکھنوی

کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''نجم صاحب ہم نے بائیس(22) سال اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔''

خطاب: ناصر الملّت نے نجم آفندی کو ''شاعر اہلبیت کا خطاب دیا جو نجم آفندی کے مسلسل سلام اور قصیدہ نگاری کا اثر تھا۔

یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ نجم آفندی کے دادا کے بھائی مرزا فتیح کو خلافت عثمانیہ کی جانب سے آفندی خطاب کعبتہ اللہ اور حاجیوں کی خدمت کرنے پر دیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل استعمال ہوسکتا تھا۔

ہم عصر شعراء: حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال، سائل دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، مرزا اوج، دولھا صاحب عروج، مرزا ثاقب، آرزو لکھنوی وغیرہ بزرگ ہم عصر شعرا تھے جب کہ ان کے ہم عمر شعرا میں فانی، جوش، صدق جائسی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، سید آل رضا وغیرہ شامل تھے۔

تلامذہ: نجم آفندی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے جو فہرست جلیس ترمذی کو روانہ کی تھی اس میں(69) نام تھے۔ وہ بعد میں بڑھ کر(72) ہوگئی، اور کچھ اس طرح ہے جسے ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر و فن میں نقل کیا ہے۔ رعنا اکبر آبادی، جعفر مہدی، رزم رودلوی، صفدر حسین کاظمی، عبدالسعید رشک، عابد مرحوم، وزارت علی، علی انجم اکبر آبادی، مرزا عبدالکریم مضطر، کوکب اکبر آبادی، جلیس ترمذی، انتظام الحسینین، خاور نوری، سعید شہیدی، مرزا عادل، ساجد رضوی، شاہد حیدری، عازم رضوی، قائم جعفری، عباس عابدی، خورشید جنیدی، باقر منظور، طاہر عابدی، خواجہ ضمیر، کاوش حیدری، منجو قمر، راحت عزمی، تصور کرت پوری، عباس زاہد، شہید یار جنگ، ہشیار جنگ، ڈاکٹر اختر احمد، تبسم نظامی، طالب رزاقی، حرماں خیر آبادی، عاصم جمیل، ساحر نجمی، سعید الساعہ، زیبا رودلوی، پرنس معظم جاہ تجمع، ہاشم جاں بہادر، اختر زیدی، حسن مدنی، اثر غوری، کاظم رشک، شاغل حیدر آبادی، صمیم حیدر، محب جاورہ، صادق نقوی، سوز رضا ترمیم، تقی عسکری، اقبال عابدی، سید جعفر

حسنین، زاہد رضوی، ظہیر جعفری، آغا ہاجر، باذل عباس ضیغم، سائر، ثاقب، سعادت نظر، عبدالحی خاں، شارق، بانو سید پوری، نظیر سیہوری، عقیل نجمی، سہیل آفندی، روپ کماری، بیدار نجفی اور وفا ملک پوری وغیرہ۔

ڈاکٹر نواز حسن زیدی لکھتے ہیں کہ تلامذہ کی اصلاح کے وقت نجم آفندی کے ہاں وہی جذبہ کارفرما ہے جسے عشقِ اہل بیت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تلامذہ کے کلام کی اصلاح کے لیے باقاعدہ اصول وضع کر رکھے تھے۔ شاگردوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے امید نہیں کہ جلد تمھارا کلام دیکھ کر بھیج سکوں گا۔ از روئے انصاف سلسلہ وار دیکھتا ہوں'' آج کل چار طرف سے پاکستان اور ہندوستان سے اصلاح کا کلام آرہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دماغ بھی کام دیتا ہے تو ہاتھ کانپتا ہے کس کس کو منع کروں اور کیسے ممکن ہے مدحِ اہل بیت کا مسئلہ ہے۔

مدت مشقِ سخن: تقریباً ستر (70) سال

مسافرت برائے شاعری: دہلی، کانپور، لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی، کلکتہ، بنارس، لاہور ہی نہیں بلکہ دور دراز کے چھوٹے مقامات پر بھی تبلیغ پیامِ اہل بیت میں مشغول رہے۔ چنانچہ فیض آباد، بریلی، بارہ بنکی، سیتاپور، بھرت پور، اجین، مدراس اور بلرام وغیرہ کے لوگ بھی موصوف کے کلام کے دلدادہ رہے۔

زیارت عتبات عالیہ: 1950ء اگست میں زیارتوں کے لئے عراق گئے اور مختلف مقامات مقدسہ پر حاضری دی اور اپنے تاثرات کو منظوم لکھ کر ''تاثرات زیارت'' کے عنوان سے شائع کیا۔

تصنیفات: راقم کو کائنات نجم آفندی مرتب کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نجم آفندی کی تصانیف تقریباً عنقا ہیں۔ نجم آفندی کی چالیس (40) سے زیادہ تصانیف شائع ہوئیں۔ سب سے پہلی تصنیف ان کے کلام کا مجموعہ 1917 میں اور آخری تصنیف ''لہو قطرہ قطرہ'' ان کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں شائع ہوا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ نجم آفندی نے حیات میں چند تصانیف مرتب کی تھیں مثلاً ''گلدستہ

نعت'' ''مذہبی رباعیات'' ''قومی اورمذہبی نظموں کا مجموعہ'' ''خودنوشت سوانح حیات'' جو نامکمل رہ گئی تھی جو کبھی شائع نہ ہوئیں۔ نیز نجم کے مضامین کا کوئی مجموعہ بھی ترتیب نہیں دیا گیا۔

نجم مرحوم کی تصانیف کی فہرست جو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کی ہے یہاں پیش کی جارہی ہے۔ باضافہ چند تصانیف جو بعد میں شائع کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.1	پھولوں کا ہار	1917ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	پہلا مجموعہ کلام۔ ادبی، اخلاقی قومی نظموں کا مجموعہ وہ نظمیں جو شیعہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھیں۔
.2	قصائد نجم	1943ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	رباعیات (32) قصائد اور نظمیں (25)
.3	تہذیب مودّت	1943ء	تاج پریس، یوسف آباد، حیدرآباد	رباعیات (140)
.4	اشاراتِ غم حصہ اول	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (32) نوحے
.5	اشاراتِ غم حصہ دوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (33) نوحے
.6	اشاراتِ غم حصہ سوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (21) نوحے
.7	کربل کی آہ	———	کتب خانہ اثناعشری، لکھنؤ	جدید نوحہ جات (9) نوحے
.8	آیاتِ ماتم	1361ھ	نظامی پریس، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض
.9	تصوراتِ غم	1943ء	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.10	کربل نگری	1361ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی پر لکھی گئی نظم (اردو۔ہندی)
.11	اسلام پوتھی	1380ھ	امامیہ مشن لکھنؤ	طویل مثنوی، آغاز اسلام سے ہجرت حبشہ تک (اردو۔ ہندی)
.12	فتحِ مبین	1943ء	نظامی پریس لکھنؤ	ایک مرثیہ۔5 سلام، 9 رباعیات
.13	بیاضِ حجم	1950ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی	نوحہ جات، (حصہ اول، 53 نوحے، حصہ دوم 81 نوحے)
.14	شاعرِ اہل بیتؑ جیل میں	1939ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	قومی نظموں اور قطعات کا مجموعہ
.15	حسینی سنسار	1364ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحہ جات
.16	کاروانِ ماتم	———	کتب خانہ اثناعشری لاہور	(54) نوحے اور سلام
.17	پریم بھکتی	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	ہندی نظموں کا مجموعہ، اردو رسم الخط میں
.18	دارالسلام	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	جدید رنگ کے سلام
.19	تاثرات زیارت	1950ء	الکٹرک پریس، حیدرآباد	زیارت سے متعلق منظوم خراج عقیدت

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.20	نصاب دینیات	1364ھ	مطبع حیدری، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر دینی احکامات (نثر)
.21	شہیدوں کی باتیں	1952ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	کربلا والوں کے اقوال اور کارنامے (نثر)
.22	حسینؑ اور ہندوستان		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	ہندوستان کا امام حسینؑ سے روحانی تعلق (نثر)
.23	لغات المذہب	1961ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	ایک ہزار مذہبی الفاظ پر مشتمل لغت (نثر)
.24	چور اماموں	1349ھ	زاویہ ادب، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر اخلاقی افسانہ (نثر)
.25	چاند کی بیٹی	—	—	—(نثر)
.26	پھول مالا	—	—	—(نثر)
.27	معراجِ فکر	1959ء	رضا کاربک ڈپو، لاہور	مرثیہ
.28	اسرار و افکار	1971ء	ادارۂ قدر ادب، حیدرآباد	چار سو رباعیات وقطعات
.29	قصائدِ نجم	1372ھ	تاج پریس، حیدرآباد	سولہ (16) قصائد کا مجموعہ
.30	جانِ کربلا	1993ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.31	معرکۂ غم		مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.32	دکھ کا ساگر		مکتبہ ناصری گولہ گنج لکھنؤ	(نوحے + سلام)

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.33	کاروانِ عزا	———	عزا دار بک ڈپو	نوحے اور سلام
.34	ترقی کی برکتیں	———	———	——— (نثر)
.35	قصاید قدسی	———	مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ	قصائد
.36	ستارے	1364ھ	دکن اُردو اکادمی	نظموں کا مجموعہ
.37	بندۂ خدا	1969ء	کاظمی پرنٹنگ پریس حیدرآباد	ایک مذہبی ناول (نثر)
.38	نفس اللہ	———	دائرہ الکٹرک پریس، حیدرآباد	——— (نثر)
.39	ترقی پسندوں کے نام	———	———	——— (نثری کتاب)
.40	رباعیات نجم آفندی	———	امامیہ کتب خانہ لاہور	(145) رباعیات
.41	پچھتّی قصائد (غیر مطبوعہ)	———	———	قصائد
.42	رباعیات	1976ء	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	(30) رباعیات
.43	لہو قطرہ قطرہ	فروری 1979ء	پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی	پچاس منتخب غزلوں کا مجموعہ

وطن پرستی اور انگریز نفرت: سچ تو یہ ہے کہ برصغیر نے علامہ نجم آفندی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور آزادی کے بعد ع: منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

وطن دوستی انگریز نفرت اور قومی محبت نجم آفندی کے ریشہ ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند واقعات اور حکایات ہمارے دعویٰ کے ثبوت ہیں۔

.1 ابتدائی عمر میں جب اسکول میں کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہونے کے بعد ان کے ہیڈ

ماسٹر راج کمار کے جملہ ''تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے؟'' نے فوراً انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کررہے ہیں لیکن اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔''

2. نجم آفندی کی کھدر پوشی سے تنگ آکر ان کے انگریز افسر نے ان کا تبادلہ سزا کے طور پر آسنسول کردیا۔ چنانچہ بعد میں نجم نے تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے استعفیٰ دے دیا۔

3. انگریزوں کے استعمار سے بیزار ہوکر زمانۂ طالب علمی میں ایک چھوٹی سی انجمن بنائی جس کا خفیہ ایجنڈا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں سے مقابلہ اور قومی ملی یکجہتی تھا۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ انجمن رشتوں کے بھائی کی سازش سے ختم ہوگئی۔

4. سرکاری ملازمت سے علاحدگی کے بعد قومی اور مذہبی رجحان نے تقویت پائی چنانچہ ایک طویل پچیس(25) بند کی نظم ''دُرِ یتیم'' لکھی جو ''پھولوں کا ہار'' مجموعۂ کلام میں شامل ہے اور اس نظم کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی نظم ہے جس نے شیعہ کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الہ آباد میں حشر برپا کردیا تھا اور جس پر راجہ سید ابوجعفر صاحب نے ساڑھے چار ہزار روپے نچھاور کردیے تھے۔

5. نجم آفندی نے اپنی تصنیف ''ترقی کی برکتیں'' میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے طاقت ور بازوؤں کا صحیح مصرف کریں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے فساد روک کر ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں۔

6. نجم آفندی جلیس ترمذی کے خط میں لکھتے ہیں: ہندو قوم کے افراد نے گاندھی جی کو ختم کرکے دنیا کو یہ بتادیا ہے کہ ہندوستانی ذہنیت کہاں تک پست ہوسکتی ہے۔

7. نجم آفندی کانگریسی تھے اور اسی لئے کانگریسی مشاعرے بھی کروائے۔ ایک مشاعرے میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست برہم سروپ خارمیرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربار داری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ، کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ وثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کرکے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعروسخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب، شاعر اور

خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : ½ 9 بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میّت : وصیّت کے مطابق مکان پر ہوا

نماز میت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخِ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراق نجم آفندی مرحوم
''غروب انجم نجم'' اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرتیؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیسانؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغل سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلشؔ اب تو یوں
ہے لکھا غم حجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل شاعرِ اہل بیت جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم نجم گئے ہیں باغ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجع کرم خسروِ اقلیم دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازش ملت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحید زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

مکتوب سیّد باقر حسن زیدی

۳؍فروری ۲۰۰۵ء

برادرم تقی عابدی السلام علیکم

شکاگو کے قیام کے دوران آپ سے وعدہ کیا تھا کہ علامہ نجم آفندی مرحوم کی موت کے حالات آپ کے لیے قلم بند کروں گا تا کہ غلط فہمیوں کا تدارک ہو اور صحیح صورت حال واضح ہو سکے سو یہ تحریر حاضر ہے۔

نجم صاحب کا انتقال ان کے داماد مرحوم سید شمیم عباس کاظمی کے مکان پر ہوا جو اس وقت حیات تھے۔ ان کی بیگم یعنی نجم صاحب کی صاحبزادی بھی موجود تھیں۔ ان کا انتقال گذشتہ سال کراچی میں ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں ہوا۔

شمیم بھائی شعر و ادب کی دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ وہ سماجی اور معاشی اعتبار سے بھی کمزور تھے اور اسی لیے شاید وہ سب کچھ نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔ کسی اچھے قبرستان کے بجائے سخی حسن کے قبرستان میں دفن کیا جانا اور چہلم کی مردانی مجلس کا نہ ہوسکنا بھی شاید معاشی حالات کے سبب سے ہو۔

میں ان دنوں بسلسلہ ملازمت حیدرآباد میں رہتا تھا اور ہر Week-END پر کراچی آیا کرتا تھا۔ ان کا انتقال چونکہ اتوار کو ہوا تھا اس لیے میں موجود تھا اور ایک شب قبل بھی مزاج پرسی کے لیے در دولت پر حاضری دے چکا تھا۔ صبح انتقال کی خبر سن کر ان کے گھر پہنچا تو یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ غسل وکفن کہاں ہو۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میت رضویہ کالونی کی امام بارگاہ لے جائی جائے جبکہ بعض چاہتے تھے کہ مرحوم کی وصیت کے احترام میں غسل وکفن گھر پر ہی ہو لیکن غسل دینے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنے چچا کو گولیمار سے بلوایا تا کہ وہ مجھے ہدایات دیتے رہیں اور اس طرح یہ سعادت مجھ ایسے گناہگار کو نصیب ہوئی۔ اخبارات کو خبر بھجوانے کی حامی کچھ قریبی اعزا نے بھری لیکن ریڈیو کی

ذمہ داری کسی نے نہ لی۔ میں نے ایک خبر تیار کر کے اپنے ایک Cousin کو دی۔ وہ ریڈیو پاکستان پہنچے تو انھوں نے یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیا کہ مرحوم کا تعلق چونکہ ہندستان سے ہے اس لیے وہ معذرت خواہ ہیں۔ چنانچہ جناب رئیس امروہوی سے رابطہ کیا تو انھوں اس خبر پر یہ نوٹ لکھا کہ حجم آفندی صاحب کی لاکھوں عقیدت مند کراچی میں اور پورے پاکستان میں رہتے ہیں اس لیے ان کے انتقال کی خبر ریڈیو سے نشر ہونی چاہیے۔ یہ تحریر دیکھ کر اس خبر کو نشر کیا گیا۔ فلمی گانوں کا پروگرام ''آپ کی فرمائش ON-AIR تھا جسے روک کر اناؤنسر نے کہا کہ ہم بڑے افسوس کے ساتھ یہ خبر نشر کر رہے ہیں کہ ہندستان کے مشہور شاعر حجم آفندی کا آج صبح کراچی میں انتقال ہوگیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس خبر کو خبرنامے میں بھی شامل کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ظاہر ہے فلمی گانوں کے دوران نشر کی گئی خبر کسی ثقہ آدمی کے کان تک کہاں پہنچ پاتی۔ ان کے جنازے میں میرے اور والد مرحوم حضرت فیض بھرتپوری کے علاوہ کل بیس پچیس افراد کا مجمع تھا۔ دفن کے بعد علامہ عباس حیدر عابدی کے گھر جا کر ان سے سویم کی مجلس کا وعدہ لیا جو انھوں نے بڑے شوق سے کر لیا۔ مجلس میں تشریف لائے۔ اخبارات میں موت کے یا سویم کے حوالے سے کوئی خبر چھپی ہی نہیں اس لیے مجمع کیا ہوتا۔ یوں بھی سہ پہر کا وقت منگل کا دن۔ لوگ دفتروں میں تھے۔ علامہ نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ جب صورت حال وہی رہی تو قوم کو بُرا بھلا کہا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی سے اس مجلس کو پڑھنے کا وعدہ لیا اور گھر لوٹ گئے۔ مجلس ضمیر اختر صاحب نے پڑھی اور خوب پڑھی۔ انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ چند آدمی ہیں تو چند جملوں میں زیارت پڑھوا دیں۔

حجم صاحب کے اکلوتے فرزند علامہ سہیل آفندی ان دنوں دبئی میں رہتے تھے۔ دفن میں شرکت شاید نہ کر سکے مگر نہ سویم پر آئے نہ چہلم پر۔ چہلم کی مردانی مجلس نہیں ہوئی۔ شمیم بھائی کے گھر پر چہلم کی زنانی مجلس ہوئی۔

باقر زیدی

نجم آفندی

خودنوشت سوانحِ حیات

آج سہ شنبہ 29/ جمادی الاول 1392ھ مطابق 11/جولائی 72ء ہے اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے سوانح حیات کی تحریر کا آغاز کر رہا ہوں۔ انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میری عمر 82 برس کی ہو چکی ہے اور ہوش سنبھالنے کے بعد سے کئی مرتبہ یہ اقدام کر چکا ہوں لیکن اس موضوع کا تکملہ نہ ہو سکا بلکہ کچھ لکھ سکا وہ بھی تلف ہو گیا۔

واقعات قابلِ تحریر اتنے ہیں کہ اگر میرا حافظہ کام دیتا تو ایسی کسی کاپی کے ہزارہا اوراق بھی ناکافی ہوتے۔ بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے متعلق افراد کے نام یاد نہیں رہے، بہت سے افراد کے نام حافظہ میں ہیں مگر اُن سے متعلق واقعات یاد نہیں رہے۔

مذہبی اعتبار سے شیعہ اثنا عشری ہوں اور قومیت کے لحاظ سے ترک ہوں جو ہندوستان میں مغل اور مرزا کہلائے۔ میرے جد اعلیٰ مرزا نجف علی بیگ تھے جو مرزا جعفر علی فصیح کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان دونوں سے چھوٹے بھائی ایک اور تھے جن کا نام میرے ذہن میں نہیں رہا۔ غالباً صبیح تخلص تھا۔ یہ مرزا فصیح کے ساتھ مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ اُنھیں کے اخلاف میں ایک بزرگ ہندوستان آئے تھے جب میری ڈھائی یا تین سال کی عمر تھی اور کچھ دن ہم لوگوں کے ساتھ قیام کیا تھا۔ ایک دن میں نے اُن کی گھڑی کی زنجیر میں (جب وہ گھڑی پلنگ پر رکھ کر ہاتھ منہ دھو رہے تھے) گانٹھ لگادی۔ موصوف نے دیکھ کر فرمایا۔ کیوں مرزا صاحب آپ نے ہماری گھڑی کی زنجیر میں گرہ لگادی۔'' میں نے فوراً جواب میں کہا۔ ''گرہ کہتے ہو گانٹھ کہو۔'' وہ بزرگوار بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے'' لیجئے اصلاح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔''

مرزا فصیح کے متعلق کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن پر دورِ حاضر میں یقین نہیں کیا جا سکتا۔ میں انھیں ضبطِ تحریر میں نہیں لاؤں گا صرف وہی حالات درج ہوں گے جو بعض مصنفین کی کتابوں سے

مجھے ملے ہیں۔ مولانا سیّد مظہر حسین سہارنپوری نے اپنی کتاب ''تہذیب الحسبین فی تاریخ امیر المومنین'' کی جلد اول میں تحریر فرمایا ہے:

''قبر مبارک حضرت ابو طالبؑ و جناب خدیجۃ الکبریٰ کی مکہ میں اب تک بے گنبد تھی۔ ہمارے اس زمانے سے کچھ پیشتر یعنی اوسط تیرہویں صدی ہجری میں جناب مغفرت مآب مرزا جعفر علی فصیح لکھنوی نے (مولف نے لکھنوی اس اعتبار سے لکھا ہے کہ میرے اسلاف نے ایک عرصے تک لکھنؤ میں بھی قیام کیا) کہ آخر ایام حیات میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ بہ کمال جانفشانی مومنین خالصین کو ترغیب وتحریص کر کے ان دونوں قبروں کے گنبد تعمیر کرائے گویا تمام شیعوں پر بذل احسان کیا۔ اب مومنین نزدیک و دور سے ان حضرات کی زیارت سے مستفید ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ بہ عوض اس کارِ خیر کے مرزا صاحب مرحوم کو جنت الخلد میں گھر عطا فرمائے۔ واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔''

صاحبِ ''آب حیات'' محمد حسین آزاد دہلوی نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''اُس دور میں چار مرثیہ گو نامی تھے خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح۔ مرزا فصیح حج و زیارت کو گئے اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔''

اب میں اپنی سوانح حیات کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے بہت سے حضرات اس سے واقفیت نہ رکھتے ہوں کہ خلیق میر انیسؔ کے پدر بزرگوار تھے اور میاں ضمیر مرزا دبیرؔ کے اُستاد تھے۔ دلگیر ایک ہندو شاعر جھنولال نامی تھے۔ طرب تخلص تھا جو مسلمان ہو گئے اور دلگیر تخلص اختیار کر کے مرثیہ کہنے لگے۔

مرزا فصیح کی یہ خصوصیت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان کا کلام ہر دور میں پڑھا گیا اور اس زمانے میں بھی محرم کی ساتویں تاریخ ''سلامی کربلا میں جب بنا ابنِ حسن دولھا'' کہیں نہ کہیں سننے میں آجاتا ہے۔ ''سلام لکھتا ہوں میں حرم میں، قلم سے زم زم ٹپک رہا ہے۔'' مرزا صاحب کا مشہور ترین سلام ہے ''جب مشک بھر کر نہر سے عباسؑ غازی گھر چلے۔'' یہ مرثیہ بھی میں نے مجلس میں پڑھتے سنا ہے اور یہی کچھ چیزیں ہیں جن کو درج کر کے اس کتاب کو طوالت دینا نہیں چاہتا۔

میں نے ایک قدیم تذکرہ میں دیکھا تھا کہ مرزا فصیح غزل بھی کہتے تھے۔ مرزا صاحب کے دو شعر بھی اس تذکرے میں تھے جو میں نے نوٹ کر لئے تھے مگر وہ کاغذ بھی دوسرے کاغذات کے ساتھ تلف ہو گیا۔

مرزا فصیح نے کعبتہ اللہ اور حاجیوں کی اتنی خدمت کی تھی کہ ترکی حکومت نے اُن کو آفندی کا خطاب دیا جو نسلاً بعد نسلٍ استعمال ہو سکتا تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کس زمانے میں میرے اسلاف نے آگرہ آکر مستقل قیام اور اسے اپنا وطن بنالیا۔ میرے دادا مرزا عباس فصیح کی شادی مرزا آغا حسین آغا کے خاندان میں ہوئی۔ آغا اُس دور کے ایسے شاعر تھے جن کے یہ دو شعر آج تک مشہور ہیں

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

دیکھیں تو کس طرح انھیں ہوتا نہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ تخلص اُس دور کے بزرگ شعرا میں تھے اور غالبؔ کے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہؔ کے شاگرد تھے۔ وہ جب کسی مشاعرے میں میری غزل سنتے تھے تو فرماتے تھے میں نے ایسا پڑھنا پہلے بھی کبھی سنا ہے۔ ساحرؔ صاحب میرے والد کے احباب میں تھے۔ میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں ان کے دولت کدہ پر حاضری دیتا تھا۔ ایک دن کچھ شعراء وہاں جمع تھے اور اپنے خاندانی شاعر ہونے کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے کہا مجھے شاعری داد ھیال اور نانہال دونوں سے ورثے میں ملی ہے۔ پنڈت جی نے یہ سن کر فرمایا ''تمھاری دادھیال کے متعلق تو مجھے علم ہے۔ تمھاری نانہال میں کون شاعر تھا۔'' میں نے عرض کیا ''مرزا آغا حسین آغا میرے نانا تھے۔'' کہنے لگے ''ارے یہ بات ہے جب ہی تو میں کہتا تھا کہ ایسے پڑھنا میں نے پہلے بھی سنا ہے۔ تم بالکل اپنے نانا کی طرح پڑھتے ہو۔ میں جب آگرہ سینٹ جانسن کالج میں پڑھتا تھا، اس زمانے میں تمھارے نانا کو کئی مرتبہ سننے کا اتفاق ہوا۔''

میری عمر سال بھر یا سوا سال کی ہوگی کہ ایک عجیب واقعہ ہوا جسے معرض تحریر میں لا رہا ہوں۔ میرے بڑے بھائی مرزا اعجاز حسین مرحوم (جو اکیس برس کی عمر میں انتقال کر گئے) مجھے دومنزلہ کے بڑے کمرے میں ساتھ لے کر آئے تھے جس کے تین دروازے جو ہوا اور روشنی کے لیے صحن کی طرف رکھے گئے تھے، ان کے نچلے حصوں میں کچھ بانس لگا دیے گئے تھے تا کہ بچوں کے گرنے پڑنے کا اندیشہ نہ رہے۔ ایک دروازے کے بانس پر میں نے اور میرے مرحوم بھائی نے ہاتھ سہارے کے لئے رکھ دیے۔ اس بانس کو دیمک کھا گئی تھی۔ بالکل گل گیا تھا۔ ہمارے ہاتھوں کا زور نہ سہار سکا، بانس ٹوٹ گیا اور میں صحن کے فرش پر جا کر گرا جو پورا پتھر کا تھا۔ گھر میں ہر فرد کا یہی خیال ہوا کہ ختم ہو گیا لیکن میں آج تک بقید حیات ہوں اور یہ سوانح حیات لکھ رہا ہوں۔ سر میں ذرا سی چوٹ لگ گئی تھی۔ خون نکل آیا تھا دو چار روز میں یہ زخم اچھا ہو گیا۔

اپنے لڑکپن کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے میرے مزاج کی افتاد کا کچھ اندازہ ہوگا۔ ایک دن کٹرہ کے پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہنچا تھا کہ داہنے ہاتھ کے ایک مکان میں رہنے والے بزرگوار نے اپنے ملازم سے جو ایک لڑکا ہی تھا کہا "جا ذرا یوسف کو بلا کر لے آ" اس نے جواب میں کہا ایسُف کو۔ اِن بزرگوار نے کہا۔ یوسف کو۔ پھر لڑکے نے وہی کہا ایسُف کو۔ یہ سوال و جواب کئی مرتبہ ہوئے اور اب بڑے میاں نے ایک لکڑی جو اُن کے ہاتھ میں تھی، ہر مرتبہ لڑکے کے جواب پر اسے مارنی شروع کر دی۔ لڑکے نے رونا شروع کر دیا۔ میں کچھ دیر تک یہ سین دیکھتا رہا اور پھر میں نے وہ لکڑی ان کے ہاتھ سے چھین لی اور کہا "حضرت وہ یوسف نہیں کہہ سکتا جو کہتا ہے کہنے دیجئے، آپ کو اپنے کام سے مطلب ہے۔" بڑے میاں مجھ پر بہت برہم ہوئے۔ تم دوسروں کے معاملات میں دخل دینے والے کون، جاؤ اپنا کام کرو۔" غرض اس طرح وہ مار پیٹ ختم ہو گئی اور میں اپنے گھر چلا آیا۔

ذیل کی چند سطروں میں ایک ایسا واقعہ درج کر رہا ہوں جس سے میرے دل میں اپنے ایک ٹیچر کی عزت بہت بڑھ گئی۔

"مفید عام اسکول میرے مکان سے بالکل قریب تھا جہاں میں پڑھ رہا تھا۔ مولوی سلامت اللہ صاحب جو یہاں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے، ریٹائر ہو گئے اور

ان کی جگہ ایک ہندو ماسٹر صاحب مقرر کیے گئے جو غالباً کائستھ تھے۔ اس جماعت میں صرف اردو کا درس ہوتا تھا۔ پہلے ہی دن ماسٹر صاحب نے ایک لفظ کے غلط معنی بتائے۔ میں نے کہا ''ماسٹر صاحب! اس لفظ کے معنی یہ نہیں ہیں اور فصیح معنی بتا کر کہا یہ ہیں۔'' ماسٹر صاحب بہت بگڑے اور فرمانے لگے ''خاموش رہو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔'' میں نے عرض کیا ''یہ بات نہیں ہے اتفاق ہے۔ آپ لغت منگا کر دیکھ لیجئے۔'' میرے اصرار پر لغت منگا کر دیکھی۔ اور میرا کہنا سچ ثابت ہوا۔ دوسرے یا تیسرے روز پھر ایسا ہی واقعہ ہوا۔ اب ماسٹر صاحب نے کہا ''دیکھو بھئی تم کلاس کو پڑھایا کرو ہم بیٹھے سنتے رہیں گے۔''

مذہبی اعتبار سے پہلا مسئلہ جس کی تحریک و تائید میں نے کی اور مجھے کامیابی حاصل ہوئی وہ حسب ذیل ہے۔

آگرہ میں قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث علیہ الرحمہ کا مزار ہے جن کو جہانگیر کے ایام حکومت میں شہید کر دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی گئی ہیں دونوں کے ٹائٹل پر میرا یہ شعر مولفین نے درج کیا ہے:

جاں نثاروں نے ترے کر دیئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے

خدا ہی جانتا ہے کہ کس نے اس مقام کی چہار دیواری بنائی اور کب سے یہاں مُردے دفن ہونے شروع ہوئے۔ ان کتابوں میں کچھ ایسے حالات ضرور ہوں گے مگر میرا حافظہ بالکل کام نہیں دیتا اور وہ کتابیں دوسری کتابوں اور کاغذ اب کے ساتھ ضائع ہوگئیں۔ محلّہ گلاب خانے کے ایک بزرگ حاجی فدا علی مرحوم آٹھویں دن کچھ افراد کو ہمراہ لے جا کر مزار شہید ثالث پر ایک مجلس عزا کیا کرتے تھے اور وہاں کی صفائی وغیرہ کا بھی اس سلسلے میں اہتمام ہو جاتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ طریقہ ختم ہوگیا۔ ایک دن ہمارے محلے کے ایک فرد نے گلاب خانے جا کر ہر محلّہ سے حاجی فدا علی کی طرح وہاں کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت حاصل کی جو فوراً ہی مل گئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے جن کے کچھ اثرات بھی افراد قوم اور سرکاری ملازمین پر تھے، اس زمین

پر اپنے اور اپنے بھائی کے نام سے بھتیہ مساوی کھیوٹ وغیرہ میں لکھوا کر قبضہ جما لیا۔ پوری تفصیل واقعے کی مجھے یاد نہیں رہی۔ بہر حال میں نے کچھ افراد قوم کو جمع کر کے واقعات بتائے اور سب نے مل کر اُن کے قبضۂ نا جائز سے اس مقام کو نکال لیا۔

میرے بڑے پھوپھا سید محمد حسن قمر داعی پور ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے اور حضرت منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ داد دینے میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے۔ جب تک کسی کا شعر ان کے دل پر کوئی خاص اثر پیدا نہ کرے تعریف میں زبان نہ ہلاتے تھے۔ ایک روز میں ایک مشاعرہ پڑھ کر آ رہا تھا کہ موصوف کا سامنا ہو گیا۔ مجھ سے پوچھا۔ کیا تم کسی مشاعرے میں گئے تھے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا ''کس کا شعر یاد ہے جو سب سے زیادہ کامیاب رہا ہو۔''

میں نے رئیس مرحوم کے ایک شاگرد کا مطلع سنایا جس پر بہت داد ملی تھی۔

ان کا ناوک ہوا دل لے کے جو چمپت کیا ہے
یہ سدا کا ہے اُچکا، نئی عادت کیا ہے

مجھ سے پوچھا ''تمھارا مطلع کیا تھا'' میں نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا:

لذتِ درد سے بے درد کو نسبت کیا ہے
اہلِ دل جو نہ ہو کیا جانے محبت کیا ہے

''یہ مطلع ہے۔'' ان کی اس داد پر مجھے خود بڑا تعجب ہوا اور اس دن سے میں نے شعر و سخن میں بہت زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ حضرت رئیس کے شاگرد کا یہ شعر جو میں نے اس واقعے کے سلسلے میں درج کیا ہے کسی مزاحیہ غزل کا مطلع معلوم ہوتا ہے مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔

اب جو واقعہ درج کر رہا ہوں وہ پنڈراول ضلع علی گڑھ سے متعلق ہے۔ اس ریاست میں تین روز تک چھ مجلسیں سالانہ ہوا کرتی تھیں۔ اب تو ہر بڑے شہر میں سالانہ مجالس ہوتی ہیں۔ میں نے یہاں کی مجلسوں میں کئی سال شرکت کی ہے اور تمام بڑے بڑے ذاکروں کو سنا ہے۔ حدیث خوانوں میں مولوی سبط حسن جیسے زبردست مقرر کو، سوز خوانوں میں منجھو صاحب اور ایک مرتبہ ان کے استاد مہدی حسین صاحب کو بھی، مرثیہ خوانوں میں دولھا صاحب کو مرزا اوج کو، طاہر صاحب کو۔

پہلی مرتبہ میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان مجلسوں میں گیا تھا۔ ایک دن شام کی مجلس کے بعد وہ مجھے رابہ صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ اُس زمانے میں انیسئے اور دبیریئے کا بڑا سوال تھا اور رابہ صاحب بڑے پکّے دبیریئے تھے۔ جو کوئی نوجوان شاعر ان سے ملتا تھا اس کو مرزا اوجؔ کی شاگردی کا مشورہ دیتے تھے اور جو شاگرد ہو جاتا تھا اس کو ایک گنّی انعام دیا کرتے تھے۔ مجھ سے پوچھا۔تم بھی کچھ کہتے ہو؟ میں نے کہا۔ جی ہاں۔فرمایا: سناؤ۔'' میں نے شاہ نیاز احمد وارثی کی غزل پر مصرعے اردو میں لگائے تھے جس کا مطلع ہے:

زہے عزّ و جلالے بوترابے فخرِ انسانے
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائے شیرِ یزدانے

یہیں تضمین سنائی، بہت خوش ہوئے اور مجھ سے بھی کہا کہ ''تم مرزا اوجؔ کے شاگرد ہو جاؤ۔'' میں نے جواباً عرض کیا ''میں کیسے شاگرد ہوسکتا ہوں۔'' فرمایا'' کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے کہا ''میرے گھر خود استادی ہے۔''

والد مجھے ڈانٹنے لگے۔رابہ صاحب نے کہا'' آپ کچھ نہ کہیے۔صاحبزادے بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔مرزا فتیحؔ کے پوتے ہیں۔لاؤ ہمارا صندوقچہ۔'' ملازم صندوقچہ لے کر آیا تو مجھے دو گنّیاں عنایت ہوئیں۔

سن تو مجھے یاد نہیں رہا۔بہر حال ایک سال انھیں مجلسوں میں جب میں پنڈراول گیا ہوں تو میں اور دولھا صاحب عمارت کے ایک ہی حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ایک دن ہم دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کہ آگرہ کا ایک لڑکا ابوجعفر جس کا نام تھا، دوڑا ہوا آیا اور بے ساختہ کہنے لگا۔

''دولہا صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنے باپ کا کلام پڑھتے ہیں۔''

دولہا صاحب نے فوراً جواب دیا:

''ان سے کہہ دیجئے وہ کہتا ہے کہ میں اپنے ہی باپ کا کلام پڑھتا ہوں، آپ کے باپ کا تو نہیں پڑھتا۔'' یہ جملہ کہہ کر دولہا صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا ''اس سے بہتر جواب نہیں ہوسکتا۔''

سن تو مجھے یاد نہیں رہا، واقعہ یاد ہے۔ پنڈراول کی مجالس کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ کچھ تکان محسوس ہو رہی تھی۔ اول شام سے پلنگ پر لیٹ کر سو گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد ہی ایک غیر معمولی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ پلنگ سے متصل دو تخت بچھے ہوئے تھے، ان پر بیٹھے ہوئے نسیم امروہوی ایک صاحب کو مرثیہ سنا رہے تھے اور وہ میں فرما رہے تھے ''سبحان اللہ ہزار سبحان اللہ اور دس ہزار سبحان اللہ لاکھ سبحان اللہ، دس لاکھ سبحان اللہ ——— ''مجھ سے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اور میں بستر سے اٹھ کر اس عمارت کے دوسرے گوشے میں چلا گیا۔ یہ تعریف کرنے والے صاحب بھی شاعر تھے اور میں ان کا نام بھول گیا۔

دوسرا واقعہ سنئے:

ہر زمانے میں کچھ غیر شاعر، شاعر اور کچھ غیر مولوی، مولوی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک مولوی صاحب نے جہاں میں بیٹھا تھا، کچھ لوگوں کو جمع کر کے الٹی سیدھی تقریر شروع کر دی اور ان پر اپنے علم و فضل کا رعب جمانے لگے۔ تھوڑی دیر تک تو میں سنتا رہا۔ آخر تنگ آ کر ان سے عرض کیا۔ ''یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں، پہلے آپ خدا کے وجود کا ثبوت تو دیجئے۔'' جواب میں فرماتے ہیں۔

''اگر خدا چاہے تو یہ دیوال (دیوار) بھی گویا ہو جائے۔''

میں نے کہا ''بس معلوم ہو گئی آپ کی قابلیت۔ آپ سے خدا کے وجود کا ثبوت مانگا جا رہا ہے اور آپ خدا چاہے تو یہ دیوال (دیوار) بھی گویا ہو جائے، اس کا جواب دیتے ہیں اور دیوار کا لفظ بھی صحیح نہیں ہے، دیوال کہہ رہے ہیں۔''

سب حضرات جو وہاں جمع تھے یہ سُن کر ہنسنے لگے اور وہ حضرت اُس وقت سے مجھ سے دور دور رہنے لگے۔

شاعری کی ابتدا ہی سے مجھے بڑے پیمانے پر مشاعرے کرانے کا شوق تھا۔ اور میں نے سب سے پہلے اپنے وطن آگرہ میں اپنے مکان کے سامنے کی زمین پر جو کافی وسیع تھی، چار طرف بڑے بڑے بانس گاڑ کر اور ان پر چاندنیاں لپیٹ کر مشاعرے کے لئے بہت عمدہ جگہ بنائی۔ شہر کے تمام شاعروں کو مدعو کیا، جس میں سیمابؔ اکبر آبادی کا نام مجھے یاد ہے۔ مصرع طرح بھی یاد نہیں رہا۔

ایک شعر اپنی غزل کا یاد رہ گیا جو مطلع تھا۔

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبر عاشق اور ایک میلی سی چادر دیکھتے

جب تک میں آگرہ میں رہا پھر ایسا مشاعرہ نہیں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آگرہ میں تعزیہ داری بہت زور شور سے ہوتی تھی۔ شیعہ سنّی اور ہندو سب تعزیہ داری کا فریضہ ادا کرنے میں حصّہ لیتے تھے۔ اہل سنّت کے اہتمام سے ایک پھولوں کا تعزیہ اتنا اونچا بنا کر گشت کرایا جاتا تھا کہ پردہ دار عورتیں اپنے مکانوں کے بالا خانوں سے زیارت کر لیتی تھیں اور ایک پھولوں کا چھوٹا تعزیہ جس کا گشت ۷ اور ۹ محرم کو ہوتا تھا، اس میں صادق نامی ایک نوجوان (اہل سنت) اور اس کے ساتھی انیسؔ کے سلام اور جلیلؔ استاد نظام حیدرآباد کے سلام راستے بھر پڑھتے تھے اور بہت بڑا مجمع ساتھ رہتا تھا۔ صادق نے میرے شاگرد رعنا اکبرآبادی سے کہا کہ نجمؔ صاحب سے کہہ دو، وہ ہمیں پڑھنے کے لیے سلام کہہ کر دیں۔ میں نے ان کی خواہش کے مطابق سلام کہہ کر دیا جس کا مطلع تھا:

وفا پر کربلا میں ہو گئے صدقے وفا والے
خدا کے سب تھے بندے پر بہتر تھے خدا والے

یہ سلام پڑھا جا رہا تھا اور بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ جب صادق اس شعر پر پہنچا:

فرشتے حشر میں سمجھے گروہِ انبیاءؑ آیا
کچھ ایسی شان سے آئے محمدؐ مصطفےٰ والے

تو سامعین میں سے ایک شخص نے اپنا دوشالہ کندھے سے اتار کر صادق کو دے دیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسی سلام کو میں نے مختلف سوزخوانوں سے مجالس میں دوسرے شعرا کے تخلص سے سنا۔

دوسرے سال اسی زمانے کا ذکر ہے جن دو بھائیوں سے قاضی صاحب کے مزار کے سلسلے میں جھگڑا ہوا تھا، اپنے مکان کے دروازے پر ایک صاحب کھڑے تھے۔ میں اپنے گھر جا رہا تھا جو ان کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے، ابھی سُن کر آ رہا ہوں:

سنا کر نجمؔ قصہ کربلا والے شہیدوں کا
مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

جب تک میں آگرہ میں رہا، ہر سال ایک نیا سلام کہہ کر دیتا تھا جو پڑھا جاتا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں انیسئے اور دبیریئے کا بڑا ہنگامہ رہتا تھا۔ ہمارے ہمسایہ وہی جن سے قاضی صاحب کے مزار کا جھگڑا چلا تھا، انیسئے تھے اور ان کے ہاں مجلسوں میں ایک صاحب انیسؔ اور ان کے خاندان کے افراد کے مصنفہ مرثیے پڑھتے تھے اور میرے ایک عزیز قریب بزرگ مرزا دبیرؔ اور ان کے خاندان کے مرثیہ کو حضرات یا اس خاندان کے متبعین کا کلام پڑھتے تھے۔ یہ مجلسیں بڑے زور وشور کی ہوتی تھیں۔

ایک روز وہ میرے عزیز بزرگ عموماً جن صاحب کا کلام پڑھا کرتے تھے، ان کا مصنفہ مرثیہ نقل کرتے کرتے حمام میں چلے گئے اور جس رُخ پر دو بند لکھے تھے، اس کو اسی طرح چھوڑ کر گئے تھے۔ میں اُدھر سے گزرا تو وہ بند میں نے پڑھے اور پنسل سے کچھ تغیر وتبدل کر کے باہر چلا گیا۔ جب وہ حمام سے آئے اور انھوں نے تغیر وتبدل دیکھا تو پوچھا یہ کس نے کیا ہے تو گھر والوں نے میرا نام بتایا۔ فوراً انھوں نے ایک لڑکے کو بھیج کر مجھے بلایا اور مجھ سے کہا یہ مرثیہ لے جاؤ اور اسی طرح ترمیم و تنسیخ کر کے مجھے دے دینا۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ جب تک آگرہ میں رہا یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں اس واقعے سے متعلق کسی کا نام لکھنا پسند نہیں کرتا، اس سے کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے۔

اب جو قصہ میں لکھ رہا ہوں، ممکن ہے میرے ہم عصر افراد میں سے کسی کو اس کا علم ہو جس کو سیاست سے دلچسپی رہی ہو۔

جس زمانے میں گاندھی جی آنجہانی غالباً افریقہ میں تھے اپنے وطن ہندوستان نہیں آئے تھے، دہلی میں ایک نوجوان طالب علم جن کا نام غالباً حیدر رضا زیدی تھا، یکا یک انگریزی مصنوعات کے خلاف سودیشی چیزوں کے استعمال کی موافقت میں تقریریں کرنے لگے۔ سن وغیرہ تو مجھے یاد نہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آگرہ میں پھول ڈول کے میلے ہوتے ہیں۔ آج کسی بازار میں میلہ ہے، کل کسی بازار میں ہے۔ تقریباً پندرہ بیس روز یہ میلے جاری رہتے ہیں۔ آگرہ آکر بھی اُس زمانے میں انھوں نے دو ایک تقریریں کی تھیں۔ ان کے ایک عزیز کسی بڑے عہدے پر ممتاز تھے۔ کمشنر نے ان کو بلا کر کہا ''یہ طالب علم بہت تیز ہے۔ اگر یہ تیار ہو جائے تو حکومت اپنے صرف سے اسے لندن تعلیم

کے لیے بھیج سکتی ہے۔'' غرض ان کے عزیز اور دیگر اعزا نے اسے سمجھا بجھا کر لندن بھجوا دیا۔

اُسی زمانے میں ایک روز ایک ہلکا سا زلزلہ آیا۔ میں نے جو زمین ہلتے ہوئے دیکھی اور اس کے متعلق والدہ سے کچھ دیر گفتگو کر کے ایک مضمون لکھ کر آگرہ اخبار کے دفتر پہنچا دیا جو اس پرچہ میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ چاروں طرف سے اس کی تعریفوں کی آوازیں آئیں۔ یہ میرا پہلا انٹر کا مضمون تھا۔

دوسرا مضمون ''حسین اور ہندوستان'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا جس میں یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ امام حسین علیہ السلام سے ہر قوم و مذہب کے افراد کو عقیدت ہے۔ خواہ وہ ہندو ہوں، عیسائی ہوں، سکھ ہوں، راجپوت ہوں۔ اتفاقاً ایک کتاب میرے ہاتھ لگ گئی جس کے مصنف کوئی اہل سنت تھے۔ نہ مجھے کتاب کا نام یاد ہے، نہ اس کے لکھنے والے کا۔ اس کتاب میں یہ واقعہ درج تھا کہ امام حسینؑ کے ساتھ شریک ہو کر سات برہمنوں نے یزید فوج سے جنگ کی تھی، یا مختار کے ساتھ شامل کر ہو کر حضرت کے قاتلوں سے انتقام لیا تھا اور ان کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ حسینی بامن کہلاتے ہیں۔

اس واقعے کا تذکرہ ایک ڈاکٹر صاحب سے میں نے کیا جو ہندو تھے۔ ان کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انھوں نے کہا ہم بھی حسینی بامن ہیں۔ بہرحال اس مضمون میں حسینی بامنوں کا ذکر میں نے اس کتاب کے حوالے سے کر دیا اور اسے ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں شائع کرا کے آگرہ میں تقسیم کیا۔

واقعات اس زمانے کے بہت ہیں مگر مجھے یاد نہیں رہے۔ میں نے بہت کچھ نوٹ کر کے رکھے تھے۔ وہ تمام کاغذات بھی ضائع ہو گئے۔ بہرحال اب میں اپنے مرحوم بڑے بھائی مرزا اعجاز حسین کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ کے انٹرنس پاس طالب علم تھے۔ اُس زمانے میں میٹرک نہیں کہلاتا تھا، انٹرنس کہتے تھے۔

وکٹوریہ ہائی اسکول سے نکلنے کے بعد ان کو گوالیار اسٹیٹ میں سب انسپکٹر پولیس کی پوسٹ مل گئی اور وہاں کام کرنے لگے۔ ایک روز کچھ کانسٹبلوں کو ساتھ لیے تھانے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک شخص سامنے سے آتا نظر آیا۔ اسے .....

نوٹ: حضرت نجم آفندی مرحوم نے انتقال سے قبل اپنی سوانح حیات کا آغاز کیا تھا، لیکن موت نے مہلت نہ دی اور مسودہ نامکمل رہ گیا۔

نجم آفندی

جب آتش جواں تھا

میری جوانی کی شاعرانہ سرگرمیاں بہت کچھ ہیں، مگر میں اس وقت صرف تین مشاعروں کی روداد بیان کرسکوں گا۔ پہلے مشاعرے میں میری کارگزاری کو شاعرانہ جسارت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ دوسرے مشاعرے میں جو اقدام میں نے کیا ہے، وہ شاعرانہ حمیّت سے موسوم ہونا چاہیے۔ مشاعرے کے ہنگامہ کو شاعرانہ شرارت کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔

ابتدائے شباب اور مشغلہ شعروسخن کے آغاز میں چھوٹے چھوٹے مشاعرے اپنے ہم عمر شعرا کے ساتھ کتنے ہی پڑھ چکا تھا لیکن پہلا بڑا مشاعرہ میں نے جس میں شرکت کی ہے اس کی یاد کے ساتھ ہی مجھے ایک فخر کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ مشاعرہ میں نے مرحوم منشی امیر اللہ تسلیم کے ساتھ پڑھا ہے جو یادگارِ مومن و تسلیم کہلاتے ہیں۔ ان کی عمر اُس وقت سو برس کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ اپنے دو شاگردوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تشریف لائے تھے۔

اس ضعیفی میں جب بصارت تقریباً ختم ہوچکی تھی (بغیر دو آدمیوں کے سہارا لئے ہوئے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا) اردو کی خدمت کے اس جذبے اور مشاعرے کی سرپرستی کے اس کارنامے نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آداب عرض کرکے ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس مشاعرے میں میرے والد مرحوم مرزا بزمؔ آفندی، منشی حیات بخش رسؔا، جناب جادوؔرام پوری، جناب طپشؔ مارہروی، جناب صمیمؔ بلندشہری وغیرہ اس دور کے اساتذہ کرام بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب سب شعراء پڑھ چکے تو حضرت تسلیم کی غزل ان کے ایک شاگرد نے پڑھ کر سنائی۔ اس غزل کے بعد مشاعرہ برخاست نہیں ہوا بلکہ بعض شعراء اور سامعین چاہتے تھے کہ خود حضرت تسلیم کی زبان سے کچھ کلام سنیں لیکن ان سے عرض کرنے میں ہر شخص کو تامل تھا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں نے بغیر کسی مشورے اور اشارے کے اس خدمت کو اپنے ذمے لیا اور موصوف سے بلا تکلف عرض کردیا کہ

میں نے کبھی آپ کا کلام آپ کی زبان سے نہیں سنا ہے اور میرے ساتھ پورا مجمع آپ سے اس بزرگانہ شفقت کی توقع کر رہا ہے۔ اس بزرگوار نے حیران ہو کر پوچھا۔

''صاحبزادے آپ کون ہیں، اور آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا۔ ''میں منشی منیر شکوہ آبادی کا پوتا[1] حجم آفندی ہوں۔'' منیر شکوہ آبادی کے فضل و کمال، شاعرانہ قوتوں اور صلاحیتوں کا حضرت تسلیم سے زیادہ کون معترف ہو سکتا تھا جنھوں نے منیر کا زمانہ دیکھا تھا اور برسوں ان کے ساتھ نشست و برخواست کا اتفاق ہوا تھا۔ منیر میرے والد مرحوم کے استاد بھی تھے اور دور کے رشتے سے ماموں بھی ہوتے تھے۔ (یہ اپنے دور کے وہ زبردست ہمہ داں اور ہمہ گیر شاعر تھے جن کے سامنے بڑے بڑوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں)

منیر کا نام میرے لیے کتنی ہی مرتبہ کھل جا سم سم والے طلسم کا کام دے چکا تھا جس کا ذکر میرے سوانح حیات میں آگے آئے گا اگر لکھی گئی۔ بہر حال منیر کے نام نے وہی کام کیا اور جس وقت تسلیم مرحوم نے اپنی منحنی، کانپتی ہوئی درد انگیز آواز میں یہ مطلع پڑھا ہے:

نہ ہوا کم کسی تدبیر سے چکر میرا
جب تھکے پائے جنوں، پھرنے لگا سر میرا

تو سننے والوں میں سے بعض رقیق القلب آدمیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد ایک اور شعر پڑھا جو مطلع کی طرح آج تک میرے دل پر نقش ہے۔

حجاب، باغ میں نرگس کی چشم سے نہ کرو یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

مشاعرہ ختم ہوا۔ اس کی یاد باقی ہے۔ اب نہ ایسے بزرگ نظر آئیں گے اور نہ ایسی شفقتیں اور نہ کسی کی آنکھ میں آنسو دکھائی دیں گے۔

دوسرا مشاعرہ بھارت کے دارالسلطنت دہلی کا ہے (جو کبھی اردو ادب کا مرکز سمجھی جاتی تھی) اس مشاعرے میں قریب قریب تمام شعرائے دہلی شریک تھے جن میں نمایاں شخص اُس دور کے مسلم الثبوت استاد نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی تھی جو حضرت داغ مرحوم کے شاگرد بھی تھے اور داماد بھی۔ حضرت سائل دہلوی میرے والد کے ہم عصر اور بے تکلف دوستوں میں تھے۔ مجھ

---

[1] حقیقی پوتا نہیں، بلکہ رشتے کا۔ (ش۔م۔ر)

پر بہت شفقت فرماتے تھے اور موصوف کو میں چچا کہتا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس مشاعرے میں بابائے صحافت حضرت جالبؔ دہلوی بھی شریک تھے جن کی بدولت آج ہندوستان میں بہت سے اردو زبان کے صحیفہ نگار نظر آتے ہیں۔ اُنھیں صدر محفل میں جگہ دی گئی تھی۔ بیرون جات کے شعراء میں میرے والد مرحوم حضرت بزمؔ آفندی، جناب کشتہؔ اکبر آبادی، میرے رشتے کے ایک بڑے بھائی شوخؔ مرحوم، میرے پھوپھی زاد بھائی حضرت نیرؔ اکبر آبادی بھی موجود تھے۔ یہ سب ارض تاج آگرہ کے رہنے والے تھے۔ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ آگرہ تاریخی اعتبار سے ادب اردو کا گہوارہ ہے۔ اردو یہاں پلی بڑھی اور دہلی میں پھلی پھولی۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ۔ شیخ شرف الدین مضمونؔ، خواجہ بقاء اللہ خاں بقاؔ، میر تقی ومرزا غالبؔ جیسے معمار اردو آگرہ کی ہی سرزمین سے اٹھے تھے۔ آگرہ اردو شاعری کا ایک ایسا اسکول ہے جس کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔

میں دہلی میں بہت مشاعرے پڑھ چکا تھا اور غلط انکسار کو ناپسند کرتے ہوئے بلا تکلف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔ مشاعرہ میں میری غزل خوب چمکتی تھی اور سامعین میری غزل سرائی کے منتظر رہتے تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کہ شمع دہلی کے ایک شاعر مفتونؔ کے سامنے آئی۔ انھوں نے آخر میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔

''زبان اردو ہے دہلی ولکھنؤ کے لیے''

کشتہ صاحب اور بھائی نیرؔ چونکے۔ بھائی شوخ نے جو میرے برابر ہی بیٹھے تھے، میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تم نے سنا؟''

میں نے کہا ''جی ہاں سُنا اور سناؤں گا بھی۔'' جب شمع میرے سامنے آئی۔ میں نے دو غزلہ کہا تھا۔ ایک غزلہ صرف 'تو'' کے قافیہ میں اور ایک مختلف قوافی میں غزل پڑھی اور ہمیشہ سے زیادہ داد ملی۔ سامعین میں سے بعض آدمیوں نے کہا کہ مشاعرہ لوٹ لیا۔ آخر میں یہ دو شعر پڑھے جو مفتونؔ کا شعر سن کر کہے گئے تھے۔

یہ اُس سے کہہ دو ہے دعویٰ زبان کا جس کو
ہمارے آگے زبان کھولے گفتگو کے لیے

زبان میرؔ کی ہے میرؔ آگرہ کے تھے مقام فخر ہے دہلی نہ لکھنؤ کے لیے

یکا یک ایک ایسا سناٹا طاری ہوگیا جسے انگلش میں (Pin Drop Silence) کہتے ہیں۔ محفل

کے حیرت و سکوت کو حضرت جالبؔ کی اس آواز نے توڑا۔ ''یہ کیا ہے؟ حضرت سائلؔ دہلوی نے فرمایا: ''واقعہ ہے۔''

جالبؔ صاحب نے بہت بگڑ کر جواب دیا:

''یہ آپ اِن لڑکوں کی تعریفیں کر کے ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔'' جواب الجواب میں سائلؔ صاحب نے فرمایا۔

''شعر تعریف کے قابل ہوں تو تعریف کی ہی جاتی ہے۔ خواہ کسی کے ہوں اور اس مسئلے میں ابتدا مفتونؔ نے کی ہے۔ اُنھیں یہ نہیں چاہیے تھا۔ ساری ذمہ داری مفتونؔ پر ہے۔''

غرض بڑا ہنگامہ ہوا۔ اس پورے مجمع میں حضرت سائلؔ دہلوی نے حق بات کہی۔ میرے والد مرحوم نے جو ایک سلجھ کل آدمی تھے، بہت معذرت کی۔ بڑی طول طویل گفتگو کے بعد آدھے گھنٹہ میں بمشکل ہنگامہ فرو ہوا اور مشاعرہ پھر شروع کیا گیا۔ صرف اساتذہ پڑھنے کے لیے باقی تھے۔ انھوں نے پڑھا لیکن مشاعرے میں وہ گرما گرمی اب کہاں تھی۔ اس اتفاقی حادثے نے اسے بالکل سرد کر دیا۔ بہت جلد اور بڑی بے لطفی کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوگیا۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے ڈیڑھ برس تک دہلی کے مشاعروں کی دعوت نہیں ملی۔

میرے والد کے ایک اور دوست غالبؔ کے ایک عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہؔ کے شاگرد پنڈت امرناتھ ساحرؔ، دہلی کے رؤسا میں تھے۔ وہ جب تحصیلدار سے وظیفہ پر سبکدوش ہوکر پنجاب سے دہلی آئے تو موصوف نے اپنے مشاعرے کی دعوت دی اور پھر دہلی کے مشاعروں میں میری شرکت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پنڈت جی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ میں انھیں بھی چچا کہتا تھا۔ تیسرے مشاعرے کا تعلق انھیں بزرگوار سے ہے۔

پنڈت جی کانگریسی جدوجہد کے خلاف تھے اور کانگریسی جلسوں کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے ایک دوست سوتی برہم سروپ خارؔ میرٹھی میری طرح پکے کانگریسی اور برٹش حکومت کے مخالف تھے۔ ہم دونوں اور دوسرے ہم مشرب شعراء غزلوں کے اشعار میں حکومت پر کھلی چوٹیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہم نے ایسے مشاعرے بھی کیے ہیں، جن کا مقصد برٹش حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعرے کا نام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مشاعرہ

کے مصرع طرح کی ردیف ''کھدر'' رکھی گئی تھی ۔ مجھے اپنے اس زمانے کے کلام کا خیال آتا ہے تو اس کے ضائع ہو جانے کا بڑا رنج ہوتا ہے جو اس انقلاب ہی کی نذر ہو گیا۔

ایک دن سوتی برہم سروپ میرے پاس غازی آباد آئے اور کہنے لگے۔

''بھئی ہم بڑے پیمانہ پر کانگریسی مشاعرہ کر رہے ہیں ۔ اس کے لیے کوئی صدر تجویز کرو۔''

مجھے کچھ ایسی شرارت اُس وقت سوجھی کہ میں نے پنڈت امرناتھ ساحؔر کا نام تجویز کر دیا اور خاؔر صاحب مجھ سے ان کے نام کا سفارشی خط لے کر گئے اور ان کو صدارت کے لیے راضی کر لیا۔ پنڈت جی مشاعرے کی نوعیت سے بے خبر اور خاؔر پنڈت جی کی ذہنیت سے ناواقف، غرضیکہ مشاعرے کا دن آ گیا۔ میں عین مشاعرے کے وقت پہنچا اور خاؔر کو الگ لے جا کر چپکے سے کہا کہ:

''دورانِ مشاعرہ پنڈت جی کے سامنے نہ جانا۔'' وہ اس پر حیران ہوئے تو میں نے انھیں یہ راز بتایا۔ وہ بہت محظوظ ہوئے اور ہم دونوں پنڈت جی سے دور سامعین کی آڑ میں ایک طرف بیٹھ رہے۔ مشاعرہ شروع ہوا اور پنڈت جی کی اضطرابی کیفیت، چہرے کا اتار چڑھاؤ، بار بار ان کا فرمانا کہ ''یہ کیا ہے؟ یہ کیسی غزل ہے؟ ختم کیجئے۔ ختم کیجئے۔ یہ کیسا مشاعرہ ہے؟ آخر تجم کہاں ہیں۔ خاؔر صاحب کہاں ہیں؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔'' غرضیکہ موصوف نے اتنے پہلو بدلے اور اس قدر جُز بز غضب ناک اور بے بس دکھائی دینے لگے کہ مجھے خود ان پر ترس آ گیا اور ساتھ ہی اس قدر خوفزدہ بھی ہوا کہ مشاعرے سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن اور وہاں سے غازی آباد اپنے مستقر پر پہنچ گیا۔ کئی روز بعد خار سے مشاعرہ کی پوری کیفیت معلوم ہوئی جس کے سنانے کے لیے نہ وقت ہے اور نہ گنجائش۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ پھر ایک طویل عرصے کے لیے دہلی کے مشاعرے مجھ سے چھوٹ گئے اور جب ایک زمانے کے بعد پنڈت جی سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو میں نے بہت جھک کر معصومیت کے ساتھ آداب عرض کیا اور مشاعرے کا مسئلہ چھڑتے ہی سارا الزام سوتی برہم سروپ خاؔر پر رکھ دیا اور اپنے آپ کو بالکل بے گناہ ثابت کر کے پھر ان کا نہایت ہی سعید و رشید بھتیجا بن گیا۔''

۵/نومبر ۱۹۶۱ء حیدرآباد (اے پی)

نوٹ: یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ جب میں اس صفحہ کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں تو آج تاریخ ۵/نومبر 2005ء ہے۔ (راقم الحروف۔ تقی عابدی)

پیغامات اور تاثرات

نجم آفندی مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں

(منثور اور منظوم)

1- جناب سہیل آفندی (اکلوتے بیٹے)
2- پروفیسر احتشام حسین
3- جناب سید آل احمد رضا ایڈوکیٹ
4- جناب سہیل بنارسی
5- جناب فیض محمد گوہر
6- ڈاکٹر عسکری بن احمد
7- جناب احسن عمرانی مدیر معارف اسلام
8- جناب زائر فتح پوری
9- پروفیسر وزیر الحسن عابدی
10- جناب احسان دانش
11- جناب سید قیصر زیدی
12- جناب قیصر بارہوی
13- جناب سیّد ہاشم رضا صاحب
14- ڈاکٹر اسد اریب
15- ڈاکٹر مسعود رضا خاکی
16- جناب مضطر حیدری
17- جناب سید جلیس ترمذی
18- جناب شمشاد حسین رضوی
19- مولانا طالب جوہری
20- جناب جوش ملیح آبادی
21- جناب مالک رام
22- جناب سیّد فاتح واسطی

23- جناب محمد صدیق (مدیر ہفت روزہ رضاکار)
24- جناب شائق انبالوی (مدیر ہفت روزہ اسد)
25- مدیر (مجلّہ پیام عمل لاہور)
26- مدیر (مجلّہ المبلغ سرگودھا)
27- علاّمہ عباس حیدر عابدی
28- جناب افضال حسین نقوی
29- جناب سید معز الدین قادری
30- مولانا آغا مہدی لکھنوی
31- جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
32- ڈاکٹر سبط حسن
33- جناب سخن فتح پوری
34- جناب صبا اکبر آبادی
35- جناب سیّد فیاض علی
36- ڈاکٹر احسن فاروقی
37- جناب امیر امام حُر
38- جناب اختر انصاری اکبر آبادی
39- جناب شیخ انصار حسین
40- جناب سید عاشور کاظمی
41- جناب نسیم امروہوی (قطعہ تاریخ وفات)
42- جناب رئیس امروہوی
43- جناب شاہد نقوی
44- جناب فیض بھرت پوری
45- جناب نفیس فتح پوری
46- جناب زاہد فتح پوری
47- محترمہ رابعہ نیہاں
48- جناب ساحر لکھنوی
49- جناب کسریٰ منہاس
50- جناب نیساں اکبر آبادی
51- ڈاکٹر بلال نقوی
52- جناب قسیم امروہوی
53- پروفیسر فیضی
54- جناب خلش پیر اصحابی (قطعہ تاریخ وفات)
55- جناب کرار حیدر راہی
56- علاّمہ سید ابن حسن نجفی
57- علاّمہ مرزا یوسف حسن لکھنوی
58- الحاج محمد بشیر انصاری
59- مولانا پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری
60- علاّمہ حکیم محمد گیلانی
61- جناب سید ریاض الرحمٰن
62- جناب منظر
63- جناب گوہر جعفری
64- جناب فقیر سیّد فقیر حسین شیرازی
65- جناب تسلیم ترمذی کربلائی
66- محترمہ بیگم سیدہ بلقیس اعجاز
67- جناب آر آر سکسینہ صاحب الہامؔ
68- ڈاکٹر اسدؔ انصاری
69- جناب بشیر احمد ارمانؔ
70- جناب اکملؔ آلہ وری
71- جناب ادیبؔ حیدر آبادی
72- جناب باقرؔ امانت خوانی

73- جناب سید شاہ نصیر الدین بسمل

74- جناب ابوالحسن عابدی حسن

75- جناب خورشید جنیدی

76- جناب عرب شاہ خالد کشمیری

77- جناب سید ارشاد احمد دراک

78- جناب شاہد حیدری

79- جناب طاہر عابدی

80- جناب طالب اسدی

81- جناب میرزا عادل بجمی

82- جناب علی فطرت

83- جناب فرید شرنی

84- جناب قدر عریضی

85- جناب قائم جعفری

86- جناب محمد عبدالکریم ماہر

87- جناب میر محمد علی وفا

88- جناب وقار جعفری

89- جناب آغا ہاجر

سب کہتے ہیں شاعر ہے دربارِ حسینیؑ کا

پیغامات اور تاثرات

1۔ جناب سہیل آفندی (اکلوتے بیٹے):

دردِ دل اپنا کوئی افسانۂ باطل نہ تھا
ہم نے چُپ سادھی نگاہ اہلِ عالم دیکھ کر

یہ شعر غیر مطبوعہ ہونے کے علاوہ صرف مجھے معلوم ہے۔ پندرہ سال پہلے مجھے لکھوایا تھا کہ میری لوحِ تربت پر لکھوا دینا۔ ان کے آخری دنوں کی کیفیت اس میں سموئی ہوئی ہے۔ خلوص کارواں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ابّا نے قوم کے لئے جو کچھ کیا ہے اُسے مختصر طور پر بیان کرنے کے لئے بھی ایک مقالہ نہیں بلکہ ایک کتاب چاہیے۔ پچھتر سال خدمت کی ہے۔

2۔ پروفیسر احتشام حسین: جناب نجم آفندی دورِ جدید کے اُن شعرا میں سے ہیں جنھیں بجا طور پر استادی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی عمر ریاضِ سخن میں بسر ہوئی۔ انھوں نے بچپن ہی سے اکبر آباد کی علمی اور ادبی مجلسوں میں شریک ہوکر زبان و بیان کے لطیف مسائل پر غور کیا اور انھیں برتا ہے۔ اپنے والد مرحوم کے استادانہ رنگ سے کسبِ فیض کرنے کے علاوہ انھوں نے اساتذہ کا کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں ابتدا ہی سے ایسی پختگی اور ہمواری پیدا ہوگئی ہے جو بڑے ریاض کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں یہ بات ہر

ہر لفظ سے نمایاں ہوتی ہے لیکن وہیں اس بات کا پتہ بھی دیتی ہے کہ اس والہانہ عقیدت کی بنیاد گہرے شعور اور استدلالی تیقن پر ہے۔ عقیدت کا عرفان گہرائی، شدت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جو نجم آفندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا عقیدہ علم و عرفان کا آفریدہ ہے۔ ان کا یقین ادراک و شعور کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے جسے ان کی جدت طراز طبیعت ایک ایسے زاویہ سے پیش کر دیتی ہے جس پر دوسروں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔

3۔ **جناب سید آل احمد رضا ایڈوکیٹ:** دنیا سے چلے جانے والوں کی فہرست میں بہت بڑا اور مدتوں یاد کئے جانے والے نام کا جو اضافہ ہوا ہے وہ عزائے شاہ شہیداں علیہ السلام کے سلسلے میں بہت یاد آئے گا۔

4۔ **جناب سہیل بنارسی:** نجم ہماری نگاہوں سے اوجھل ضرور ہو گئے لیکن دل ان کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔ نجم سپہر شاعری کا درخشاں نجم مزید روشنی کا محتاج نہیں۔ ان کے کلام کی حرارت ان کی زندگی کی ضمانت ہے۔ نجم اپنی ہی روشنی میں اپنے ممدوحین سے جا ملے جہاں روشنی ہی روشنی ہے۔ زندگی ہی زندگی ہے۔

5۔ **جناب فیض محمد گوہر:** ''نجم آفندی کی موت سے روح کو وہ صدمہ اور قلب کو وہ دھچکا ہے کہ احساس و ادراک تسلیم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہ ایک فرد واحد کا انتقال نہیں بلکہ ایک گراں قدر ادبی نسل ایک فکری دور ایک عہد ساز کائنات اور قومی ادارہ کی موت ہے۔

6۔ **ڈاکٹر عسکری بن احمد:** نجم آسمانی کا علیؑ کی جستجو میں اُترتا سنتے آئے ہیں۔ آسمانی شاعری کے درخشندہ ستارے اسم با مسمّیٰ نجم آفندی بھی اتر گئے۔ کہاں۔ لحد میں جس کی جستجو تھی اسی کے پاس پہنچ گئے۔

ہمیں توفیق دے خیبر شکن خیبر کشائی کی
کہ اب ہر اک قدم پر زندگی میدانِ خیبر ہے

7۔ **جناب احسن عمرانی (مدیر معارف اسلام):** جہاں عزائیہ ادب کے آسمان پر انیسؔ و دبیرؔ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے وہاں بغیر کسی مبالغے کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نجمؔ آفندی نجم بن کر دمکتے رہے اور دمکتے رہیں گے۔

8۔ **جناب زائرؔ فتح پوری:** نجمؔ اتالیق تھا، عالم تھا اور شاعر تھا۔ اس کے اخلاقی درسیات تحقیقی عوامل اور فکری معجزات میں فیشن نہیں، الجھاؤ نہیں، روایت پرستی نہیں، اظہار و ابلاغ کا فقدان نہیں، اس کا ذہن پختہ ہے۔ حقائق اس کے گرد ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کا نظریہ واضح عقائد، پایندہ اور فکر و نظر بلند ہیں۔

9۔ **پروفیسر وزیر الحسن عابدی:** نجمؔ آفندی مرحوم و مغفور کی رحلت سے وہ شہنشاہ سخن دنیا سے اُٹھ گیا جس نے عصر حاضر میں دینی اردو شاعری کی ہر صنف کو تاج پہنا کر عالمی مسند پر بیٹھا دیا۔

10۔ **جناب احسان دانش:** میں ان کے اخلاق اور کمال شاعری کا معترف ہوں۔ انھوں نے عزائی ادب میں جرأت و ہمت، جوش و استقلال کا جو بے پایاں اضافہ کیا، اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔

11۔ **جناب سید قیصر زیدی:**

زندگی نے مار ڈالا نجمؔ کو
نجمؔ کی شیوا بیانی اب کہاں

نجمؔ آفندی شاعرِ اہل بیت، محبِ اہل بیتؑ، مصلح و ناصح قوم ایک انقلاب پسند شاعر اور قوم پرست کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اور خصوصاً نوجوان نسل اور پُرخلوص لوگوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نجمؔ صاحب اقلیمِ سخن کے تاجداروں میں آسمانِ شہرت پر نجمؔ اکبر کی مانند دمک رہے ہیں۔ نجمؔ صاحب تاریخ اسلام کے عظیم مفکر جنھوں نے فکر و خیال کی نئی راہیں کھول دیں اور علم و عقل کی قندیلیں روشن کیں۔ انھیں دینی بصیرت بھی حاصل تھی اور عرفانِ شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حکمت ہے معرفت ہے سچائی ہے،

گہرائی ہے۔ انھیں خیالات کا اظہار نجم صاحب کی زبانی۔

رفعت ترے کلام کی عرش آشنا ہے نجم
کھیلی ہے فکر دامن برق و سحاب میں

نجم صاحب مرحوم ایک فطری شاعر تھے جو اپنے ماحول سے متاثر تھے۔ نجم صاحب ایک ایسے شاعر تھے جو مجازی مشاہدات کو حقیقی معنی مہیا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں قدرت کی طرف سے ایسی قوت ودیعت کی گئی تھی جس سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے قالب میں ڈھالتے تھے کہ ہماری آنکھوں میں اس کا سماں سا بندھ جاتا ہے۔ ہمارے احساسات مائل فکر ہوجاتے ہیں۔ قلوب ان کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ اپنے الفاظ کی بندش اور بیان کی روانی سے ہمارے سامنے ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ سامع کو ان کے اشعار اس کی اپنی زبوں حالی کا نوحہ معلوم ہوتے ہیں۔

نجم صاحب مرحوم کی شاعری تخیل کو استحکام دیتی اور فکر کو استوار کرتی ہے۔ ان کے کلام کی بنیاد اور اساس اسرار حیات کی ترجمان پر ہے۔

تربیت کی ذہن انساں کی غم شیریں نے
صاحب دل بن گئے جو غم کے خوگر ہوگئے

ملٹن نے شعر کی تین خصوصیات کو لازمی قرار دیا ہے۔ اول سادگی، دوئم اصلیت اور سوئم تحریک نجم صاحب کا کلام ان تینوں اقدار پر سچا اور قادر نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں سادگی اس درجہ ہے کہ وہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے تیر ونشتر کا حکم رکھتا ہے اور دلوں میں کرب کو جلا دیتا ہے اور ایسی تڑپ پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والا مزید تشنگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اصلیت سے تو انکار محال اور تحریک ان کے کلام کی روح ہے۔

جلتی ہوئی وہ ریت وہ سجدے وہ تشنگی
وہ نینوا کی خاک پہ رخسار آپ کا

شکر خدا زبان پہ یادِ خدا میں دل
تیغوں کی چھاؤں پیکرِ خونبار آپ کا

ان کے کلام میں افسردگی وتسلیم ورضا کی علامات بھی نمایاں ہیں۔ ان کی نظر میں انسانی اقدار کی پستی اور ملت کی کمزوریاں قابل تحقیر نہیں بلکہ وہ ان سے متاثر ہو کر ان کے غم میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں اور ان سے نجات کو لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ ملت کے سچے ہمدرد اور ناچیز کی رائے میں ملت کے حقیقی مزاج شناس تھے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر کبھی جذبہ ملی کو فروغ ملتا ہے کبھی طبیعت فکر کی طرف رجوع ہوتی ہے کبھی پند و نصح کے دفتر اور ممدوح علیہ السلام کی ثناء پر آمادہ ہوتا ہے۔

کلامِ حجم تقلید پسندی سے آزاد ذاتی مشاہدات ضروریات اور خیالات کا مظہر ہے۔ ان کی شاعری دور حاضر کے شعراء کرام اور نوجوانوں کے لیے ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان حالات میں جبکہ دنیا ادب برائے ادب سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتی ہے حجم صاحب کا کلام اسلوب میں سادگی کے باوجود پُرکشش اور پُراثر ہے۔

یوروپ کا محقق کہتا ہے کہ ''مشاغل دنیوی کے انہماک سے بیزاری اور دین کی طرف رجوع کرنے کا واحد ذریعہ شعر وسخن ہیں۔'' ماضی کے تجربات حالی، شبلی، اقبال اور جوش کی موجودہ کاوشیں صداقت کے لیے کافی ہیں کہ قوموں کو بیدار اور آمادہ عمل کرنے میں اشعار شمشیر بے نیام کا کام کرتے ہیں۔

گو کہ دور حاضر میں حجم صاحب کا کلام سوسائٹی کی اقدار اور بدلی ہوئی روشوں کو جھنجھوڑنے کے لیے ناکافی ہے مگر پھر بھی یہ سعی رائیگاں نہ جائے گی۔ ان کے کلام کی اشاعت وتشہیر میں بزم حجم کے ذریعہ سے باقر صاحب نجف صاحب حسیب صاحب اور ضمیر اختر نقوی کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ حجم صاحب کے کلام کی اشاعت ملت کی زبوں حالی میں مرہم کا کام کرسکتی ہے۔

حجم صاحب نے بے شمار رباعیات، قصائد اور نوحے کہے۔ یہ سب کے سب

ان کی شخصیت اور جذبات کی واضح عکاسی کرتے ہیں۔ سادگی، گھلاوٹ، روزمرہ کے الفاظ کا استعمال، قافیوں کی نشست مصرعوں کی برجستگی بیان کی حقانیت ان کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

نجم صاحب کے کلام کا کچھ حصہ ہندی میں بھی ہے جو ہندستان کے قیام کے دوران ان کے مشن اور مقصد کی وضاحت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انھوں نے نہایت آسان اور سادہ ہندی میں تبلیغ مشن حسینیؑ میں اپنے ہندی کلام کو بھی حصہ دار بنایا۔ وہ دوسرے مذاہب تک اپنے پیغام کو پہنچانا لازمی سمجھتے تھے۔

نجم صاحب کا کلام تبلیغ کے ساتھ ساتھ درس ہے دعوتِ عمل ہے۔ ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نہایت پُر درد اور موثر صدا ہے۔ آپ کے کلام کے مجموعے خوابیدہ عبرت افراد اور مردہ دلوں کو بیدار کر کے از سر نو تازگی اور مقصدیت بخشنے والے نوحوں اور سلاموں رباعیات وقصائد پر مشتمل ہے۔ ان کا کلام عرصہ دراز تک مخلص اور دردمند لوگوں میں تازگی کو برقرار رکھے گا۔

سب کہتے ہیں شاعر ہے دربار حسینیؑ کا
نجم اپنی حقیقت سے غافل نظر آتا ہے

12۔ **جناب قیصر بارہوی**: اگر گذشتہ پچاس برس میں کسی عظیم سخنور کی جستجو کی جائے تو میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہنے کو تیار ہوں کہ شاعر اہل بیتؑ حضرت نجم آفندی پوری آب وتاب کے ساتھ کشور سخن پر حکمراں نظر آتے ہیں۔

13۔ **جناب سید ہاشم رضا صاحب**: جناب نجم آفندی مرحوم کی موت سے اردو ادب کا ایک اور درخشاں ستارہ ڈوب گیا لیکن اس نے جو روشنی پھیلائی ہے وہ تا ابد قائم رہے گی۔

مدّاح اہل بیت ہے حق کی نوا یہ نجم
زندہ ہے اور زندہ رہے گا سدا یہ نجم

14۔ **ڈاکٹر اسدار یب**: اردو شاعری نے جو نئی کروٹیں لی تھیں، اگر عزائی ادب بھی ان کروٹوں

کے رُخ نہ ہوتا تو شاید انقلاب فکر اُسے کچل ڈالتا نجم آفندی نے اپنے نوحوں کے ذریعہ شاعری اور زندگی کے نئے رشتوں کی خبر دی۔

15۔ **ڈاکٹر مسعود رضا خاکی:** علامہ نجم آفندی دنیائے ادب کی وہ عظیم ہستی ہیں جن کے سامنے ہر صاحب فکر ونظر ہمیشہ مودب رہے گا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے اور وہ لمحات جو میں نے ان کی خدمت میں بسر کئے ہیں میری پوری زندگی کا ماحصل ہیں۔

16۔ **جناب مضطر حیدری:** نجم آفندی کی موت قوم کے لئے زبردست المیہ ہے۔ ان کے کلام میں درد ہے، سوز ہے اور ایک ایسا پیغام ہے جس میں بلا کا درد ہے۔

17۔ **جناب سید جلیس ترمذی:** ہائے وہ آفتاب شعروسخن ڈوب گیا۔ افسوس نجم شعروادب، کوکب علم وفن، سہیل زبان وبیان، برجیس بحور وعروض اور مہتاب صحافت موت کے دبیز پردوں میں روپوش ہوگیا۔ اب کسے شاعرِ اہل بیتؑ کہیں گے۔ اب کون نقیبِ آل محمدؐ کہلائے گا۔ بھاشا کے رسیلے شبدوں میں کربل کی روپ کہانی کون سنائے گا۔

دنیا کی مایا کوئی نہیں، کچھ نوتے ہیں کچھ دو ہے ہیں
نجمی یہی مایا لائے تھے نجمی یہی مایا چھوڑ گئے

18۔ **جناب شمشاد حسین رضوی:** نصف صدی تک کربلائی ادب کے لئے جو مشعل نجم آفندی نے روشن رکھی اس کی روشنی میں آنے والے نوجوان دانشوروں کو اپنی راہ متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔

19۔ **مولانا طالب جوہری:** میری ذاتی رائے کے مطابق حضرت نجم آفندی نصف صدی تک اردو رثائی ادب پر حکومت کرتے رہے اور نسل نو کا کوئی ایسا مرثیہ نگار نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے متاثر نہ ہوا ہو۔

20۔ **جناب جوش ملیح آبادی:** میں ان کے اشعار کا لوہا مانتا تھا اور میرے نزدیک مرثیہ اور منقبت میں انھیں وہ مقام حاصل تھا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

21۔ **جناب مالک رام** : میدان خالی ہو رہا ہے اور کوئی ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

22۔ **جناب سید فاتح واسطی**: وہ عظیم انسان جس نے تقریباً پون صدی تک مدّاحی معصومین کی اس عالم غربت میں اس کی موت یقیناً سانحہ ہے۔ اس صدی میں ان کے پائے کا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ مرحوم و مغفور واقعی مجتہد الشعرا تھے۔

23۔ **جناب محمد صدیق (مدیر ہفت روزہ رضاکار لاہور)** شاعرِ اہل بیتؑ حضرت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ نے شاعری کو تو چار چاند لگائے ہی ہیں، مرحوم نے نثر میں بھی اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔''

24۔ **جناب شایق انبالوی (مدیر ہفت روزہ اسد لاہور)**: علامہ نجم آفندی کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا تھا وہ زندگی بھر مدحِ اہل بیتؑ اور نشرِ حسینیتؑ کرتے رہے۔ ان کے نوحے اور سلام اس قدر مقبول ہوئے کہ زبان زد خاص و عام ہیں وہ شعر و سخن میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

25۔ **مدیر (مجلہ پیام عمل لاہور)**: نجم آفندی 21 دسمبر 1975ء بروز شنبہ اس دنیا سے چل بسے۔ وہ نصف صدی سے قومی شاعری کی بساط پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ پاکستان میں مہمان تھے، پردیسی تھے اور اپنے وطن سے دور تھے۔ ان کے پاس قومی شاعری کے علاوہ کوئی اور دولت نہ تھی۔

26۔ **مدیر (مجلہ المبلغ سرگودھا)**: مرحوم کی شخصیت تعارف کی محتاج تو نہیں ہے۔ ملّت جعفریہ کا ہر شخص ان کے نام اور افکار سے واقف ہے۔ شاید ہی کوئی گھرانہ ایسا ہوگا جہاں ان کے تصنیف کردہ نوحے نہ پڑھے جاتے ہوں۔ ان کا کلام شہرت دوام رکھتا ہے۔ اور قوم میں ان کو شاعرِ اہل بیتؑ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

27۔ **علامہ عباس حیدر عابدی**: یہ بات کہتے ہوئے بے اختیار نجم آفندی کا نام زبان پر آتا ہے جنہوں نے اپنی 50 برس کی شاعری میں پیغام آلِ محمدؐ اور ملت جعفریہ کی وہ ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی اور ذہنوں کے لیے فکر کا وہ سرمایہ فراہم کیا کہ جس نے

حسینیؑ آواز کے چہرہ کی تازگی کو باقی رکھا۔
ان کی شاعری نے کربلا سے قوم کو عملی جدوجہد کا سبق حاصل کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی غم کے کیف سے اپنی شاعری کو دور نہیں ہونے دیا۔ مثلاً ان کا ایک نوحہ۔

اے خدا کے بندوں میں منتخب خدا والو
تختِ امّما والو تاج ہل اتی والو
شانِ مصطفیٰؐ والو وضع مرتضیٰؑ والو
کیا وفا پہ جانیں دیں تم نے اے وفا والو
ہائے کربلا والو ہائے کربلا والو

کا اک اک شعر جہاں ایک طرف کربلا کی کیفیتِ غم میں ڈوبا ہوا ہے، وہاں پڑھنے اور سننے والوں کے لئے جذباتی اور عملی مہمیز کا کام بھی انجام دیتا ہے۔
نجم آفاقِ شیعیت کا ایک ایسا ستارہ تھا کہ جو نصف صدی تک اپنی ضیاء پاشیوں سے دنیائے شیعیت کو منور کرتے رہنے کے بعد اس بے سروسامانی میں ڈوب گیا کہ ملّت جعفریہ کو اپنے اس سرمایۂ گراں بہا کے نقصان کی خبر تک نہ ہوئی۔
قوم کو چاہیے کہ نجم کے کلام پر تحقیقی کام کیا جائے۔ ان کی آواز کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ نجم کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے ان کا ایک ہی شعر کافی ہے کہ

دنیا یہ نہ ہوگی مگر اسلام رہے گا
شبیرؑ بہرحال تیرا نام رہے گا

28۔ **افضال حسین نقوی:** صرف یہ کہہ دینا کہ نجم نے صنف نوحہ سے حسینیت کی تبلیغ کا کام لیا۔ دراصل ایک پورے دفتر کو ایک بے ہنگم فقرے میں بند کردینے کے برابر ہے۔
نوحہ جو اصولی طور پر بین و بکا ہے، جس میں درد و غم کا رچاؤ، اس کی روح ہے، کیا کوئی صاحب فن ایسا بھی حشر آسا اور قیامت بردوش ہوسکتا ہے جو نوحہ جیسی

نازک، کومل اور چھوٹی موٹی زمین پر اتنی بلند و بالا تبلیغ کی عمارت کھڑی کر سکے اور اس فرض سے عہد برآ ہو سکے، تو میں عرض کروں گا وہ صرف اور صرف نجم آفندی ہے جس نے نوحہ کو نہ صرف اس جدت سے آشنا کیا بلکہ اس ندرت کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ یہ سچ ہے بغیر گداز دل اور چشم نم کے کوئی تخلیق کمال فن کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ میرا ایمان ہے کہ جب تک حسین کا غم باقی ہے، نجم کے یہ نوحے کبھی نہیں مٹ سکتے۔ نجم اور نجم کے نوحوں کو بقائے دوام حاصل ہے۔

29۔ **جناب سید معز الدین قادری:** ''نجم صاحب پر جیسا کام ہونا چاہیے تھا اب تک کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی حیات اور ادبی کارناموں پر تفصیل سے گفتگو کے بغیر اردو ادب کی تاریخ میں خلا رہے گا۔

30۔ **مولانا آغا مہدی لکھنوی:** ''والنجم اذا ھوی برصغیر کے سرخیل شعراء عظام میں حضرت نجم آفندی کا نام ان کی ادبی خدمات قوم کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ بڑے یار باش، وضع دار، مجسمہ خلق، دیرینہ روابط کو بھولتے نہ تھے۔ دو بار غریب خانہ پر تشریف لائے۔ کراچی کی گوناگوں شخصیتوں نے مشورہ دیا کہ وہ بغیر ان کی اجازت یا کم از کم اطلاع کے کسی قومی پلیٹ فارم پر قدم نہ رکھیں، منبر پر نہ جائیں۔ یہ قول و قرار خود دار ذات پر بہت شاق ہوا اور مجھے دردِ دل بتاتے ہوئے کراچی چھوڑ دی۔ لاہور چلے گئے۔

ان کی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ یہی ہے کہ کلیات حالات زندگی کے ساتھ جلد طبع ہوں۔

نجم آفندی کو میں، شہر اور قوم کا سب سے بڑا شاعر ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ وہ مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ، یادِ اسلاف کا مرکز، قدیم روایات کے گنجینہ تھے۔ اہلِ قلم ان کی وفات حسرت آیات پر جو کچھ لکھ چکے، وہ ان کی شخصیت کے لحاظ سے تھوڑا اور عظمت فن کو دیکھتے ہوئے قلیل ہے۔

وہ صرف آزار خیال شاعر نہ تھے بلکہ ان میں دینی جذبات، مذہبی جوش بدرجہ اتم

تھا اور یہ خصوصیات، میرا خیال ہے کہ توارث سے اُن میں نظر آئے اس لیے کہ وہ ذاتی طور پر شعر وسخن میں اس قلم رو کے نمایاں انسان نہ تھے بلکہ اسلاف میں اُن کے، کئی ہستیاں دنیائے ادب میں نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ ان کے ادبی اور علمی اور مذہبی خدمات سورج کی روشنی سے زیادہ چمکتے ہیں۔

ننھیالی سلسلہ منیر شکوہ آبادی تک پہنچتا ہے۔ یہ نوید علم افزا تو اخبارات میں نشر ہوئی، مگر مجھ سے خاندانی رواسم قدیمانہ کو دیکھتے ہوئے مرنے والے نے اپنی آخر ملاقاتوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا ددھیالی سلسلہ مرزا فصیح مرحوم شاعر تک پہنچتا ہے۔

نجم آفندی کی یہ خصوصیت تھی جو ممدوح نے مجھ سے بہ فخر بیان کی۔ حجتہ الاسلام مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ (جونپور) نے کسی شخص کو اپنی غزل نہیں سنائی۔ نجم آفندی وہ تھے کہ قبلہ وکعبہ نے اپنی غزل کے اشعار سنائے۔ آیۂ قرآن سے اپنے تاثرات کو شروع کیا تھا اور آیہ قرآن پر ختم کرتا ہوں۔ منھم من قضیٰ نحبہ و منھم من ینتظر۔

31۔ **جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی:** جناب نجم مرحوم اردو ادب کے نامور شاعر تھے۔ شعر و ادب کی میراث ان کے اجداد سے حصے میں آئی تھی۔ ان کے بزرگ مذہبی اقدار کے حامل اور دینی جذبات کے ترجمان تھے۔ مرزا جعفر علی فصیح، صرف مرثیہ گو شاعر نہ تھے بلکہ بڑے دین دار بزرگ بھی تھے۔ انھوں نے مکّے ہجرت کی اور حضرت ابو طالب رضوان اللہ علیہ کے مزار کی تعمیر اور اس کے وقف، مدینہ منورہ کی خدمت اور وہاں کی سکونت بھی اختیار کی۔ چونکہ حکومتِ ترکیہ اس وقت حرمین کی مالک بنی بیٹھی تھی اور بزم صاحب کو حرمین کی جدی وراثت سے کرایہ وغیرہ ملتا تھا۔ لہٰذا ان کی مراسلات میں ترکوں کی رسم کے مطابق آفندی لکھا جاتا تھا۔ یہی ''آفندی'' نجم صاحب نے اپنے تخلص کے ساتھ علامت و امتیاز کے لیے باقی رکھا۔ اس کے پس منظر میں ان تعلقات

حرمین کا اشارہ تھا جو انھیں بزرگوں سے ملے تھے۔

نجم صاحب مرحوم کا گھر آگرے میں تھا۔ کٹرہ حاجی حسن علی اور گلاب خانہ کی محل سرا میں انھوں نے ہوش سنبھالا۔ یہ گھر اور محلّہ، دینی اور مذہبی لحاظ سے آگرے کا مرکز تھا۔ ان کے خالو جناب تقدس مآب مولانا سید ذاکر حسین صاحب قبلہ بارہوی علم وعمل میں سلمانِ زمانہ اور ابو ذر عہد تھے۔ نجم صاحب نے ان کے فیوض سے اپنے شعور کو آراستہ کیا اور عملی دعوت کو اپنا شعار بنایا۔ طبع خداداد سے بہت کم سنی میں شاعری شروع کی اور شروع ہی سے حقیقت پسندی اور اصلاح ملک وملت کو اپنا مسلک بنایا۔ شیعہ کانفرنس کے اسٹیج پر قومی زندگی کے منصوبے بنتے تھے۔ نجم ان اجتماعات میں اپنی قومی نظموں سے جوانوں کا لہو گرماتے تھے۔ قوم کو آگے بڑھنے، کچھ کرنے اور باعزت زندہ رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ شیعہ ایجی ٹیشن میں ان کی شاعری نے قوم کو حوصلہ دیا۔ لوگوں کی ہمت بڑھائی۔ وہ خود جیل گئے اور جب رہائی پائی تو ان کے نوحوں میں ایک نیا جذبہ ابھرا۔

نجم کے نوحے بیسویں صدی کے ربع اول سے مشہور چلے آرہے تھے۔ حیدرآباد دکن سے کشمیر تک جوانوں کے حلقوں میں ان کے ولولہ انگیز شعر گونج رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد تو شاید ہی کوئی نوحہ خوانی ہوتی ہو جہاں ان کے نوحے نہ پڑھے جاتے ہوں۔ وہ نوحہ گوئی کے منفرد رہنما قرار پائے۔ ان کے سادہ، جوش آفریں، خطیبانہ اشعار نے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لوگ ان کے اسلوب میں نوحے لکھنے لگے۔ مگر ان کی بڑائی تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ ان کا حلقہ ارادت بڑھتا گیا۔ انھوں نے ہندی میں نوحے لکھ کر تبلیغی دائرے کو مزید وسعت دی۔ انھوں نے بین اور بکا میں، جذبہ وعقیدت میں صدا بلند کی، ماتم اور سینہ زنی کے عالم میں نجم کے نوحے موضوعاتی ہونے لگے۔ ''دھرم پربت'' ''تقدیر حسینؑ'' ''قومی نشان'' ''اُسوۂ حسینؑ'' ''پریم پنتھی'' ''حسینؑ سیوا''

''قوم کا بناؤ'' جیسے قیامت خیز منظر اور ہمت آفریں نوحوں نے خطابت و پیام کو نیا لہجہ اور عزائی ادب کو سرمایہ دیا۔

نجم نے رباعی، قطعہ، سلام، مرثیہ، نظم ونثر، قصیدہ ومثنوی ہر صنف ادب میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ نئی نسل کو نئے لہجے میں مخاطب کیا، مگر جوانوں نے اب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ان کے فن، ان کی محنت کے ساتھ انصاف یہ تھا کہ ان کا کلیات چھپتا اور ان کی زندگی پر کتاب لکھی جاتی تا کہ قوم کا ایک نقیب تاریخ کی زندگی پاتا اور عقیدت کے آبِ حیات سے جاودان ہو جاتا۔

32۔ **ڈاکٹر سبط حسن**: تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی میں محرم اور چہلم کا جلوس ہندوؤں کے محلے ''بیچ گھرے'' سے گزرتا تھا تو ماتمی دستے ہندی نوحے پڑھتے تھے۔ یہ تاسیس پاکستان سے قبل کی بات ہے۔ جو نوحہ سب سے زیادہ مقبول ہوا تھا، جو ہندوؤں کی زبانوں پر بھی ایام عزا میں سنا جاتا تھا، وہ یہ تھا۔

''اندھیارا پاپ کے بادل کا سنسار پہ جب چھاجاتا ہے''

یہ نوحہ نجم آفندی کا تھا جس کو حفیظ صاحب مخصوص انداز میں پڑھتے تھے اور میں نے خود دیکھا کہ اس نوحہ کے شعروں پر جو سامعین میں گریہ و بکا کا شور گلی کوچوں میں ہوتا تھا، اس میں ہندو مسلمان سب شامل ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی زبانوں پر نجم آفندی کے نوحوں کے بول تھے اور اسی زمانے سے یہ محسوس ہوا کہ ان کے کلام میں کس قدر درد وسوز وگداز ہے کہ اپنے تو اپنے، بیگانے بھی متاثر ہوئے۔

33۔ **جناب سخن فتح پوری**: نجم میں بعض ایسی خصوصیات تھیں جو ان کے ہم عصروں میں نہ تھیں۔ مثلاً ہندی زبان میں جو نوحے انھوں نے کہے، وہ عدیم النظیر ہیں۔ ان کے شعر میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو آواز رنج و الم میں ڈوب کر زبان پر آئے یا جس کا تعلق دکھے ہوئے دل سے ہو اور جب وہ شعر پڑھا جائے تو تمام فضا کو

غم آلود کردے۔ اسی طرح اردو زبان میں جو بھی کہا وہ لاجواب کہا۔ ایک ایک مصرع میں فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن ہے۔ مثلاً مصرعہ

علیؑ کا نام، سن زہراؑ کا اور صورت پیمبرؐ کی

نجم آفندی آسمانِ ادب کا ایک ایسا درخشندہ ستارہ تھا جو تہذیب وتمدن کا شاہکار ہو، جس میں طبیعت کی للکار، فطرت کی پکار، خلق ومروت کا آئینہ دار، ولائے آل میں سرشار، جسم نحیف وزار مگر برائے شرکت بزم ولا بے قرار، قید مسافت سے بیزار، جہاں بلائے چلنے پر آمادہ وتیار۔ ایک غیور، باشعور، نازک مزاج ایسا شاعر جس کے کلام میں نازک ولطیف استعارے، حقیقت کے اشارے، جلوۂ حق کے نظارے ہیں۔

پہلو میں حساس دل، جس میں درد، درد میں سوز وگداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ زبان میں انتہائی صفائی، بیان میں حد درجہ کی دلکشی، زورِ کلام میں فصاحت و بلاغت، خیالات میں سادگی وسلاست۔ جذبات میں شیفتگی و بلندی، طبیعت میں دردمندی، صحت محاورہ کا خاص خیال اور ادائیگی میں برجستگی، ادبیت کے لحاظ سے یہ وہ گوہر صفات ہیں جو مرحوم میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ انھیں صفات نے مرحوم کو شرف انفرادیت سے مشرف کیا۔ سچ ہے:

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہ حقیقت ہے کہ نجم آسمان شاعری کا وہ ستارہ تھا جس کے ڈوبنے سے بزم ملت میں اندھیرا ہوگیا۔''

34۔ **جناب صبا اکبرآبادی:** ''نجم آفندی کا شمار شیعہ طبقہ کے ان مشاہیر شعرا میں تھا جن کے کلام نے بڑا تبلیغی کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتیں، مناقب ومصائب اہل بیتؑ کے بیان کے لیے وقف کردی تھیں، ورنہ وہ دورِ جدید کے بہت سے ایسے نام آوردہ شعرا سے جو صنف اول کے غزل گو شمار ہوتے ہیں، بہت بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے کہ ان کے پایہ کمال تک پہنچنے کے لیے

بڑے مراحل طے کرنے کی ضرورت ہے لیکن ان کے جذبہ ولا کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بجائے ایک غزل گو شاعر کے وہ دنیا کے سامنے شاعر اہل بیتؑ کی طرح آئے، حالانکہ اس طرح ان کا حلقہ تعارف محدود ہوکر رہ گیا لیکن ولائے اہل بیتؑ میں انھیں اپنے اس عمل کو اس روشنی میں دیکھنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

نجم آفندی نے اردو شعر و ادب کی ساٹھ سال تک اتنی خدمت کی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو ان کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا بیشتر کلام ان کے استغنا اور عدم توجہی کی وجہ سے یا تو ضائع ہوگیا یا دوسرے شعراء کے نام سے منسوب ہوا۔

نجم آفندی کی موت اردو ادب کے ایک درخشندہ ستارے کا غروب ہے۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مقام بلند پر سرفراز فرمائے۔''

35۔ **سیّد فیاض علی:** ان کے اشعار تو ہندوستان پاکستان کی افق شاعری پر دھنک رنگوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے نوحے مجالس میں آہ و فغاں کا وہ طوفان اٹھایا کرتے ہیں کہ زمین سے آسمان تک ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے۔

حضرت نجم آفندی بھی وطن عزیز پاکستان میں ستارۂ شام بن کے آئے تھے۔ ایک ایسا ستارہ بن کر جو مہیب رات کی تاریکیوں میں انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو کاروانِ حسینی کے نقش قدم دکھانے کے لیے جگمگا رہا ہو۔

میں حیران ہوں کہ دانستہ یا نادانستہ ہم اس روشن ستارے کی مدھم، ملائم اور ٹھنڈی روشنی سے اپنے وجود کو بچاتے رہے۔ نجم آفندی تو وہ شاعرِ اہلِ بیتؑ تھے جنھوں نے عمر بھر ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو امن و آشتی کا درس دیا۔ وہ آخر عمر میں پاکستان کے مسلمانوں کی ہدایت کے لیے یہاں تشریف لے آئے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی مصلحت مانع نہیں کہ ہم حضرت نجم آفندی کو ان کے شایان شان مسند عزت پر بٹھانے سے گریز کرتے رہے۔ وہ اس

دور کے چند نامور شاعروں میں سے تھے لیکن ہم انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔

36۔ **ڈاکٹر محمد احسن فاروقی:** نجم مرحوم نے زیادہ وقت اور توجہ نظم کو دی اور اس میں مخصوص اضافے کیے۔ نوحہ اور ماتم کو جو عوامی درجہ کی چیزیں تھیں، انھوں نے ادبی حیثیت دے دی۔ مگر نثر میں جو کچھ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آگے آنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ تمثیلی یا اشاراتی افسانوں، مختصر تاریخی حکایتوں اور مذہبی اصلاحوں کے سلسلے میں جس کام کی انھوں نے ابتدا کی ہے، اس کی حدیں بہت دور جاتی ہیں۔ ان کی شاعری بہت کافی مقبول ہے اور قومی شاعری خود رو اصناف کو مستقل ادبی مقام دیتی ہے، مگر ان کی نثر مستقبل میں آنے والے رجحانات کا پیش خیمہ اور ضروری اور مفید رجحانات کی ابتدا کرتی ہے۔

37۔ **جناب امیر امام حُر:** ''جناب نجم آفندی کی مرثیہ سرائی سید آل رضا اور جوش دونوں حضرات سے مختلف انداز رکھتی ہے۔ جوش کی مرثیہ سرائی ان کی انقلابی شاعری اور ان کی آزاد فکری کی ایک تحدید ہے۔ سید آل رضا کی مرثیہ سرائی اور نجم آفندی کی مرثیہ سرائی میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں کے یہاں بے انتہا خلوصِ عقیدت کا گہرا احساس ہوتا ہے، لیکن جہاں سید آل رضا کے مراثی میں لکھنؤ کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ نئے خیالات و افکار کی تازگی ہے، وہاں نجم آفندی کی مرثیہ سرائی ہندی زبان کے ادب کے اثرات اور ہندوستان کی دنیا کی انفرادیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ہندی زبان کی سادگی اور بے ساختگی نجم آفندی کی شاعری کی خصوصیت کو اور بھی زیادہ اجاگر کر دیتی ہے۔ نجم آفندی کے مرثیہ کا جو مقصد تھا وہ تبلیغ تھا اور اردو سے زیادہ یہ مقصد ہندی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نجم آفندی نے اپنے ان فیصلوں میں بڑی بصیرت سے کام لیا اور ہمیں ان کی اس بصیرت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی خوبیوں کا قائل ہونا پڑے گا۔

38۔ **جناب اختر انصاری اکبرآبادی:** نجم آفندی کے دل کا گداز شگفتہ بیانی کا مظہر تھا اور منفرد انداز بیان سونے پہ سہاگہ۔ درد اور یہ کرب نجم آفندی کی تمام شاعری میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دردمندی اور یہ احساس نجم کی شاعری کی ایک ایسی لازوال سچائی ہے جس کے سبب وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

39۔ **جناب شیخ انصار حسین:** حضرت نجم آفندی نے اپنی تابندہ تصنیف وتالیف کے جواہر پاروں سے اردو ادب کے سرمائے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ عربی، فارسی اور اردو کے شعرا میں نجم آفندی وہ واحد شاعر ہیں جنھیں شاعرِ اہلِ بیتؑ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نجم کی شاعری کی بنیاد مذہبی، اعتقادی وتاریخی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نجم کا مقصدِ شاعری اس عالم میں انسان کے مقام کی وضاحت ہے۔ ان کی شاعری کا مقصد انسان کے اصل نصب العین کی نشان دہی ہے۔ اس میثاق کا اعادہ ہے جو انسان نے یوم الست کو کیا تھا۔ انسانی عظمت کی اس انتہا کو ظاہر کرنا ہے جس کے آگے کچھ نہیں، جس سے بلند کوئی نہیں اور جس کے سامنے کوئی عظمت نہیں۔

40۔ **جناب سید عاشور کاظمی** : فرہادعصر ڈاکٹر تقی عابدی اب شاعر اہلِ بیتؑ حضرت نجم آفندی کی جملہ شعری تخلیقات کو ''کائناتِ نجم آفندی'' کے نام سے شائع کررہے ہیں۔ رثائی ادب میں تنقید کی راہیں متعین کرنے کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی اہم کتابیں بھی شائع کررہے ہیں۔ وہ جس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھاتے ہیں اس پر وسیع تر تحقیقی کام بھی کرتے ہیں جس سے کتاب کی معنویت دوبالا ہوجاتی ہے۔

نجم آفندی شاعرِ اہلِ بیتؑ ہی نہیں، شاعر انقلاب بھی ہیں۔ جدید مرثیے کے افق پر جوش اور جمیل مظہری کے ساتھ نجم آفندی کا نام بھی ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ جس وقت جوشؔ ملیح آبادی اور جمیلؔ مظہری ملت کو جدید مرثیے کی طرف لے جارہے تھے، اس وقت نجم آفندی اپنے سلام اور نوحوں کے ذریعے

یہی خدمات سر انجام دے رہے تھے۔ ان کے نوحوں میں درد کی تپش کے ساتھ انقلاب کی گونج تھی۔ انھوں نے کربلا میں خانوادۂ رسالتؐ پر کیے گئے ہر ظلم کو تاریخ کربلا کے ایک باب کی حیثیت سے نظم کیا ہے۔ مثلاً سید سجادؑ کو بیڑیاں پہنانے کے درد انگیز منظر کی تصویر کشی نجمؔ کے الفاظ میں یوں کی گئی ہے

سجادؑ اسیر جور ہوئے صد حیف کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے

نجمؔ آفندی مرثیہ گوئی کی طرف آئے تو اپنے نوحوں کا آہنگ، ماتم کی دستکیں اور انقلاب انگیز جذبے لے کر آئے۔ پہلا مرثیہ ''فتح مبین'' ۱۹۴۳ء میں کہا جس کا پہلا مصرع ہی نجمؔ کی انقلابی فکر کا مظہر ہے۔ نجمؔ نے شہادت کو فتح قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا
بدلا لہو سے رنگِ گلستانِ کربلا

''معراج فکر'' نجمؔ آفندی کا شاہکار مرثیہ ہے۔ یہ ان دنوں لکھا گیا ہے جب روس اور امریکہ چاند کی طرف راکٹ بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے اور دنیا خلائی دور میں داخل ہو رہی تھی۔ نجمؔ آفندی کی ترقی پسند فکر نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور کہا:

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

خلا کی تسخیر ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے اب وہ وقت دور نہیں جب نجمؔ آفندی کی پیش گوئی پوری ہوگی اور خلاء میں جہاں جہاں انسان پہنچے گا، عباسؑ کا علم وہاں وہاں لہرائے گا۔ نجمؔ آفندی کی شاعری پر ابھی ٹھوس تنقیدی کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی جس

انداز سے کام کرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ کائناتِ نجم آفندی کی اشاعت کے بعد نجم آفندی لوگوں کی سمجھ میں آئیں گے اور ان کی صحیح حیثیت متعین ہوگی۔

41۔ جناب نسیم امروہوی:

حُسنِ بیاں کی اک کتاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم
لطفِ زباں میں کامیاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

بہرِ قصیدہ و سلام از رہِ بندش و نظام
فکرِ جدید کا شباب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

نوحۂ غم کی راہ میں سبطِ نبی کی چاہ میں
موجدِ طرزِ لاجواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

قائدِ بزمِ عزمِ نو، صاعقۂ عمل کی رو
کعبۂ نظم کا سحاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

جذبۂ ماتمِ حسینؑ واقفِ رمز شور و شین
فطرتِ درد کا خطاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

نجمِ زمینِ شاعری ماہِ مبین شاعری
اوجِ سخن کا آفتاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

ذہن رسا فلک کا اوج، طبع رواں لبن کی موج
بحرِ سخن کی آب و تاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

رنگِ سخن سے اس کے فق چہرۂ مطلعِ شفق
خالقِ لالہ و گلاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

دینِ سخن میں وہ زعیم، خطِ صراطِ مستقیم
سالک جادۂ صواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

مدح لکھی ہے بار بار شعر کہے ہیں بے شمار
خلدِ بریں میں بے حساب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

چند ہی مدح گو ہیں اب، بعد انیسؔ منتخب
منتخبوں میں انتخاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

اس کا نہیں کوئی سہیم، جوشؔ و رضاؔ ہوں یا نسیمؔ
سب کو پیامِ انقلاب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

لکھ دو نسیمؔ باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاکِ محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

42۔ جناب رئیسؔ امروہوی:

فراقِ نجمؔ آفندی کی تفسیر
سرشکِ درد سے اے چشمِ نم لکھ

وہ دانشور وہ شاعر وہ سخن سنج
اُسے نکتہ ور اہلِ حرم لکھ

وہ نوحہ خوانِ شبیرؑ اب کہاں ہے
رئیسؔ افسانۂ اربابِ غم لکھ

فراقِ نجمؔ آفندی مرحوم
"غروب اخترِ نجمؔ" اے قلم لکھ

1395ہجری

43-جناب شاہد نقوی:

کیا ہوا گر اہلِ دنیا نے نہ اس کی قدر کی
کیا ہوا گر اس کی میت تشنۂ ماتم رہی
وہ عطائے مصطفیٰؐ سے پائے گا اجرِ عظیم
اُس کا کیا بگڑا اگر دنیا میں قیمت کم رہی

حُبِّ اہلِ بیتؑ میں مرنا شہادت ہے اگر
عاشقِ آلِ نبیؐ مرنے سے ڈر سکتا نہیں
مر نہیں سکتا اگر کوئی شہیدِ راہِ حق
لاکھ موت آجائے لیکن نجمؔ مرسکتا نہیں

44-جناب فیضؔ بھرت پوری:

شاعرِ اہلِ بیتؑ نجمؔ افسوس — موت تیری ہے دل کی بربادی
تیرے مرنے سے ہوگئی سنسان — نوحۂ دل گداز کی وادی
اپنی دُنیا تو ہوگئی برباد — بڑھ گئی کو جناں کی آبادی
تو نہیں جب تو اب ملے گی کہاں — نظم رنگین اور روش سادی
تو جہانِ ثنائے مولاؑ میں — راہِ نو کا ہے بانی و ہادی
نوحہ و منقبت کی دُنیا میں — کر گیا انقلاب بنیادی
طمعِ دُنیا سے دور گوشے میں — شہؑ کا تھا مدح خواں بہ آزادی
تیری تاریخ مرگ لکھتا ہے — فیضؔ جو مرثیے کا ہے عادی

1975ء

45۔ جناب نفیسؔ فتح پوری:

کوئی شاعر ہو کہ موجد فلسفی ہو یا ادیب اس جہانِ آب وگل میں کس کو حاصل ہے دوام
ہے فنا سب کا مقدر مہر ہو یا ماہتاب نجمؔ کے بھی دور کا آخر تھا اک دن اختتام
اپنے دورِ شاعری میں منفرد انداز سے نجمؔ اپنے آپ کو منوا گیا ماہِ تمام
نجم کی روشن خیالی سے ہوئے رخشندہ تر مرثیے نوحے قصیدے منقبت سوز و سلام
شاعری کی آنکھ کا تارا تھا نجمؔ ذی حشم نغز گو شیریں سخن، طبّاع، مداحِ امام
پوربی بولی میں نوحے اور وہ ان کی مٹھاس کیوں نہ کرلیتی دیارِ ہند میں ہر اک کو رام
اب کہاں وہ نجمؔ آفندی کہ جس کی ذات نے جگمگائے محفلِ شعروسخن کے صبح و شام
اُس کے ہم عصروں نے ناقدری جو کی تو کیا ہوا جب تک اردو ہے رہے گا نجمؔ کا تابندہ نام
آخری لمحے گزارے آکے ارض پاک پر اور اب باغِ ارم ہے نجمؔ کی جائے قیام

دیکھنا ہو جس کسی کو رُتبۂ نجمؔ اے نفیسؔ
پڑھ کے دیکھے اُس کا ہندی فارسی اردو کلام

46۔ جناب زاہدؔ فتح پوری:

نجمؔ دنیائے فن کو پیارا ہے آسمانِ ادب کا تارا ہے
رفعتِ حُسنِ شاعری کے لیے نجمؔ بھرپور استعارا ہے
وہ روانی کلام میں گویا تند دریا کا تیز دھارا ہے
نجمؔ نے اپنا خونِ دل دے کر چہرۂ فکر و فن نکھارا ہے
مرثیہ ہو کہ منقبت کہ سلام اُس نے ہر صنف کو سنوارا ہے
اک نیا طرزِ دے کے نوحے کو اُس نے ذوقِ سخن ابھارا ہے
ہم کو اک موڑ پر ملا تھا کبھی جب سے اپنے لئے سہارا ہے
کر گیا آہ محفلیں سونی قلبِ حسّاس پارا پارا ہے

نجم جب خلد میں ہوا داخل بولے شبیرؑ یہ ہمارا ہے
ندرتِ فکرِ نجم اے زاہد
اُس کے شعروں سے آشکارا ہے

47۔محترمہ رابعہ نہاں:

دارِ فنا سے نجم بہ سوئے جناں گیا آلِ رسولؐ پاک کا وہ قدر داں گیا
شاعر تھا اہلِ بیتؑ کا اور عاشقِ رسولؐ جھڑتے تھے پھول منہ سے وہ غنچہ دہاں گیا
جاری زباں پہ نعتِ نبیؐ مدحِ آل تھی خدمت میں جب حسینؑ کی وہ مدح خواں گیا
اب قربِ پنجتنؑ بھی ہے اور سیرِ خلد بھی فردوس میں بہ فضلِ خدا بے گماں گیا
کیا مرتبے ملے کہ لیا اُس کو ہاتھوں ہاتھ جنت میں جس مقام پر شیریں بیاں گیا
افکار اُس کے آپ ہی اپنی مثال ہیں دُنیائے شاعری کا وہ روحِ رواں گیا
نوحہ کیا کبھی نہ زبانِ حسینؑ سے ہاں خود غمِ حسینؑ میں نوحہ کناں گیا
جذبات پر لگائے وہ نشتر کہ الاماں مجلس سے جو گیا وہی سینہ تپاں گیا
راہیں نکالیں اُس نے نئی راہِ فکر میں یعنی وہ ہم کو بخش کے فکرِ جواں گیا
دُنیائے مادّی میں وہ اوجھل ضرور ہے زندہ رہے گا تا بہ ابد وہ جہاں گیا
سیرت میں اس کی سیرتِ آلِ رسولؐ ہے
سینے میں اپنے لے کے یہ وصفِ نہاں گیا

48۔جناب ساحرؔ لکھنوی:

شمع کے پھول کے مانند، شرارے کی طرح نجمِ فن ڈوب گیا صبح کے تارے کی طرح
مطلعِ فکر سے اوجھل ہوا اے شاہدِ نظم وہ جو چمکا تری قسمت کے تارے کی طرح
شاعر ایسا کہ ہر اک صنفِ سخن نے پایا فیض اک ذات سے اس کی اک ادارے کی طرح
جس کا ہر شعر تھا اک جلوۂ صد رعنائی نگہہِ ذوق میں جنّت کے نظارے کی طرح
جس کی آواز سکوں بخشِ دلِ شعر و سخن غم کے بڑھتے ہوئے طوفاں میں کنارے کی طرح
جس کے افکارِ مودت سے مزین اوراق منزلِ مدح میں قرآن کے پارے کی طرح

اُس کی پروازِ تخیل تھی کہ معراجِ ہُنر — رفعتِ عرش پہ رف رف کے طرارے کی طرح
اپنی آغوش میں پروان چڑھایا اُس نے — اک نئے لہجے کو اک راج دُلارے کی طرح
قلب پر اُس کے مضامین کا ہوتا تھا نزول — مصحفِ قدس کے اک تازہ شمارے کی طرح
اُفقِ شعر پہ اُبھرا تھا مثالِ خورشید — رہنما بن کے ہدایت کے منارے کی طرح
اقتدار اُس کا مکمل تھا بہر طرزِ سخن — فن کی اقلیم میں شاہوں کے اجارے کی طرح
فکر کے وقت نگاہوں میں سمندر کا سکوں — زورِ تخیل میں طوفان کے دھارے کی طرح
موت سے اُس کی زیاں قوم و ادب نے جھیلا — ایک ہی لمحے میں صدیوں کے خسارے کی طرح
زوجِ زہراؑ کی زیارت کے لیے اے ساحرؔ — نجم اب قبر میں اُترا ہے ستارے کی طرح

سالِ رحلت کے لیے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
نجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395 ہجری

49۔ جناب کسریٰ منہاس:

چل بسے آہ نجم آفندی — شاعرِ نکتہ سنج و سحر نگار
شاعرِ اہلِ بیتؑ لاریب — مدحتِ پنجتنؑ تھا اِن کا شعار
کبر و نخوت سے دور رہتے تھے — بات کے سچے نیک تھا کردار
سالِ ہجری و عیسوی دونوں — شعرِ کسریٰ سے ہوگئے اظہار

دُرِ یک دانہ نکتہ داں شاعر

1395 ہجری

شاعر نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

50-جناب نیساںؔ اکبرآبادی

نجم درخشاں چلا آج سوئے پنجتن
بزمِ ملائک میں یہ ہونے لگا غلغلہ
تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

51۔ڈاکٹر ہلالؔ نقوی:

سُن سکے کوئی تو سُن لے داستانِ اشکبار — سینۂ تاریخ کے ناسور کی رِستی پکار
کہہ رہی ہے انقلابِ دہر کے قدموں کی چاپ — زندگی ہر موڑ پر زخم و نمک کا ہے ملاپ
اک تڑپ ہے جو مسلسل ہے رگِ دل میں رواں — زندگی ایک کرب ہے جس کی چبھن ہے خونفشاں
یہ خلش جو ڈھل گئی ہے فطرتِ انسان میں — زندگی محبوس ہے ماحول کے زندان میں
اُلجھنوں میں اِس قدر مصروف ہے نوعِ بشر — شورشِ غم میں نہیں انسان کو اپنی خبر
غم مٹانے کے لیے پی ہے جو غفلت کی شراب — آدمی سے آدمی نے کرلیا ہے اجتناب
ہوگئے ہیں بے خبر اتنے نہیں پروا ذرا — کوئی دنیا سے گیا؟ کیسے مرا؟ کیونکر مرا؟

اس قدر بے حس ہیں کیوں؟ آخر یہ انساں سب کے سب
وقت اس آزار کا ہم کو بتاتا ہے سبب

جب سیاسی کجروی ماحول کا بنتی ہے روگ — جب معاشی ابتری سے تلملا جاتے ہیں لوگ
مفلسی کے نشتروں سے جب ٹپکتا ہے لہو — زندگی روتی ہے اپنے حالِ غم پر کو بہ کو
جب رگوں کو بھوک کا سرطان دیتا ہے چبھن — آدمی مُردوں کے تن سے چھین لیتا ہے کفن
اس قدر سفاک ہوجاتا ہے انساں کا ضمیر — خاک ہوجاتا ہے ذہنوں میں محبت کا خمیر
دل میں ہر رخ سے جنم لیتے ہیں پھر مکروریا — یہ عمل رہتا ہے جاری سلسلہ در سلسلہ
اک کڑی اس سلسلے کی ہے دلوں کی بے حسی — جس سے بن جاتا ہے غفلت کا نمونہ آدمی
یاد کا مفہوم ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں لوگ — عظمتِ اسلاف کو دل سے مٹا دیتے ہیں لوگ

یوں اُبھر کر سامنے آتی ہے ہستی قوم کی
رنگ لاتی ہے نیا مُردہ پرستی قوم کی

آج بھی اس کی ہمارے سامنے ہے اک مثال ایک شاعر جو طریقِ فکر و فن میں باکمال
وہ بزرگِ عالمِ طرزِ جدیدِ شاعری مرگیا! لیکن خبر تک اہلِ دنیا نے نہ لی
یہ حقیقت اک حقیقت ہے جو میں کہتا ہوں ٹھیک آدمی گنتی کے تھے اُس کے جنازے میں شریک
اس کی ہستی کے اجالے تیرگی میں سوگئے بے خبر دنیا رہی! اخبار گونگے ہوگئے
ہاں مگر یہ عزم لے کر آئے ہیں اہلِ ادب کچھ نہیں پرواہ ہم کو چپ رہیں دنیا کے لب
لاکھ اپنی بے حسی دکھلائے یہ مجرم سماج
ہم مگر دیتے رہیں گے اس کی عظمت کو خراج

نجم! اے شعر و سخن کے آسماں کے آفتاب تو نے بخشا ہے زلیخائے تفکر کو شباب
اک نئے انداز سے کارِ ادب تو نے کیا تو نے نوحوں کو عقیدت کا نیا لہجہ دیا
بالیقیں کہنا پڑے گا یہ کہ ہیں تیرے سلام کربلا والوں کے مقصد کی اشاعت کے پیام
تیری جدت آفرینی کے اضافے ہیں مزید مرثیہ تیرا ہے اک فکرِ دبستانِ جدید
تیرے باغِ فکر میں کھلتے ہیں فطرت کے کنول کروٹیں لیتا ہے تیرے شعر میں جوشِ عمل
تو نے جذبے کو وفاؤں کا قرینہ دے دیا تو نے اشکوں کو شراروں کا خزینہ دے دیا
طرزِ نو تیرا دماغ و ذہن پر چھانے لگا فکر میں جس کے اثر سے انقلاب آنے لگا
جس کی سچائی کو آسکتا نہیں ہرگز زوال کیوں نہ لکھے وہ حقیقت شعر میں فکرِ بلاؔل
جب بھی چھڑ جائے گا ذکرِ جدّتِ ''شعر و پیام''
آئے گا لب پہ ہمیشہ نجم آفندی کا نام

52۔جناب قسیم امروہوی:

نجم آفندی جمالِ شاعری نجم حُسنِ لا زوالِ شاعری
نجم کی فطرت کمالِ شاعری نجم کے نوحے تآلِ شاعری
نجم تھا آنکھوں کا تارا نظم کا
ہائے ڈوبا وہ ستارا نظم کا

نوحہ گوئی کو دیا فکری پیام　　سر بہ سر احساس ہے جس کا کلام
ہر قصیدہ جس کا اک ماہِ تمام　　کہہ گیا صلوات کے قابل سلام
منقبت میں بھی وہ تھا فکری صعود
دل یہ کہتا تھا پڑھے جاؤ درود

ایسی نظموں کو دیا اُس نے رواج　　ہندی و اردو کا جن میں امتزاج
کس میں یہ اندازِ تبلیغی ہے آج　　وقت کا پہچانتا تھا وہ مزاج
اُس کی یہ تخلیق تھی اک شاہکار
اِس شریعت کا تھا وہ پروردگار

نجمؔ تھا افکارِ نو کی اک کتاب　　نجمؔ کا ہر شعر خود اپنا جواب
نجمؔ تھا طرزِ بیاں کا انقلاب　　نجمؔ کی پیری سخن کا تھی شباب
نجمؔ زینت تھا عزا کے فرش کی
فرش پہ کرتا تھا باتیں عرش کی

یوں اُبھاری شمع بیداری کی لَو　　قوم کے ذہنوں نے پائی جس سے ضو
وہ لکھے فکری مضامیں نو بہ نو　　جن سے دوڑی ارتقا کی ایک رَو
نجمؔ تھا تابندہ موجِ شاعری
السلام اے نجمؔ اوجِ شاعری

53- پروفیسر فیضؔی

بتائید الٰہی یہ شرف فیضؔی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجمؔ آفندی

1975ء

54- جناب خلش پراصحابی

چلے نجمؔ شیریں بیاں دہر سے　　رہا کچھ نہ اب زندگی کا مزا
احبا کو ہے فکرِ سالِ وفات　　سنو تو سناتے اب یار کیا

الف سے الم کے خلش اب تو یوں
ہے لکھا، غمِ نجمؔ دائم رہا

1395 = 1394 + 1 ہجری

تیرے افکار کے سورج ہیں درخشاں اے نجمؔ
ہے نئی راہِ سخن طور بداماں اے نجمؔ
ڈھل گئے شعر کے سانچے میں جو جذبات ترے
ہوگئی بزمِ سخن بزمِ فروزاں اے نجمؔ

55۔ جناب کرار حیدر راہی:

فلکِ شاعری کا سیّارہ — بوستانِ ادب کا شہ پارہ
شاعرِ سر زمینِ کرب و بلا — مبتلائے غمِ ایّام ہوا
نئے نوحوں کا موجدِ اوّل — شاعرِ بے نیازِ صنفِ غزل
ہاتھ میں ہے حسینیت کا علم — دل میں سلطانِ کربلا کا غم
آنکھ میں اشک لب پہ نوحا ہے — بس یہی زادِ راہِ عقبیٰ ہے
نجمؔ کی زندگی کا ہر لمحہ — از برائے غمِ حسینؑ رہا
لوگ کہتے ہیں مرگیا ہے نجمؔ — میں سمجھتا ہوں گھر گیا ہے نجمؔ

مسکراتا ہے باغِ جنّت میں
سیّد کربلا کی خدمت میں

56۔ علامہ سید ابن حسن نجفی: خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ جذبہ غم کے روح پرور ترجمان اور ''تہذیب مودّت'' کے شیوا بیان شاعر حضرت نجمؔ آفندی تقریباً آدھی صدی تک ہمارے دل و دماغ پر چھائے رہے۔

مرحوم کا شمار ان گنے چنے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کے سنبھلے ہوئے مزاج نے نئی راہیں بنائیں۔ جدید عنوان دیئے۔ تازہ فکر عطا کی اور ہمارے ذہنوں کو

بالکل اچھوتے اسالیب سے روشناس کروایا۔ فی الواقع نجم بہت بڑے انسان عظیم مفکر اور ہماری صدی کے ممتاز اور منفرد سخن طراز تھے۔ انھوں نے نصف صدی میں جس صنف ادب کا بیش بہا ذخیرہ مہیا کیا ہے اس میں اتنی تاب و تواں ہے کہ صدیوں تک انسانی شعور کی ہدایت کرتا رہے گا۔

نیز نجم کا نام ہر ستارے سے زیادہ چمکتا رہے گا اور اسی نیک ذخیرہ کی بدولت آخرت میں بھی انھیں بہت نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

57۔ **علامہ مرزا یوسف حسین لکھنوی** (پرنسپل مدرسۃ الواعظین لاہور): شاعرِ حسینیت حضرت نجم آفندی اکبر آبادی اعلی اللہ مقامہٗ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے عدیم المثال کارناموں کی نئے انداز میں تصویر کشی کی۔ فلسفۂ حسینیت کو وسعت دی اور اس ذکر کی نئی راہیں نکالیں اور ہر اہم مقصد کو ایسے سادہ الفاظ اور روزمرّہ میں ادا کیا جس سے ہر خاص و عام لطف اندوز ہوتا رہا اور ہر کہی ہوئی بات دل میں اترتی رہی۔

ان کا کلام شعر بھی تھا اور تبلیغ بھی۔ وہ اس فن کے مسلّم الثبوت بادشاہ تھے۔ وہ کلام کے نہیں کلام ان کے تابع تھا۔ ان کے کلام میں آمد ہی آمد ہے۔ کہیں آورد کا نام نہیں۔ ان کی ہر نظم نظم بھی ہے اور نثر بھی۔ ایسی سخن آفرینی جو حقیقت کے مطابق ہو ان کی فطرت میں داخل تھی۔ ان کے ایسے بلند پایہ شاعر فلک نے کم دیکھے ہوں گے۔ یو۔پی اور پنجاب ہر جگہ ان کے شاگرد موجود ہیں۔ جناب رزم (ردولوی) جناب مضطر حیدری اور جناب جلیسؔ ترمذی صاحب کے بلند پایہ کلام ان کے استاد کی عظمت پر گواہ ہیں۔

انھوں نے لغت کی ایک کتاب بھی تالیف کی تھی جسے دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ جیسا ان کا کلام، ویسا ان کا عمل۔ نہایت سادہ مزاج، وسیع الاخلاق، متواضع اور منکسر، نحیف و زار مگر دل شیروں جیسا جوان تھا۔

سب سے پہلے 1939ء میں لکھنؤ کے محاذ میں شرف ملاقات حاصل ہوا اور کئی

ہفتہ ساتھ رہا اور آخر میں 1973ء میں لاہور شب پانزدہم شعبان کو لب دریا نیاز حاصل ہوا۔ ساری عمر حیدرآباد میں گزاری۔ اب پاکستان میں قیام کا ارادہ تھا مگر موت نے مہلت نہ دی اور ہمیشہ کے لیے قیام ہوگیا۔ یہاں کی مٹی انھیں حیدرآباد (اے۔ پی) سے کھینچ لائی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

58۔**الحاج محمد بشیر انصاری:** ''میں ایسے شاعر رفیع الفکر، دقیق النظر، بلیغ الکلام، مدّاح اہل بیتؑ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قدر ومنزلت کے لیے کیا لکھ سکتا ہوں جن کے لیے آلِ محمدؐ علیہم السلام نے بالتحقیق فرمایا ہو کہ ہمارے مادحین کے لیے روح القدس مقرر ہے کہ وہ ان کی تائید وتسدید کرے اور ان کی ہر بیت کے عوض جنت میں ایک بیت مہیا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جناب نجم آفندی علیہ الرحمہ کو جوارِ اہل بیت علیہم التحیۃ والثنا میں منبر مدحت ومنقبت عطا فرمائے۔

59۔**مولانا پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری:** شاعرِ اہل بیتؑ حضرت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ کی وفات حسرت آیات کی خبر میں آپ کے گرامی نامہ سے پیشتر ہفت روزہ ''اسد'' اور ''شہید'' میں پڑھ چکا ہوں۔

حقیقتاً نجم کی شاعری اور مدح ثنائی اہل بیت اور ان کے نوحوں میں سوز وگداز اپنی مثال آپ تھا۔

یہ ہماری بدنصیبی کا زمانہ ہے کہ اس قوم کے درخشندہ ستارے یکے بعد دیگرے غروب ہورہے ہیں۔

نجم کی وفات حسرت آیات کی گمنامی قوم کی بدنصیبی ہے مگر جن ذواتِ قدسیہ کے لیے وہ مدح ثنائی فرماتے رہے، ان کے نزدیک اس کا اجر محفوظ ہے۔

60۔**علامہ حکیم محمد گیلانی** : مرحوم ساری عمر خدمتِ ملت اور مداحی معصومینؑ میں مصروف رہا اور جب دنیا سے رخصت ہوا تو آنسو بہانا تو درکنار کسی نے ٹھنڈی آہ بھی نہ بھری۔ اللہ عزوجل مرحوم کو جوارِ اہل بیتؑ میں جگہ دے۔

61۔ **جناب سید ریاض الرحمٰن** : ''قبلہ نجم آفندی کی موت ایک فرد کی موت نہیں ایک باشعور قوم و شعراء کے طبقہ کی موت ہے مگر افسوس تو اس قدر ہے کہ قومی شاعر ہوتے ہوئے گمنامی کی موت ہماری بے حسی کے لیے زبردست چیلنج ہے۔

62۔ **جناب منظر** : مرحوم رہنما تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے ایسے آدمیوں کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

63۔ **حضرت گوہر جعفری** :بلا شبہ علامہ نجم آفندی کے بعد شعبہ ادبیات کا ایک باب ایک ادارہ ایک مہتم بالشان انجمن اور سوسائٹی کا خاتمہ ہوگیا۔

64۔ **جناب سید فقیر حسین شیرازی**: قبلہ نجم صاحب کی وفاتِ حسرت آیات قوم کے لیے ایک نا قابل تلافی صدمہ ہے۔

ع : جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا

65۔ **جناب تسلیم ترمذی کربلائی**: ''علامہ نجم آفندی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون: اب کس کس کو رویا جائے؟ ان کی موت پر آنسو بہائے جائیں۔ یا ان کی غریب الوطنی اور قوم کی بے حسی کا رونا رویا جائے۔مرحوم ساری زندگی مدح اہلِ بیتؑ علیہم السلام کرتے رہے۔ خدا رسول اور ائمہ معصومین کے نزدیک ان کے مدارج بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ۔

مجھے وہ وقت نہیں بھولتا جب 1972ء میں جلیس صاحب کے ساتھ شمیم کاظمی کے ہاں میرا جانا ہوا۔ وہاں نجم آفندی مرحوم نے جس پدرانہ شفقت کا اظہار فرمایا اور جو پُرخلوص دعائیں دیں، ان کا اثر اب تک محسوس ہو رہا ہے۔ خدا انھیں جنت وکوثر عطا فرمائے۔

66۔ **بیگم سیّدہ بلقیس اعجاز** : اتنے بڑے قومی شاعر کی اس المناک موت سے دل کو بہت رنج پہنچا۔ ان کے اعزہ نے کسی کو خبر تک نہ دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عظیم شاعر کی موت کی خبر کو صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا۔

مجھے نجم آفندی کا یہ شعر بہت یاد آتا ہے:

دریا سے تجھے پار اُترنا ہے بہرحال
طوفان کے کاندھے پہ قدم رکھ کے اتر جا

مرنے والے تو مرجاتے ہیں لیکن اپنی ایسی یادیں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں کہ لاکھ بھلائیں نہیں بھولتے۔

آنکھ سے دور سہی دل سے کہاں جائے گا
مرنے والے تو ہمیں یاد بہت آئے گا

حضرت علامہ نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ کی یاد میں جناب قدر عریضی سرپرست ادارہ ''قدر ادب'' نے یکم فروری ۱۹۷۶ء کو ایک طرحی محفل دوبیتی ومسالمہ منعقد کی تھی۔ جن شعرا نے رباعیات اور قطعات میں نجم آفندی کی شخصیت اورفن کی قدر دانی کی وہ یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

67۔ جناب آر آر سکینہ الہام:

دنیا میں رہے تابعِ فرمانِ حسینؑ
عقبیٰ کا سکوں ملا بہ فیضانِ حسینؑ
رضواں سے پتہ ہم نے جو پوچھا تو کہا
''جنّت میں ہیں نجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

68۔ جناب ڈاکٹر اسدؔ انصاری:

تھا اُن پہ اسدؔ سایۂ دامانِ حسینؑ
دنیا میں وہ کہلائے ثنا خوانِ حسینؑ
جو کل تھا وہی آج بھی باقی ہے ربط
''جنّت میں بھی ہیں نجم زخاصانِ حسینؑ''

69۔ جناب بشیر احمد ارمانؔ قریشی:

تھا نجم کا دل اصل میں ایوانِ حسینؑ
جب تک جیئے دل میں رہا ارمانِ حسینؑ

اب آلِ محمدؐ کی محبت کے طفیل
''جنّت میں ہیں ہجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

70 ۔ جناب اکمل آلہ وری:

ہر شان حسینؑ کی ہے شایانِ حسینؑ
فیضانِ نبیؐ، علیؑ ہے فیضانِ حسینؑ
مداح کو اپنے پاس بلوا ہی لیا
''جنت میں ہیں ہجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

71 ۔ جناب ادیبؔ حیدرآبادی:

وہ شاعرِ مدح تھے ثنا خوانِ حسینؑ
حاصل ہے وہاں بھی انہیں فیضانِ حسینؑ
ہے اُن پہ کرم اِسی وسیلہ کا ادیبؔ
''جنت میں ہیں ہجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

72 ۔ جناب باقرؔ رضوی امانت خانی:

رکھتے تھے مرحوم ہر صنفِ سخن پر دستگاہ — بالیقیں اُن کی زمین شاعری تھی حشر خیز
ایک ہی دُھن اُن کو تھی شاعر تھے اہلبیتؑ کے — سلح کل مسلک تھا وہ رکھتے نہ تھے خوئے ستیز
اُن کے خامہ نے لکھا جب قصۂ یومِ غدیر — فکر کے شہب نے کی میدانِ خم میں جست وخیز
جشن اور مجلس پہ ان کی فکر کا یوں تھا اثر — اشک افشاں ان کے نوحے اور قصائد عطر بیز
جوہرِ مدحِ امیرالمومنینؑ رکھتے تھے وہ — شعر لکھتے وقت اُن کا کلک تھا الماس ریز
عمر بھر کرتے رہے آلِ محمدؐ کی ثنا — کی ہمیشہ مدحِ غیرِ آلِ احمدؐ سے گریز

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے ہجم ٹوٹا جلوہ ریز

۱۹۷۵ء

73 ۔ جناب سید شاہ نصیر الدین بسملؔ:

سب کو یہ سناتے رہے فرمانِ حسینؑ
ان کے لیے ایمان تھا ایقانِ حسینؑ
ہر سانس پہ تھے حسینؑ کے یہ بسملؔ
''جنت میں ہیں ہم زیرِ دامانِ حسینؑ''

74 ۔ جناب ابوالحسن عابدی حسنؔ:

حاصل تھی یہ دولت بھی بہ فیضانِ حسینؑ
دیکھ آئے تھے وہ رونقِ ایوانِ حسینؑ
جب فکرِ مقام کی تو ہاتف نے کہا
''جنت میں ہیں ہم زیرِ دامانِ حسینؑ''

75 ۔ جناب خورشید جنیدی

احساس تھا وابستۂ دامانِ حسینؑ
کی مدح تمام عمر شایانِ حسینؑ
محفل میں نہیں بذاتِ خود ہم مگر
بے جسم ہے طلعتِ ثنا خوانِ حسینؑ

۱۹۷۵ء

76 ۔ جناب عرب شاہ خالدؔ کیشری:

قسمت کے دھنی ہیں سب غلامانِ حسینؑ
ملتا ہے بہر حال انہیں فیضانِ حسینؑ
جو ''شاعرِ اہلبیتؑ'' کہلاتے رہے
وہ ہم ہیں اب شمعِ شبستانِ حسینؑ

77 ۔ جناب سید ارشاد احمد دراکؔ قنوجی:

حاصل رہا دنیا میں بھی فیضانِ حسینؑ
عقبیٰ میں بھی پایا ہے گلستانِ حسینؑ
اللہ نے دی تجمّل کو عظمت دراک
جنت میں ہیں وابستۂ دامانِ حسینؑ

78 ۔ جناب شاہدؔ حیدری

وہ شاعرِ خوش فکر ثنا خوانِ حسینؑ
قدرت سے ملا تھا جن کو عرفانِ حسینؑ
وہ روحی فداک کہہ کے دم توڑ دیئے
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

79 ۔ جناب طاہرؔ عابدی

تھے شاعرِ اہلبیتؑ قربانِ حسینؑ
اُن پر تھا سدا نزولِ فیضانِ حسینؑ
رضواں کی صدا آئی یہ مجھ کو طاہرؔ
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

80 ۔ جناب طالبؔ اسدی:

حاصل جنہیں ہوجاتا ہے عرفانِ حسینؑ
کہلاتے ہیں وہ لوگ غلامانِ حسینؑ
مر کر بھی وہ محروم رہیں ناممکن
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

81 ۔ جناب میرزا عادلؔ نجمی:

وہ بلبلِ خوش گوائے بستانِ حسینؑ
ہر سانس میں تھا نغمۂ فیضانِ حسینؑ

77 ۔ جناب سید ارشاد احمد دراکؔ قنوجی:

حاصل رہا دنیا میں بھی فیضانِ حسینؑ
عقبیٰ میں بھی پایا ہے گلستانِ حسینؑ
اللہ نے دی تجمّل کو عظمت دراک
جنت میں ہیں وابستۂ دامانِ حسینؑ

78 ۔ جناب شاہدؔ حیدری

وہ شاعرِ خوش فکر ثنا خوانِ حسینؑ
قدرت سے ملا تھا جن کو عرفانِ حسینؑ
وہ روحی فداک کہہ کے دم توڑ دیئے
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

79 ۔ جناب طاہرؔ عابدی

تھے شاعرِ اہلبیتؑ قربانِ حسینؑ
اُن پر تھا سدا نزولِ فیضانِ حسینؑ
رضواں کی صدا آئی یہ مجھ کو طاہرؔ
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

80 ۔ جناب طالبؔ اسدی:

حاصل جنہیں ہوجاتا ہے عرفانِ حسینؑ
کہلاتے ہیں وہ لوگ غلامانِ حسینؑ
مر کر بھی وہ محروم رہیں ناممکن
''جنت میں ہیں تجمّل زیرِ دامانِ حسینؑ''

81 ۔ جناب میرزا عادلؔ نجمی:

وہ بلبلِ خوش گوائے بستانِ حسینؑ
ہر سانس میں تھا نغمۂ فیضانِ حسینؑ

رکھتے ہو اگر ہوشِ نظر تو دیکھو
''جنت میں ہیں نجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

86۔ جناب محمد عبدالکریم ماہرؔ:

چھوٹا نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ حسینؑ
تا عمر رہے تابعِ فرمانِ حسینؑ
بخشش کے لیے ان کی یہی کافی ہے
تھے نجم افندی جو ثنا خوانِ حسینؑ

87۔ جناب میر محمد علی وفاؔ:

کرتے تھے بیاں وسعتِ امکانِ حسینؑ
روشن تھی نظر بہ فیضِ عرفانِ حسینؑ
مرتے ہی گئے خدمتِ شبیرؑ میں وہ
''جنت میں ہیں نجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

88۔ جناب وقارؔ جعفری:

کہلاتے ہیں جیتے جی محبانِ حسینؑ
مرتے ہیں تو پالیتے ہیں دامانِ حسینؑ
شبیرؑ کے قدموں میں ہیں اب نجم وقارؔ
احسانِ حسینؑ ہے یہ احسانِ حسینؑ

89۔ جناب آغا ہاجرؔ

حاصل نہ ہو کیونکر انہیں عرفانِ حسینؑ
جو لوگ دل وجاں سے ہیں قربانِ حسینؑ
کہتے ہیں فلک کے یہ ستارے ہاجرؔ
''جنت میں ہیں نجم زیرِ دامانِ حسینؑ''

باب دوم

مضامین
حیات
شخصیت
اور
فنِّ شاعری

حیات، شخصیت، فنِ شاعری

			صفحہ نمبر
1.	نجم آفندی (نایاب تحریر)	سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی	125
2.	نجم آفندی۔ ایک مطالعہ	جناب ضیاء الحسن موسوی	131
3.	نجم آفندی کا اسلوب شاعری	راحت حسین ناصری	142
4.	شاعر اہلِ بیتؑ اور ان کے پیغامات	ڈاکٹر سید علی مومن	151
5.	علامہ نجم آفندی کی نثر نگاری	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	183
6.	نجم آفندی کی ہندی شاعری	امیر امام حُر	189
7.	شاعر اہلبیتؑ علامہ نجم آفندی	سید باقر حسن زیدی	195
8.	نجم آفندی کا تابندہ کلام	ڈاکٹر شیخ انصار حسین	203
9.	نجم آفندی کی عزائیہ شاعری	ڈاکٹر نظیر حنین زیدی	209
10.	نجم آفندی اپنے خطوط کے آئینے میں	شمشاد حسین رضوی	213
11.	نجم آفندی اور پاکستان	سید ہاشم رضا	224
12.	نجم آفندی پاکستان میں	علامہ سید ضمیر اختر نقوی	229
13.	شاعرِ اہلِ بیتؑ حضرت نجم آفندی	جناب کسریٰ منہاس	241
14.	علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن	ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشنیر	246
15.	نجم درخشندہ	جناب واصف عابدی، سہارنپوری	263
16.	جناب نجم آفندی کی شخصیت	جناب سید معز الدین قادری ملتانی	266
17.	تعارف نجم آفندی	جناب قدر عریضی	284

سیّد العلماء مولانا سیّد علی نقی نقوی

نایاب تحریر

.....اس سلسلہ میں اب وہ مضمون درج کر رہا ہوں جو چند سال پہلے ان کی زندگی میں میں نے ان کے ایک لائق پاکستانی شاگرد مظفر صاحب کی فرمائش سے لکھا تھا جو ان کے حالات میں ایک کتاب لکھ رہے تھے یا لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ مضمون حسب ذیل تھا۔

شاعرِ اہلِ بیتؑ جناب حجم آفندی سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب وہ جوان تھے اور میں بچہ تھا یا اوائل زمانہ بلوغ کا دور تھا جسے عموماً بچہ ہی کہا جاتا ہے اور آپ سے اس وقت میں حجم آفندی نہیں بلکہ مرزا اجمل حسین اور شاعر نہیں بلکہ ایک پر جوش مضمون نگار کی حیثیت سے واقف ہوا تھا۔

وقت وہ تھا جب پہلی جنگ عظیم میں ٹرکی کے جرمنی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انگریزوں نے اس کے خلاف معرکہ آرائی کی اور عراق جو اس وقت ٹرکی کے زیر حکومت تھا، برطانوی فوجوں کے حملہ کا مرکز بنا اور علمائے عراق نے جن کے سرگروہ پہلے سرکار مرزا محمد تقی شیرازی تھے اور پھر اسی دوران میں ان کی وفات ہو جانے کی وجہ سے شیخ الشریعہ فتح اللہ اصفہانی معروف بآقائے شریعت ہوئے تھے، انگریزوں کے خلاف حکم جہاد دے دیا اور اس سلسلہ میں انگریزوں کی طرف سے نجف اشرف پر گولہ باری ہوئی جس کے ذیل میں معلوم ہوا کہ روضہ امیر المومنینؑ کو بھی کچھ نقصان پہنچا۔ اس کے پہلے آزادی ہند کی تحریک گاندھی جی کی زیر سرکردگی چل رہی تھی۔ ٹرکی پر حملہ کی وجہ سے مسلمان اکثریت علی برادران کی قیادت میں ان کے ساتھ متحد ہوگئی اور خلافت کمیٹی قائم کی تھی۔ شیعہ اب تک خاموش تھے مگر گولہ باری نجف کی خبر سے شیعوں میں بھی تلاطم ہوگیا اور لکھنؤ میں انجمن خدام عتباتِ عالیات قائم ہوئی جس کے سکریٹری جناب حکیم میرن صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے، جناب حکیم صاحب عالم صاحب کے چھوٹے بھائی محمد نواب صاحب تھے جو اس سلسلہ میں جیل بھی گئے۔ ان کے علاوہ ایک ہمارے خاندانی بزرگ جناب

حکیم سید علی صاحب آشفتہ بھی جو ہمارے والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کے عزیز شاگرد تھے، جیل گئے۔

لکھنؤ میں اس سلسلہ میں جو احتجاجی جلسے ہوئے، ان میں ہمارے والد ماجد صاحب ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن الموی طاب ثراہ پیش پیش تھے اور ہمارے چچا جناب علامہ مہدی اعلی اللہ مقامہ تو کانگریس سے بہت قریب ہو گئے تھے اور انگریزوں کے مقاطعہ اور ترکِ موالات کی تحریک کے بہت گرمجوش موید ہوتے ہوئے بالکل کھدر پوش ہو گئے تھے۔ باہر کے علماء میں جناب مولانا یوسف حسین صاحب قبلہ امروہوی اور جناب مولانا سید سبط نبی صاحب قبلہ نوگانوی اور بمبئی کے ایرانی عالم ثقتہ الاسلام شیخ عبد الرحیم بلبلہ ایران کے کوہ قاف والے علاقہ کے رہنے والے تھے جس پر روس کا قبضہ ہو گیا اور وہ تحریک مشروطیت ایران سے جلا وطن ہو کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ آقائے بلبلہ نے بڑے جلسہ کی صدارت بھی کی تھی۔ دیگر اکابر علمائے لکھنؤ چونکہ انگریزوں کی مخالفت کو بڑی خطرناک شے سمجھتے تھے اور اس تحریک میں براہ راست انگریزوں سے ٹکر کی صورت تھی اس لیے وہ تحریک کی اگر مخالفت نہیں بھی کر رہے تھے تو ہمت شکن بے تعلقی سے کام لے رہے تھے۔ اس وقت شیعی اخباروں کے صفحات پر بڑے پُر جوش اور پُر اثر مضامین مرزا تجمل حسین صاحب کے شائع ہو رہے تھے جن میں اس تحریک سے بے تعلقی اختیار کرنے والوں پر غم وغصہ کا اظہار بڑے تلخ انداز میں ہوتا تھا۔

اس ذیل میں ایک بڑا اہم واقعہ یہ ہوا کہ اکابر علمائے لکھنؤ میں سے ایک بزرگوار اس زمانہ میں زیارت کے لیے گئے، یہ کہہ کر کہ میں جا کر تحقیق کروں گا اور گنبدِ امیر المومنین کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کہ گولہ باری کی خبر صحیح ہے یا نہیں۔ فطری طور پر تمام افراد قوم نے یہ زمانہ بڑی بے چینی سے کاٹا۔ جب ممدوح لکھنؤ واپس آئے تو فوراً ہی ممتاز افراد شیعہ کا ایک وفد جس میں جناب حکیم امیر حسین صاحب مرحوم وغیرہ تھے۔ ممدوح سے ملا۔ ممدوح نے تفصیل کے ساتھ مظالم عراق کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ گنبدِ امیر المومنین پر گولوں کے نشان موجود ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان حضرات نے وہاں سے آ کر ایک چوصفحہ

''مظالم عراق عرب حسب بیان سرکار..... دام ظلہ العالی'' کے عنوان سے اپنے

دستخطوں کے ساتھ شائع کر دیا مگر اس کے شائع ہونے کے بعد شاید حکومت برطانیہ کی طرف سے کچھ چشم نمائی ہوئی یا جو بھی وجہ ہو، بہر حال موصوف کی طرف سے انکار ہو گیا کہ میں نے یہ چیزیں بیان نہیں کی تھیں۔

واعظین میں سے بھی ایک صاحب اس زمانہ میں عتباتِ عالیات سے مشرف ہو کر آئے تھے، انھوں نے بڑے زور و شور سے منبروں پر انگریز بہادر کی صفائی پیش کرنا شروع کر دی۔ اس سے افراد قوم میں بڑا غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جناب مرزا تجمل حسین صاحب کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ پھر آپ نے ان مضامین کو ترک موالات وغیرہ کے متعلق متعدد علماء کے فتاوے کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے یہ مجموعہ ہمارے والد ماجد ممتاز العلماء طاب ثراہ کو ملاحظہ کے لیے دیا تھا جو بعد میں کسی وجہ سے موصوف واپس نہ لے سکے۔ یہ جناب مرحوم کے کاغذات میں رہا جسے میں نے بچپن کے وقت سے دیکھا تھا۔ چند سال اُس طرف جناب نجم سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس قلمی مسودہ کا تذکرہ کیا اور پھر موصوف کی فرمائش پر دوسری دفعہ اسے اپنے ساتھ لیتا گیا اور ممدوح نے اس کو مجھ سے لے لیا۔

انجمن خدام عتبات عالیات کے دور کے ان مضامین کے بعد درمیانی دور میں جبکہ میری لکھنؤ میں طالب علمی کا دور تھا، میں جناب تجمل حسین صاحب اور جناب نجم صاحب، کسی سے بھی پھر واقف نہیں رہا، یہاں تک کہ میں تکمیل کے لیے عراق چلا گیا اور وہاں کے اشغال علمی میں منہمک رہا۔ اس دوران میں سرفراز اخبار میرے پاس بالالتزام جاتا تھا، اس لیے جناب نجم صاحب کی نظمیں جو اس میں ضرور شائع ہوتی ہوں گی، میری نظر سے یقیناً گزرتی تھیں مگر مجھے کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں لوگ تجمل حسین کو جیسے بالکل بھول گئے اور اب قوم میں جناب نجم بحیثیت قصیدہ گر اور اس سے زیادہ بحیثیت ایک خاص طرز نوحہ و ماتم کے موجد کے امتیازی شہرت کے مالک ہو گئے۔ میں عراق سے تکمیل کے بعد ۱۳۵۰ھ/۱۹۴۲ء میں واپس آیا۔ مگر اس کے بعد بھی عرصہ تک مجھے جناب نجم کے مشاہدہ کا موقع نہیں ملا یہاں تک کہ لوہامنڈی، آگرہ میں میری شادی ہو گئی اور اس سلسلہ میں وہاں میری آمد و رفت ہو گئی اور کبھی کبھی کئی کئی مہینے قیام رہا۔ اس وقت جہاں تک مجھے یاد ہے، سب سے پہلے میں نے جناب نجم

صاحب سے ملاقات اس وقت کی جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ معدہ کے شکایات کی وجہ تشویشناک حد تک بیمار اور صاحب فراش ہیں۔ اپنے تاثرات تو اس وقت کے یاد نہیں مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ آپ کا کلام جو اخباروں میں نظر سے گزرا تھا اس کا اثر ہی ہوسکتا ہے کہ مجھے غائبانہ ایک تعلق خاطر ممدوح کے ساتھ پیدا ہوا جس کی وجہ سے یہ یاد نہیں کہ کس کے ساتھ، مگر بہرصورت میں آپ کی عیادت کو گیا، ورنہ حکم شریعت تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کی عیادت کرنا چاہیے مگر عمل درآمد اس پر کہاں ہے؟ جب تک کسی سے شناسائی ہی نہیں، بلکہ عرف عام میں جسے ''ملاقات'' کہتے ہیں نہ ہو، اس وقت تک ہم لوگ کسی کی عیادت کو کہاں جاتے ہیں اور میں تو اس سلسلہ میں بہت زیادہ بے توفیق ہوں جس کی کمی میں اپنے میں محسوس کرتا ہوں۔ میں بہت سے اچھے خاصے ملنے والوں کی عیادت کو اکثر نہیں پہنچتا جبکہ ارادہ بھی کرتا ہوں مگر بغیر سابق کی ملاقات کے، میں جناب نجم صاحب کی عیادت کو چلا گیا۔ یہ موصوف کا غائبانہ دل پر اثر ہی ہوسکتا ہے۔

مجھے اس وقت کی موصوف کی صورت بھی اس وقت تک یاد ہے۔ وہ بہت ضعیف، زار و نزار نظر آئے اور تقریباً نشست و برخاست سے بھی معذور تھے۔ یقیناً رسمی طور پر نہیں بلکہ دل سے میں نے ان کے بازو پر دعا پڑھی اور جب آیا تب بھی دل سے یہی دعا تھی کہ یہ اچھے ہو جائیں اور تادیر سلامت رہیں۔ اس کے بعد موصوف اچھے ہو گئے اور پھر مجھے شاید بہت دن تک ممدوح سے ملاقات کا موقع نہیں ہوا۔

ادھر تصانیف وغیرہ کی صورت سے میرے ناچیز جذبات جو موصوف کی نظر سے گزرتے تھے، ان سے ان کو مجھ سے تعلق کچھ بڑھتا گیا ہوگا اور ادھر ان کے نتائج فکر جو اخباروں میں آتے تھے، ان سے میں نے محسوس کیا کہ ان کا وجود اور انداز شاعری اس وقت قوم کی ایک بہت اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے، یہاں تک کہ شیعہ سنی کے درمیان مدح وقدح کے جھگڑے نے شدت اختیار کی اور شیعوں کا وہ مشہور ایجی ٹیشن ہوا جس میں اٹھارہ ہزار شیعہ جیل چلے گئے تھے۔ بوجوہ میں نے اس ایجی ٹیشن میں حصہ نہیں لیا تھا مگر جب سنا کہ جناب آقندی جیل گئے تو میں لکھنؤ کی جیل میں، جو چارباغ کے آگے ہے، قیدیوں سے ملاقات کے لیے گیا تھا اور اس وقت کی صورت بھی شاعرِ اہلِ بیتؑ کی حافظہ کے خزانہ میں امتیازی طور پر محفوظ ہے جب وہ لوہے کے کٹہرے میں

تھے اور میں باہر سے ان سے صاحب سلامت کر رہا تھا اور شاید مختصر گفتگو بھی۔

اب اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب میں نے تحریک یادگار حسینؑ ۱۳۶۱ھ کے سلسلہ میں کام شروع کیا۔ اس وقت جناب نجم کا ریاست محمود آباد سے تعلق تھا۔ میں تحریک کے سلسلہ میں تعاون حاصل کرنے کے لیے تقریباً ہر کارآمد آدمی سے مل رہا تھا۔ چنانچہ محمود آباد ہاؤس میں جناب نجم کے پاس گیا اور یادگار کے منصوبہ کو موصوف سے بیان کیا اور آپ نے گرمجوشی سے اس میں تعاون کا وعدہ کیا۔ اس ملاقات کے ذیل میں آپ نے اپنی نوحہ گوئی کی ایک خصوصیت کا تذکرہ فرمایا تھا جس پر مجھے اس وقت تک توجہ نہ تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے جناب نجم کے نوحوں کے پڑھنے والے اس خصوصیت کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ میں بھی دیگر اشخاص کی طرح موصوف کے نوحہ کی خصوصیت، نوعیت مضامین کے لحاظ سے سمجھتا تھا مگر یہ اسلوب بیان کی وہ خصوصیت ہے جس کی طرف اس ملاقات کے بعد توجہ ہوئی اور پھر برابر توجہ رہی۔

وہ خصوصیت یہ ہے کہ عموماً نوحہ کو حضرات کسی کی زبانی نوحہ کرتے ہیں، مثلاً بانو نے کہا یا سکینہؑ کہتی تھیں یا جناب زینبؑ فرماتی تھیں۔ یہ نوحہ حقیقت میں نقل قول یا روایت نوحہ کہا جا سکتا ہے۔ خود نوحہ نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علماء کو اس کے جواز کے لیے ''زبان حال'' کا دامن تھامنا پڑتا ہے کیونکہ وہ اقوال جو ان حضرات کی زبانی نظم ہوتے ہیں، عموماً کسی کتاب میں ان حضرات کے قول کی حیثیت سے وارد نہیں ہوئے ہیں۔ جناب نجم کے یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ وہ نوحہ میں جن تاثرات کو درج کرتے ہیں وہ خود ان کے تاثرات ہوتے ہیں، یوں کہنا چاہیے کہ وہ خود نوحہ کرتے یا واقعہ کربلا پر دردانگیز انداز سے تبصرہ کرتے ہیں اور اس طرز کی ابتدا غالباً آپ ہی نے کی ہے۔

جیسا کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا، یادگارِ حسینؑ کی تحریک میں آپ نے بڑے انہماک کے ساتھ تعاون فرمایا۔ چونکہ اس سلسلہ کے اجتماعات بین الاقوامی ہوا کرتے تھے، اس لیے آپ کا طرزِ ادا واقعات کربلا کے متعلق ان اجلاسوں کے لیے بڑی مخصوص کارآمد حیثیت رکھتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ آپ کی ہندی بھاشا کی نظم ''کربل بیتی'' بڑی موثر ثابت ہوتی تھی۔ بھرت پور وغیرہ کے یادگار حسینؑ کے جلسوں میں اس نظم کے غیر معمولی اثرات دیکھنے میں آئے۔ یہ نظم

۱۳۶۱ھ میں شائع ہونے کے بعد پھر امامیہ مشن کے لٹریچر کا ایک جز بن گئی۔

جب ایک طبقہ کی طرف سے قوم میں میرے خلاف شدید محاذ قائم کیا گیا تو جناب نجم کے عملی استقلال، پختہ نگاہی اور ثابت قدمی کا وہ جوہر سامنے آیا جس کا اس کے پہلے تجربہ نہ ہوا تھا۔ میرے خیال میں تو اس شدید مخالفت میں جو مجھ سے تمام لوگوں کو دور کرنے کے لیے کی گئی، وہ لوگ پہلے سے زیادہ مجھ سے قریب ہوگئے، ان کی سب سے آگے کی صف میں جناب نجم تھے۔ بالخصوص جب سے نظام الدین صاحب کے یہاں ماہ جمادی الاول میں میرے حیدرآباد جانے کا سلسلہ قائم ہوا اور پھر حضور نظام کے آخر زندگی تک سال میں دو ایک اور کبھی تین دفعہ ان کے یہاں جانا ہوتا تھا، اس وقت سے ممدوح کی محبت میں مجھ سے بہت اضافہ ہوگیا اور مجھے بھی زیادہ قریب سے ممدوح کے اوصاف بلند کو دیکھنے کا موقع ملا، جس کا مجمل تاثر یہ رہا کہ وہ چھوٹے قد میں بہت بڑے دل اور پست قامت میں بلند ہمت اور کمزور جسم میں طاقتور ارادہ کے مالک ہیں اور دل و دماغ دونوں بڑے حساس رکھتے ہیں اور ان دونوں کے تناسب سے وہ زبان بھی رکھتے ہیں جو دونوں کے احساسات کو پیش کرنے کا حق ادا کردے۔ یہ ہے ان کے اوصاف پر مختصر تبصرہ۔ اس کے علاوہ ان کے کام کی افادیت کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ ان کے نوحوں نے تبلیغ حسینیت کی وہ ضرورت پوری کی جو اس دور میں بغیر ان کے نوحوں کے پوری نہیں ہورہی تھی۔

یہ سب وہ اپنے تجربات اور احساسات ہیں جن کے لکھنے کا میں اپنے لیے حق محسوس کرتا ہوں۔ رہ گئے ان کے کمالات شاعری، ان پر لکھنے کا حق کسی اردو کے ادیب اور شاعر کو ہے اور میں ظاہر ہے کہ اردو زبان کے ادیب اور شاعر کی حیثیت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کو ان لوگوں کے لیے چھوڑتا ہوں جن کا یہ حق ہے۔

علی نقی النقوی

دوسرا دیوان ''باغِ بزم'' کے نام سے شائع ہوا۔ باقی پانچ غیر مطبوعہ ہیں۔ حیدرآباد میں بزمؔ اکبرآبادی نواب تراب یار جنگ سعیدؔ مرحوم سے وابستہ رہے اور نواب تراب یار جنگ سعیدؔ مرحوم باوجود یہ کہ پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد تھے، مگر وہ ہر مدرسۂ شاعری کے اربابِ کمال کی قدردانی کرتے تھے اور ان کے فرزند نواب عباس یار جنگ رشیدؔ، جو میرے عزیز دوست ہیں، انھوں نے اپنے والد کے بعد سب سے زیادہ استفادہ حضرت بزمؔ ہی سے کیا ہے۔

حضرت بزمؔ کا رنگِ تغزل ملاحظہ ہو

ایک شب عرش پہ محبوب کو بُلوا ہی لیا — ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اُٹھایا نہ گیا
ایک عالم گوش برآواز تھا یومِ اَلست — جو تڑپ اُٹھا وہ ذرّہ قلبِ مضطر بن گیا
قفس میں دور ہوئی نیند آشیانے کی — کھُلی جو آنکھ فضا اور تھی زمانے کی
اسیرِ قیدِ کہن چھوٹ کر کہاں جائیں — زمین پاؤں پکڑتی ہے قید خانے کی

مرثیے کا ایک بند ملاحظہ ہو

پیدا ہوا ہے جوہرِ جرأت، علیؑ کے ساتھ — رفعت ہوئی ہے قابلِ رفعت، علیؑ کے ساتھ
جھولے میں جھولتی تھی شجاعت، علیؑ کے ساتھ — بچپن میں کھیلتی تھی قیامت، علیؑ کے ساتھ

گویا علیؑ کے ساتھ پلی اور بڑی ہوئی
جب پاؤں یہ چلے تو قیامت کھڑی ہوئی

حضرت عونؑ و محمدؑ کے گھوڑوں کی تعریف میں یہ تشبیہ حضرت بزمؔ ہی کا حصہ ہے۔

دونوں فلک نَورد ہیں گردوں صریر ہیں
گھوڑے ہیں یا کہ فکرِ انیسؔ و دبیرؔ ہیں

انہی بزمؔ کی شاعری کا حاصل مرزا تجمل حسین تجمؔ آفندی تھے جن کو سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ نے ''شاعرِ اہلبیتؑ'' کا خطاب دیا اور یہ خطاب ان کے نام کا جزو بن گیا۔ تجمؔ آفندی عہد حاضر کی مدّاحیٔ اہلبیتؑ رسولؐ میں ''سنگِ میل'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مدح ورثاء کو ایسا نیا رنگ اور نیا آہنگ دیا ہے جس کی چھاپ ان کے ہر مصرعے پر نظر آتی ہے۔

تجمؔ آفندی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر مفید عام اسکول آگرہ سے مڈل کا

امتحان پاس کیا اور اردو فارسی عربی اور انگریزی کی اچھی خاصی استعداد مطالعے سے حاصل کی۔ وہ وضع قطع، اخلاق و کردار، مروت و وضعداری اور حسنِ معاشرت کے لحاظ سے قابلِ نمونہ تھے اور جو خیالات ان کے کلام میں ملتے ہیں، وہ ان کی اپنی زندگی میں بھی جھلکتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل چند سال میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ میرے چھوٹے ماموں سرکار سعید الملتہ مرحوم سے بہت مانوس تھے تا اینکہ محاذ حسینی میں قید و بند کی صعوبتوں کے بھی ساتھی رہے۔ اس رفاقت میں حضرت مہذبؔ لکھنوی، مولانا سید سبط الحسن صاحب فاضل ہنسوی اور سید افضال حیدر کاظمی سہاناؔ بھی شامل تھے۔ اس زمانہ میں وہ جیل سے نظمیں لکھ لکھ کے بھیجتے تھے اور میں، جو خواجہ اسدؔ مرحوم کے ساتھ روزنامہ اسدؔ میں کام کرتا تھا، ان کو شائع کرتا تھا۔ ان نظموں کا مجموعہ مصطفےٰ علی ہاشمی صاحب نے مکتبۂ ناصری لکھنؤ سے ''شاعرِ اہلبیتؑ جیل میں'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اتوار کے دن لوگ قیدیوں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ شہر سے میلوں دور پہنچنے والوں کی تعداد میں کمی ہوگئی تو انھوں نے ایسی ہی ایک اتوار کو مجھ سے کاغذ پنسل طلب فرمایا اور سلاخوں کے پیچھے سے ارتجالاً چند شعر لکھ کے مجھے دے دیے۔ جب وہ شائع ہوئے تو نہ صرف قیدیوں سے ملنے والوں، بلکہ قید و بند کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے والوں میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ ان اشعار میں سے دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں

کبھی اے اہلِ الفت دل کی دنیا دیکھنے آؤ　　تماشا بن نہیں سکتے تماشا دیکھنے آؤ
گزاری ہے ابھی تک عمر زندانِ خیالی میں　　حقیقت میں قفس ہوتا ہے کیسا دیکھنے آؤ

لکھنؤ کی ملاقات کے بعد حضرت حجمؔ سے حیدر آباد دکن میں بہت ربط ضبط رہا جہاں وہ شاہزادہ معظم جاہ بہادر شجیعؔ کے اُستاد تھے۔ کئی سال تک یہ سلسلہ رہا مگر درباری زندگی ان کے لیے ایک جبر کی سی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ آزادی ہند و پاکستان کے بعد وہ بھی اس جبر سے آزاد ہوگئے مگر وہیں مقیم رہے۔ کچھ عرصے قبل وہ پاکستان آئے مگر انتہائی ضعیفی اور گراں گوشی کی وجہ سے خانہ نشین رہے۔ میں نے ان کو آخری مرتبہ محرم ۱۳۹۵ھ میں ریڈیو پاکستان کی محفل مسالمہ میں سُنا۔ اپنا سلام ریکارڈ کرانے کے بعد وہ محفل سے رخصت ہوگئے اور سال ختم ہونے سے کچھ قبل دنیائے ادب و شاعری سے بھی رخصت ہو گئے۔ ان کی موت کی مختصر سی خبر اخبار میں نظر سے

گزری تو مجھے ان کا یہ شعر یاد آیا

خدا چاہے تو وقت آتا ہے سننے کا سمجھنے کا
میں کہتا ہوں مگر سنتی نہیں دنیا بھی میری

نجم آفندی نے دس بارہ سال کی عمر ہی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ کچھ عرصے تک اپنے والد سے اصلاح لی مگر ان کی جدّت طبع نے بہت جلد ان کو اصلاحِ سخن سے بے نیاز کر دیا اور وہ قوم کی اصلاح اور نئے نئے جادہ ہائے سخن تراشنے میں مصروف ہو گئے۔

دہلی میں ان کو ریلوے کی ملازمت مل گئی تو وہ آگرہ سے دہلی آ گئے جہاں نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ، جناب بیخودؔ دہلوی اور امرناتھ ساحرؔ جیسے اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی اور ان کا جوہر ذاتی درخشاں ستارے کی طرح چمکنے لگا۔ ایک مرتبہ جناب سائلؔ دہلوی نے ان کو ایسے مشاعرہ کا صدر بنایا جس میں اکثر عمائدین شہر نے شرکت کی۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت اور مقبولیت عام ہوتی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا جہاں انھوں نے انجمن شباب سخن قائم کی جس کے زیر اہتمام ہر مہینے ایک اچھا مشاعرہ ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں ان کو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ان اجلاسوں میں حضرت صفیؔ لکھنوی کا طوطی بولتا تھا۔ جب نجمؔ آفندی اس اسٹیج پر آئے تو معلوم ہوا کہ قومی اصلاح و ترقی کی دنیا میں ہلچل مچ گئی تا اینکہ الہ آباد کے اجلاس میں جس کے صدر، مرحوم راجا! ابوجعفر صاحب تھے، نجمؔ آفندی کی نظم کے عوض ایک بزرگوار نے کانفرنس کو ساڑھے چار ہزار روپے دیے اور اصل نظم، جو نجمؔ کے قلم کی لکھی ہوئی تھی، وہ خرید لی۔

میرے والد مرحوم سید نجم الحسن صاحب نجمؔ موسوی سے نجمؔ آفندی کی دوستی اسی کانفرنس کے اسٹیج پر ہوئی اور یہ دونوں نجمؔ شعر و سخن اور خدمت قومی کے رشتے سے بھائی بن گئے اور ان میں برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ کیا عجب ہے کہ یہی ربط نجمؔ آفندی کو حیدرآباد کھینچ لے گیا ہو اس لیے کہ والد مرحوم پائیگاہ سروقارالامراء میں ملازم تھے اور شاہی خاندان کے متعدد افراد کے اتالیق و نگراں بھی رہے تھے اور حضور نظام کے قریبی وابستگان میں شامل تھے، وہ برابر حضرت بزمؔ اور سید علی رضا صاحب سے تقاضا کرتے کہ نجمؔ صاحب کو حیدرآباد بُلا یئے!

جب برصغیر میں تحریک ترکِ موالات پھیلی تو نجم آفندی نے سرکاری ملازمت ترک کردی اور رُدولی لکھنو اور آگرہ میں کچھ وقت گزار کے حیدرآباد آگئے جہاں نواب شہید یار جنگ کنٹرولر جونیئر پرنس نے ان کو شاہزادہ معظم جاہ بہادر سے متعارف کرایا اور معظم جاہ ان کے گرویدہ ہوگئے اور جب نجم آفندی شہزادہ معظم جاہ کی اُستادی سے دستکش ہوگئے تو انھوں نے چھتہ بازار میں ایک دکان کھول لی جس میں مشقِ سخن کے ساتھ جوتے اور چپل فروخت کرتے تھے اور شام کو حکیم محمد عباس صاحب سرسوی کے گھر واقع دارالشفاء کی محفلوں میں حصہ لیتے تھے جہاں نواب شہید یار جنگ، سید علی رضا صاحب، سید علی بن کاظم صاحب، زیبا رُدولوی، سید علی محمد اجلاؔل صاحب، مولانا غلام عباس ناصؔر، یگانہ چنگیزی، مہذبؔ لکھنوی غرض مختلف مہمان اور مقامی اہل کمال ادیب اور شاعر جمع ہوتے اور ہر قسم کی پُر تکلف اور بے تکلف نشستیں ہوا کرتیں جن میں فلسفہ ومذہب کے نکات بھی زیر بحث آتے، شعروادب کی بلندیاں بھی نظر آتیں اور یار باشی، لطائف اور دعوتوں کے سلسلے بھی جاری رہتے۔ سات آٹھ سال تک میں بھی اس بزم کا ایک رُکن رہا جس میں سن وسال اور علم واستعداد کی کوئی قید نہ تھی اور فقط ''مذاقِ سلیم'' یا ''ہمرنگیٔ جماعت'' شرط شمولیت تھی۔ اسی محفل کا ہفت روزہ اجتماع شب جمعہ کو شہر حیدرآباد کے مضافات میں واقع مذہبی مقامات، مثلاً کوہِ مولا علیؑ، کوہ امام ضامنؑ، کوہ قائمؑ وغیرہ پر ہوتا جہاں نماز و اوراد وظائف کے بعد قصیدہ خوانی ہوتی۔ اس کے بعد پُر تکلف دعوتِ طعام اور پھر علمی مذہبی گفتگو کے بعد جب باقاعدہ محفل برخاست ہوجاتی تو آقائے میرزا علی شریعتی اور مولانا عباس حسین (جو اعجاز منزل کی نسبت سے مشہور اور بڑے صاحب مطالعہ عالم تھے) اور علامہ رشید ترابی جیسے بزرگ بھی ہمارے ''بازی بازی باریش بابا ہم می بازی'' میں شامل ہوجاتے اور ''مزاح المومنین'' کے منازل طے کرتے۔ نجم آفندی مرحوم جن کی ظرافت کبھی فقرہ بازی سے آگے نہ بڑھی، نواب شہید یار جنگ کی طرح آگ پر تیل چھڑکتے اور اپنی بزرگی کے دائرہ میں محصور رہتے۔ یہ ساری تفریح بھی ادب وذہانت کی تفریح ہوتی جس میں فی البدیہہ اشعار کہے جاتے، مصرعوں پر مصرعے لگائے جاتے یا زیادہ سے زیادہ مائل بہ خواب علماء سے فتوے پوچھے جاتے کہ ہاتھی کا وضو کیسے ٹوٹتا ہے؟ اور آئس لینڈ میں غسل کی کیا صورت ہوگی؟ اور برف پر تیمم'' کیسے ہوگا؟ کچھ دیر کے بعد پاسبان عقل واپس آجاتا اور اس خیال سے سب، کچھ

دیر کے لیے محوِ خواب ہو جاتے کہ فریضۂ سحری تو بہر حال ادا کرنا ہی ہے!

تجمؔ آفندی کے شاگردوں میں وفاؔ ملک پوری، رزمؔ ردولوی، جلیسؔ ترمذی، خاورؔ نوری، بانوؔ سید پوری، مضطرؔ حیدرآبادی، ساجدؔ رضوی، زیباؔ ردولوی، رعناؔ اکبرآبادی، مضطرؔ حیدری اور راحتؔ عزمی جیسے معروف و مقبول شعراء بھی شامل ہیں۔

تجمؔ آفندی کی پچیس تصانیف طبع ہو چکی ہیں جن میں ''معراجِ فکر'' اور ''فتحِ مبین'' جیسے دو عظیم مرثیے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ قصائدِ تجمؔ۔ آیاتِ غم۔ بیاضِ تجمؔ۔ اشاراتِ غم۔ چنتخبی قصائد۔ تصوراتِ غم۔ کربل نگری۔ تاثرات زیارت۔ پریم بھگتی۔ کاروانِ ماتم۔ حسینی اور ہندوستان اور شاعرِ اہلبیتؑ جیل میں، یہ بھی شامل ہیں۔ تجمؔ آفندی نے اپنی اکثر کتابیں اپنے قلم سے کچھ لکھ کے مجھے عنایت فرمائی تھیں، جو حیدرآباد دکن میں رہ گئیں۔ کچھ یادگار تصویریں بھی تھیں جن سے وہ یادیں وابستہ ہیں جو اب تجمؔ صاحب کے انتقال کے بعد اور زیادہ ذہن کو ماضی کی طرف لے جاتی ہیں اور کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا کو فراموش کرا دیتی ہیں اور پھر تجمؔ صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

جب ان کے ایک شعر کا تذکرہ ہوا ہے، تو چند اشعار اور بھی سہی

ابھی ناز کر رہے تھے جو زمانے کی روش پر
وہ پلٹ کے دیکھتے ہیں تو بدل گیا زمانہ

بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل
ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

بہت کیا چاہتا ہوں آدمی سے
ذرا سی آدمیت چاہتا ہوں

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

عیش کیا سخت سزا دیتا ہے
مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے

اس وہم میں ہیں حاملِ امروز کے مالک
چڑھتے ہوئے دریا کو اُترنا نہیں آتا

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزت کی موت سستی ہے

وہ مردہ دل جئیں گے خاک جن کا یہ عقیدہ ہو
جہاں تک سانس آتی ہے وہاں تک زندگانی ہے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں
جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے!

حجم آفندی کی غزلیات اگر بہم پہنچ جائیں تو ان میں سے ایسے صدہا اشعار منتخب ہو سکتے ہیں جن کی جھلا ہی پکار پکار کے کہے گی کہ ہم حجم آفندی کے اشعار ہیں۔

حجم آفندی روایت سے بغاوت کا نام ہیں مگر وہ بغاوت نہیں جو روایت کو تباہ کر دے یا اس کا تسلسل ختم کر دے۔ ان کی بغاوت اس منجمد ذہنیت سے ہے جو روایت کو اپنے عہد اور اس کے ذہن وفکر کے مطابق آگے بڑھانے کے بجائے روایت پر اڑ جاتی ہے۔

انھوں نے سب سے پہلے رُباعیات، سلاموں اور نظم نما نوحوں سے اپنا کام شروع کیا اور اسلامی تعلیمات اور شہادت عظمیٰ کے ایسے پہلو پیش کیے جو مسلمانوں کو متحرک کر سکیں اور ان کو وحدت، مساوات، عدل اور ایثار وقربانی کی عملی راہ اختیار کرنے کی طرف مائل کر سکیں۔ وہ پکارتے ہیں۔

مایوسِ شفا کو آسرا دیتے ہیں　　آیات کو تعویذ بنا دیتے ہیں
ہشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق　　بیہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

وہ حیران ہیں کہ

جس قوم نے سر کی مہم کرب و بلا　　اس قوم میں ملتے نہیں آثار حیات ؟
وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں　　جس قوم کے ورثے میں ہو عاشور کا دن؟
اسلام پیام امن ہے یاد رہے　　سنّی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو؟

پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

شبیرؑ ترے ماننے والے ہیں بہت　　لیکن ترے پہچاننے والے کم ہیں!

اور اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ جن پر ہے، ان کو وہ للکارتے ہیں

آ درسِ عمل کے دار کر سامنے آ !　　دل والوں کے دل شکار کر سامنے آ !
واعظ تری تبلیغ سر آنکھوں پہ مگر　　چہرے سے نقاب اتار کر سامنے آ !

اور پھر انھوں نے خود اپنا فرض ادا کرنا شروع کیا اور کہا کہ

شاعر ہوں مجھے دماغ تفصیل کہاں　　سو بات کی اک بات کہہ دیتا ہوں!

اور یہ بات انھوں نے اس انداز سے کہنا شروع کی:

حق کو باطل سے جدا کرنے کو اٹھے تھے حسینؑ　　اقتضا وقت کا تھا بیچ میں تلوار آئے

کیا حسینیؑ کارواں میں تھا شعورِ زندگی
بڑھ گیا جوشِ عمل جب مرنیوالے کم رہے

وہ عصرِ تنگ سے پہلے حسینؑ کی نظریں
ہر اقتدار کا سر جھک گیا جدھر دیکھا

جہاں نواز جو پیغام کربلا نہ رہے
کہاں دلوں میں زبانوں پہ بھی خدا نہ رہے

کچھ ایسے وقت میں زنجیر پہنی عابدؑ نے
کہ اس گھرانے سے صدیوں یہ سلسلہ نہ گیا

کہاں اشکِ غم اور کہاں قصرِ جنت
ہمیں تجھ قیمت گرائے ہوئے ہیں

حضرت مسلمؑ کو سلام کرتے ہوئے کہا:

نکلا وطن سے بارِ سفارت لیے ہوئے
فرمانِ بارگاہِ امامت لیے ہوئے

آقا کے اعتماد کی دولت لیے ہوئے
شبیرؑ کا پیامِ محبت لیے ہوئے

لاکھوں سلام تجھ پہ محبت کے ایلچی

علمؑ حضرت عباسؑ کے لیے کہتے ہیں:

مرثیہ ہمت فزا ہے اس علم کے حال کا
رہ گیا ہے یہ نشاں اسلام کے اجلال کا

یہ علم ہے اے مسلماں مصطفیؐ کی آل کا
خون میں ڈوبا ہوا دریا سے آتا ہے علم

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت پر کہتے ہیں:۔

کیا تین دن کی پیاس میں تیور دکھا گئے
دنیا کے نوجوانوں کی ہمت بڑھا گئے

پھولوں میں تُل رہے تھے سنانوں میں آ گئے
اکبرؑ جواں تھے جی سے گزرنے کے دن نہ تھے

اے دشتِ کربلا ابھی مرنے کے دن نہ تھے

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت پر کہتے ہیں:

یہ تشنگی یہ پیکاں یہ سن یہ بے زبانی
لائے گی رنگ اک دن اسلام کی کہانی

خونِ گلو سے اپنے رنگین بنا رہا ہے
ننھا سا اک سپاہی گودی میں آرہا ہے

شہداءِ کربلا کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

تیرہ سو برس سے تپ رہے ہیں ان جیوٹ مرنے والوں کے
تڑپے نہیں خود خنجر کے تلے دنیا کو تڑپتا چھوڑ گئے

اور خوب کہے گئے۔ میں نے بھی اس صنف میں قلم اٹھایا ہے۔ اور ایک مرثیہ پیش کر رہا ہوں.....''

''فتح مبین'' میں مصائب کے نقطۂ عروج پر پہنچ کے نجم کہتے ہیں:۔

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا　　بدلا لہو سے رنگ گلستانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا　　سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا فرش خاک پہ لاشا پڑا ہُوا
بالیں پہ فتح حق کا تھا جھنڈا گڑا ہُوا

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب　　بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب
مجبورئ حیات سے کونین کو حجاب　　نیزہ پہ سر حسینؑ کا مغرب میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا　　اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا　　بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنا اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

''معراج فکر'' نجم نے اس وقت کہا جب انسان، زمین سے چاند کی طرف بڑھ رہا تھا:۔

اہل زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر　　ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر　　مردان حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

نوحوں اور سلاموں میں نجم آفندی کے تجربات اپنا لیے گئے مگر مرثیہ نگاروں نے مہیکی مصائب کے عنصر اور رزم وبزم کے روایتی مضامین نہ ہونے کی وجہ سے مراثی نجم کو ''مسدس'' کہنے پر اصرار کیا— جہاں تک میں سمجھتا ہوں، نجم نے اس پر ردوقدح بھی نہیں کی۔ ان کا مقصد،

جناب راحت حسین ناصری

نجم آفندی کا اسلوبِ شاعری

ٹیس پھر دل میں اٹھی پھر مجھے غم نے گھیرا
پھر کراہا دلِ بے تاب خدا خیر کرے

موت قدرت کا وہ اٹل فیصلہ جس میں کوئی تغیر محال اور اس سے نجات ناممکن ہے۔ اس دارِ فانی میں آنا ہی دلیل واپسی ہے۔ ہر آغوش مادر میں آنے والے کے لیے آغوش لحد لازمی اور حتمی ہے۔ اس سے نہ کوئی رسول بچا نہ خاصانِ خدا۔ یہاں تک کہ خاتم النبیین نے بھی دارِ فانی کو چھوڑا۔

یوں تو اس عالم گزرگاہ میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن بعض ہستیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو اپنی غیر معمولی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قوم وملت میں ایسا بلند مقام حاصل کرلیتی ہیں کہ ان کی حیات، قوم کے لیے عظیم سرمایہ بن جاتی ہے۔ وہ قوم وملت کے دماغوں کو جھنجھوڑ کر، بیدار کر کے روحِ عمل پھونک دیتی ہے۔ ان کی حیات کا ہر ہر لمحہ قوم کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہوتا ہے اور ان کا اس دارِ فانی سے جانا ایک عظیم نقصان ہوتا ہے اور ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جو پُر نہیں ہوتا، نہ اس کی تلافی ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملّتِ جعفریہ میں ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے ملت کو بیدار کر کے ان میں روح عمل پھونکنے میں اپنی عمریں صرف کردیں۔ ان ہی عظیم ہستیوں میں ایک ذات جناب نجم آفندی اکبرآبادی مرحوم ومغفور کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم نے ذکر حسینؑ کے لیے قوم کو ایک نیا اندازِ فکر دیا۔ انھوں نے اب سے ۶۰ سال پیشتر جب کہ مجالس عزا اور ذکرِ سید الشہدا صرف مصائب کی حدود میں گھرا ہوا تھا اور شعراء نوحہ وماتم میں صرف مصائب نظم

کرتے تھے اور اس قدیم دائرے سے نکلنا ایک گناہ تصور کرتے تھے، اس وقت یہی ذات تھی جس نے نیا انداز پیش کیا اور نوحہ میں بجائے مصائب کے کردارِ شہدا اور فلسفۂ شہادت کو نظم کیا، جس طرح جناب سلطان الذاکرین مولانا سبطِ حسن صاحب قبلہ مرحوم نے ذاکری کو ایک نیا رُخ دیا۔ جناب نجم نے نظم میں جدت پیدا کر کے اور ایک نرالا طرز دے کر قوم کے دماغوں میں روشنی پیدا کی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ موجودہ طرز مرثیہ کوئی جناب نجم اور صرف جناب نجم کی بدولت ہے۔ اور اس وقت کے جملہ مرثیہ گو اور نوحہ و ماتم کہنے والے انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور انہیں کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہیں، وہ جوش ہوں یا آلِ رضا سب، ان ہی کے رہینِ منت ہیں۔

میری سب سے پہلی ملاقات جناب نجم مرحوم سے 1920ء میں ہوئی۔ فیض آباد میں جناب علی اظہر صاحب بیرسٹر مرحوم کے یہاں سالانہ محفلِ مقاصدہ 13/ رجب کو ہوتی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے ان کو وہیں سنا۔ مرحوم نے سب سے پہلے قصیدہ ہی میں نیا رُخ پیدا کیا، اور پُرانے طریقے کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کی۔ اس وقت تک قصائد میں تشبیب، عشقیہ مضامین اور بہار وغیرہ پر ہوتی تھی۔ جناب نجم نے اس سے الگ ہو کر ایک نیا رُخ اختیار کیا اور بجائے عشقیہ مضامین کے فلسفیانہ مضامین نظم کیے۔ چنانچہ اپنا پہلا قصیدہ 1920ء میں اس محفل میں پڑھا۔ اس وقت ان کا سن غالباً 26 یا 27 سال کا تھا۔

اس محفل میں جناب صفی لکھنوی مرحوم، جناب عزیز لکھنوی مرحوم اور دیگر اساتذہ موجود تھے۔ مقاصدہ کا آغاز ہوا اور مقامی شعرا کے بعد جناب نجم مرحوم کی باری آئی۔ کسی کے تصور میں بھی نہ تھا۔ ایک 26 یا 27 سال کا نوجوان پوری محفل پر چھا جائے گا اور کامیابی اسی کو نصیب ہوگی۔ مرحوم کی آواز میں کوئی سُر نہ تھا بلکہ ایک حد تک بڑی بے سُری تھی۔ ظاہر ہے کہ ان محافل میں آواز اور پڑھنے کا لہجہ ہی زیادہ اثر پذیر ہوتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود جس وقت انھوں نے قصیدہ شروع کیا تو لوگوں کے دماغ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس پہلے قصیدے کا مطلع یہ تھا۔

نمودِ عالم ہُو تھی فضائے تیرہ و تار
نہاں تھے کتمِ عدم میں چراغ و شمع و شرار

مطلع نے ہی اساتذہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ چند اشعار کے بعد جب یہ شعر پڑھا

سنور رہی تھی یہاں جب کہ عنصری دنیا
میں اپنی نور کی دنیا سے دیکھتا تھا بہار

تو جناب صفؔی نے بہت جوش کے ساتھ تعریف فرمائی۔ اس کے بعد گریز اور اُس کے بعد اشعار پر اساتذہ کا یہ عالم تھا کہ جھوم جھوم کر تعریف کر رہے تھے، اور پوری محفل تعریف کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ فرماتے ہیں

ایک اور جلوہ صبر آزمانے دل مانگا
ابھی تو لٹ ہی چکا تھا کسی کا صبرو قرار
علیؑ کنارِ نبیؐ میں نبیؐ ہیں کعبہ میں
چمن میں گل ہے تو دامانِ گلستاں میں بہار
مَلک بھی حاضرِ خدمت نبیؐ بھی ہیں موجود
علیؑ کے نور سے کعبہ ہے مجمعِ انوار
ملی تھیں یہ صفتیں نام جب اسد پایا
خدا کا شیر نواسہ اسد کا شیر شکار
بنائے مقصدِ اعلیٰ جہان کا مقصود
شریک قسمتِ زہراؑ رسولؐ کا دیدار
پڑھا دیے جسے دو حرف عقلِ کُل ٹھہرا
بڑھا دیا جسے سدرہ کا کردیا مختار
گھٹا دیا جسے اُبھرا نہ پھر قیامت تک
بتوں نے خانۂ کعبہ میں پھر نہ پایا بار

یہ ان کا پہلا قصیدہ تھا۔ اِس کے بعد انھوں نے یہی انداز اپنے کُل قصیدوں میں اختیار کیا۔ اس کے بعد نوحہ وماتم کی طرف توجہ فرمائی۔ اس میں ایک ایسا تغیر کیا کہ وہ نوحہ و ماتم صرف بکا کے لیے مصائب وبین پر مبنی ہوتے تھے، اس میں کردار حسینؑ اور شہدائے کربلا کے کردار کا وہ

رنگ بھرا جس نے اس فن کو اپنے عروج پر پہنچادیا۔ پھر لطف یہ کہ کسی جگہ سے مقصدِ عزا یعنی گریہ میں کوئی کمی نہیں، بلکہ زیادتی ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں شعرا نے یہ رنگ اختیار کیا اور یہی رنگ آج تک باقی ہے۔ ان کے ماتم ونوحوں کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ ان کے شائع ہونے کے فوراً ہی بعد ہندوستان میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں یہی اور صرف یہی نوحے نہ پڑھے جاتے ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے ۱۹۳۰ء۔۱۹۳۲ء سے اس طرف توجہ دی۔

ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ حسینیؑ شاعر شاعری کی کس منزل پہ تھا۔قوم کو اس نے کردارِ حسینیؑ سے کس طرح روشناس کرایا۔پھر جذبات کا یہ عالم کہ کوئی شعر ایسا نہیں کہ جس پر دل بے چین نہ ہوجائے اور گہر ہائے اشک نذرانۂ عقیدت میں آنکھوں سے نہ ٹپکیں۔شاعر حسینیؑ اگر شبِ عاشور کا ذکر کرتا ہے تو بچوں کے نالہ وزاری اور مخدراتِ عصمت کی بے قراری نہیں بیان کرتا۔وہ یوں گہر افشانی کرتا ہے۔

چاند کمھلایا ہُوا نکلا شبِ عاشور کو
کِس قدر غم کا اندھیرا تھا شبِ عاشور کو
تھے تبسم ریز انصارِ حسینِ ابنِ علیؑ
زندگی دلچسپ تھی گویا شبِ عاشور کو
اللہ اللہ چاہتے ہیں تجھ کو انصارِ حسینؑ
زندگی نے موت سے پوچھا شبِ عاشور کو
سر فروشانِ وفا کی تھیں نگاہیں دیدنی!
اُٹھ گیا تھا کون سا پردا شبِ عاشور کو
ایسے بے پروا کہ جیسے سرہی شانوں پہ نہیں
جنگ پر جب فیصلہ ٹھہرا شبِ عاشور کو
شمع لے کر روئے اکبرؑ دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبحِ محشر تک ٹھہرنا تھا شبِ عاشور کو

مطلع کے بعد کے بعد چاروں اشعار میں انصار حسینؑ کے عظیم کردار کی جو حقیقی تصویر کشی کی ہے اور جس قدر جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کی مثال نہیں۔ پھر یہ کہ کسی جگہ مبالغہ نہیں بلکہ بالکل حقیقت۔

تاریخیں شاہد ہیں کہ شبِ عاشور انصار سید الشہداءؑ کو مسرت و اطمینان کس درجہ پر تھا، ایک دوسرے کو شہادت کی مبارک دے رہا تھا۔ گویا مرنے کی عید تھی خاص کر یہ شعر:

سرفروشانِ وفا کی تھیں نگاہیں دیدنی
اُٹھ گیا تھا کون سا پردا شبِ عاشور کو

دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اصحاب سید الشہداءؑ کی نگاہوں سے وہ پردہ و حجاب اٹھا دیے گئے تھے اور انھوں نے مراتب و درجات کو دیکھ لیا تھا۔ اس واقعہ کو کس قدر دلکش انداز میں پیش فرمایا ہے۔ آخری شعر کی تو نہ بلندی کی کوئی انتہا ہے نہ جذبات کی، عجیب و غریب انداز اختیار کیا ہے۔ بے اختیار آنکھوں سے اشکِ غم جاری ہو جاتے ہیں۔ اس ایک شعر کی گر شرح کی جائے تو صفحات کافی نہیں ہو سکتے۔

شمع لے کر روئے اکبرؑ دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبحِ محشر تک ٹھہرنا تھا شبِ عاشور کو

ماں کو یہ معلوم ہے کہ صبح یومِ شہادت ہے۔ سب کو راہِ خدا میں شہید ہونا ہے۔ ایک تو حسرت بھرا ماں کا دل۔ اٹھارہ برس کا کڑیل جوان۔ شبیہ پیغمبرؐ۔ ماں کے دل کو سیری کہاں ہو سکتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں جس بہترین انداز سے اس کو پیش کیا ہے، وہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔ مصرع کی بلندی کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کے عمق کی کوئی تھاہ۔ جتنی دفعہ یہ مصرع پڑھا جائے، لطف میں کمی نہیں واقع ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے فرزند کے رُخ کی زیارت کے لیے صبح محشر تک کا طول بھی کافی نہیں ہے۔ یہ تو شبِ عاشور کا منظر تھا۔ اب صبح عاشور ہوتی ہے۔ باکمال شاعر اس منظر کو اس طرح نظم کرتا ہے:

سجدے سے سر کسی کا اٹھا روشنی ہوئی
عشرہ کی صبح آئی قیامت بنی ہوئی

وقتِ نمازِ عصر کا آنکھوں کو انتظار
کانوں میں وہ اذاں علیؑ اکبر کی دی ہوئی
وہ گرد و پیش مجمع ارواحِ انبیاءؑ
دُنیا ادب سے حدِ نظر پر رُکی ہوئی
پانی کی بندشوں پہ حقارت کی ایک نظر
عزت کی موت سے وہ نگاہیں لڑی ہوئی
ایک ذاتِ سرفروش اور اک ذاتِ کردگار
مرکز سے کائناتِ دوعالم ہٹی ہوئی
سجدہ کہ جس پہ سجدۂ کون و مکاں نثار
حسرت سے کربلا کی زمیں دیکھتی ہوئی

ہر ہر شعر شاعر کے کمال کا پتہ دے رہا ہے۔ کردار اور عزم کا کتنا حقیقی مرقع کھینچا ہے اور عظمت حسینؑ کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ایک دوسری نظم ''پیغام حسینؑ'' اس انداز سے نظم فرماتے ہیں:

تا ابد زندہ ہے تو اور تا ابد اسلام ہے
اے شہیدِ کربلا اسلام تیرا نام ہے
مرحبا اے سرفروشانِ حسینؑ مرحبا
یوں تلاشِ موت جیسے موت سے کچھ کام ہے
ہے غل و زنجیر میں جکڑا ہوا پیغامبر
خون میں ڈوبا ہوا شبیرؑ کا پیغام ہے
کر چکے تسخیرِ کوفہ سوگوارانِ حسینؑ
اب اسیرانِ بلا کا قصد سوئے شام ہے

دوسرے شعر میں انصار سید الشہداءؑ کا جو نفسیاتی نقشہ کھینچا ہے، نہ صرف حقیقت ہی پر منحصر ہے بلکہ جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ بیان کا انداز ایسا دلکش ہے کہ جس کی حد نہیں۔

شہدائے کربلا نے جس ذوق و شوق کے ساتھ جانیں قربان کی ہیں اور اپنے کو موت کی آغوش میں دیا ہے، حقیقتاً موت ان کو نہیں، بلکہ وہ موت کو تلاش کر رہے تھے۔ ایک دوسری نظم میں کردار سید الشہداء اس طرح نظم فرمایا ہے:

شہیدِ ظلم کلیجے بلا دیے تو نے
حسینؑ درد کے دریا بہا دیے تو نے
جراحتوں میں نمک بھر دیا تشکر کا
اذیتوں میں تبسم گھلا دیے تو نے
زمینِ کرب و بلا پر شہید کرب و بلا
ہزار کعبۂ معنی بنا دیے تو نے
دلوں کو حوصلۂ غم کی تازگی دے کر
نشاط کفر کے تیور بجھا دیے تو نے
زہے کمالِ سیاست کہ زیرِ تیغ آکر
نگاہ خلق سے پردے اٹھا دیے تو نے
ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی
دماغ وضع کیے دل بنا دیے تو نے

جناب سید الشہداء نے جس عظیم سیاست سے حق و باطل کو الگ فرمایا ہے اور ظلم و جور کے پردوں کو چاک کر کے دنیا کو حقانیت کا سبق دیا، آپ کے اس فلسفۂ شہادت کو مرحوم نے کس قدر دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ مطالب کا دفتر ہے۔ آپ کا یہ شعر:

جراحتوں میں نمک بھر دیا تشکر کا
اذیتوں میں تبسم گھلا دیے تو نے

کیا صبر حسینؑ کی اس سے بہتر طریقے سے وضاحت ہو سکتی ہے۔ سید الشہداء نے جس طرح خوش ہو کر زخم کھائے، اس کی سچی تصویر شاعر نے اس شعر میں دکھا دی۔

پھر یہ شعر ہے:

زمینِ کرب و بلا پر شہید کرب و بلا
ہزار کعبۂ معنی بنا دیے تو نے

شعریت اور حقیقت دونوں کے لحاظ سے کتنا بہترین شعر ہے۔ پھر اس کے بعد اس شعر میں کہ:

زہے کمال سیاست کہ زیرِ تیغ آکر
نگاہِ خلق سے پردے اٹھا دیے تو نے

سیاست حسینیؑ کی پوری تفسیر بیان کردی اور آخری شعر تو پوری نظم کا ماحصل ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی
دماغ وضع کیے دل بنا دیے تو نے

شعر ہے کہ پورا ایک دفتر ہے۔ قلم اس شعر کی پوری تعریف لکھنے سے معذور ہے۔ کردار حسینیؑ کی شرح اس سے بہتر ناممکن ہے۔ جو انقلاب اس شہادت عظمیٰ نے پیدا کیا، اس کی حقیقی تصویر قوم کے سامنے پیش کردی ہے۔ اس شعر کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقت میں حسین نے دل و دماغ وضع کر کے ملت کو دیے تھے۔

دل تو چاہتا ہے کہ ان کے اشعار لکھتا ہی چلا جاؤں، مگر وقت کی کمی اور مضمون کے طول ہو جانے کا خوف مانع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس شاعر سرکارِ حسینیؑ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ غالبؔ نے تو کسی امیر کے لیے مبالغہ میں یہ شعر کہا تھا لیکن جناب نجم کی تعریف کے لیے یہ اس طرح پورا اترا کہ معلوم ہوتا ہے غالبؔ یہ شعر انہی کے لیے کہہ گئے تھے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

صنفِ شاعری سے علاحدہ ہو کر بھی اگر مرحوم کو دیکھا جائے تو جامع صفات ذات ایسی کم ہوں گی۔ عاشقِ حسینؑ، مومنِ خالص، متقی، احباب نواز، مخلص، پاک طینت، غرض تمام صفات کا مجموعہ تھی یہ ذات۔

ہندوستان میں آخری ملاقات مرحوم سے غالباً 1925ء یا 1926 میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد

1971ء میں کراچی میں جناب علامہ رشید ترابی مرحوم کے گھر پر ہوئی۔ ضعف بصارت سے صورت سے تو پہچاننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، لیکن نام بتاتے ہی فوراً سمجھ لیا اور اٹھ کر نہایت محبت و خلوص سے بغل گیر ہوئے۔ افسوس کیا کہ میں اپنے مخلص کرم فرما کی آخری خدمت سے بھی محروم رہوں گا اور مجھے ان کے انتقال کی خبر بھی عرصہ بعد معلوم ہوگی۔

''بہر حال ایک ایسی ہستی ملت جعفریہ سے اٹھ گئی جس کا بدل ایک عرصہ تک نہیں ملے گا اور ایک ایسا نقصان قوم کو پہنچا جس کی تلافی کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

○

ڈاکٹر سید علی مومن

شاعرِ اہلِ بیتؑ اور ان کے پیغامات

دنیائے ادب کی یہ عظیم ہستی، بلند کردار انقلابی شاعر، جناب تجمل حسین نجم آفندی مرحوم ان ممتاز شعراء میں سے ایک فرد واحد ہیں جن پر علم وفن کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جن کا کلام غیر فانی سرمایہ ہے، جو بلا کی ابدیت رکھتا ہے اور ہر صاحب فکر ونظر کو پیامِ انسانیت اور دعوت عمل دیتا ہے۔

حضرت نجم آفندی کی شاعری کا سرچشمہ دامنِ اہل بیتؑ علیہم السلام ہے اور وہ بجا طور پر شاعرِ اہل بیتؑ کہلائے جانے کے سزاوار ہیں۔

شاعر ہوں اہلِ بیتؑ کا میں نجمؔ دلفگار
پہنچانتے ہیں کشتۂ راہِ خدا مجھے

دوسری جگہ کہا:

نجمؔ میں وہ شاعر دربار اہلِ بیتؑ ہوں
غم نے چھانٹا ہے مجھی کو فردِ کامل دیکھ کر

ہر بڑا شاعر اپنے پیشِ نظر ایک نصب العین رکھتا ہے، جو اس کے تخیلات و افکار پر چھایا ہوتا ہے اور ادراک اور شعور کا مرکز ہوتا ہے، جو اس کی شاعری کے دھارے کو ادھر اُدھر مڑنے سے بچائے رکھتا ہے۔ نجمؔ مرحوم کا نصب العین مدح اہل بیتؑ ہے جس کو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک حقیقی معنوں میں اپنی غرضِ حیات سمجھا اور اشاعت امر اہلِ بیتؑ کو اپنا شغل قرار دیا۔ ان کی عقیدت، ان کے خلوص، ان کے جذبۂ مودّت کی یہ حد تھی کہ ارمان کرتے تھے:

اے نجمؔ مدحِ آلِ نبی میں گزار دوں　　اللہ عمرِ خضر جو مجھ کو عطا کرے

ان کا تعلق محبانِ اہل بیتؑ اور شعراء کے گھرانے سے تھا۔ طبیعت اوائل عمر ہی سے شاعری کی طرف مائل تھی ۔ قدرت نے ماحول کے ذریعہ مدحت مصطفیٰؐ و آلِ مصطفیٰؐ کی جانب رہنمائی کی جو اُن کی نمایاں خصوصیت بن گئی۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزّ و شرف
نجمؔ فطرت ہے میری مدح و ثنائے مصطفیٰؐ

میرے آبا کا شرف ہے، میری فطرت کا خمیر
نجمؔ صدیوں سے ہے فخرِ مدح آلِ مصطفیٰؐ

یہ حقیقت ہے کہ نجمؔ مرحوم کی اہل بیت اطہار سے عقیدت، ان مقدس ذوات سے وابستگی، جذباتی سے زیادہ عقلی وفطری ہے۔ اُن کے کلام میں شاندار انفرادیت پائی جاتی ہے جو غیر فطری قسم کے جذبات پر قائم نہیں، بلکہ سنجیدہ فکر، تخیل کی رعنائی، علم و عرفان کی تخلیق ہے۔ صرف مادّی اور ادبی ذوق کی تسکین دینے والی نکتہ آفرینی اور لطف اندوزی ہی کو پیش نگاہ نہیں رکھا گیا بلکہ حضرت نجمؔ نے اپنے باطن کے نہ دبنے والے رجحانات کے دباؤ کے تحت ایسی نظمیں لکھی ہیں جن سے اخلاقی نظائر اور مذہبی تفکر کو بہت کچھ صالح توانائی ملتی ہے اور ان سے دینی عقیدت کی آنکھیں منوّر ہوتی ہیں، جیسا کہ فرماتے ہیں:

علیؑ کی مدح میں اسرار کھلتے ہیں دوعالم کے
نہیں یہ ذوق تو محدود ہے دنیا سخنور کی

مدحت کے ترانے میں بڑا وزن ہے واعظ
اک حرف ہے بھاری تری تسبیحِ گہر سے

یوں تو نجمؔ صاحب اہل بیتؑ کے ایک ایک فرد پر پروانہ وار فدا ہیں لیکن امام حسینؑ سے اُن کے عشق و محبت کا کچھ اور ہی رنگ ہے۔ اپنے کلام میں امام عالی مقام سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اور مدح حسینؑ میں اپنی تمام فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ امام علیہ

السلام اُن کی شاعری کے اہم کردار ہیں۔ جس کو وہ اُسوۂ رسولؐ کی پیروی سمجھتے ہوئے، عجب بلند پروازی سے کہتے ہیں۔

مدحت ہے حسینؑ ابن علیؑ کی مرا جادہ
گزرے ہیں پیمبرؐ بہت اس راہ گزر سے

پھر کس انداز سے اپنی بے بساطی اور انکساری کا اظہار کیا ہے

تیری مدحت ہو تو نظمِ نجم کا کیا پوچھنا
نجم ہے اپنی جگہ پر بے حقیقت اے حسینؑ

دوسری جگہ اپنے سے خطاب کرتے ہوئے مداح اہل بیتؑ کے کردار کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں:

کچھ شعر جو منقبت میں کہلاتا ہے کس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب تو شاعرِ اہل بیتؑ کہلاتا ہے

مگر مدح اہل بیتؑ میں اپنی عاجزی اور کم مائیگی کے باوجود اسی مدحت کو اپنی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں:

مجھے نجمؔ کوئی کہا کرے میں بلند اوج فلک سے ہوں
مجھے مدح آلِ رسولؐ نے مہ و مہر سے بھی بڑھا دیا

نیز کس فخر سے کہتے ہیں:

نغمۂ منقبت میں نجمؔ ہیچ ہے میرے سامنے
حسنِ بیانِ فرخیؔ، زورِ کلامِ انوریؔ

اور ان کی بے نیازی کی یہ کیفیت ہے:

جگہ بزمِ غزل میں دیں نہ دیں وارفتۂ دنیا
مجھے ہے نجمؔ نسبت مدحتِ مولاؑ کی محفل سے

ان کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ مدحِ پیمبرؐ اور آلِ پیمبرؐ کو نجات کا وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ ایک سلام کے مقطع میں کہا ہے:

نجم ہو اگر نسبت اُسوۂ حسینؑ سے
ایک شعر مدحت میں خلد کا قبالا ہے

حضرت نجم آفندی کی نگاہ میں اُسوۂ حسینؑ نہ صرف باعثِ وجوبِ جنت ہے بلکہ معراجِ انسانیت، کمالِ اخلاق، روح اسلام اور جانِ ایمان ہے۔

سینے پہ کائنات کے نقشِ دوام ہے
انسانیت حسینؑ کے اسوہ کا نام ہے
سبطِ نبیؐ سے دینِ خدا کا قیام ہے
کلمہ حسینؑ کا ہے محمدؐ کا نام ہے

نجم صاحب نے محسوس کیا کہ حسینؑ سے نہ صرف خدا اور رسولؐ ہی کا نام روشن ہے اور دین حق کی حفاظت ہے، بلکہ جہاں کہیں بھی خیر اور خوبی پائی جاتی ہے، وہ حسینؑ ہی کا طفیل ہے۔

ملت کی جو نبضوں میں تھوڑی سے حرارت ہے
اے اُسوۂ شبیریؑ یہ تیری بدولت ہے

نیز کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنے مقدس کردار سے سعادت کی تمام راہیں روشن کر دیں، کائنات کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو ابھار دیا اور اپنے انوکھے عمل سے فکر کو نئی توانائی دی۔ آزادیِ رائے کو مضبوط اور با اثر لب ولہجہ دیا، حوصلۂ عمل کو جرأت دی، جامد ذہن کو انقلاب انگیز حرکت عطا کی۔

شبیرؑ نے فکروں کے انداز بدل ڈالے
کیا ذہن کی قدرت ہے کیا فکر میں قوت ہے
اپنے حق کی سعی کو مظلوم انساں چل پڑے
شمع روشن بن گئے نقشِ کفِ پائے حسینؑ
حق پرستی خود شناسی ہمت و عزم و عمل
مل کے ان اجزاء سے بنتی ہے تو لائے حسینؑ
بن گئی انسان کا معبد زمینِ کربلا
نجم جب عزم و عمل کی زندگی لائے حسینؑ

قطعہ ۱ :

حسینؑ ملتِ اسلام کی حیات کا راز
شہید ابنِ شہید اس کے غم کی عمر دراز
اسی کے صدقے میں سب معرفت مقام ہوئے
کوئی غریب نواز اِن میں ہو کہ بندہ نواز

قطعہ ۲ :

ملا کیا کیا نہ ہم کو بانیِ اسلام کے گھر سے
عمل کی عزم کی معراج وابستہ ہے اس در سے
حسینؑ ابن علیؑ نے فطرتِ انساں کو چمکایا
زمانہ بے خبر تھا ورنہ آزادی کے جوہر سے

امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر ان کے عظیم کارنامے کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

شام و کوفہ کے درندے اور وہ حیوانیت
تو نے جاں دے کر بچایا جوہرِ انسانیت
فطرتِ اسلام ہے ممنون تیری اے حسینؑ
تو نے بخشا دردِ ملت تو نے دی وجدانیت
اے کہ تیرے ذکر سے اُبھرا ہوا سوز و گداز
اے کہ تیری یاد سے چمکی ہوئی روحانیت
اے کہ تیرے شوق میں کھوئی ہوئی فکر و نظر
اے کہ تیرے درد میں ڈوبی ہوئی عرفانیت
جان تو نے ڈال دی دراصل اے نفسِ عظیم
سربسر ایک پیکرِ بے روح تھی روحانیت
تجھ کو محرابِ عبادت بن گئی شمشیرِ کند
اپنے خوں کی دھار سے کھینچا خطِ عرفانیت

ایک جگہ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

جان دے کر ذہنِ انسانی کو روشن کردیا
اے شہید ابنِ شہید اور اے کریم ابنِ کریم

جب طاقت و اقتدار انسانی آزادی کا سرکچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا، مساوات، سادگی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہورہی تھیں، حسینؑ نے مظلومیت کی نئی شان دکھا کر جبر و استبداد کو کاری ضرب لگائی اور مٹتے ہوئے انسانیت کے نقوش کو ابھار دیا۔ دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کردیا۔ نجم صاحب اس حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کیسے شدید ظلم زمانے کے سہہ گئی ندی لہو کے دیدۂ عبرت سے بہہ گئی
رکھی تھی ظالموں نے مٹانے میں کیا کسر انسانیت حسینؑ کے صدقے میں رہ گئی

یہی نہیں کہ امام عالی مقامؑ نے اپنے حُسن عمل سے انسانیت کو اجاگر کیا بلکہ نوع انسانی کی عقل و فکر پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ان کی ضمیری صلاحیتیں ابھریں اور زندگی کی تاریک راہیں منور ہوگئیں۔ حضرت نجم اس حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

امت کی ذہنیت ہی بدل دی حسینؑ نے
کیا ذکر ہے عمل کے ارادے سنور گئے

ان چند اشعار پر غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نجم آفندی صاحب کو حضرت امام حسینؑ کی عظیم المرتبت شخصیت، ان کے پاکیزہ اصولِ زندگی اور مقدس کردار کا عرفان حاصل تھا۔ حالانکہ وہ خود اس سعادت پر اپنی عاجزی اور عدم معرفت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں:

ہے نجم کی ہستی کیا اے کرب و بلا والے
کس نے تجھے سمجھا ہے کس نے تجھے جانا ہے

دوسری جگہ کتنی سادہ زبان میں کہہ گئے ہیں:

سمجھے کہاں جو سبطِ نبیؐ کا مقام ہے
کتنا ابھی شعورِ بشر تشنہ کام ہے

حقیقتاً حسینیت کا صحیح عرفان بشر کی رسائی سے بالاتر ہے۔ انسان جتنا جتنا باشعور ہوتا جائے گا

اُتنی اتنی اس کی نگاہوں میں حسینؑ اور حسینؑ والوں کی قدر و منزلت بڑھتی جائے گی اور معرفت کے درجے بلند ہوتے جائیں گے۔ مگر نجم آفندی کے پُرخلوص جذبہ حسینیت اور حسینؑ کے حیرت انگیز کارنامے اور سبق آموز کردار کی روشنی میں فضائل ایمان اور محاسن اسلام کی منصفانہ ولولہ انگیز ترجمانی سے جو اپنے اشعار میں کرنے کی کوشش کی ہے، ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ شاعر اہل بیتؑ کے دل میں حسینیت کی صحیح تڑپ تھی اور ان کے تصورات میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب باوفا چھائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنا جولاں گاہ شاعری کے واسطے اُن ہی بلندترین شخصیتوں کا انتخاب کیا اور اُن کے شاندار کارنامے کچھ ایسے انوکھے انداز میں بیان کیے ہیں کہ دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی مضمون آفرین طبیعت نے نئے نئے عنوانات اور حقیقی جذباتِ انسانی کی عکاسی کر کے ایسی نظمیں پیش کی ہیں جن میں ان ذواتِ مقدسہ کی بلند اور اعلیٰ سیرت کی کسی نہ کسی حد تک تصویر کشی ہو سکے تا کہ انسانیت کی اخلاقی قدروں پر نہایت گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوں:

نجم غرورِ ملت ہے جلوہ طرازِ کرب و بلا
ایک ایسا مجاہد عالم میں نازِ دو عالم ہوتا ہے

پڑھ کر نمازِ عصر کی شبیرؑ زیرِ تیغ — اک عصر نو کی خلق میں تعمیر کر گئے
سمجھے نہ حق شناس بھی منزل حسینؑ کی — اتنا ہی کہہ سکے یہ بڑا کام کر گئے

نجم صاحب اپنے عمیق والہانہ جذبات کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کے مقدس کردار سے متاثر ہوتے ہوئے ان کی خدمت میں ایک انوکھے پن سے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

اللہ اللہ یہ ترا ذوقِ عبادت اے حسینؑ — زیرِ خنجر تھی تجھے سجدے کی فرصت اے حسینؑ
تیرے نانا کا عمل درسِ شریعت اے حسینؑ — تیرے ہی گھر کا چلن راہِ طریقت اے حسینؑ
تیری مظلومی کی یہ شانِ جلالت اے حسینؑ — خون دیتی ہے ابھی تک خاکِ تربت اے حسینؑ
عرش بھی ممکن ہے تیرا فرشِ پا انداز ہو — اے سوارِ دوشِ سرکارِ رسالتؐ اے حسینؑ
تیری ہی رفتار ہے تخلیقِ معیارِ خلوص — جذب کی لو تیرے ضبطِ غم کی قوت اے حسینؑ

اپنے نانا کے عوض تو نے شہادت کی قبول　　السلام اے خاتمِ کارِ نبوت اے حسینؑ
قلبِ عارف میں تیرے حسن نظر کا انعکاس　　تیری آنکھوں کا تصدق ہے بصیرت اے حسینؑ
عالمِ حق آشنا کو نازِ تقریب نیاز　　صوفیِ درد آزما کو فخرِ نسبت اے حسینؑ
کتنے غم نا آشنا اس راز سے واقف نہیں　　تیرا غم ہے دیدۂ و دل کی طہارت اے حسینؑ
تیرا طرزِ فکر، تیرہ سو برس کے بعد بھی　　وقت کی ظلمت میں ہے روشن حقیقت اے حسینؑ
تو ہر ایک عنوان سے ہے آپ ہی اپنی مثال　　حُسنِ سیرت ہے جواب حُسنِ صورت اے حسینؑ
تیری نظروں میں تجلی منزل قوسین کی　　تیرے قدموں میں نگارستانِ فطرت اے حسینؑ

ایک اور نظم میں اپنی عقیدت مندانہ تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اسلام تیرا حاصلِ محنت ہے اے حسینؑ　　دنیا میں دین تیری بدولت ہے اے حسینؑ
جینے کا اختیار تھا مرنا کیا پسند　　کیا جبر و اختیار پہ قدرت ہے اے حسینؑ
زخمی جبیں لہو سے مصلےٰ رنگا ہوا　　یہ روحِ معرفت یہ عبادت ہے اے حسینؑ
زخمی اسد کے قبضے میں جیسے شکار ہو　　قدموں میں کائنات کی دولت ہے اے حسینؑ
یہ تیرے ساتھ موت میں کیسی حیات تھی　　زندہ جو رہ گئے انھیں حسرت ہے اے حسینؑ
سمجھے گا کیا کوئی مری سینہ شگافیاں　　واللہ تیرے درد میں لذت ہے اے حسینؑ

نجم آفندی دردِ حسینؑ میں محض لذت ہی نہیں محسوس کرتے، بلکہ اس درد کو جد وجہد حیات سمجھتے ہیں، جس سے احساسات متحرک ہوتے ہیں اور انسانی دل و دماغ کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ کیا خوب کہا ہے:

شہیدِ ظلم کلیجے ہلا دیے تو نے　　حسینؑ درد کے دریا بہا دیے تو نے
ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی　　دماغ وضع کیے دل بنا دیے تو نے
شہیدِ ظلم غریب الدیار کیا کہنا　　حسینؑ درد کے پروردگار کیا کہنا

نجم صاحب حضرت امام حسین علیہ السلام کو پروردگار درد کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو ایمان کا مینارۂ نور سمجھتے ہیں جس سے اسلام روشن و منور ہے۔ دین کی حیات ہے اور ان کی شہادت کی جلالتِ دینِ خدا کی بقا کو قرار دیتے ہیں:

زندہ ہے کربلا میں گردن کٹانے والا ایمان کی تجلّی اسلام کا اجالا
حق کے تصورات میں روحِ شباب پھونک دی نازش لافتیٰ ہے جو ایسا جوان حسینؑ ہے

●●●

جب حسینؑ آئے ہیں منزلِ شہادت میں کلمۂ شہادت کا بول بالا ہے
دین اس سے رہا زندہ دنیا کو خبر کیا ہے سو تجمّ تصدق ہیں وہ سر ہے وہ سجدہ ہے
ذکر صلوٰۃ کے دھنی اس کا بھی ہوش ہے تجھے ذکر صلوٰۃ ہے حسینؑ فکرِ اذاں حسینؑ ہے

●●●

بارہا اٹھے فتنے بارہا سنبھالا ہے کیا حسینؑ کے ہوتے ہوئے دیں مٹنے والا ہے

●●●

تری سرفروشی کی شان تھی جو حیات دینِ خدا بنی
نہ ملا کسی کو حیات میں تجھے موت نے جو مزا دیا
چمن آپ اپنا مٹا گئے کہ بہارِ دین خدا رہے
نہ جما جو رنگِ بہار سے تو لہو بھی اپنا ملا دیا

یہ حقیقت ہے کہ واقعۂ کربلا میں مرکزی اہمیت امام حسینؑ کے کردار کی عظمت اور ان کی شہادت کو حاصل ہے مگر اصحابِ حسینؑ نے بھی جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ بھی حمایت حق میں عدیم المثال قربانیاں ہیں اور شہادت کے جلال و جمال میں رنگا رنگ اضافہ ہیں اور حسینؑ کے مقصدِ حیات کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔

تجمّ آفندی کربلا والوں سے عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے عظیم کردار کی تصویر کشی میں اپنے تخیل کا تمام حسن کام میں لاتے ہیں ؎

انصار کربلا میں حسینؑ نصاب کے سامان کر گئے ابدی انقلاب کے

کربلا والے

زندگی کا تاج سر انسانیت کا دل بنے آخری قربانی و ایثار کی منزل بنے
خالق کل نے جو کی بزمِ جہاں آراستہ کربلا والے مجاہد زینتِ محفل بنے

اللہ والے

وہ جنگل میں یثرب کی گودی کے پالے — قیامت ہے تیغِ جفا کے حوالے
وہ عونؑ و محمدؑ وہ اکبرؑ وہ قاسمؑ — نگاہیں اجل کی نگاہوں میں ڈالے
وہ مضبوط ہاتھوں میں گھوڑوں کی باگیں — وہ بھرپور شانوں پہ زلفیں سنبھالے
وہ جینے کے دن اور وہ مرنے کی جلدی — مسافر انوکھے ارادے نرالے
وہ بچوں کے تیور، وہ ماؤں کی ہمت — وہ کودوں کی دولت خدا کے حوالے
وہ پیاسوں کی امید تیروں کی زد پر — وہ عباسؑ مشکِ سکینہؑ سنبھالے
وہ مسلخ وفا کا محبت کا مقتل — جوانوں میں شامل وہ بوڑھے وہ بالے
وہ قرآں کی تبلیغ پیاسی رگوں سے — لبوں پر تلاوت زبانوں پہ چھالے
وہ تیغوں پہ سجدے وہ سجدوں پہ تیغیں — وہ خنجر گلوں پہ وہ سینوں پہ بھالے
وہ زخموں کی کثرت وہ بارش لہو کی — وہ فوجوں کے بادل میں دھنس جانے والے
عزیزؔ اُن کے قلبوں کو حق کی حمایت — حقیر اُن کی نظروں میں شامی رسالے
وہ تیغوں سے ٹکڑے وہ نیزوں سے چھلنی — وہ بندوں کے مولاؑ وہ اللہ والے
کلیجوں میں نیرے لبوں پر تبسم — اذیّت کو راحت کے سانچے میں ڈھالے
رضائے خدا پر جو سب کچھ لٹادیں — رضائے خدا جن کو اپنا بنالے

اسی دھن میں نالے کیے جاؤ نجمی
یہ نوحے ہیں دنیا ہلا دینے والے

واقعی نجم آفندی کے نوحے مترنم اور جوش آفریں ہیں۔ ان میں درد و تاثر کوٹ کوٹ کر ایسا بھرا ہوا ہے کہ ہر وہ انسان جس کے سینے میں ایک درد آگیں دل ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پڑھنے والے، سننے والے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ اسی نوحہ کو دیکھیے، اشعار میں کتنی روانی، بے ساختگی اور سلاست ہے۔ بیان کی سادگی نے تاثر کو بہت بڑھادیا ہے۔ شعر ہیں کہ تلوار کی دھار کی طرح سینے میں اتر جارہے ہیں و۔ درد و الم میں ڈوبے ہوئے مگر نہایت پُر جوش، ولولہ انگیز اور سیرت و کردار کے حسین مرقع۔ مختصر اور سادہ الفاظ مگر روح فصاحت سے بھرپور۔ حقیقت اور

صداقت سے لبریز، کلام کی خوبی اور ندرت خیالی سے قطع نظر، ایثار، شجاعت، صبر، مظلومیت، جوشِ عمل، فداکاری کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہوسکتی ہے۔ ایسا ہی نرالا طرز، سلیس زبان، مؤثر اسلوب بیان، سوز و گداز اور درد تجم کے تمام نوحوں میں پایا جاتا ہے، جو جذبات و خیالات کے لحاظ سے بلاشبہ شاعرانہ عظمت اور تخیلی رفعت کا ثبوت ہیں۔

ملاحظہ ہو ایک اور نوحہ:

حیات نو

شبیرؑ کو سر دے کر اسلام بچانا ہے — کونین ہیں قدموں پر ریتی پہ ٹھکانہ ہے
اکبرؑ پہ نظر ڈالو قاسمؑ کی طرف دیکھو — مرنے کے ارادے ہیں جینے کا زمانہ ہے
یہ خون بھرے چہرے یہ کفر شکن نظریں — حیدرؑ کا گھرانہ ہے شیروں کا گھرانہ ہے
شبیرؑ کے ہاتھوں کا بوسہ تو کوئی لے لے — ننھے سے مجاہد کو میدان میں لانا ہے
دیکھا ہی ابھی کیا ہے دنیا کی نگاہوں نے — رکھ کر ابھی ہاتھوں پر دل اپنا دکھانا ہے
کوثر کے یہ مالک ہیں پانی کی طلب کیسی — سوئی ہوئی ملّت کی غیرت کو جگانا ہے
امت کی محبت میں بچوں کو فدا کر کے — دنیائے محبت کا قانون بتانا ہے
یہ کس نے جھکایا ہے سر طاعتِ خالق میں — کیا سر ہے کہ سجدہ سے قاتل کو اٹھانا ہے
احمدؐ کا نواسا ہے معراج بھی پائے گا — نیزے کی بلندی سے قرآن سنانا ہے
لفظوں سے حکومت کی بنیاد ہلانی ہے — سجادؑ کو ظالم کے دربار میں جانا ہے
اسلام کو دیتی ہے ہر سال حیاتِ نو — کیا تو نے کہا ظالم یہ ذکر پُرانا ہے
یہ خون سے لکھا ہے مٹنے کا نہیں ہرگز — اے صفحۂ گیتی کس بیکس کا فسانہ ہے
اب اپنے غلاموں سے شبیرؑ کا پُرسا لے — اے صاحبِ عصر آجا اک دن تجھے آنا ہے

ہے تجم کی ہستی کیا اے کرب و بلا والے
کس نے تجھے سمجھا ہے کس نے تجھے جانا ہے

اس نوحہ کا آخری شعر، مقطع، نہایت جامع، نہایت معنی خیز اور نہایت بلند ہے۔ مدح امام میں جو گہرائی اور جدت شاعر کی فکر نے دکھائی ہے، وہ ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ مدحت کے

میدان میں انھوں نے یہ کہہ کر:

''کس نے تجھے سمجھا ہے کس نے تجھے جانا ہے''

ایسی خراجِ عقیدت پیش کردی کہ کسی کے لیے کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

ایسے نادر اور اعلیٰ مضموں کو نوحہ کے طرز پر ڈھالنا نجم آفندی ہی کا کام ہے۔ نوحہ کا اندازِ بیان درد انگریز، حسرت آمیز اور موثر ہوتا ہے نجم صاحب نے نوحہ کی ان تمام حقیقتوں کو جلا دیتے ہوئے اپنے نوحوں میں ایک خاص ندرت اور جدت پیدا کی۔ مضمون نوحہ کو حیرت انگریز وسعت بخشی، معنوی حیثیت سے نوحوں کو ایک نئی طرز کا خلعت پہنایا اور اعلیٰ تبلیغی واصلاحی اقدار کا حامل بنایا اور کمال یہ ہے کہ زبان کی سادگی، بیان کی روانی اور سوز وگداز کی فراوانی کو بھی قائم رکھا جس کی بنا پر اُن کے نوحے بیحد مقبول ہیں اور فروغ حسینیت میں ایک اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ اسی باعث نجم مرحوم بجا طور پر اس نرالی طرز کے خالق کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

ان کے کلام میں ایک اجتہادی کیفیت دکھائی دیتی ہے اور بعض اشعار بلاشبہ الہامی شان لیے ہوئے ہیں۔ اگر چہ مفہوم اور باتیں وہی ہیں جن کی داغ بیل ان کے پیشتر شعراء نے ڈالی تھی مگر اسلوبِ بیان کی دلفریبی، زبانِ حال سے گویا ہے کہ وہ اپنے انداز اور طرز کے آپ ہی موجد اور مالک تھے جن میں ان کا ایک امتیازی منفرد رنگ نمایاں ہے۔ جیسا کہ وہ خود بھی فخریہ کہتے ہیں ؎

شعر و سخن میں نجم یہ ہیں بے نیازیاں
بیٹھا ہوں اجتہاد کی قوت لیے ہوئے

دوسری جگہ کہا:

تقلید میری ہوتی ہے اہلِ سخن میں نجم
چھایا ہوا دلوں پہ یہ رنگِ کلام ہے

یہ حقیقت ہے کہ نجم آفندی کی طبیعت کو نوحہ سے خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود سراپا درد ہیں اور اپنی دردبھری نواؤں سے تمام دنیا کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو مرحوم کی شاعری کا نمایاں شاہکار ان کے نوحے ہیں، لیکن دیگر اصنافِ سخن پر بھی قدرت رکھتے تھے اور اپنی طبع رسا کی جولانیاں دکھلائی ہیں۔ بلند وبالا مضامین کو اس خوبصورتی اور نزاکت سے نظم فرمایا ہے کہ

عقل حیران ہو جاتی ہے اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔ خصوصاً سلام اور قطعات کی وادی میں جو بوقلمونی اور رنگارنگی جدت ان کے تخیل نے پیش کی ہے، اس کی داد دینی پڑتی ہے۔

سلاموں میں ادب، پیام، زبان، بیان اور زندگی کی توانائیاں خوب اُبھری ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور دل نشین الفاظ میں اُبھرنے والے احساسات کی تصویریں پیش کر کے غضب کا شاعرانہ جلال پیدا کیا ہے اور اندازِ بیان کو غیر معمولی وقار بخشا ہے۔ خود بھی ایک سلام کے مقطع میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ؎

بہت پیام ملیں گے مرے سلام میں تجمّ
نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

ان کی عظمتِ فن کا صحیح اندازہ تو ان کے مجموعۂ سلام ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک سلام بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

سلام

مقتل میں ہیں حسینؑ یہ قدرت لیے ہوئے — دو انگلیوں میں نبضِ مشیّت لیے ہوئے
دشمن ہیں تیغ و تیر کی طاقت لیے ہوئے — شبیرؑ ہیں مزاجِ نبوت لیے ہوئے
قرآن کی زبان بھی ہوتی نہ مستند — آتا اگر نہ حرفِ مودّت لیے ہوئے
ساری شریعتوں کا خلاصہ ہے ایک لفظ — کتنی نبوتیں ہیں امامت لیے ہوئے
فتحِ عظیم کربِ وبلا ان کے نام تھی — اصغرؑ ازل سے تھے یہ امانت لیے ہوئے
کیا کم یہ امتحان ہے کہ انوارِ اہلِ بیتؑ — دنیا میں رہ گئے بشریت لیے ہوئے
نیند آئی ہے علیؑ کو عبادت بنی ہے نیند — کیا امتیاز ہے شبِ ہجرت لیے ہوئے
اکبرؑ کے ہمہمہ سے لرزتی ہے فوجِ شام — ہر لفظ ہے اذاں کی جلالت لیے ہوئے
بچ ہی گیا جہاں علی اصغرؑ کے وار سے — ہر بوند تھی لہو کی قیامت لیے ہوئے
انگڑائی لی ہے گھوڑے پہ حیدرؑ کے شیر نے — قامت ہے اختیارِ قیامت لیے ہوئے

شعر و سخن میں تجمّ یہ ہیں بے نیازیاں
بیٹھا ہوں اجتہاد کی قوت لیے ہوئے

ان نظموں کے ایک طائرانہ مطالعہ ہی سے نجم آفندی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہوتا ہے، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے سخن ہائے دل پذیر میں سحر و اعجاز کی سی کیفیت ہے۔ جو بات کہتے ہیں پورے خلوص اور عقیدت مندی سے۔ ایک ایک لفظ حقیقت اور بصیرت کا پیام۔ ان کا کلام صرف دعوت آہ و نالہ اور تحریک اشک افشانی تک محدود نہیں۔ اخلاقی قدروں کا بھی غیر فانی سرمایہ ہے۔

نجم مرحوم اس راز سے خوب واقف تھے کہ جدید دور کا تقاضا ہے کہ اب واقعۂ کربلا کی حکایت پر زور نہ دیا جائے بلکہ مقصد شہادت اور تاثرات، حسینیت کی اشاعت اس خوش اسلوبی سے کی جائے کہ ذہنی فکر پر گہرا اثر پڑے اور ہر انسان کی رہنمائی ہو۔ چنانچہ شاعرِ اہلِ بیتؑ کے دل کے ہر کونے میں آفتابِ ہدایت کی کرنیں جھلملاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان کا عکس ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ کیا خوب لکھا ہے

یہ بے جگر مسافر نیزوں میں بڑھنے والے — ہر کاروانِ حق کی ہمت بڑھا رہے ہیں
میدانِ کربلا کو اپنا لہو پلا کر — دنیا میں حریت کا مرکز بنا رہے ہیں
ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی — الفاظ ہیں کہ ساری دنیا پہ چھا رہے ہیں
تا حشر درس لیں گے دنیا میں آنے والے — ایسا پیام دے کر دنیا سے جا رہے ہیں

درحقیقت کربلا والوں کا کارنامہ حریت کا وہ علم ہے جس کے پھریرے کی چھاؤں میں دنیا کی متمدن قومیں شرافت و عزت، حریت و آزادی کی مطمئن سانسیں لے سکتی ہیں۔ بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے شمع راہ ہے جو منزلِ مقصود کا پتہ دیتی ہے اور رہتی دنیا تک جگمگاتی رہے گی۔ بے شک کربلا والوں نے صداقت شعار، شریف اور غیرت دار انسانوں کی حیثیت سے کربلا کے میدان میں خونین کفن پہن کر اسلام کی روحانیت کی شان باقی رکھتے ہوئے عام عالمِ انسانیت کے لیے ایک ایسا اخلاقی اور روحانی دستورالعمل پیش کیا جس سے دنیا کی تمام قومیں عام اس سے کہ وہ کسی خطۂ زمین پر آباد ہوں، ہر زمانے میں یکساں طور پر سبق حاصل کر سکتی ہیں، اور جو انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی کی دعوت دیتا ہے، اور جس میں انسانی آزادی، استقلال، ثبات، سرفروشی، دلیری، بے جگری، تدبر، جوش اور اخلاص کے عدیم المثال نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ان حقائق سے متاثر ہوکر جناب حجم آفندی کہتے ہیں

ہر قوم کو ہے دعوتِ فہم و ادراک ہر دور میں ہے غور طلب فکرِ حسینؑ
اخلاق کا معیار سمجھنا ہے اگر آ مجلسِ غم میں اور سُن ذکرِ حسینؑ

ذکرِ حسینؑ باوجود ایک دردانگیز عمل کے صحیح انسانی قدروں کو اُجاگر کرنے کا بہترین ادارہ اور مؤثر ترین مرکز ہے۔ اور ایک انقلاب انگیز پیغام ہے جس میں انسانی حقوق کا تحفظ، روحانی طہارتوں کی بقا اور اجتماعی فلاح وبہبود مضمر ہیں۔ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ان حقیقتوں کو پوری طرح آشکارا کیا جائے۔ حجم آفندی اس عظیم مقصد کو خوب سمجھتے ہیں

تیری ہی کہانی کہنی ہے تیرا ہی سبق دُہرانا ہے
اسلام کو زندہ تو نے کیا اسلام ہے زندہ تیرے لیے
اشک آنکھ میں ہیں کاندھے پہ علم اور پاؤں رہِ آزادی میں
اب ہوش حقیقت آیا ہے اب حشر ہے برپا تیرے لیے
اب کام کی تیری باتیں ہیں اب نام کی تیرے پوجا ہے
تو نے جو نہ چاہا اپنے لیے اللہ نے چاہا تیرے لیے

تیرہ سو سال بعد بھی اس ذکر میں وہی کیف، وہی سرور، وہی غم انگیزی اور وہی تازگی ہے۔ اسلام کی بقا ہی اسی ذکر سے ہے

اسلام کو دیتی ہے ہر سال حیاتِ نو
کیا تو نے کہا ظالم یہ ذکر پُرانا ہے

ذکرِ حسینؑ حقیقی اسلام کے اصول، صحت مند نظریات کو پیش کرتا ہے اور دستور حیات سے روشناس کراتا ہے ۔

کیونکر قدرت کا مدعا سمجھے گا بے ذکرِ غمِ حسینؑ کیا سمجھے گا
اسلام کا مشکل ہے سمجھنا اے دوست سمجھے گا غلط اگر خدا سمجھے گا

ذکرِ حسینؑ احیائے ایمان کا واحد طریق کار ہے۔ یقینِ محکم اور حرارتِ ایمانی کا سرچشمہ ہے

ہے

غمِ حسینؑ کے ادنیٰ تصرفات ہیں یہ ہر ایک قوم کو اِس غم میں نوحہ گر دیکھا

نجم مرحوم اپنے لیے غمِ حسینؑ کو نعمت سمجھتے ہیں اور آنسو بہانا ان کے لیے عین حیات ہے

اشکِ غمِ حسینؑ میں ہے لطفِ زندگی رونا اگر نہ آئے تو جینا حرام ہے

بے ماتمِ حسینؑ سحر ہے نہ شام ہے جس دن یہ غم تمام ہے دنیا تمام ہے

نیز کہتے ہیں کہ یہ غم ہماری سیرت و کردار میں تعمیر کے انقلاب آفریں جذبات پیدا کر کے صالح انسان بناتا ہے

نجم اس میں تصور بھی بجا ہے بُرائی کا
غم سبطِ پیمبرؐ کا جس دل کی امانت ہے

پھر ان کو احساس ہوتا ہے کہ اگر ہم کو نفس کی تربیت، ضمیر کی پاکیزگی، ظلم سے نفرت، حق کی حمایت، خدا کی محبت، صبر و استقلال، سچائی اور راست بازی کے لیے اپنی زندگی سنوارنے کے لیے کوئی مثال سامنے رکھنا ہے اور کسی سے سبق لینا ہے تو یہ آرزو اُسوۂ شبیری کی پیروی سے پوری ہوسکتی ہے اور اس کے لیے غمِ حسینؑ منانا، انسانیت کی ایک مستحکم اور پائیدار خدمت ہے جو ہم سب کا انسانی و اخلاقی فریضہ ہے۔ جیسا کہ نجم صاحب نے کہا ہے

سب سے عظیم حُسنِ عمل ہے غمِ حسینؑ کتنی مخالفت ہو اٹل ہے غمِ حسینؑ
اس غم کے ساتھ فکر و نظر بھی جو ہو نصیب ہر عقدۂ حیات کا حل ہے غمِ حسینؑ

اس حیات بخش غم کے فروغ اور اشاعت کے لیے تحریکِ عزاداری، مجلس غم نہایت مبارک اور ہمہ گیر اقدام ہے جس کی طرف نجم مرحوم اپنے الفاظ میں متوجہ کرتے ہیں

یہ مجلسِ غم ظلم مٹانے کے لیے ہے دنیا کو رہِ راست دکھانے کے لیے ہے
انسان کو انسان بنانے کے لیے ہے محدود نہیں سارے زمانے کے لیے ہے

بیگانہ کوئی لاکھ ہو مجلس کی فضا سے
دل آپ دہل جاتے ہیں ماتم کی صدا سے

یہی وہ اہم مقاصد "تشکیل سیرت، تطہیرِ معاشرہ اور تنظیمِ قومی" حقیقی عارفانِ غم کے اس

انقلابی تحریک میں مضمر ہیں جس کے تحت مجسمۂ غم امام زین العابدینؑ، سید الساجدینؑ اور شریکتہ الحسینؑ، ثانی زہراؑ نے مجلس غم کی بنا ڈالی۔ اور دونوں نے مل کر عزاداری کی بنیادوں کو استوار کیا ہے اور ان دونوں بزرگانِ دین کی مساعی جمیلہ اور جدوجہد سے عزاداری کا اجرا ہوا ہے۔ غم زدہ پھوپھی اور صابر بھتیجے کی مشترکہ کوششوں سے عزاداری کا جو دستور قائم ہوا ہے، وہ صدیوں بعد ہمارے بزرگوں کی بے مثال قربانیوں کے ساتھ آج ہم تک پہنچا ہے، جو ایک مقدس قومی امانت اور فریضہ دینی کا درجہ رکھتا ہے۔ اب اس تحریک کو بامقصد بنانا اور اس سے حسبِ دلخواہ مستفید ہونا خود ہماری ذہانت، حوصلہ اور عمل پر موقوف ہے۔ حضرت نجم آفندی نے اس سلسلے میں اپنی تمام فکری صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے حقائق ومحاسنِ عزاداری پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

مجلس کی بناء کے متعلق ایک قصیدہ درمدح حضرت امام علی ابن الحسینؑ علیہما السلام میں کہا ہے

اے علی ابن الحسینؑ اے درودِ غم کے تاجدار — ہر نفس ہے تیرا عاشورہ کے دن کا کارزار
تو نے ڈالی انقلاب انگیز مجلس کی بنا — اے علیؑ اور اے حسینؑ ابنِ علیؑ کے سوگوار
ایک ہی دن کے لیے تھی جنگِ عاشورہ فقط — آج تک جاری ہے تیری انقلابی کارزار

حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی خدمتِ اقدس میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے نجم صاحب عرض کرتے ہیں

اپنے بھائی کی بہن روحِ بہارِ کربلا — پیکرِ ہمت شریکِ کار زارِ کربلا
تو نے مجلس کی بنا سے قوم کی تعمیر کی — قوم کی ماں اور بنیٔ شاہ خیبر گیر کی

شاعر نے اپنے ان اشعار میں حقیقت بینی اور بصیرت افروزی کا ثبوت دیا ہے اور اس انقلابی مشن 'مجلس' کا مقصد ہر اعتبار سے قوم کی تعمیر قرار دیا ہے، جس کو وہ امام مظلوم سے عظیم عہد تصور کرتے ہیں

خدا کرے وہ اطاعت کا مدعا سمجھیں — جو صرف اشکوں کے موتی نثار کرتے ہیں
یہ مجلسیں نہیں پیمان ہیں اطاعت کے — یہ ہم حسینؑ سے قول وقرار کرتے ہیں

مقصد شہادت عظمیٰ اور افادیت عزاداری کی اتنی وضاحت کے بعد شاعر اہلِ بیتؑ مطمئن

نہیں دل ملول ہیں اور حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ قوم جو عزاداری کو اپنی حیات کا نصب العین قرار دیے ہوئے ہے، وہ پسماندگی، غفلت اور ذلت کا شکار ہو۔ جو سال بھر متواتر ذکرِ حسینؑ و شہداء کربلا کرتی و سنتی رہے اور اس کا یہ عمل صدیوں سے جاری و ساری ہو، لیکن اس کے اعمال ان باہمت مجسمۂ عمل ذوات مقدسہ کے اسوۂ حسنہ سے متاثر نہ ہوں۔ اور یہ قوم حسینؑ سے والہانہ عقیدت و محبت کے باوجود حسینی مشن کے بلند نصب العین اور انقلاب آفریں مقصد کو عملی طور پر پورا کرنے سے آج تک قاصر رہے اور صرف مظاہراتِ غم والم میں کھو کر رہ جائے۔ قوم کی اس مایوس کن حالت نے نجم آفندی کی حساس طبیعت پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ یاس وحسرت کے عالم میں نہایت جرأت آموز انداز میں افراد قوم کو عزم وعمل کی دعوت دیتے ہیں، اپنے کلامِ بلاغت نظام کے ذریعے ملت کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

استفہامیہ لہجے میں مقصد شہادت کے صحیح مفہوم کو یوں سمجھایا ہے:

کیا ارضِ فرات جگمگا دینی تھی　　ذرات کو خوں سے جلا دینی تھی
قربانیٔ شبیرؑ کو سمجھے کیا ہو　　کیا خاک میں تاثیر شفا دینی تھی

اک خواب و خیال کوثر آشامی ہے　　جذبات کا مدّو جزر ہنگامی ہے
مجلس سے نکل کے رُخ کدھر ہے دیکھ　　غافل ابھی تشنگی میں کچھ خامی ہے

انسان ہوتا ہے غم اٹھانے سے بلند　　تمکینِ سلف کا بھید پانے سے بلند
جن کو ہے ولائے راکب دوشِ نبیؐ　　ہو جاتے ہیں وقت اور زمانے سے بلند

پھر بڑے تعجب سے کہتے ہیں ؎

ایسا تھا کہاں شمع سرِ طور کا دن　　جلوے سے قریب کا ہو یا دور کا دن
وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں　　جس قوم کے ورثے میں ہو عاشور کا دن

عاشور کا وارث قرار دے کر، ان سے سوال کرتے ہیں جن کے دلوں میں کربلا بسا ہوا ہے

جن کے دماغوں میں کربلا سمایا ہوا ہے۔ کربلا جن کا مرکز عقیدت، کربلا جن کا شمع ہدایت

کچھ خبر ہے تجھ کو اے پروانۂ بے بال و پر — روشنی دیتی ہے کب سے شمعِ طور کربلا
ذہنیت میں آج تک باقی ہے کیوں یہ تیرگی — جلوہ گر ہے جب دماغ و دل میں نورِ کربلا
ہوگیا بیدار اس دن کو اگر جذبہ تو کیا — طے نہ ہوگی اس طرح سے راہ دورِ کربلا
بربنائے ہوش کب ہوگا ترا جوشِ عمل — کربلا پھر چاہتا ہے کیا حضورِ کربلا
پست ہو دنیا میں ایسا اُس کا آئینِ حیات — ہائے جس ملت کے سر میں ہو غرورِ کربلا

یہ امر قابل افسوس سہی مگر ہے واقعہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم پست نظر آرہے ہیں۔ ہماری مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی حالت روز بروز گرتی جارہی ہے اور اس مسلسل پامالی سے ملّی خصائص دبے جارہے ہیں۔ شاعر کی نظر میں اس کیفیت کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے آقاؤں اور رہنماؤں کی زندگی اور سیرت کو مشعلِ راہ سمجھنا چھوڑ دیا۔ اس تغافل کی بناء پر انتشار و پریشانی میں گرفتار ہوگئے۔ عزائے حسینی جیسی انقلابی تحریک کے ہوتے ہوئے ایسی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ ہم کو تو ایک بلند سیرت، انتہائی ترقی یافتہ، باوقار، قابل فخر منظم قوم ہونا چاہیے۔ نجم مرحوم ہم کو سیرت اہلبیت اپنانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ انھوں نے تاسی سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی پُر زور تبلیغ و ترغیب دی ہے۔

ہر ذرّہ سے ایک سحاب پیدا کردے — ہر قطرہ سے آفتاب پیدا کردے
آقا ہے تیرا حسینؑ سا مردِ عمل — جب چاہے تو انقلاب پیدا کردے
کردار پہ اپنے رکھ نگاہِ تنقید — خود اپنے لیے شاہدِ عینی ہوجا
تو مجلس و ماتم میں حسینیؑ ہے ضرور — ہر رنگ میں اے دوست حسینیؑ ہوجا

کاش حسینیؑ کہلانے والے حسینیؑ کارناموں کو عملی حیثیت سے اپنانے کی سعی بلیغ کریں۔ اپنی زندگیوں کو حسینیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں، اور اس کی روشنی میں اپنی سیرت و کردار میں تبدیلی کریں۔ نجم آفندی ہر صاحب نظر کو دعوت عمل دیتے ہیں

شبیرؑ نے راہِ حق میں کیا کیا نہ دیا — ہم نے ہی ثبوت کچھ وفا کا نہ دیا
کاندھا جو ضریح کو دیا بھی تو کیا — جب بھائی نے بھائی کو سہارا نہ دیا

اے سینہ شگاف غم اٹھانے والے　　اے درد بدل قدم اٹھانے والے
آلودہ خون حق شعاری تو نہیں　　یہ ہاتھ جو ہیں علم اٹھانے والے

کیا یہ ہے زندگی کا نصب العین　　یہ ہے تقلیدِ سید کونین
دل دکھاتے رہو غریبوں کا　　اور کہتے رہو حسین حسین

نجم مرحوم حسینی حسین کرنے پر معترض نہیں ،وہ غم حسینی منانا ایک احسن عمل تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں روئیے اور خوب جی بھر کر روئیے مگر گریہ وزاری اور ماتم کے شوروغل اور جذباتی ہنگاموں میں اس مقصد کو نظر انداز نہ کیجئے جس کی خاطر کربلا والوں نے عظیم قربانیاں پیش کی ہیں

آنسوؤں کا جو تقاضا ہو تو بھر دے جل تھل　　کربلا والوں کے ایثار کا مقصد نہ بدل
چند لفظوں میں ہے اسوۂ انصارِ حسینی　　وسعتِ فکر و نظر حوصلۂ عزم و عمل

اخلاقِ حسینی سے سروکار بھی ہو　　دنیا کی نمائشوں سے بیزار بھی ہو
دولت سے ہے بے نیاز جو مردِ عمل　　مزدور بھی ہو اور عزا دار بھی ہو

مولاؑ کا استغاثہ ہے تیرے حافظے میں　　مجلس کی حاضری سے منبر کی آگہی سے
یہ قول بھی سنا ہے سلطانِ کربلا کا　　عزت کی موت بہتر ذلت کی زندگی سے

نجم صاب کی نظر میں امام کا یہ قول آپ کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ ایک عملی درس ہے، زندہ پیغام ہے۔ مگر مولاؑ کا یہ فرمان ہماری فکروں اور نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے۔ ہم تعلیمات حسینی فراموش کر چکے ہیں۔ ہم حسینؑ یادگار کو صرف رسمی اور روایتی انداز میں مناتے ہیں۔ وہ خلوص وعقیدت ہی نہ رہی۔ نام ونمود شخصی وجاہت اور ذاتیات کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ جیسا کہ معاشرہ کی کچھ خرابیوں کی طرف نجم صاحب بڑے لطیف اشارے کرتے ہوئے ماتم کے متعلق کہتے ہیں

نمودِ قوتِ نانِ شعیر دیکھتے ہیں　　کمالِ شوق سے یہ داروگیر دیکھتے ہیں

غم حسینؑ بھی یارب کوئی تماشا ہے　　غریب کرتے ہیں ماتم، امیر دیکھتے ہیں

نذر و نیاز کے سلسلے میں کہا ہے

تکمیل نذر و نیاز کرلیتے ہیں　　اس راہ میں قرض بیشتر لیتے ہیں
بھوکوں کو نوالہ نہیں ملتا لیکن　　سب پیٹ بھرے ہی پیٹ بھر لیتے ہیں

ہر جگہ ہے اہلِ دولت کے لیے سامان الگ　　نذر کے موقع پر بھی بچھتا ہے دسترخوان الگ
یوں غریبوں سے یہ ہر منزل میں رہتے ہیں جدا　　جیسے قبلہ ہے امیروں کا الگ قرآن الگ

مجلس کی افادیت کے بارے میں کہتے ہیں

مجلس کے جو ختم پر پلٹتے دیکھا　　حضار کو ٹولیوں میں بٹتے دیکھا
تعریف کسی کی اور کسی پر تعریض　　خالی باتوں میں وقت کٹتے دیکھا

جن مجلسوں سے کل تک ہم علم وانوار کے موتی لے کر آتے تھے، آج رنجشیں اور تعصب کے پتھر لا رہے ہیں۔ جن منبروں سے کل تک محمدؐ وآل محمدؐ کا خالص پیغام سنایا جاتا تھا، آج قصے کہانیاں، ضعیف روایتیں بیان ہورہی ہیں۔ جن زبانوں سے کل تک ایمان وعرفان کے گوہر جھڑتے تھے۔ آج سطحی اور غیر مفید باتیں سُن رہے ہیں۔ وہ مجلس جو تعمیر قومی اور ملی تنظیم کا مؤثر ترین ادارہ ہے، ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کررہی ہے، حالانکہ بقول نجم مرحوم:

مجلسوں سے قوم کی تنظیم ہونی چاہیے
کچھ تو حالِ زار کی ترمیم ہونی چاہیے
مقصدِ شبیرؑ کی تفہیم ہونی چاہیے
عام اب مظلوم کی تعلیم ہونی چاہیے

اس وقت جس رنگ میں عزاداری برپا کرتے ہیں، وہ اپنی افادی نوعیت کھوتی جارہی ہے اور افسوس ناک حد تک قابل اصلاح ہے۔ نجم آفندی اس صورت حال سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ ایڈیٹر رضاکار کے نام ایک تحریر میں اپنے جذبات کا اظہار فرماتے ہیں:

''مکرمی۔ بعض منبر نشینوں کی بدولت کلیجہ خوں ہوگیا ہے۔ اور بغیر قصد واہتمام یہ چار

مصرعے آنسوؤں کی طرح ٹپک پڑے ہیں۔'' (نجم آفندی)

مفہومِ شہادت کو بھلا دے ملت
مجلس کو بھی اک رسم بنا دے ملت
تقریر کا آج کوئی معیار نہیں
منبر پہ جسے چاہے بٹھا دے ملت

یہ واقعہ ہے کہ آج منبر کا تقدس اور وقار جاتا رہا۔ ہر کس وناکس زیبِ منبر دکھائی دیتا ہے۔ جنھوں نے کبھی کچھ پڑھا لکھا نہیں، وہ بھی چرب زبانی اور شعلہ بیانی کی وجہ سے علامہ کہے جانے لگے ہیں۔ جنھیں حسینیت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں وہ حسینیت کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں۔ فن خطابت اور گفتار کے غازی اور عمل وکردار میں محمدؐ وآل محمدؐ کے محض نام لیوا۔ عام طور پر ہمارے واعظ اور ذاکر بے عمل ہی نہیں ہیں بلکہ یہی لوگ مجلس کی رونق منبر کی زیب وزینت اور عزاداری کے روحِ رواں، یہی لوگ خطیب آل محمدؐ، یہی حضرات بلبلِ بوستانِ آل رسولؐ۔ یہی ہستیاں ہمارے پیشوا، ہمارے رہنما، ہمارے قائد اور لیڈر، یہ ہے مجالس پڑھنے والوں کی سیرت وکردار۔ اسی سے مجالس سننے والوں کی حالت کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

بدنصیبی کی حد تو یہ ہے کہ ہمارے بیشتر علمائے کرام، پیشوائے دین جو قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں، حیات دینی کے ذمہ دار ہیں، قوم کی تشکیلِ سیرت کے معمار، قرآن وسنت کے محافظ اور قوم وملت کے نگہبان ہیں، پیشہ ور ذاکر بن کر رہ گئے ہیں۔ ان سے اتحاد ملی اور وحدت ایمانی رخصت ہوگئی ہے۔ اکثر رؤساء اور امراء کے قصیدے خواں ہی نظر آتے ہیں۔ چہ جائے کہ ان کی گفتار، ارشادات محمدؐ وآل محمدؐ کی تفسیر ہوتی ہے اور ان کی رفتار، دین کا شعار اور اسلامی اطوار۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آجکل اجتہاد کے معنی عباوقبا، مجتہد کے معنی قیمتی عمامہ، عالم سے مراد شعلہ بیاں مقرر، واعظ ومبلغ سے مراد سحر زباں ذاکر۔

خدا رحمت نازل کرے نجم آفندی مرحوم کی روح پر کہ انھوں نے اپنے کلام میں جرأت مندانہ حیثیت سے عزاداران واعظین اور ذاکرین کی اصلاح کو بھی مدنظر رکھا۔ واقعی ایسے نازک اور کڑے وقت میں حق وصداقت کی آواز نکالنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ شاعری کا مقصدِ

وحید تشکیل سیرت اور تعمیر و کردار جس کو مجم آفندی نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے حق کے بول یقیناً عبرت ہیں، اور اصلاح کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔
عام عزاداران کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ کاش ہم ان سے سبق حاصل کریں

اٹھا نہ قدم عمل کا بڑھنے کے لیے　　ہمت کی بلندیوں پر چڑھنے کے لیے
مولا کا ہر معرکۂ علم و عمل　　سنتے ہی رہے ہم درود پڑھنے کے لیے

دل میں ترے درد کی ہے لے کہ نہیں　　کردار میں ملتی ہے کوئی شے کہ نہیں
ہے حُبِ علیؑ سفینۂ نوحؑ مگر　　تیری بھی سفینہ میں جگہ ہے کہ نہیں

آنسو تو بہت آنکھ کے پیمانے میں　　کیا رنگ ہے زندگی کے افسانے میں
دل بھی ترا پاک ہے، زباں بھی طاہر　　یہ دیکھ کے پاؤں رکھ عزا خانے میں

ذاکریں اور واعظین سے مخاطب ہوکر بہ ادب واحترام کہتے ہیں کہ خدا کرے ان حضرات پر ان کی آواز کا اثر ہو

قول اور عمل میں مطلقاً میل نہیں　　عقبیٰ کے منڈھے چڑھے یہ وہ بیل نہیں
لعزش ہے قدم میں کیا قدم رکھتے ہو　　منبر ہے رسولؐ کا کوئی کھیل نہیں

یہ عمامہ یہ عبا یہ اوجِ منبر پر نشست　　یہ سمجھنا ہے غلط جیسے کہ ہے گھر پر نشست
پہلے اتنا دیکھ لیجئے پاؤں اس قابل بھی ہیں　　یہ نشستِ منبری ہے قوم کے سر پر نشست

حیرت ہے اگر تجھے یہ ادراک نہیں　　جامہ کی بساط کیا جو دل پاک نہیں
تو رونقِ منبر ہو کہ ہو خاک نشیں　　کردار ہے اصل چیز پوشاک نہیں

خدمت میں جو وارد ہو کوئی صاحبِ دولت　　تعظیم کو بڑھتا ہے عمامہ بھی عبا بھی

تعظیم کا کیا ذکر ہے پہلو بھی نہ بدلیں　　آجائے اگر صورتِ مفلس میں خدا بھی

سلام میں سبقت اور پھر غریبوں پر　　نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف
غرور علم کا عالم ارے معاذ اللہ　　کہ جیسے دوش پہ رکھی ہے درسگاہِ نجف

کس دن کے لیے راہِ محبت پہ چلا　　سانچے میں نہ تو صبر و قناعت کے ڈھلا
اپنی تنخواہ کی کمی پر شکوہ　　افلاس پہ اہلِ بیتؑ کے صلِ علیؑ

ہاں سرِ خفی اُصِ جلی کہہ کے الٹ　　اے صاحب زورِ ازلی کہہ کے اُلٹ
کیا صرف کتابوں کے الٹتا ہے ورق　　دنیا کا ورق بھی یا علیؑ کہہ کے اُلٹ

محفل میں نشہ مئے تولا کا چڑھا　　خیبر کی خبر سن کے درود اور پڑھا
راہیں کیا کیا علیؑ کی سیرت سے ملیں　　دل نعرۂ صلوٰۃ سے آگے نہ بڑھا

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری مجالس میں عام طور سے ذاکری اور خطابت کا پہلو اور زیادہ روشن باب فضائل، شخصی تعریف، معجزات ہوتے ہیں مگر ان بلند مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کے لیے ان شخصیتوں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا ہے، ان کے اتباع کے لیے مجلس کی ذاکری، منبر کی خوش بیانی اور مبلغ کی قوتِ لسانی خاموش نظر آتی ہے۔

مثلاً امام حسینؑ کی تعریف اور قصیدہ خوانی ہو رہی ہے اور ذکر مصائب میں واقعۂ شہادت بھی بیان ہو رہا ہے۔ لیکن جن بلند مقاصد کے لیے امام نے جان دی، شہادت اختیار کی، جہاد کیا، اس کا ذکر نہیں۔ نماز میں امام کی شہادت کا ربط مصائب تو ہے مگر پابندی صلوٰۃ اور اتباع خدا اور رسولؐ کے بلند اسلامی مقاصد اور نصب العین پر امام کی یہ جدوجہد الفت امام کا دم بھرنے والوں کے لیے کوئی توجہ کا مرکز نہیں۔

فضائل علویہ بیان ہو رہے ہیں۔ معجزات اور حالات، حرب وضرب پر مجالس میں نعرۂ

حیدری کے فلک شگاف نعرے بلند ہیں لیکن سیرت علویہ اور امیر المومنینؑ کی عملی زندگی جن سے ہم استفادہ کر کے ان کے سچے شیعہ بن جائیں، اس کا ذکر بھولے سے بھی ہماری مجالس میں نہیں ہوتا۔

جب سے وعظ اور ذاکری نے کاروباری نوعیت اختیار کی ہے، سامعین وداعیان مجالس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی طبیعت ومرضی کے مطابق بیان کرنا ذاکرین اور مقررین کا معمول ہوگیا ہے۔ بعض نام نہاد واعظین اور ذاکرین نے عزاداری کا مفہوم فقط یہ سمجھ رکھا ہے کہ فضائل اور مناظرانہ بیان سے مجلس میں واہ واہ اور درود کے نعروں سے گونج پیدا کی جائے۔ تبلیغ دین کے حقیقی عوامل کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ عمل کی طرف رغبت دلانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ اہل بیتؑ اطہار کی پیروی کی طرف بلانا ضروری نہیں سمجھا جاتا جس کے باعث موجودہ طرز ذاکری سے مذہب وملت کو فائدہ بہت ہی کم اور اس کے بالمقابل نقصان بہت زیادہ پہنچ رہا ہے اور پھر مقررین حضرات کی باہمی رقابت اور رسہ کشی سے ملت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ عظیم تر ہے۔ اس وقت قوم میں جو انتشار اور تشتت ہے، وہ علماء کرام، واعظین عظام کے عدم اتحاد کا ردِ عمل ہے۔ اگر ان حضرات میں اتحاد ووحدت ہوتو قوم کبھی منتشر اوراق نہیں بن سکتی۔ قوم بحیثیت مجموعی خصوصاً عوام علماء کرام، ذاکرین اور واعظین کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضراتِ علماء اپنے کو صرف مصائب وفضائل کی مجالس پڑھ کر ایک پیشہ ورانہ طبقہ کے معزز افراد ہی نہ سمجھیں۔ تعلیماتِ محمدؐ وآل محمدؐ کی ترقی اشاعت اور قوم کی تنظیم واصلاح کے سلسلے میں بھی ان پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے اور جب تک وہ خود سیرتِ محمدؐ وآل محمدؐ پر عامل نہ ہوں گے، ان کے وعظ اور تقریر کا کوئی اثر ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ مقررین اور ذاکرین حضرات کے بیانات وتبلیغ وہ اثر پیدا نہیں کر رہے ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے۔

یہ صورتِ حال ہم سب کو دعوت غور وفکر دیتی ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ نجم آفندی اس بات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہمارے دینی اجتماعات، سامعین میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کرتے۔ اس وقت ذاکری کو جس نہج پر ڈھالا گیا ہے، اس سے ہماری عملی زندگی متاثر نہیں ہوتی اور نہ ہماری حیاتِ اجتماعی سنورتی

دکھائی دیتی ہے۔ البتہ ہماری دماغی عیاشی کے جملہ سامان ضرور فراہم ہوجاتے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عزاداری سید الشہداء جس سے ہماری قومی حیات وابستہ ہے، اب بے روح ہوتی جارہی ہے اور محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔

ان تصوّرات نے مرحوم کے دل میں ایک ایسی تڑپ پیدا کردی تھی کہ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ ہماری اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت قوم کی بہتری و سربلندی کے لیے سوچتے رہتے تھے۔ چنانچہ شاعر اہل بیت نے اسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی بیشتر نظموں میں قوم کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش فرمائی۔ جابجا عمل اور حقیقی عمل کی ہدایت کرتے ہیں۔ تعلیم اہل بیتؑ کی طرف راغب کرتے ہیں۔ یہ پیام ان کے کلام میں کہیں کہیں فریاد کی شکل میں پایا جاتا ہے اور اکثر التجا کے طور پر برادرانہ خطاب۔ ان کا یہ ایمان ہے کہ اگر تذکرہ اہل بیتؑ صحیح طریق پر کیا جائے تو ہماری دینی و دنیاوی زندگی کو سنوارنے کا ضامن ہوسکتا ہے۔ مصائب و فضائل آل محمدؐ وہ بلند تذکرے ہیں کہ جو نہ صرف قومی کردار میں انقلاب آفریں بہتر اثر پیدا کرسکتے ہیں، بلکہ ہر کوئی انسان، خواہ وہ کسی بھی عقیدہ و مسلک سے تعلق رکھتا ہو، ناممکن ہے کہ فضائل و مصائب آل محمدؐ خصوصاً واقعات کربلا سنے اور اس کا دل نہ کھنچا چلا آئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کا تذکرہ اس عنوان سے کیا جائے کہ ان کی یاد ہمارے قلوب کو گرما دے۔ ان کی سیرت اور زندگی ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہوجائے اور ہم میں حق و صداقت کے لیے جان دے دینے کا جذبہ بیدار ہوجائے۔ ہمارے دلوں کو ذوقِ عمل سے تڑپا دے اور ہماری فکروں میں ہمارے ارادوں میں اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر ملت کو اوج ثریا پر پہنچادینے کا شوق چٹکیاں لینے لگے۔

اس اعلیٰ مقصد کے پیش نظر حضرت نجم آفندی مجلس پڑھنے والوں، ذاکرین، مقررین اور مرثیہ خواں حضرات سے مخلصانہ خطاب کرتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ وہ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنے بیان کا رنگ بدلیں اور سامعین کے لیے دماغی عیاشی کے سامان فراہم کرنے کے بجائے، ملت کی سربلندی کے سامان فراہم فرمائیں اور صحیح معنوں میں حسینیتؑ کی تبلیغ کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

موسم غم آگیا کر شکر احسانِ حسینؑ
اے سریر آرائے مجلس مرثیہ خوانِ حسینؑ

نالہ ہائے زیر لب کو قوتِ پرواز دے
نوعِ انسانی کے اک اک فرد کو آواز دے

بے خبر افراد کو رازِ عزا داری بتا
خندہ زن قوموں کو وجہ گریہ و زاری بتا

پیش کر صدہا برس کے ناشکستہ جوش کو
دعوتِ فکر و نظر دے اہلِ عقل و ہوش کو

منکر تاثیر کا بڑھ کر کلیجہ تھام لے
چیخ اٹھے گا شہیدِ کربلا کا نام لے

اسوۂ محنت کشانِ کربلا تعلیم کر
اٹھ صفِ ماتم بچھا کر قوم کی تعلیم کر

نعرۂ یا لیتنی میں روحِ معنی ڈال دے
قول کو شانِ عمل دے رنگِ استقلال دے

دشت و در کو آنسوؤں کی سیل سے پانی بنا
درد کو طوفانِ دل کو نوحِ طوفانی بنا

جوشِ غم کے بادلوں سے بجلیاں تخلیق کر
موت کی گہرائیوں میں زیست کی تحقیق کر

شانِ سالاری بتا ذہنِ علم بردوش کو
دستگیری بھی سکھا کچھ دستِ ماتم کوش کو

سرفروشی جس کی ہے سرمایۂ نازِ حیات
اس کے لفظوں میں سنا افسانۂ رازِ حیات

بات ایسی کہہ جو دستور العمل ہو کام دے
کربلا سے جو تجھے پہنچا ہے وہ پیغام دے

چہرۂ روشن دکھا کر فطرتِ اسلام کا
کلمہ پڑھوا دے حسینؑ ابنِ علیؑ کے نام کا

مرثیہ خوانوں اور خطیبوں سے اس خطاب میں نجم صاحب نے انھیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔ واقعی اگر ذاکرین حضرات جن کی مٹھی میں ملت کی پوری توجہ ہوتی ہے اور جو عزا داری کی جان ہیں، صحیح معنوں میں اپنے فرائض کا احساس فرمائیں اور سیرت ائمہ علیہما السلام پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تبلیغ دین انجام دیں، اپنی طرز ذاکری اور طرز خطابت میں بنیادی تبدیلی پیدا کریں اور اصلاح و با مقصد ذاکری کو فروغ دیں، ہمارے معاشی و اخلاقی مسائل کو موضوع سخن بنائیں، ہماری توجہ ٹھوس اور تعمیری امور کی طرف مبذول کریں، تاریخی حقائق، قرآنی معارف، محاسنِ اسلام کے ساتھ ساتھ ملی تنظیم اور ترقیاتی پروگرام کی بھی تبلیغ و اشاعت کریں تو موجودہ قومی جمود میں بیداری پیدا ہو اور ہم عملی عروج سے ہمکنار ہوں۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ذاکرین عظام کی اس مخلصانہ کوشش سے قوم میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور ہماری جماعت

دین ودنیا میں کامیابی وکامرانی حاصل کرسکتی ہے۔

حضرت نجم آفندی محض مرثیہ خوانوں اورمقررین کو اپنا اصلاحی پیغام دے کر مطمئن نہیں ہوجاتے بلکہ تمام عزاداران امام مظلوم تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ عزادار وہ خوش نصیب قوم ہیں جن کے ساتھ حسینی انقلاب کومنانے اور اس کی یاد زندہ رکھنے کی سعادت مخصوص ہے، جو یادگار حسینؑ کومختلف انداز سے ،مختلف طریقوں سے ،کبھی مجالس، کبھی نوحہ و ماتم ،کبھی شعائرعزا، علم ، جلوس وغیرہ کے ذریعے تمام دنیا کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور اقوام عالم کومجاہد کربلا کی شخصیت اوران کے زندہ جاوید کارنامۂ شہادت سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بھی حسینؑ کارناموں کوعملی حیثیت سے اپنانے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کوحسینیت کے سانچے میں ڈھالیں تا کہ وہ حسینؑ کہلائے جانے کے مستحق قرار پائے جائیں اور اپنی مساعی سے حسینیت کا مفہوم دوسروں کوسمجھانے میں کامیاب ہوں اورحسینی مشن مؤثر طور پر دنیا والوں تک پہنچاتے رہیں اورانسانیت ان کے ذریعے حسینی تعلیمات سے فیضیاب ہوتی رہے۔عزاداران کے نام نجم صاحب یوں پیغام پیش کرتے ہیں:

مظلوم کے ماتم سے دو عالم کو ہلا دو — نوحہ میں پیامِ اب معصوم سنا دو
کہہ دو کہ اشاعت ہے ہمیں درد کی مطلوب — مامور ہیں تبلیغ محبت پہ بتا دو
سمجھاؤ یہ فریاد کی لے غور طلب ہے — دل رکھتے ہو رونے کو ہنسی میں نہ اڑادو
کچھ بھولے ہوئے سے نظر آتے ہیں مسلماں — پھر اُسوۂ شبیرؑ ذرا یاد دلادو
مدت ہوئی کرتے ہوئے اقرار غلامی — اب شان بھی کچھ اس کے غلاموں کی دکھا دو
کیا سوچ میں ہو جادۂ تسلیم دکھا کر — بھٹکے ہوئے انسان کو رستے پہ لگادو
کیا جاگ رہے ہو شبِ عاشور اکیلے — ہم کہتے ہیں سوئی ہوئی دنیا کو جگا دو
جب دوش پہ عباسؑ دلاور کا علم ہے — کیا سر پہ اٹھائے ہو فلک حشر اٹھادو
شبیرؑ کے سوکھے ہوئے ہونٹوں کا تصدق — پیاسا ہے زمانہ کی ذرا پیاس بجھادو
بات آئی ہے اشکوں کی تو ہر آنکھ سے ٹپکیں — اس غم کو جگاؤ غمِ ہستی کو سلادو

دل پہلے مگر اپنے ہی پہلو میں ٹٹولو ٹھنڈا ہو جہاں خونِ عمل آگ لگادو
یہ دل کا تڑپنا ہے کہ بیمار کی کروٹ کونین بھی تڑپیں جو تڑپنے کی رضا دو
انصارِ حسینؑ کی تاسّی کا ہے دعویٰ ملت کے پسینے پہ لہو اپنا گرا دو
یہ کوئی نہ کہہ دے کہ جھلک ان میں نہیں ہے کچھ اپنی روش سے خبرِ کرب و بلا دو
ہر سال تمھیں یاد دلاتا ہے محرم کھوئے ہوئے ہو جس میں وہ ماحول بھلا دو
ایمان کو ایمان کی صورت میں دکھاؤ اسلام کو اسلام کا مصداق بنادو

کچھ غور کرو نجمؔ کے مفہومِ سخن پر
دیوانہ سمجھتے ہو تو مرنے کی دعا دو

کوئی دیوانہ ہی ایسے مخلص انسان، ہمدردِ قوم اور نجمِ شعر وسخن کو مرنے کی دعا دے، اور وہ بھی نہایت نافہم ہے جو ایسے نقیب آل محمدؐ اور محبِّ اہل بیتؑ کو اس کی مادّی موت کے بعد مردہ سمجھے۔ محبِّ اہل بیت کبھی نہیں مرتا۔ مرنہیں سکتا کوئی شہید راہ حق۔ لاکھ موت آجائے لیکن نجمؔ مرسکتانہیں۔ من مات علی حب آل محمد مات شھیدا جیسا کہ نجمؔ مرحوم خود کہتے ہیں:

شہادت کا شرف پایا تولا میں فنا ہوکر
اٹھے بھی ہم زندہ ہی اٹھے دنیا کی محفل سے
جاری ہے اب بھی سلسلۂ نصرتِ حسینؑ
وہ سب شہید ہیں جو محبت میں مرگئے

مداحِ اہلِ بیتؑ کے لیےتو موت کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ حیات ابدی لے کرآتا ہے۔ نجمؔ صاحب بھی ایسا یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ مرحوم نے کس عقیدت سے اظہار کیا ہے:

شاعر ہوں جن کا نجمؔ وہ ہیں وجۂ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

یقیناً ہمارے دلوں میں ان کی یاد تازہ اور نگاہوں میں ان کی تصویر ہے جو کبھی محو نہ ہوگی اور ان کا تبلیغی کلام ہمارے دلوں کو زندگی جاوداں بخشتا رہے گا۔ ان کا کلام ان کی زندگی ہے اور وہ زندہ جاوید ہیں، جیسا کہ حکیم اسلام مولانا ابی طالب علیہ السلام کا حقیت آگیں ارشاد ہے۔

الناس موتی و اھل العلم احیاء۔ کنج مزار میں آرام کرنے والا زندہ جاوید ہے اگر وہ واعظانہ زندگی چھوڑ کر مرے۔

دنیا کی مایا کوئی نہیں کچھ نوحے ہیں کچھ دوہے ہیں
نجمی یہی مایا لائے تھے نجمی یہی مایا چھوڑ گئے

اور نجم مرحوم کی یہ مایا ہمارے لیے وہ سرمایۂ تبلیغ و ہدایت ہے، درس و عمل کا وہ منبع ہے، اصلاح و ترقی کا وہ سرچشمہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ ہماری راہنمائی کرتا رہے گا اور کبھی دنیا و آخرت کے فائدوں سے بے نیاز نہ ہونے دے گا۔ خدا ہم کو ان کے حقیقت افروز پیغامات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت عطا کرے۔ ہم ان کے کلام کا بہ نظر غور مطالعہ کریں۔ ان کے دیے ہوئے پیغامات، عملی رموز و نکات کو سمجھیں اور سیرت اہل بیتؑ کو اپنا شعار بنائیں، جو شاعر اہل بیتؑ کا مرکزی پیغام ہے اور یہی ان کے لیے ہمارا بہترین خراج عقیدت اور خراج تحسین ہوگا۔ مرحوم حتی الوسع سیرت اہل بیتؑ پر عمل پیرا تھے اور تا سی اہل بیتؑ اطہار کے پیغام کو ہم تک پہنچانے میں اپنی زندگی صرف کردی۔ ان کو کما حقہ احساس تھا کہ شیعہ خواہ وہ کسی مقام، طبقہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں، محبان اہل بیتؑ کہلاتے ہیں۔ اس لیے ان کا طرز عمل اور طرز زندگی اہل بیتؑ کے طرز زیست سے جداگانہ کوئی شئے نہیں۔ ضرورت ہے کہ ٹھنڈے دل سے تعلیمات آل محمدؐ کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی صلاحیتیں پیدا کی جائیں۔ ان کے طرز فکر کے نقوش اجاگر کیے جائیں۔ ان کے اعمال و اقوال کو رہبر بنایا جائے اور ان کے مقصد حیات کو اپنایا جائے۔ نجم آفندی مرحوم نے اس مقصد کی وضاحت کے لیے اپنے کلام میں دل پذیر اختراعیں کیں۔ نئی نئی راہیں نکالیں۔ ان کی نظمیں کیا ہیں عقیدت اور بصیرت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور وہ اپنی تمام عمر ہم میں روح عمل پھونکنے کی سعی بلیغ کرتے رہے۔ اللہ ان کو جوارِ اہل بیتؑ اطہار مرحمت فرمائے۔ مرتے وقت ان کی زبان پر یہی ایک صدا رہی۔ خدا اس آواز میں اثر پیدا کرے سُنیے اور غور سے سُنیے کیا کہہ رہے ہیں:

تاریخ ہے گواہ کہ ہر ایک دَور میں — کیا متحد رہے ہیں غلامانِ اہل بیتؑ
کیوں آج ہوں نہ شاد عدو اہل بیتؑ کے — آپس میں لڑ رہے ہیں ثنا خوانِ اہل بیتؑ

قربان کر رہے ہیں وہ اغراض پر اصول
کل تک تھے جان و دل سے جو قربانِ اہلِ بیتؑ

ان کا اگر یہ طرزِ عمل ہو تو ہے بجا
حاصل نہیں ہُوا جنھیں عرفانِ اہلِ بیتؑ

غیرت نہ آئے گی جو کسی نے کیا سوال
ہوتے ہیں ایسے تابعِ فرمانِ اہلِ بیتؑ

دربارِ اہلِ بیتؑ میں جانا ہوا اگر
کس منہ سے ہوسکیں گے یہ مہمانِ اہلِ بیتؑ

خدمت ہو پُرخلوص محبت ہو پُر خلوص
وہ نذر چاہیے جو ہو شایانِ اہلِ بیتؑ

ایثار کی تپش میں گزاریں وہ زندگی
جن کو ہے فکر سایۂ دامانِ اہلِ بیتؑ

وَما عَلَیْنا اِلّا الْبَلاغ

○

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

علاّمہ نجم آفندی کی نثر نگاری

علاّمہ مرحوم کی نثر نگاری کے سلسلے میں تین اہم کارنامے ہیں:

- چور ماموں
- شہیدوں کی باتیں
- لغات المذہب

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ علاّمہ مرحوم کی تمام تصانیف بنیادی طور پر مذہبی ہیں اور مذہب ہی وہ بنیاد ہے جن پر تمام علوم اور فنون کی مستحکم بنیاد رکھی گئی ہے اور رکھی جاتی ہے۔ سیکولرزم، (لادینیت) کا ڈھونگ رچانے والے بھی بہ مشکل ہی مذہب سے الگ ہو پاتے ہیں۔ ایمان داری یہ ہے کہ مذہب سے لگاؤ کا اس صاف طریقہ پر اعلان کردیا جائے جیسا کہ علاّمہ مرحوم کی تمام تر تصانیف میں ملتا ہے۔ مندرجہ بالا تصانیف صاف طور پر مذہبی ہیں اور ان کا مقصد نوعمروں کو مذہب کی بنیادوں سے واقف کرانا ہے۔

نجم صاحب مرحوم کی نظم میں تصانیف ہر سن اور سال کے لوگوں کے لیے ہیں، مگر ان نثری تصانیف کا رخ خاص طور سے بچوں کی طرف ہے اور ان تمام خصوصیات سے معمور ہیں جو بچوں کے ادب میں ہونا چاہیے۔ ان کی نفسیاتی سطح وہی ہے جو ایک عینی معلم کو اختیار کرنا چاہیے اور زبان وطرزِ ادا بھی اتنا آسان اور دلکش ہے جو اسی سطح کی کتابوں میں ہونا چاہیے۔

اسی طرح ''چور ماموں'' ایک تمثیلی افسانہ ہے جس میں پہلے کچھ بچوں کے سامنے لایا گیا جو ان میں سے ایک کی سالگرہ منانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بچوں کی آپس کی بات چیت ایک دلچسپ نفسیاتی فضا قائم کرتی ہے۔ خاص طور سے ایک توتلی لڑکی مہر النساء نمایاں ہوتی ہے۔ سارا

معاملہ چھوٹے بڑے بچوں کا ہے اور ایسا گڑ بڑ جیسا بچوں کا ہونا چاہیے، مگر یہ جلسہ ایک صاحب کے آنے سے ایک خاص ترتیب میں آجاتا ہے، جو اپنے آپ کو ان بچوں کا ماموں بتاتا ہے۔ سالگرہ کے جلسے کے لیے مٹھائی منگاتے ہیں۔ جلسہ کے صدر بن کر بچوں کو اہم تاریخی اور جغرافیائی حقیقتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ مالک مکان پولیس آفیسر ہیں اور وہ ایک اہم تفتیش کے سلسلے میں چلے جاتے ہیں۔ واپسی پر انھیں ایک خط ملتا ہے جس سے انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ملزم کی تلاش میں وہ شہر کی ناکہ بندی کررہے تھے، وہ ان کے گھر ہی میں تھا۔ افسانہ کی جان ملزم کا کردار ہے۔ اپنے خط میں وہ بتاتا ہے۔

''میں ایک تعلیم یافتہ انگلینڈ ریٹرن چور ہوں۔ اور جتنی دیر میرا یہاں قیام رہا، میں نے تہذیب اور اخلاق کے اصول کو لمحہ بھر کے لیے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ میں نے اس قلیل وقت میں ان کو خوش رکھنے کی کسی قدر کوشش کی اور ان کی معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا۔''

چوری کے متعلق آپ زیادہ فکر نہ کیجئے۔ سیٹھ صاحب بہت وزنی آدمی ہیں۔ تھوڑا سا بوجھ ہلکا ہوگیا ہوگا۔ اچھا ہی ہُوا۔ خدا ہی جانتا ہے کتنا غیر معمولی سود اور بے تحاشا منافع کا پیسہ ہوگا۔''

اس تمثیلچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تجمل صاحب کو اصلاح کا کتنا شوق تھا اور کس سلیقے اور شگفتگی سے وہ اصلاحی امور کو تمثیل کے ذریعہ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ اور کاموں میں مصروفیت نے انھیں اس طرف زیادہ توجہ دینے کی مہلت نہ دی مگر پھر بھی وہ اپنے بنیادی اخلاقی مقصد کو جیسے بھی ممکن ہوا پیش کرتے رہے۔ ان کا خاص میدان نظم ہے مگر نثر میں جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے، وہ ان کی ادبی صلاحیتوں کا پورے طور پر آئینہ دار ہے۔

نثر میں ان کا شاہ کار اور اپنی نوعیت کی بہترین کتاب ''شہیدوں کی باتیں'' ہے۔ اس میں بڑی جدت یہ ہے کہ فرضی چٹکلوں کے بجائے انھوں نے واقعہ کربلا سے مستند تاریخی واقعات لیے ہیں اور ان کو ایسی زبان اور ایسے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے کہ بچے کیا، بزرگ لوگ بھی ان

سے ہدایت حاصل کریں۔ ''مقدمہ'' میں وہ فرماتے ہیں۔

''میں کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہوں۔ نہ میرا مقصد کوئی دماغی کارنامہ ہے۔ یہ تمام اقوال تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

میں شرافتِ نفس کے ان زرّین کارناموں کو تاریخی ضخیم کتابوں کی دبازت سے نکال کر چند مختصر صفحات میں قوم کے نونہالوں کے سامنے لایا ہوں کہ وہ انھیں دیکھیں اور غور کریں۔ ممکن ہے کہ کوئی اچھا نتیجہ نکلے۔''

یہاں ہر واقعہ کو نہایت مناسب سرخی دی گئی ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

شہیدِ انسانیت

''عصر عاشورہ کے وقت حسینؑ زخموں سے چور ہو کر زمین پر بیٹھے جھوم رہے تھے۔ ایک شخص قتل کے ارادے سے بڑھا۔

فرمایا: ''تو میرا قاتل نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تو مبتلائے عذاب ہو۔'' حسینؑ کے اس ارشاد نے دل بدل دیا۔ ''ابن رسول اللہ آپ کو اس حال میں بھی ہمارا غم ہے۔'' یہ کہہ کر روتا ہوا اپنے ساتھیوں پر پلٹ پڑا اور حسینؑ کے لیے لڑ کر جان دے دی۔''

کیا دشمن پر ترس کھانے کی ایسی کوئی مثال ہے۔ شرافتِ انسانی کی اسی معراج کو دیکھو۔

عظمتِ کردار

''محمد ابن بشر الحضرمی کو معرکہ کربلا میں یہ اطلاع ملی کہ تمھارا بیٹا سرحدِ رے پر گرفتار ہو گیا ہے۔

محمد ابن بشر نے کہا: ''میں اس کی نصرت کو امامؑ کی نصرت پر ترجیح نہیں دے سکتا۔'' امامؑ نے فرمایا: ''میں نے اطاعت کا بار تم سے اٹھا لیا۔ جا کر اپنے بیٹے کو چھڑاؤ۔'' عرض کیا: ''یا ابن رسولؐ اللہ۔ اگر میں آپ کو چھوڑ دوں تو جانور درندہ

مجھے پھاڑ ڈالیں۔''

''محمد ابن بشر کا یہ جواب جذبۂ اخلاص کی ایک چیخ ہے جو دل کو چیر کر نکلی ہے۔ عہد رفاقت کی یہ مضبوطی۔ محبت کی یہ کو ہماری مطالعہ کرو اور اے حسینؑ کے نوعمر ماتم دار و کردار کی اس بلندی تک پہنچو۔''

جانِ معرفت

''قاتل جب سینہ پر سوار ہوا ہے، اس وقت کے دو جملے حسینؑ مظلوم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے تاریخ میں ملتے ہیں۔ ایک با آواز بلند۔ ایک زیر لب قاتل سے فرمایا ''تو کون ہے جو ایسے بلند مقام پر چڑھ گیا۔''

اپنی عظمت کا احساس، اس کے اعلان و اظہار، استقرار حق کا محل دیکھو، اور سوچتے رہو۔

زیر لب کچھ فرمایا: قاتل نے کان لگا کر سنا

''تم اپنا عہد پورا کرو۔ میں اپنا عہد پورا کروں گا۔''

یہ قرآن کی ایک آیت ہے جس کی تلاوت کا نہ اس سے بہتر وقت ہوسکتا تھا نہ کسی اور کی زبان اس کی تلاوت کے لیے اس زبان سے زیادہ موزوں تھی۔''

ان تین مثالوں ہی سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ نجم صاحب کس پایہ کے معلمِ اخلاق ہیں۔ چٹکلوں کے ذریعہ اخلاق سکھانے کا طریقہ فارسی اور اردو ادب میں عام ہے۔ یہاں جدّت یہ ہے کہ چٹکلے فرضی نہیں ہیں، بلکہ تاریخی اور مستند ہیں اور ایک عظیم ترین علم اخلاق سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ان میں عظمت کا وہ پہلو نکلتا ہے جو رزمیہ نظموں کی جان ہوتا ہے۔ پھر زبان و بیان کا عالم دیکھیے۔ سادہ اور روزمرّہ کی زبان کا طرزِ کمال ہے۔ ہر حکایت کیل کی طرح دل میں گڑ جاتی ہے۔ کاش نجم مرحوم اسی طرح کی ضخیم کتاب مرتب فرماتے۔ بہرحال وہ آئندہ لکھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان کی نشاندہی کر گئے۔

تیسری کتاب کی بابت مرتضیٰ حسین فاضلؔ صاحب فرماتے ہیں:

''**لغات المذہب** میں ایسے الفاظ و اصلاحات و تلمیحات کا مختصر تعارف ہے جسے ہر سن و سال کے آدمی، بچے، جوان، بوڑھے، لڑکی، لڑکے، مرد و عورت ہر ایک کو ان سے واقف ہونا چاہیے۔ اس لغت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

لولا علی لھلك عمر۔ جب کسی امر مشکل میں حضرت عمر حاضر ہو کر امیر المومنین سے مدد مانگتے تھے اور حضرت اسے حل کر دیتے تھے اس وقت آپ کی زبان پر یہ جملہ جاری ہوتا تھا جس کا ترجمہ ہے اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

واجب تمیزی: دو امور واجبہ میں سے ایک کا بجالانا۔

وادی عقبہ: پہاڑ کی ایک گھاٹی جہاں اعلان غدیر خم کے بعد مدینہ جاتے ہوئے کچھ نقاب پوش افراد نے رسول اللہ ﷺ کے اونٹ کو بھڑکانے اور حضرت کو شہید کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

واقعۂ قرطاس: رسالت مآبؐ نے رحلت سے کچھ روز قبل بحالت مرض کچھ لکھوانے کے لیے دوات قلم طلب فرمائی تھی تا کہ **ملت** آپ کے بعد گمراہ نہ ہو لیکن صحابہ کرام میں اختلاف ہوا، اس پر بحث ہونے لگی کہ اس حکم کی تعمیل کی جائے یا نہ کی جائے۔ آپ نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ یہ واقعۂ قرطاس کہلاتا ہے۔ اس حکم کی آخر تعمیل نہ ہوئی۔ پورا واقعہ تاریخ میں دیکھو۔

یوم الست: وہ دن جب خداوند عالم نے ارواح سے عہد و پیمان لیا ہے۔

اس کتاب کے معاملہ میں بھی نجم مرحوم نے مذہبی ڈکشنری کی ابتدا کی اور آج جب کہ ہماری مذہبی اصطلاحیں غیر معروف ہوتی جارہی ہیں، ایسی ضخیم کتابوں کی ضرورت ہے جو مذہب سے وابستہ اصطلاحوں اور جغرافیائی اور تاریخی مقامات کے بابت معلومات بہم پہنچا سکیں۔ اس معاملہ میں بھی نجم مرحوم نے ایک ایسی ابتداء کی ہے جس کی حدیں بہت دور جانے والی ہیں۔

نجم مرحوم نے زیادہ وقت اور توجہ نظم کو دی اور اس میں مخصوص اضافے کیے۔ نوحہ اور ماتم کو

جوعوامی درجہ کی چیزیں تھیں، ان کو انھوں نے ادبی حیثیت دے دی مگر نثر میں جو کچھ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں، وہ آگے آنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ تمثیلی یا اشاراتی افسانوں، مختصر تاریخی حکایتوں اور مذہبی اصطلاحوں کے سلسلے میں جس کام کی انھوں نے ابتدا کی ہے اس کی حدیں بہت دور جاتی ہیں ۔ ان کی شاعری بہت کافی مقبول ہے اور قومی شاعری خود رو اصناف کو مستقل ادبی مقام دیتی ہے مگر ان کی نثر مستقبل میں آنے والے رجحانات کا پیش خیمہ اور ضروری اور مفید رجحانات کی ابتدا کرتی ہے۔

○

جناب امیر امام حُر

نجم آفندی کی ہندی شاعری

جناب نجم آفندی سے مجھے پہلی بار شرف زیارت جب حاصل ہوا جب وہ لکھنؤ کے 1939ء والے شیعہ ایجی ٹیشن کے بعد جیل سے نکل کر آئے اور بجائے حیدرآباد دکن واپس جانے کے لکھنؤ ہی میں قیام کو ترجیح دی۔ میرے خالو صاحب، جناب سید حسن مہدی (برادر جناب سید محمد مہدی، رابطہ صاحب پیر پور) سے جناب نجم آفندی کی ملاقات اور تعارف غالباً جیل میں ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے موصوف سے گزارش فرمائی کہ ان کے بڑے بیٹے، سید حسین مہدی سلمہ کو اردو اور فارسی کی تعلیم اور ادبی تعلیم دے دیں۔ اس سلسلے میں جناب نجم آفندی کا قیام محمود آباد ہاؤس، قیصر باغ میں تقریباً دو سال رہا، جس کے بعد وہ پھر حیدرآباد دکن واپس چلے گئے۔

اس دو سال کی قلیل مدت میں میں نے جناب نجم آفندی کو کافی قریب سے دیکھا۔ البتہ اس زمانے میں میری عمر اتنی نہ تھی کہ موصوف کی ادبی شخصیت کی پوری معرفت حاصل کرتا۔ (میری ولادت جنوری 1928ء کی ہے اور میں اس دوران میں لڑکپن اور نوجوانی کے درمیان میں تھا) لیکن نجم آفندی کی ادبی و شعری شخصیت سے بغیر تھوڑا بہت متاثر ہوئے، شاید ہی کوئی اس زمانے میں رہا ہو۔

جناب سید آلِ رضا صاحب دام مجدہٗ، جناب جوشؔ اور جناب نجم، یہ تینوں حضرات اس زمانے میں مرثیہ سرائی شہدائے کربلا کو اپنے اپنے مخصوص و منفرد انداز میں ایک نیا رنگ دے رہے تھے۔

انیسؔ و دبیرؔ، و عشقؔ و تعشقؔ و اوجؔ و نفیسؔ کے زمانے سے لے کر ان تینوں حضرات یعنی سید آلِ رضاؔ، جوشؔ اور نجم آفندی کے عہد تک جو فکری و ادبی تغیرات تمام دنیا میں اور برصغیر میں واقع ہو چکے تھے اس سے کوئی سماج اور مجمع بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمارے زمانے تک وہ

سابق اودھ کا افق پھیل کر عالمی بن چکا تھا۔ انگریزی تعلیم، انگریزی اردو، عربی اور فارسی زبانوں کی کتابوں کی طبع ونشر و اشاعت، اخباروں اور پھر ریڈیو کی خبروں کے ذریعے سے دنیا بھر کی اطلاعات اور معلومات وغیرہ، ان سب کا لازمی نتیجہ ہمارے اذہان کے آفاق کی غیر متوقع توسیع تھی اور اب ہم سب ہی اس کے قبل والی ذہنیتوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے، لیکن ایک تخلیقی ذہن اور ادبی صلاحیت والی شخصیت میں اور ہم سب کے ذہن اور صلاحیت میں یہی فرق ہوتا ہے کہ چاہے احساس کم و بیش ہم سب کو ہو، لیکن قیادت وہی کرتے ہیں جن میں غیر معمولی تخلیقی استعداد ہوتی ہے۔

چنانچہ مرثیہ سرائی شہدائے کربلا میں جن حضرات نے ہمارے عہد میں اس تخلیقی کام اور ادبی قیادت کو پورا کیا، ان میں ان تینوں حضرات یعنی سید آل رضاؔ، جوشؔ اور نجمؔ آفندی کو شاید اولیت حاصل ہے۔

جناب نجمؔ کی مرثیہ سرائی، سید آل رضاؔ اور جوشؔ دونوں حضرات سے مختلف انداز رکھتی ہے۔ جوشؔ کی مرثیہ سرائی ان کی انقلابی شاعری اور ان کی آزادفکری کی ایک تحدید ہے۔

سید آل رضاؔ کی مرثیہ سرائی اور نجمؔ آفندی کی مرثیہ سرائی اس بات میں مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں کے یہاں بے انتہا خلوص وعقیدت کا گہرا احساس ہوتا ہے، لیکن جہاں سید آل رضا کے مراثی میں لکھنؤ کی زبان کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ نئے خیالات و افکار کی تازگی ہے، وہاں نجمؔ آفندی کی مرثیہ سرائی میں ہندی زبان کے ادب کے اثرات اور ہندوستان کی دنیا کی انفرادیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میرا ذاتی تاثر پورے طور پر معروضی نہ ہو، لیکن مجھے ہمیشہ نجمؔ آفندی کی ہندی زبان میں مرثیہ سرائی، ان کی اردو زبان کی مرثیہ سرائی سے زیادہ موثر محسوس ہوئی۔

کم از کم امیر خسروؔ کے عہد سے لے کر اب تک جو ہندی ادب مسلمانوں کے دوران حکومت میں اور پھر انگریزی حکومت اور آزادی برصغیر کے عہد میں وجود میں آیا ہے، وہ خود بہت وسیع اور متنوع ہے۔ کبیر داس کے دوہوں سے لے کر حالی جی (جمیل الدین عالیؔ) کے دوہوں تک جو ہندی ادب ہمارے سامنے ہے، وہ کسی طرح اردو ادب سے کم ادبی اہمیت نہیں رکھتا۔ آرزوؔ لکھنوی کی خالص اردو اسی ہندی ادب اور اردو ادب کے درمیان ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہی نہیں

ہے، بلکہ ایک بہت شگفتہ ادبی تخلیق ہے۔ آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' جو خالص اردو میں نظموں کا گلدستہ ہے، اپنی شیرینیِ زبان اور لطافتِ احساس میں آپ اپنا جواب ہے۔ اس میں دو نظمیں قابلِ توجہ ہیں جو ایک ہی زمین میں تو ہیں لیکن ایک عاشقانہ غزل ہے اور دوسری رثائی نظم ہے۔ قافیہ برسا، ٹھہرا، وغیرہ اور ردیف پانی۔ اور اس مشکل زمین میں اور بر خود عائد کردہ خالص اردو کی قید کے باوجود، یہ دونوں بے تکلف انداز اور برجستگی و بیساختگی میں آمد کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہیں۔

نجم آفندی نے ہندی زبان میں جو مرثیہ سرائی کی ہے وہ بھی اسی طرح آمد میں آپ اپنی مثال ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی میں ان کی خلوصِ عقیدت اور بھی زیادہ اس لیے واضح نظر آتی ہے، چونکہ ہندی زبان کی سادگی اور بیساختگی نجم آفندی کی شاعری کی اس خصوصیت کو اور بھی زیادہ اجاگر کر دیتی ہے۔ اس کا دوسرا سبب شاید یہ بھی ہو کہ نجم آفندی کی مرثیہ سرائی کا جو مقصد تھا وہ بلیغ تھا اور اردو سے زیادہ یہ مقصد ہندی کے ذریعے حاصل ہوتا تھا۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب دنیا بھر حسین ابنِ علیؑ اور ان کے رفقاء کی شہادت کے پیغام اور مقصد کو سمجھ کر دکھ اور درد کی دنیا سے پوری طرح ہمدردی کا احساس کرنے لگے گی۔ لیکن ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اور برصغیر کے ایک باشندے ہوتے ہوئے نجم آفندی کو شاید یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ ان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کو اسلام کی اس دکھ بھری کہانی، یعنی واقعہ کربلا سے آگاہ کریں اور اس مقصد کے لیے ہندی زبان سے زیادہ کوئی اور زبان مناسب نہ تھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ جیسا مجھے ذاتی طور پر محسوس ہوتا ہے، نجم آفندی کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی، ان کی اردو زبان کی مرثیہ سرائی سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔

نجم آفندی کی اس فکر و نظر کا ثبوت ان کی ایک نثری تصنیف سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے بعنوان ''حسین اور ہندوستان'' اس موضوع پر لکھی ہے کہ جناب سید الشہداء کا ایک ارادہ یہ بھی تھا کہ اگر انھیں تبلیغ اسلام کے لیے ہندوستان جا کر اخلاق حسنہ سے اسلام کی دعوت دینا ہو تو انھیں جانے کا موقع دیا جائے۔

نجم آفندی کی ہندی زبان کی مرثیہ سرائی کی جو مثالیں اس وقت تک میری نظر سے گزری ہیں ان میں من جملہ ''اسلام پوتھی'' ''کربل نگری'' کے، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ جو کچھ ماقبل

کی سطروں میں کہا گیا ہے، غلط نہیں ہے۔ ''دکھ کا ساگر'' ''کھیون ہار'' ''حسینیٰ سیوا'' ''پریم پنتھی'' اور ''دھرم پربت'' بھی ہیں۔ اول الذکر نسبتاً طویل ہیں لیکن آخر الذکر بہت درد بھری اور موثر ہیں۔ ان میں سے چند اشعار کا اقتباس بطور مثال اور بغرض شواہد، قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ آیا جو کچھ اوپر کی سطروں میں عرض کیا گیا ہے، وہ درست ہے یا نہیں۔

کربل بن سے چلے مسافر باجت کوچ نقارا — ایک اک سیس انی پر چمکے چمکے جیسے تارا
سب سے لانبی پرچھی پردہ سیس حسینؑ سوامی کا — بھرے پُرے سنسار میں جس کو بھوکا پیاسا مارا
پریم کی نیا ڈوب رہی تھی کیسی پار لگائی — اپنے لہو میں ڈوب کنارے لایا کھیون ہارا
جان گئے پردیسی دیسی جھوٹی سانچی مہما کو — ہار ہے کس کی جیت ہے کس کی مان گیو جگ سارا
ہنس ہنس دکھ کی کڑیاں جھیلیں جگ کو یہ اُپدیش دیا — اپنے دم کا آس بھروسہ مالک نام سہارا
نگری نگری دھوم مچی ہے واہ حُسینؑ بابا کی — کربل بن میں دیا جلایو سارا جگت اجیارا

(کھیون ہار)

اندھیارا پاپ کے بادل کا سنسار پہ جب چھا جاتا ہے
اک چاند سروپی سورج روپی مکھڑا درس دکھاتا ہے
جب مایا جگ کو کھاتی ہے جب ایسی بپتا آتی ہے
جب مالک آنکھ بدلتے ہیں اک بندہ آڑے آتا ہے
اک جینا مرنا اُن کا ہے جو جیتے ہیں مرجاتے ہیں
اک جینا مرنا اُس کا ہے جو مر کے امر ہوجاتا ہے
جاگی ہوئی کب کی آنکھیں تھیں خنجر کے تلے بھی آہ نہ کی
سکھ نیند اُسی کو آتی ہے جو سوتی قوم جگاتا ہے
بھاشا کے رسیلے شبدوں میں دکھ روپ کہانی کربل کی
محنت یہ سوارت ہو بھگتی یوں کون کسے سمجھاتا ہے

(دھرم پربت)

شبیر کے تن کی بستی میں شیرؑ کا من کیا ہیرا تھا
اس دیپ کی لو بڑھتی ہی رہی آنکھوں میں اندھیرا چھائے گیا
سنتے ہیں کہ دھرتی کانپ گئی تلوار وہ کی تلوار یئے نے
جو بھور سے لے کر سانجھ تلک لاشیں ہی اٹھا کر برسائے گیا
کیا تیروں کی بوچھاروں میں اُپدیش کی میٹھی باتیں تھیں
سب اپنے لہو کے پیاسوں پر وہ امرت جل برسائے گیا
سنسار کو ست کی شکتی سے گھر بار لٹا کر موہ لیا
سودا ہے ذرا اک جوکھم کا جو کھوئے گیا وہ پائے گیا
اب جا کے ہمالہ پربت سے لے ماتم کی ٹکراتی ہے
اس دیس کی تجھی دور بلا جس دیس پہ یہ غم چھائے گیا

(پریم پنتھی)

جی دے کے یہ سور گباش ہوئے کوفے کے ادھرمی ناش ہوئے
شیرؑ کا بول بالا رہا اسلام کی اونچی بات رہی
سانچے ہی رہے جو سانچے تھے یاں سانچ کو کوئی آنچ نہیں
دشمن ہی کو سب نے دوش دیا اور ان کے لیے صوات رہی
ایشر کی دیا لہرائے گی آکاش کی بانی آئے گی
دکھ درد کی جتنی دھوپ بڑھی سنتوش کی بدلی چھات رہی
اب راجا پرجا چوکھٹ پر سب سیس نوائے بیٹھے ہیں
جب چھوڑ کے دنیا دین لیا دنیا بھی انھیں کے ہات رہی
جب آئے حسینیؑ سیوا میں سب ہندو مسلم ایک ہوئے
مل جائیں گے جمی دل بھی کبھی جب اُن کی نجر پر بات رہی

(حسینی سیوا)

سنسار کا چاہا اُس نے بھلا کٹوادیا کنبے بھر کا گلا
شیرؑ کے من کے سانچے میں کرتار نے بھگتی ڈالی تھی
مارے گئے ست کی سیوا میں دھنباد ہے ایشر بھگتوں کو
مکھڑوں پہ لہو کی لالی سے بڑھ بڑھ کے خوشی کی لالی تھی
یہ جی سے گزرنے والے تھے یہ بات پہ مرنے والے تھے
کب موت سے ڈرنے والے تھے سو بار کی دیکھی بھالی تھی

(دکھ کا ساگر)

ان مثالوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہندی زبان میں تجم آفندی نے بڑی غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ان باتوں کو کہا ہے جو ہم شاید اردو ہی میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور ان کی اس کامیابی میں ان کے اِس خلوص کا بڑا حصہ ہے جو ان کا تبلیغی مقصد تھا یعنی حسینیؑ پیغام اور اسلامی اصول کو آفاقی و عالمی ثابت کر کے اُس کی طرف دعوت دینا۔ لیکن جس طرح ہر اچھی بات پہلے اپنے نزدیک ترین لوگوں سے کہی جاتی ہے اور اس کا ثبوت خود اسلام کی تاریخ کے اس اہم واقعے یعنی دعوت عشیرہ سے ملتا ہے، اسی طرح تجم آفندی نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنے وطن یعنی ہندوستان کی اکثریت کو مخاطب کر کے حقیقی اسلام کے اصول کو ان کے لیے اجاگر کریں اور اس کے لیے دو باتیں ضروری تھیں، ایک تو واقعات و امور دین سے سب سے اہم واقعے کا انتخاب، جو ان کی نظر میں واقعۂ کربلا ثابت ہوا اور دوسرے زبان کا انتخاب، جو ظاہر ہے کہ اکثریت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندی زبان ہی مناسب تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تجم آفندی نے اپنے ان فیصلوں میں بڑی بصیرت سے کام لیا اور ہمیں ان کی اس بصیرت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی خوبیوں کا قائل ہونا پڑے گا۔''

○

جناب سید باقر حسن زیدی

شاعرِ اہل بیتؑ علاّمہ نجم آفندی

نجم آفندی کے نام سے میں بچپن سے مانوس ہوں۔ ہمارے گھر کے عزا خانے میں چھ محرم کو حضراتِ عونؑ و محمدؑ کا تابوت اٹھایا جاتا تھا۔ اس مجلس میں میرے والدِ محترم حضرت فیضؔ بھرت پوری ایک مخصوص مرثیہ ہر سال پڑھا کرتے تھے اور مرثیہ کے بعد نجم صاحب کا مشہور نوحہ:

زینبؑ کے دُلارے ہیں زینبؑ کے دُلارے ہیں

انتہائی عقیدت و احترام سے پڑھا جاتا تھا اور آٹھ محرم کو جب علم نذر کیے جاتے تھے، یا بچے سقّہ بنائے جاتے تھے، تب بھی ان کی مشہور نظم ''قومی نشان'' ہمیشہ پڑھی جاتی تھی۔ یوں تو ان کے نوحے زبان زد عام ہیں لیکن جو شہرت عام اور بقائے دوام اس نظم کو حاصل ہوا ہے، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاید ہی کوئی عزا خانہ ایسا ہو جس میں بالخصوص یہ نظم نہ پڑھی جاتی ہو اور اسی نظم کے مقطع سے میں نجم صاحب کے نام سے اس وقت متعارف ہوا تھا جس زمانے کی بیشتر باتیں اب یاد بھی نہیں، لیکن اُس نظم کے بیشتر اشعار آج بھی میرے حافظہ پر نقش ہیں۔ اس نظم کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے:

نشانِ فوج پیمبرؐ سجایا جاتا ہے شبابِ شیرِؑ خدا یاد آیا جاتا ہے

وہ سامنے ہے علَم کی شبیہ نجم اٹھو وفا پرستی کا منظر دکھایا جاتا ہے

تبلیغی جذبہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے حضرت نجم نے ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہندی میں بے شمار نوحے لکھے جس میں ان کی ایک معرکۃ الآرا نظم ''کربل نگری'' بے حد مقبول ہوئی اور ہندو شعرا نے اس نظم سے متاثر ہوکر نوحے، سلام اور مرثیے لکھے۔ نجم کی ایک معروف

شاگرد مس روپ کماری کا مرثیہ اس امر کا شاہد ہے۔

مرثیہ کے میدان میں بھی نجم نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور اگرچہ صرف دو تین مرثیے لکھے لیکن یہ مرثیے اس میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید مرثیہ کا مزاج ان کے اندازِ فکر کا آئینہ دار ہے۔

کہتے ہیں کہ سقراط کو جب اُس کی آزادیٔ فکر کی سزا میں زہر کا پیالہ پلایا گیا تو اس کے عزیز ترین شاگرد CRATO نے غم واندوہ کی حالت میں اپنے استاد سے پوچھا کہ آپ کے مرنے کے بعد ہم کیا کریں گے۔ جواب ملا۔ میرے جسم میں کیا رکھا ہے، جو کچھ ہے میری فکر ہے جو اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک تم اس سے استفادہ کرتے رہو گے۔ نجم بھی اس وقت تک زندہ ہیں جب تک ہم ان کی انفرادی طرزِ فکر، جذبۂ اسلام اور پیغامِ عمل کو مشعلِ راہ بنا کر ان کی روح کلام سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

جب بھی میں نجم کی جرأتِ تنقید اور جذبۂ اصلاح سے متاثر ہوتا ہوں، میرے سامنے حضرت ابو ذر غفاریؓ کی جرأتِ ایمان کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ نہ ابوذرؓ کے جنازے کی بے کسی ابوذرؓ کے مدارج کو کم کرسکی اور نہ نجم کے جنازے کی غربت نجم کی اہمیت کو گھٹا سکی۔ اپنی تمام پستیوں کے باوجود ابھی اس قوم میں اتنی بے حسی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اپنے محسنوں کو بھول جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اس محسنِ قوم اور عظیم شاعر کی زندگی میں ہم اس کی خاطر خواہ قدر نہ کرپائے۔ کاش اللہ ہم کو توفیق دے کہ ہمارے بھٹکے ہوئے قدم نجم کی تعین کردہ منزل کی طرف چل نکلیں۔

عقیدت کے علاوہ نجم صاحب سے میرا ایک اور رشتہ بعد میں قائم ہوگیا اور ان کے حقیقی برادرِ خورد حضرت کوکب آفندی کی فرزندی میرے لیے باعثِ شرف ہوئی۔ اس طرح جو لگاؤ بچپن سے نجم صاحب سے شروع ہوا تھا اسے مزید تقویت پہنچی۔

شروع میں میں بھی عقیدتاً ان کے نوحے گنگنایا کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں علم اور شعور بڑھتا گیا ان کے کلام کی انفرادیت دل ودماغ کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی غم جیسے نازک ترین احساس کو حیرت انگیز طریقے پر فکر وعمل کی بلندی کے لیے استعمال کرنے کی قدرت تھی۔ نوحہ ایک ایسی محدود صنفِ سخن تھی جس سے صرف گریہ وبکا

اور ماتم کے تقاضے بیہ اشعار کے ذریعے پورے کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت علی اصغر کے حال میں یہ اشعار اثرِ کلام اور مآلِ بیان کی بنا پر بہت مقبول تھے اور عام طور پر شعرا اسی قسم کے اشعار لکھتے تھے۔

قبرِ اصغرؑ پہ کہتی تھی مادر گھر چلو شام ہوتی ہے اصغرؑ

منہ چوم کے ماں نے کہا گھر آئیو اصغرؑ اکبر کی طرح رن میں نہ رہ جائیو اصغرؑ

اے مومنو جب خون میں ڈوبا ہوا آیا اصغرؑ کا جنازہ ایک ایک نے رو رو کے کلیجے سے لگایا اصغرؑ کا جنازہ

ننھا سا جھولا جل گیا اصغرؑ کا بھائی جان خیموں میں آگ فوجِ ستم نے لگائی ہے

اصغر کے لیے نالہ و فریاد کرے گی ماں قید میں بچے کو بہت یاد کرے گی

ایک عظیم مفکر اور مصلح قوم کی طرح نجم آفندی نے اس عام روش سے ہٹ کر اپنے لیے ایک مخصوص راہ معین کی اور نوحے کے میدان کو وسعت دے کر اسے تبلیغ و افکار کا لامحدود ذریعہ بنایا۔

حضرت علی اصغر کے لیے کہے ہوئے ان کے یہ چند شعر اندازِ فکر کی امتیازی حیثیت نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔

جب ضرورت اک علی کی پھر ہوئی میدان میں
چھ مہینہ کا علی مردانہ وار آ ہی گیا

کیا نصرتِ حسین میں اصغرؑ کی شان ہے ختمی مآبِ معرکۂ کربلا ہوا

قسم کھاتا ہوں تیرہ سو برس کے دورِ ماتم کی
تری چھ ماہ کی ہے عمر، عمرِ خضرؑ سے بہتر

علی اصغرؑ کی منزل کچھ نہ پوچھو یہ تربت کربلا در کربلا ہے

تہذیبِ لاشِ اصغرؑ ناداں پہ نوحہ گر اخلاق کی نگاہ سے عالم گرا ہوا

جانِ رباب، جانِ پدر، جانِ کربلا
چھ ماہ کا وہ فاتحِ میدانِ کربلا

نجم صاحب غمِ حسین کو اپنی قوم کی بے مثال Strength تصور کرتے تھے۔ وہ کربلا کو اصلاحِ انسانیت کا عظیم محرک سمجھتے تھے اور ہر شہید کو ایک منارۂ ہدایت۔ انھوں نے ہمیشہ المیۂ کربلا کے تعمیری پہلو پیش کیے۔ یہی وجہ ہے کہ قنوطیت، حزن و ملال، بیچارگی و مجبوری اور مایوسی و ناامیدی کی کیفیت ان کے کلام میں مفقود ہے۔ ان اشعار کو دیکھیے۔ ان کی بلاغتِ فکر اور بیدار مغزی کی داد دیجیے۔

اسلام تیرا حاصلِ محنت ہے اے حسینؑ
دنیا میں دین تیری بدولت ہے اے حسینؑ
جینے کا اختیار تھا مرنا کیا پسند
کیا جبر و اختیار پہ قدرت ہے اے حسینؑ

رہِ عمل میں اُٹھائے جو مرتضیٰؑ نے قدم اُصول بن گئے اللہ کی رضا کے لیے

یہ نہ قرآں میں، نہ قرآن کی تفسیر میں ہے
روحِ احساس و عمل اُسوۂ شبیرؑ میں ہے

سبطِ نبی سے دینِ خدا کا قیام ہے کلمہ حسینؑ کا ہے محمدؐ کا نام ہے
دنیا میں یا حسینؑ کا نعرہ جو عام ہے یہ دشمنِ حسینؑ سے اک انتقام ہے

سینہ پہ کائنات کے نقشِ دوام ہے — انسانیت حسینؑ کے اسوہ کا نام ہے
اپنی طرف سے چھیڑ نہ اپنی طرف سے جنگ — یہ مسلکِ حسین علیہ السلام ہے

حسینؑ رازِ حیات آشکار کرتے ہیں — ہر اختیار پہ موت اختیار کرتے ہیں
قدم ہٹیں گے نہ انصارِ حق کے میداں سے — حسینؑ پرورشِ کوہسار کرتے ہیں
ہجومِ غم کو مٹاتے ہیں یا علیؑ کہہ کر — ہزار وار پہ ہم ایک وار کرتے ہیں
یہ مجلسیں نہیں پیمان ہیں اطاعت کے — یہ ہم حسینؑ سے قول و قرار کرتے ہیں

شبیرؑ سیاست کا وہ قائدِ اعظم ہے — قانون بنا ڈالا عاشور کو دن بھر میں

سروؑ ہیں زیرِ تیغ یہ رفعت لیے ہوئے — کونین کا نظامِ حکومت لیے ہوئے

تربیت کی ذہنِ انساں کی غمِ شبیرؑ نے — صاحبِ دل بن گئے جو غم کے خوگر ہو گئے
کون لاتا جو حسینؑ آخر پیامِ حریت — یہ پیمبرؐ کے نواسے تھے پیمبرؐ ہو گئے
وہ بھی دن آئیں دلِ ملت سے آئے یہ صدا — نوجواں آمادۂ تقلیدِ اکبرؑ ہو گئے

ہم کود کے بچوں کو کر دیتے ہیں شامل — جب تکملۂ قوتِ لشکر نہیں ہوتا
آسان ہے قربانی و ایثار پہ تقریر — میدانِ عمل کچھ سرِ منبر نہیں ہوتا
اے نجم جبیں ہوتی ہے چوکھٹ پہ نجف کی — میں مدح کے عالم میں فلک پر نہیں ہوتا

جب سے قتلِ سبطِ پیغمبر پہ تکبیریں کہیں
گھٹ گیا اُس دن سے زورِ نعرۂ تکبیر بھی

عزمِ خالص چاہیے حُر کے ارادے کی قسم
بڑھ گیا آگے تو پیچھے ہٹ گئی تقدیر بھی

نجم آفندی کو اپنی قوم کی پسماندگی ودر ماندگی اور احساسِ کمتری کا شدید احساس تھا۔ وہ ایک انتہائی حساس دل رکھتے تھے جو قوم کی خستہ حالی دیکھ کر تڑپ اُٹھتا تھا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے درد کو انھوں نے اپنی ذات میں جذب کر کے اُسے اپنا درد بنا لیا تھا۔ اور اپنی تمام تخلیقی قوتیں اس درد کے درماں کی تلاش میں صَرف کردی تھیں۔ ان کے یہ چند اشعار دیکھیے اور میرے دعوے کی صداقت کی تائید کیجئے۔

وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں جس قوم کے ورثہ میں ہو عاشور کا دن

احساس ہو قوم میں تو دن پھیر نہ دے
ہجرت کی یہ رات اور یہ عاشور کی شب

جس قوم نے سرکی مہم کرب و بلا
اُس قوم میں ملتے نہیں آثارِ حیات

اللہ وہی قوم ہو سب سے پیچھے جس قوم میں ہو معرکۂ کرب و بلا

''تہذیب مودت'' ان کے قطعات کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کا پیش لفظ چند جملوں پر مشتمل ہے۔ ان جملوں کی صداقت دیکھئے اور اس کرب کا اندازہ کیجئے جسے اس حساس شاعر نے اپنا مقسوم بنالیا تھا اور اپنے مقصد کو آگے رکھ کر نظم ونثر کی تمام صلاحیتوں کو بیداریِ فکر اور اصلاحِ قوم کے لیے وقف کردیا تھا۔ جہاں کہیں معاشرہ کی خرابیاں نظر آئیں۔ انھوں نے ان کی نشاندہی ضرور کی۔ مثلاً:

مایوسِ شفا کو آسرا دیتے ہیں　　آیات کو تعویذ بنا دیتے ہیں
ہشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق　　بے ہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں
نمودِ قوتِ نانِ شعیر دیکھتے ہیں　　کمال شوق سے سب داروگیر دیکھتے ہیں
غمِ حسینؑ بھی یارب کوئی تماشہ ہے　　غریب کرتے ہیں ماتم امیر دیکھتے ہیں

افطار کے سامان سے مطبخ بھر جائے　　جو زیرِ گلو جائے وہ قطرہ تر جائے
ہوتی نہیں ایسے روزہ داروں کو خبر　　فاقے سے اگر کوئی پڑوسی مر جائے

عالم ہے تو قرآں پہ عامل بھی ہو　　خاکِ درِ اہلؑ بیت منزل بھی ہو
اے دوست تری عباقبا کے نیچے　　اللہ کرے درد بھرا دل بھی ہو

بھولے سے کسی کی خود بھی کرتے ہیں مدد؟
دن رات جو یا علیؑ مدد کہتے ہیں

مجلس ہماری قوم کی ایک لاثانی میراث ہے اور اصلاحِ قوم کے لیے اس سے زیادہ موثر پلیٹ فارم ممکن نہیں ہے۔ نجمؔ کے کلام میں جگہ جگہ منبر نشینوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے والے اشعار موجود ہیں۔

نجمؔ نے اپنے اعلیٰ مقصد کے سامنے اس بات کی ذرا بھی پروانہ کی کہ وہ روایتی مولوی کو ہدف بنا کر ایک انتہائی محترم اور با اثر طبقہ کو اپنے خلاف کر رہے ہیں۔ ان کے مقصد کی راہ میں کوئی با اثر ہستی اور کوئی عقیدہ، خواہ وہ کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، زد میں آیا تو انھوں نے رعایت نہیں برتی۔ تنقید کی۔ بھرپور تنقید۔ پوری سچائی کے ساتھ اور غالباً یہی مقصد کی سچائی تھی کہ جو طبقہ ان کا سب سے زیادہ ہدف بنا، وہی ان کا سب سے بڑا قدرداں نکلا۔

منبرِ رسولؐ سے خطابت اور شاعری کے پھول برسانے والوں کے لیے ان کا پیغام یہ تھا:

موسمِ غم آگیا کر شکر احسانِ حسینؑ
اے سریر آرائے مجلس مرثیہ خوانِ حسینؑ
بے خبر افراد کو رازِ عزا داری بتا
خندہ زن قوموں کو وجہ گریۂ وزاری بتا
منکرِ تاثیر کا بڑھ کر کلیجہ تھام لے
چیخ اُٹھے گا شہیدِ کربلا کا نام لے
اُسوۂ محنت کشانِ کربلا تعلیم کر
اُٹھ صفِ ماتم بچھا کر قوم کی تنظیم کر
نعرۂ یا لیتینی میں روحِ معنی ڈال دے
قول کو شانِ عمل دے رنگِ استقلال دے
شانِ سالاری بتا ذہنِ علم بردوش کو
دستگیری بھی سکھا کچھ دستِ ماتم کوش کو
بات ایسی کہہ جو دستور العمل ہو کام دے
کربلا سے جو تجھے پہنچا ہے وہ پیغام دے
چہرۂ روشن دکھاکر فطرتِ اسلام کا
کلمہ پڑھواوے حسینؑ ابن علیؑ کے نام کا

○

ڈاکٹر شیخ انصار حسین

نجم آفندی کا تابندہ کلام

حضرت نجم آفندی مرحوم کو میں اپنے اوائل عمر ہی سے جانتا تھا۔ اس کی وجہ میرے محترم خالو جان حضرت یاس یگانہ مرحوم سے ان کی برادرانہ دوستی تھی جو یگانہ مرحوم کے مرتے دم تک خلوص اور وضع داری کے ساتھ جاری رہی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں ہر سال ایام عزا کے دوران نجم آفندی کے نوحے اور سلام اس قدر مقبول عام تھے کہ جگہ جگہ سننے میں آتے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ بچوں کی ایک انجمن ''غنچۂ اطفالیہ'' (لکھنؤ) میں، میں خود اور میرا چھوٹا بھائی وقار حسین جب نجم کا نوحہ پڑھتے تھے تو اہلِ علم و دانش کثیر تعداد میں جمع ہو کر داد دیتے تھے اور مثاب ہوتے تھے۔ اُس نوحے کے دو بول مجھے آج بھی یاد ہیں

خدا کی راہ میں کارِ نمایاں ایسے ہوتے ہیں
عطش پر صبر کر لیتے ہیں انساں ایسے ہوتے ہیں

سُنا کر نجم قصہ کربلا والے شہیدوں کا
مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

واقعی کربلا کے شہیدوں کی ہر بات بالا، بلکہ بہت بالا اور ہر کام بڑا، بے حد بڑا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ کربلا کے واقعۂ جانکاہ کے ہر جز نے دنیا والوں کو متاثر کیا ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے بنی نوعِ آدم کے ہر حلقۂ فکر و نظر نے اپنی اپنی توفیق اور صلاحیتوں کے بموجب اس سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ وارداتِ کربلا کو کس کس نے سمجھا، کہاں کہاں سمجھا اور کن کن مراحل پر سمجھا گیا، اگر اس کی فہرست مرتب کی جائے تو نہ معلوم کتنی

جلدیں درکار ہوں گی۔ البتہ اگر مختصراً بیان کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ امامِ عالی مقام حضرت حسین ابن علی علیہما السلام اور ان کے بہتر (72) حریت پسند ساتھیوں نے تمام شعبہ ہائے عمرانی کو متاثر کیا ہے اور انسانیت کے لیے اخلاقی قدروں کی آبیاری کر کے اسلام کو ایک زندگی نو عطا کی اور شعورِ انسانی کو ایسی جلا بخشی ہے کہ رہتی دنیا تک ایک یادگار رہے گی۔

اس ضمن میں حضرت نجم آفندی نے اپنی تابندہ تصنیف وتالیف کے جواہر پاروں سے اردو ادب کے سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ عربی فارسی اور اردو شعراء میں نجم آفندی وہ واحد شاعر ہیں جنہیں ''شاعرِ اہلِ بیت'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دامنِ آلِ رسول سے یہ ابدی وابستگی یقیناً لائقِ فخر واعزاز ہے۔ نجم آفندی کا دوسرا اعزاز یہ ہے کہ وہ آگرے کے رہنے والے تھے۔ بقول ان کے والد بزم آفندی کے:

زباں میر کی تھی میر آگرے کے تھے
شرف ہے بزم نہ دلّی نہ لکھنؤ کے لیے

نجم آفندی نے اگرچہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن نوحے، ماتم، سلام، اور مرثیے کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ایسی شاعری کو گریہ وزاری، آہ وبکا اور رونے پیٹنے کی شاعری خیال کرنا کسی صحت مند ذہنی رجحان کی علامت نہیں۔ اس سلسلے میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ رونا پیٹنا شیوۂ مردانگی نہیں اور پھر یہی نہیں، اپنے اس دعوے کے جواز میں بعض ساقط الاعتبار، غیر فطری اور رد کر دینے کے لائق جھوٹی روایت کو آڑ بنایا جاتا ہے۔

اس خصوص میں اگرچہ متعدد جدلیاتی استدلال Dialectical Arguments سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ میرے نزدیک یہ طرزِ استدلال غیر مطبوع اور اس کے برعکس اثباتی اندازِ فکر ونظر دل نشین ثابت ہوتا ہے، اس لیے میں بھی دوسرا راستہ اختیار کرنا پسند کرتا ہوں۔

عہدِ حاضر کے سائنسی اندازِ فکر ونظر کے مطابق ماہرینِ حیات انسانی اور علم الابدان کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ رونا اور ہنسنا بزدلی نہیں، ایک فطری ردِعمل ہے اور انسانی زندگی کے لیے بہت اہم بھی ہے۔ ماہرینِ علم الابدان کا یہ تجزیاتی اور تجرباتی فیصلہ ہے جس کی فنی تشریح عوام الناس کی توجہ کا

مرکز نہیں بن سکتی۔ یہ تو ہے عہدِ حاضر کا اندازِ فکر ونظر۔ اب اگر ہم تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت بغیر کسی دقت کے ہم پر منکشف ہو جاتی ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی آئے ہیں جب دنیا کے بڑے بڑے اولوالعزم اور عظیم المرتبت انسان کسی خاص واقعے پر رو دیے اور اس رونے سے ان میں ایک ناقابلِ شکست عزم وثبات پیدا ہوا۔

مسئلہ زیرِ نظر کے ان دو پہلوؤں کے بعد ایک تیسرے پہلو پر نظر ڈالیے۔ یہ پہلو اتنا بدیہی اور اتنا واضح ہے کہ اگر ہم میں قوتِ تمیز معطل یا سلب نہیں ہوئی ہے تو ہم ہر دور اور ہر خطۂ ارض پر اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ دکھ پہنچنے پر انسان رو دیتا ہے۔ اس روشن حقیقت پر کوئی غیر فطری خول نہیں چڑھایا جا سکتا۔

نجمؔ کا عروجی نقطۂ فکر ابتداء ہی میں اس حقیقت سے آشنا ہو گیا تھا کہ اس کا رگِ شیشہ گری میں نزاکتِ احساس کے تاثر پذیرانہ پرتو کے اظہار کا سب سے عظیم اور بلند ترین ذریعہ حزن وملال کی تقدیس ہے۔ گریہ کائناتی حقائق کا سچا، قابلِ قبول ردعمل اور ایک ایسا پرتو ہے جسے نادرالوجود سمجھنے میں انسان حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا حزنیہ شاعری کے خلاف دلوں کا زہر زبان وقلم سے ٹپکتا ہی رہتا ہے۔

ابھی تک یہ مظلومیت کی کہانی کہی جا رہی ہے سُنی جا رہی ہے
سمجھ لے گی وہ غمِ کربلا کو جو دنیا ابھی اجنبی جا رہی ہے
یہ گریہ نہیں ہے یہ آنسو نہیں ہیں یہ دادِ وفا ہے جو دی جا رہی ہے
ابھی نجمؔ کچھ اور نوحے سناؤ
ذرا قوم کی بے حسی جا رہی ہے

نجمؔ اس حقیقت سے واقف تھے کہ عالمی معیار کے مطابق دنیا کا عظیم ادب، حُزنیہ ادب ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا آج تک یونانی المیوں اور انیسؔ کے المیے کا جواب نہ پیدا کر سکی۔ پھر چونکہ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ کا عروجی نقطۂ منتہا، الم پسندی ہے، اس لیے نجمؔ نے مختلف اصنافِ میں سے اس غم انگیز صنف کو اپنی جودتِ طبع کے لیے منتخب کیا۔

نجمؔ آفندی نے ایک زوال آشنا معاشرے میں آنکھ کھولی اور اس کے ہر گوشے اور شعبے کا

بڑی گہری نگاہ سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے اس دور کے مسلمانوں پر نظر کی جو تقریباً ایک تہائی آبادی اور خطۂ ارض کے مالک ہونے کے باوجود پستیوں اور گمنامیوں کی تاریک اور دور دست وادیوں میں کھو چکے تھے۔ ہندوستان کے فاتح مسلمان بھی غلام تھے اور اسی غلامی نے ان میں متنوع قنوطی تحریکات کو جنم دیا۔ چنانچہ ذہنی مفرور شعرا اپنی مختلف شاعرانہ مصنوعات پر مختلف لیبل لگا کے انھیں بازار میں لے آئے۔ ان تمام اشتہاری فن کاروں میں صرف ایک قدر مشترک تھی اور وہ یہ کہ حیاتِ انسانی کے گہرے پیچیدہ مسائل پر فولادی پردے ڈال کر جھوٹے کیف وسرور اور غیر حقیقی مسرت وانبساط کا ڈھول پیٹا جائے اور حصولِ مسرت ہی کو عین مقصدِ حیات قرار دیا جائے۔

غرض ان شعرا نے مقصدِ حیات کی عکاسی اور آئینہ سامانی محض مادّی بنیادوں پر کی، ولولہ انگیز جنسی محرکات کو منتہائے فکر قرار دے کر پوری طرح کچے ذہنوں کو متاثر کیا۔ اب آپ غور فرمائیے کہ حیاتِ انسانی کا یہ معیار تقدیسِ الم کے مقابلے میں کتنا بے مایہ اور کم حقیقت ہے۔ نجم نے الم کو حاصلِ حیات قرار دیا۔ تاریخِ عالم میں ایسا حاصلِ حیات جس کی عدل ونظیر موجود نہیں۔ نجم کی شاعری کا محور حسینؑ کی ذات ہے،

وہ حسینؑ جس نے عالمِ انسانیت کو رہتی دنیا تک ایک ایسا حسین اور نیا اُفق دیا جو انسانی معراج کا نقطۂ منتہا ہے

چاند نے زہراؑ کا مستقبل درخشاں کردیا
قومیت کی روحِ آزادی کو جولاں کردیا
اے حسینؑ ابنِ علیؑ اے کار سازِ حریت
تو نے مرگ و زندگی دونوں کو آساں کردیا
درد کی قوت سے دنیا لرزہ براندام ہے
بجلیاں ماتم میں بھردیں غم کو طوفاں کردیا
جھوٹ سے ٹکرا کے سچے بول شعلے بن گئے
ہر زبانِ گنگ کو شمشیرِ عریاں کردیا

ڈھے گیا قصرِ امارت ہل گئی بنیادِ ظلم
کارگاہِ عیش کو خوابِ پریشاں کردیا
اضطرابِ معنوی دے کر بنایا دل کو دل
زندگی کو زندگی انساں کو انساں کردیا
نجم ہم نے مدحِ اہلِ بیت کے ہر شعر میں
فاضلِ طینت کی فطرت کو نمایاں کردیا۔

حسین نے دشتِ نینوا میں حریت فکرونظر، آزادیٔ ضمیر، جرأتِ اظہارِ حقائق اور ہولناک قربانیوں کی ایسی مثالیں پیش کیں جن کی کبھی کہیں اور مثال نہیں اور جو خود اپنی مثال ہیں۔

حضرتِ ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے قربانی کا عزم کیا، لیکن حسین نے عزم کے بعد بارگاہِ رب ذوالجلال میں بہتر قربانیاں پیش کیں۔ وہ آزادی کا طلوع تھا اور یہ نصف النہار۔ غرض نجم نے حسین کی ذاتِ بابرکات کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ انھوں نے اظہارِ فکر کے لیے اپنے نصب العین میں وحدتِ تامہ تلاش کی۔ ایک ایسا نصب العین جس کی بلندی اور ارتفاع تک کسی دوسرے نصب العین کی رسائی ممکن نہیں

بعدِ حسین یوں کوئی جلوہ نُما نہیں ہُوا
حوصلۂ بشر کبھی کرب و بلا نہیں ہُوا
ہائے وہ ارضِ کربلا ہائے وہ سجدۂ جبین
پھر تہ تیغِ جانستاں ذکرِ خدا نہیں ہوا
ہائے حسین کا لہو ہائے ہجومِ رنگ وبو
پھر کوئی خطۂ زمیں خاکِ شفا نہیں ہوا
نجم کہیں ہمارے بعد اہلِ عزا نہ یہ کہیں
نجم کی طرح پھر کوئی نوحہ سرا نہیں ہوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ نجم آفندی کی اس شاعری کی بنیاد مذہبی، اعتقادی اور تاریخی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نجم کا مقصدِ شاعری اس عالم میں انسان کے مقام کی

وضاحت ہے۔ ان کی شاعری کا مقصد انسان کے اصل نصب العین کی نشاندہی ہے۔ اس میثاق کا اعادہ ہے جو انسان نے یومِ الست کو کیا تھا۔ انسانی عظمت کی اس انتہا کو ظاہر کرنا ہے جس کے آگے کچھ نہیں، جس سے بلند کوئی نہیں اور جس کے سامنے کوئی عظمت نہیں۔

ہر چند کہ نجم آفندی اب ہم میں موجود نہیں لیکن ان کے عظیم کام اور کارنامے ہمیشہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔ انھوں نے اپنی سچی لگن، ان تھک محنت اور علمی وادبی انہماک کے ذریعے صاحبانِ بصیرت کے لیے ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو نہ صرف ان کے مداحوں اور ان کے شاگردوں کے لیے قابلِ تقلید ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ آیندہ نسلوں کے لیے بھی ایک ایسی فروزاں مشعل رہے گی جس سے رہنمائی حاصل کرنے کے علاوہ حوصلہ اور ہمت کے سرچشمے جاری وساری رہیں گے۔

وہ بلاشبہ ان فخرِ روزگار لوگوں میں سے تھے جو اپنی عالی ظرفی کے سہارے اپنے لیے ایک پاکیزہ دنیا اور شفاف ماحول تیار کر لیتے ہیں۔

نجم کی زندگی بلاخیز ہنگاموں سے پاک تھی اور انھوں نے ہمیشہ ایک خاموش اور باوقار انسان کی حیثیت سے اپنا علمی، ادبی اور تہذیبی سفر جاری رکھا اور راستے کے بلند و پست کو خاموشی کے ساتھ ہموار کیا۔ انھوں نے اختلافات اور قدیم وجدید کی بحث میں پڑے بغیر اپنا رستہ خالص علمی وتحقیقی شعبوں سے اُستوار کیا اور زبان وتہذیبی روایات کی سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کرتے رہنے کی سعیِ پیہم کے سوا کسی اور بات پر اپنی توجہ مرکوز نہ کی۔

''اتنی محنت اور ایسے انہماک کے ساتھ انھوں نے ایک کارِ خیر کو کچھ اس سلیقے سے انجام دیا کہ ہر قسم کے اختلافات اور سارے تضاد، ان کی شخصیت کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئے، اور اس طرح اپنی زندگی ہی میں وہ ''شاعرِ اہلِ بیت'' کے منصب پر فائز ہو کر لائقِ احترام اور قابلِ فخر ہو گئے'':

خود پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی بن گئی
نجم آخر شاعرِ آلِ پیمبرؐ ہو گئے

○

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

نجم آفندی کی عزائیہ شاعری

نجم آفندی نے اردو شاعری میں فکر کے نئے سانچے ڈھالے اور زبان میں انداز بیاں کے نئے اسلوب پیدا کئے۔ ان کے عزائیہ نوحوں میں فکر کی گہرائی اور ابلاغ کی وسعت ہے۔ ان کے سلام بھی اسی طرح پیغام حیات جدید ذہن کو فکر کی روشنی میں دیتے ہیں، اسی طرح ہر مذہب وملت کے لیے ان کا کلام یکساں طور پر جاذب قلوب ہے۔

اس وقت پیش نظر صرف ایک مرثیہ ہے جو ''معراج فکر'' کے نام سے شیخ محمد صدیق صاحب نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ اس مرثیے کے بیاسی بند ہیں۔ یہ مرثیہ ستر برس کی عمر میں لکھا گیا تھا۔ یہ مرثیہ اس پختگی عمر کے دور کا ہے جہاں عقل وفکر اپنی پختگی کے اوج کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ شاعر کا اس روانی کے ساتھ مرثیہ کی مشکل وادی میں قدم رکھنا ایک مشکل امتحان ہے اور وہ اس میں اس کامیابی سے گزرے ہیں، جہاں ان کے انداز بیاں میں بے حد وانتہا سلاست وروانی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں وہ سب فطری تبدیلیاں ہیں جو ذکرِ حسینؑ کے سبب انسانی ذہن میں آگئی ہیں۔

اس مرثیہ کا پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ
اک مرکزِ روابطِ اقوام ہے حسینؑ
فکر و نظر، مشیت و الہام ہے حسینؑ
محبوبِ اہل درد بس ایک نام ہے حسینؑ

دریا مخالفت کے چڑھے، اور اُتر گئے
باقی رہا یہ نام، حوادث گزر گئے

اس مرثیہ میں انھوں نے امام حسینؑ کی زندگی کو ایک مثالی انسان کی زندگی کے طور پر پیش کیا ہے۔ حسینؑ کی زندگی نے خوددار زندگی بسر کرنے اور عوامی شعور کو بیدار کرنے، اور عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دینے کا سلیقہ دیا اور زمانے کی تبدیلیوں کے باوجود جو انسانیت کے بنیادی اصول قائم کردیے، وہ بلا تفریق مذہب وملت ہر انسان کے لیے سرمایۂ افتخار اور باعثِ شرف ہیں اور رہیں گے۔ زیرِنظر بند میں اسی جذبۂ اظہار کو ملاحظہ فرمائیے۔

خوددار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسینؑ عزت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسینؑ
جو خالق شعورِ عوامی ہے وہ حسینؑ ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسینؑ
واقف نہیں بشر جو پیمبرؐ کے نام سے
مانوس ہیں حسین علیہ السلام سے

ان کی زندگی ہر ہر قدم ایک طرف منشائے رسالتؐ کے مطابق، اسی لیے اور حکم الٰہی کے تحت اور منزل تفسیر پر قرآن کی تفسیر، گویا قرآن مجید کی آیات کا مصداق ذاتِ حسینؑ تھی۔ زہد کی تعریف قرآن میں پڑھیے۔ صابرین کا تذکرہ پڑھیے اور اس تعریف کے مصداق حسین علیہ السلام تھے اور بس وہی تھے۔ جنھوں نے ثباتِ عزم بھی بخشا اور اظہارِ حق کا سلیقہ بھی:

مظلومیت کو عزم دیا، حوصلہ دیا
اظہار حق کا جس نے سلیقہ سکھا دیا

اس دنیا میں اعتدال کی زندگی بسر کرنا ایک انتہائی مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہی ہے۔ شاعر ہمارے سامنے ایسے انسان کی زندگی کو پیش کررہا ہے جس نے منزل خیروشر میں تمیز پیدا کرکے امروز کے آئینے میں تصویرِ فردا دکھادی۔ اکثریت کے دور میں، تلواروں کی جھنکار میں، لاکھوں انسانوں کے درمیان جس کا ہر قدم عملِ رسولؐ کی مکمل تصویر تھا۔ اگر یزید نے حسینؑ سے بیعت لینے پر اصرار کیا تھا تو کیا ہوا۔ امام حسینؑ نے بھی مکہ مدینہ سے باہر کربلا کے تپتے میدان میں ہر غلط اصول کی تردید اپنی خون کی لکیروں سے کردی۔ شاعر کا نکتہ سنج قلم اپنے اچھوتے انداز

میں پورے دور پر تبصرہ ہی نہیں بلکہ تنقید کر کے کردارِ حسینؑ کو ممتاز حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ مرثیہ میں یہ انداز نیا ہے اور دلکش بھی ہے۔

تاریخِ روزگار پہ تنقید جس نے کی ہر ایک غلط اصول کی تردید جس نے کی
قدرت کے نظم وضبط کی تائید جس نے کی اسلام کے پیام کی تجدید جس نے کی
پھر بڑھ چلا تھا زور جو باطل کا گھٹ گیا
پردہ سا ایک روئے حقیقت سے ہٹ گیا

شاعر کا اندازِ فکر بالکل فلسفیانہ ہے۔ زمانے کے تقاضے ذہن انسانی کو جس نئی سوچ کی طرف بڑھا رہے ہیں، ان تقاضوں کا جواب کردارِ حسینؑ میں دیکھئے اور اپنی مشکلات کا حل اسی سے حاصل کیجئے۔ غریب وامیر دونوں کے لیے زندگی کا ایک نیا سلیقہ بخشا اور یہ بتادیا کہ حق اگرچہ تعداد میں انتہائی مختصر ہی کیوں نہ ہو، اکثریت کے زعم باطل کو ختم کرسکتا ہے اور پھر یہ کہ زعم بھی وہ زعم جو فرمانِ رسولؐ کے خلاف ہو، تو اس کی اہمیت پرِ کاہ سے بھی کم ہے۔ دولت کب کسی کے اطمینان کا باعث بن سکتی ہے اور ناشکری کب انسانیت سے دور کردیتی ہے، وہ شاعر کے الفاظ میں سنیے کہ انھوں نے عزائیہ شاعری میں فلسفیانہ اندازِ فکر پیش کر کے ایک ٹھوس دلیل کو شاعری کے سانچے میں ڈھال کر نہایت نرم ونازک الفاظ میں پیش کردیا۔

جس نے کیے مقاصدِ صبر و رضا بلند جس نے کیے معانیِ حرفِ وفا بلند
جس نے کیے منازلِ درد آزما بلند ممنون سب اسی کے ہیں کیا پست کیا بلند
منعم کو شکرِ نعمتِ حق کا سبق دیا
جس نے غریب قوم کو جینے کا حق دیا

حسینؑ کی ذات والا صفات اس لیے واجب الاحترام ہے کہ جو بلا شرکت غیرے رسولؐ کی نمائندگیِ شہادت کا حق ادا کررہی ہے (بقول صاحب سرالشہادین) اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولؐ کی نمائندگی ایک طرف اور مخالف رسولؐ کی نمائندگی دوسری طرف کا رسالت، اس کا اندازہ حسینؑ سے زیادہ کون کرسکتا ہے، جس قدر اہم ہے اس کا اندازہ حسینؑ سے زیادہ کون کرسکتا ہے اس لیے شاعر کا نکتہ سنج قلم اسی نکتہ کو یوں بیان کر کے عزمِ حسینؑ کو نمائندگیِ کارِ رسالتؐ کا مرتبہ دیتا ہے کہ

جو حق ہے اور عین حق کہ

زندہ کیے حسینؑ نے اسلام کے اصول　　اس نے عوض نبیؐ کے شہادت بھی کی قبول
مجتمع الصفات ہوئے اس طرح رسولؐ　　اور اک دم بخود ہوں کہ حیران ہوں عقول

اک آیۂ جلی ہے یہ سرِّ خفی نہیں
منصب تو ہے نبیؐ کا اگر وہ نبیؐ نہیں

شاعر نے تمام معروف شہدائے کربلا کا نام ہر ہر بند میں کر کے بعد میں جناب علی اصغرؑ کی شہادت جس کر بہہ انداز میں کی وہ ان کے زور قلم کا شاہکار ہے اور ان کی شہادت نے بتا دیا کہ بنائے ظلم رکھنے والے واقعی نام کے مسلمان تھے۔ اور یہ بند ان کے مرثیہ کی جان ہے:

ایسی بنائے ظلم ہے اس کے گلے کا تیر　　جس سے نگاہِ غیر میں اسلام تھا حقیر
ہوتی ہی جارہی ہیں غلط فہمیاں کثیر　　روکی ہمارے اشک عزا نے یہ دار و گیر

ماتم نے راز فاش کیے اہلِ شام کے
ہم نے بتا دیا وہ مسلماں تھے نام کے

شاعر، ذکر حسینؑ کو فکر کی عظمت قرار دیتا ہے اور اس غم کو فرض عین سمجھتا ہے اور غم حسینؑ کو اپنے سینے سے اس طرح لگائے رکھتا ہے کہ اہل دنیا اگر چاند پر مادی برتری کے لیے جائیں گے لیکن ہمارے نزدیک عظمت غم حسینؑ اور عظمت علمدارِ حسینؑ اتنی ہے کہ ہم فضائے عالم کی بلندی پر بھی اسے نہ بھولیں گے۔

عباسِ نامور کا علَم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

○

جناب شمشاد حسین رضوی

نجم آفندی اپنے خطوط کے آئینے میں

کسی شاعر و مفکر کو سمجھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے گرد و پیش کے ماحول اور اس کے محرکات و کوائف کو سمجھا جائے تا کہ اس کی روشنی میں اس کے کلام و افکار کا صحیح تعین ہو سکے۔ انسان چونکہ الگ تھلگ رہ کر زندگی کو اس کی صحیح قدروں اور فطری مطالبات کے ساتھ پورا کرنے سے قاصر ہے، لہٰذا وہ اجتماعی اندازِ رہائش اختیار کرتا ہے اور سوسائٹی سے کسی نہ کسی صورت میں واسطہ ضرور رکھتا ہے، اس لیے اکثر وہ مقامات بھی آتے ہیں جہاں انسان کو اپنے اوپر خول چڑھانا پڑتے ہیں اور بعض اوقات تو کئی کئی خول چڑھانا پڑتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی قسم کا خول چڑھانا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ ٹوٹنا تو پسند کرتے ہیں مگر لچکنا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے ایک طبقہ انہیں نا عاقبت اندیش یا مصلحت آمیزی سے عاری تصور کرتا ہو۔ یہاں یہ بحث بے سود ہے کہ ان کا طرزِ فکر صحیح ہے یا غلط۔ تاہم ایسے اشخاص ہر جگہ اور ہر دور میں ملتے ہیں۔

جہاں تک اپنی شخصیت پر خول چڑھانے کا تعلق ہے تو وہ اکثر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے اور اگر شخصیت ذرا سلیقہ مند ہو تو وہ خول بہت مشکل سے اُترتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی شاعر یا دانش ور کی گفتگو یا اس کے کلام سے اس کی شخصیت کے ہر پہلو اور اس کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی حسرتوں کا بھی پورے طور سے جائزہ لیا جا سکے۔ کیونکہ گفتگو میں بھی کچھ آداب ملحوظ ہوتے ہیں اور کلام میں بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں جس کے باعث وہ شخصیت پورے طور سے نمایاں ہو کر سامنے نہیں آپاتی ہے۔ البتہ ایک موقع ایسا ہوتا ہے جہاں تمام پردے ہٹ

جاتے ہیں۔ تمام تکلفات ختم ہوجاتے ہیں۔ سارے خول اُتر جاتے ہیں اور وہ ہے نجی خط وکتابت۔

جب کسی ارادت مند، بے تکلف دوست یا قریبی عزیز سے مراسلت ہوتی ہے تو اُس مراسلے کے ذریعے کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔ کیونکہ مراسلہ نگار کا یہ قطعی خیال نہیں ہوتا کہ اس کی اس ''نصف ملاقات'' کو کبھی منظرِ عام پر بھی لایا جائے گا اور اس کی شخصیت اپنی حقیقت کے ساتھ اپنے خط میں اپنے مخاطب سے بیان کردیتا ہے۔ اگر مرزا غالبؔ، ابوالکلام آزادؔ۔ اور دیگر مشاہیر ادب کے خطوط کا سرمایہ ہمارے سامنے نہ آتا تو ہم یقیناً ان کی شخصیات، ان کے ماحول اور ان کے فکری محرکات کا صحیح جائزہ نہ لے سکتے۔

نجم آفندی نے تقریباً ساٹھ سال تک شعروادب کی باقاعدہ خدمت کی اور اس عرصے میں بڑے بڑے معرکے دیکھے۔ عوام سے لے کر خواص تک۔ غریب کی جھونپڑی سے لے کر تاجدار آصفیہ کے 'فلک نما' اور 'کنگ کوٹھی' تک مختلف محافل ومجالس میں شرکت کی۔ ہزاروں کو مشورۂ سخن دیا۔ لاکھوں دلوں میں اپنے لیے جگہ بنائی اور کروڑوں محبانِ اہلِ بیت کے لیے ''کربلائی ادب'' کی تخلیق کرکے اُسے طرزِ جدید اور آہنگِ نوبخشا۔ لہٰذا ایسی ہستی کا وہ گوشہ بھی تو قابلِ غور ہے جہاں وہ مجلسی زندگی سے دور ہوکر اپنی شخصیت کا عکس اپنے مراسلے پر مرکوز کردیتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں جب پہلی بار ایک جلوسِ عزا میں کسی نوحہ خواں کو یہ مصرعہ پڑھتے سنا:

''جس مانگ کو دیکھا اجڑی تھی جس گود کو دیکھا خالی تھی''

تو شعری محاسن کو سمجھنے کا شعور نہ رکھنے کے باوجود، میرے دل ودماغ پر اس کا بہت اثر پڑا۔ پھر کسی دوسری جگہ سنا:

''حسنین کا ماتم چاند میں ہے، حسنین کا ماتم تاروں میں''

تو اس مصرعے نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ اول الذکر مصرعے نے دل میں ایک کسک پیدا کرکے ذہن پر اُس لٹے ہوئے قافلے کی مظلومیت کا احساس نمایاں کیا، اور دوسرے مصرعے سے حسنین علیہما السلام کی عظمت کا احساس اور پیغام حسینیؑ کے فروغ کی تحریک بیدار ہوئی۔ مگر یہ پتہ اس

وقت میری کم عمری کے باعث نہ ہو سکا کہ آخر نوحہ وسلام میں اس جدید طرزِ فکر کا خالق کون ہے۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا جب شعر و ادب سے دلچسپی کے ساتھ اسے سمجھنے کی کچھ صلاحیت پیدا ہوئی۔

نجم آفندی کے کلام میں جو جدت مجھے نظر آئی، اس کے باعث مجھے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس ہستی کے بارے میں اور اس کی زندگی کے دوسرے گوشوں کو قریب سے دیکھ کر اپنے خیالات وتاثرات دوسروں کے سامنے پیش کروں۔ اگر میری اس جسارت کو قارئین کرام معاف فرمائیں تو اتنا اور عرض کر دوں کہ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا اور آج بھی اپنے اس خیال پر قائم ہوں کہ لوگ اپنی مجالس ومحافل کو نجم آفندی کے کلام سے زینت دینے پر تو مُصر تھے مگر عملی زندگی میں اس کلام کے خالق کو مجالس ومحافل کی حدود سے آگے کوئی خصوصی مقام دینے کے سلسلے میں بالکل خاموش تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے محدود علم وفکر کے باوجود نجم آفندی کی زندگی کے چند گوشوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں مرحوم سے تقریباً بارہ تیرہ سال تک مختلف موضوعات پر مراسلت ہوتی رہی اور جب وہ کراچی تشریف لائے تو شرفِ نیاز کے ساتھ بالمشافہ گفتگو اور تبادلۂ خیال کا بھی موقع ملا۔ مجھ سے مرحوم کی پُرخلوص محبت اور کرم گستری کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور نہایت مفید مشورے دیے۔

میں ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ایک کتاب ترتیب دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے حتی المقدور مواد بھی جمع کر لیا تھا مگر گوناگوں مصروفیات اور اپنی تساہلی کے باعث ان کی زندگی میں ان پر ایک مضمون بھی نہ لکھ سکا جس کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔

جن دنوں میں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان) میں تھا اور نجم آفندی حیدرآباد دکن میں تھے، اور مجھے جب بھی ان کے متعلق کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو میں انھیں زحمت دیتا اور وہ بلا تامل مجھے تفصیلات سے آگاہ فرماتے۔ خط کا جواب دینا وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو بھی تفصیلات ان کے متعلق میرے پاس جمع ہوئیں وہ مجھے براہِ راست ان سے ہی حاصل ہوئیں۔ میرے پاس ان کے جتنے خطوط آئے اور جو انقلابِ مشرقی پاکستان کے بعد میرے پاس رہ گئے، ان میں سے 13-12 خطوط اس مضمون میں شامل کیے گئے ہیں تاکہ قارئین ان کی زندگی کے ان گوشوں سے روشناس ہو سکیں جو عام لوگوں سے اب تک

پوشیدہ رہے ہیں۔

میں نے نجم آفندی مرحوم میں جو چند خصوصیات محسوس کیں، وہ یہ تھیں کہ وہ ہر خط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے تھے۔ خط کا جواب نہ دینا بداخلاقی سمجھتے تھے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا جس کے باعث خط لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتا تھا، اس کے باوجود ان کی اردو اور انگریزی تحریر بہت ہی پاکیزہ اور روشن تھی۔ خط پر عام طور سے پتہ انگریزی زبان میں لکھتے تھے جو کہ بہت ہی صاف اور خوش نما ہوتا تھا۔ جب زیادہ علیل ہوتے یا خط لکھنے میں تکلیف ہوتی تو اپنے داماد شاہد حیدری صاحب یا کسی دوسرے شخص کو بٹھا کر خط ڈکٹیٹ کرادیتے اور خط کے اختتام پر اپنے ہاتھ سے دستخط ضرور کردیتے تاکہ مندرجات کی صحت کا مکتوب الیہ کو بھی اطمینان ہوجائے۔ خطوط عام طور پر مختصر ہوتے۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم۔ ثقیل الفاظ اور عربی تراکیب سے پرہیز کرتے تھے۔ ایک خاص بات یہ بھی دیکھی کہ ہر خط کے آخر میں یہ ضرور لکھتے۔ ''مومنین کرام کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔'' یہ کوئی رسمی جملہ نہیں ہوتا بلکہ وہ حقیقتاً مومنین کی سلامتی کے خواہاں تھے جس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں اس طرح کرتے تھے۔

نئی نسل کی مذہب سے لاعلمی اور بے گانگی۔ مادیت کے بڑھتے ہوئے رجحان اور خوارج کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے باعث تعلیماتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے فروغ کے لیے انھوں نے حیدرآباد دکن ''ادارۂ اعلانِ حق'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس ادارے کے ذریعے وہ ''امامیہ مشن'' کی طرز پر مذہبی لٹریچر شائع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے چند کتابچے شائع کروا کر لوگوں میں تقسیم بھی کروائے تھے۔ ایک عظیم پروگرام ان کے ذہن میں تھا مگر اپنی پیرانہ سالی، مالی پریشانیوں اور عوام کی عدم توجہی کے باعث ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ان کی تصانیف تقریباً تیس تھیں جس میں سے بہت سی ان کے پاس خود بھی موجود نہیں تھیں، کیونکہ بہت سی انقلاب آگرہ کی وجہ سے تلف ہوگئیں۔ (انقلاب آگرہ نجم آفندی کی زبان میں لکھا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ جب انھوں نے آگرہ کی سکونت ترک کرکے حیدرآباد میں رہائش اختیار کی تو ان کی جو کتابیں اور دیگر علمی سرمایہ آگرہ میں موجود تھا اس میں سے بہت سا ضائع ہوگیا۔) جو کتابیں ان کے پاس رہ گئیں، ان میں سے اکثر ان کے ارادت مندوں اور

شاگردوں کی نذر ہوگئیں، جو اکثر ان سے مانگ کر لے جاتے تھے اور بہت کم واپس کرتے تھے۔ ان کا مرثیہ ''معراجِ فکر'' رضا کار بک ڈپو نے لاہور سے 1959ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے انھیں ''معراجِ فکر'' کے متعلق جب ڈھاکے سے لکھا تو انھوں نے مجھے تحریر کیا کہ ''معراج فکر'' ان کے پاس نہیں ہے اور میں اُسے ان کو فراہم کروں۔ چنانچہ میں نے لاہور سے ''معراجِ فکر'' منگوا کر انھیں حیدرآباد دکن بھیجی۔ اس کی کتابت وطباعت ملاحظہ فرمانے کے بعد بذریعہ رجسٹری پھر انھوں نے مجھے ڈھاکہ واپس کی اور اپنے دستخط فرما کر اس پر لکھا

''سید شمشاد حسین صاحب رضوی کے لیے بطور یادگار''

جو میرے پاس اب بھی ان کی بہترین یادگار ہے۔

اس سلسلے میں تجمّم آفندی کے ایک خط کا اقتباس بھی باعثِ دلچسپی ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔

''حسین اور ہندوستان کی پہلی اشاعت کو کم وبیش پچاس[1] سال ہوگئے۔ میری عمر اس وقت 75 پچھتر سال کی ہے۔ 1310ھ میں پیدا ہوا تھا۔ شاعری کی عمر بلا مبالغہ 64 سال کی ہے۔ میرے بہت سے مضامین، نظمیں، غزلیں آگرہ میں نذرِ انقلاب ہوگئیں۔''

لاہور میں جب ''الصباح'' ''کسان'' روزنامے نکل رہے تھے۔ ''زمیندار'' اور ''سیاست'' کا زور تھا۔ ''مخزن'' لاہور۔ ''زمانہ''، کانپور۔ ''نئی روشنی''، الہ آباد۔ ''عالم گیر'' اور ''شہکار''، لاہور کا زور تھا۔ ان سب میں میرا نظم ونثر کلام طبع ہو چکا ہے۔ یہ سب کلام، ان اخبارات کے کتنگ غارت ہوگئے۔ ''شاعر اہلِ بیت جیل میں'' یہ کتاب فہرست میں لکھنی بھول گیا تھا۔ مئی 1939ء جیل کا زمانہ ہے۔ کتاب کا سنِ طباعت یاد نہیں رہا۔

(۱) مجھے[2] اس کا علم نہیں کہ کب اور کن حالات میں (ہمارے آبا واجداد) ہندوستان آئے تھے۔ ہم لوگ تُرک ہیں۔ تلوار رکھ کر قلم ہاتھ میں لی اور ادب

---

[1] یہ خط راقم الحروف کو تجمّم آفندی نے 11 فروری 1963ء کو لکھا تھا۔ لہٰذا آج تک کے درمیانی عرصے کو ملحوظ رکھئے۔ (ش م ر)

[2] میرے چند سوالات کے جوابات بالترتیب اس خط میں دیے تھے۔

اردو سے تعلق مرزا فتیح اعلیٰ اللہ مقامہ کے زمانے سے ہے۔

(۲) عمر بھر مدح اہلؑ بیت کی۔ مشاعرے کم پڑھے اور غزل پر کم توجہ رہی۔ پھر بھی بہت سا کلام ضائع ہونے کے باوجود دو سو غزلیں اس وقت موجود ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے کانگریسی ہوں۔ ملازمت ذریعہ معاش رہا۔ میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوگی۔ مگر کم از کم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی نظر سے گزری ہیں۔ اردو میں ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا ہے جو غائب کر دیا گیا۔ اردو فارسی گھر ہی پر پڑھی۔ عربی نہ پڑھ سکا۔

(۳) غیر مطبوعہ کلام بہت ہے۔ غزل، نظم، قطعات، رباعیات، مرثیہ، سلام۔ قصائد وغیرہ

(۴) مرثیہ ختم ہوتا نظر آرہا ہے۔ ''معراج فکر'' کے انداز پر اگر شعرا مرثیہ کہیں اور اس سے بھی کچھ آگے بڑھ کر کوئی جدت طرازی کریں تو شاید پبلک دلچسپی لے سکے۔

میرے واقعات بہت ہیں۔ حکومتِ انگلشیہ کی مخالفت کے قصے۔ قومی معاملات کے قضیے، مشاعروں کے افسانے۔ مگر لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ میرا ہاتھ تحریر میں بے حد کانپتا ہے۔ آپ کا خط مجھے بہت[1] پسند ہے۔ میرا خط بھی اچھا تھا اور اب ملاحظہ فرما لیجئے کیا حیثیت رہ گئی ہے۔ شاگرد ہندوستان پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں جو حیدرآباد میں ہیں وہ سب عدیم الفرصت ہیں صرف مشورۂ سخن[2] کی حد تک انھیں فرصت ہے۔''

محترمی سلام مسنون

آپ میرے لیے کس قدر جستجو اور محنت کر رہے ہیں مجھے ندامت ہوتی ہے۔

---

1. ازراہ نوازش میری ہمت افزائی فرمائی۔ مرحوم کا خط ہاتھوں میں رعشہ اور ضعیفی کے باوجود بہت ہی پاکیزہ اور روشن تھا۔
2. حلقۂ تلمیذ میں بہت سے مطلب پرست داخل ہو گئے تھے جس کا نجم آفندی مرحوم کو خود بھی احساس تھا (ش م ر)

کانپتے ہاتھوں سے جو کچھ ممکن ہو سکا ہے، لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ خداوندِ عالم آپ کی سعی کامیاب کرے۔

جوشؔ میرے اس زمانے کے دوست ہیں جب وہ اور میں دونوں گم نام تھے۔ جوشؔ کی کفریات کے باوجود مجھے اس شخص سے بہت محبت ہے۔ افسوس ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ اگر اب کبھی ملاقات ہوئی تو میری داڑھی دیکھ کر خدا جانے کیا کیا صلواتیں سنائے گا۔

پُرسانِ حال حضرات سے سلام کہہ دیجئے۔

نیازکیش نجم آفندی $\frac{۲}{۶۵}$ ۱۱

عزیز مکرم سلام مسنون

خدا سے دعا ہے کہ آپ ہمہ وجوہ بخیریت ہوں۔ 12 رجنوری کو میں نے بذریعہ رجسٹری ''معراجِ فکر'' واپس کیا ہے اور کچھ کاغذات اس کے ساتھ بھیجے ہیں۔ اب تک آپ نے رسید سے مطلع نہیں فرمایا جس کی وجہ سے پریشانی ہے۔ عنقریب آپ کے خط کا جواب بھی روانہ کروں گا۔ طولِ عمر، مسلسل علالت اور مختلف حالات وواقعات ضروری کاموں میں بھی ہارج ہوتے ہیں۔

جملہ مومنین کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے۔

نیازکیش نجم آفندی $\frac{۱}{۶۵}$ ۲۶

عزیز مکرم سلام مسنون

آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ لکھنؤ جانے والا ہوں۔ اگر آپ واپس آ گئے ہوں تو مطلع فرمایئے آپ کی فرمائش کے سلسلے میں کچھ روانہ کرنا ہے۔ امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازکیش نجم آفندی $\frac{۱۱}{۶۴}$ ۲۶

مکرمی زاداللہ شرفکم سلام ونیاز

مشرقی پاکستان میں شدید بارش کی اطلاع سے پریشانی ہے۔ براہ کرم اپنی خیریت سے مطلع فرمایئے۔ سب کو علیٰ قدرومراتب سلام دعا۔

جواب کے لیے چشم براہ ہوں۔

نیازکیش حجم آفندی ۱۰ ۷/۶۵

مکرمی زاداللہ شرفکم سلام مسنون

ڈھاکہ میں طوفانی بارش کی خبر اخبارات کے ذریعے معلوم ہوکر پریشانی ہے۔ براہ کرم فوری اپنی سب کی خیریت سے مطلع فرماکر شکریہ کا موقع عنایت کریں۔

میری صحت آج کل بہت خراب ہے۔ بمشکل یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ جواب آنے پر آپ کی فرمائش ارسال خدمت کروں گا جو قریب قریب تیار ہے۔

سب کو علیٰ قدرمراتب دعا سلام

نیازکیش حجم آفندی ۱۷ ۸/۶۹

عزیز مکرم سلام مسنون

بمبئی سے واپس آکر آپ کا مرسلہ مرثیہ ''معراجِ فکر'' اور خط ملا۔ رسید سے آپ کے اطمینان کی غرض سے مطلع کررہا ہوں۔

بمبئی میں بہت عدیم الفرصتی رہی۔ صحت اچھی نہیں۔ تکان بے حد ہے۔ انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں تعمیل ارشاد کرکے مرثیہ واپس کروں گا اور کچھ ضروری مطلوبہ کاغذات بھی۔

نیازکیش حجم آفندی ۵ ۱۰/۶۵

مکرمی سلام مسنون

سیلاب کی خبر نے بہت پریشان کردیا۔ خدا کرے آپ سب حضرات بہ تصدق

اہل بیت علیہم السلام بہمہ وجوہ بخیریت ہوں۔ براہِ کرم اپنی اور جملہ مومنین کی خیریت سے اطلاع دے کر ممنون فرمایئے اور سب کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجئے۔

بچوں کو دعا۔ بچوں کا آداب قبول ہو۔

نیازکیش نجم آفندی

پتہ نجم آفندی ۵۔۵۔۱۶ فرحت نگر۔ حیدرآباد اے پی (انڈیا)

عزیز مکرم سلام مسنون

آپ سے بڑی ندامت ہے۔ یہ پورا[1] مہینہ یادگار صادق آل محمد علیہ السلام کے سہ روزہ اجلاسوں کے انتظامات میں گزرا جو بڑی شان وشوکت اور کامیابی کے ساتھ یہاں منائے گئے۔ اس مصروفیت کے بعد اب بہت زیادہ تکان محسوس کررہا تھا کہ نزلہ، شدید کھانسی اور بخار نے یورش کردی۔ انشاء اللہ آپ کے ارشاد کی تکمیل حالت ذرا اصلاح پذیر ہوتے ہی کروں گا۔

تحریر میں ہاتھ بہت کانپتا ہے۔ اس وقت کوئی لکھنے والا بھی موجود نہیں۔ مختصر نویسی کو معاف کیجئے۔ آپ جو میرے مسئلہ میں دلچسپی لے رہے ہیں اس کا بے حد شکر گزار ہوں جملہ حضرات مومنین سے میرا سلام عرض کردیجئے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ بہمہ وجود بخیریت رہیں۔

نیازکیش نجم آفندی

نجم آفندی ۳۵۸۔۲۔۲۲ اندرون دبیر پورہ۔ حیدرآباد۔ اے پی (ہندوستان)

مکرمی زاداللہ شرفکم سلام مسنون

نوازش نامہ صدار ہوا۔ یادآوری اور توجہات کا ممنون ہوں۔ آپ میرا کلام[1] جس

---

[1] اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر یہ خط مجھے 11 راگست 1964ء کو ڈھاکہ میں موصول ہوا لہٰذا اغلب یہ ہے کہ اگست 64ء کے پہلے ہفتے میں یہ خط لکھا گیا۔ (ش ح ر)

طرح مناسب سمجھیں کتابی صورت میں شائع کر سکتے ہیں۔ میری طرف سے بالکل اجازت ہے۔ ضعیفی اور مسلسل علالت کے باعث تحریر میں ہاتھ کانپتا ہے۔ خط کسی نہ کسی سے لکھوانا پڑتا ہے اسی وجہ سے جواب میں کچھ تاخیر ہوگئی۔

نیازکیش نجم آفندی ۸۱ $\frac{۴}{۶۴}$

نجم آفندی اندرون دبیر پورہ۔ حیدرآباد (اے پی)

محترمی زادالله شرفکم سلام مسنون

خدا سے دعا ہے کہ آپ بہمہ وجوہ بخیر ہوں۔ آپ کے سوالات کا جواب 25/ اگست کو ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ رسید کا خط ابھی نہیں ملا۔ اس وجہ سے تردّد ہے۔ جملہ حضرات مومنین کی خدمت میں سلام ونیاز

نیازکیش نجم آفندی

نجم آفندی ۵۳۸۔۲۰۔۲۲ اندرون دبیر پورہ حیدرآباد (اے پی[۲])

مکرمی زادالله شرفکم سلام مسنون

سالہا[۳] سال کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ بہرحال آپ کی خیریت معلوم ہوکر خوشی ہوئی۔ اس وقت مسلسل علالت اور ضعیفی کے باعث گزشتہ زمانے سے کہیں زیادہ انحطاط کا شکار ہوں اس کے باوجود آپ کے ارشاد کی تعمیل ضرور ہوگی۔ اطمینان رکھیے۔

مضطر حیدری بے چارہ ایک عرصۂ دراز سے اس فکر میں ہے۔ میرے تلامذہ میں اس کے سوا کسی نے ادھر توجہ نہیں کی۔ اُسے میری دعا لکھ دیجئے۔ میں بھی خط

---

۱ مجھے اپنی کوتاہیوں معروفیات کے باعث اس وقت موقعہ نہ مل سکا کہ ان کے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں کچھ کرسکتا جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔ (ش ح ر)

۲ آندھراپردیش (بھارت)

۳ میری کوتاہی کی جائز مگر پُرخلوص شکایت ہے۔ (ش ح ر)

لکھوں گا۔

میرے شاگرد یہاں اپنے ہم مشرب بہت ہیں مگر اپنی ضرورت پر تشریف لاتے ہیں۔ خاورؔ غریب بیکار ہوگیا۔ بڑے کام کا آدمی تھا۔ اب مجبور ہے۔

کیا اتفاق ہے دو چار دن ہوئے آپ کا خیال آیا تھا۔ کل آپ کا خط آگیا۔ کسی فارسی کے شاعر نے خوب کہا ہے۔

دل ور بہ دل است دریں کینہ سپہر

آپ نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔ پُرانا پتہ بڑی تلاش کے بعد ملا۔ اُسی پتے پر جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا دوسرا خط آنے پر سلسلہ جاری ہوگا۔

یہ بھی اتفاق ہے پرسوں سے سوانح حیات جمع کر رہا ہوں۔ پھر خبط ہُوا ہے۔ واقعات بہت ہیں۔ وقت زیادہ صرف ہوگا۔ خدا کرے تکملہ ہو جائے۔

تحریر میں ہاتھ بہت کانپتا ہے۔ پُرسانِ حال کو سلام۔ آپ کے بچوں کو دعائیں۔

اب میرا پتہ یہ ہے۔

نجم آفندی۔ کمان ایلچی بیگ۔ منڈی میر عالم۔ حیدرآباد۔ (اے۔ پی)

نجم آفندی

۹ ۷/۶۹

○

جناب سید ہاشم رضا

نجم آفندی اور پاکستان

حضرت نجم آفندی کی موت کا ماتم ہمارے لیے تعلیم روحانی ہے۔ میں طالب علمی کے دَور میں اُن کے اشعار کا لطف اٹھایا کرتا تھا، لیکن ان کی ملاقات کا شرف مجھے پانچ سال ہوئے پاکستان میں حاصل ہوا، جب وہ آگرہ سے کراچی منتقل ہوکر آ گئے۔ ایک دن انھوں نے کرم فرمایا اور میرے دفتر میں تشریف لائے، چونکہ وہ ہندوستان سے عارضی پرمٹ پر آئے تھے جس کی مدت ختم ہورہی تھی، لہٰذا انھیں نوٹس ملا تھا کہ وہ ہندوستان واپس جائیں۔

انھوں نے میری وساطت سے ایک درخواست وزارت داخلہ کو دی جس میں یہ لکھا تھا کہ میں ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتا۔ اسی درخواست کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجھے اپنی زندگی کے واقعات اپنے دست مبارک سے لکھ کر دیے۔ میں نے ان کی درخواست کو سکریٹری وزارت داخلہ کو بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا نوٹ یہ لکھا کہ ''جناب نجم آفندی پاکستان میں پھلنے پھولنے کے لیے نہیں، بلکہ مرنے کے لیے آئے ہیں۔''

میں نے اپنے نوٹ میں ایک انگریزی اسٹینلے ایونس کا قول نقل کیا کہ:

''تمھارا وطن وہ جگہ نہیں ہے جہاں تم رہنا چاہتے ہو بلکہ وہ جگہ ہے جہاں تم مرنا چاہتے ہو۔''

اور میں نے لکھا کہ ''لاکھوں ہندوستانی مہاجروں کی طرح جو اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان آئے ہیں، جناب نجم آفندی کو بھی مرنے کی سہولت مہیا کی جائے۔''

۱۲/نومبر ۱۹۷۳ء کو مرحوم نے مجھے اپنی زندگی کے حالات لکھ کر دیے جن کا اقتباس یہ ہے:

''میرا نام تجمل حسین، تخلص نجم اور آفندی وہ خطاب ہے جو سلطنت ترکی کی طرف سے میرے پردادا جعفر علی فتیح کو ان کی خدمات کی بنا پر دیا گیا تھا جو انھوں نے مکہ معظمہ میں انجام دی تھیں، ان کا بہت مذہبی کلام آج تک پڑھا جاتا ہے۔ یہ خطاب نسلاً بعد نسلٍ استعمال کے لیے دیا گیا تھا۔ میرے نانا مرزا آغا حسین آغا بھی اپنے دور کے مشہور شعراء میں تھے جن کے دو شعر آج تک مشہور ہیں۔

۱۔ کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

۲۔ دیکھیں تو کس طرح انھیں ہوتا نہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

مرزا فتیح مرحوم کا ایک شعر سن لیجیے۔

فتیح اگلے برس ہم تھے پیمبرؐ کے مدینے میں
کبھی روضے میں زائر تھے کبھی بیت الحزن میں تھے

انھوں نے مکے ہی میں انتقال کیا، لکھنؤ کی ملتی ہوئی وزارت جو حسب وعدہ امجد علی شاہ دے رہے تھے، چھوڑ کر مکے چلے گئے اور وہاں ایک مکان بنوا کر زائرین حج کے قیام کے لیے وقف کر دیا جو بعد میں شہر کی توسیع کے پلان میں شامل ہو گیا۔ نواب عنایت جنگ نے وہ مکان دیکھا تھا۔

بہر حال ان بزرگوں کے حالات کہاں تک لکھوں گا بہت کثرت سے ہیں۔

میں رمضان ۱۳۱۰ھ میں آگرہ میں پیدا ہوا، مفید عام اسکول میں تعلیم پائی اور مفید عام اسکول ہی میں انگریزوں کے خلاف ایک انجمن بنائی جو قائم نہ رہ سکی۔

اس وقت ۸۳ سال کی عمر ہے۔ میں نے ہزاروں غزلیں، نظمیں اور سلام کہے ہیں۔ میرا آدھے سے زیادہ کلام ضائع ہو گیا۔

میں نے اپنی جوبلی کے متعلق ہندوستان اور پاکستان کی دو تحریکوں کی مخالفت کی، بمبئی کے

حضرات ہزار ہا روپیہ کی تھیلی دے رہے تھے، پچاسی ہزار تک نوبت آ گئی تھی مگر میں نے منظور نہیں کیا۔

میرے شاگردوں کی تعداد ۵۵ تک پہنچی (جن میں رعنا اکبر آبادی بھی شامل ہیں۔) اور تصنیفات ۲۶۔۲۷ تک شائع ہو چکی ہیں۔ معظم جاہ بھی میرے شاگرد ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی۔ سب کا کلام میں نے پوری توجہ سے دیکھا ہے۔

نثر اور نظم دونوں اصناف میں میرا کلام مطبوعہ موجود ہے۔ صرف غزلوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا، میں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ میری غزلیں بھی پرانے مذاق کی نہیں ہیں، جن مشاعروں میں بھی ہندوستان اور پاکستان میں پڑھی گئی ہیں، غیر معمولی کامیابی ہوئی۔

لاہور اور کراچی میں بھی میری تصنیفات ایک زمانے سے شائع ہو رہی ہیں۔ میں نے کبھی حکومت کی ملازمت نہیں کی، یہی تصنیف و تالیف ذریعہ حیات رہا۔

طول ہو جانے کے خیال سے اختصار کر رہا ہوں ورنہ لکھنے کے لیے بہت سے واقعات ہیں۔ مجھے پاکستان سے جو دلچسپی ہے، اس لحاظ سے میں اب یہیں رہنا چاہتا ہوں۔

فیض آباد میں جو تیرہ رجب کی مقاصدے کی محفلیں پڑھی ہیں، اس کی ایک محفل میں مولانا صفی لکھنوی نے فرمایا تھا کہ:

''نجم صاحب ہم نے ۲۲ برس اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔''

یہ کہہ کے چلے گئے اور محفل نہیں پڑھی اور نہ آئندہ آئے۔

راجہ صاحب محمود آباد مرحوم سے میری بہت زیادہ راہ و رسم تھی۔ آغا پویا مرحوم سے میرے بہت اچھے راہ و رسم تھے۔ واقعات سیکڑوں ہیں کہاں تک لکھ سکتا ہوں۔ کتنے رسائل میں میرا کلام شائع ہوا ہے، کوئی انتہا نہیں ہے۔ اب میں پاکستان ہی میں بقایا زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

جناب نجم آفندی اپنے دور کے بہترین شعرا میں شمار ہوں گے اور ان کے نوحوں، سلام اور مرثیوں کی وجہ سے مرحوم کو ہمارے عظیم مرثیہ گویوں کی صف اول میں جگہ ملے گی۔

''ان کے دور میں ان سے بہتر کسی نے نوحے اور سلام نہیں کہے۔''

زبان پر ان کو قدرت کاملہ تھی۔ وہ اپنے دور کے تقاضوں سے بہت اچھی طرح آگاہ تھے اور اسی لیے ان کے سلام اور مرثیے نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول رہے۔ ان کا طرز ایسا منفرد تھا کہ اگر ان کے سلام اور مرثیوں میں ان کا نام نہ لکھا جائے تو اہل بینش سمجھ جائیں گے کہ یہ انھیں کا کلام ہے۔

جس زمانے میں کہ امریکہ اور روس میں چاند پر جانے کے لیے خلائی دوڑ ہو رہی تھی اور ابھی امریکہ کے ہوا باز چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے، اس زمانے میں جناب نجم آفندی کے دماغ کی قوت پرواز اس طرح صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوئی۔

اہل زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر　　ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر　　مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

میرا عقیدہ ہے کہ خدمت سید الشہدا میں حاضر ہونے سے پہلے عالم بالا میں میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ اور مرزا دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ نے ان کا خیر مقدم کیا ہوگا اور کیا عجب ہے کہ میری طرح انھوں نے بھی مرحوم کے تین بندوں کے لیے یہ کہا ہو کہ ایسے بند نجم آفندی کے علاوہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

۱۔　جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو　　جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو　　جو سو گیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

۲۔　کچھ حُسن کی نمود تھی کچھ عشق کا مزاج　　آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادتِ عظمیٰ کا سر پہ تاج　　ملتا ہے آنسوؤں کا جسے آج تک خراج
مٹھی میں تھا لیے ہوئے موت اور حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

۳۔ کیا ربط آج موت کو ہے زندگی کے ساتھ کتنے ادا شناس ہیں سبطِ نبیؐ کے ساتھ
پھر یہ ہجومِ شوق نہ ہوگا کسی کے ساتھ مرنے کو یوں نہ جائیں گے انساں خوشی کے ساتھ

سُن کر سفیرِ مرگ کے قدموں کی آہٹیں
ہونٹوں پہ جمع ہوگی نہ پھر مسکراہٹیں

○

علامہ سید ضمیر اختر نقوی

نجم آفندی پاکستان میں

(یہ اقتباس علامہ سید ضمیر نقوی کے عمدہ مضمون ''علامہ نجم آفندی حیات اور شاعری''
جو مجلہ انجم مطبوعہ ۱۹۶۶ء کراچی میں شائع ہوا سے اخذ کیا گیا)

نجم صاحب نے غیر منقسم ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کا سفر کیا تھا۔ کشمیر سے کولمبو تک ہندوستان کے ظاہر و باطن سے خوب واقف تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نجم صاحب ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے۔ معز الدین قادری نے تحریر کیا ہے۔

''کانگریسی حضرات کا اگر کوئی گروپ بن سکتا ہے تو اس فہرست میں نجم کا نام شامل کیا جائے گا۔ گاندھی جی سے کئی بار مل چکے ہیں اور ان کے قدردان بھی ہیں۔''

وہ کون سے حالات تھے جس کے تحت نجم صاحب ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آئے، اب تک معلوم نہیں ہو سکے۔ کراچی وہ پہلی بار آئے تھے۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں علامہ نجم آفندی نے پاکستان کا سفر فرمایا۔ بمبئی سے بحری جہاز سے سوار ہوئے تو کراچی کی بندرگاہ پر اُترے۔

نجم آفندی کا نام میں نے بچپن میں سنا تھا۔ ان کے نوحے سنتے سنتے مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ بعض شاعروں کے کلام میں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو مجبور کر دیتا ہے کہ شاعر سے محبت ہو جائے۔ میں نے نجم صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے کلام سے اور ان کی شخصیت سے ایک طرح کا لگاؤ تھا۔ مئی ۱۹۷۱ء میں پہلی مرتبہ میں نے انہیں دیکھا۔ ''عزاخانہ زہراؑ'' میں میلاد سرور کائناتؐ کے موقع پر اچانک علامہ رشید ترابی مرحوم نے اعلان کیا کہ

''برصغیر کے نامور شاعر حضرت نجم آفندی ہندوستان سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ اپنا کلام پیش کریں گے۔''

نجم صاحب نے ایک نعت سنائی۔ رشید ترابی صاحب نے بعد میں نجم صاحب کا شکریہ یہ کہہ کر ادا کیا۔ ''بڑا کرم کیا۔'' کراچی میں چند مہینے قیام کر کے نجم صاحب لاہور چلے گئے۔ ان کی ایک مختصر سی ڈائری سے قیام کراچی کے سلسلے میں چند باتیں معلوم ہوسکیں ہیں۔ یہاں ڈائری کے چند اوراق ملاحظہ کیجئے۔

یکشنبہ ۲۷/جون ۱۹۷۱ء مطابق ۳/جمادی الاول

بزم آرزو کے مشاعرہ میں میری غزل سب سے زیادہ کامیاب رہی۔ جوش نے خلاف اصول و معمول غزل پڑھی، صدرِ مشاعرہ آلِ رضا نے غزل نہیں پڑھی۔ خلیق کے والد مرحوم کا نام، تخلص اور زندگی کا حال معلوم کرنا ہے۔

دوشنبہ ۲۸/جون ۱۹۷۱ء مطابق ۴/جمادی الاول

(۱) کچھ دنوں میں گفتگو کا راز بھی کھل جائے گا
رفتہ رفتہ ان کی وجہ خامشی سمجھے تھے ہم

(۲) مخمور اکبرآبادی مصنف ''روحِ نظیر'' اور اصالت خاں سے ملنا ہے۔

(۳) علامہ رشید ترابی کی عیادت کو گیا، وہ مل نہ سکے۔ کہلا بھیجا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہوسکی۔ رقم کل حیدرآباد پہنچ جائے گی۔ بیدار[1] میرے ساتھ تھے شمیم کو خط لکھا۔

سہ شنبہ ۲۹/جون ۱۹۷۱ء مطابق ۵/جمادی الاول۔

سروجنی نائیڈو کا ذکر سوانح حیات میں آنا ہے۔

شمیم کا خط آیا۔ اپنے نئے مکان کے پتے سے اطلاع دی۔

---

[1] بیدار رجنی، نجم آفندی کے شاگرد ہیں۔

حسین اعظمی آئے اور بہت دیر بیٹھے۔ کچھ کتابوں کی طباعت کے بارے میں گفتگو رہی۔
صاحب عالم کے دوست کی بنا کر وہ مجلس کے لیے ان لوگوں کے ساتھ ہادی حسین صاحب کے یہاں گیا۔ وہ نہیں ملے لہٰذا مجلس کے لیے ذاکری کا مسئلہ مولانا جوہر صاحب سے طے کرادیا۔

———

چہارشنبہ ۳۰ر جون ۱۹۷۱ء مطابق ۶ر جمادی الاول

حفیظ جالندھری اور سیزدہ صدسالہ یادگار۔

پرنس سے ملاقات دہلی اور حیدرآباد۔

حسین اعظمی اور بیدار ۸ بجے کے قریب آئے اور دس بجے شب تک بیٹھے۔

———

آموں کے لیے ڈیڑھ روپیہ صاحب عالم کو دیئے۔

خلیق[1] کے والد کا نام اور تخلص ضاحک تھا۔ درباری تھے

———

پنجشنبہ یکم جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۷ر جمادی الاول

عشق کی منزل میں یہ حسنِ سماعت دیکھنا
قہقہہ ان کا فرشتوں کی ہنسی سمجھے تھے ہم

زیبا مرحوم کے صاحبزادے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے دوست طاہر اور ریاض احمد ساتھ تھے۔

منوہر لال بہار اور بجرنگ سنگھ فقیر کا ذکر سوانح حیات میں آئے گا۔

جمعہ ۲ر جولائی ۱۹۷۱ء۔ مطابق ۸ر جمادی الاول۔

ناشناسِ حق کے دو لفظوں سے ظاہر ہوگیا
خوب سمجھے تھے جو دینی مفلسی سمجھے تھے ہم

---

[1] میر خلیق کے بارے میں نجم صاحب کو تفصیل بتانے والے نے سب کچھ غلط بتایا ہے۔ ان کا نام میر مستحسن ہے۔ والد کا نام میر حسن ہے۔ ضاحک خلیق کے دادا تھے۔ خلیق درباری نہیں تھے۔

اخضؔر اکبرآبادی
شمیمؔ امروہوی
صمیمؔ بلندشہری
پنڈراول کی مجلسیں

شنبہ۳ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۹ر جمادی الاول۔
زیبا ردولوی کے ایصال ثواب کی مجلس میں گیا، جہاں کے لیے جوہر صاحب سے وعدہ لیا تھا۔ جوہر صاحب نے خوب مجلس پڑھی۔ صاحب عالم ہمراہ تھے۔ زیبا ردولوی کے ایصالِ ثواب کی مجلس میں مقررین نے میرا ذکر بھی کیا۔ رات کو رعنا کے مشاعرے میں میری غزل بہت کامیاب ہوئی۔ وہاں اصالت خاں سے ملاقات ہوئی۔

دوشنبہ۵ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۱۱ر جمادی الاول
علامہ رشید ترابی آئے اور اپنے ساتھ ''عزاخانہ ایرانیان'' میں لے گئے۔ مجلس بہت اچھی ہوئی۔ واپسی میں ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ پھر میرے مکان پر پہنچادیا۔

سہ شنبہ۶ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۱۲ر جمادی الاول
علامہ رشید ترابی نے موٹر بھیج کر بلایا اور مجلس میں ایرانیان کی لے گئے۔ واپسی میں ہوٹل میں کھانا کھلایا اور گھر پہنچادیا۔
یگانہ کی صاحبزادی آئیں اور تقریباً دن بھر قیام کیا۔

چارشنبہ۷ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳ر جمادی الاول
علامہ رشید ترابی اپنے ساتھ مجلس میں ایرانیان لے گئے۔ واپسی میں ہوٹل میں

کھانا کھلایا اور گھر تک پہنچا گئے۔ مجلس خوب ہوئی۔ تینوں مجلسیں خوب پڑھیں۔ مجمع بہت تھا۔

پنجشنبہ ۸ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۱۴ر جمادی الاول

علامہ رشید ترابی نے بلایا اور اپنے ساتھ مجلس میں نور باغ لے گئے۔ غیر معمولی مجمع تھا۔ خوب مجلس ہوئی۔ مجلس کے بعد گھر پہنچا گئے۔

۲۹ر ستمبر ہفتہ تاریخ مشاعرہ ۳۱۴/۱۹ء، اقبال سوسائٹی

طرح: ع۔ وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں۔

اس کے آگے ڈائری کے صفحات نہیں لکھے گئے۔ چند صفحات سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ نجم صاحب کراچی آ کر شروع شروع میں کافی مصروف رہے۔ چند مہینوں کے بعد وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ قیام لاہور کے دوران لاہور کے قومی اخبارات میں ''کلیات نجم آفندی'' کا اشتہار شائع ہوا۔ ہفتہ وار ''رضا کار'' اشاعت ۸ر مئی ۷۳ء میں بھی اشتہار شائع ہوا

مہینوں یہ اشتہار چھپتا رہا۔ دھیرے دھیرے یہ اعلان غائب ہوگیا۔ اور لوگ بھول گئے کہ کلیات چھپنے کا پروگرام بھی تھا یا نہیں۔ ابھی حال میں لاہور سے مسعود رضا خاکی صاحب تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اس کلیات کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس لیے مزید اس موضوع پر میں لکھنا نہیں چاہتا۔

نجم صاحب اپریل میں کراچی آئے تھے۔ مئی کے مہینے میں وہ چند دنوں کے لیے لاہور گئے تھے۔ لاہور کا یہ پہلا دورہ تھا۔ لاہور میں بھی نجم صاحب محفلوں میں اور مسالموں میں شرکت کرتے رہے۔ اسی دوران ہفت روزہ ''اسد'' لاہور نے ۱۸ تا ۲۶ مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی تھی۔

علاّمہ نجم آفندی کے اعزاز میں عصرانہ

لاہور۔۵رمئی۔آج یہاں سید اختر حسین شائق انبالوی جنرل سیکریٹری آل پاکستان شیعہ کانفرنس نے برصغیر ہندوپاک کے ممتاز اور عظیم شیعہ شاعر علامہ نجم آفندی کے اعزاز میں ایک شاندار دعوتِ عصرانہ ترتیب دی۔شائق انبالوی نے علامہ نجم آفندی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ''حضرت نجم آفندی کی پوری زندگی مدح اہل بیتؑ اور نشر حسینیت میں گزری ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کا محور صرف محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح ہی کو قرار دیا ہے۔'' اس کے بعد حضرت شاہد حیدری، وحید الحسن ہاشمی ایم، اے اور علامہ نجم آفندی نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ اس دعوتِ عصرانہ میں خطیب آل محمدؐ مولانا سید اظہر حسن زیدی صدر مرکزی ادارہ تحفظ حقوق شیعہ، سید ہادی علی شاہ بخاری نائب صدر آل پاکستان شیعہ کانفرنس، جناب مظفر علی شمسی جنرل سیکریٹری مرکزی ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، سید منظور حسین بخاری ایڈوکیٹ۔ ملک یوسف حسین رئیس ساندہ کلاں، مولانا ملک مہدی حسن علوی ناظم اعلیٰ شیعہ جمعیت العلماء پاکستان، سید غلام عباس شاہ رئیس ٹھٹھی بالا رابہ، چوہدری رشید احمد اشغب ایڈوکیٹ، خان غلام شبیر خاں سیکریٹری دارالعلوم محمدیہ، سرگودھا، مولانا سید ظہور الحسن شاہ جھنگ، جعفر علی میر ایڈیٹر شہید، مولانا عبدالغفور جعفری، ملک سجاد حسین رئیس ساندہ کلاں، سید شفقت علی شاہ، مولانا ملک ظفر عباس، مولوی نذر عباس اصغر، ڈاکٹر سید مقصود حسین کاظمی، سید ناصر عباس کاظمی، سید شمیم عباس کاظمی، سید غلام بخاری وقاری، سید اظہر علی بخاری، مولانا محمد ریاض اسد، سید محمد رضا کاظمی و سید اقبال حسین شاہ، رام گڑھ، ڈاکٹر سید محمد عالم زیدی، سید جعفر حسین آغا عبدالعزیز قزلباش شریک تھے۔

''کاروں والے شہر کراچی کے ۲۰، ۲۵ آدمیوں نے نجم صاحب کے جنازے میں شرکت کی۔'' بے کاروں والے شہر لاہور کے کتنے لوگوں نے نجم صاحب کے لیے تعزیتی اجلاس کیے؟ کتنے رئیسوں نے نجم صاحب کے ایصالِ ثواب کی مجلس کروائی؟ کتنے اخباروں کے اور رسالوں کے مدیران ''نجم نمبر'' شائع کر چکے؟ کتنے علماء نے نجم صاحب کے لیے مجلسیں پڑھیں اور مضامین

لکھے؟

اس خبر میں کتنے کتنے بڑے بڑے نام ہیں۔ ان سب نے اب تک نجم صاحب کے لیے کیا کیا؟ صرف نجم صاحب کے ساتھ دعوت کھانے اور اخبار میں نام چھپوانے کی حد تک یہ حضرات کیوں محدود ہیں۔ وحیدالحسن ہاشمی صاحب کو کراچی والوں سے بڑا گلہ ہے۔ ارے جناب! اگر نجم صاحب لاہور میں انتقال کرتے تو وہاں بھی جنازے میں اتنے ہی آدمی شرکت کرتے جتنے کراچی کے لوگوں نے جنازے میں شرکت کی تھی۔نجم صاحب پاکستان کے کسی شہر میں بھی مرتے، ہر جگہ کا منظر یہی ہوتا جو کراچی کا تھا۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے۔نجم صاحب ہندوستانی تھے .....خالص ہندوستانی! پاکستان کی حکومت نے ان کو نیشنلٹی نہیں دی۔ وہ ہندوستانی تھے۔اس لیے اخبارات نے ان کی خبر وفات چھاپنے سے انکار کردیا۔لیکن وہ لوگ جنہوں نے نجم صاحب سے اس ضعیفی کے عالم میں بھی تین تین گھنٹے کی محفلوں کی صدارت کروائی اور زیادہ تر حضرات کسی بہت بڑے ٹرسٹ یا ادارے کے ذمہ داران ہیں۔قوم کے نام نہاد لیڈروں نے نجم صاحب کی زندگی میں انہیں جو زحمتیں دی تھیں، اس کے صلے میں ان کے مرنے کے بعد ایصال ثواب کی مجلس منعقد کروادیتے تو کیا تھا؟ (شرم! شرم) اس بےتوجہی میں کراچی اور لاہور ہر جگہ کے قومی کارکن شامل ہیں۔

لاہور کے ہفت روزہ اخبارات اور ماہ ناموں نے نجم صاحب کا کلام چھاپا۔ بس! جب کہ ضرورت تھی کہ زیادہ سے زیادہ نجم صاحب پر تحقیقی کام ہوتا۔ ان سے پوچھ پوچھ کر ان کی مکمل سوانح حیات تیار کی جاتی۔ ان کی وفات کے بعد زندگی کے کتنے پہلو تشنہ ہیں۔ اس کا اندازہ لکھنے والوں کو بخوبی ہے۔

نجم صاحب کی شاعری پر کتابیں لکھی جاسکتی تھیں۔لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ نجم صاحب کے پانچ چھ شاگرد لاہور اور کراچی میں موجود ہیں۔ یہ تمام ذمہ داریاں ان کی تھیں۔ ظاہر ہے جب انہوں نے زندگی میں توجہ نہیں کی تو اب کیا امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ نجم صاحب پر کچھ لکھیں گے ـــــ اب تو وہ مر ہی گئے ـــــ اور انہیں لوگوں کے لیے شاید نجم صاحب نے یہ شعر کہا تھا:۔

نجم اربابِ غرض نے دل کے ٹکڑے کر دیئے
زندگی نعمت سہی نعمت سے بھی دل بھر گیا

بہر حال لاہور میں بھی نجم صاحب کو خوشی نہیں ملی۔ وہ پھر کراچی آ گئے۔ لاہور سے آنے کے بعد انہوں نے کراچی کی بہت سی محفلوں میں شرکت کی اور تازہ کلام سنایا۔

رضویہ سوسائٹی کراچی کے امام باڑے میں محفل میلاد بسلسلۂ ولادت امام حسین علیہ السلام ۳ر شعبان ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس محفل میں میری تقریر تھی۔ نجم صاحب نے محفل کے اختتام پر میری تقریر کی بہت تعریف کی اور مجھے اپنے گھر پر بلایا۔ میں کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا ''انجمن یادگار میر انیسؔ'' کے زیر اہتمام ۹ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو ''یوم انیسؔ'' کے لیے میں نے ان سے وعدہ لیا اور نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے بخار کے عالم میں میری فرمائش پوری کی اور صبح نو بجے جلسے میں پہنچ گئے۔ میر انیسؔ پر انہوں نے جو نظم لکھی وہ کتاب ''انیسؔ شاعر انسانیت'' میں شائع ہو چکی ہے۔ جن حضرات کی نظر سے نہیں گزری ان کے لیے یہاں درج کی جاتی ہے۔

انیسؔ غم کدۂ کربلا کے درد شعار — تیرا کلام ہے یا مرثیت کے لیل ونہار
یہ راز تو نے بتایا ہے اہلِ عالم کو — نہ ہو یہ درد جو دل میں تو زندگی بیکار
شعورِ فکر نے غیروں پہ بھی کیا یہ اثر — کہ گوشے گوشے میں انسان ہوگئے بیدار
سنی سنائی نہیں بات آنکھوں دیکھی ہے — کہ ہندوؤں کو بھی دیکھا گیا ہے سینہ فگار
خصوصیات بہت کچھ ترے کلام کی ہیں — ترے کلام سے پیدا ہوئے وہ نقش و نگار
ترے کلام سے اردو زباں کا وزن بڑھا — محاورات کا یک جا لگا دیا انبار

اس سے پہلے ''پیامِ عمل'' کے ''انیسؔ نمبر'' کے لیے کوثر حسین صاحب پانی پتی کی فرمائش پر نجم صاحب نے میر انیسؔ پر چار مصرع اور کہے تھے۔

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقام انیسؔ — یہ فن مرثیہ گوئی میں اہتمام انیسؔ
حسینیت کی جو خدمت انیسؔ نے کی ہے — رہے گا تا بہ قیامت بلند نام انیسؔ

یومِ انیسؔ پر میں نے خصوصی فوٹوگرافر کا انتظام کیا تھا، تا کہ وہ مسلسل نجم صاحب کی تصاویر کھینچتا رہے۔ جلسے کے بعد بھی میں نے نجم صاحب کی مختلف انداز سے تصاویر کھنچوائیں۔ یہ

تصاویر رنگین تھیں جو میرے پاس موجود ہیں۔ باقر زیدی صاحب (کوکب آفندی کے داماد) نے بھی اپنے لیے چند تصاویر کھنچوائی تھیں، جو اس مجلّہ میں شائع کی جارہی ہیں۔ میری کوشش تھی کہ نجم صاحب کے ساتھ، سید آلِ رضا اور نسیم امروہوی کا ایک فوٹو گروپ ہوجائے۔ لیکن نسیم امروہوی تشریف نہیں لائے اور سید آلِ رضا جلدی چلے گئے۔ نجم صاحب جلسے کے آخر تک موجود رہے۔ بہرحال ایک یادگار فوٹو گروپ میں نجم صاحب کے ساتھ جو حضرات موجود ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

آغا سروش لکھنوی مرحوم، سید یوسف حسین (فرزند میر عارف لکھنوی) سید اصغر حسین (فرزند بابو صاحب فائق) نفیس فتحپوری شہر ہوشنگ آبادی، زاہد فتحپوری، شاہد نقوی، عزت لکھنوی، ڈاکٹر انصار حسین، سید کرّار حیدر راہی، مظاہر عباس نقوی، تنویر اختر نقوی، جلیل حسن رضوی حیدرآبادی، اور کہیں پر میں بھی موجود ہوں۔ اس کے علاوہ الگ الگ تصاویر میں سید آل رضا، منور عباس، کوکب شادانی، سید ہاشم رضا، وغیرہ بھی نجم صاحب کے ساتھ ہیں۔

''یومِ انیس'' کے بعد یہ تصاویر میں نے نجم صاحب کو دی تھیں۔ بہت خوش ہوئے۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اپنی تصانیف کی تفصیلات بتاتے رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ ''اب کچھ یاد نہیں رہتا۔'' ہر بات بھول جاتا ہوں۔ آخر میں پنشنلٹی کی بات نکلی تو میں نے انہیں تفصیلات بتائیں کہ مجھے اس سلسلے میں بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں۔ پاسپورٹ کی فائل منگوا کر مجھے دکھائی جس میں سید ہاشم رضا کا سفارشی خط بھی تھا جس میں حکومت پاکستان سے اپیل کی گئی تھی کہ نجم صاحب کو پاکستان کی پنشنلٹی دے دی جائے۔ نجم آفندی کا انتقال ہوگیا۔ حکومت تو انہیں یہاں کی قومیت نہ دے سکی۔ قدرت نے ان کو یہاں کا قومی باشندہ بنادیا۔ کیا خیال ہے حکومت پاکستان کا۔ وہ خط جو نجم صاحب کو حکومت نے لکھا تھا کہ آپ جلد سے جلد پاکستان چھوڑ دیجئے۔

اب حکومت ذرا نجم صاحب کو پاکستان سے نکال کر
دکھائے! وہ تو قیامت تک اسی سرزمین پر قابض رہیں

گئے!

وطن کے عشق میں ڈوبا ہوا آتش بجاں ہوں میں
وطن ہے میرے ہر اک گوشۂ دل میں جہاں ہوں میں
نجم آفندی

وفات

دنیا شاید تاہلِ رشکِ موت اسے سمجھے کہ جنازے میں لاکھوں کا مجمع ہو، اخبارات میں جلوسِ جنازہ کی تصاویر ہوں۔ٹیلیویژن پر پروگرام پیش کیا جائے۔شاندار مقبرہ تعمیر ہو وغیرہ وغیرہ۔

معصومؑ کی نظر میں شاعر کی تاہلِ رشکِ موت یہ ہے کہ:۔

''ہمارا شاعر جب مرجاتا ہے تو جنت میں ملائکہ مقربین اور انبیاء مرسلین اس سے ملاقات کرنے کے لیے آتے ہیں۔''

(ارشاد امام ہشتمؑ)

نجم آفندی ''شاعرِ اہلِ بیت'' تھے۔اور وہ اس خطاب پر فخر کرتے تھے:۔

نجم اپنی زندگی ہے وقف مدحِ اہلبیتؑ
شاعرِ سرکارِ اہلِ بیتؑ کہلاتے ہیں ہم

نجم صاحب نے دولت دنیا کی کبھی پروانہیں کی:۔

نجم شاعر ہے حسینؑ ابن علیؑ کے در کا
اور دنیا میں نہ منصب ہے نہ جاگیر کوئی

نجم صاحب کو یقین ہے کہ ہمارا کلام دربار رسالتؐ میں پہنچ چکا ہے:۔

اے نجم میں شاعر ہوں سرکار امامت کا
نظمیں مری پہنچیں گی دربار پیمبرؐ میں

نجم صاحب خدمتِ محمدؐ وآل محمدؐ کے صلے میں ملنے والے انعام کا مصرف بھی بتا دیتے ہیں۔

صلہ میں خلد وہ دیں گے تو نجم کہہ دیں گے
تمہارے نقش قدم پر نثار کرتے ہیں

محمدؐ و آلِ محمدؐ کے نقشِ قدم پر خلد نثار کرنے کے لیے نجم صاحب نے بمقام کراچی بروز اتوار بتاریخ ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء بوقت ۹/۳۰ بجے صبح سفر آخرت اختیار کیا۔

غسل میت نجم صاحب کے اپنے مکان ہی پر ہوا۔ شام ۴ بجے کے قریب نجم صاحب کی میت امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں لائی گئی جہاں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ۶ بجے کے قریب نئی حسن دربار کے قبرستان، واقع نارتھ ناظم آباد میں دفن کر دیا گیا۔

شعرائے کراچی میں صرف فیضؔ بھرت پوری اور ثمرؔ ہوشنگ آبادی جنازے میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ دور اور قریب کے چند رشتے دار شریک جنازہ تھے۔ شفقؔ اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ میں اتفاق سے جنازے میں شریک ہوا، اس کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ان کا آخری دیدار میں نے کیا۔ تیسرے دن سوئم کی مجلس تھی، مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ مجلس علامہ عباس حیدر عابدی کو پڑھنا تھی، لیکن دیر ہو جانے کے سبب یہ ذمہ داری جاتے جاتے موصوف میرے سپرد کر گئے۔ میں نے نجم صاحب کی خدمات ادب اور مذہب پر تقریر کی اور مصائب میں ''کربل نگری'' ہندی نظم پڑھنے کے بعد سورہ فاتحہ پڑھوادیا۔ چہلم کی مجلس نہیں ہوئی اور اس کی ذمہ داری نجم صاحب کے ورثہ پر ہے۔ اور جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے ان کے ورثہ نہایت غیر ذمہ داری اور نجم صاحب کی عظمتوں کی طرف سے لاپروا اشخاص ہیں۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب ان کے ورثہ کا یہ فرض ہے کہ نجم صاحب کی قبر پر کم از کم ایک پتھر ہی لگوادیں تا کہ نشان قبر تو رہ جائے۔ اس لیے کہ نجم صاحب کی قبر بھی غلط جگہ بنی۔ ایک ایسا قبرستان جہاں نہ مجلس ہو سکتی ہے اور نہ ماتم، کسی ایسے قبرستان میں قبر بنائی جاتی جہاں مومنین جاتے رہتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں، تلاوت کلام پاک کرتے ہیں اور مجالس منعقد ہوتی ہیں، جیسے ''جنت البقیع'' کا قبرستان۔ یہ بھی

اپنے دل کو سمجھانے کے لیے اور آنے والی نسلوں کو نشان قبر بتانے کے لیے، ورنہ نجم صاحب کو یقین تھا کہ مجھے کہیں بھی موت آئے، ہماری خاک کے ذرّے نجف یا کربلا پہنچ جائیں گے:۔

نجم اڑا کر ہماری خاک کے ذرّے ہمیں
یا نجف لے جائیں گے یا کربلا لے جائیں گے

نجم صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا:۔

شاعر ہوں جن کا نجم وہ ہیں وجہ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

○

جناب کسرؔی منہاس

شاعرِ اہلبیتؑ حضرت نجمؔ آفندی

نام مرزا تجمل حسین، تخلص نجمؔ، والد کا نام مرزا عاشق حسین بزمؔ آفندی ۱۸۹۲ء ۱۳۱۰ھ میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ترکستان سے ترک وطن کر کے پہلے فیض آباد آیا۔ پھر لکھنؤ اور آخر اکبر آباد (آگرہ) میں آ کر بس گیا۔ نجمؔ کی علمی استعداد خاصی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ شاعری میں اپنے والد ماجد حضرت بزمؔ آفندی کے شاگرد تھے۔ ان کے اجداد میں حضرت منیرؔ شکوہ آبادی مشہور زمانہ استاد تھے۔ نجمؔ کے نانا آغا حسین آغاؔ اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے، جو مرزا عنایت علی ماہؔ اور مرزا حاتم علی مہرؔ کے ہم صحبت وہم مشق رہے تھے۔ آغاؔ کے یہ دو شعر آج بھی زبانوں پر ہیں:

دیکھیں کہ کس طرح انہیں ہوتا نہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

نجمؔ آفندی منیرؔ شکوہ آبادی کے سلسلے کے نامور شاعر تھے۔ ان کے خاندان میں چار پشتوں سے شاعری کے چرچے تھے۔ ان کے صاحبزادے مسعود الحسن سہیلؔ بھی خوب شعر کہتے ہیں۔ ان کے خاندان میں جہاں شعرانہ ذوق کی فراوانی رہی ہے، وہاں مذہبی رجحانات بھی زیادہ پائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ نجمؔ کے مراثی، قصائد، رباعیات اور نوحہ جات ملک کے کونے کونے میں مشہور ہیں۔ ان کی معاشی زندگی کا آغاز محکمہ ریلوے یارڈ سے ہوا۔ اس محکمہ میں تیرہ

برس تک خدمات انجام دیں۔ چونکہ یہ ملازمت ان کی شاعرانہ طبیعت کے سراسر خلاف تھی، آخر کسی وجہ سے ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ غالباً وہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۹ء تک مذکورہ ملازمت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے معاشی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ آگرہ چونکہ ان کا آبائی وطن تھا اس لیے وہاں کے اخبارات اور رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ مثلاً شاعر، تاج اور پیمانہ میں ان کی نظمیں اور غزلیں کثرت سے چھپیں۔ زمانہ کانپور میں اور دوسرے چوٹی کے ماہناموں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ آگرہ سے جب حیدرآباد جانا ہوا تو وہاں کی علمی صحبتوں میں ان کے جوہر کمال کو خوب پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے۔ پرنس معظم جاہ شجیع ان کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ شجیع صاحب نے ان کا وظیفہ -/300 روپے ماہوار مقرر کردیا۔ اور نجم نے ان کو تقریباً بیس برس اصلاح دی۔ ایک دفعہ شجیع نے ان کو کہا کہ ''یہ ٹکڑا غزل میں آجائے'' نجم صاحب نے جواباً عرض کیا'' کہ یہ بحر اس ٹکڑے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' جس پر شجیع صاحب نے فرمایا کہ'' آپ کا اب بڑھاپا ہے'' آپ اب کچھ نہیں کہہ سکتے، چنانچہ اس بات پر نجم صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور خانہ نشین ہوگئے۔ آخری عمر میں حیدرآباد سے لاہور تشریف لائے اور پھر لاہور سے کراچی اور وہیں ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازے میں دس سے بھی کم افراد شریک تھے۔ ان کی وفات کی تشہیر نہیں کی گئی، اور کراچی کے کسی روزنامے کو اس نامور استاد کی وفات کی خبر شائع کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ جس کا انتہائی افسوس ہے۔

نجم ایک کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اور دوسرے مقام کے کتب فروشوں نے ان کی مختلف تصانیف شائع کی ہیں، قصائد، مراثی، سلام، رباعی، نوحہ اور غزل سبھی کچھ انہوں نے کہا ہے۔ اور ہر صنفِ سخن میں شعر و ادب کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ الفاظ کی بندش، محاورات کی برجستگی اور ان کا صحیح استعمال، انداز بیان میں دل کشی ان کے کلام کی جان ہیں۔ سوزوگداز اور رمزیت ان کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ان کی غزل بھی بڑی پُرکشش ہے۔ دل میں چونکہ درد ہے اس لیے صحیح جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اخلاق اور موعظت کے مضامین سے ان کا کلام خالی نہیں۔

تصوف اور اخلاق دونوں طرح کے مضامین سے انہوں نے اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ اخلاقی مضامین کی ادائیگی میں رمزیت سے وہ کام لیتے ہیں تو شعر کے محاسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد باون ہے۔ اپنے شاگردوں میں خاورؔ نوری کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ ان کی غزلیات کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں تقریباً تین سو غزلیں ہیں۔ پڑھنے کا انداز نرالا تھا۔ پاٹ دار آواز تھی اور مجمع پر چھا جاتے تھے۔

'فتح مبین' اور 'معراجِ فکر' شائع ہو چکے ہیں۔ فتح مبین تو نظامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا تھا، اور معراجِ فکر رضا کاربک ڈپو لاہور سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں مرثیے نجم کی استادی کا شاہکار ہیں۔ ''معراج فکر'' میں تو ان کی شاعری نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔ اصناف سخن میں 'نوحہ' پر انہوں نے خاصی محنت کی ہے۔ اور آج ہر ماتمی جلوس میں ان کے نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نوحوں میں تبلیغی رنگ رچا بسا ہوا ہے جو سننے والوں کے دلوں پر ایک جاودانی اثر پیدا کرتا ہے۔ ان کے ایک نوحے کا مطلع ہے

مظلوم کا حق ہے عالم پر، ہیں دونوں جہاں غمخواروں میں
شبیرؑ کا ماتم چاند میں ہے، شبیرؑ کا ماتم تاروں میں

اور یہ شعر ہے

آج اُس سے عبادت باقی ہے آج اس سے نمازیں قائم ہیں
کل ایک مصلے بچھا تھا جو تیروں کی بوچھاروں میں

نہر علقمہ سے خطاب، نوحے کی شکل میں کیا گیا ہے۔ اس نظم کے اشعار سن کر پتھر دل بھی پانی ہوجاتے ہیں۔ مطلع ہے

پیاسا رہا جانِ نبیؐ اے دائے نہر علقمہ
اٹھتی رہیں موجیں تری اے دائے نہر علقمہ

یہ نوحہ سوز و گداز سے پُر ہے۔ اور جب تک دنیا قائم رہے گی نجم کی یہ فریاد باقی رہے گی۔

نجم کی دیکھا دیکھی، چند دوسرے شعراء نے بھی تبلیغی نوحے لکھے ہیں۔ فضلؔ لکھنوی ان میں پیش پیش ہیں۔ ان کے ایک نوحے کے دو شعر ملاحظہ ہوں

ماتم کی صدا ٹکرا کے رہی، ہر آنکھ میں آنسو آ کے رہا　　روکا تو ہزاروں ہاتھوں نے شبیرؑ کا پرچم چھا کے رہا
دربارِ حسینیؑ ختم ہوا سرکارِ حسینیؑ باقی ہے　　یہ صبر و رضا کی منزل ہے جو کھو کے رہا وہ پا کے رہا

ارشاداتِ غم کے تینوں حصے مکتبۂ ناصری، گولہ گنج لکھنؤ نے شائع کیے تھے۔ ان میں قصائد، مختلف عنوانات پر نظمیں اور دل ہلا دینے والے نوحے شامل ہیں۔ آیاتِ ماتم، کربل نگری، جانِ کربلا، حسینیؑ سنسار، معرکۂ غم بھی مکتبۂ ناصری نے شائع کیے ہیں۔ ان کے سلاموں کا ایک مجموعہ ''دارلسلام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ جدید طرز کے سلام ہیں۔ رباعیات کا مجموعہ حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے 'الکرار' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا تھا۔ جو زیادہ دیر چل نہ سکا۔ ان کے ایک سلام اور ایک غزل کا نمونہ پیش کرتے ہیں تا کہ ان کے اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکے۔

سلام

چاند نے زہراؑ کے مستقبل کو درخشاں کردیا　　قومیت کی روحِ آزادی کو جولاں کردیا
جلوۂ شبیرؑ نے جنت بداماں کردیا　　قسمت اس جنگل کی جس کو کوئے جاناں کردیا
سینۂ یثرب سے نکلا کاروانِ وردِ دل　　کربلا کو سجدہ گاہِ درد و درماں کردیا
اے حسینؑ ابنِ علیؑ اے کار سازِ حریت　　تو نے مرگ و زندگی دونوں کو آساں کردیا
سر پہ کج رکھ کر ہجوم غم میں تاجِ بے کسی　　ظلم کے آئین کو سردر گریباں کردیا
درد کی قوت سے دنیا لرزہ براندام ہے　　بجلیاں ماتم میں بھر دیں غم کو طوفاں کردیا
جھوٹ سے ٹکرا کے سچے بول شمع بن گئے　　ہر زبانِ گنگ کو شمشیرِ عریاں کردیا
ڈھے گیا قصرِ امامت، ہل گئی بنیادِ ظلم　　کارگاہِ عیش کو خواب پریشاں کردیا
اضطرابِ معنوی دے کر بنایا دل کو دل　　زندگی کو زندگی، انساں کو انساں کردیا

نجم ہم نے مدحِ اہلبیتؑ کے ہر شعر میں
فاضلِ طینت کی فطرت کو نمایاں کردیا

غزل

ملی ہے موت بھی قسمت سے شاہکار مجھے
کہ تیز کرنی پڑی خود چھری کی دھار مجھے

خبر تو دل سے ملی ہے ہزار بار مجھے
کبھی تو میں بھی سنوں، اس طرح پکار مجھے

مظاہرے تو ہیں دونوں طرف محبت کے
نہ اعتبار انہیں ہے نہ اعتبار مجھے

کمالِ فن مرے دستِ طلب سے دور نہ تھا
مگر قبول نہ تھی شرطِ انکسار مجھے

خدا کا شکر ہے دشمن سے خود عوض نہ لیا
ملی تھی خیر سے توفیقِ انتظار مجھے

میں خود ہوں مطمئن اے حجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

شاعر اہلبیت حضرت حجم آفندی اعلی اللہ مقامہٗ نے شاعری کوتو چار چاند لگائے ہی ہیں۔ مرحوم نے نثر میں بھی اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں.....'شہیدوں کی باتیں' اور 'لغات المذہب' آپ کے دو نثری شاہکار ہیں، جن کی اشاعت کا شرف رضا کار بک ڈپو لاہور کو حاصل ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کتابچے حجم میں تو کم ہیں لیکن افادیت کے لحاظ سے ان کا پلڑا بہت بھاری ہے۔

O

ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر

علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن

(ڈاکٹر ریاض فاطمہ کی عمدہ تصنیف سے اقتباس)

شخصیت: میں اپنے زعمِ بلندی سے مٹ گیا لیکن
کبھی نشانہ احساس کمتری نہ بنا

فن کو فرد کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی فنکار یا شاعر اپنے تجربات زندگی ہی اپنی تخلیقات میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے نجم کے کلام کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کو پرکھنے اور ان کی صحیح قدر و قیمت کے تعین کے لیے ان کا ماحول، معتقدات، معاشرہ اور زندگی کے نشیب و فراز کا سرسری جائزہ ضروری ہے۔

نجم کا قد، اگر چہ پستہ تھا، لیکن اکہرا بدن اور مضبوط کاٹھی تھی۔ سرخ و سفید رنگت۔ گول چہرہ جس پر سیاہ فریم کا چشمہ ان کے حُسن میں اضافہ کرتا۔ شیشوں سے جھانکتی ہوئی چمکدار آنکھیں جن میں سنجیدگی کے پوشیدہ خزانے، چہرے سے رعب و جلال ٹپکتا تھا، لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی رہتی تھی۔

لباس کے معاملے میں نجم بہت سادگی پسند تھے۔ خالص مشرقی اصول کے حامی۔ حُب الوطنی کا جذبہ اتنا شدید کہ بدیسی ماحول کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہمیشہ کھادی کا کرتا، پاجامہ، پہنتے رہے۔ گھر سے باہر جانا ہوتا تو سفید یا بادامی رنگ کی شیروانی پہنتے تھے۔ سیاہ مخملی ٹوپی اور سیاہ کینوس کا جوتا استعمال کرتے۔ محرم میں سیاہ شیروانی پہنتے۔ گرم کپڑوں کا استعمال بہت کم کیا، گھر سے جب بھی باہر نکلتے تو ہاتھ میں چھڑی ضرور ہوتی۔

نجم صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ فجر کی نماز کے ساتھ ہی چائے پیتے، ناشتے میں روغنی روٹی اور چائے، دوپہر میں چپاتی کھاتے تھے۔ رات کا کھانا جب تک نجیب کے دربار سے وابستہ رہے، وہیں ہوتا تھا۔ چار بجے چائے پی کر نماز پڑھتے اور دربار کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان کی خوراک اگرچہ کم تھی، تاہم چائے بہت شوق سے پیتے تھے اور وقت پر پیتے تھے۔

نجم وقت کے بہت پابند تھے اور یہی پابندی کھانے پینے کے معاملے میں بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کے وقت بھی لوگ انہیں دیکھ کر اپنی گھڑی درست کر لیتے۔ اگر کسی مشاعرے کا وقت دو بجے دن کا ہوتا تو راستہ کا اندازہ کر کے نجم گھر سے روانہ ہو جاتے تا کہ ٹھیک وقت پر مقام مقررہ تک پہنچ جائیں۔ یہ ان کے مزاج کی سادگی اور اصول پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا ثبوت تھا، اگرچہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مشاعرے عموماً وقت پر شروع نہیں ہوتے پھر بھی وہ اپنی روش پر قائم رہے۔ آدابِ محفل کا انہیں بہت خیال تھا اور شاگردوں کو تاکیداً پابند کرتے کہ محفل میں اس وقت تک ٹھیرنا چاہیے جب تک کہ محفل برخواست نہ ہو۔ جب وہ خود صدر محفل یا صدر مشاعرہ ہوتے تو اس وقت لازماً اختتام محفل تک ٹھیرتے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی اور شاعر کی صدارت میں مشاعرہ ہوتا، تو ایسے وقت بھی نجم اختتام تک بیٹھتے اور شاگردوں کو بھی تاکید تھی کہ دوسرے شعراء کلام سنائیں تو اس وقت ہم تن گوش رہیں تا کہ وہ جو کچھ سنا رہا ہے توجہ سے سن سکیں۔ مشاعرے کے دوران اگر کوئی اُٹھ کر چلا جاتا تو بہت خفا ہوتے تھے۔

مشاعروں میں جب ان کے شاگرد کلام سناتے تو وہ داد نہیں دیتے تھے، بلکہ اگر کوئی شعر پسند آجائے تو بس نظر اٹھا کر دیکھ لیتے یا ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی۔ بہت زیادہ تعریف کے قابل کوئی شعر ہوتا تو صرف ہاتھ آہستہ سے مخصوص انداز میں اٹھا دیتے، یہی تعریف ہوتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ داد دینے کے معاملے میں وہ کافی بخیل تھے، وہ اپنے ہم عصر شعرا اور اساتذۂ سخن کے کلام پر دل کھول کر داد دیتے تھے اور اس داد کے حق دار شہید یار جنگ، میر محمد علی مسرور، علامہ ناصر زیدپوری، کامل شطاری، حکیم آشفتہ اور قدر عریضی جیسے اساتذہ فن ہی تھے۔

شعر گوئی کے لیے عموماً تنہائی کو پسند کرتے۔ گھر میں ہوتے تو دیوان خانے میں فرش پر

بیٹھتے، سامنے قلمدان ہوتا۔ اگر کبھی شاگرد موجود رہتے اور شعر نازل ہوتا تو ایسے وقت میں خاموش ہو جاتے اور شاگردوں کی باتوں میں صرف ہوں ہاں کہہ کر حصہ لیتے۔ نجم کے شاگرد راحت عزمی کا کہنا ہے کہ ایسے وقت ہم سمجھ جاتے کہ حضرت کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہے، چنانچہ ہم کچھ بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ جاتے تا کہ حضرت یکسوئی سے اپنا کلام لکھیں۔ جب شعر کہہ رہے ہوتے تو اس وقت کوئی شاگرد اصلاح کی غرض سے آجاتا تو کہہ دیتے ''رکھ دو ہم دیکھ لیں گے۔'' اگر کبھی دیوان خانے کا دروازہ بند رہتا تو شاگرد سمجھ جاتے کہ نجم اس وقت شعر کہہ رہے ہوں گے۔

جس طرح وقت کے پابند تھے اسی طرح خط کا جواب بھی پابندی سے دیتے تھے۔ خط کا جواب نہ دینا بداخلاقی سمجھتے تھے۔ اگر چہ ضعیفی کے باعث ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا لیکن تحریر اچھی تھی جب تک خود لکھ سکتے تھے، خطوط لکھتے رہے، جب ہاتھ میں قلم پکڑنا بار ہوگیا تو کسی شاگرد سے لکھوایا کرتے لیکن دستخط اپنے ہاتھ سے کرتے۔

نجم کی آواز بلند اور گرجدار تھی۔ شعر تحت میں پڑھتے اور جب کلام سناتے تو ایک ایک لفظ کو اس طرح ادا کرتے گویا لفظ خود بول رہا ہو۔ محفل ہمہ تن گوش رہتی اور پھر داد سے پوری محفل گونج اٹھتی۔

نجم کی اصلاح کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ وہ کبھی شاگرد کے شعر میں ترمیم نہ کرتے بلکہ ایک آدھ لفظ بدل کر ہی شعر کو آسمان پر پہنچا دیتے۔ ساتھ ہی یہ خوبی بھی تھی کہ ہر شاگرد کے کلام میں اس کے ذوق طبع کے مطابق ہی اصلاح دیتے تھے۔ اپنا رنگ کبھی شاگرد کے کلام میں ظاہر نہیں کیا، یہی وجہ تھی کہ ان کے تقریباً تمام شاگرد اپنے رنگ میں ایک دوسرے سے مختلف و منفرد ہیں۔

اپنے شاگردوں سے انہیں بے حد پیار تھا۔ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور کہا کرتے کہ میرے شاگرد میرے بچے ہیں۔ یہ صرف زبان ہی سے نہیں کہتے بلکہ عملاً بھی انہیں اولاد کی طرح چاہا اور جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کی نافرمانی اور گستاخیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یہی رویہ نجم کا بھی رہا۔ ساتھ ہی اپنے شاگردوں کی دلجوئی کا خیال بھی رہتا تھا۔

کراچی جانے سے قبل جونپور میں ایک طرحی مشاعرہ پڑھنے گئے۔ اس مشاعرے میں ان کی ملاقات با نو سید پوری کے شوہر ڈاکٹر ابوالحسن سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا تعارف کروایا

اور اصرار کیا کہ بانو نے انہیں یاد کیا ہے اور ملنے کے لیے بے چین ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شاگرد سے ملنے جونپور سے کانپور چلے گئے۔

نجم بہت خود دار تھے۔ اگر چہ وہ ایک پرنس کے استاد تھے لیکن پرنس کے ساتھ بھی ان کا رویہ ایسا رہا جیسا کہ ایک استاد کا اپنے شاگرد کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اثر ورسوخ کا کبھی نا جائز فائدہ نہیں اٹھایا، اگر چہ پرنس شجیع نے انہیں ایک مکان کی پیشکش کی تھی جسے نجم نے قبول نہیں کیا اور جب تک حیدرآباد میں رہے، کرایہ کے مکان ہی میں رہے۔

نجم کے اجداد ترک سپاہی تھے۔ بیباکی اور جرأت بھی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ حق گوئی میں کبھی پس وپیش نہیں کیا جس کے باعث اکثر اوقات خود ان کی ذات کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اس نقصان پر بھی انہیں کبھی پچھتاوا نہیں رہا۔ اپنی اس خودداری کے نتیجے میں بالآخر انہیں دربار شجیع سے کنارہ کش بھی ہونا پڑا۔ ڈاکٹر جعفر رضا کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوئے تو پرانی حویلی سے لنگم پلی تک پیدل جانا گوارا کیا لیکن اپنے اصول اور آن سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

اپنی والدہ کی حیات میں نجم کبھی اپنی دوسری ماں سے ملنے نہیں گئے، نہ ہی کبھی اپنی بہن بانو پروین سے ملے۔ جب بزم وہاں رہتے تو نجم ان سے ملنے وہاں جاتے اور صرف والد سے مل کر آجاتے۔ نجم کی کسی لڑکی کی پیدائش پر ان کی بہن گھر آئیں تو اس کے بعد وہ بھی ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر جانے لگے اور جب ان کے شوہر علی رضا کا انتقال ہوگیا تو بہن کو بلا کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔

نجم بہت حساس اور نرم دل انسان تھے۔ دوسروں کی تکلیف پر اس طرح تڑپ جاتے جیسے کہ یہ ان کی اپنی تکلیف ہو۔ کشمیر میں لوگ سیر وتفریح کے لیے جاتے ہیں۔ پرنس شجیع کے ساتھ نجم کو بھی ۱۹۴۱ء میں کشمیر جانے کا اتفاق ہوا۔ کشمیر کی حسین وادیوں نے ان کے دل پر جو اثر کیا، وہ اپنی جگہ، لیکن اس سے بڑھ کر جو چیز ان کے دل نازک پر اثر انداز ہوئی وہ کشمیریوں کی حالت زار تھی۔ یہ زمانہ کشمیر میں جہالت وافلاس کے عروج کا زمانہ تھا۔ چنانچہ یہ اشعار ان کی انسان دوستی کے مظہر ہیں۔

کشمیر میں کیا شام وسحر کی ہم نے
اک آہ کی جس سمت نظر کی ہم نے

کانٹوں میں کسی کی یوں نہ گذری ہوگی
جس درد سے پھولوں میں بسر کی ہم نے

اصلاح قوم اور حقیقت پسندی ہمیشہ حجم کا شعار رہا۔ عشق رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے سرشار تھے۔ ان کے کلام سے جابجا ان کی اس محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مدحِ اہلبیتؑ پر آتے تو ایک دریا کی سی روانی ان کے کلام میں آجاتی۔ تاہم اپنے نظریات میں کبھی غلو نہیں کیا۔ سانحہ کربلا صدیوں سے موضوع شاعری رہا ہے۔ بین اور بکا پر اکثر شعرا نے اپنا زورِ قلم دکھایا۔ حجم کی شخصیت کو یہ اولیت حاصل ہے کہ وہ پیغام حسینیؑ کو اپنے کلام کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاتے رہے اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کا درس دیا۔ حجم کے نزدیک مذہب ہی وہ سچا راستہ ہے جس پر چل کر قوم اپنی حالت سدھار سکتی ہے، ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے۔ لیکن آج انسان اس حقیقت سے بے خبر ہوتا جارہا ہے اس پر انہیں افسوس کے ساتھ حیرت بھی ہے، اس لیے قدم قدم پر اپنے پیغامات کے ذریعہ قوم کو بیدار کرتے رہے۔

کس طرح بدل گیا یہ معیارِ حیات
کیوں سرد ہوئی گرمیِ بازارِ حیات
جس قوم نے سر کی مہمِ کرب و بلا
اس قوم میں ملتے نہیں آثارِ حیات

انسان کی عظمت کے نگہبان بھی ہو
مسلم ہو سلامتی کا عنوان بھی ہو
اسلام پیامِ امن ہے یاد رہے
سُنی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

حجم آفندی ایک پُرگو شاعر تھے۔ تقریباً ۶۵ سال تک اردو شعر و ادب کی خدمت کی۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور لاکھوں اشعار کی تعداد میں اپنا سرمایہ شعری، اپنی یادگار چھوڑا ہے جو ہندو پاک بلکہ سارے عالم میں بکھرا پڑا ہے۔ عمر کے آخری ایام تک بھی جوش، ولولہ اور اردو

سے محبت کا جذبہ کم نہ ہوا۔

قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نجم شاعر گر بھی تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) رہی ہوگی جس کا ذکر خود نجم نے کیا تھا اور آج ان میں بہت سے ایسے ہیں جو خود استادی کے درجہ پر فائز ہیں۔ نجم کی شعری تخلیقات میں رُباعیات، قطعات، سلام، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ، غزل اور نظمیں شامل ہیں۔ ادبی اور مذہبی مضامین، ناول، غرض ہر شے موجود ہے۔ ان کے منتخب کلام سے پہلے ان اصناف شعری کا سرسری جائزہ بھی ضرور ہے جن پر نجم نے طبع آزمائی کی اور نئی راہیں تلاش کی ہیں۔

رباعی: رباعی کے معنی چار مصرعہ والی نظم ہیں۔ اس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے جب کہ تیسرا مصرعہ مختلف القافیہ ہوتا ہے۔ اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح رباعی بھی فارسی کے زیر اثر اردو میں رائج ہوئی لیکن رباعی سے ملتی جلتی صنف ہندوستانی زبان میں بھی دو بیتی یا ترانہ کی شکل میں رائج تھی۔ دیگر اصناف سخن کی طرح رباعی کے لیے متفرق بحروں کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ بحر ہزج ہی رباعی کے لیے مختص ہے۔ اس کے ۲۴ اوزان ہی رباعی کے لیے برتے جاتے رہے رہیں۔ مضامین عموماً داخلی ہوتے ہیں، اخلاقی اور حکیمانہ نکات، تمدنی اور مذہبی موضوعات اس میں نظم کئے جاتے ہیں۔ تخیل کی بلندی ضروری ہے۔ چار مصرعوں میں ارتقائی کیفیت اس انداز سے ہو کہ چوتھے مصرعہ میں خیال اپنے کمال کو پہنچے۔

نجم نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی رباعیوں میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، رثائی، اخلاقی، فلسفیانہ، حکیمانہ ہر قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ نجم نے رباعیات میں اپنی زندگی اور اپنے عہد کو مقید کیا ہے۔

نجم کی غزل کے مطالعہ کے وقت جب ان کی رباعیات کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نجم کی فکر غزل کے ساتھ فن رباعی میں بھی کس قدر گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جس نے فن سے بھی گہرا ربط رکھا، اور مواد کو بھی وسعت دی۔ یہ قادرالکلامی کے بغیر کسی شاعر سے ممکن نہیں۔

اخلاص کا زور آزما سکتے ہو
فولاد کے دل میں بھی سما سکتے ہو

کرتے رہو نیکی جو بدی کے بدلے
دشمن کو بھی تم دوست بنا سکتے ہو

بھارت ہے چمن، جانِ چمن ہیں ہم لوگ
کیا قابلِ شرطِ زیب وطن ہیں ہم لوگ
آپس میں بھی مول تول ہوتا ہے کہیں
اس دیس کے انمول رتن ہیں ہم لوگ

نوحہ: نوحہ کے معنی بین کرنا اور رونا ہیں۔ مرثیہ کے ساتھ ہی نوحہ کا بھی آغاز ہوا۔ نوحہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بین کرنا اور رونا۔ عرب میں یہ طریقہ رائج تھا کہ بڑے آدمیوں کی موت پر عورتیں جمع ہو کر نوحہ کرتی تھیں۔ نوحہ کی قدامت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ عربی میں متمم بن نویرہ اور خنسا کے مرثیوں کو اولیت حاصل ہے۔ ان مرثیوں کے آخری حصہ میں شدت جذبات میں جو گریہ و بکا کے اشعار ملتے ہیں، وہی نوحے کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ فارسی میں نوحہ کو جداگانہ صنف سخن کی حیثیت کب حاصل ہوئی، تاہم اتنا ضروری ہے کہ ''رثا'' کی ذیل میں جو نوحے لکھے گئے ہیں، ان میں درد و الم کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی ملتی ہے۔ اردو نوحے کے اولین نمونے قطب شاہی دور میں ملتے ہیں۔ نوحہ میں عہد بہ عہد ترقی ہوتی رہی۔ ابتدائی دور میں زبان کی سادگی، بیانیہ اور مکی طرز بیان ملتا ہے۔ لیکن انقلاب زمانہ کے اثر سے کوئی شے محفوظ نہیں، اس لیے نوحہ کی زبان میں ادبیت آ گئی۔

انیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور بیسویں صدی کے ربع اول میں جو نوحے لکھے گئے وہ زیادہ تر روایات پر مبنی ہوتے۔ اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے بعض شعرا روایات میں غلو کر جاتے۔ نجم نے نوحہ میں اصلاحی رجحان پیش کیا اور حسینیت اور کردار حسینؑ کی تصویر کشی پُر اثر اور کامیاب انداز میں پیش کی ہے۔

سر فروشانِ وفا کی تھیں نگاہیں دیدنی
اٹھ گیا تھا کون سا پردہ شبِ عاشور کو

دو طفل دس ہزار جوانوں سے لڑ گئے
تیروں سے خنجروں سے سنانوں سے لڑ گئے

کیا کیا لڑے ہیں گیسوؤں والوں کو دیکھنا
بنتِ علی کی گود کے پالوں کو دیکھنا

اب فرات پہ عباس کی وفا دیکھو
کہ تشنگی بھی تھی پانی بھی تھا پیا نہ گیا

تجمّ نے اپنی شاعری کے ذریعہ امام حسینؑ کے پیغام عمل اور جدوجہد کو عام کیا، درد وغم کی فضا برقرار رکھی، یہ ان کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہے۔تجمّ نے اردو کے ساتھ ہندی زبان میں بھی نوحے کہے ہیں۔مجبوری ونا امیدی،حزن وملال، بے چارگی اورنا امیدی کے بیانات کے بجائے تجمّ کے کلام میں عزم واستقلال،طوفانوں اور چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ملتا ہے۔

بڑھا تھا کفر کہ اسلام کا نشاں نہ رہے
تڑپ کے روک لیا دل پہ وار کیا کہنا
مارے گئے ست کی سیوا میں دھنبا در ہے ایشر بھکتوں کو
مکھڑوں پہ لہو کی سرخی سے بڑھ چڑھ کے خوشی کی لالی تھی
سنسار کو سچ کی شکتی سے گھر بار لٹا کر موہ لیا
سودا ہے ذرا اک جو کھم کا جو کھوئے گا سو پائے گا

سلام: سلام وہ منظوم نذرانۂ عقیدت ہے جس میں حضور رسول اکرمؐ،حضرت علی ابن ابی طالب اور ائمہ طاہرین اور اہلبیت اطہار کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔امام حسینؑ اور آپ کے اعزہ وانصار کی شجاعت اور شہادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔فارسی ادب کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایران میں سلام گوئی کا رواج بہت کم رہا لیکن ہندوستانی شعرا نے فارسی میں سلام لکھے، تاہم اردو نے سلام گوئی کو مستقل صنفِ سخن کا درجہ عطا کیا۔دکن میں جو ابتدائی دور کے مرثیے ملتے

ہیں ان کی ہیئت غزل کی ہے اور سلام بھی غزل ہی کی ہیئت میں لکھا جاتا رہا لیکن موضوع کے اعتبار سے سلام اور مرثیہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جس کلام کی ردیف میں سلام علیک، سلام مجرئ مرحبا یا صلواۃ جیسے الفاظ ہوں، وہ سلام ہے اور اس سے جدا صنف مرثیہ۔ اُس زمانے کا سلام حقیقی معنی میں سلام ہی ہوا کرتا۔ شاعر اپنی طرف سے معصومین علیہم السلام کی خدمت میں نذرانہ عقیدت وہدیۂ درود تہنیت پیش کرتا تھا۔

انیسؔ ودبیرؔ نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں سلام کو زیادہ تابدار بنادیا۔ منقبتی اور اخلاقی مضامین کو مدحیہ انداز میں پیش کر کے نئی روش کی بنیاد ڈالی، اس صنف کو ترقی کی ان منزلوں پر پہنچا دیا کہ اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ رہی۔ نجمؔ آفندی کی جدت پسندانہ طبعیت سلام کے میدان میں بھی اپنی فکر کے جوہر دکھاتی رہی اور سلام کو بیسوں صدی میں عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ یقیناً نجمؔ وہ پہلے شاعر ہیں جس نے واقعات کربلا کو پس منظر میں رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سلام کے مضامین استعمال کئے ہیں۔ امام عالی مقام اور آپ کے انصار کی بے مثال قربانیاں، ان کے عزم واستقلال کو نجمؔ نے جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ مایوس ونا اُمید مصیبت زدہ مسلمانوں کے دل میں احساس بیداری پیدا ہو، اپنے حق کے لیے لڑنے کی امنگ اور حوصلہ پیدا ہو۔ بعد میں ان کے اس انداز کو دیگر شعراء نے بھی اپنایا ہے لیکن اولیت کا شرف نجمؔ ہی کو حاصل ہے۔

ہے علیؑ کی مِلک میں قرآن بھی شمشیر بھی
تائل قولِ ''سلونی'' بھی ہے خیبر گیر بھی

ملتی نہیں جہاں میں علیؑ کی مثال بھی
ہم نے تو یہ سنا تھا خدا بے مثال ہے

قدم ہٹیں گے نہ انصارِ حق کے میداں سے
حسینی پرورش کوہسار کرتے ہیں

حسینی راز حیات آشکار کرتے ہیں
ہر اختیار پہ موت اختیار کرتے ہیں

مرثیہ: اردو شاعری کی پانچ سوسالہ میراث ہے۔ اردو مرثیہ کا آغاز دکن میں ہوا، پھر مرثیہ دکن سے شمالی ہند پہنچا۔ بعض نقادانِ فن یہ سمجھتے ہیں کہ مرثیہ عربی زبان سے دنیا میں رواج پایا، بعض دیگر اصناف سخن کی طرح مرثیہ کو بھی فارسی شاعری کی دین سمجھتے ہیں لیکن مرثیہ اردو زبان کی دین ہے۔ آفاقی شاعری میں اردو زبان کی جانب سے ایک پائیدار، جان دار اور نئی صنف سخن کا حسین وجمیل اضافہ ایسے وقت میں ہوا، جب کہ اردو شاعری غزل کی رنگینوں سے سبک تر ہوتی جارہی تھی۔ میر انیس و مرزا دبیر کے فنکارانہ ہاتھوں نے اسے سنبھال دیا۔ مرثیے کو ماہرانہ انداز میں نکھارا اور اسے جلا بخشی۔ انیسؔ و دبیرؔ نے صنف مرثیہ کو اس انداز سے نکھارا تھا کہ اس میں مزید تبدیلی یا تغیر کی ضرورت باقی نہ رہی۔ انیسؔ نے جزئیات نگاری اور منظر کشی، اس انداز سے کی کہ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، ساتھ ہی صاف ستھری زبان اور مخصوص طرز ادا، جو ان کا خاندانی ورثہ ہے، انیسؔ کا خاص جوہر ہے۔ اسی طرح دبیرؔ کو زبان و بیان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ صنعتوں کا استعمال دبیرؔ کے پاس انوکھے انداز میں ملتا ہے۔ دبیرؔ کے کلام کی لفظی خصوصیات میں صناعی، شکوہ الفاظ، تخلیقی مضامین، معنی آفرینی کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدحیہ فضاء کو بھی برتا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کی گونج سارے ہندوستان میں تھی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں میں دو طرز کے لکھنے والے پیدا ہوئے، ایک گروہ ان شعرا کا تھا جو بزرگوں کی مقرر کردہ روش کو اپنائے ہوئے تھے اور ایک گروہ ایسا بھی ملتا ہے جس نے روایت کی پابندی سے انحراف کیا اور رثائی شاعری میں تبلیغی انداز کو اپنایا۔ اس گروہ میں نجمؔ آفندی بھی شامل ہیں۔ نجمؔ نے رثائی ادب میں فکری اور تبلیغی رنگ کو اپنایا ہے، ساتھ ہی رثائیت کو بھی برقرار رکھا۔

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا
اسلام کی نجات کا سامان مرحبا

انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا
بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنے اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

کس درجہ دردناک تھا وہ وقت وہ مقام
خاموش فرطِ غم سے تھے اہل حرم تمام
غیرت سے بیکسوں کو نہ تھی طاقت کلام
بے رحم کررہے تھے اسیری کا اہتمام
آواز تھی بلند سکینہؑ کے بین کی
مقتل میں ہورہی تھی یہ مجلس حسینؑ کی

قصیدہ: بیشتر اصناف شاعری عربی اور فارسی سے اردو میں رواج پائی ہیں۔قصیدہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔قصیدے کے لغوی معنی ''گاڑھے مغز'' کے ہیں۔ان اشعار میں دقیق مضامین تمام تر زور طبعیت کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔اس لیے ان کو قصیدہ کہتے ہیں۔اصطلاحی معنی میں قصیدہ وہ نظم ہے جس کے پہلے دو مصرعہ ہم قافیہ ہوں اور مسلسل نظم کا مصرعہ ثانی بھی اسی قافیہ میں نظم کیا جائے۔اس کے موضوعات میں تعریف وتوصیف، وعظ ونصیحت، مدح وذم یا مختلف کیفیات وحالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔اشعار کی تعداد کم ازکم ہو۔زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔قصیدہ کو کے لیے اجزائے قصیدہ کی پابندی لازمی ہے۔تشبیب، گریز، مدح یا ہجوم، دعا، خاتمہ۔

اقسام قصیدہ: مدحیہ، ہجویہ، بیانیہ، وعظیہ۔نظم کی طرح قصیدے کے عنوانات بھی لکھے گئے ہیں۔جدید شعرا نے زیادہ تر اس کی پابندی کی ہے، چنانچہ عزیزؔ لکھنوی نے ''شمع حرم'' اور اسمٰعیلؔ میرٹھی نے ''جریدۂ عبرت'' کے عنوان دیئے ہیں۔تشبیب کے اعتبار سے قصیدوں کی درجہ بندی کی گئی تو بہار کے ذکر پہ ''بہاریہ'' واردات قلبی کا ذکر ہوتو ''عشقیہ''۔زمانے کے حالات کا تذکرہ کیا تو ''حالیہ'' اور شاعر نے اپنے کمالات اور بڑائی کا ذکر کیا تو ''فخریہ'' قصیدے کہے گئے۔

حجم کے تمام تر قصیدے مدحیہ ہیں جو حضور سرورِ کائناتؐ اور ائمہ اطہارؑ کی شان میں کہے گئے ہیں۔ حجم نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ قصیدے کی جو روایات ہیں، ان کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ بلندیٔ فکر، طرزِ ادا، زورِ بیان، مضمون آفرینی، صنائع بدائع کے مشفقانہ برتاؤ سے حجم کی قادرالکلامی اور پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے قصیدوں کی زمین شگفتہ ہے۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں نہیں الجھتے، لیکن بحر کی حد تک حجم کے قصیدوں میں اجتہاد ملتا ہے۔

چہرۂ مہروش ہے ایک سنبلِ مشک فام دو
حُسنِ بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو
اور بڑھیں گی رنگتیں گلشنِ روزگار کی
حُسنِ ازل کو فکر ہے تکملۂ بہار کی
حُسن ازل تھا فقط غیرتِ صد انجمن
آپ تماشائی تھا آپ ہی جلوہ فگن
نمود عالم ہُو تھی فضائے تیرہ و تار
نہاں تھے کتم عدم میں چراغ وشمع وشرار

غزل: غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔ نظم کی طرح غزل میں شاعر کو یہ آزادی فکر نہیں کہ وہ اپنے خیالات کو مبسوط اور مسلسل نظم کرتا چلا جائے۔ اردو شاعری کی پسندیدہ صنف سخن غزل میں محمد قلی سے لے کر حالی کے دور تک ہر شاعر نے اس صنف کی اہمیت کو مانا ہے تاہم حالی کا خیال تھا کہ شعرا غزل گوئی میں مبالغہ آرائی، حسن وعشق کی داستان، ساقی اور بزم، نشاط کے تذکرے، ہجر وفراق کے قصے بیان کر کے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ اگر شاعر چاہے تو اپنے زورِ کلام اور اشعار کے ذریعہ بے حس اور سوئی ہوئی قوم کو جگا سکتا ہے، چنانچہ سرسید، محمد حسین آزاد اور حالی نے موضوعاتی مشاعروں کو رواج دیا اور نظم کے عنوان دیئے جاتے جس پر شعراء اپنا زورِ سخن دکھاتے۔ ان حالات میں کچھ عرصے کے لیے غزل کی روشنی مدھم ضرور ہوئی، تاہم ''آبروئے شاعری'' غزل کا خطاب ہر دور میں برقرار رہا۔ فن کو فرد کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر اور فنکار اپنے تجربات زندگی ہی اپنے

فن پارے میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ غزل کے موضوعات بھی بدلے۔ اب حسن وعشق کے تذکرے، گل وبلبل کی داستان اور ساقی ومیخانے کے تذکرے تو موضوع غزل بنتے رہے لیکن ان کے معنی ومطالب بدلتے گئے اور غزل حالات حاضرہ کا پرتو بنتی گئی۔

آپ گھبرائیں نہیں نظروں کو دھوکا ہوگیا
ایک ہی صورت کے ہوں گے میرا قاتل اور آپ
(ثاقبؔ)

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے
(صفیؔ)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
(یاسؔ)

تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام
الٰہی میری سحر کی بھی شام ہوجائے
(اصغرؔ)

حجم جیسے حساس دل شاعر نے اس کوچہ میں قدم رکھا تو غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ تبلیغی اور اصلاحی موضوعات میں ایسے گوشے نکالے کہ ان کی روش اختیار کر کے شاعروں کا ایک کارواں بن گیا۔

غرور بندگی و ہوشِ بندگی کب تک
جبیں سے سجدۂ مستانہ وار پیدا کر
کسی نے بے تکلف بڑھ کے قبضہ کرلیا اپنا
کوئی کہتا رہا یہ میری خاطر جام آتا ہے

جاں نثاروں نے ترے کردیئے جنگل آباد
خاک اُڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے
بجلیوں کی شوخیوں کو ایک مصرف چاہیے
آپ کا عشرت کدہ ہے میرے ویرانے کے بعد
پاؤں سے ان کے نکلتے ہوئے دیکھی ہے زمیں
ہاتھ سے رکھ بھی نہ پائے تھے جو پیمانے کو

ان کا یہ مفکرانہ انداز غزل کے سانچے میں ڈھل کر ابدی صداقت بن جاتا ہے، ایک ایسی صداقت جس میں نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ غزل کی حد تک تجم جذبات کے شاعر نہیں بلکہ تخیل کو جذبہ کا پیکر دے کر اس میں تاثر پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ ان کی تہذیب کرتی ہے۔

نہ جانے کس کو پکارا تھا اس کی رحمت نے
تڑپ کے میں نے صدا دی گناہگار آیا
کچھ ایسے نقش مری خستگی نے چھوڑے ہیں
غرورِ حسن بھی ٹھہرا گیا جدھر دیکھا
اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے
کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

تجم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہیں سامراجی شکست وریخت کا بخوبی اندازہ تھا۔ قدم قدم پر انہیں انسانیت کی پامالی کے منظر بھی بے چین کر دیتے تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں ادب واخلاق، قربانی اور انسان دوستی کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے۔ ان کی ساری زندگی معاشی پریشانی، رشتہ داروں کی بے اعتنائی، احباب کی ستم ظریفی اور ظلم وستم سہتے گذاری۔ ''خود داریِ مزاج'' سے درباری زندگی میں بھی تلخ تجربے ہوئے، یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں درد وغم کی کسک ہے لیکن فانیؔ کی سی قنوطیت نہیں۔

اسی زمیں کو کبھی آسماں بنالوں گا
زمیں کو چھوڑ کے اب آسماں پہ جاؤں کیا
یہ گت بناکے جاؤں میں کیا اس کے سامنے
تخلیق کائنات پہ جس کو غرور تھا
دردِ دل اپنا کوئی افسانۂ باطل نہ تھا
ہم نے چپ سادھی نگاہِ اہلِ عالم دیکھ کر
خاک ہوکر ہم نشیں اکسیر ہونا ہے مجھے
کیا کہیں راحت ملے گی خاک ہوجانے کے بعد

اردوغزل کی تاریخ نے نجم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا کہ رثائی شاعری ان کی ذات سے اس طرح وابستہ وپیوستہ ہوگئی کہ نجم کے معنی نوحہ وسلام، اورنوحہ وسلام کے معنی نجم آفندی سمجھا جاتا تھا۔ خودنجم نے بھی یہی چیز اپنے لیے باعث صدافتخار سمجھی اورغزل نظم اورقصیدے میں جوان کے اجتہاد اور اکتسابات ہیں، ان کی طرف نہ تو کسی کومتوجہ کیا، نہ خودتوجہ دی۔ اسی سبب ان کی غزلیات کا مجموعہ بھی شائع نہ ہوسکا۔

نجم فطرتاً غزل کے شاعر تھے لیکن ''شاعرِ اہلبیتؑ'' کا خطاب پاکر اپنی زندگی مدحتِ اہلبیتؑ کے لیے وقف کردی تو غزل کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، اگر چہ ابتدا ہی سے انہیں مشاعرے منعقد کرنے کا شوق رہا ہے۔ یقیناً بے شمار غزلیں کہی ہوں گی لیکن نہ اسے محفوظ رکھا نہ شائع کیا۔ ان کی اسی لاپروائی کی وجہ سے ان کا بہت سارا کلام یا تو ضائع ہوگیا یا کسی اور شاعر کے نام سے منسوب ہوگیا۔

نظم: اردو شاعری میں نظم ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں موضوعاتی شاعری کی جاتی ہے۔ کسی خاص موضوع پر شاعر اپنے خیالات اور تجربات مسلسل ومربوط نظم کرتا ہے۔ مضامین اخلاقی بھی ہوسکتے ہیں، سماجی اور تاریخی بھی۔ موضوع کی قید نہیں، نہ ہیئتی اعتبار سے کوئی تخصیص ہے کہ نظم صرف دوبیتی ہو یا مربع مخمس یا مسدس۔ ردیف وقافیہ کی پابندی ضروری ہے۔ ابتداء سے نظم کے لیے مختلف ہیئتیں استعمال کی جاتی رہیں۔ پہلی مرتبہ سرسید اور حالؔی نے نظم کے عنوان

مقرر کر کے مشاعروں کا آغاز کیا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگاموں کے بعد کرنل ہالرائڈ کے زیر قیادت ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ سرسید، حالؔی اور محمد حسین آزاد وغیرہ نے موضوعاتی مشاعروں کا آغاز کیا۔ اس طرح اصلاحی نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ جب حالؔی نے اپنا مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' لکھا تو اس کی کافی شہرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی موضوعاتی نظموں کا رواج چل پڑا جو اصلاح معاشرہ میں کافی مددگار ثابت ہوا۔

تجمؔ آفندی کی نظم نگاری کا آغاز بھی شیعہ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے لکھنو میں ہوا جہاں ان کی نظم ''درِ یتیم'' کو کافی مقبولیت ملی۔ کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں جو ۱۹۱۵ء میں ۱۵ تا ۱۷ اکتوبر منعقد ہوا، تجمؔ کی اس نظم کو بار بار سنا گیا اور آخر میں اس کا نیلام ہوا۔ ہر بولی دہندہ نے اپنی بولی کی رقم جمع کروائی۔ اس طرح ۵۶۵۰ روپے شیعہ یتیم خانہ کو دیئے گئے۔

شاعر کی حیثیت سے اکبرآباد سے مشہور شاعر تجمؔ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہ نظم ''پھولوں کا ہار'' میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ کلام ۱۹۱۷ء میں آگرہ سے شائع ہوا جس میں ۱۶ رباعیاں، ۲۲ نظمیں، ۲۰ قصیدے اور ایک شخصی مرثیہ شامل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ایک نظم ''کسان'' کے عنوان سے ملتی ہے۔

یہ نظم اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ ''ترقی پسند تحریک'' سے بہت پہلے بلکہ انقلاب روس سے بھی کچھ پہلے تجمؔ نے اردو شاعری کو محنت کش طبقہ کی طرف متوجہ کیا اور وہ ''کسان'' اور ''مزدور'' جو بعد کے دور میں نعرہ بن گئے، تجمؔ کے لیے بہت پہلے قابل توجہ تھے۔ ان کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے کسان کا پیکر نہیں تراشا بلکہ اس کی صفات پیش کی ہیں۔ اگرچہ اقبالؔ کے کلام میں دہقان کا تذکرہ ہے تو جوشؔ نے ''کسان'' میں محنت کش طبقہ کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ تاہم اولیت تجمؔ آفندی کو حاصل ہے۔ جس نے سب سے پہلے کسان کو بحیثیت ''موضوع شعری'' روشناس کروایا، اسے تاریخ ادب نے یکسر فراموش کر دیا۔ اقبالؔ کی وہ نظمیں جو ۱۹۲۱ء کے بعد لکھی گئیں، ان میں لفظ دہقان استعمال کیا ہے، جب کہ جوشؔ نے ۱۹۲۸ء میں ''کسان'' پر مستقل نظم لکھی۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ تاج اولیت جو تجمؔ کے سر پر ہونا چاہیے تھا، دوسروں کے حصہ میں آیا۔

ہے حیاتِ نوع انسانی تری ہستی کا راز
کچھ خبر بھی ہے تجھے او بھولے بھالے بے زباں
ہے ترا مرہونِ منت بادشاہ ہو یا گدا
ہے ترا ممنونِ احساں پیر ہو یا نوجواں
تیرا طرزِ زندگانی ہے تصنع سے بری
تیری باتوں میں نہیں مطلق بناوٹ کا نشاں
تجھ کو الفت ہے مویشی سے بھی بچوں کی طرح
دہر میں قائم ہے تیری ذات سے امن و اماں

اک اور مجموعہ کلام ''ستارے'' میں نجم نے ''کسان کی فریاد'' اور ''مزدور کی آواز'' بچوں کے لیے لکھی ہے۔ نجم اس حقیقت سے باخبر تھے کہ آج کے بچے ہی کل قوم کے معمار ہوں گے۔ اس لیے بچپن سے ان کی ذہنی تربیت کرنی چاہیے۔ ''ستارے'' میں شامل نظمیں بچوں کے لیے لکھی گئی تاریخی، سائنسی، اور معلوماتی نظمیں ہیں۔ یہ بات یقیناً قابل غور ہے کہ نجم جیسے شاعر نے کس طرح بچوں کی سطح پر آ کر ان ہی کے معیار کے مطابق دلچسپ آسان اور جلد سمجھ میں آنے والے انداز میں ہر بات کہی ہے۔ نجم کو اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ ہر جگہ ان کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ ''ہندوستان'' ''ہندوستان کا معصوم بچہ'' ''ہندوستان کی لڑکی'' ان سب میں نجم کی وطن سے محبت کا احساس ملتا ہے۔

میں اک اک ہند کے ذرے کو اپنی جان کہتا ہوں
میں ہر صوبہ سے ہندوستان ہندوستان کہتا ہوں
میں جو کچھ بھی ہوں جس حالت میں ہوں ہندوستانی ہوں

نجم آفندی پُرگو شاعر تھے۔ ان کی تصانیف جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ غیر مطبوعہ کلام جو وہ اپنے ساتھ کراچی لے گئے وہاں اس ذخیرہ بے بہا کا انجام کیا ہوا خدا جانے۔ کراچی جانے سے قبل ۴۰۰ غزلیات مرتب کی تھیں کہ شائع کروائیں، لیکن وہ گوشہ گمنامی میں چھپ گئیں۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہو جاتا تو تاریخ ادب میں ان کی صحیح قدر و منزلت کا تعین آسان ہوتا۔

واصفؔ عابدی سہارنپوری

نجمِ درخشندہ

بلبلِ بُستانِ ایماں، گلشنِ مدحت کے پھول — عصرِ حاضر کے "فرزدقؔ" شاعرِ آلِ رسولؐ
ترجمانِ آگہی اے علم وحکمت کے نقیب — تیری فطرت نے تراشے عقل ودانش کے اصول
منزلِ بیدار سے واقف ترا حُسنِ خیال — راحتِ کونین کا مرکز ترا قلبِ ملول

زیب دیتا ہے کہ تجھ کو نقشِ تابندہ کہیں
آسمانِ فکر کا نجمِ "درخشندہ" کہیں

۲۱ر دسمبر ۷۵ء کا دن دنیائے شیعیت کے لیے ایک درد وکرب کا پیغام لایا تھا۔ اس روز علامہ نجمؔ آفندی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی وفات پر ہندوپاک کے علمی وادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ شیعہ قوم کا معمار، آلِ رسولؐ کا فدائی، حسینیت کا نقیب دنیا سے اٹھ گیا۔ نباضِ عصر کی شمع حیات ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

نجمؔ آفندی کی وفات تاریخ ادب کا عظیم المیہ ہے۔ موت نے شیعہ قوم سے اس کی متاعِ حیات کو چھین لیا۔ مگر محرابِ عقیدت پر اس کا لکھا ہوا نام نہ مٹا سکی۔ لاکھوں دلوں پر اس کی یادوں کے نقوش چمک رہے ہیں۔ اس کے ادبی کردار نے روشنی کا وہ دریچہ کھول دیا جس سے فکر وشعور کی شعاعیں ابھرتی رہیں گی۔

حضرت نجمؔ آفندی نے اردو ادب کی بقا اور ارتقا کے لیے جو ادبی دستاویز مرتب کی، اس میں سرِ فہرست ان کے انقلاب آفریں نوحے اور وجد آفریں سلام نظر آتے ہیں۔ وہ تمام عمر شعر وسخن کے ذریعہ رسولؐ واہلبیتِ رسولؐ کی مدح وثناء کرتے رہے۔ ان کی سمتِ سفر واقعاتِ کربلا اور تعلیماتِ حسینیؑ کی نشر واشاعت سے متعلق رہی۔ حسینؑ کے عزم کا آئینہ دار یہ بوڑھا مجاہد زندگی کے آخری نفس تک نصرتِ

امام مظلومؑ کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ اور جب اس کا کام پورا ہوگیا، تو اس کا سفرِ حیات بھی ختم ہوگیا۔

نجم آفندی نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی، نظم وغزل، رباعی، قطعات، نعت، نوحے اور سلام پر ان کی فنکارانہ گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان تمام اصنافِ سخن کے گرد ان کی شاعرانہ عظمتوں کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اور ان کی عظیم صلاحیتوں کا ہر آسمان اَن گنت ادبی ستاروں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ہر لمحہ ان کی فکرِ رسا گلستانِ ادب میں نئے نئے گل کھلاتی رہی، اور ہر آن ان کا طائرِ خیال شعور وادراک کی بلندیوں سے گزرتا رہا۔ ان کی تخلیقی قوت فطرت کے رموز واسرار سے دنیا کو روشناس کراتی رہی۔ ان کے تفکر کی گھٹائیں زمین ادب پر جھوم جھوم کر برستی رہیں۔ صحیفۂ حکمت کا ان کے دل نازک پر نزول ہوتا رہا۔ اور ان کی حیات بارشِ الہام میں غسل کرتی رہی۔

مجھے حضرت نجم آفندی کا غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے، جب میری عمر بچپن کی سرحدوں سے نکل کر شباب کی وادی میں داخل ہوئی اور مجھے نجم آفندی کے نوحے سننے کا اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سہارنپور میں چھٹی ساتویں محرم کا جلوس علَم برداری بڑی شان وشوکت سے نکلتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل انجمن معین العزاء سہارنپور، ایام عزا وجلوس عزا میں نوحہ خوانی کرتی تھی، جن میں حضرت نجم آفندی کے نوحے کثرت سے پڑھے جاتے تھے۔ میرے دل میں اسی وقت سے حضرت نجم آفندی کی عقیدت ومحبت کے جذبات پرورش پانے لگے تھے۔ یہ اسی ''ایمان بالغیب'' کا تقاضا ہے کہ میرے قلبی تاثرات نوک قلم پر آگئے ہیں۔ اس غائبانہ تعارف کو محکم بنانے میں اس قسمی ملاقات کا بڑا دخل ہے جو قصبہ لکھنوتی، ضلع سہارنپور کے ''جلوس عماری'' کے سلسلے میں برادرم نوازش رضا حسین سکریٹری ''انجمن امامیہ'' قصبہ مذکور کے توسل سے فرمائشی نوحوں کے بارے میں مستقل دو تین سال تک جاری رہی۔ مرحوم کے خطوط میں ایمانی رشتوں اور بزرگانہ شفقتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ میں اور نوازش رضا، مرحوم کی مجاہدانہ زندگی اور مخلصانہ برتاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور محبت وعقیدت کے جذبات اور شدت کے ساتھ دلوں میں کروٹیں لینے لگے۔ اب جب کہ وہ اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما چکے ہیں، تو محبت وعقیدت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور ادبی ومذہبی کارناموں سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا جائے اور اس کام کو آگے بڑھایا جائے جس کو وہ قوم کے سپرد کر گئے ہیں۔

امام مظلوم کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ اور جب اس کا کام پورا ہوگیا، تو اس کا سفرِ حیات بھی ختم ہوگیا۔

نجم آفندی نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی، نظم وغزل، رباعی، قطعات، نعت، نوحے اور سلام پر ان کی فنکارانہ گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان تمام اصنافِ سخن کے گرد ان کی شاعرانہ عظمتوں کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اور ان کی عظیم صلاحیتوں کا ہر آسمان اَن گنت ادبی ستاروں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ہر لمحہ ان کی فکرِ رسا گلستانِ ادب میں نئے نئے گل کھلاتی رہی، اور ہر آن ان کا طائرِ خیال شعور وادراک کی بلندیوں سے گزرتا رہا۔ ان کی تخلیقی قوت فطرت کے رموز واسرار سے دنیا کو روشناس کراتی رہی۔ ان کے تفکر کی گھٹائیں زمین ادب پر جھوم جھوم کر برستی رہیں۔ صحیفۂ حکمت کا ان کے دل نازک پر نزول ہوتا رہا۔ اور ان کی حیات بارشِ الہام میں غسل کرتی رہی۔

مجھے حضرت نجم آفندی کا غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے، جب میری عمر بچپن کی سرحدوں سے نکل کر شباب کی وادی میں داخل ہوئی اور مجھے نجم آفندی کے نوحے سننے کا اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سہارنپور میں چھٹی ساتویں محرم کا جلوس علَم برداری بڑی شان وشوکت سے نکلتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل انجمن معین العزاء سہارنپور، ایام عزا وجلوس عزا میں نوحہ خوانی کرتی تھی، جن میں حضرت نجم آفندی کے نوحے کثرت سے پڑھے جاتے تھے۔ میرے دل میں اسی وقت سے حضرت نجم آفندی کی عقیدت ومحبت کے جذبات پرورش پانے لگے تھے۔ یہ اسی ''ایمان بالغیب'' کا تقاضا ہے کہ میرے قلبی تاثرات نوک قلم پر آگئے ہیں۔ اس غائبانہ تعارف کو محکم بنانے میں اس قسمی ملاقات کا بڑا دخل ہے جو قصبہ لکھنوتی، ضلع سہارنپور کے ''جلوس عماری'' کے سلسلے میں برادرم نوازش رضا حسین سکریٹری ''انجمن امامیہ'' قصبہ مذکور کے توسل سے فرمائشی نوحوں کے بارے میں مستقل دوتین سال تک جاری رہی۔ مرحوم کے خطوط میں ایمانی رشتوں اور بزرگانہ شفقتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ میں اور نوازش رضا، مرحوم کی مجاہدانہ زندگی اور مخلصانہ برتاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور محبت وعقیدت کے جذبات اور شدت کے ساتھ دلوں میں کروٹیں لینے لگے۔ اب جب کہ وہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما چکے ہیں، تو محبت وعقیدت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور ادبی ومذہبی کارناموں سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا جائے اور اس کام کو آگے بڑھایا جائے جس کو وہ قوم کے سپرد کر گئے ہیں۔

حضرت حجم آفندی کا سب سے بڑا کارنامہ اقوام عالم کو ''درسگاہ کربلا'' سے متعارف کرانا ہے۔ ان کے نوحے اور سلام، حریت فکر، اور جوشِ عمل کے پیغامبر ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے دوش پر ابوالفضل العباسؑ کا علم ہے اور قوم کو راہِ عزم وثبات کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں دلوں کو فتح کرنے والی اسلام کی وہ روحانی تلوار ہے جس کو عزائے حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس تلوار کی تعریف خود ان کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

بھر دیا جوشِ عمل اسلام کی تلوار میں
یا حسینؑ ابن علیؑ کا شور ہے جھنکار میں

چونکہ عزائے حسینی بقائے اسلام کی ضامن ہے، اس لیے ان کے دعوتی رخ کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے

چہرۂ روشن دکھا کر فطرتِ اسلام کا
کلمہ پڑھوا دو شہیدِ کربلا کے نام کا

فطرتِ اسلام کا روشن چہرہ اور شہیدِ کربلا کے نام کا کلمہ، یہ دونوں جزو، تاریخ دعوت وعزیمت کو اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہیں۔ حجم آفندی اب اِس تاریخ کے اُس آخری باب کو سامنے لاتے ہیں جس سے صبرِ حسینی کی معراج کا پتہ چلتا ہے :

خیمے سے لانے کو ہیں تحفۂ آخر حسینؑ
نذر کے سامان میں کوئی کمی رہ گئی
رن کو وہ اصغرؑ چلے گود میں شبیرؑ کے
لے کے بلائیں رباب درپہ کھڑی رہ گئی

یہ وہ بلندمنزل ہے جہاں سے شاعرِ اہلبیتؑ نے امام مظلومؑ کی عظمت کا تعارف کراتے ہوئے کربلا کے ننھے شہید کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ماں کی ممتا کی منظر کشی کی ہے۔

شاعرِ اہلبیتؑ اپنی منزل پہ پہنچ گیا۔ کاش ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔

○

سید معز الدین قادری الملتانی

نجم آفندی کی شخصیت اور ان کی شعری خصوصیات

تاریخ اردو ادب کا یہ المیہ ہے کہ بہت سارے شعراء کے حالات نہیں ملتے۔ زندگی میں اس طرف توجہ نہیں کی جاتی لیکن جب ادب کا کوئی طالب علم ان کے حیات وکلام پر تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو بہت ساری باتیں قیاسات کے سہارے متعین ہوتی ہیں اور تحقیق کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے، جس میں شاعر کی شخصیت سے کم، لیکن محقق کے علم وفضل، ذوقِ تحقیق واجتہاد سے زیادہ بحث کی جاتی ہے۔ علمی اسٹیج پر یہ تماشے اتنے عام ہو چکے ہیں کہ کسی ثبوت یا گواہ کی حاجت نہیں۔ اردو کے بہت سارے محقق اس صورت حال سے دوچار ہیں۔ مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ شاعر کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ ضبطِ تحریر میں آجائے۔ اس لیے کہ کسی بھی شاعر کے تخلیقی کارنامے تک رسائی اس کی شخصیت اور اس کے عہد کے پس منظر کے مطالعہ کے بغیر تحصیل حاصل کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

علامہ نجم مدظلہٗ بیسویں صدی کے آغاز میں سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے۔ ان کی زندگی کی کہانی زندگی کے سوز و ساز یعنی حدّت، حرارت اور حیات سے عبارت ہے۔ بے چینی، کش مکش اور انقلاب سے انہیں قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔ شعور زیست، مختلف تجربات سے گذر کر پختہ ہوا ہے۔ صرف نظریات کی ہمہ ہمی نہیں اور چند بے نام سی تمناؤں کی بازیافت معشوق کے پیکر میں جلوہ گر نہیں ہے، بلکہ ان کے ہاں غور وفکر کی ریاضت ہے۔ دانش وبصیرت کی دولت ہے۔ حیات وکائنات کی وسعتوں، کو عقل ودل کے فاصلوں کو ان کے فکر وفن نے اپنی جولانگاہ بنایا ہے۔ وہ

زندگی کے خارزاروں سے الجھتے بھی ہیں،نشیب وفراز، مدوجزر ہر سطح پر ان کے ساتھ ہیں، لیکن ان کی منزلیں اتنی روشن وتابناک ہیں کہ مصائب وآلام زادِ راہ بن جاتے ہیں۔ وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوتے ، انسانوں سے نا امید نہیں ہوتے ، اور کسی راہِ فرار یا گریزپا آدرش کو عنوانِ حیات نہیں بناتے، قدم قدم پر دانش مندانہ آگہی، حیات کے سرچشموں سے حیات کا راستہ جوڑتی ہے۔ یقین دائمی کو روایت کے طور پر نہیں، بلکہ ایک فعال اور حساس انسان کے صداقت پر مبنی تجربہ کی اساس پر پیش کرتے ہیں۔ یہ اپنے ماحول کے زبردست نقاد ہیں لیکن اس نقدونظر کے پیچھے نفرت وتعصب کے بجائے خلوص کے رواں دواں چشمے ہیں۔ آیئے دیکھیں یہ رنگ ونور یہ چمک دمک علامہ نجم کی زندگی میں کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے محرکات کیا ہیں۔

امیر خسرو اور میرزا غالب کی طرح نجم صاحب کے اجداد بھی تُرک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کے بزرگوں میں کون اور کب منگولیا سے ترک وطن کرکے ہندوستان آئے۔اور یہاں کس مقام پر سب سے پہلے بود وباش اختیار کی،فتنۂ تاتار نے جب ایشیائے کوچک اور ممالک اسلامیہ کو تہس نہس کرکے رکھ دیا تھا۔تو بہت سارے ذی علم اور صاحب کمال خاندان ہندوستان آئے ، اس لیے کہ کوہ ہمالیہ اس زمانہ میں واقعی ایک زبردست دیوار کی طرح ہندوستان کی حفاظت کررہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ نجم صاحب کے اجداد بھی اسی زمانے میں یہاں آئے ہوں۔علامہ نجم کے پردادا میرزا محمد ہادی فیض آباد کے محلّہ مغل پورہ میں رہتے تھے۔میرزا محمد ہادی کے تین لڑکے تھے۔۱۔میرزا جعفر علی فتیح ۲۔میرزا نجف علی بلیغ اور تیسرے صبیح۔میرزا جعفر علی فتیح کا زمانہ واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔میرزا فتیح سے ان کے قریبی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ خاندان فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا۔ امجد علی شاہ نے میرزا فتیح سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ تخت نشین ہوگئے تو انہیں منصب وزارت پر مامور کریں گے۔ نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے حقیقی چچا ۱۸۴۲ء تک حکومت کرتے رہے۔ ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں ان کے انتقال کے بعد سریر آرائے تخت سلطنت ہوئے۔میرزا فتیح نے اسی سال حج وزیارت کا عزم کرکے زادِ سفر ٹھیک کرلیا تھا اور بمبئی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جب امجد علی شاہ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے حسب وعدہ میرزا جعفر علی فتیح کو منصب وزارت پر مامور

کرنے کے لیے طلب کیا۔ آدمی دوڑائے گئے لیکن اس مردِ خدا نے جواب میں کہلوایا کہ میں ایک ایسے بادشاہ کے پاس جارہا ہوں جس کے آگے آپ بھی سر جھکاتے ہیں۔ میری واپسی کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔ امجد علی شاہ نے ایک خطیر رقم بھجوائی، جس سے میرزا فتیح نے حرم کے قریب قرارہ محلّہ میں ایک دومنزلہ مکان بنوایا اور اس کو زائرین حج کے قیام کے لیے وقف کیا۔ نواب عنایت جنگ نے اس مکان کو دیکھا ہے۔ ابن سعود کے زمانہ میں اس مکان کو شہر کی توسیع کے پلان میں شریک کرلیا گیا۔ میرزا فتیح حرم مقدس پہنچے اور وہیں کے ہورہے۔ اس امر کی شہادت آب حیات کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ملتی ہے، جس کو رام بابو سکسینہ[1] نے بھی اپنی تاریخ ادب اردو میں بخیہ دہرادیا ہے

''عہد مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے۔ میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، میاں فتیح۔ میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی اس لیے مرثیہ خوانی نہیں کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی انہوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا۔ میرزا فتیح حج وزیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے لیے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں۔''[2]

میرزا فتیح کو بروایت علامہ عجم، ناسخ سے غزل میں تلمذ تھا لیکن محمد حسین آزاد اور رام بابو سکسینہ نے ان کو ناسخ اور دلگیر دونوں کا شاگرد بتایا ہے۔ میرزا فتیح کا کلام اس دور میں بھی بڑے ہی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ساتویں محرم کو یہ سلام سننے میں آتا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

سلامی کربلا میں جب بنا ابنِ حسنؑ دلہا

اور یہ سلام بھی جس کا مطلع ہے:

کفن پہنے شہِ مظلوم کے انصار رن میں تھے
سلامی چاند سے وہ چہرے تابندہ کفن میں تھے

میرزا فتیح کی ہجرت کے بعد سے ہی میر ضمیرؒ استاد دبیر اور میر خلیقؒ والد میر انیس لکھنو

---

[1] رام بابو سکسینہ تاریخ ادبیات اردو صفحہ ۳۱۹ عشرت پبلشنگ لاہور۔

[2] آب حیات مصنفہ محمد حسین آزاد صفحہ ۳۸۲ گیارھواں ایڈیشن مطبوعہ مبارک علی لاہور۔

کے ادبی افق پر جگمگانے لگے۔ رام بابو سکسینہ میرزا فصیح کی ہجرت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

''اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ کوئی رہ گیا تھا''

اس جملہ سے میرزا فصیح کے مقام کا بھی تعین ہو جاتا ہے کہ وہ میر ضمیر اور میر خلیق کے پایہ کے مرثیہ گو سمجھے جاتے تھے۔ میرزا فصیح کا ایک شعر جو انہوں نے مدینہ کی حاضری کے موقع پر کہا تھا، ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

فصیح اگلے برس ہم تھے پیمبرؐ کے مدینے میں
کبھی روضے میں زائر تھے کبھی بیت الحزن میں تھے

کعبہ میں لکھا گیا ایک سلام کا مطلع بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگِ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے

میرزا فصیح کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن ان کے چھوٹے بھائی میرزا نجف علی بلیغ صاحبِ اولاد تھے۔ میرزا عباس تجلی ان کے لڑکے کا نام تھا۔ ان کے لڑکے میرزا عاشق حسین بزم ہیں، جو علامہ نجم آفندی کے والد ہیں۔ میرزا عاشق حسین بزم کی شادی آگرہ کے جس گھرانے میں ہوئی، وہاں بھی شعر وشاعری کا بڑا عمدہ مذاق پایا جاتا تھا۔ نجم صاحب کے نانا آغا حسین آغا آگرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں آغا حاجی حسن تھے جن کے نام سے آگرہ میں کٹرہ حاجی حسن مشہور ہے۔ یہیں ان کا گھر تھا۔ یہ مقام پیپل منڈی آگرہ کے پیچھے واقع ہے۔ آغا حسین آغا کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے جو خاصے مشہور بھی ہیں۔

۱ کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

۲ دیکھیں تو کس طرح نہیں ہوتا نہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

علامہ نجم کا نام میرزا تجمل حسین ہے، رمضان ۱۳۱۰ھ مطابق اپریل ۱۸۹۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مفید عام اسکول آگرہ میں تعلیم پائی۔ یہیں سے مڈل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس مدرسہ

کے اہم اساتذہ میں مولانا سلامت اللہ تھے جو اردو فارسی کے جید اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ راج کمار ہیڈ ماسٹر تھے اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ نجم صاحب کی مغرب بیزارگی اور انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کا تخم انہوں نے ہی بویا تھا۔ نجم صاحب اپنی تعلیمی زندگی کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ امبیکا پرشاد نامی ایک ہندو لڑکے سے کسی بات پر لڑائی ہوگئی۔ بات اتنی بڑھی کہ ان دونوں کو ہیڈ ماسٹر کے روبرو پیش کردیا گیا۔ راج کنور جی نے اس طریقہ سے تفہیم کی ''تم دونوں آپس میں لڑنے کے بجائے دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے۔ نجم صاحب نے اس نصیحت کو اپنی گرہ میں باندھ لیا۔ بچپن کا ایک چھوٹا سا واقعہ نجم صاحب کی زندگی میں بڑے ہی دور رس اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ جوں جوں شعور ترقی کرتا گیا اور ملک کے حالات مشاہدے میں آتے گئے، اس کی روشنی میں انہیں انگریزوں سے، ان کی تہذیب سے ایک بیر سا ہوگیا۔ ہندو مسلم اتحاد، بدیشی مال کا بائیکاٹ، وطن دوستی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی اور سماجی سطح پر انسانی مساوات، اخوت، سچائی، ایثار اور سلح جوئی کے میلانات ان کی فکر کے مذہبی دھارے کے ساتھ مل کر بین الاقوامی سطح پر انسان دوستی اور بقاء باہم جیسے معیارات ان کی زندگی کا نصب العین بن گئے۔

نجم صاحب نے زمانۂ طالب علمی میں اپنے ہم عمر دوستوں کی ایک انجمن بنائی جس کے رہنما اصولوں میں مغرب بیزاری، اور انگریزی تہذیب ومعاشرت سے عملاً گریز شامل تھے۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگھوٹھی پہنتے تھے تاکہ ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ شناخت کرسکیں۔ انگریزی ناولوں میں اس قسم کی بہت ساری انجمنوں کا حال ملتا ہے جن کے نجم صاحب بڑے ہی دلدادہ تھے۔ یہ خیال اسی مطالعہ سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے ہی ہتھیاروں سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ اس انجمن کے پندرہ بیس رکن بن چکے تھے۔ اس انجمن کے ایک رکن تھے میرزا بادشاہ علی جو نجم صاحب کے قریبی رشتے کے بھائی ہوتے تھے۔ ان کا تقرر اسی زمانے میں محکمہ پولیس میں ہوگیا۔ ان صاحب نے اپنی کارگزاری کے مظاہرہ کے لیے سب سے پہلے اپنے محکمہ کو اس حکومت بیزار انجمن کے بارے میں اطلاع دینی چاہی۔ نجم صاحب نے انہیں سمجھایا، رشتہ کا حوالہ دیا لیکن سب طریقے بیکار ہی ثابت ہوئے۔ ایک دن جب کہ اس انجمن کا اجلاس ہورہا تھا اور سب ارکان حاضر تھے، کسی نے اس بات کی خبر سب تک

پہنچادی۔ پھر کیا تھا سارے ارکان نے اس انجمن سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا اور اُٹھ کر چل دیئے۔ وہاں صرف ایک رکن باقی رہ گیا تھا جو ہمارے ان ہی علامہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

نوجوانی کا یہ واقعہ شباب کی انقلاب پسندی کا آئینہ دار تو ہے ہی، لیکن اس کا انجام بڑا چونکا دینے والا تھا۔ سماجی تعلقات اور دوستی ہمیشہ اصولوں کی جنگ میں مزاحم ہوتے رہے ہیں۔

نجم صاحب محکمہ ریلوے میں بحیثیت کلرک ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی ملازم ہوئے۔ ۱۹۲۵ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مسٹر نیومن ان کے افسر اعلیٰ تھے۔ ایک دن ان کی کھدر پوشی پر معترض ہوئے۔ نجم صاحب ان کے اعتراض پر بھڑک اٹھے۔ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ سزا کے طور پر ان کا تبادلہ آسنسول کر دیا گیا۔ نتیجہ میں علامہ نجم اس نوکری سے مستعفی ہوگئے اور عمر بھر کسی سرکاری نوکری کا ارادہ نہیں کیا۔ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں حیدرآباد آئے۔ ان کی آمد بھی ایک قومی کام کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ آگرہ کے ایک ایسے قبرستان کے قریب کی زمین سرکار کی طرف سے فروخت کی جارہی تھی جس میں شیعہ اور سنی دونوں اپنے مرنے والوں کی تدفین کیا کرتے تھے۔ اس زمین کو حاصل کر کے قومی کام کے لیے محفوظ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ فراہمی رقم کے لیے حیدرآباد کا سفر پیش آیا تھا۔ ان کے ساتھ حیدر مہدی بیرسٹر اور سید کلب عباس سکریٹری شیعہ کانفرنس بھی آئے تھے۔ اس سے پہلے ان کے والد میرزا عاشق حسین بزمؔ کئی بار حیدرآباد آچکے تھے اور یہاں ان کے دوستوں میں کئی رئیس موجود تھے۔ نواب شہید یار جنگ اور حکیم محمد عباس ان کو حیدرآباد کے جونیر پرنس نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ کے دربار میں لے گئے۔ نجم صاحب نے یہاں جو غزل سنائی تھی۔ اس کے تین شعر یہ ہیں۔

کعبہ و دیر سے پیام آئے
تیری جانب جو چند گام آئے
سن رہے ہیں تمہارا افسانہ
کہیں شاید ہمارا نام آئے
نجم صاحب کو راستہ دینا
مذہب عشق کے امام آئے

فانی بدایونی اس زمانہ میں پرنس کے پاس موجود تھے۔ حجم صاحب کو بھی دربار کی حاضری دینی پڑی اور اصرار کے ساتھ ان کو روکا گیا۔ یہ تعلق اصل میں ان کے مستقلاً قیام حیدرآباد کا باعث بنا۔

حجم صاحب نے قرآن اور اردو فارسی کی تعلیم تو اپنے رشتے کے چچا میرزا محمد ہادی سے حاصل کی، البتہ فن شاعری میں اپنے والد میرزا عاشق حسین بزم کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ میرزا عاشق حسین بزم منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۲ برس کی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ دکن میں قیام کو اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب یہ حیدرآباد ہی کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے ان کا تذکرہ ''دکن میں اردو'' میں ضروری سمجھا۔ لکھتے ہیں:۔

> ''میرزا تجمل حسین آفندی حجم تخلص آگرہ میں تولد ہوئے اور حیدرآباد آکر بس گئے۔ آپ کے خاندان میں چار پشتوں سے شاعری چلی آرہی ہے۔ حجم بارہ سال کی عمر سے شعر گوئی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد محترم بزم آفندی سے فن شاعری میں استفادہ کیا۔ اب کہنہ مشق قادرالکلام شاعر ہیں۔ قدیم مکتب خیال سے آپ کا تعلق ہے مگر اس کے باوجود موجودہ شعر و ادب کے تقاضوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ الفاظ کی بندش، محاورہ کی برجستگی، انداز بیان کی ندرت، مضمون آفرینی، رمزیت اور سوز و گداز آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں نظم ونثر کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔''

''آفندی'' سلطنت ترکی کی طرف سے دیا ہوا خطاب ہے جو حجم صاحب کے پردادا کے والد میرزا جعفر علی فتیح کو ان کی ان خدمات کی بنا پر دیا گیا تھا جو انہوں نے مکہ معظمہ میں انجام دی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی کو جب حکومت ترکی نے تمغہ مجیدی عطا کیا تھا، تو ان کے نام کے آگے بھی ''آفندی'' محکمہ ترکی کے سرکاری فرمان میں موجود ہے۔[1] حجم صاحب کے بیان کے مطابق چونکہ یہ خطاب نسلاً بعد نسلاً استعمال کے لیے عطا کیا گیا تھا، اس لیے ان کے خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ آفندی لکھتے ہیں۔ حجم صاحب نے مدحت اہل بیت میں اپنے خون جگر کو جلایا ہے،

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے سفرنامہ مصر و روم و شام از شبلی نعمانی صفحہ ۱۴۱ مطبوعہ قومی پریس دہلی

اس لیے ان کو شاعرِ اہلؑ بیت کے معزز اسم نسبتی سے بھی مفتخر کیا گیا ہے۔

خاندانی روایات، مذہبی تعلیم وتربیت، اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوش قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی وتمنا نے ان کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنا دیا ہے۔ نجم صاحب کو اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔

اس وقت عمر کے ۸۰ سال پورے کر چکے ہیں۔ سماعت میں تھوڑا فرق آ گیا ہے۔ پستہ قد، گول چہرہ، سرخ وسفید رنگ، چھریرا بدن لیکن مضبوط کاٹھی۔ آج کل نحیف ونزار ہو گئے ہیں اس کے باوجود چلتے پھرتے ہیں۔ آواز میں رعب اور چہرے پر مسکراہٹ۔ شعر تحت اللفظ سناتے ہیں۔ اور خوب سناتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز پوشیدہ ہیں۔

کشمیر سے کولمبو تک ہندوستان کے ظاہر وباطن سے خوب واقف ہیں۔ ہندوستان کانگریسی حضرات کا اگر کوئی گروپ بن سکتا ہے تو اس فہرست میں نجم صاحب کا نام شامل کیا جائے گا۔ گاندھی جی سے کئی بار مل چکے ہیں اور ان کے قدرداں بھی ہیں۔ دہلی، لکھنو اور حیدرآباد کی ثقہ روایات کا نمونہ ہیں۔ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں، اپنے دل سے محسوس کرتے ہیں اور انہیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے

میری تلاش راہ پر ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل مری گرد راہ کی

ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کی تشکیل جدید میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے دونوں فرقے سنی اور شیعہ کے مابین کسی بھی قسم کے افتراق کو پسند نہیں کرتے۔ باہمی یگانگت، وسیع المشربی، فراخ دلی اور صفائی قلب کو سماجی آدرش سمجھتے ہیں۔ انہیں سارے بنی نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقاید پر خود سختی کے ساتھ کاربند ہیں، لیکن سیرت وکردار میں کہیں بھی ''ملاپن'' یا ''پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سوانگ موجود نہیں ہے۔ بردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے۔ غزل،

قصیدہ، نعت، سلام، منقبت، رباعی، قطعات، غرض سارے اصناف سخن میں فکر شعر کرتے ہیں۔

کانپور کے ایک خاندان میں شادی کی۔ جملہ ۵ لڑکے ۷ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک لڑکی اور ۴ لڑکے جاتے رہے۔ ان کے فرزند سہیل افندی جو شاعر بھی ہیں۔

نجم صاحب شعر کی تخلیق کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

جس عالمِ بالا سے خبر آتی ہے　　عارف کے دل میں نور بن جاتی ہے
گر ترکِ ادب نہ ہو تو یہ بھی کہدوں　　شاعر کی زباں پہ شعر کہلاتی ہے

خالص فنی نقطۂ نظر سے بھی کسی دانشور کی بصیرت، کسی عارف کی یافت اور کسی شاعر کے پس پردہ محرکات کا جائزہ لیا جائے تو یہ عجیب وغریب قوت مختلف صورتوں میں جلوہ گر نظر آئے گی۔ معلوم ہوا کہ شاعری اکتسابی شے نہیں ہے بلکہ وہبی ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے مضمون اصول تنقید میں ڈاکٹر رچرڈسن کا ایک قول نقل کیا ہے۔

''نقاد کو ذہن کی صحت سے اسی قدر تعلق ہے جتنا ڈاکٹر کو جسم کی صحت سے ہوتا ہے''[1]

نجم صاحب فرماتے ہیں:۔

لازم ہے کہ ہو ذوقِ طلب صحت مند　　آئینِ حیاتِ روز و شب صحت مند
حکمت کا تقاضا ہے یہ شاعر کے لیے　　کردار صحیح ہو ادب صحت مند

نجم صاحب کے ہاں اس صحت مندی کا ایک متعین مفہوم موجود ہے جو ان کے مذہبی معتقدات، سماجی شعور، اور گہرے مشاہدات کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ شاعر کی خیالی آوارگی، غیر ذمہ داری اور بے کرداری کو وہ ادبی صحت مندی کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

تو قوم کی اصلاح پہ آمادہ ہے　　یا شہرتِ تحریر کا دلدادہ ہے
نظموں کا یہ انبار مضامین کی پوٹ　　بکواس ہے جب دل کا ورق سادہ ہے

''دل کا سادہ ورق'' اپنی بلاغت کے اعتبار سے بے پناہ معنوی وسعت کا احاطہ کئے

---

[1] شعور تنقید صفحہ ۱۰۶، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

ہوئے ہے۔ خلوص کا فقدان، فکری کارنامے کو واقعی ''بکواس'' بنا دیتا ہے۔ یہ خلوص وہی ہے جسے غالبؔ نے ''دل گداختہ'' سے تعبیر کیا ہے اور حالیؔ نے سادگی اور اصلیت سے۔

شاعری کے اسلوب و اظہار پر بھی نجم صاحب کے خیالات نہایت ہی واضح ہیں۔ فرماتے ہیں:

سب فلسفۂ حیات کہہ دیتا ہوں　　اک حرف میں کائنات کہہ دیتا ہوں
شاعر ہوں مجھے دماغ تفصیل کہاں　　سو بات کی ایک بات کہہ دیتا ہوں

شاعرانہ اظہار کی یہی وہ صلاحیت ہے جو شاعری کو نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ اس ایجاز و اختصار کی تہوں میں فنی شعور کے ساتھ ساتھ فکری خلوص بھی موجود ہے، لیکن اس کے باوجود انانیت ان کے ہاں پھٹک نہیں پاتی۔ فرماتے ہیں:

آسان ہے اللہ سے منکر ہونا　　یا معرفتِ نبیؐ سے قاصر ہونا
اس شان سے اپنی شاعری کا اقرار　　جیسے کہ بڑا فخر ہے شاعر ہونا

لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے منصب و مقام کا پورا عرفان ہے فرماتے ہیں:۔

شاعر ہوں مذاقِ رنگ و بو کہتا ہے　　خود دار ہوں طرزِ گفتگو کہتا ہے
اس وقت میں دیتا ہوں نظر کو زحمت　　جب حُسنِ نگاہ روبرو کہتا ہے

شاعر کی نگاہ میں اخذ و اکتساب اور ترک و اجتناب کی بڑی اہمیت ہے۔ شاعر کے سامنے موضوعات کی ایک لامتناہی وسیع و عریض دنیا رہتی ہے۔ وہ ہر ذرّہ کو موضوع بنا سکتا ہے اور ہر لمحہ کو محفوظ کر سکتا ہے۔ اس کے احساسات اور جذبات کے دھارے بھی متنوع ہو سکتے ہیں، لیکن اہمیت ان شعراء کی ہے جو اپنے موضوعات کے انتخاب میں محتاط ہوں اور کچھ اصول رکھتے ہوں، جن کی روشنی میں وہ جانچ پڑتال بھی کر سکیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تخیل و جذبات کی سرحدیں ملتی ہیں۔ تخلیق کی فضا بنتی ہے، ماحول کا مطالعہ حیات و کائنات کو اس طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے کہ شاعر کے سامنے فطرت کے رموز بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ نجم صاحب نے ان وادیوں میں برسوں جادہ پیمائی کی ہے۔ حاصل سفر ان کے یہ اشعار ہیں:

ڈوبا ہوا غم میں ہوں ابھرنے کے لیے　　آئینِ حیات وضع کرنے کے لیے

مرمر کے میں جی رہا ہوں کتنے دن سے ایک قابلِ رشک موت مرنے کے لیے

دنیا پہ ستم نفس پہ بیداد کرے بھولے سے نہ اصل اپنی کبھی یاد کرے
جیسے تری تخلیق ہیں یہ رات یہ دن جس طرح سے چاہے انہیں برباد کرے

ان کی مذہبیت، گوشہ گیری یا راہبی کی اسیر نہیں۔ ایک حساس اور فعال انسان کے صحت مند ذہن کی آئینہ دار ہے، جس کی گرفت سماج پر، حیات اور اس کے متعلقات پر، بلکہ ساری کائنات پر بے حد مضبوط ہے۔ مایوسی یا نامرادی کے بجائے ایک صحت مند رجائیت ان کے ہاں ملتی ہے۔ مناظرِ قدرت میں صبح کا جلوہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نجم صاحب نے اس سے کیا عمدہ فائدہ اٹھایا ہے:

نعمت ایک ایک یاد آسکتی ہے دل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سوغم تیرے اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

امن عالم کے خلاف کتنے چنگیز وہلاکو گذر چکے ہیں۔ ہٹلر اور دوسرے فاشسٹ آمرین کو زمانہ بھلا نہیں سکتا۔ ان کے معنوی جانشین آج بھی دوسرے ناموں کے ساتھ موجود ہیں، لیکن نجم صاحب کا ایقان دیکھئے فطرتِ انسانی کا کتنا عمیق مطالعہ ہے۔ سادہ و پُرکار انداز میں ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ان کا پیغام اور ان کا آدرش رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

زخمِ دلِ ناتواں سیو سینے دو جی بھر کے مئے سکوں پیو پینے دو
کوشش بے جا ہے امنِ عالم کے خلاف مفہومِ حیات ہے جیو جینے دو

ان کے بعض تجزیئے شعری صداقت کے ساتھ ساتھ واقعات کی ایسی عمدہ تصویر پیش کرتے ہیں کہ بات دل پر نقش ہو جائے۔ چار مصرعوں میں تاریخ کے اس المیہ کو محفوظ کرلیا ہے

ہر سمت نظر میں جوئے خوں آتی ہے سرگزشتۂ جستجوئے خوں آتی ہے
تہذیب وزباں تجارت وقوم و وطن ان لفظوں سے آج بوئے خوں آتی ہے

شاعر کو اس کے اسباب وعلل سے زیادہ غرض نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ آپ کا کام ہے کہ آپ سوچیں۔ ایک لمحۂ فکر یہ ہے، ایک سچی تصویر ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ انسان ہی کو سمجھتے

ہیں۔ اس اخلاقی بگاڑ کے نتائج کو مناظر قدرت کے ساتھ مربوط کر کے انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یہ صبح کی تازگی یہ آرام کی رات　　گرمی سورج کی چاندنی کی برسات
سب کے دامن پہ ہیں لہو کی چھینٹیں　　انساں نے بگاڑ دی ہے تصویرِ حیات

ان کے رباعیات وقطعات کے موضوعات اتنے متنوع اور دلکش ہیں کہ ہر رباعی اور قطعہ، اورکوئی نہ کوئی اہم موضوع پاکیزہ زبان اور دلکش اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر رباعی یا قطعہ کو ایک عنوان بھی دیا گیا ہے۔ ان رباعیات وقطعات میں فکروفن کے شاندار تجربے بھی ملتے ہیں اور استادانہ شانِ سخن کے جلوے بھی۔ ان کو ہم مختصر نظم بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے عنوان سے اس قدر چست ہے کہ معنوی ربط کے لیے کسی خارجی تفہیم کی قطعاً ضرورت نہیں۔شعری محاسن بھی جابجا موتیوں کی طرح سجے سجائے اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔صنعتیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ ان کے ہاں طنز بھی ملتا ہے لیکن بے حد سنجیدگی کے ساتھ۔ اس کی سطح قطعاً جذباتی نہیں ہے۔ ریاضت فکر اور اپنے مقصد سے خلوص کی گرمی، ان سنجیدہ اور تیکھے انداز کو پیدا کرتی ہے، تلخی مشاہدے کی ہے لیکن بے حد مہذب، ثقہ اور سنجیدہ۔فرماتے ہیں:

کس کام کے ہیں یہ بندہ پرور جلسے　　یہ قوم کے چندے سے تونگر جلسے
بھوکے مرتے ہیں کتنے مفلس مجبور　　ماتم ہے گھروں میں اور باہر جلسے

یا یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

وہ دینِ الٰہی کا سفینہ منبر　　تطہیرِ حیات کا قرینہ منبر
اس عہد میں دیکھتا ہوں اللہ اللہ　　دنیا کی ترقی کا ہے زینہ منبر

ان کے پاس مزاح کی لطیف چاشنی بھی ملتی ہے، لیکن لب آسا مسکراہٹ سے زیادہ نہیں، لیکن اس میں طنز ضرور شامل رہتا ہے۔

آج کہلاتی ہے بے راہ روی اسٹائیل
اب زمانے کو ہے مرغوب یہی اسٹائیل

بات اکھاڑے سے یہ بزم شعراء تک پہنچی۔شعر بھی ہونے لگے اب تو فری اسٹائیل۔ججم

صاحب با مقصد شاعر ہیں، اپنے ماحول کے عکاس اور نقاد ہیں۔ ان کے آدرش اور اصول بے حد واضح ہیں۔ ان میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اپنے معاصرین میں اس حیثیت سے منفرد بھی ہیں کہ خاموشی کے ساتھ اپنے مقصد کی شمع روشن کیے اجالوں کے تصور سے مردہ انسانیت کو نئی زندگی بخشنا چاہتے ہیں۔ ان کے پیغام کو مجمل انداز میں ملاحظہ فرمائیے:

وہاں اے دوست کس دل سے ادا ہے جشن آزادی — جہاں انسان ملک وقوم کی تفریق فرمائے
ہمارا قصد بھی ہے یومِ آزادی منانے کا — اگر ہر ملک میں انسانیت کا راج ہو جائے

ملت بیضا سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے بہتر حل اس بگڑی ہوئی قوم کے لیے شائد ہی ہو سکے۔ ساری امت کا اس پر اجماع ہے۔ رنگ ونسل، قوم ووطن اور زبان کی اساس پر اتحاد کے نتائج آج سب کے سامنے ہیں، لیکن اتحاد واخوت کی جو اساس اس قطعہ میں پیش کی گئی ہے، اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے:

تاریکیاں ہیں ملتِ بیضا کی تاک میں — کچھ قوم کی حیات کا سامان کیجئے
سرکارِ دو جہاںؐ کی محبت کے نام پر — آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے

بنی نوع انسان کے لیے مذہب کا پیغام بھی ملاحظہ فرمائیے جو بلا امتیاز نسل ورنگ ومذہب وقوم قابل قبول ہی نہیں ہے، بلکہ اگر اس صداقت کو عام کر دیا جائے تو شاید مستقبل کے کئی ایک خوفناک مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ فرماتے ہیں:

بنی آدم ہیں سب لیکن یہ کیسی آدمیت ہے — فسادوں کے لیے دوون کی دنیا میں بھی فرصت ہے
لڑائی اختلافِ مذہب وملت پہ کیا معنی — جسے کہتے ہیں مذہب وہ محبت ہی محبت ہے

ان کی رباعیات وقطعات، فلسفہ اخلاقیات، عمرانیات، سیاسیات ومذہب کے مختلف گوشوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حدود ادب سے خارج نہیں۔ ان کی سب سے پہلی اہمیت ادبی ہی ہے۔ نجم صاحب کی شاعرانہ شخصیت افکار عالیہ کے لباس میں اور بھی جاذب نظر بن گئی ہے۔ اسرار وافکار اردو ادب کے ادب عالیہ میں ایک اضافہ ہے جو فن کی لطافتوں اور زبان کی نزاکتوں سے معمور ہے۔ اور یہ گرتو واقعی تشکیک وتضاد کے اس دور میں سوچنے اور سمجھنے کی کئی راہیں آسان کر دیتا ہے:

رشتہ بہت ہے نازک تکمیلِ دوستی کا　　میں گُر بتا رہا ہوں آسان زندگی کا
رہنا بہت ہی کم ہے اس منزلِ عمل میں　　ہو دوست ایک ہی کا دشمن نہ ہو کسی کا

نجم صاحب نے بہت ساری رباعیات اور قطعات کسانوں، مزدوروں اور مفلس انسانوں کے مسائل پر بھی کہی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مزدور دوستی اور مادہ پرستی وخدا بیزارگی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔ مزدوروں کے اجارہ دار، کسانوں کے غمگسار صرف وہی سمجھے جاتے تھے جو ایک خاص نظام فکر کے شیدائی ہوں۔ مذہبی اور روحانی اقدار پر یقین رکھنے والوں کو رجعت پسند اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ قرار دیا جاتا تھا۔ نجم صاحب کے سامنے ایسی کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگئیں، لیکن نجم صاحب اپنی تمام صداقتوں کے ساتھ اپنے مسلک پر آج بھی قائم ہیں۔ نجم صاحب مذہب پر روحانیت کا گہرا ایقان رکھتے ہیں، لیکن شروع سے ان کی ہمدردیاں مظلوم انسانوں، بے کس مزدوروں اور مفلس کسانوں کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ قصور سارا ان اصولوں کا ہے اور اس نقطۂ نظر کا ہے کہ سماجی ناانصافیاں مذہب کی پیدا کردہ ہیں۔ اس مفروضہ کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ثبوت میں نجم صاحب کے یہ شعر پیش کیے جاسکتے ہیں:

انسان کی جنسِ خام کہلاتے ہیں　　نا قابلِ احترام کہلاتے ہیں
سیدھے سچے جری جفاکش مزدور　　کیا ظلم ہے یہ عوام کہلاتے ہیں

افلاس پہ مامور نظر آتا ہے　　مرکز سے بہت دور نظر آتا ہے
دستور بدل گیا حکومت بدلی　　مزدور بدستور نظر آتا ہے

جب لطفِ حیات میں کمی پاتا ہے　　جب شدتِ آرام سے تھک جاتا ہے
منعم تجھے اس وقت بھی بھولے سے کبھی　　مزدور کی محنت کا خیال آتا ہے

آزاد کو اک قید ہے فغفوری بھی　　ہے بارِ گراں قبائے دستوری بھی

تو اپنے لیے جگہ معین کرلے　　دنیا میں غلامی بھی ہے مزدوری بھی

دنیا ہمدرد آج مزدور کی ہے　　حالت یہی چار سمت جمہور کی ہے
تیرہ سو برس سے کہتے آئے ہیں یہ ہم　　اب سمجھے ہو تو تم بات ذرا دور کی ہے

کشمیر پر اثر لکھنوی کی ایک اچھی رباعی مشہور ہے:

کشمیر کے مرغزار اللہ اللہ　　شاداب وہ کوہ سار اللہ اللہ
جنگل کے خموش ہمہمے کی ہیبت　　دھڑکا دلِ جوبار اللہ اللہ

حجم صاحب بھی کشمیر جاتے ہیں۔ کشمیر جنت نظیر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے وا ہے۔ خوشنما منظر، خوبصورت جھیلیں اور خوشگوار موسم، تخلیقِ شعر کے تمام اسباب مہیا ہیں، لیکن شاعر کی نظر اہل کشمیر سے صرفِ نظر نہ کرسکی۔ فرماتے ہیں:

سونا چاندی پگھل رہا ہے تو کیا　　محلوں میں چراغ جل رہا ہے تو کیا
اہلِ کشمیر سیر و سیراب نہیں　　شاہی چشمہ اُبل رہا ہے تو کیا

یہ رباعی ۱۹۴۱ء کی ہے جب کہ کشمیر میں افلاس اور جہالت اپنے عروج پر تھے۔ شاعر کے احساسات کشمیر کے دلکش روزوشب میں الجھ کر نہیں رہ گئے بلکہ شاعر کا سماجی شعور اہل کشمیر کے حال زار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ان کی سیر کشمیر، ان کے معیارِ نظر اور انسان دوستی کا واضح ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کشمیر میں کیا شام و سحر کی ہم نے　　اک آہ کی جس سمت نظر کی ہم نے
کانٹوں میں کسی کی یوں نہ گذری ہوگی　　جس درد سے پھولوں میں بسر کی ہم نے

اس قسم کی بیسوں مثالیں حجم صاحب کے حیات وکلام سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

حجم صاحب انسانیت اور آدمیت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

ان کا تصور انسانیت ملاحظہ فرمائیے:۔

بے جا طلب سے زعمِ سخا سے بلند ہے　　فکرِ حیات و خوفِ قضا سے بلند ہے
مسجود ہے ملک کا تو اے بندۂ خدا　　تیرا مقام شاہ و گدا سے بلند ہے

بندۂ خدا جو تجود ملائک ہے، اس کو دنیا کے بنائے ہوئے اعتبارات شاہ و گدا سے ممیّز کر کے پستی و بلندی کے مفروضہ امتیازات کی بنیاد بلادی ہے۔ انسان کا بندۂ خدا ہونا ہی اس کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ اگر انسان کو اس کا احساس نہیں ہے تو پھر اس کا حال جو ہوتا ہے اسے خود حجم صاحب کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے:۔

کیا راہِ غرض میں لوٹتا جاتا ہے　　کیا کمتر و ناچیز بنا جاتا ہے
اللہ کے آگے نہیں جھکتا جو سر　　بندے کے حضور میں جھکا جاتا ہے

حجم صاحب توصیفِ پیمبر کو ادب کی معراج سمجھتے ہیں۔ مقام رسالت کا عرفان ان کے ایک شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔

صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر　　اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا

اسرار و افکار میں ان کی بہت ساری رباعیات، جو خاتمِ رسالتؐ، خیر البشرؐ، فخر انبیاء، سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہی گئی ہیں، شامل ہیں۔ اسلام سے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلبیتِ اطہار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ان کی وابستگی محض روایتی نہیں ہے، بلکہ شعوری ہے۔ وہ اس کسوٹی پر حیات و کائنات کو پرکھتے ہیں۔ ان کے فکر و خیال اور ادب و فن میں سارے جلوے اسی نور کے ہیں۔ ان کی وضعداری ہو کہ ان کی خودداری، اسی سرچشمے سے فیض یاب ہے۔ زمانے کے گرم و سرد نے اس کی اہمیت اور ضرورت کو ان کی نگاہوں میں اور بھی بڑھا دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

انسان کی عظمت کے نگہبان بھی ہو　　مسلم ہو سلامتی کا عنوان بھی ہو
اسلام پیام امن ہے یاد رہے　　سنّی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

بھارت ہے چمن جانِ چمن ہیں ہم لوگ　　کیا قابلِ شرط و ریب وطن ہیں ہم لوگ
آپس میں بھی مول تول ہوتا ہے کہیں　　اس دیس کے انمول رتن ہیں ہم لوگ

ان کا مشاہدہ کس قدر سچا ہے۔ وہ قوم کے زوال کا افسانہ سنا کر ہمتوں کو پست بنانا نہیں چاہتے، بلکہ قدم قدم پر اس کی بیداری کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ صحیح تشخیص کے بغیر علاج کا

تصورمحال ہے۔

کس طرح بدل گیا یہ معیارِ حیات　　کیوں سرد ہوئی گرمیِ بازارِ حیات
جس قوم نے سر کی مہمِ کرب وبلا　　اس قوم میں ملتے نہیں ہیں آثارِ حیات

بھارت کی اکثریت کے سامنے نجم صاحب کی یہ آواز بڑے ہی خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کے لیے نجم صاحب کی ذات مستغنا میں سے ہے۔ ان کی کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ایک وقت آئے گا کہ ان کی صحیح قدروقیمت کا اندازہ سب کو ہوجائے گا۔ ویسے وہ اپنی تاثیرِ شعر کے بارے میں مطمئن ہیں اور یہ استغنائی کیفیت ہم کو نجم صاحب سے بہت قریب کردیتی ہے۔

جب زیرِ زمیں سُلا کے آئے گا مجھے　　دو چار قدم میں بھول جائے گا مجھے
اس دن ترا حافظ ہے خدا ہی اے دوست　　جب میرے کسی شعر میں پائے گا مجھے

نجم صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان کے کلام کے تفصیلی جائزے کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم ان کی چند ایسی رباعیات کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے اردو کے دامن میں وسعت وتجربے کی مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان رباعیات کو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے اور دونوں زبانیں دعویٰ کریں گی کہ یہ میری زبان ہے۔

جب تک میری زباں میں رس ہے سُن لے　　جب تک سننے پہ تیرا بس ہے سن لے
سنسار کو سکھ ملا ہے میرے دُکھ سے　　میرے دکھ میں پریم رس ہے سن لے

سنسار کی ریت ناپی جوکھی سمرن　　مالا کا وہ پھیر وہ انوکھی سمرن
ہم جانیں سکھی ہمارا سائیں جانے　　من کی سمرن ہے سب سے چوکھی سمرن

ست کی بنسی بجائے جاؤ ساتھی　　سوتی دنیا جگائے جاؤ ساتھی
کتنا بھی ہو بوجھ بھار تھکنے کے نہیں　　سیوا کی ڈگر پہ گائے جاؤ ساتھی

مایا مائی ہے اور لونا ہے تو سنسار کی ہاٹ میں کھلونا ہے تو
سمجھا ہی نہیں آپ کو مورکھ لوبھی باہر بھیتر تمام سونا ہے تو

تجمّم صاحب کی ذاتِ گراں مایہ بھی ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے ہے۔ یہ آب ورنگ، یہ روپ ونکھار صرف مطالعہ کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اور مطالبات بھی ہیں۔ وہ کیا ہیں یہ میں نہیں بتلاؤں گا۔ اگر آپ حساس ہیں، باشعور اور حق پرست ہیں تو آپ خود بخود ان آدرشوں کو اپنائیں گے جنہیں تجمّم صاحب نے سلیقہ کے ساتھ اسرار و فاکار کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حیدرآباد اپریل ۱۹۷۱ء سید معزالدین قادری الملتانی

○

قدر عریضی

تعارف نجم آفندی

شاعرِ اہلبیتؑ علامہ نجم آفندی کا تعارف کروانا اور ان کی ہمہ گیر و پہلو دار شخصیت کا مکمل جائزہ لینا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کرم کرنے والا کسی پر اس کی نمود سے کرم کرتا ہے تو کسی پر زمانہ طفولیت سے، کسی پر عالم شباب میں کرم کرتا ہے، تو کسی پر پیرانہ سالی میں۔ شعر و ادب کے میدان میں علامہ نجم نوعمری ہی سے خالقِ کائنات کے کرم کا مرکز بن گئے۔ میر انیسؔ کی طرح حضرت نجمؔ کو بھی شاعری ورثے میں ملی۔ جس طرح میر انیسؔ نے کہا تھا

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

اس دشت کی سیاحی میں ان کے آباواجداد کی طویل عمریں بیت چکی ہیں۔ مرزا عاشق حسین بزمؔ آفندی، حضرت نجمؔ کے والد ماجد فن شعر میں اپنے دور کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ مرزا عباس تلیحؔ حضرت نجمؔ کے جد اور مرزا نجف علی بلیغؔ جدِ اعلیٰ تھے۔ علامہ نجمؔ کے نانا مرزا آغا حسین آغاؔ، صاحبِ دیوان اور قادرالکلام شاعر تھے جن کا شمار چوٹی کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ موصوف کے یہ دو شعر آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

دیکھیں کہ کس طرح نہیں ہوتا انہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

انیسؔ اور دبیرؔ کی طرح تلوکؔ اور بلیغؔ بھی اپنے دور کے مایہ ناز مرثیہ نگار اور استاد فن گذرے ہیں۔ حضرت تجمؔ اور ان کے آباواجداد کا وطن اکبرآباد (آگرہ) ہے۔ سرزمین آگرہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اردو شاعری کے وہ اساتذہ جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے، اسی خاک سے اٹھے۔ میر تقی میرؔ کا مولد آگرہ ہے۔ نظیرؔ اکبرآبادی آگرے ہی کی امانت ہیں۔ مرزا غالبؔ بھی آگرے ہی میں پیدا ہوئے اور آٹھ سال کی عمر میں دلی آگئے۔ سیمابؔ اکبرآبادی کا وطن بھی آگرہ ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ کئی مشاہیر زمانہ اور اکثر سیاسی قائدین بھی اسی خاک سے اٹھے۔ ابوالفضل اور فیضیؔ کا وطن بھی آگرہ ہے۔ پنڈت موتی لعلؔ نہرو آگرہ ہی میں پیدا ہوئے۔ آگرہ ہی میں دریائے جمنا کے کنارے ''آگر بند'' وہ تاریخی مقام ہے جہاں شری کرشن جی نے محبت کی بنسری بجائی تھی اور گیتا کی تدوین کی۔ عجائبات عالم کا حسین ترین عجوبہ ''تاج محل'' جو سارے عالم میں حسن کا شہکار مانا جاتا ہے، آگرے ہی میں ہے۔ ''آگر بندوتاج محل'' کی طرح آگرے کے شعراء، ادباء اور اہل علم وفن دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اسی پس منظر میں ادبی دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت تجمؔ کے مجموعۂ رباعیات ''اسرارو افکار'' کو دنیائے اردو ادب کا تاج محل کہا جائے۔ حضرت تجمؔ کی شاعری کی عمر ہمارے بیشتر شعراء کی عمروں سے زائد ہے۔ انہوں نے کم وبیش چھ دہوں سے شعروادب اور زبان کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردیا ہے۔ نہ صرف حیدرآباد، بلکہ ہندوپاکستان میں حضرت تجمؔ کے مرتبہ کا پختہ مشق وقادرالکلام شاعر کوئی نظر نہیں آتا۔ حضرت تجمؔ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے، جن میں کے اکثر خود بھی استاد ہیں۔ حضرت تجمؔ کو ارباب علم وفن کی جانب سے شاعرِ اہلبیتؑ کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ وہ گرانقدر خطاب ہے جو عرب کے مشہور شاعر فرزدقؔ کو حاصل تھا۔ بعض ناواقف حضرات، حضرت تجمؔ کو صرف نوحہ نگار، سلام نگار یا مرثیہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ چنانچہ مرحوم مخدوم محی الدین نے الیسٹریٹڈ ویکلی (Illustrated Weekly) میں چھپے شعراء کے ایک تعارفی مضمون میں علامہ تجمؔ کا تعارف ایک مرثیہ نگار کی حیثیت سے کروایا ہے جو حقیقت سے بعید اور انصاف کے مغائر ہے۔ حضرت تجمؔ نے جملہ اصناف سخن کو اپنے کلام سے مالا مال کیا ہے۔ غزل، نعت، منقبت، سلام، مثنوی، قصیدہ رباعی وقطعات کے مسلم الثبوت اساتذہ میں وہ

اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس میں حضرت نجم کا کلام موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ آپ کے وسیع میدان شعروفکر میں ترقی پسند شاعری بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ نظم کی طرح آپ نے نثر کو بھی نوازا ہے۔ جس میں ناول، اخلاقی ومذہبی مضامین، تاریخ وتمدن سب ہی شامل ہیں۔ چنانچہ آپ کی ۲۷ کتابیں نظم ونثر کی منظر عام پر آچکی ہیں، اورعوام وخواص میں کافی مقبول بھی ہیں۔

حضرت نجم نے اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک صحبت میں بتایا کہ جب وہ مفید عام اسکول آگرہ کی چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، ان کی لڑائی ایک ہم جماعت ہندو ساتھی سے ہوئی۔ نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ یہ قضیہ صدر مدرس تک پہنچا۔ دونوں اس بات پر اڑے رہے کہ پہلے تم نے مارا۔ اس بات کو سن کر صدر مدرس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا کہ ''تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے'' سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے حضرت نجم نے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے حریف نے اس جملہ کا کیا مفہوم سمجھا۔ مگر میرے دل پر دہ نقرہ نقش کالحجر ہوگیا اورفوراً میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کررہے ہیں اور اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔ اس واقعہ سے نجم صاحب کی طفولیت کی فراست، نکتہ دانی اور کمال شعور کا پتہ چلتا ہے۔ جب عقل کی پختگی کا زمانہ آیا تو نجم صاحب نے ایک سوسائٹی قائم کی جس سے انگریز سامراج کے خلاف پروپیگنڈہ مقصود تھا۔ سوسائٹی کے اراکین کی شناخت کے لیے خاص نمونے کے نقروی چھلے بنائے گئے تھے۔ اور مخصوص اشارے بھی مقرر تھے تاکہ اراکین آپس میں بہ آسانی ایک دوسرے کی شناخت کرسکیں۔ اس سوسائٹی کا واحد مقصد انگریز سامراج کے خلاف ہندوستانیوں کو متحد کرنا تھا۔ اس سوسائٹی کے ایک سرگرم رکن حضرت نجم کے خالہ زاد بھائی بھی تھے جو کچھ عرصہ بعد پولیس کے انسپکٹر بن گئے اور انہوں نے سوسائٹی سے نہ صرف قطع تعلق کرلیا بلکہ یہ بھی کہا کہ بلحاظ فرائض ملازمت وہ اس سوسائٹی کی اطلاع حکومت کو دے دیں گے۔ یہ سن کر تمام ممبر مستعفی ہوگئے اور نجم صاحب تنہا اس کے رکن رہ گئے۔ ان واقعات سے حضرت نجم کی جرأت و بے باکی اور احساس حب الوطنی کا

اظہار ہوتا ہے۔

حضرت تجمّل کی پختہ مشقی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں یادگارِ مومن و نسیم، منشی امیر اللہ تسلیم کے ساتھ ایک مشاعرے میں کلام سنانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت تجمّل نے اس مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ اللہ جب اس زمانے کا خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں سو برس سے جی رہا ہوں۔ اس واقعہ کے تسلسل کو یوں شروع کیا کہ مشاعرے میں سامعین اور شعراء کی تعداد کافی تھی اور سب حضرت تسلیم کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد موصوف، جن کی عمر تخمیناً ایک سو سال کی ہوگی اور شاگردوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تشریف لائے اور مسند صدارت پر متمکن ہو گئے۔ اس مشاعرے میں اس دور کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ کئی شعرا نے کلام سنایا۔ آخر میں حضرت تسلیم کی صدارتی غزل ان کے شاگرد نے سنائی کیونکہ بوجہ کبیر سنی حضرت تسلیم کے اعضاء و زبان میں رعشہ تھا، اور وہ خود اپنا کلام نہیں سنا سکتے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر شعراء اور سامعین بیٹھے رہے اور سب کی یہ خواہش تھی کہ حضرت تسلیم اپنی زبان سے کم از کم دو شعر سنائیں، لیکن کسی میں جرأت نہ تھی کہ حضرت تسلیم سے ایسی خواہش کر سکیں۔ تجمّل صاحب نے فرمایا کہ حاضرین مشاعرہ، شعراء اور سامعین کی دلی خواہش کا جب مجھے اندازہ ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرات کو حضرت تسلیم کی زبان سے دو شعر میں سنوا دیتا ہوں۔ اس پر اکثروں نے مسکرا دیا اور بعض ہنس پڑے اور بعض اساتذہ نے فرمایا، میاں تم بچے ہو۔ بڑے بڑوں کا یہ حوصلہ نہیں۔ چپکے بیٹھے رہو۔ میں کہاں چپ ہونے والا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر حضرت تسلیم سے ادباً عرض کیا۔ قبلہ اکثر شعراء و سامعین آپ کی زبان مبارک سے صرف دو شعر سننا چاہتے ہیں اور میری بھی گذارش ہے۔ حضرت تسلیم میری اس درخواست اور دیدہ دلیری پر بہت حیران ہوئے۔ فرمایا میاں صاحبزادے تم کون ہو جو سب کی نیابت کر رہے ہو۔ میں نے جواباً عرض کیا میں تجمّل آفندی ہوں۔ ارشاد ہوا۔ کون تجمّل آفندی؟ میں نہیں سمجھا۔ میں نے عرض کیا۔ میں منیر شکوہ آبادی کا پوتا ہوں۔ یہ کہنا ہی تھا کہ حضرت تسلیم تڑپ اٹھے اور فرمایا۔ ضرور سناؤں گا ضرور سناؤں گا۔ منیر جیسے باکمال کے پوتے کی زبان خالی نہیں کی جاسکتی۔ یہ کہہ کر حضرت تسلیم نے کانپتی ہوئی آواز میں دو شعر پڑھے جنہیں حافظہ کمزور

ہو جانے پر بھی میں آج تک نہیں بھول سکا۔

نہ ہوا کم کسی تدبیر سے چکرّ میرا
جب تھکے پاے جنوں پھر نے لگا سر میرا
حجاب باغ میں نرگس کی چشم سے نہ کرو
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت منشی منیؔر مرحوم حضرت نجمؔ کے والد کے استاد بھی تھے اور حضرت نجمؔ کی دادی کے رشتے کے بھائی بھی تھے۔ واقعہ صدر سے نجمؔ صاحب کی بے باکی اور برجستگی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ نجمؔ صاحب کی جوانی کا ایک اور واقعہ خود ان کی زبانی سنئے:۔ ''کانپور میں میرے خالہ زاد بھائی کے مکان کے قریب حضرت ابومظفر وقارؔ کانپوری مقیم تھے۔ میرے خالہ زاد بھائی نے مجھے ان سے ملا دیا اور کہا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے اور شعر بھی کہتا ہے۔ حضرت کی خواہش پر میں نے غزل کا یہ مطلع پڑھا:

یہ سنتا ہوں لحد میں پیتا ہے استخواں کوئی
الٰہی خیر! کیا زیر زمیں ہے آسماں کوئی

مطلع سن کر فرمایا۔ خوب! اور پوری غزل سن کر فرمایا۔ میاں صاحبزادے یہ آپ کی غزل ہے؟ میں نے جواب دیا۔ جی ہاں! پوچھا۔ آپ کس کے شاگرد ہیں۔ میں نے کہا اپنے والد حضرت بزمؔ آفندی کا۔ پوچھا وہ کس کے شاگرد ہیں۔ میں نے کہا۔ منشی سید اسمٰعیل حسینی منیؔر شکوہ آبادی کے.....بس تڑپ اٹھے اور بے ساختہ فرمایا کہ تم اس عمر میں اس سے بھی بہتر شعر کہہ سکتے ہو۔ ہمارا تمہارا سلسلہ تلمذ ایک ہی ہے۔ ہم عروجؔ کے شاگرد ہیں اور عروج منیؔر کے۔ استاد بھائی حضرت ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ اس واقعہ سے نجمؔ صاحب کی شاعرانہ عظمت کا رُخ تاباں صاف دکھائی دیتا ہے۔ حضرت نجمؔ نے ایک اور واقعہ بائیس چوبیس سالہ عمر کا یوں بیان کیا کہ حضرت شوکت میرٹھی اپنے دور کے بہت بڑے اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف بہت معمر اور نازک مزاج بھی تھے۔ حضرت شوکت کے دو صاحبزادے ندرتؔ اور جدّتؔ تھے۔ میں ایک مرتبہ حضرت شوکت سے ملنے کی غرض سے ان کے مکان پر گیا۔ اور ان کے صاحبزادے ندرت

صاحب سے کہا کہ میں اکبر آباد، آگرہ سے آیا ہوں اور حضرت شوکت سے ملنا چاہتا ہوں۔ ندرت صاحب نے بگڑ کر کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ میں نے کہا کہ میں حضرت شوکت سے مل کر ہی لوٹوں گا۔ آپ ازراہ کرم حضرت سے یہ فرما دیجئے کہ منیر شکوہ آبادی کا پوتہ آپ سے ملنے حاضر ہوا ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد حضرت شوکت اپنے دونوں صاحبزادوں کا سہارا لیے تشریف لے آئے۔ مجھ سے کلام سنا اور خود بھی کلام سنایا۔ اس واقعہ سے حضرت منیر شکوہ آبادی کی عظمت وشخصیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے باکمال حضرات ایک دوسرے کی کس قدر، قدر ومنزلت کیا کرتے تھے۔

ایک اور واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے جس سے نجم صاحب کی حق گوئی اور وضعداری کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ راجہ غضنفر علی خاں والیِ اسٹیٹ پنڈراول، مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج کے نہایت معتقد تھے۔ جو بھی شاعر راجہ صاحب سے ملتا، اس کو وہ مرزا اوج کے شاگرد ہو جانے کی ہدایت کرتے اور جب شاعر مرزا اوج کا شاگرد ہو جاتا تو ایک اشرفی دی جاتی تھی۔ نجم صاحب بھی، جب ان کی عمر پندرہ سال کی تھی، اپنے والد کے ہمراہ راجہ صاحب سے ملے۔ راجہ صاحب نے نجم صاحب کا کلام سنا اور کہا۔ تم بھی مرزا اوج کے شاگرد ہو جاؤ۔ نجم صاحب نے بے ساختہ فرمایا صاحب! میرے گھر کی استادی ہے۔ میں کیوں کسی کا شاگرد بنوں۔ میرے جواب سے راجہ صاحب بے حد متاثر ہوئے اور مجھے بجائے ایک کے دو اشرفیاں عنایت فرمائیں۔ اس واقعہ سے حضرت نجم کی خودداری کی عکاسی ہوتی ہے.....ایک آل انڈیا مشاعرے کا حال بیان کرتے ہوئے نجم صاحب نے فرمایا کہ وہ غازی آباد (یوپی) کے کل ہند مشاعرے کے بانی تھے جو چوبیس گھنٹے تک مسلسل جاری رہا۔ اس عظیم الشان مشاعرے میں ہندوستان کے مختلف مقامات کے تقریباً ۳۰ شعراء نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کے تعلق سے نجم صاحب کے تاثرات ہیں کہ اس قدر کامیاب مشاعرہ آج تک ان کے دیکھنے میں نہیں آیا۔ مشاعرے کی طرح یہ تھی ۔ الٰہی ترجمانِ دل نگاہِ واپسیں ہوتی۔ بڑی ہی معرکتہ الآرا اور کامیاب غزلیں سننے میں آئیں۔ بقول حضرت نجم حسب ذیل تین شعر مشاعرے کی داد کا مرکز بنے رہے:

حضرت حافظؔ پیلی بھیتی کا یہ شعر

محبت کی نمائش کیا، نمائش کی محبت کیا
ریاکاروں میں ہوتی ہوگی رندوں میں نہیں ہوتی

ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب کا یہ شعر، جن کا تخلص مجذوبؔ تھا۔

وہاں ہوتے جہاں دودِ جگر کا آسماں ہوتا
وہاں بستے جہاں خاکستر دل کی زمیں ہوتی

یاسؔ یگانہ چنگیزی کا یہ شعر

یہ آبِ آتشیں ہے اور یہ دریا خونِ ناحق کا
مگر نفسِ شقی کی پیاس میں تسکیں نہیں ہوتی

واقعات صدر سے نجمؔ کی ادبی صلاحیتوں اور شعری محفلوں کے انعقاد اور حُسن اہتمام کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

اب میں شاعرِ اہلبیتؑ کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات کو مختصراً پیش کرتا ہوں۔ جناب کاظم علی باغؔ مرحوم کے پاس قطبی کوڑہ میں ہر ماہ طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں راقم پابندی سے شریک ہوا کرتا تھا۔ نجمؔ صاحب بھی کبھی کبھی شریک مشاعرہ ہوا کرتے تھے۔ موصوف کی غزلیں پہلے پہل میں نے وہیں سنیں اور مسالموں میں نجمؔ صاحب سے سلام بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹، ۲۰ سال پیشتر حکیم آشفتہؔ صاحب مرحوم نے نجمؔ صاحب کے والد حضرت بزمؔ کے نام سے مجلس بزم قائم کی، جس میں ہر ہفتہ طرحی مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں بپابندی راقم حضرات نجمؔ آفندی، کاملؔ شطاری، ناصرؔ زیدپوری، محمد حسین آزادؔ، سیفؔ حموی، وامقؔ بدایونی، تاجؔ قریشی، خاورنوریؔ، عزمؔ، سعادتؔ نذیر، خورشیدؔ جنیدی، قائمؔ جعفری، شاہدؔ حیدری، طاہرؔ عابدی کے علاوہ اور بھی شعراء شریک ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی حضرات حیرتؔ بدایونی، حمید الدین رضاؔ، سعیدؔ شہیدی بھی آجاتے تھے۔ اس ہفتہ وار بزم کی بدولت ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے سے نجمؔ صاحب میں اور مجھ میں یگانگت بڑھتی گئی اور اب ادارۂ قدر ادب کی محافل دوبیتی کے سلسلہ میں ہم ایک جان دو قالب ہوگئے ہیں۔

مندرجہ واقعات وحقائق کی روشنی میں ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نجم آفندی کو تمام اصناف سخن حمد، منقبت، سلام، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، نوحہ میں ماہرانہ دستگاہ حاصل ہے۔

فن عروض میں جس کو میزان شعر کہا جاتا ہے، علامہ نجم کو قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ اسرارِوافکار کے تعلق سے میری پُرخلوص دعا ہے کہ رب کریم اپنے کرم سے علامہ نجم آفندی کی رباعیات وقطعات سے قوم کو حقیقی فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا کرے۔ ہم کو عزم وعمل کی صلاحیتوں سے مالامال کرتے ہوئے اتحادواتفاق کی روح قوم کے جسم میں بھردے۔

حضرت نجم کو قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے اس کا عین الیقین ہے بلکہ حق الیقین ہوا کہ حضرت نجم کو مبدۂ فیاض سے وہ شعوروا حساس عطا ہوا ہے جو صرف بڑے فنکاروں کا حصہ ہے اور بڑے فنکاروں کا تعارف طوالت اور مضمون نگار کی صلاحیت کا طالب ہے۔

حضرت نجم کے اجداد نے ماشاء اللہ طویل عمریں پائی ہیں۔ چنانچہ حضرت بزمؔ نے کافی طویل عمر میں رحلت فرمائی۔

میں بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ حضرت نجم کو ان کے والد ماجد کی طرح تادیر علم وادب کی خدمت کے لیے زندہ وسلامت رکھے۔ آمین

قدرؔ عریضی

باغ فریدوں جاہ، حسینی علم روڈ
حیدرآباد۔۲

۱۵/مارچ ۱۹۷۱ء

○

باب سوم

منتخب اشعار

کل اشعار (1130) عدد

نجم آفندی کے مقطعوں کا گلدستہ (430) عدد

منتخب اشعار

بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے
کسے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے نجم
میری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

غالب کی طرح معترف میرؔ ہوں میں نجم
فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ میرے انتقام سے

مصیبت پر مری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں
بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت — بنتے ہیں جمؔ دیدۂ پُر نم سے آدمی

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت — اٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

انھیں بھی جمؔ دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر — جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن — کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا
ہر ایک در پہ نہ جا جمؔ داد کی خاطر — کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

میں خود ہوں مطمئن اے جمؔ ادب کی خدمت سے — جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانہ میں تھی — یہ زمانہ دیکھتا ہے آگ میں پروانہ ہے
پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں — بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن — کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری — اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر
نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے — نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر
ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے جمؔ کیا معنی — ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

رندوں میں اور بڑھ گیا رحمت کا اعتبار — واعظ ترے بیانِ عذاب خدا کے بعد
اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے — کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد
کوشش تو جمؔ دوائے دنیا نے کی بہت — بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

خود ساختہ ملّا کے پیرایۂ حکمت نے
پرورۂ صحت کو بیمار بنا ڈالا
مذہب کے مسائل میں ڈالے ہیں وہ الجھاوے
آسان شریعت کو دشوار بنا ڈالا

شریکِ حال تھی عہدِ خزاں میں خود داری
زباں پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

تمھارے ذوقِ تکلم کا یہ تقاضا ہے
تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری
زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی
ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا
مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا نجمؔ
وہ رنگ چہرہ یومِ انیسؔ پر دیکھا

کوئی تدبیر کیجیے میں نہیں تقدیر کا قائل
مری حالت پہ لفظوں میں ترس کھانے سے کیا ہوگا

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں
زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہوجانا

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی
کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا
فطرتِ انساں پہ جب تک عشق تھا پرتو فگن
جوہرِ انسانیت کو نجمؔ خطرہ کچھ نہ تھا

غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کے
سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر

کس کو ہے خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گہر تک

کوئی حسینؑ کا ایثار نجمؔ کیا سمجھے
کسے ہے وسعتِ مفہومِ کربلا معلوم

فلسفہ منطق سیاست موعظہ حکمت حدیث
علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل

حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ مرثیہ
کتنے عالم اپنے دامن میں اٹھا لائی غزل

میرؔ و غالبؔ کی غزل ہے جگرؔ و ثاقبؔ کی غزل
تجھ سے ارضِ تاج نے کی بزم آرائی غزل

رحمت نے گنہ گاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا
واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط
اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

میرے سوا کسی کو نہیں میری معرفت
چرچا جگہ جگہ مرے عیب و ہنر کا ہے

نبضِ ہستی پر ہے صدیوں سے ہماری انگلیاں
جب مرض میں ہوگی تبدیلی دوا بدلیں گے ہم

یہ خیالِ خام ہے کس کم نظر کج فہم کا
مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

بدلا ہے جگرؔ کیا معیار شعر فہمی
جب سطحِ شاعری سے نغمے نے سر ابھارا

مسخ ہوتے ہیں ارادے بارہا
کوئی شاید کار فرما اور ہے

سفر تھا کون سا ایسا جو بے جھجک نہ ہوا
رہے گا پوری طرح کامیاب شک نہ ہوا

بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست
اسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

عزمِ محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر
راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت
غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

درِ زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار
کون کہتا ہے زمانے کے لیے بار ہیں ہم

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم
کم سے کم عزتِ انساں کے تو حقدار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گناہ گار ہیں ہم

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

یہ دور جو اے نجم ہے اردو کا مخالف
اس دور میں اردو کی ہوئی نشو و نما اور

ستم شعاروں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم سہے
خیال میں بھی نہ احساس انتقام آیا

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے
وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

مارا ہے کس کے داؤں سے دنیا سے کیا کہوں
میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

زادۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں
یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل

نجم میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ
کیوں نہ کرتی میرے در پر ناسیہ سائی غزل

نجم صاحب کو راستہ دینا
مذہبِ عشق کے امام آئے

میرے لئے آرام کہاں
مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

بزم انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل
اک ذرہ نہیں محفوظ اداکاری سے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

عیش کیا سخت سزا دیتا ہے مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے
عمر بھر پرورش فکر و نظر ہوتی ہے زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے
زہے جلال کے شاہوں کو دستِ قدرت نے کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے
جو دوستوں پہ بھی چھپ چھپ کے وار کرتے ہیں بھلا وہ کیا کسی دشمن کا سامنا کرتے
بھلے رہے وہ زمانے کے ہم نوا ہوکر خدا کی راہ میں کس کس سے دل بُرا کرتے

فکر عصیاں میں گرفتار ہوں پہ فکر بھی ہے میرے اللہ نہ ہو دیکھنے والا کوئی
فطرتِ عشق جو دے ساتھ تو آسکتا ہے ساری دنیا کے مقابل تنِ تنہا کوئی
سایہ حق میں بھی مل جاتی ہے ناحق کو پناہ کبھی چھپ جاتا ہے سچوں میں بھی جھوٹا کوئی

دشمنی میرا کیا بگاڑے گی دوست بن کر مجھے تباہ کریں

اپنے اپنے بنالئے ہیں خدا ہر پرستش میں خود پرستی ہے

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں زیر قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

طاقتیں مسلّم ہیں علم و عقل کی لیکن عشق کو تعلق کیا ان پناہ گاہوں سے
جبر کا شکنجہ تھی میری ناتواں گردن موت نے چھڑا لیا ہے زندگی کی بانہوں سے
فرش پر ہے تخت اس کا عرش پر دماغ اپنا کیا غریب رہتے ہیں دب کے بادشاہوں سے

غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی
غزل کے چہرے پہ ہے میرے التفات کا نور
کیے ہیں شمع غزل سے وہ داغ دل روشن
بنا ہے جن کی تجلّی میں مُلک کا دستور

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو
کمالِ غم سے وہ نصب النہار پیدا کر

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور
منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں
زندگی میں ہے فراقِ تن وجاں ہوجانا

میں اپنے زعم بلندی میں مٹ گیا لیکن
کبھی نشانہ احساس کمتری نہ بنا

حق ناشناس مجھ سے ملائے نہیں نظر
جس دن سے سامنا مری فکر ونظر کا ہے

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

علی کنارِ نبیؐ میں نبیؐ ہیں کعبہ میں
چمن میں گل ہے تو دامانِ گلستاں میں بہار
سنور رہی تھی یہاں جب کہ عنصری دنیا
میں اپنی نور کی دنیا سے دیکھتا تھا بہار
پڑھا دیا جسے دو حرف عقلِ کل ٹھہرا
بڑھا دیا جسے سدرہ کا کردیا مختار
گھٹا دیا جسے ابھرا نہ پھر قیامت تک
بتوں نے خانۂ کعبہ میں پھر نہ پایا بار

سرفروشانِ وفا کی تھیں نگاہیں دیدنی
اٹھ گیا تھا کون سا پردا شبِ عاشور کو

ایسے بے پروا کہ جیسے سر ہی شانوں پہ نہیں
جنگ پر جب فیصلہ ٹھہرا شبِ عاشور کو

شمع لے کر روئے اکبرؑ دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبح محشر تک ٹھہرنا تھا شبِ عاشور کو

سر اُس طرف حسینؑ کا نیزے پہ جلوہ گر
مغرب میں آفتاب ادھر ڈوبتا ہوا

اُس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ کا دنیا میں شور ہے

حدِ ادب پہ صبحِ قیامت رُکی ہوئی
قدموں پہ عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

کیا جانے کیسے ارض و سما تھے ٹکے ہوئے
اللہ ایک دن میں یہ سب معرکے ہوئے

یہ ضعف اور یہ لاشہ جوان بیٹے کا
یہ تیرے دوش پہ کوہِ وقار کیا کہنا

تیرہ سو برس سے چرچے ہیں ان جیوٹ مرنے والوں کے
تڑپے نہیں خنجر کے تلے دنیا کو تڑپتا چھوڑ گئے

سب کچھ لٹا کے دین کی ہستی بچائی ہے
اے قوم تو حسینؑ کی گاڑھی کمائی ہے

موت کو بھی دو قدم ہٹنا پڑا
زندگی میدان میں جب ڈٹ گئی

عزم محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر
راہ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

انھیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرمِ عمل کر دو
اندھیرے میں خطِ تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا

بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے　　زمیں پہ جس کے لئے چاندنی اتر آئی

سب نے اپنے اپنے مقصد کے بنا رکھے ہیں چاند　　اپنی اپنی حد میں سب نے چاند تک پرواز کی

دیکھ اے واعظ مرا عرشِ سخن　　میں ترے منبر پہ جاکر کیا کروں

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا　　یارب مجھے دنیا سے گناہ گار اٹھالے

دے رہے تھے بے عمل درسِ عمل　　ہم بھی سب سُن کر سمجھ کر رہ گئے

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت　　غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

خبر کیا خانہ بربادوں کی تم کو　　خدائی ہے خداوندی ہے گھر میں
شبِ غم رنگ لائی جاتے جاتے　　لگادی آگ دامانِ سحر میں
اجل آنے سے پہلے کچھ نہ سمجھے　　بہت کچھ تھا حیاتِ مختصر میں

کب تک رہیں گے آخر شام وسحر کے شکوے　　تو جیسے چاہتا ہے شام و سحر بنالے
ہر عیب سے ہے مشکل دامن بچالے چلنا　　جس عیب کی ہوس ہو اس کو ہنر بنالے
پھر دوجہاں بھی تیرے کون ومکاں بھی تیرے　　اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنالے

بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے　　وہ پیرہن ہوں جو یوسف کو کھو کے ناز کرے
نہ اقتدارِ دو روزہ پہ کوئی ناز کرے　　کسے خبر ہے وہ کل کس کو سرفراز کرے
جو سوچتا ہوں وہ دنیا سے کہہ نہیں سکتا　　خدا کسی کو نہ یوں مبتلائے راز کرے

سکونِ دل سے تمنا ہے ایک سجدہ کی
خدا نصیب اگر فرصتِ نماز کرے

مانگی ہے ان سے موت نہ مانگی تھی زندگی
دامن کبھی یہ دامنِ سائل نہیں رہا
میں نے لیا ہے قوّتِ بازو سے اپنا حق
شرمندۂ نوازشِ باطل نہیں رہا

تیزگامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں
ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے
نقشِ آب وگل کی ایسی خودسری اچھی نہیں
سرکشِ نافہم گردن میں ذرا سا خم رہے

میں یہ کہتا ہوں کہ محفل میرے ساتھ اٹھ جائے گی
یہ نہ کہیے تجھ کو محفل سے اٹھ سکتا ہوں میں
مجھ کو واعظ رشکِ مسجد کی امامت پر ہو کیا؟
جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں
غم کی تاریک راتیں اور تسلّی کا پیام
شمع کی زحمت نہ کیجیے دل جلا سکتا ہوں میں

نظر والو حقیر و ناتواں ہم ہیں مگر ایسے
کہ آج اتنی بڑی دنیا کی نظروں میں کھٹکتے ہیں
فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے
جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں
سراپا جرم ہو کر بھی میں بندہ ہوں وہ خالق ہے
کہیں اس طرح کے مضبوط رشتے ٹوٹ سکتے ہیں
کریں کیا بندگانِ وقت حق کہتے جھجکتے ہیں
گلے میں لفظ اظہارِ حقیقت کے اٹکتے ہیں

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ مرے انتقام سے

جن کی ہشیاری کے دنیا میں نشانے تھے بہت
وہ بھی مارے گئے خود اپنی ہی ہشیاری سے
بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل
ایک ذرّہ نہیں محفوظ اداکاری سے

تابوت و شامیانہ و قبر وچراغ و گل
اللہ آج بھی سرو ساماں سے کام ہے

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانے میں تھی
یہ زمانہ دیکھتا تھا آگ میں پروانہ ہے

ساری دنیا اک فریب جلوۂ جانا نہ ہے
یہ حرم ہے دور سے نزدیک سے بت خانہ ہے

کچھ ہوا دے دیں اگر بیرون در کی کوششیں
گھر جلانے کے لیے حاضر چراغ خانہ ہے

اندازۂ محفل تو مجھے دور سے بھی تھا
کچھ اور بھرم کھول دیا پاس بٹھا کے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن
کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط
اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا
مسند شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

میں حریم ناز میں در آ گیا
پردۂ کونین سرکاتا ہوا

تجھ کیا روکے گی یہ دنیا مجھے
میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے
بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

زہے قسمت اسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا
یہ جلال و جبر دیکھو اسے مان لے زمانا

مجھے اس روش سے دنیا کی بڑا سکوں ملا ہے
مرے غم کو غم نہ سمجھا مرے دل کو دل نہ جانا

میں گزرتو کر رہا ہوں ابھی در گذر سے لیکن
مرا ہاتھ ہوگا کاری جو پڑے گا ہاتھ اٹھانا

زبان دانِ محبت ہی نہیں تم تمھیں کیا قدر ہو اُردو زباں کی

ہر اک کی لغزشیں دیکھیں ہر اک کو ٹوک دیا مری نگاہ تھی اور مجھ کو دیکھتی نہ رہی
صلہ کچھ اس کے سوا تجم کو نہیں منظور اگر ذریعۂ عزت یہ شاعری نہ رہی

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا اجل کے سائے میں کیا زندگی نکھر آئی
کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی
یہ دور وہ ہے کہیں سے جو اب تک نہ ملا ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

زندہ دلوں نے بارہا بحرِ فنا سے دی نجات یہ نہ سنبھالتے اگر ڈوب گئی تھی کائنات

یقیں ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جاتے قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا
حیات وعلم ونشاط وصلا و دانش ومرگ بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

ایسے ایسے بھی ہیں مردِ اعتبار کھو دیا ظاہر کو باطن کے لئے
تجم دنیا میں بہت سے کام ہیں آدمی درکار ہے جن کے لئے

میں شب غم کے طلاطم میں اکیلا ہوں مگر آس ہے اک جانی پہچانی ہوئی آواز کی

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے اب کر چکے گناہ تو پروا نہ کیجیے
مفہوم زندگی ہے محبت کا ایک دن دو دن کی زندگی پہ بھروسہ نہ کیجیے

آسانیوں کے دور کا حاصل نہ پوچھیے سب کچھ ہے صرف حوصلہ دل نہیں رہا

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے
کیا اس سے بڑھ کے اور دلیلِ بہار ہے

ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گزر چکے
اب وہ ہیں ان کا وقت ہے اور اعتبار ہے

میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ بوئے گل
واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے

کچھ کرلیا اسی نے جو یہ سوچ کر اٹھا
میری ہے جیت سارے زمانے کی ہار ہے

تم خود ہی دیکھ لوگے غمِ زندگی میں ہم
ڈوبے ہوئے سے ہیں کہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی
قصورِ فکر و نظر ہے جو تشنگی نہ رہی

پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردا
مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی

کہاں وہ عہدِ گذشتہ کی دوستی اے دوست
وہ دشمنی کی شرافت وہ دوستی نہ رہی

دانۂ گندم سے ہیں محروم آج
پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر

دنیا بنا کے لے گا کیا دورِ زندگی میں
میں دل بنا رہا ہوں تو دل میں گھر بنا لے

کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیّل
تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنا لے

تجمّل بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

کوئی حسینؑ کا ایثار تجمّل کیا سمجھے
کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

تجمّل فطرت سے مری ولولۂ شعرو ادب
میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

بدلا ہے تجمّل کیسا معیارِ شعر فہمی
جب سطحِ شاعری سے نغمہ نے سر ابھارا

ناز تسبیح و مصلا اور ہے زیرِ خنجر ہو جو سجدا اور ہے

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

ہماری فکر کا اندازہ دیکھ کر اے نجم فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اُتر آئی

محتاج شرح جو ہو وہ نجم شاعری کیا ہر شعر پر یہ قدغن دنیائے راز ہوجا

اے نجم کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چربے اتارے

مرے منہ سے جھڑتے رہے پھول نجم زباں شاخِ گل سی لچکتی رہی

نجم کتنے ہوں گے عرفی کی طرح نشتر و لا و نعم سمجھے ہوئے

کیا ڈھونڈتی ہے نجم نگاہِ سخن شناس ہم اپنے کیفِ شعر میں کھوئے ہوئے سے ہیں

نجم خدا سے آج تک راست معاملات نہیں بندۂ در اسی کا ہوں جس نے مجھے جگا دیا

نجم ہر شعر میں ترنم ہے آج شاعر ہے نے نواز ان کا

یوں تو سو بہانے ہیں نجم کچھ نہ کرنے کے قصد ہے تو کر ڈالو آج کل اور اب تب کیا

کسی کو نجم خوشی ہو تمھارے غم سے اگر دعا کرو کہ خدا عمرِ غم دراز کرے

آپ دو آنسو بھی اپنے نجم پی سکتے نہیں　　پینے والا ڈگمگا کر زہر بھی پی جائے ہے

کبھی نجم طوفاں اٹھانا بھی ہے　　کہاں تک یہ آنسو پئے جایئے

نجم مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی　　گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

نجم تقدیر کی گردش سے میں دبنے کا نہیں　　پست ہمّت نہ کرے وقت کی افتاد مجھے

تخلیقِ کائنات کا عنوان دیکھنا　　اے نجم ابتدائے محبت کہاں سے ہے
نجم کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا　　پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اگلتا ہے

یہ تو نجم آپ کی ہی ہے وہ دوام شعر کوئی　　مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے

نجم افراطِ محبت نے مجھ گم کردیا　　میں نے آنکھیں بند کرلیں شدّتِ غم دیکھ کر

اے نجم میں پتلا ہوں رنگ اور تلوّن کا　　کس رنگ میں لکھے گی دنیا مرا افسانہ

نجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر　　کس تبسّم کا خزانہ میرے آب وگل میں ہے

محبت ہے کیوں نجم ہندوستاں سے　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

بزمِ سخن میں آگئے نجم خودی کو چھوڑ کر　　بن گئے کب سے آدمی زدِ جنوں اتار کے

حجم ہم موحد ہیں ہم پہ کیا اثر ہوتا
بے شمار بدلے ہیں رنگ روپ دنیا نے

حقائق ہی رہیں گے حجم میری سعی کا حاصل
خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیتِ شعر و سخن
جس کسی محفل میں پہنچے حجم ہم ہی ہم رہے

ہم نے منزلت دی ہے حجم نظمِ اردو کو
ہر زمین پر ہم نے آسماں اتارا ہے

میں پھیلاتا ہوں نورا ے حجم اپنے کنجِ عزلت سے
زمینِ شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

وہ کون ہے اے حجم جو میخانہ میں آکر
ساغر میرے آگے سے حریفانہ اٹھالے

شکستہ پا ہو جب اے حجم یہ ذوقِ سفر کیا
دلیلِ کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

یہ نازِ حُسن مری عاشقی کے دم سے تھے
تمھارے دل میں ہوں بولو زباں پہ آوں کیا

نام تو ساتھ نہ جائے گا خدا حافظ ہے
ایک رہ جائے گی دنیا میں امانت میری

شوق کی آگ رُکے گی نہ دبے گی اے دوست
اُڑ کے پہنچے گی یہ پروانوں سے پروانوں میں

مدفنوں پر جو شہیدانِ محبت کے ملی
مسجدوں میں ہے وہ رونق نہ صنم خانوں میں

پہلو میں برائے نام ہے دل اب درد کا دل میں نام نہیں
مومن ہیں مگر ایمان نہیں مسلم ہیں مگر اسلام نہیں

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ
زبردستی اگر بدلا نہ جائے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

اب اتنی تو ہمّت کیے جایئے اجل آئے تک ہی جیئے جایئے

مرا نور دل دیکھ لے گا زمانہ گرجتے برستے شرر دے رہا ہوں

دل کی وسعت اور ہے محفل کی وسعت اور ہے ظلم ہوتا ہے کسی پر یاد آجاتا ہوں میں
کوئی خوش خوش جب نظر آتا ہے قید و بند میں دیکھ کر خود اپنی آزادی کو شرماتا ہوں میں
میری پستی پر نظر کر اپنی ہستی دیکھ کر اے خدائے آب و گل انساں کہلاتا ہوں میں

سخت جانی سے ہے میری اسی دنیا کو گلہ اِسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
عرض کرتے ہوئے گزرا ہے زمانہ بے سود دی ہے احساس نے اب ہمّتِ ارشاد مجھے
اپنی ہمّت کے مطابق ہے ہر انسان کی فکر کوئی ناشاد سمجھتا ہے کوئی شاد مجھے

اعلانِ غریت کا اب اُردو زباں سے ہے پوچھے تو کوئی یہ لب و لہجہ کہاں سے ہے
طفلی میں بے خرد تھا جوانی میں بے حواس میں کیا کہوں گناہ کی منزل کہاں سے ہے
ایک وجہِ تسکیں ہے طاعت و اطاعت کیا حق ادا نہیں ہوتا حوصلہ نکلتا ہے

سختیاں کرتی گئیں نزدیک مقصد سے مجھے مشکلوں میں دن بہ دن آسانیاں دیکھا کیا

میں جہانِ غم میں رہ کر ہوں الگ غمِ جہاں سے نہ شریک کارواں ہوں نہ جدا ہوں کارواں سے
انھیں آج سانس لینا بھی ہوا قفس میں مشکل جو ہوا میں پھر رہے تھے کبھی سیر آشیاں سے

بجھ چلا تھا دل مرا زادِ سفر کم دیکھ کر
کیا تسلّی ہوگئی سرمایۂ غم دیکھ کر

اک شعلۂ فانی پر مٹ جائے گا پروانہ
انجام سے غافل ہے آغاز کا دیوانہ

ترتیب عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن
آخر یہ قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

اور بھی کوئی مذہب ہے سوا محبت کے
میرا ہے یہی مذہب پوچھتے ہو مذہب کیا

مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ اربابِ کرم
پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہو جاتا ہوں میں

نشیمن میرا رہنے دو چمن میں آنچ اگر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

خوشی ہو یا ہو غم اک ٹھیس ہے دل کی لطافت پر
سمجھ میں ہر کس و ناکس کے یہ بات آ نہیں سکتی

ہمیشہ دل دُکھائے گا خدا کی راہ میں واعظ
یہ رندوں کو بُرا کہنے کی عادت جا نہیں سکتی

جسے وہ یاد فرمائیں کہیں رکتا ہے روکے سے
زمانہ دیکھتا رہتا ہے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ہماری سمت جب اٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی
ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کر کے چھپاتے ہیں

ہم تو ہندوستان والے ہیں
کاش ہندوستاں ہمارا ہو

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

بے نیازی اس قدر کس کام کی
بھولے بھٹکے حال پوچھا کیجیے

سحر آتی ہے جب نزدیک تارے جھلملاتے ہیں
یہ ظالم آخری لمحوں پہ اپنے مسکراتے ہیں

خودی ہے بیخودی ہے بندگی ہے کفر ہے کیا
دوا بھی چھوڑ دی میں نے دعا بھی چھوڑ دی میں نے

کوئی آساں نہ تھا اظہارِ درد و مدعا کرنا
بڑی مشکل سے کی الفاظ کی صورت گری میں نے

قلق ہے اشکِ ندامت میں ڈوب جانے کا
ملا نہ خون میں اپنے مزا نہانے کا

نیاز عشق کجا اور نمازِ خوف کجا
ادائے فرض میں ہے فرض سر جھکانے کا

بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے حجم
میں ایک ذرّہ ہوں ناہنج کے آستانے کا

خاک کے پتلوں پہ ہنستی ہے زمیں
آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولت دنیا زیادہ آدمیت کم رہے

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

آج تک تو جیتا ہوں اپنے ہی سہارے پر
چاہتے ہیں یہ کہہ دوں آپ کا سہارا ہے

کسی دن آسماں کو ہم بنالیں گے زمیں اپنی
زمیں ان کو مبارک جو زمیں کو آسماں سمجھے

غم ہے بہت اے دوست خوشی کم ہے جہاں میں
جو کچھ بھی تری ہمّت مردانہ اٹھالے

آمد و شد ہر نفس کی دے رہی ہے یہ پیام
حق کو آنا چاہیے باطل کو جانا چاہیے

عمر بھر پرورش فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

درِ زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گنہگار ہیں ہم

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اُس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پہ جس کو غرور تھا

خدا کو میں نے بہ فیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہوکر

دیا کرتا ہے انساں اپنے دل کو بھی فریب ایسا
خبر سب کچھ ہے اور بیٹھے ہوئے ہو بے خبر ہوکر

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہوکر

ہنرمندوں کا آپس میں حسد اے حجم کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہوکر

اک مشتِ خاک ہی سہی نسبت تو دیکھیے
کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

تمھارے ذوقِ تکلّم کا یہ تقاضا ہے
تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا

بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری
زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی
کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

اس بھری دنیا میں اک انساں نظر آتا نہیں
زعم کتنا بڑھ گیا انسان کہلانے کے بعد

گلہ ہو شکر ہو تقریر ہو کہ شعر حجم
یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

کس کو خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیرِ گُہر تک

کیوں اضافہ کر کے اٹھو تجمّ بزمِ شعر سے
وقت کا مصرف کہیں تحصیلِ حاصل میں نہ ہو

خدا محفوظ رکھّے خود پرستی خود نمائی سے
ان آئینوں میں جو منہ دیکھ لے ہو جائے دیوانہ

زمیں جب پاؤں سے نکلی تو ہم باز آ گئے سر سے
کہ ایسے وقتِ بد میں دوش پر بارِ گراں کیوں ہو

بہت ممنون ہوں احباب کی چشمِ عنایت کا
مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی
لہو کے گھونٹ پی کر بھی کہیں سیری نہیں ہوتی
بجھاتی ہے کسی کی تشنگی اک بوند شبنم کی
اٹھا کر دہر سے رسمِ محبت اہلِ دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی
عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے تجمّ اک انسانِ اعظم کی

کہتی ہے جسے فکر و نظر نہج البلاغہ
رندوں کی زباں میں ہے وہ میخانۂ علیؑ کا
کعبہ میں ولادت ہوئی مسجد میں شہادت
اللہ کا گھر بن گیا کاشانہ علیؑ کا

دیکھ کے انبائنا ست ہے نبضِ سخن
مصحفِ معبود پر کوئی نہیں طعنہ زن
عافیتِ ہل اتا تیری غذائے لطیف
آیۂ تطہیر کی شان ترا پیرہن

خالی ہیں جام نشہ نہ گھٹ جائے میکشو
طاقِ ولا سے لاؤ صراحی اتار کے
بڑھ جائے گی کچھ اور بھی کعبہ کی آب و تاب
آئیں گے جب قبائے امامت سنوار کے
اک دن یہ ہوں گے دوشِ پیمبرؐ پہ جلوہ گر
کیوں لائے کوئی عرش سے کرسی اتار کے

رستی ہے لہو بن کر تہذیب کی مے ساقی
دنیا کا تمدن ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ
شبیرؑ کے ماتم میں صاحب کی محبت میں
روتا ہوا عاقل ہوں ہنستا ہوا دیوانہ

مدح میں ہے جن کی توحید و رسالت ہم زباں
شاعری موقوف ان کی مدح پر ہو جائے گی

میں ہوں خلّاقِ معانی تری مدحت کے طفیل
دُر مضموں سے بھری رہتی ہے دل کی جھولی

میں جسے چاہوں بناؤں اُسے سلطانِ سخن
میری تحویل میں ہے ملکِ سخن کی شاہی

پینے کو یہاں ملتی ہے اُس ہاتھ سے واعظ
کونین کی طاعت سے گراں جس کی ہے ضربت

کبھی تو مدح اہلِ بیتؑ میں بھی صرف کر واعظ
جو طعن و طنز سے مل جائے تجھ کو وقت فرصت کا

تشدّد لاکھ ہو ہم پر تدارک کچھ نہیں ہوتا
نمونہ دیکھ لیجیے آج اسلامی حکومت کا

جب ضرورت اک علیؑ کی پھر ہوئی میدان میں
چھ مہینے کا علیؑ مردانہ وار آ ہی گیا

مدحت نہ کی علیؑ کی گر آخری نفس تک
یہ مرگِ شاعری ہے اور خطِ شاعرانہ

ہر شجرۂ تصوّف اس تک پہنچ رہا ہے
لیکن کہی کسی نے یہ بات منصفانہ

مجرم ہوں میں غلو کا قصر اُن کو ہو مبارک
ہے دینِ شیخ صاحب اب درسِ ناصحانہ

جب حق کا مسئلہ ہو ڈرتا نہیں کسی سے
ورنہ میری روش ہے اکثر مصالحانہ

صحابہ میں یہ تیری منزلت از روئے حکمت تھی
بقولِ بوعلیؑ محسوس میں معقول تھا گویا

خورشید پلٹ آیا دروازۂ مغرب سے
قانون بدلتا ہے ان کے لئے فطرت کا

نہ تھی تیری حکومت میں ہوا سرمایہ داری کی
چراغِ عافیت روشن تھا ہر مزدور کے گھر میں

یہ مطلع نفیس ہے کہ زمزمہ ہے روح کا
یہ طرز نو کی مدح بھی جہاں میں یادگار ہے

دلوں میں بت لئے کرتے ہیں کعبہ کی نگہبانی
تمسخر کر رہے ہیں آذری پندارِ قدرت سے

علیؑ کعبہ میں ہیں دربار ہے مشکل کشائی کا
مسلمانو چلو موقع ہے قسمت آزمائی کا

علیؑ کی منقبت سے فکر بیگانہ رہی جس کی
خدا جانے وہ حمد و نعت کا مفہوم کیا سمجھا

تعجب ہے جو اس کے مرتبہ کو دوست کم سمجھے
شبِ ہجرت جسے دشمن محمدؐ مصطفیٰ سمجھا

علیؑ کہنا زباں سے کس قدر آسان ہے لیکن
دلِ انساں تصور کر نہیں سکتا جلالت کا

جمع تھے قاآنی و عرفی ظہیر و انوری
حافظ و سعدی نظامی فرخی کل رات کو

لگائے پھرتے ہیں قرآن کو جو سینوں سے
وہ کاش صرف مودّت کے نکتہ داں ہوتے

ادب نواز نہ ہوتا جو بابِ علم نبیؐ
یہ زور و شور زبان و بیاں کہاں ہوتے

خدا سے ربط نہ ہوتا بغیر عترت کے
اگر ہزار بھی قرآن درمیاں ہوتے

صف شکن مشکل کشا اہلِ قلم معمار قوم
اللہ اللہ بازوئے زور آزمائے بوترابؑ

عام منبر سے جدا ہے میثمی منبر کی شان
دار پر ہوتی ہے تفسیر ولائے بوترابؑ

اب نزع کی ہے ساعت اور لب پہ یا علیؑ ہے
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ حرفِ آخری ہے

مولاؑ کو جانتے ہیں پہچانتے نہیں ہیں
آنکھوں کا دوش کیا ہے ذہنوں کی مفلسی ہے

اب خاک مل گئی خاکِ درنجف میں
وہ بندگی تھی اور یہ مفہومِ بندگی ہے

توحید کی ہے محفل بدنام فرقہ بندی
قرآں کی سورتوں میں اخلاص کی کمی ہے

میخانہ نجف سے جنّت میں پہنچتے ہیں
کیا جرم ہے محبت جس کی سزا ملی ہے

بشر کو معرفت حاصل نہ ہوگی ذاتِ حیدرؑ کی
سمجھ لے آدمی کس طرح منزل آدمی گر کی
علیؑ کو چھوڑ کر قرآن سے ہے ربط بے معنی
اٹھالے وہ ضرورت ہو جسے بے روح پیکر کی
نمازیں وقت پر واجب ولا ہر وقت واجب ہے
عبادت ہے حقیقت میں ولا آلِ پیمبرؐ کی
نہ ہوتی منعم و مزدور کی دنیا میں آویزش
جو ارضِ خم پہ دنیا بات سن لیتی پیمبرؐ کی
اِسی باعث تو پھر کوئی ہوا پیدا نہ کعبہ میں
کہ بیٹی ہی نہیں تھی دوسری کوئی پیمبرؐ کی

تری مرضی پہ ہوا رحمتِ باری کا نزول
اذن لے کر ترے کاشانہ میں قرآں اترا
ہے ترے دودھ کی تاثیر یہ قومی تعمیر
اللہ اللہ ترے خونیں کفن و سبز قبا
آئے جبرئیلِ امیں عرش سے نسبت لے کر
یہ وہ رشتہ ہے جہاں بیچ میں تھی وحیٔ خدا
دست و پا چوم کے عصمت نے لگائی مہندی
چادر آیہ تطہیر نے آنچل ڈالا
ہاشمی تیغوں کے سائے میں دلھن گھر سے چلی
لافتیٰ کا جو علیؑ باندھ کے آئے سہرا
باپ کے گھر سے ملا بخششِ امت کا جہیز
دونوں عالم نے کیا حدِ ادب پر مجرا
جادۂ سلح کے رہبر حسنِ سبز قبا
تو نے تخلیق کیا ولولۂ کرب و بلا

ہر افق پر ہے تری حُسن عمل کی روشنی
تو ہی دنیا کے اندھیرے کا اُجالا اے حسینؑ
جرأت مظلوم ہو یا ہمّتِ مزدور ہو
تو نے کھینچا تھا یہ مستقبل کا خاکا اے حسینؑ

ہمدم جہاں میں نور میں شامل نسب میں ایک
کس طرح کوئی تجھ کو نبیؐ سے جدا کہے
تعمیرِ قوم بت شکنی بخشش و عطا
کونین کیوں نہ پھر تجھے دستِ خدا کہے
ہر سانس میں ہو بوئے ولائے ابوترابؑ
ابھرے جو نبض ڈوب کے یا مرتضیٰ کہے

تجھ سے ہے نامِ حریت تجھ سے نظامِ حریت　　تو ہے امامِ حریت حُر ترا ایک لشکری

معصوم کی آغوش میں معصوم کو لاکر دیا　　دولت خدا کے گھر کی تھی دامن نبیؐ کا بھر دیا
نورِ رسالت سے ہوا نورِ امامت متحد　　اس اتحادِ حُسن نے قوموں کو یکجا کردیا
زاہد سپاہی فلسفی حاکم ولی شاعر ادیب　　کن مختلف اوصاف کا حق نے تجھے پیکر دیا
اب تک ہیں تیرے نام کے آفاق میں نعرے بلند　　قدرت نے جوشِ اسلام کا سب یا علیؑ میں بھر دیا

یداللہ و لسان اللہ و عین اللہ کو دیکھو　　حروفِ اولیں سے صاف ہوتا ہے علیؑ پیدا

مدح گر سرمایہ داروں کا نہ شاہوں کا غلام　　نجمؔ بے زر ہی سہی شاعر ہے تیرا اے حسینؑ

ہے ایک کیفیت میں رواں اپنا کارواں　　کیوں نجمؔ منقبت کو نہ بانگِ درا کہے

ننگ ہے اس کا در غیر پہ سجدہ کرنا　　نجمؔ اک آپ کی سرکار کا شاعر ہے حضور

نغمہ منقبت میں نجمؔ ہیچ ہے میرے سامنے　　حُسنِ بیان فرخیؔ زورِ کلامِ انوریؔ

بکیف مدح ہوں غالبؔ کا ہمنوا اے نجمؔ　　کہ باعلیؑ ولی مست و با خدا ہشیار

جوشِ ولا میں نجمؔ میں چھوڑ گیا خود اپنا ساتھ　　حد مجھے روکتی رہی قوّتِ اختیار کی

رہا محروم دو دن بھی جو شغلِ مدح گوئی سے　　اُسے اے نجمؔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھا

نمازِ مدحت پڑھتا ہوں مودّت کے مصلّے پر　　دکھا دو نجمؔ دنیا کو یہ رتبہ ہے سخنور کا

جگہ فردوسؔ و دعبلؔ کی نجمؔ کو ملتی　　قریب طائرِ سدرہ کچھ آشیاں ہوتے

وہ زباں دانِ محبت ہے خدا کے فضل سے　　نجمؔ کا ورثہ ہے اندازِ ثنائے بوترابؑ

حق یہ ہے کہ سرکارِ نوبت کے سوا نجمؔ　　معیارِ فضیلت کوئی سمجھا نہ علی کا

فضلِ خالق سے مرے افکار میں اشعار میں　　فلسفہ ہے نجمؔ غالبؔ کا زبانِ میرؔ ہے

مصائب سینکڑوں ہیں غم ہزاروں مشکلیں لاکھوں　　تمھارا نجمؔ ہے تنہا امامِ جعفرؑ صادق

کچھ دن سے تیری یاد کی محفل اُداس ہے　　اب چل بسے گا نجمؔ غزل خواں ترے بغیر

ہو جو بیگانہ روی سے یہ زمانہ ہے خلاف　　سب ترے علم میں ہے نجمؔ کی آشفتہ سری

میں نجمؔ اپنا فریضہ جانتا ہوں یہ ثنا گوئی　　مرا مقصد نہیں اظہار اپنی قابلیت کا

پندرہ مارہ رجب کی نجمؔ دعوت جب ملی　　اور کچھ دن زندگی کا اعتبار آہی گیا

ہم نجمؔ چار روز کے مہمان ہیں مگر　　رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

رہے اے نجمؔ کیوں خالی صدارت بزمِ مدحت کی　　ہمارے بعد کوئی اور قسمت کا دھنی آئے

پڑھتا ہوں میں نمازِ ولا جس پہ رات دن
منزل ہے آسماں سے بلند اُس حصیر کی

تشکیل ہوئی تنظیم ہوئی ترتیب ہوئی تکمیل ہوئی
کیوں ختم نہ ہو پیغامبری سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

مئے حُبِ نبیؐ کو واسطہ ہے میری فطرت سے
وہ کوئی اور ہوں گے جن کو مل جاتی ہے قسمت سے
نگاہِ اہلِ ظاہر میں وہ اُمّی تھا مگر ایسا
کتابِ زیست میں اصلاح دی ہے دستِ قدرت سے

وہ اک نورِ مجسّم تھا مگر اے ابنِ آدم سُن
تری سیرت بنانے کو اٹھایا بارِ صورت کا

کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں
اور آگ لگا دی ہے مری تشنہ لبی میں
آزاد ہوں میں وسعتِ عشقِ نبویؐ میں
الجھے ہوئے ہیں تنگ نظر بولہبی میں
اک فیصلہ کن شان سے بھیجا ہے خدا نے
قرآن بھی تلوار بھی ہے دستِ قوی میں
تکوینی ہے علم اس کا جو کہلاتا ہے اُمّی
یہ بات نہ آئے گی کبھی ذہنِ غبی میں
اے حجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

خدا بھی ایک قرآں بھی قبلہ پیمبرؐ بھی
قیامت ہے کہ پھر ملّت کا شیرازہ پریشاں ہے
بھلا سکتے نہیں دل اُس کی تحریکِ اخوت کو
چراغِ انسان کے احساس کا بے شک فراواں ہے
ابھی انسان سمجھا ہی نہیں تجویزِ امن اُس کی
ابھی دنیا کے ہر اک موڑ پر طاقت رجز خواں ہے
دیا تھا اُس نے وہ درسِ مساواتِ رواداری
کہ ہر اک قوم میں اب روحِ آزادی کی جولاں ہے

اُسے انسان کے اخلاق کی تکمیل کرنی تھی
علیؑ آفاق میں پہلا ثمر تھا اس کی محنت کا

آنکھیں تو بچھا ہی رکھیں ہیں خاکسترِ دل کا فرش کرو
ہے عرش بھی جن کے زیرِ قدم وہ فرشِ زمیں پر آتے ہیں

جب مدح پیمبر کرتا ہوں وہ زورِ سخن بڑھ جاتا ہے
اے نجم سلامی دینے کو الفاظ کے لشکر آتے ہیں

قطرہ نے لیں جو تیری محبت میں کروٹیں
بطنِ صدف میں گوہرِ غلطاں بنا دیا
یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی
اک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنا دیا
سلطانِ کج کلاہ مقابل نہ ہو سکے
جس کو رئیس دواتِ عرفاں بنا دیا
صورت گیرِ ازل نے ترے اعتبار پر
اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا

نجم مدّاح پیمبر کی بلندی کو نہ پوچھ
خاک پر بیٹھے تو سرِ عرش سے جا ملتا ہے
میں سمجھا آدمی کا احسنِ تقویم ہو جانا
یہی صورت ہے جس پر حق کی صنعت ناز کرتی ہے

فضائے عرش میں اے نجم رہتا ہے دماغ اپنا
فرازِ عرش سے اترے ہیں یہ اشعار کیا کہنا

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزو شرف
نجم فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفیٰؐ

اگر انساں کو عرفانِ غمِ شبیرؑ ہو جائے
شعورِ حریت دنیا میں عالم گیر ہو جائے
اگر منشائے فطرت خود نہ ہو کیونکر یہ ممکن ہے
کسی کا موت کا غم اور عالم گیر ہو جائے

اللہ رے صداقت سادات کے لہو کی
کیسا بھرا پڑا ہے اجڑا ہوا گھرانہ

بندے جنھیں کلام ہے عترت کے باب میں
اصلاح دے رہے ہیں خدا کی کتاب میں
اقرارِ باللسان کر اے بندۂ خدا
رکھتا ہے الفتِ شہِ مرداں حجاب میں
دل ہو نہ ہو زباں تو نصیری ضرور تھی
جب منہ کھلا کنندۂ خیبر کے باب میں
تحقیق کا جنون ہے فکرِ عمل نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو کرب و بلا کی کتاب میں

بت لاکھ بھی توڑے کوئی حیدرؑ نہیں ہوتا
وہ دوشِ پیمبرؐ تو میسر نہیں ہوتا

یہ شان ہوئی ختم حسینؑ ابن علیؑ پر
اب عشق کا سجدہ تہہ خنجر نہیں ہوتا

ہم گود کے بچوں کو بھی کر دیتے ہیں شامل
جب تکملۂ قوتِ لشکر نہیں ہوتا

آسان ہے قربانی و ایثار پہ تقریر
میدان عمل کچھ سرِ منبر نہیں ہوتا

پاؤں عابدؑ کا نئی راہ کی تعمیر میں ہے
پاؤں وہ پاؤں جو الجھا ہوا زنجیر میں ہے

یہ نہ قرآں میں نہ قرآن کی تفسیر میں ہے
روحِ احساس و عمل اسوۂ شبیرؑ میں ہے

اللہ اللہ یہ اجمالِ جمالِ قدرت
وسعتِ کون و مکاں چادرِ تطہیر میں ہے

جس کی وحدت میں ہو قرآن کا سارا مفہوم
ایسا نقطہ بھی کوئی کثرتِ تحریر میں ہے

ایک ہی شانِ عمل ہے وہ حسنؑ ہو کہ حسینؑ
صلح میں بھی ہے وہی کاٹ جو شمشیر میں ہے

اک ہی گھر چاہیے قرآن وعترت کے لئے
تنگ دل حق سے دعا کر دل کی وسعت کے لئے

یہ ترا ذوقِ عبادت اے حسینؑ ابن علیؑ
زیرِ خنجر بھی جگہ کرلی عبادت کے لئے

جرأت عباسؑ تک پہنچے گی کیا عقلِ بشر
اک نیا موقف بنایا ہے شہادت کے لئے

دل پہ ظاہر ہوگئے کیا کیا علیؑ کے مرتبے
لفظ اب ملتے نہیں اسرارِ قدرت کے لئے

جب سے قتلِ سبطِ پیغمبرؐ پہ تکبیریں کہیں
گھٹ گیا اُس دن سے زورِ نعرۂ تکبیر بھی

عزمِ خالص چاہیے حُر کے ارادے کی قسم
بڑھ گیا آگے تو پیچھے ہٹ گئی تقدیر بھی

قربان ایسی موت کے جو خود ہو زندگی
پیمانۂ حیات ہے پیمانِ کربلا

یہ گریہ نہیں ہے یہ آنسو نہیں ہیں
یہ دادِ وفا ہے جو دی جارہی ہے

پڑھ کر نمازِ عصر کی شبیرؑ زیرِ تیغ
اک عصرِ نو کی خلق میں تعمیر کر گئے

بالا ہی رہی شانِ علیؑ ذہنِ بشر سے
دنیا نے بہت کام لیا فکر و نظر سے
مدحت کے ترانے میں بڑا وزن ہے واعظ
اک حرف ہے بھاری تری تسبیحِ گُہر سے
ہوتا نہ اشارہ جو حسینؑ ابنِ علیؑ کا
ہرگز نہ بدلتی شبِ عاشور سحر سے
روتے ہیں جو اس دور کے کشتوں کو مسلماں
وہ آنکھ ملائیں تو میرے دیدۂ تر سے
کھلتی نہیں تائید میں کیوں ان کی زبانیں
دل جن کے تڑپ جاتے ہیں ماتم کے اثر سے

لا اَسلکم کہہ کے مودت جو طلب کی
قرآں نے رکھا تاج سرِ اہلِ ولا پر
جب میں نے دعا کی تو زیارت کی دعا کی
اللہ کی رحمت ہے مرے دستِ دعا پر

شبیرؑ کی روداد ہو فطرت کی زباں ہو
باز آئیں جو انساں تو فضا مرثیہ خواں ہو
میدان میں باطل کے لئے حجّتِ آخر
قدرت کا یہ منشا تھا کہ اصغرؑ کی زباں ہو
ہوتی ہے لطافت وہ عجب مدحِ علیؑ کی
مفہوم پہ جب خلعتِ الفاظ گراں ہو

ہجومِ غم کو ہٹاتے ہیں یا علیؑ کہہ کر
ہزار وار پہ ہم ایک وار کرتے ہیں
یہ مجلسیں نہیں پیمان ہیں اطاعت کے
یہ ہم حسینؑ سے قول و قرار کرتے ہیں
علیؑ کے ذکر پہ ہو یا خدا کی قدرت پر
ہم ایک سجدۂ بے اختیار کرتے ہیں

اہلِ بیتِ مصطفٰےؐ سے سیکھ شانِ خواجگی
حق کے بندے بھی رہے اور بندہ پرور ہو گئے
تربیت کی ذہنِ انساں کی غمِ شبیرؑ نے
صاحبِ دل بن گئے جو غم کے خوگر ہو گئے

نگاہوں میں ہے میری بائے بسم اللہ کا نقطہ
مجھے اب کیا تکلف ہو غرورِ نکتہ دانی میں

قرآں کی بات کون سمجھتا بجز علیؑ
ہر لفظ ہے خزانۂ حکمت لیے ہوئے

کس طرح جگہ ملتی اغیار کو اس گھر میں
دھبّہ نہیں آسکتا تطہیر کی چادر میں
شبیرؑ بچالیں گے اسلام کو مٹنے سے
ان کا ہے بڑا حصہ احساسِ پیمبرؐ میں
مولاؑ کے غلاموں میں جبرئیلی بھی ہیں میں بھی
بس فرق ہے اتنا سا میں در پہ ہوں وہ گھر میں
قرآن ہے بے معنی عترت سے جدا ہوکر
جس گھر میں یہ آیا تھا معنی ہیں اسی گھر میں
شبیرؑ سیاست کا وہ قائدِ اعظم ہے
قانون بنا ڈالا عاشور کو دن بھر میں

بلغ پہ نظر پہنچا اے ناظرِ بے پروا
قرآں اِسی منزل سے کامل نظر آتا ہے
کیا جون سے رونق ہے انصارِ حسینؑ میں
رخسار شہادت پر اک تل نظر آتا ہے
شاید یہ فرشتوں نے سوچا ہو شبِ ہجرت
انسان خلافت کے قابل نظر آتا ہے

حق پرستی خود شناسی ہمّت و عزم و عمل
مل کے ان اجزا سے بنتی ہے تولاے حسینؑ
روئے زیبائے پیمبرؐ رونقِ کون ومکاں
رونقِ دوشِ پیمبرؐ روئے زیبائے حسینؑ

ضرورت ہے مصلّے کی فضا میں قوتِ دل کی
مسلماں یا علیؑ کہہ نعرۂ تکبیر سے پہلے
کلام اللہ کی تفسیر ہے ہر فرد عترت کا
نظر کر ان کی سیرت پر ذرا تفسیر سے پہلے
سفر میں کربلا کے گردشِ تقدیر کیا کرتی
میں آگے بڑھ چکا تھا گردشِ تقدیر سے پہلے

نہیں یہ شان کسی درد کے فسانے کی
غمِ حسینؑ میں قدرت ہے دل بنانے کی
حسینؑ فکرِ شہادت میں خود ہی تھے ورنہ
کسے مجال تھی تیغِ ستم اٹھانے کی

پھر یہودی قصرِ گمنامی سے اُبھرے ہیں مگر
دینِ اسلام خدا محرومِ خیبر گیر ہے

ہم علیؑ والوں نے پرواہی زمانے کی نہ کی
مہرباں ہوکر رہا نامہرباں ہوکر رہا

دو اشک نہ ٹپکے جب آنکھوں کا بھرم کیا ہے
اٹھا جو نہ ماتم اس ہاتھ میں دم کیا ہے
صدیوں کے برابر تھی عاشور کی اک ساعت
اُس دن کے مقابل میں تاریخ امم کیا ہے
بخشے تو گئے ہوں گے کچھ ہم سے خراباتی
تاریخ مودت کی اے لوح و قلم کیا ہے
خاموش جو سنتے ہیں عترت کے مصائب کو
ان سے یہ کوئی پوچھے تائید ستم کیا ہے

نا فہم نصیری کی ادا بھاگئی دل کو
میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دولت کدھر آئی
اب ہم میں نہیں جذبۂ انصارِ حسینؑ
اپنی تھی جو منزل ہوئی جاتی ہے پرائی

ہم اہل بیتؑ کے ہیں ایسے ماننے والے
کہ جن میں میثم تمار سا دلاور ہے
مباہلہ کی فضا بھی ہے دیدنی اے دوست
اس ایک لفظ میں اس کی ثنا کا دفتر ہے
قلم کے بدلے اٹھالیں گے وقت پر تلوار
مجھے یقیں ہے یہی عزمِ ہر سخنور ہے

تیرہ سو برس میں ہوئے کیا کیا نہ تغیّر
کہہ دے کوئی شبیرؑ کے ماتم میں کمی ہے
اقوال حسینؑ ہیں عمل غیر حسینؑ
یہ دین کے الفاظ میں دنیا جلی ہے
یہ حریتِ فکر یہ بیداریٔ اقوام
اک کوشش تقلیدِ حسینؑ ابن علیؑ ہے

دیکھ کر مولا علیؑ کی شخصیت کو بے مثال
مسئلہ حل ہوگیا توحید کے اقرار کا

شرف پایا اسی نے دفن کرنے کا پیمبرؐ کے
جو واقف تھا مقامِ امتزاج روح و پیکر سے
ہمیں اللہ کے بندوں سے بس اتنا ہی کہنا ہے
نبیؐ لائے تھے اپنا جانشیں اللہ کے گھر سے

کٹتے رہے ہیں ہاتھ بدلتے رہے ہیں دور
دم بھر رکے نہ جام ولا کے شراب کے

اب لائیں گے نہ بحث میں ہم کربلا کی جنگ
کب تک چلیں گے دور سوال و جواب کے

سویا علیؑ کا لال دو عالم کو جیت کر
مٹھی میں کائنات تھی خنجر گلے پہ تھا

دشواریوں میں بھی ہے یہ فرض زندگی کا
مقصد بلند رکھنا آوازِ یا علیؑ کا
اے کربلا کے خالق عزم و عمل نے تیرے
کتنا بڑھا دیا ہے معیار آدمی کا
قرآں حدیث دونوں ہیں ایک ہی زباں کے
کیا راز کوئی سمجھے اب ربطِ معنوی کا

ہاتھ رکتے ہی نہیں ہیں ماتم شبیرؑ سے
استفادہ کر رہا ہوں موت کی تاخیر سے
جب زباں پر یا علیؑ آتا ہے فرطِ شوق میں
اک سہارا چاہتا ہوں نعرۂ تکبیر سے
اک نہ اک جا خلق میں مجلس کہیں ہوگی ضرور
کوئی پل خالی نہیں ہے ماتم شبیرؑ سے
میں نے باب العلم کی چوکھٹ کا بوسہ لے لیا
لوگ اُدھر الجھے رہے قرآن کی تفسیر سے
اک یہ ادنیٰ سی کرامت ہے غم شبیرؑ کی
آدمی انسان بنتا ہے غم شبیرؑ سے
اپنے خوں سے نقشِ الا اللہ لکھتے کیوں حسینؑ
کام چل سکتا اگر کچھ کاغذ کی تحریر سے

باز آجاتی اگر امت غم شبیر سے
نامسلماں کرتے ماتم اور مسلماں دیکھتے
میں زباں پر بھول کر لایا نہ رازِ معرفت
یہ نصیری میرا صبر و ضبط پنہاں دیکھتے
اللہ اللہ کہنے والے قربِ حق کی شان میں
یا علیؑ کہتے تو یہ مشکل بھی آساں دیکھتے

عاشور کے دن ظہر کو دنیا ہوئی واقف
مومن کی نماز اور مجاہد کی دعا سے
شبیرؑ کا غم زندگیٔ فکر و نظر ہے
ملتا ہے یہاں درسِ عمل اشکِ عزا سے
مجرم ہیں یہ رو کے ہوئے ہیں اجرِ رسالتؐ
وحشت جنھیں ہو جاتی ہے ماتم کی صدا سے

نجم آفندی

کے

مقطعوں

کا

گلدستہ

(430) اشعار

مقطعوں کا گلدستہ

تیری مدحت کے جادے پر یہ فکرِ نجم کی حد ہے　　حق آگاہی تیری منزل یداللّٰہی تیرے تیور

تقلید میری ہوتی ہے اہلِ سخن میں نجم　　چھایا ہوا دلوں پہ یہ رنگِ کلام ہے

نجم ہم نے مدحِ اہلِ بیتؑ کے ہر شعر میں　　فاضلِ طینت کی فطرت کو نمایاں کر دیا

ان کی نعلینِ مبارک میرے سر آنکھوں پہ نجم　　تاجداروں سے ہیں برتر کفشِ برادرِ حسینؑ

حاجی ہو کوئی حافظِ قرآں ہو کوئی نجم　　کچھ بھی نہیں علیؑ سے محبت اگر نہیں

نجم تیرہ سو برس سے آج تک قبرِ حسینؑ　　معبدِ اہلِ وفا ہے سجدہ گاہِ عشق ہے

اک طرف ارضِ نجف اک سمت ارضِ کربلا　　نجم لہریں لے رہا ہے کیا مقدر دیکھئے

شعورِ مدح بزرگوں کا فیض ہے اے نجم　　زہے نصیب یہ اعزاز خاندانی ہے

ڈوبا ہوا اے نجم جو ہو عشقِ علیؑ میں　　دنیا میں اسے کیا خبرِ سود و زیاں ہو

صلہ میں خلد وہ دیں گے تو نجم کہہ دیں گے　　تمھارے نقشِ قدم پر نثار کرتے ہیں

خود پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی بن گئی　　نجم آخر شاعرِ آلِ پیمبرؐ ہوگئے

مقدس بانکپن اے نجم میرے تاجِ مدحت کا　　کلاہِ خسروی میں ہے نہ دیہیم کیانی میں

اے نجم میں شاعر ہوں سرکارِ امامت کا　　نظمیں مری پہنچیں گی دربارِ پیمبرؐ میں

سب کہتے ہیں شاعر ہے دربارِ حسینؑ کا　　نجم اپنی حقیقت سے غافل نظر آتا ہے

اے نجم بیٹھتے ہو اب کیا سنبھل سنبھل کر　　آثار کہہ رہے ہیں اٹھنے کا ہے زمانہ

رفعت ترے کلام کی عرش آشنا ہے نجم　　کھیلی ہے فکر دامنِ برق و سحاب میں

اے نجم جبیں ہوتی ہے چوکھٹ پہ نجف کی　　میں مدح کے عالم میں فلک پر نہیں ہوتا

نجم میں ہوں شاعرِ بزمِ حسینؑ ابن علیؑ　　میرا نغمہ ہے فقط سازِ حقیقت کے لئے

نجم شاعر ہے حسینؑ ابن علیؑ کے در کا　　اور دنیا میں نہ منصب ہے نہ جاگیر کوئی

کب دیکھئے طلب ہو دیارِ حسینؑ سے　　بیٹھے ہیں نجم نذرِ دل و جاں لئے ہوئے

جناب نجم یہ عزلت گزینیاں کب تک　　یہ بے نیاز روش چھوڑیئے خدا کے لئے

بہرِ نجات نجم کہوں کیوں حسینؑ سے　　شاعر ہوں اہلِ بیتؑ کا صورت سوال ہے

اب جلد آستانے پہ اپنے بلایئے　　کب تک جیئے یہ نجم گناہگار آپ کا

نجم ہو اگر نسبت اُسوۂ حسینؑ سے　　ایک شعر مدحت میں خلد کا قبالا ہے

اہل جب چاہے منہ پر مُہر کر دے　　علیؑ کا نام دل پر لکھ گیا ہے

عطا کی میرزائی نجم کو پھر مدح کی نعمت　　کیا ممتاز قدرت نے زبانِ میرؔ سے پہلے

نجم شاعر ہے علیؑ کا سب سے کمتر ہی سہی　　نکتہ داں ہوکر سدھارا نکتہ داں ہوکر رہا

بن گئی انسان کا معبد زمینِ کربلا　　نجم جب عزم وعمل کی زندگی لائے حسینؑ

مدحت کی جوانی ہے پیری ہی سہی میری　　احباب نہ یہ سمجھیں اب نجم میں دم کیا ہے

اُردو میں ہے اے نجم مری نغمہ سرائی　　نغمہ عجمی اور نہ لہجہ عربی ہے

اے نجم سوال آئے اگر لطف و کرم کا　　مولاؑ کی زباں پر کبھی لاہو نہیں سکتا

اے نجم منقبت ہو اس وقت بھی زباں پر　　جب نزع کی ہو ساعت عالم روا روی کا

کربلا کی راہ میں حائل ہیں کتنی مشکلیں　　نجم پہنچے لڑتے بھڑتے گردشِ تقدیر سے

اسرارِ حقیقت مرے افکار ہیں اے نجم　　تفسیر مرے شعر کی پوچھو عرفا سے

حسینؑ سے جو عقیدت ہے اہلِ ہند کو نجم　　فضائے دہر میں اس کا کہیں جواب نہیں

میں ہوں کلیم طور ثنائے علیؑ کا نجم　　انداز ہیں کلام میں نقشِ دوام کے

نجم کیا معلوم کس کا شعر انھیں آئے پسند　　مدحِ اہلِ بیتؑ پر نازش خیال خام ہے

سب سے کم رتبہ سہی لیکن یہ رتبہ کم نہیں　　نجم بھی تیرے ثنا خوانوں میں شامل ہے حسینؑ

ممدوح ہی واقف مری نیت سے ہیں اے نجم　　دنیا میں ہے شہرت مری آشفتہ سری کی

آئیں جب امامِ عصرؑ ان سے یہ کہے کوئی　　نجم زار انتظار دیکھتا چلا گیا

نجم اسلام حقیقی کبھی مٹنے کا نہیں　　حسنِ سبز قبا سے ہے نشانِ اسلام

اب اس فضا میں رہنے کو دل چاہتا نہیں　　اب نجم ترکِ ہند کا سامان کیجئے

میں ہوں وہ نجم درخشاں سپہر مدحت کا　　بغل میں خاکِ دل بے قرار لایا ہوں

جو نجم کو کہنا تھا لمحوں میں وہ کہہ گزرا　　اب آگے مقدر ہے سمجھو نہ اگر برسوں

شافعِ مطلق ہے تو اور یہ دوائے دردِ دل　　نجم جلد آنکھوں سے یارب شیعہ کالج دیکھ لے

یہ سکونِ دل کا عالم بے دلی سے کم نہیں — نجم بیٹھے کیا ہو کچھ طوفاں اٹھانا چاہیے

اس سے بہتر نجم دنیا میں کوئی تحفہ نہیں — دوست بھیجیں دوستوں کو ارمغانِ اتحاد

نجمی کوئی سبق نہ لیا کربلا سے کیا — کیوں بے حسی کا قوم پہ الزام آگیا

ہمراہ ہوں اے نجم یہ نوحے یہ قصیدے — جب ملکِ عدم کے لئے حکمِ سفر آئے

نجم اسی کے فیض سے شاعرِ اہلِ بیتؑ ہوں — دین کے آفتاب کی یہ بھی ہے ذرّہ پروری

اے نجم کچھ نہ پوچھو اُس وقت کی جلالت — تنہا تھے دشمنوں میں جس وقت شاہؑ والا

سوئے دیارِ کربلا جب کوئی قافلہ گیا — نجم وہ بدنصیب ہیں رہ گئے دل کو مار کے

زحتِ عزا پہن کر اے نجم گھر سے نکلو — ہندوستاں میں آئی سرکار کی سواری

سُنا ہو اور دیکھا ہو کبھی اہلِ تولا نے — ہمیشہ نجم اس انداز کا نوحہ سناتے ہیں

نجم ہمیں نزع میں صرفِ عزا دیکھ کر — موت بھی کچھ دیر کو در پہ ٹھہر جائے گی

وہ سامنے ہے علَم کی شبیہہ نجم اٹھو — وفا پرستی کا منظر دکھایا جاتا ہے

جہاں کو درس دے رہے ہو اُسوۂ حسینؑ کا — بیاض نجم دلفگار نوحہ خواں لئے ہوئے

اے نجم یہی اپنی بخشش کے سہارے ہیں　　زینبؑ کے دلارے ہیں زینبؑ کے دلارے ہیں

یہ نجم تیرا شاعر دردِ نہاں کے صدقے　　دل کو زباں بنا دے سوکھی زباں کے صدقے

نجم اُڑ اُڑ کر ہماری خاک کے ذرّے ہمیں　　یا نجف لے جائیں گے یا کربلا لے جائیں گے

کیا جان دے کے نجم گیا جانِ مرتضیٰ　　جب موت میں حیات تھی خنجر گلے پر تھا

تیرا غم تیری محبت نجم کا اسلام ہے　　اے شہیدِ کربلا تجھ پر سلام اسلام کا

اپنے کو جو چاہے نجمی اُس کو کون نہ چاہے　　بھارت ماتا لوگ منا کر من ہرلیں ہمارا

دوش پر فوجِ حسینیؑ کا علم لے کر چلو　　نجم آؤ بزمِ ماتم میں قلم لے کر چلو

نجم ایک نظر کا خواہاں ہے مرضی جو نہیں یہ بھی نہ سہی　　دربار میں شامل ہو کہ نہ ہو شاعر ہے یہ تیرا تیرے لئے

ہے نجم کی ہستی کیا اے کرب و بلا والے　　کس نے تجھے سمجھا ہے کس نے تجھے جانا ہے

یہ دل میں دردِ محبت یہ نجم جوشِ سخن　　یہ تیرا خامۂ ماتم نگار کیا کہنا

یہ دل پہ تیرے صف بہ صف تارے بھی ہیں چاند بھی　　نجم کی خاطر فقط گردشِ ایّام ہے

یہ نجم نوحہ گر کا نوحہ قبول کرلے　　اے مجلسِ عزا میں تشریف لانے والے

نجم آئے تو اہلِ دل نے کہا دردِ یکسر غم تمام آئے

عازم زیارت ہے نجم ایک مدّت سے کس کو اب صدا تو نے ارضِ کربلا دی ہے

شاعر ہوں اہلِ بیتؑ کا میں نجم دلفگار پہچانتے ہیں کشتۂ راہِ خدا مجھے

نجم غرورِ ملّت ہے جلوہ طرازِ کرب و بلا ایسا مجاہد عالم میں نازِ دو عالم ہوتا ہے

فیضِ مدّاحی نے لفظوں کو عطا کی زندگی اک حقیقت اک تڑپ ہے نجم کے اشعار میں

نجم غنیمت ہے یہ سینہ زنی قوم کی یاد تو اسلاف کی تیغ زنی رہ گئی

کب حضوری میں بلاتے ہیں حسینؑ ابن علیؑ دیکھتا ہوں نجم کب تک گردشِ ایّام ہے

مزا ملا ہے وہ دل کو تیری ولا کے نثار حیاتِ نجم کے لمحے بڑھا دیے تو نے

جنّت کی سند بن جائے گی اے نجم ثنائے آلِ نبیؐ نظمیں یہ ہماری پہنچیں گی جب ان کی سخی سرکاروں میں

سرکارِ اہلِ بیتؑ کا شاعر بنا دیا اب اور نجم طالعِ بیدار کیا کریں

مرکزِ غم حسینؑ کا ہندوستاں ہے نجم آباد پُربہار یہ ہندوستاں رہے

کربلا جانے کا کچھ ساماں نظر آتا نہیں نجم دل پر ایک یہ داغِ تمنّا بھی سہی

مجھے نجم کوئی کہا کرے میں بلندِ اوجِ فلک سے ہوں　　مجھے مدحِ آلِ رسولؐ نے مہ و مہر سے بھی بڑھا دیا

کچھ غور کرو نجم کے مفہومِ سخن پر　　دیوانہ سمجھتے ہو تو مرنے کی دعا دو

سنسار کی مایا کوئی نہیں کچھ دوہے ہیں کچھ نوحے ہیں　　نجمی یہی مایا لائے تھے نجمی یہی مایا چھوڑ گئے

اِسی دھن میں نالے کیے جاؤ نجمی　　یہ نوحے ہیں دل کو بلا دینے والے

سُنا کر نجم قصہ کربلا والے شہیدوں کا　　مسلمانوں کو سمجھا دو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

فاطمہؑ کا مہ پارا ہے جگت گرو نجمی　　آج سب کو پیارا ہے جس پہ کل یہ بپتا تھی

نجمی حسینیتؑ کی طرف جھک رہے ہیں دل　　مصروف غور و فکر میں ساری خدائی ہے

رُت بند کی بدلے گی محرم کی بدولت　　نجمی یہ بہار آئے گی ماتم کی بدولت

اس دیس کی آنکھیں بھی نجمی پیاسی تھیں حسینیؑ درشن کی　　بھارت میں اجالا پہنچا ہے کربل میں درس دکھلایا تھا

رہے خالی جو فکرِ منقبت سے ذکرِ مولاؑ سے　　وہ لمحے زندگی کے نجم ہم نے رائیگاں سمجھے

شہِ دیں کا تصرّف ہے یہ نوحہ مرثیہ ورنہ　　میں جس عالم میں ہوں اے نجم دنیا کو خبر کیا ہے

حالت ہی نجم کب تھی نوحہ گری کے قابل　　ہم چپ ہی ہو چکے تھے دل نے مگر نہ مانا

دیارِ ہند کے محبوب ہیں حسینؑ اے نجمؔ محال ہے کہ یہاں غمِ حسینؑ کا نہ رہے

نجمؔ آتے ہیں وہ آہ و لب دست بہ سینہ دیکھے تو کوئی شاعرِ سرکار کا عالم

نجمؔ وہ بڑے دل والے تھے دل نام سے دھک دھک کرتے ہیں یاد ان کی سا کر سینوں میں ماتم کی دھک بن جاتی ہے

زیارت کا شرف حاصل ہو جب اے نوحہ خواں تجھ کو فضائے کربلا میں نجمؔ کا نوحہ سُنا دینا

اب غلاموں میں وہ گنے نہ گنے نجمؔ آقا یہی ہمارا ہے

پاؤں عابدؑ کے کہاں زنجیر کی ایذا کہاں کربلائے شام تک نالے کیے زنجیر نے

نجمؔ نوحوں کو صداقت کا مرقع کردیا کربلا کے غم نے غم کی دائمی تصویر نے

جہاں میں نجمؔ یہ کرب و بلا کا افسانہ کہا گیا مگر اس شان سے کہا نہ گیا

حضور نجمؔ کو اب کربلا میں بلوالیں اجل غریب کی نزدیک آئی جاتی ہے

زمینِ سخن آسماں بن گئی ہے وہ گردوں سے اے نجمؔ تارے اُتارے

پیکرِ شاعری میں نجمؔ نور حیات آگیا رلاتِ اہلِ بیتؑ سے جذبۂ دل سنور گئے

منزل شبیرؑ تک نجمؔ نہ پہنچیں گے ہم آہ و بکا تک اگر جوشِ ولا رہ گیا

کیا کہتے ہوں گے نجم شہیدانِ کربلا راہِ عمل میں قوم کی رفتار دیکھ کر

دنیا میں وقت نجم کا اچھا گزر گیا مولا کے غم میں غم تو خوشی میں خوشی رہی

مرجائے نجم مدح سرائی میں آپ کی حسرت ہے کام آئے مری جان آپ کے

قدرت ہے اگر نجم تو نوحہ کی زباں میں ہر قوم کو شبیرؑ کا پیغام سنا دے

کہاں اشکِ غم اور کہاں قصرِ جنّت ہمیں نجم قیمت گھٹائے ہوئے ہیں

ہوئے کامل سخنور مدحتِ آلِ پیمبرؐ سے ہمیں اے نجم سب کچھ آ گیا اب اور کیا آئے

جناب نجم مقصد اور بھی کچھ ہے شہادت کا سُنا ہے قوم اور مقصد سے محرم ہوتی جاتی ہے

ابھی نجم کچھ اور نوحے سُناؤ ذرا قوم کی بے حسی جا رہی ہے

نجم ہم کو عیشِ فردوس تولا ہے بہت ہم تمنائی نہیں فردوس کی جاگیر کے

نجم کتنے کام مداحانِ اہل بیتؑ کے بے بنائے رنگ لائے بے سنوارے بن گئے

نجم اربابِ غرض نے دل کے ٹکڑے کر دیے زندگی نعمت سہی نعمت سے بھی دل بھر گیا

اے نجم میری فکر کی اللہ رے ہمتیں چاہوں تو بامِ عرش سے تارے اُتار دے

نجم اپنی زندگی ہے وقفِ مدح اہل بیتؑ　　شاعرِ سرکارِ اہل بیتؑ کہلاتے ہیں ہم

انساں حسینیتؑ کو سمجھے گا نجم اک دن　　جوہر نہ یہ ملیں گے دنیا کی خاک چھانے

اے نجم یہی شاید عنوانِ سفارش ہو　　امید تو ہے اتنی آقا کی تولا سے

کس سے پوچھوں کہ سمجھتے ہیں وہ شاعر اپنا　　نجم کا نام بھی فہرست میں لکھا دیکھا

قیامت ہیں نجمی کے پُر درد نوحے　　عزا دار کا دل ہلا دینے والے

نجم دنیا آل پیغمبرؐ کی دشمن ہی رہی　　دل پہ کیا کیا داغ اُمت کے نگہباں لے گئے

میں نجم اپنا فرض سمجھتا ہوں منقبت　　ناداں ہے دل جزا کا جو امیدوار ہو

شاعر ہیں اہل بیتؑ رسالتؐ پناہ کے　　اُٹھا یہ شور نجم جو مجلس میں آ گئے

جس در کے فقیروں میں بشر بھی ہیں ملک بھی　　ہاتھ اپنے وہیں نجم بھی پھیلائے ہوئے ہیں

نجم کہیں ہمارے بعد اہلِ عزا یہ نہ کہیں　　نجم کی طرح پھر کوئی نوحہ سرا نہیں ہوا

تھے نجم خوش نصیب کہ ذکرِ حسینؑ پر　　روحی فداک کہہ کے جہاں سے گزر گئے

جناب نجم یہ عزلت گزینیاں کب تک　　یہ بے نیاز روش چھوڑیے خدا کے لئے

اب جلد آستانے پہ اپنے بلایئے　　کب تک جیئے یہ نجم گناہگار آپ کا

نجم ہو اگر نسبت اُسوۂ حسینیؑ سے　　ایک شعر مدحت میں خلد کا قبالا ہے

عطا کی میرزائی نجم کو پھر مدح کی نعمت　　کیا ممتاز قدرت نے زبانِ میرؔ سے پہلے

ہر ذرۂ وطن کو اے نجم دل بنادو　　ہندوستاں میں آقا تشریف لا رہے ہیں

بھاشا کے رسیلے شبدوں میں دُکھ روپ کہانی کربل کی　　محنت پہ سوارت ہو نجمی یوں کون کسے سمجھاتا ہے

نجم گردوں سر بسجدہ ہے ستارے بے زباں　　کس سے پوچھیں تم نے کیا دیکھا شبِ عاشور کو

اب جا کے ہمالہ پربت سے لَے ماتم کی ٹکراتی ہے　　اس دیش کی نجمی دور بلا جس دیس پہ یہ غم چھائے گیا

نجم وہ جانِ وفا ہے ہے وہ ایمانِ وفا　　یہ علَم آتا ہے کس کے خون میں تر دیکھنا

میں نجم ایک ذرہ ہوں تیری رہ گزر کا　　شاعر ہوں تیرے در کا اے عرش آشیانی

خدا ایسا کرے مقبول ہو یہ نجم کا نوحہ　　پسند آجائے تجھ کو یہ محبت کی زباں اکبرؑ

جب آئے حسینیؑ سیوا میں سب ہندو مسلم ایک ہوئے　　مل جائیں گے نجم دل ہی کبھی جب ان کی نجر پر بات رہی

آرام سے سو اے شبِ عاشور کے جاگے　　لوری تجھے دیتا ہے ترا نجم سخنور

مجلس میں ہوش کس کو اے نجمؔ جان و تن کا اُترا ہوا وہ چہرہ، ڈھلکا ہوا وہ منکا

روکو قلم کو نجمؔ سخنور ہے سر بسجدہ جانِ پیمبرؐ

کیا جان دے کے نجمؔ گیا جانِ مرتضیٰ جب موت میں حیات تھی خنجر گلے پہ تھا

غم حسین میں روئیں گے نجمؔ جی بھر کے کہیں یہ درد دلوں میں چھپائے جاتے ہیں

کچھ نہ پوچھو نجمؔ اس دم برہمی کونین کی ذبح جب رن میں نبیؐ کی کود کا پالا ہوا

نجمؔی یہ حسینؑ چوکھٹ ہے یاں آ کے مرادیں ملتی ہیں اس دُوار سے بھکشا لے کے چلے

تیرا غم تیری محبت نجمؔ کا اسلام ہے اے شہیدِ کربلا تجھ پر سلام اسلام کا

اس شام کے خیال سے دل کانپتا ہے نجمؔ عاشور کی وہ شام وہ رَن بولتا ہوا

اپنے کو جو چاہے نجمؔی اس کو کون نہ چاہے بھارت ماتا سوگ منا کر من ہر لین ہمارا

تقریر کے قربان متررؔ کے تصدق اے نجمؔ ستمگر کا بھرم کُھل گیا سارا

گو مشتِ خاک سے بھی ہے کم کائناتِ نجمؔ نقش قدم پہ تیرے تصدق حیاتِ نجمؔ

دنیا کو خوں رُلائے گی یہ داستاں بہت نوحے کہیں گے نجمؔ سے شیریں زباں بہت

پاؤں تھک جائیں تو ہمت کے قدم لے کر چلو　　نجمؔ آؤ بزمِ ماتم میں قلم لے کر چلو

جب آنکھ سے آنسو ڈھل کر نجمیؔ تن کا گرد دھوتے ہیں　　جب گھر گھر ماتم ہوتا ہے جب رونے والے روتے ہیں

نجمؔ ایک نظر کا خواہاں ہے مرضی جو نہیں یہ بھی نہ سہی　　دربار میں شامل ہو کہ نہ ہو شاعر ہے یہ تیرا تیرے لیے

ہے نجمؔ کی ہستی کیا اے کرب و بلا والے　　کس نے تجھے سمجھا ہے کس نے تجھے جانا ہے

یہ دل میں دردِ محبت یہ نجمؔ جوشِ سخن　　یہ تیرا خامۂ ماتم نگار کیا کہنا

در پہ تیرے صف بہ صف تارے بھی ہیں چاند بھی　　نجمؔ کی خاطر فقط گردشِ ایّام ہے

یہ نجمؔ نوحہ گر کا نوحہ قبول کرلے　　اے مجلسِ عزا میں تشریف لانے والے

نجمؔ آئے تو اہلِ دل نے کہا　　دردِ یکسر غم تمام آئے

آتا ہے اس کو یاد جب وہ کاروانِ تشنہ لب　　ہے نجمؔ کا نوحہ یہی اے وائے نہرِ علقمہ

عازمِ زیارت ہے نجمؔ ایک مدت سے　　کس کو اب صدا تو نے ارضِ کربلا دی ہے

شاعر ہوں اہل بیت کا میں نجمؔ دلفگار　　پہچانتے ہیں کشتۂ راہِ خدا مجھے

نجمؔ غرورِ ملت ہے جلوہ طرازِ کرب وبلا　　ایسا مجاہد عالم میں نازِ دو عالم ہوتا ہے

فیضِ مدّاحی نے لفظوں کو عطا کی زندگی　　اک حقیقت اک تڑپ ہے نجمؔ کے اشعار میں

نجمؔ غنیمت ہے یہ سینہ زنی قوم کی　　یاد تو اسلاف کی تیغ زنی رہ گئی

کب حضوری میں بلاتے ہیں حسینؑ ابنِ علیؑ　　دیکھتا ہوں نجمؔ کب تک گردشِ ایّام ہے

کربلا پہنچے ہزاروں قافلے　　نجمؔ ہم آنسو بہاکر رہ گئے

مزا ملا ہے وہ دل کو تڑی ولا کے نثار　　حیاتِ نجمؔ کے لمحے بڑھا دیے تو نے

جنّت کی سند بن جائے گی اے نجمؔ ثنائے آلِ نبیؐ　　نظمیں یہ ہماری پہنچیں گی جب اُن کی نجفی سرکاروں میں

سرکارِ اہلِ بیت کا شاعر بنا دیا　　اب اور نجمؔ طالعِ بیدار کیا کریں

ان کے تصدّق سے نجمؔ قوم ہے سب اہلِ دل　　درد ملا اس قدر دامنِ دل بھر گئے

کربلا جانے کا کچھ ساماں نظر آتا نہیں　　نجمؔ دل پر ایک یہ داغِ تمنا بھی سہی

مجھے نجمؔ کوئی کہا کرے میں بلند اوجِ فلک سے ہوں　　مجھے مدحِ آلِ رسولؐ نے مہ و مہر سے بھی بڑھا دیا

کچھ غور کرو نجمؔ کے مفہومِ سخن پر　　دیوانہ سمجھتے ہو تو مرنے کی دعا دو

اب اس فضا میں رہنے کو دل چاہتا نہیں　　اے نجمؔ ترکِ ہند کا سامان کیجیے

اے نجم الٹ جائے گا یہ پردۂ غیبت نکلے گا اِدھر تیغ بکف مرکزِ خجت

نجم کو بھی یاد رکھنا دار وگیر حشر میں اے زمینِ کربلا کے چاند تارو الوداع

سنسار کی مایا کوئی نہیں کچھ دو ہے ہیں کچھ نوحے ہیں نجمی یہی مایا لائے تھے نجمی یہی مایا چھوڑ گئے

اسی دُھن میں نالے کیے جاؤ نجمی یہ نوحے ہیں دل کو ہلا دینے والے

حشر میں انجام کیا ہوتا ہے نجمی دیکھیے پوچھتے ہیں وہ بھی شاعر جن کے کہلاتے رہے

سناکر نجم قصہ کربلا والے شہیدوں کا مسلمانوں کو سمجھادو مسلماں ایسے ہوتے ہیں

فاطمہ کا مہ پارہ ہے جگت گرو نجمی آج سب کو پیارا ہے جس پہ کل یہ بپتا تھی

نجم کے دل سے نہ آئیں لب پہ نالے یہ اگر کیا عجب ہے منہ کو آجائے کلیجہ اے حسینی

نجمی حسینیت کی طرف جھک رہے ہیں دل مصروفِ غور و فکر میں ساری خدائی ہے

اس دیس کی آنکھیں بھی نجمی پیاسی تھیں حسینی درشن کی بھارت میں اُجالا پہنچا ہے کربل میں درس دکھلایا تھا

اے نجم دیکھو یہ حق نمائی اللہ اس کے غم کی رسائی

اشکِ عزا کی تہہ میں ہے طوفاں چھپا ہوا دنیا میں نجم چشمِ حقیقت نگر نہیں

رہے خالی جوفکرِ منقبت سے ذکرِ مولا سے وہ لمحے زندگی کے نجمؔ ہم نے رائیگاں سمجھے

شۂ دیں کا تصرف ہے یہ نوحہ مرثیہ ورنہ میں جس عالم میں ہوں اے نجمؔ دنیا کو خبر کیا ہے

بجھ گیا تھا نجمؔ جب قمرِ پیمبرؐ کا چراغ کیا یونہی تاروں سے روشن چرخِ نیلی فام تھا

حالت ہی نجمؔ کب تھی نوحہ گری کے قابل ہم چُپ ہی ہو چکے تھے دل نے مگر نہ مانا

دیارِ ہند کے محبوب ہیں حسینؑ اے نجمؔ محال ہے کہ یہاں غم حسینؑ کا نہ رہے

نجمؔ آتے ہیں وہ آہ بہ لب دست بہ سینہ دیکھے تو کوئی شاعرِ سرکارؐ کا عالم

نجمؔ وہ بڑے دل والے تھے دل نام سے دھک دھک کرتے ہیں یادان کی سما کر سینوں میں ماتم کی دھمک بن جاتی ہے

ہماری روح بھی نجمؔ عزا دارِ حسینؑ تھی کھلکتے دل میں اس نشتر کو تیرہ سو برس گزرے

زیارت کا شرف حاصل ہو جب اے نوحہ خواں تجھ کو فضائے کربلا میں نجمؔ کا نوحہ سنا دینا

اب غلاموں میں وہ گنے نہ گنے نجمؔ آقا یہی ہمارا ہے

نجمؔ نوحوں کو صداقت کا مرقع کر دیا کربلا کے غم نے غم کی واقعی تصویر نے

جہاں میں نجمؔ یہ کرب وبلا کا افسانہ کہا گیا مگر اس شان سے کہا نہ گیا

حضور نجمؔ کو اب کربلا میں بلوالیں اجل غریب کی نزدیک آئی جاتی ہے

کوئی اے نجمؔ کہہ دیتا یہ ملت کے خداؤں سے بچالیتے ہیں یوں کشتیِ اُمت ناخدا ہوکر

زمینِ سخن آسماں بن گئی ہے وہ گردوں سے اے نجمؔ تارے اُتارے

پیکرِ شاعری میں نجمؔ نورِ حیاتِ آگیا رلاتِ اہل بیت سے جذبۂ دل سنور گئے

منزلِ شبیرؑ تک نجمؔ نہ پہنچیں گے ہم آہ و بکا تک اگر جوشِ ولا رہ گیا

کیا کہتے ہوں گے نجمؔ شہیدانِ کربلا راہِ عمل میں قوم کی رفتار دیکھ کر

دنیا میں وقت نجمؔ کا اچھا گزر گیا مولاؑ کے غم میں غم تو خوشی میں خوشی رہی

مرجائے نجمؔ مدح سرائی میں آپ کی حسرت ہے کام آئے مری جان آپ کے

قدرت ہے اگر نجمؔ تو نوحے کی زباں میں ہر قوم کو شبیرؑ کا پیغام سنادے

کہاں اشکِ غم اور کہاں قصرِ جنّت ہمیں نجمؔ قیمت گھٹائے ہوئے ہیں

رُت ہند کی بدلے گی محرم کی بدولت نجمؔی یہ بہار آئے گی ماتم کی بدولت

ہوئے کامل سخنور مدحتِ آل پیمبرؐ سے ہمیں اے نجمؔ سب کچھ آگیا اب اور کیا آئے

نجمی کوئی سبق نہ لیا کربلا سے کیا　　کیوں بے حسی کا قوم پہ الزام آگیا

ہمراہ ہوں اے نجم یہ نوحے یہ قصیدے　　جب ملکِ عدم کے لیے حکمِ سفر آئے

نجم اسی کے فیض سے شاعرِ اہلِ بیتؑ ہوں　　دین کے آفتاب کی یہ بھی ہے ذرّہ پروری

ہنگامہ ہے اب قتل کا اے نجم دل افگار　　مولاؑ و لے خاموش ہیں رن بول رہا ہے

اے نجم کچھ نہ پوچھو اس وقت کی جلالت　　تنہا تھے دشمنوں میں جس وقت شاہؑ والا

سوئے دیارِ کربلا جب کوئی قافلہ گیا　　نجم وہ بدنصیب ہیں رہ گئے دل کو مار کے

زحتِ عزا پہن کر اے نجم گھر سے نکلو　　ہندوستاں میں آئی سرکار کی سواری

شاید یہی دربار میں مقبول ہو نجمی　　نوحہ تو نہیں قابلِ سرکار ہمارا

اے نجم جبیں ہوتی ہے چوکھٹ پہ نجف کی　　میں مدح کے عالم میں فلک پر نہیں ہوتا

شعر و سخن میں نجم یہ ہیں بے نیازیاں　　بیٹھا ہوں اجتہاد کی قوت لیے ہوئے

ابھی نجم کچھ اور نوحے سناؤ　　ذرا قوم کی بے حسی جارہی ہے

نجم کہیں ہمارے بعد اہلِ عزا نہ یہ کہیں　　نجم کی طرح پھر کوئی نوحہ سرا نہیں ہوا

خود پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی بن گئی　　نجمؔ آخر شاعرِ آلِ پیمبرؐ ہوگئے

یادِ علیؑ ہے دل میں دنیا سے جارہا ہوں　　اے نجمؔ درحقیقت یہ موت زندگی ہے

بُلالیں شاید آقا کربلا میں موت سے پہلے　　ابھی اے نجمؔ کچھ امید ہے امیدواری ہے

اب جلد آستانے پہ اپنے بلایئے　　کب تک جیئے یہ نجمؔ گنہگار آپ کا

اے نجمؔ کاش مجھ سے اتنا ہی کوئی کہہ دے　　کس دل سے یہ جسارت کس منہ سے عذرخواہی

نجمؔ اپنی زندگی ہے وقف مدحِ اہل بیتؑ　　شاعرِ سرکارِ اہلِ بیتؑ کہلاتے ہیں ہم

نجمؔ شاعر ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کے در کا　　اور دنیا میں نہ منصب ہے نہ جاگیر کوئی

صلہ میں خلد وہ دیں گے تو نجمؔ کہہ دیں گے　　تمھارے نقشِ قدم پر نثار کرتے ہیں

شاعر ہوں جن کا نجمؔ وہ ہیں وجہ کائنات　　ممکن ہے تابد مرا نام و نشاں رہے

نجمؔ میں وہ شاعرِ دربارِ اہلِ بیتؑ ہوں　　غم نے چھانٹا ہے مجھی کو فردِ کامل دیکھ کر

اے نجمؔ مدحِ آلِ نبیؐ میں گذاردوں　　اللہ عمرِ خضر جو مجھ کو عطا کرے

چارپشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزّ وشرف　　نجمؔ فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفیٰؐ

میرے آبا کا شرف ہے میری فطرت کا خمیر　　نجمؔ صدیوں سے ہے فخرِ مدحِ آلِ مصطفیٰؐ

تیری مدحت ہو تو نظمِ نجمؔ کا کیا پوچھنا　　نجمؔ ہے اپنی جگہ پر بے حقیقت اے حسینؑ

بن گئی انسان کی معبد زمینِ کربلا　　نجمؔ جب عزم و عمل کی زندگی لائے حسینؑ

بہت پیام ملیں گے مرے سلام میں نجمؔ　　نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

نجمؔ اس میں تصور بھی بے جا ہے برائی کا　　غمِ سبطِ پیمبرؐ کا جس دل کی امانت ہے

نجمؔ اس کی نذر ہے یہ زلزلہ انگیز نظم　　جس کی حسرت ناک خاموشی تھی طوفاں در کنار

نجمؔ میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیح　　مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

سب سے کم رتبہ سہی لیکن یہ رتبہ کم نہیں　　نجمؔ بھی تیرے ثنا خوانوں میں شامل ہے حسینؑ

میں ہوں کلیمِ طور ثنائے علیؑ کا نجمؔ　　انداز ہیں کلام میں نقشِ دوام کے

عقیدت ہے مجھے اے نجمؔ پورے خانوادے سے　　خدا کا شکر ہے میں ہوں ثنا خوانِ ابو طالبؑ

جب مدحِ پیمبرؐ کرتا ہوں وہ زورِ سخن بڑھ جاتا ہے　　اے نجمؔ سلامی دینے کو الفاظ کے لشکر آتے ہیں

تمام روشنیاں ہیں انھیں کے نور سے نجمؔ　　فروغِ ملت بیضا ہیں جعفرؑ صادقؑ

جگہ فرزدقؔ و دعبلؔ کی نجمؔ کو ملتی　　قریبِ طائرِ سدرہ کچھ آشیاں ہوتے

نمازِ مدح پڑھتا ہوں مؤدّت کے مصلے پر　　دکھادو نجمؔ دنیا کو یہ رتبہ ہے سخنور کا

ہے حضرتِ ناسخؔ سے تلمذ کا تسلسل　　نسبت ہے مجھے نجمؔ بڑے اہلِ ہنر سے

ہم نے منزلت دی ہے نجمؔ نظمِ اردو کو　　ہر زمین پر ہم نے آسماں اُتارا ہے

سنسار کے بھولے بسروں کو اپدیش نیا مل جاتا ہے　　ہر سال جو نجمؔی پیاسوں کا ہم سوگ منایا کرتے ہیں

اے نجمؔ یہی اپنی بخشش کے سہارے ہیں　　زینبؑ کے دُلارے ہیں زینبؑ کے دُلارے ہیں

جو نیم جاں تھے بھوک سے جو پیاس سے نڈھال　　اے نجمؔ آج ان کی سیاست ہے لازوال

رخصت طلب ہے نجمؔ کی اب عارضی حیات　　ستر برس کی عمر میں کچھ کم نہیں یہ بات

بزمِ سخن میں آگئے نجمؔ خودی کو چھوڑ کر　　بن گئے کب سے آدمی زحتِ جنوں اتار کے

نجمؔ ہم موحد ہیں ہم پہ کیا اثر ہوتا　　بے شمار بدلے ہیں رنگ روپ دنیا نے

مرے قابو میں نہ تھی نجمؔ مرگِ ناگہاں　　تھیں مقدر زیست کی بدنظمیاں دیکھا کیا

نجمؔ اک عمر میں احباب پہ یہ راز کھلا　　جتنا بدنام تھا میں اتنا گنہ گار نہ تھا

مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے — ہجم آپ کی ہی ہے وہ دوام شعر گوئی

میں نے آنکھیں بند کرلیں شدّتِ غم دیکھ کر — ہجم افراطِ محبت نے مجھے گم کردیا

کس رنگ میں لکھے گی دنیا مرا افسانہ — اے ہجم میں پتلا ہوں رنگ اور تلوّن کا

کس تبسّم کا خزانہ مرے آب و گل میں ہے — ہجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر

چاندنی کی بارش میں یہ ڈھلی ہوئی شب کیا — ہجم سوچتا ہوں میں کچھ مجھے سکون دے گی

قصد ہے تو کر ڈالو آج کل اور اب تب کیا — یوں تو سو بہانے ہیں ہجم کچھ نہ کرنے کے

کب تک چراغِ سوزِ محبت بجھا رہا — سوچے گی ہجم فطرتِ انساں ہمارے بعد

مرا ہر لفظ ہونٹوں پر اب پیمانہ ہوجائے — غزل ہو ہجم میری اور زباں اس نغمہ پرور کی

کہاں تک یہ آنسو پئے جایئے — کبھی ہجم طوفاں اٹھانا بھی ہے

ہجم کچھ آہٹ سی پاکر رہ گئے — بڑھ چلے تھے دل کی منزل سے مگر

جس کسی محفل میں پہنچے ہجم ہم ہی ہم رہے — سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیتِ شعر و سخن

زمینِ شعر مرے دم قدم سے آسمانی ہے — میں پھیلاتا ہوں نور اے ہجم اپنے کنجِ عزلت سے

وہ کون ہے اے نجم جو میخانہ میں آکر ساغر مرے آگے سے حریفانہ اٹھالے

کریں گے نجم کیا اُردو کے دشمن قدر اُردو کی جو پشتینی سپاہی ہو وہ لشکر کی زباں سمجھے

شکستہ پا ہو جب اے نجم یہ ذوقِ سفر کیسا دلیلِ کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

جہنم میں جاؤں تو اے نجم رضواں اٹھاکر جہنم کو جنت میں ڈالے

بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے نجم میں ایک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانہ کا

کسی دن نجم کہنا ہے خدائے بندہ پرور سے تری زافِ کرم سے لی ہے تابِ سرکشی میں نے

ہوا ہے میری بے ربطی سے اے نجم بہت کچھ رابطہ عیب و ہنر میں

چھپاؤں نجم ان سے کس طرح آثار چہرے کے جو میرے ضبطِ غم کو دیکھ کر گھبرائے جاتے ہیں

نجم اس کے خلاف جانا ہے جس طرف زندگی کا دھارا ہو

حقائق ہی رہیں گے نجم میری سعی کا حاصل خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

لگا کے نجم محبت میں آخری بازی شعورِ فکر و نظر کی رقم بھی ہار آیا

محبت ہے کیوں نجم ہندوستاں سے چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

کسی دن جا ملے گی روح اس بحرِ حقیقت میں — کہاں تک واسطہ اے نجم آب و گل کے زنداں سے

خاک نجف سے خاک نجمِ حزیں ملا دے — الفت کی منزلوں میں دو دل ملانے والے

کچھ دن میں تیری یاد کی محفل اداس ہے — اب چل بسے گا نجم غزل خواں ترے بغیر

حق یہ ہے کہ سرکارِ نبوتؐ کے سوا نجم — معیارِ فضیلت کوئی سمجھا نہ علیؑ کا

مصائب سینکڑوں ہیں غم ہزاروں مشکلیں لاکھوں — تمھارا نجم ہے تنہا امامِ جعفرؑ صادق

پندرہ ماہِ رجب کی نجم دعوت جب ملی — اور کچھ دن زندگی کا اعتبار آ ہی گیا

وہ زباں دانِ محبت ہے خدا کے فضل سے — نجم کا ورثہ ہے اندازِ ثنائے بوترابؑ

ہے حضرتِ ناسخ سے تلمذ کا تسلسل — نسبت ہے مجھے نجم بڑے اہلِ ہنر سے

جناب نجم یہ اندازِ مدحت کیا پسند آئے — ابھی دنیا کو اندازہ نہیں لطفِ حقیقت کا

رہا محروم دو دن بھی جو شغلِ مدح گوئی سے — اسے اے نجم میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھا

میں نجم اپنا فریضہ جانتا ہوں یہ ثنا گوئی — مرا مقصد نہیں اظہار اپنی قابلیت کا

نجم اسلامِ حقیقی کبھی مٹنے کا نہیں — حسنِ سبز قبا سے ہے نشانِ اسلام

فضلِ خالق سے مرے افکار میں اشعار میں　　فلسفہ ہے نجم غالبؔ کا زباں میرؔ کی ہے

اے نجم سوال آئے اگر لطف و کرم کا　　مولا کی زباں پر کبھی ''لا'' ہو نہیں سکتا

مدحت کی جوانی ہے پیری ہی سہی میری　　احباب نہ یہ سمجھیں اب نجم میں دم کیا ہے

نجم شاعر ہے علی کا سب سے کمتر ہی سہی　　نکتہ داں ہو کر سدھارا نکتہ داں ہوکر رہا

بن گئی انسان کا معبد زمینِ کربلا　　نجم جب عزم وعمل کی زندگی لائے حسینی

عطا کی میرزائی نجم کو پھر مدح کی نعمت　　کیا ممتاز قدرت نے زبانِ میرؔ سے پہلے

جنابِ نجم یہ عزلت گزینیاں کب تک　　یہ بے نیاز روش چھوڑیے خدا کے لیے

نجم شاعر ہے حسینی ابنِ علی کے در کا　　اور دنیا میں نہ منصب ہے نہ جاگیر کوئی

نجم میں ہوں شاعرِ بزمِ حسینی ابن علی　　میرا نغمہ ہے فقط سازِ حقیقت کے لیے

شعور مدح بزرگوں کا فیض ہے اے نجم　　زہے نصیب یہ اعزاز خاندانی ہے

تقلید میری ہوتی ہے اہلِ سخن میں نجم　　چھایا ہوا دلوں پہ یہ طرزِ کلام ہے

رفعت ترے کلام کی عرش آشنا ہے نجم　　کھیلی ہے فکر دامنِ برق و سحاب میں

کہاں تک یہ مروّت نجمؔ اک دن حق کے منکر سے
خدا لگتی کہو جو دل کو تگ کر تیر ہو جائے

سب کہتے ہیں شاعر ہے دربارِ حسینیؑ کا
نجمؔ اپنی حقیقت سے غافل نظر آتا ہے

ڈوبا ہوا اے نجمؔ جو ہو عشقِ علیؑ میں
دنیا میں اسے کیا خبر سود و زیاں کی

شبیرؑ کے غم نے پرکھا ہے شبیرؑ کے غم نے سمجھا ہے
اے نجمؔ کہیں اس دنیا میں سودا ترے دل کا ہو نہ سکا

ان شجاعانِ ازل کا ہوں میں بندہ اے نجمؔ
تنِ تنہا بھی ہزاروں کو جو للکار آئے

اے یارب نہ ہو معلوم حالت نجمؔ کے دل کی
غمِ اسلام کم ہے اور غمِ دنیا فراواں ہے

اے نجمؔ میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں
نجمؔ مدّاحِ پیمبرؐ کی بلندی نہ پوچھ
خاک پر بیٹھے تو سر عرش سے جا ملتا ہے

میں اپنے شعر لے کر نجمؔ اس منزل میں کیا جاؤں
جہاں قرآن کی ایک ایک آیت ناز کرتی ہے

فضائے عرش میں اے نجمؔ رہتا ہے دماغ اپنا
فرازِ عرش سے اترے ہیں یہ اشعار کیا کہنا

نجمؔ میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ
کیوں نہ کرتی میرے در پر ناصیہ سائی غزل

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت
بنتے ہیں نجمؔ دیدۂ پُرنم سے آدمی

گزر جاتی ہے اک تازہ قیامت نجم کے دل پر
کسی کے لب پہ ارضِ تاج کا جب نام آتا ہے

وہ دور جو اے نجم تھا اُردو کا مخالف
اس دور میں اُردو کی ہوئی نشوونما اور

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

کیا نجم فریبِ دل سے بچیں
دنیا میں فریب دل ہی تو ہے

پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں
بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

بے ساختہ زباں پہ درود آرہا ہے نجم
اک روشنی سی منزلِ فکر و نظر میں ہے

انھیں بھی نجم دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر
جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

نجم ان کے مری طرح پرستار بہت ہیں
بندوں کی خدائی میں جو بندے تھے خدا کے

گلہ ہو شکر ہو تقدیر ہو کہ شعر ہو نجم
یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

کس مصیبت میں لطافت مری تخئیل کی ہے
نجم بے چین ہوں لفظوں کی گرانباری سے

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

قصیدہ عرض کیجے نجم شانِ حُسن میں کوئی
وہ کہتے ہیں غزل ارشاد فرمانے سے کیا ہوگا

یہ اے نجم تم حق پرستوں سے کہہ دو مبارک ہو سودائے خامِ محبت

نجم اس عہد میں بے قدر ہے کیوں جنسِ وفا کوئی اتنا نہیں کہتا کہ خریدار ہیں ہم

سخن طرازوں میں تنقید کی غرض سے سہی کلامِ نجم کا بھی ذکر لا کلام آیا

میں نجم حال کا مفہوم سمجھ نہ سکا مری نظر میں گزرتا ہوا زمانہ تھا

ہنرمندوں کا آپس میں حسد اے نجم کیا معنی ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہوکر

کوشش تو نجم دولتِ دنیا نے کی بہت بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

شریکِ حال نہ ہوتی جو نجم خودداری ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

مجھے انیسؔ کی عظمت پر رحم آیا نجم وہ رنگ چہرۂ یومِ انیسؔ پر دیکھا

عید ہی سہی لیکن میکدے میں ہم نہ تھے نجم ابرِ نوبہار دیکھتا چلا گیا

نجم بہتر ہے تصنّع کی دلآویزی سے تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

فطرتِ انساں پہ جب تک عشق کا پرتو فگن جوہرِ انسانیت کو نجم خطرہ کچھ نہ تھا

نجم فکر حسن میں اک حرف آخر اور ہے ہم ٹھہرنے کے نہیں پیغام پہنچانے کے بعد

فرمودۂ غالبؔ کے موافق ہوں میں اے نجمؔ
جینے کا یقیں کس کو ہے آہوں کے اثر تک

وحدت ہماری حاصلِ نوعِ بشر ہے نجمؔ
وابستہ ہیں جو دامنِ خیر البشرؐ سے ہم

کوئی حسینؑ کا ایثار نجمؔ کیا سمجھے
کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

کبھی یہ سوچتا ہوں نجمؔ میں اشعار پر اپنے
چڑھیں گی ان کی نظروں میں یہ آیاتِ جلی کب تک

آج کل سنتے ہیں نجمؔ لحن پر ملتی ہے داد
یوں زمانہ رخ نہیں کرتا غزل خواں کی طرف

آج اردوئے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ نجمؔ نکتہ داں باقی رہا

بگڑ کر قلم کار قسمت سے نجمؔ
محبت کی بگڑی بنانے چلے ہیں
اشکوں کی رو میں نجمؔ دل کا لہو بہا کر
غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

وہی لفظوں کی خوش نظمی وہی ترتیب کے تیور
جنابِ نجمؔ کی نظموں سے رعنائی نہیں جاتی

زبان شاعرِ کامل پہ ہو اگر اے نجمؔ
مری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

کچھ اضافہ کر کے اٹھو نجمؔ بزمِ شعر میں
وقت کا مصرف کہیں تحصیل حاصل میں نہ ہو

نجمؔ اس کے خلاف جانا ہے
جس طرف زندگی کا دھارا ہو

عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر　　محبت دل میں ہے اے نجمؔ اک انسانِ اعظم کی

غالبؔ کی طرح معترف میرؔ ہوں میں نجمؔ　　فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

فردِ قسمت اِس طرف ہوگی اُدھر فردِ عمل　　نجمؔ ظاہر قدرتِ عیب و ہنر ہوجائے گی

حقائق ہی رہیں گے نجمؔ میری فکر کا حاصل　　خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

نجمؔ فطرت ہے مری ولولۂ شعر و ادب　　میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

ایسے قلم اٹھانے کی نوبت نہ آئے نجمؔ　　جس طرح کھینچ لے کوئی تلوار نیام سے

حق ناشناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجمؔ　　خود دارئ سخن کو سخنداں سے کام کیا
ہم پہ وقت آیا تو خود داری شریکِ حال تھی　　نجمؔ اربابِ غرض دامن کشاں دیکھا کیے

اللہ رے محبت کہ محبت کی فضا میں　　نجمؔ اس نے کیا ہے مجھے خود میرے حوالے

تقلید میری ہوتی ہے اہلِ سخن میں نجمؔ　　چھایا ہوا دلوں پہ رنگ کلام ہے

پچپن برس کے ملک سخن پر تصرفات　　تیری ثنا گری ہے مرے گھر کی کائنات

اے نجمؔ مدح آل نبی میں گزار دوں　　اللہ عمرِ خضر جو مجھ کو عطا کرے

میں نجم نہیں واقف آسایش دنیا سے کچھ نوحہ و ماتم ہی نکلیں گے مرے گھر سے

نجم ہم نکلے جو ارض تاج سے خسروِ بے تاج ہوکر رہ گئے

نجم ارباب غرض نے دل کے ٹکڑے کردیے زندگی نعمت سہی نعمت سے بھی دل بھر گیا

میں نجم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

راس آئے جناب نجم تمھیں سالکِ جادۂ وفا ہونا

میرزا نجم سے نہ کچھ کہنا چاہے جو کچھ یہ کج کلاہ کریں

مہر و مہ بھی ہیں نجم دنیا میں آدمی سے مگر یہ بستی ہے
میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے نجم بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

نجم یہ نشانی ہے اہل دل کی دنیا میں ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

شاعر سمجھ کے نجم کو سمجھے ہیں سادہ دل واقف نہیں ہیں آپ بھی اس کج کلاہ سے

نجم میں قائل نہیں ہوں انکسار و عجز کا میں ہوں سلطانِ سخن اور فکر برحق ہے ندیم

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

○

غزلیات

کل غزلیات	=	195
مطبوعہ غزلیات	=	49
غیر مطبوعہ غزلیات	=	146
کل اشعار غزلیات	=	1932

فہرست غزلیات

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ	صفحہ نمبر
1	مرا دل ہے نقشِ دوامِ محبت	7	//	469
2	کفرِ نعمت ہے غمِ عشق میں فریاد نہ کر	7	//	469
3	مست وہ عیش میں ہیں غم سے گراں بار ہیں ہم	17	//	470
4	ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور	11	//	470
5	مری نظر میں نہ معیارِ صبح وشام آیا	11	//	471
6	خدا کی یاد کو بھی میکدہ میں آنا تھا	15	//	471
7	سچ ہے کہ وہ قریبِ رگِ جاں ضرور تھا	11	//	472
8	کسی دن داغِ گمراہی رہے گا ان کے سر ہو کر	17	//	473
9	احساسِ التجا بھی نہیں التجا کے بعد	13	//	473
10	ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا	13	//	474
11	جو اپنے دل کے طلاطم کا ترجماں ہوتا	10	//	475
12	نہ پوچھئے غمِ دوراں میں کیا اثر دیکھا	12	//	475
13	زمانے کی فضا میں انقلاب آنے سے کیا ہوگا	10	//	476
14	دے کے دل میں بے قرار دیکھتا چلا گیا	11	//	476
15	کھل گیا جامۂ ہستی کا گراں ہو جانا	14	//	477
16	خواب خوش کہنے ہی کو اپنا تھا اپنا کچھ نہ تھا	12	//	477
17	پھر نہ اٹھا کوئی فتنہ حشر ہو جانے کے بعد	13	//	478
18	جنوں کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر	18	//	478
19	پہنچیں گے نہ گمراہ تری راہ گزر تک	17	//	479
20	سوئے ابل بھی جائیں گے اس کرّ وفر سے ہم	19	//	480
21	حدِ گناہ میں آجاتی ہے نگاہ کبھی	14	//	481

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ	صفحہ نمبر
22	مجھے کرنا ہے کچھ پروانۂ آتش بجاں ہو کر	18	//	482
23	بن گئی قوسِ قزح جب لے کے انگڑائی غزل	16	//	482
24	دلی جذبات کے برعکس یہ صورت گری کب تک	13	//	483
25	آڑ ہے کعبہ کی سجدہ روئے جاناں کی طرف	13	//	484
26	لٹ لٹا کر تھا جو کچھ وہ بھی کہاں باقی رہا	10	//	484
27	اس قدر شدّتِ احساس میں ڈوبا ہوا ہوں	16	//	485
28	کبھی یوں کہیں سر جھکانے چلے ہیں	12	//	486
29	پینگ ان سے بڑھ رہے ہیں وہ دل پہ چھا رہے ہیں	13	//	486
30	کبھی چتون سے وضع کا رفرمائی نہیں جاتی	7	//	487
31	راہ رضا میں کہیں مصرفِ گناہ نہیں	12	//	487
32	سوچتا ہوں مصرفِ حق سعی باطل میں نہ ہو	11	//	488
33	بھر تو دے موت ذرا عمر کے پیمانے کو	9	//	488
34	پھر ادھر دیکھتے چلے جاؤ	10	//	489
35	میرے دل میں جو دل تمھارا ہو	9	//	489
36	سنو گے مجھ سے میری ڈوبتی کشتی کا افسانہ	11	//	490
37	نگاہِ دوست کی بے التفاتی رائیگاں کیوں ہو	13	//	490
38	مسلسل قہقہوں سے ہے تلافی شدّتِ غم کی	13	//	491
39	کس کرب سے وہ رات قفس میں بسر ہوئی	11	//	491
40	جب میں چاہوں گا شبِ غم مختصر ہو جائے گی	10	//	492
41	محبت کی نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی	9	//	492
42	بیکسوں کی صفِ ماتم پہ ہے رقصاں کوئی	21	//	493
43	عجب کیا عیش کی غفلت میں سارا دن گزر جائے	7	//	494

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ	صفحہ
44	کیوں اس کو چھیڑتے ہو شبِ غم کے نام سے	13	//	494
45	زندگی غم میں گزرتی ہے رواداری سے	11	//	495
46	انساں سے لاکھ دور ہوں انساں سے کام ہے	10	//	495
47	شب ہے تمام صبح کا تارا نظر میں ہے	8	//	496
48	مرتے مرتے اہلِ دل کیا سختیاں دیکھا کیے	14	//	496
49	اے تنگ نظر عشق کے جذبوں کو جگا لے	9	//	497
50	رہتے ہیں دور مرحلۂ غم سے آدمی	9	غیر مطبوعہ	498
51	دل ہم سے نہ سنبھلا دل ہی تو ہے	6	//	498
52	یہ خودداری ہے یا بیگانگی ہے رنگِ محفل سے	11	//	499
53	صلوٰۃ و صوم سے آئینِ سرکشی نہ بنا	7	//	499
54	ملی ہے موت بھی قسمت سے شاہکار مجھے	15	//	499
55	زیست کی حد ہے جہاں تک ہمّتِ مردانہ ہے	8	//	500
56	خاکے جو بنے عزم و عمل سے شہدا کے	11	//	501
57	مجھے بھی دل پہ میرے اختیار ہے کہ نہیں	4	//	501
58	موت لائے زندگانی لے گئے	6	//	501
59	میرے نفس نفس میں اشارہ سفر کا ہے	11	//	502
60	کیا خبر تھی زندگی کا مدّعا بدلیں گے ہم	6	//	502
61	کچھ عقل نے بگاڑا کچھ عشق نے سنورا	9	//	502
62	نازِ تسبیح و مصلّا اور ہے	8	//	503
63	مرا آغوشِ نظر یاد آیا	8	//	503
64	فضائے عشق میں لایا گیا ہوں	5	//	504
65	خداوندیاں ہیں ستم رانیاں ہیں	7	//	504

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
66	میں نے دیکھا ہے شباب آتا ہوا	7	//	504
67	بچ کے جو طوفانِ غم سے تر گئے	5	//	505
68	دنیا جسے ملتی ہے محبت نہیں ملتی	8	//	505
69	پھر غم و درد کی دھوپ ڈھلنے لگی	9	//	505
70	جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر	7	//	506
71	اللہ اللہ اہلِ دل کی دسترس	9	//	506
72	سنا سب کچھ جو سننا تھا کہا سب کچھ جو کہنا تھا	5	//	506
73	سکونِ دل کی لذت چاہتا ہوں	6	//	507
74	بلا ہے محبت ہماری تمھاری	7	//	507
75	کوئی ڈوبے کوئی ابھر آئے	7	//	507
76	میرے مزاجِ درد کو رسوا نہ کیجئے	7	//	508
77	کیا اپنا سانس لینا آہیں سی بھر رہے ہیں	6	//	508
78	فکر و دانش آزما کر کیا کروں	8	//	508
79	کچھ ایسی وضع کے دل ایسے غم بھی ہوتے ہیں	7	//	509
80	کیسی خموشی کیسے اشارے	8	//	509
81	خوش رہے خاک چھاننے والا	7	//	509
82	پوچھے کیا ہو جلالت اُس حریم ناز کی	11	//	510
83	دنیا سے گزرتا ہے گزرنا نہیں آتا	6	//	510
84	کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا	6	//	511
85	جی رہے ہیں سہل و ممکن کے لئے	6	//	511
86	مجھے بھی دل پہ مرے اختیار ہے کہ نہیں	7	//	511
87	تعمیرِ آدمیت ترکیبِ رنگ و بو ہے	8	//	512

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
88	ستم کو مذہب وملت کا آسرا نہ رہے	6	//	512
89	حال پر بارہا زوال آئے	10	//	512
90	یہ بھی ہے کوئی زندگی کیا یہی کائنات ہے	6	//	513
91	اے درپے سیاست آگاہِ راز ہو جا	6	//	513
92	زندہ دلوں نے بارہا بحرِ فنا سے دی نجات	11	//	513
93	بادۂ تلخ کام کیا کرتا	7	//	514
94	جلوے ترے نظر میں سموئے ہوئے سے ہیں	7	//	514
95	حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی	13	//	515
96	قفس میں جو ہمیں توہینِ غم نظر آئی	14	//	515
97	بیٹھے ہو کب سے منہ کو موڑے	7	//	516
98	اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی	7	//	516
99	بہت بڑھ چلی زندگانی ہماری	7	//	517
100	نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا	10	//	517
101	کہوں گا کچھ نہ قلبِ ناتواں کی	9	//	517
102	زمیں بوئے خوں سے مہکتی رہی	10	//	518
103	زخمِ دل زخمِ زباں سب سہہ گئے	7	//	518
104	خوب بیٹھے ہیں بہم سمجھے ہوئے	8	//	519
105	گھر میں خزاں کا دور چمن میں بہار ہے	9	//	519
106	وقت کی پرستش کیا آدمی کا مذہب کیا	12	//	519
107	تبسّم ہو کہ آنسو چشمِ تر میں	8	//	520
108	زورِ سخن سے اک جہاں روز نیا بنا دیا	7	//	520
109	عشق تھا حُسنِ کارساز ان کا	9	//	521

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
110	راہِ وفا کے راہی کچھ ہم سفر بنا لے	14	//	521
111	بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے	15	//	522
112	کیوں اے فضائے درد کہیں دل نہیں رہا	12	//	523
113	موت کی آغوش میں بھی زیست کا دم خم رہے	15	//	523
114	بے حسوں کو درد کی منزل میں لا سکتا ہوں میں	8	//	524
115	غریبوں کی جسارت پر وہ منہ حیرت سے تکتے ہیں	10	//	524
116	نہ گدائی مجھے دے اور نہ سلطانی دے	6	//	525
117	شکستہ ہوش نہیں ہوں شکست پاؤں کیا	10	//	525
118	عشق کو حُسن بنانے کو چلے	7	//	525
119	ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے یہ دولت میری	9	//	526
120	درد ہے خیال ان کا زندگی ہے خواب ان کا	5	//	526
121	میرے ہونٹوں پر تبسّم میرے دل میں ہائے ہے	6	//	527
122	حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا کے چھوڑ دیا	5	//	527
123	ان کو دیکھا بے خودی سی ہوگئی	6	//	527
124	کہاں ہے محبت کو کیا ہوگیا	10	//	527
125	دردِ دل حاصلِ نظر پایا	5	//	528
126	ہم دکھائیں گے جو سُن آئے ہو افسانوں میں	10	//	528
127	وہ دور چلے گا تا بہ کجا مئے جس کی سبیل عام نہیں	11	//	529
128	محبت کی وہ آہٹ پا نہ جائے	9	//	529
129	اب اتنی تو ہمت کیے جایئے	5	//	530
130	ترے نام کو رہگزر دے رہا ہوں	9	//	530
131	کائناتِ غم کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں	16	//	530

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
132	لب پہ کس کس کا نام آتا ہے	16	//	531
133	کیا سکوں دے گی نئے دور کی روداد مجھے	15	//	532
134	اعلانِ غریت کا اب اردو زباں سے ہے	19	//	532
135	ہونا لفظوں میں ادا عشق کا وہ جوش نہ تھا	10	//	533
136	وہ بھی تھا وقت کہ محفل میں تری بار نہ تھا	11	//	534
137	عشق حسنِ فطرت ہے دل جو یوں پگھلتا ہے	6	//	534
138	مرنے والا مرتے مرتے سختیاں دیکھا کیا	14	//	535
139	یہیں آئے دن رہیں گے جو فسادِ باغباں سے	13	//	535
140	رنگ کچھ سے کچھ ہوا نیرنگ عالم دیکھ کر	8	//	536
141	لائی غفلت مجھے دنیا کی ہوا کھانے کو	7	//	536
142	روتے نہ کھے اور تڑپتے نہ بسر ہو	10	//	537
143	وہ حسن سے بے قابو اک عشق میں دیوانہ	15	//	537
144	جس کو سو آسانیاں تھیں وہ بھی کچھ مشکل میں ہے	10	//	538
145	ان کا سکوں تباہ کئے جا رہا ہوں	4	//	538
146	وہ جلوہ گر نہیں تو نگاہوں میں کیا رہے	8	//	539
147	شراب و شعر و نغمہ کے اثر کی یاد آتی ہے	10	//	539
148	بہت ہیں یوں تو پروانے حرم کی شمع سے پوچھو	6	//	539
149	درِ ساقی کھلے اک سجدۂ مستانہ ہو جائے	9	//	540
150	حسن ہے ان کا ایک قیامت کیا کہیے	3	//	540
151	مہرِ حق میں خاموشی حوصلہ کی پستی ہے	4	//	540
152	میرا وہ غم رہا نہ وہ ان کی خوشی رہی	9	//	541
153	کون خدا خدا کرے وقت کا مقتضا نہیں	9	//	541

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
154	اُس نظر کی چوکھٹ کھا کر رہ گئے	11	//	541
155	دشمنی سہی لیکن دوست بن کے مارا ہے	13	//	542
156	مسافر ہوں مگر کیا زندگانی پر حکمرانی ہے	8	//	543
157	امید صبح کیوں دِل حسرت اثر نہیں	15	//	543
158	تجھ میں ہو اگر جرأت رندانہ اٹھا لے	13	//	544
159	نگاہیں میرے پہچانے مرا دردِ نہاں سمجھے	15	//	544
160	کہنے کو حقیقت کی تلخی پتھر سا کلیجا کون کرے	14	//	545
161	طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے	7	//	546
162	دل وفا کا مزار کیوں نہ رہے	7	//	547
163	راہ پر لا نہ سکی گردشِ ایام مجھے	12	//	547
164	دن گزرتا ہے شب آتی ہے سحر ہوتی ہے	9	//	547
165	نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب دردوالے	10	//	548
166	موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے	15	//	548
167	ظالم مری نظر میں محبت کا زہر ہے	5	//	549
168	شباب نام ہے غفلت کی نیند آنے کا	9	//	549
169	بھری دنیا پہ جب ڈالی نگاہ آخری میں نے	13	//	550
170	اسے کیا ہو دماغِ خاکساری	8	//	550
171	کعبہ و دیر سے پیام آئے	6	//	551
172	کہہ چکے سب کہہ کے اب کیا کیجئے	7	//	551
173	محبت میں محبت کے تقاضے بھول جاتے ہیں	8	//	551
174	میرے دل میں جو دل تمھارا ہو	11	//	552
175	محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی	16	//	552

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ	صفحہ
176	نور ہے کہ ظلمت ہے عشق کی بلا جانے	12	//	553
177	ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا	11	//	554
178	عفت قلب کے سوا کچھ بھی نہ تھا گناہِ عشق	8	//	554
179	مرے شعر نشتر نشاں اور بھی ہیں	7	//	555
180	اٹھوں گا زندۂ جاوید ہو کر بزمِ امکاں سے	12	//	555
181	جنھیں تم نے خلاف وقت سمجھا بے محل جانا	7	//	555
182	مسکراہٹیں سیکھیں قہر کی نگاہوں سے	10	//	556
183	زحمت کریں نہ میرے لئے جلوہ گاہ سے	13	//	556
184	روئے فرزانگی سیاہ کریں	7	//	557
185	ختم دم بھر میں کارِ ہستی ہے	7	//	557
186	رازِ ہستی ہے مبتلا ہونا	6	//	558
187	اس کی دنیا کو بُرا کہتا ہے کیا کیا کوئی	17	//	558
188	دل میں رکھ مال جو دل خواہ نہیں	7	//	559
189	مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے	8	//	559
190	کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا	7	//	559
191	اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی	7	//	560
192	دیکھوں تو راہِ غم میں کوئی ہم رکاب ہے	13	//	560
193	فریضۂ غم الفت نہ کیوں ادا کرتے	17	//	561
194	تدبیر اگر فاتحِ تقدیر نہیں ہے	17	//	561
195	جیسے میں اگلے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا	9	//	562

منتخب اشعار غزلیات

(268)

بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے
کسے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ تجمّل نکتہ داں باقی رہا

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے تجمّل
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے تجمّل
میری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

غالب کی طرح معترف میرؔ ہوں میں تجمّل
فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ میرے انتقام سے

مصیبت پر مری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں
بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی　　کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت　　بنتے ہیں تجمّ دیدۂ پُر نم سے آدمی

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت　　اٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

انھیں بھی تجمّ دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر　　جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن　　کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا
ہر ایک در پہ نہ جا تجمّ داد کی خاطر　　کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

میں خود ہوں مطمئن اے تجمّ ادب کی خدمت سے　　جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانہ میں تھی　　یہ زمانہ دیکھتا ہے آگ میں پروانہ ہے
پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں　　بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن　　کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری　　اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر
نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے　　نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر
ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے تجمّ کیا معنی　　ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

رندوں میں اور بڑھ گیا رحمت کا اعتبار　　واعظ ترے بیانِ عذاب خدا کے بعد

اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے
کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

کوشش تو حجمؔ دوائے دنیا نے کی بہت
بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

خود ساختہ ملاّ کے پیرایۂ حکمت نے
پرورۂ صحت کو بیمار بنا ڈالا

مذہب کے مسائل میں ڈالے ہیں وہ الجھاوے
آسان شریعت کو دشوار بنا ڈالا

شریکِ حال تھی عہدِ خزاں میں خود داری
زباں پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

تمھارے ذوقِ تکلم کا یہ تقاضا ہے
تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا

بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری
زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی
ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا

مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا حجمؔ
وہ رنگ چہرہ یومِ انیسؔ پر دیکھا

کوئی تدبیر کیجیے میں نہیں تقدیر کا قائل
مری حالت پہ لفظوں میں ترس کھانے سے کیا ہوگا

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں
زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہوجانا

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی
کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

فطرتِ انساں پہ جب تک عشق تھا پرتو فگن
جوہرِ انسانیت کو حجمؔ خطرہ کچھ نہ تھا

غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کے
سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر

کس کو ہے خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں　　اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گہر تک

کوئی حسینؑ کا ایثار تجمّل کیا سمجھے　　کسے ہے وسعتِ مفہومِ کربلا معلوم

فلسفہ منطق سیاست موعظہ حکمت حدیث　　علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل
حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ مرثیہ　　کتنے عالم اپنے دامن میں اٹھا لائی غزل
میرؔ و غالبؔ کی غزل ہے تجمّلؔ و ثاقبؔ کی غزل　　تجھ سے ارضِ تاج نے کی بزم آرائی غزل

رحمت نے گنہ گاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا　　واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

شمع و پنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط　　اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے
میرے سوا کسی کو نہیں میری معرفت　　چرچا جگہ جگہ مرے عیب و ہنر کا ہے

نبضِ ہستی پر ہے صدیوں سے ہماری انگلیاں　　جب مرض میں ہوگی تبدیلی دوا بدلیں گے ہم
یہ خیالِ خام ہے کس کم نظر کج فہم کا　　مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

بدلا ہے تجمّلؔ کیا معیار شعر فہمی　　جب سطحِ شاعری سے نغمے نے سر ابھارا

مسخ ہوتے ہیں ارادے بارہا　　کوئی شاید کار فرما اور ہے

سفر تھا کون سا ایسا جو بے جھجک نہ ہوا　　رہے گا پوری طرح کامیاب شک نہ ہوا
بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست　　اسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

عزمِ محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر
راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت
غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

درِ زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار
کون کہتا ہے زمانے کے لیے بار ہیں ہم

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم
کم سے کم عزتِ انساں کے تو حقدار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گناہ گار ہیں ہم

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

یہ دور جو اے حجم ہے اردو کا مخالف
اس دور میں اردو کی ہوئی نشو و نما اور

ستم شعاروں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم سہے
خیال میں بھی نہ احساس انتقام آیا

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے
وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

مارا ہے کس کے داؤں سے دنیا سے کیا کہوں
میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

خبر کیا خانہ بربادوں کی تم کو
خدائی ہے خداوندی ہے گھر میں

شبِ غم رنگ لائی جاتے جاتے
لگادی آگ دامانِ سحر میں

اجل آنے سے پہلے کچھ نہ سمجھے
بہت کچھ تھا حیاتِ مختصر میں

کب تک رہیں گے آخر شام و سحر کے شکوے
تو جیسے چاہتا ہے شام و سحر بنا لے

ہر عیب سے ہے مشکل دامن بچا کے چلنا
جس عیب کی ہوس ہو اس کو ہنر بنا لے

پھر دو جہاں بھی تیرے کون و مکاں بھی تیرے
اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنا لے

بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے
وہ پیرہن ہوں جو یوسف کو کھو کے ناز کرے

نہ اقتدارِ دو روزہ پہ کوئی ناز کرے
کسے خبر ہے وہ کل کس کو سرفراز کرے

جو سوچتا ہوں وہ دنیا سے کہہ نہیں سکتا
خدا کسی کو نہ یوں مبتلائے راز کرے

سکونِ دل سے تمنّا ہے ایک سجدہ کی
خدا نصیب اگر فرصتِ نماز کرے

مانگی ہے ان سے موت نہ مانگی تھی زندگی
دامن کبھی یہ دامنِ سائل نہیں رہا

میں نے لیا ہے قوّتِ بازو سے اپنا حق
شرمندۂ نوازشِ باطل نہیں رہا

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں
ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

نقشِ آب و گل کی ایسی خودسری اچھی نہیں
سرکشِ نافہم گردن میں ذرا سا خم رہے

میں یہ کہتا ہوں کہ محفل میرے ساتھ اٹھ جائے گی
یہ نہ کہیے تجھ کو محفل سے اٹھا سکتا ہوں میں

مجھ کو واعظ رشکِ مسجد کی امامت پر ہو کیا؟
جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

غم کی یہ تاریک راتیں اور تسلّی کا پیام
شمع کی زحمت نہ کیجئے دل جلا سکتا ہوں میں

نظر والو حقیر و ناتواں ہم ہیں مگر ایسے
کہ آج اتنی بڑی دنیا کی نظروں میں کھٹکتے ہیں

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے
جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

سراپا جرم ہو کر بھی میں بندہ ہوں وہ خالق ہے
کہیں اس طرح کے مضبوط رشتے ٹوٹ سکتے ہیں

کریں کیا بندگانِ وقت حق کہتے جھجکتے ہیں
گلے میں لفظ اظہارِ حقیقت کے اٹکتے ہیں

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت　　دشمن بچے گا اب نہ میرے انتقام سے

جن کی ہشیاری کے دنیا میں نشانے تھے بہت　　وہ بھی مارے گئے خود اپنی ہی ہشیاری سے
بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل　　ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

تابوت و شامیانہ و قبر و چراغ و گل　　اللہ آج بھی سر و ساماں سے کام ہے

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو　　ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانے میں تھی　　یہ زمانہ دیکھتا تھا آگ میں پروانہ ہے
ساری دنیا اک فریب جلوۂ جانا ہے　　یہ حرم ہے دور سے نزدیک سے بت خانہ ہے
کچھ ہوا دے دیں اگر بیرون در کی کوشش　　گھر جلانے کے لئے حاضر چراغِ خانہ ہے

اندازۂ محفل تو مجھے دور سے بھی تھا　　کچھ اور بھرم کھول دیا پاس بٹھا کے
باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن　　کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط　　اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا　　مسند شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

میں حریمِ ناز میں در آ گیا　　پردۂ کونین سرکاتا ہوا
حجم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے　　میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسّم کے　　بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

زہے قسمت اسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا
یہ جلال و جبر دیکھو اسے مان لے زمانا

مجھے اس روش سے دنیا کی بڑا سکوں ملا ہے
مرے غم کو غم نہ سمجھا مرے دل کو دل نہ جانا

میں گزر کو کر رہا ہوں ابھی درگزر سے لیکن
مرا ہاتھ ہوگا کاری جو پڑے گا ہاتھ اٹھانا

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم
تمھیں کیا قدر ہو اُردو زباں کی

ہر اک کی لغزشیں دیکھیں ہر اک کو ٹوک دیا
مری نگاہ تھی اور مجھ کو دیکھتی نہ رہی

صلہ کچھ اس کے سوا حجم کو نہیں منظور
اگر ذریعۂ عزت یہ شاعری نہ رہی

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا
ابل کے سائے میں کیا زندگی نکھر آئی

کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں
ابل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

زندہ دلوں نے بارہا بحرِ فنا سے دی نجات
یہ نہ سنبھالتے اگر ڈوب گئی تھی کائنات

یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جائے
قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا

حیات و علم و نشاط و صلا و دانش و مرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

ایسے ایسے بھی ہیں مردِ اعتبار
کھودیا ظاہر کو باطن کے لئے

حجم دنیا میں بہت سے کام ہیں
آدمی درکار ہے جن کے لئے

میں شبِ غم کے طلاطم میں اکیلا ہوں مگر
آس ہے اک جانی پہچانی ہوئی آواز کی

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے
اب کر چکے گناہ تو پروا نہ کیجئے
مفہومِ زندگی ہے محبت کا ایک دن
دو دن کی زندگی پہ بھروسہ نہ کیجئے

آسانیوں کے دور کا حاصل نہ پوچھئے
سب کچھ ہے صرف حوصلۂ دل نہیں رہا

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے
کیا اس سے بڑھ کے اور دلیلِ بہار ہے
ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گزر چکے
اب وہ ہیں ان کا وقت ہے اور اعتبار ہے
میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ بوئے گل
واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے
کچھ کرلیا اُسی نے جو یہ سوچ کر اٹھا
میری ہے جیت سارے زمانے کی ہار ہے

تم خود ہی دیکھ لوگے غمِ زندگی میں ہم
ڈوبے ہوئے سے ہیں کہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی
قصورِ فکر و نظر ہے جو تشنگی نہ رہی
پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردا
مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی
کہاں وہ عہدِ گذشتہ کی دوستی اے دوست
وہ دشمنی کی شرافت وہ دوستی نہ رہی

دانۂ گندم سے ہیں محروم آج
پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر

دنیا بنا کے لے گا کیا دورِ زندگی میں
میں دل بنا رہا ہوں تو دل میں گھر بنا لے
کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیّل
تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنا لے

یہ نازِ حُسن مری عاشقی کے دم سے تھے
تمھارے دل میں ہوں بولو زباں پہ آؤں کیا

نام تو ساتھ نہ جائے گا خدا حافظ ہے
ایک رہ جائے گی دنیا میں امانت میری

شوق کی آگ رُکے گی نہ دبے گی اے دوست
اُڑ کے پہنچے گی یہ پروانوں سے پروانوں میں
مدفنوں پر جو شہیدانِ محبت کے ملی
مسجدوں میں ہے وہ رونق نہ صنم خانوں میں

پہلو میں برائے نام ہے دل اب درد کا دل میں نہیں
مومن ہیں مگر ایمان نہیں مسلم ہیں مگر اسلام نہیں

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ
زبردستی اگر بدلا نہ جائے
وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں
جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

اب اتنی تو ہمّت کیے جایئے
اجل آئے تک ہی جیے جایئے

مرزا سوز دل دیکھ لے گا زمانہ
گرجتے برستے شرر دے رہا ہوں

دل کی وسعت اور ہے محفل کی وسعت اور ہے
ظلم ہوتا ہے کسی پر یاد آجاتا ہوں میں
کوئی خوش خوش جب نظر آتا ہے قید و بند میں
دیکھ کر خود اپنی آزادی کو شرماتا ہوں میں
میری پستی پر نظر کر اپنی ہستی دیکھ کر
اے خدائے آب و گل انسان کہلاتا ہوں میں

سخت جانی سے ہے میری اسی دنیا کو گلہ
اِسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
عرض کرتے ہوئے گزرا ہے زمانہ بے سود
دی ہے احساس نے اب ہمّتِ ارشاد مجھے
اپنی ہمّت کے مطابق ہے ہر انسان کی فکر
کوئی ناشاد سمجھتا ہے کوئی شاد مجھے

اعلان غربت کا اب اردو زباں سے ہے
پوچھے تو کوئی بہ لب و لہجہ کہاں سے ہے

طفلی میں بے خرد تھا جوانی میں بے حواس
میں کیا کہوں گناہ کی منزل کہاں سے ہے

ایک وجہ تسکیں ہے طاعت و اطاعت کیا
حق ادا نہیں ہوتا حوصلہ نکلتا ہے

سختیاں کرتی گئیں نزدیک مقصد سے مجھے
مشکلوں میں دن بہ دن آسانیاں دیکھا کیا

میں جہانِ غم میں رہ کر ہوں الگ غمِ جہاں سے
نہ شریک کارواں ہوں نہ جدا ہوں کارواں سے

انھیں آج سانس لینا بھی ہوا قفس میں مشکل
جو ہوا میں پھر رہے تھے کبھی سیر آشیاں سے

بجھ چلا تھا دل مرا زادِ سفر کم دیکھ کر
کیا تسلّی ہوگئی سرمایۂ غم دیکھ کر

اک شعلۂ فانی پر مٹ جائے گا پروانہ
انجام سے غافل ہے آغاز کا دیوانہ

ترتیب عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن
آخر میں قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

اور بھی کوئی مذہب ہے سوا محبت کے
میرا ہے یہی مذہب پوچھے ہو مذہب کیا

مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ ارباب کرم
پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہو جاتا ہوں میں

نشیمن میرا رہنے دو چمن میں آنچ اگر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

خوشی ہو یا ہو غم اک ٹھیس ہے دل کی لطافت پر
سمجھ میں ہر کس و ناکس کے یہ بات آ نہیں سکتی

ہمیشہ دل دُکھائے گا خدا کی راہ میں واعظ
یہ رندوں کو بُرا کہنے کی عادت جا نہیں سکتی

جیسے وہ یادفرمائیں کہیں رکتا ہے روکے سے
زمانہ دیکھتا رہتا ہے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ہماری سمت جب اٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی
ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کر کے چھپاتے ہیں

ہم تو ہندوستان والے ہیں
کاش ہندوستاں ہمارا ہو

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

بے نیازی اس قدر کس کام کی
بھولے بھٹکے حال پوچھا کیجئے

سحر آتی ہے جب نزدیک تارے جھلملاتے ہیں
یہ ظالم آخر لمحوں پہ اپنے مسکراتے ہیں

خودی ہے بیخودی ہے بندگی ہے کفر ہے کیا ہے
دوا بھی چھوڑ دی میں نے دعا بھی چھوڑ دی میں نے
کوئی آساں نہ تھا اظہارِ درد و مدعا کرنا
بڑی مشکل سے کی الفاظ کی صورت گری میں نے

قلق ہے اشکِ ندامت میں ڈوب جانے کا
ملا نہ خون میں اپنے مزا نہانے کا
نیاز عشق کجا اور نمازِ خوف کجا
ادائے فرض میں ہے فرض سر جھکانے کا
بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے جگر
میں ایک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانے کا

خاک کے پتلوں پر ہنستی ہے زمیں
آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولتِ دنیا زیادہ آدمیت کم رہے
ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

آج تک تو جیتا ہوں اپنے ہی سہارے پر
چاہتے ہیں یہ کہہ دوں آپ کا سہارا ہے

کسی دن آسماں کو ہم بنالیں گے زمیں اپنی
زمیں ان کو مبارک جو زمیں کو آسماں سمجھے

غم ہے بہت اے دوست خوشی کم ہے جہاں میں
جو کچھ بھی تری ہمّتِ مردانہ اٹھالے

آمد و شد ہر نفس کی دے رہی ہے یہ پیام
حق کو آنا چاہے باطل کو جانا چاہیے

عمر بھر پرورش فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

وطن میں ہیں جیسے کوئی بے وطن ہو
کسی پر خدا یہ مصیبت نہ ڈالے

در زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم
ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں تو سرِ دار ہیں ہم
ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لئے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گنہگار ہیں ہم

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اُس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پر جس کو غرور تھا
خدا کو میں نے بہ فیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہوکر
دیا کرتا ہے انساں اپنے دل کو بھی فریب ایسا
خبر سب کچھ ہے اور بیٹھے ہوئے ہو بے خبر ہوکر
نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہوکر
ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے تجم کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہوکر

اک مشتِ خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے
کونین میں مقام بشر ہے خدا کے بعد

تمھارے ذوقِ تکلّم کا یہ تقاضا ہے
تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا

بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری
زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

رحم کے قابل ہے اس عالمِ بے چارگی
کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

اس بھری دنیا میں اک انساں نظر آتا نہیں
زعم کتنا بڑھ گیا انسان کہلانے کے بعد

گلہ ہو شکر ہو تقریر ہو کہ شعر نجم
یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

کس کو خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیرِ گہر تک

کیوں اضافہ کر کے اٹھو نجم بزم شعر سے
وقت کا مصرف کہیں تحصیل حاصل میں نہ ہو

خدا محفوظ رکھّے خود پرستی خود نمائی سے
ان آئینوں میں جو منہ دیکھ لے ہو جائے دیوانہ

زمیں جب پاؤں سے نکلی تو ہم باز آ گئے سر سے
کہ ایسے وقتِ بد میں دوش پر بارِ گراں کیوں ہو

بہت ممنون ہوں احباب کی چشمِ عنایت کا
مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی
لہو کے گھونٹ پی کر بھی کہیں سیری نہیں ہوئی
بجھاتی ہے کسی کی تشنگی اک بوند شبنم کی
اٹھا کر دہر سے رسم محبت اہلِ دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی
عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے نجم اک انسانِ اعظم کی

جبر کا شکنجہ تھا میری ناتواں گردن
موت نے چھڑایا ہے زندگی کی باہوں سے

فرش پر ہے تخت ان کا عرش پر دماغ اپنا
کیا فقیر رہتے ہیں دب کے بادشاہوں سے
کیا ہوگا فیصلہ مری ذوقِ نگاہ کا
دنیا کو دیکھتے ہیں سب اپنی نگاہ سے

زندگی بھر اِدھر اُدھر دیکھا
آج اپنی طرف نگاہ کریں
آدمی سے ہو کیوں نظر نیچی
اپنے اللہ کا گناہ کریں
دشمنی میرا کیا بگاڑے گی
دوست بن کر مجھے تباہ کریں

ناز بے جا نہ کر بلندی پر
ہر بلندی کی اصل پستی ہے
کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزّت کی موت سستی ہے
اپنے اپنے بنالیے ہیں خدا
ہر پرستش میں خود پرستی ہے

حیات وعلم ونشاط و ملال و دانش ومرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

زہے قسمت اُسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں
زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

ظاہر ہے ایک باب نہاں ایک باب ہے
یہ کائناتِ دہر ادھوری کتاب ہے
اپنی خرابیوں پہ کسی نہ نظر نہ کی
ایک ایک کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے
اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے
زہے جلال کے شاہوں کو دستِ قدرت نے
کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے

نجم یہ نشانی ہے اہلِ دل کی دنیا میں ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

میرزا نجم سے نہ کچھ کہنا چاہے جو کچھ یہ کج کلاہ کریں

راس آئے جناب نجم تمھیں سالکِ جادۂ وفا ہونا

اشکوں کی روحیں نجمی دل کا لہو بہا کر غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے نجم بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

میں نجم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

نجم بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

کوئی حسینؑ کا ایثار نجم کیا سمجھے کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

نجم فطرت سے مری ولولۂ شعر و ادب میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

بدلا ہے نجم کیسا معیارِ شعر فہمی جب سطحِ شاعری سے نغمہ نے سر ابھارا

ناز تسبیح و مصلا اور ہے زیرِ خنجر ہو جو سجدا اور ہے

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

ہماری فکر کا اندازہ دیکھ کر اے نجم فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اُتر آئی

محتاج شرح جو ہو وہ نجم شاعری کیا ہر شعر پر یہ قدغن دنیائے راز ہوجا

اے نجم کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چربے اتارے

مرے منہ سے جھڑتے رہے پھول نجم زباں شاخِ گل سی لچکتی رہی

نجم کتنے ہوں گے عرفی کی طرح نشتر و لا و نعم سمجھے ہوئے

کیا ڈھونڈتی ہے نجم نگاہِ سخن شناس ہم اپنے کیفِ شعر میں کھوئے ہوئے سے ہیں

نجم خدا سے آج تک راست معاملات نہیں بندۂ در اسی کا ہوں جس نے مجھے جگا دیا

نجم ہر شعر میں ترنم ہے آج شاعری ہے نے نواز ان کا

یوں تو سو بہانے ہیں نجم کچھ نہ کرنے کے قصد ہے تو کر ڈالو آج کل اور اب تب کیا

کسی کو نجم خوشی ہو تمھارے غم سے اگر دعا کرو کہ خدا عمرِ غم دراز کرے

آپ دو آنسو بھی اپنے نجم پی سکتے نہیں پینے والا ڈگڈگا کر زہر بھی پی جائے ہے

کبھی نجم طوفاں اٹھانا بھی ہے کہاں تک یہ آنسو پئے جایئے

انجم مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی	گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں
انجم تقدیر کی گردش سے میں دبنے کا نہیں	پست ہمّت نہ کرے وقت کی افتاد مجھے
تخلیق کائنات کا عنوان دیکھنا	اے انجم ابتدائے محبت کہاں سے ہے
زادۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں	یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل
انجم میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ	کیوں نہ کرتی میرے در پر ناسیہ سائی غزل
انجم صاحب کو راستہ دینا	مذہبِ عشق کے امام آئے
میرے لیے آرام کہاں	مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب
بزم انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل	ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے
وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں	جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے
عیش کیا سخت سزا دیتا ہے	مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے
عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے	زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے
انجم کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا	پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اُگلتا ہے
یہ تو انجم آپ کی ہی ہے وہ دوام شعر گوئی	مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے

غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی
غزل کے چہرے پہ ہے میرے التفات کا نور
کیے ہیں شمعِ غزل سے وہ داغِ دل روشن
بنا ہے جن کی تجلی میں مُلک کا دستور

باب چہارم

غزلیات

.1	غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
.2	آسمانِ شعر و ادب کے نجم	جناب اختر انصاری اکبر آبادی
.3	نجم آفندی کی غزل گوئی	ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی
.4	نجم آفندی کی غزلیں	محترمہ ثمین فاطمہ
.5	منتخب اشعار غزلیات	(268) عدد
.6	فہرست غزلیات	(195) عدد
.7	مطبوعہ غزلیات	1 الیٰ 49 (49) غزلیات
.8	غیر مطبوعہ غزلیات	50 الیٰ 195 (146) غزلیات

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

''غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی''

(نجم)

''لہو قطرہ قطرہ'' نجم آفندی کی پچاس غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو موصوف کے انتقال کے چار سال بعد پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے پبلشر زسید محمد شاکر نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''جہاں تک غزل اور عشقیہ نظموں کا تعلق ہے۔ اس میں بھی آپ کو جو کمال حاصل تھا وہ بھی احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے معترف وہی لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو ہند و پاک کے مشاعروں میں سنا۔ آپ کے عشقیہ مضامین میں بھی اپنے اندر وہی چاشنی ہے جو ایک حساس دل ہی کا خاصہ ہے۔ آپ کی شاعری میں اگر میرؔ کا نشتر ہے، سوداؔ کی شوخیاں ہیں، انیسؔ جیسی روانی ہے تو غالبؔ کی گہرائی بھی اور انداز بیان نہایت ہی سادہ اور معنویت لئے ہوئے ہے۔''

آنکھوں نے جان ڈال کے دل رکھ دیا تھا نام
دل کیا تھا میرے ذوقِ نظر کا شعور تھا

اگر چہ یہ مجموعہ نجم کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا لیکن خود مرحوم کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کوشش ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی۔ لکھتے ہیں۔ ''احباب کے مسلسل اصرار کے باعث اکثر مشاعروں میں بھی شرکت کرنی پڑی اور غزلیں کہنا پڑیں مگر اس کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس صنف کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔''

ڈاکٹر ثمین فاطمہ غزلوں کے مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''غزل اپنے ارتقائی منازل میں صرف اپنے موضوعات کا مظہر ہیں۔ یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ غزل کو کسی اور قالب

میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے غزل کے لئے کسی قدر الگ راہ متعین کی تھی لیکن علامہ اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنفِ شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع حقائق کی رنگارنگی کو غزل میں سموکر یہ بات ثابت کردی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ عشق وحسن، مضامین تصوف اور تمام تر مسائلِ حیات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل غالبؔ اقبالؔ اور فانیؔ کے بعد صرف نجمؔ صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی تو بے جا نہ ہوگا۔ نجمؔ صاحب کی غزلیں ان اقدار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جن سے اقبالؔ نے غزل کو آشنا کیا، اس نہج کا آئینہ دار ہیں جس کو انقلابیوں نے پسند کیا۔ ان مسائل کو سموئے ہوئے ہے جو ''ادب برائے زندگی'' کا خاصہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں اختصار ہے۔ خیال کی گہرائیاں ہیں۔ فکر کی بلندیاں ہیں۔ ان کے کلام میں اعتماد اور یقین ہے۔'' شاید اسی لئے نجمؔ نے کہا تھا:

غمِ حیات کا حاصل تلاش کرتا ہوں　　تبسم سرِ منزل تلاش کرتا ہوں
وہ بزم جس میں کچھ اہلِ دماغ بیٹھے ہوں　　میں سادگی سے وہاں دل تلاش کرتا ہوں

اردو کی زندہ ترین روایت جو قدیم ترین بھی ہے، اُردو غزل ہے۔ اُردو غزل نے کئی صدیوں میں عروج و زوال کے منظر دیکھے، نشیب و فراز کے مقامات دیکھے۔ کیوں کہ سخت جان ہونے کے ساتھ جان جاناں تھی اس لئے کبھی بے جان نہ ہوئی بلکہ زندہ رہی اور زندہ دلوں کی ہی نہیں بلکہ افسردہ اور قنوطیوں کے دل کی دھڑکن بھی بنی رہی۔ غزل کی تاریخ اور داستان لمبی ہے، جس کو ہم صَرفِ نظر کرتے ہوئے اُس عدالت کی کچہری میں آتے ہیں جس میں سرسید احمد خان کی سرپرستی میں مشہور غزل گو شاعر غالبؔ کے شاگرد حالیؔ نے غزل پر مقدمہ دائر کردیا جس کی تفصیل مقدمہ شعر و شاعری میں ثبت ہے۔ اردو غزل کو سخن طعن اور تعریض کا نشانہ بنایا اور اسے عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتایا اور فوراً اس میں ترمیم اور تبدیلی پر زور دیا۔ اگر چہ اس استغاثہ کا کوئی خاص اثر اس دور کے حالیؔ کے ہم عصر عظیم شعراء داغؔ، اکبرؔ، امیرؔ، مجروحؔ اور تسلیمؔ وغیرہ پر نہیں پڑا، جنھوں نے اسے نالۂ مرغ چمن غرب سمجھ کر توجہ نہ کی لیکن اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، شادؔ، اور نجمؔ نے اس کا خاص اثر لیا، خصوص علامہ اقبالؔ نے اس کو اپنی غزل کا جوہر قرار دیا۔ اقبالؔ کی اولین غزلیں داغؔ کی پیروی میں نظر آتی ہیں جس میں عشق و جذبات کو زبان اور بیان کے

چٹخارے سے خوش ذائقہ بنانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اقبالؔ کے ذیل اشعار اسی لذت کام دہن سے بھرے ہوئے ہیں۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اقبال، لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

لیکن بہت جلد ہی اقبالؔ کا رنگ بدل گیا یہاں تک کہ جن غزلوں کو وہ مستحسن سمجھ رہے تھے۔ اپنے کلام بالِ درا میں جگہ بھی نہ دی اب اقبالؔ حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اقبالؔ کے تینوں اردو مجموعوں میں غزلوں کی تعداد 93 ہے جس میں انلب اشعار پختہ مضامین سے لبریز ہیں۔ یہاں لہجہ نیا ہے جس کے لئے اقبالؔ کو نئی زبان وضع کرنی پڑی، ایسی زبان جو غزل کی زبان سے جدا تھی۔ اگرچہ غالبؔ غزل میں نئے لہجہ کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے لیکن اقبالؔ کے لئے یہ نیا چیلنج تھا اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

غزل کے زندان میں اقبالؔ نے نئے در یچے کھولے لیکن جو لوگ تاریکیوں کے دور کے پالے ہوئے تھے وہ روشنی سے گھبرانے لگے۔ چاروں طرف سے دبے لفظوں میں بغاوت کی

تحریریں رسالوں کے سادہ اوراق کو سیاہ کرنے لگیں۔ فانیؔ، یگانہؔ، سیمابؔ، حسرتؔ، محرومؔ وغیرہ نے اسے شاعری ماننے سے انکار کر دیا۔ میر انیسؔ کے نواسے پیارے صاحب رشیدؔ، اقبالؔ کی غزل۔ ان کے لہجہ اور زبان میں سن کر منہ تکنے لگے کہ یہ کون سی زبان ہے جو غزل میں لگائی گئی ہے۔ اس دور میں نجم آفندی جو اٹھارہ برس کے سن میں عشقیہ مضمون سے بھری وہی لچک دار زبان کی غزل

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبر عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

مشاعرہ میں سنا کر داد و تحسین حاصل کر رہے تھے۔ وہی نجم بہت جلد اس راستہ پر گامزن ہو گئے جس پر اقبالؔ نے فکر و خیال کے بلند قامت شجرِ سایہ دار لگائے تھے اور اپنی شناخت کے نقوش بھی چھوڑے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نجم کے ان اشعار پر اقبالؔ کے کلام کی چھاپ نہیں۔

سبک خرامیِ برق و شرر پیدا کر — جو رہگزار نہ ہو رہگزار پیدا کر
لہو کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر — خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر

کب تک رہیں گے آخر شام و سحر کے شکوے — تو جسے چاہتا ہے شام و سحر بنا لے
پھر دو جہاں بھی تیرے کون و مکاں بھی تیرے — اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنا لے

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے — جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

مجھ کو واعظ رشکِ مسجد کی امامت پر ہو کیا — جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیل — تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنا لے

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے — وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

کسی دن نجم کہنا ہے خدا اے بندہ پرور سے تری زانفِ کرم سے لی ہے تاب سرکشی میں نے

یہ کہاوت کہ ہر مشہور شاعر بڑا نہیں اور ہر بڑا شاعر مشہور نہیں ہوتا، بڑی حد تک صحیح ہے۔ اردو ادب کے تحقیقی مسائل خود اس لئے تحقیق طلب ہیں کہ فن تحقیق عظیم مشکلات سے دو چار ہے۔ تحقیق کی روش اور سطحی تجزیہ اور پھر اس پر یقین کامل محقق کو حق اور حقیقت تک پہنچنے میں مانع ہوتا ہے جس کی مثال خود نجم آفندی کے کلام سے لاعلمی ہے۔ ''کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید'' مطبوعہ ۱۹۹۱ء کے مولف جناب طارق سعید نے غزل کے ارتقا کے عنوان پر مختلف شاعروں کے دور کے غزل گو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ اور فراقؔ کے ادوار کے تقریباً دو سو غزل گو شاعروں کے نام فہرست میں شامل کیے ہیں جن میں بعض شعرا مجہول اور معمولی درجے کے ہیں اور اس طویل فہرست میں نجم آفندی مرحوم کا نام و نشان بھی نہیں، جب کہ نجم آفندی کی غزلوں کا مجموعہ ''لہو قطرہ قطرہ'' ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آچکا تھا اور نجم آفندی ہندوستان اور پاکستان میں اپنی غزلیں سنا کر مشاعرے لوٹ چکے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کا منعقدہ یادگاری مشاعرہ جو ۱۹۵۵ء میں لاکھوں افراد نے سنا اور جس کی پوری روداد رسالہ آجکل میں شائع ہوئی، اسے بھی نجم آفندی ہی نے اپنی غزلیں سنا کر لوٹ لیا تھا۔ یہ کوئی چھپی بات نہیں کہ نجم آفندی، فانی بدایونی اور جائسی کے ساتھ نظام دکن کے فرزند شجیع کے دربار میں بیس سال تک غزل کی نوک پلک سنوارتے رہے اور پرنس شجیع کے استاد بھی رہے۔ خود جائسی نے اپنی کتاب دربار در دربار میں تفصیل سے حالات درج کیے ہیں کہ پرنس شجیع صرف نجم اور فانیؔ کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اگرچہ ''لہو قطرہ قطرہ'' میں صرف پچاس غزلیں تھیں اور اب اس ''کائنات نجم'' میں ایک سو پچانوی سے زیادہ غزلیں موجود ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں کہ نجم کا شمار اردو کے عالی ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے، اگرچہ زمانہ لاکھ بے اعتنائی کرے، حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر نے اپنی کتاب ''علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن'' میں بہت سچ کہا ہے کہ ''نجم جیسے شاعر نے جب غزل کے کوچہ میں قدم رکھا تو غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ تبلیغی اور اصلاحی موضوعات میں ایسے گوشے نکالے کہ ان کی روش اختیار کر کے شاعروں کا ایک کاروان بن گیا۔ ان کا مفکرانہ انداز غزل کے سانچے میں ڈھل کے ابدی صداقت بن جاتا

ہے۔ ایک ایسی صداقت جس میں نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ نجم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انھیں سامراجی شکست و ریخت کا بخوبی اندازہ تھا۔ قدم قدم پر انھیں انسانیت کی پامالی کے منظر بھی بے چین کر دیتے تھے اس لیے ان کے کلام میں ادب و اخلاق، قربانی اور انسان دوستی کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں درد و غم کی کسک ہے لیکن فانی کی سی قنوطیت نہیں۔ اردو غزل کی تاریخ نے نجم کے ساتھ انصاف نہیں کیا، شاید اس کا سبب یہ رہا کہ رثائی شاعری ان کی ذات سے اس طرح وابستہ اور پیوستہ ہوگئی کہ نجم کے معنی نوحہ و سلام سمجھا جاتا تھا۔

رسالہ ''نگار'' ۱۹۶۵ء جدید شاعری نمبر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اقبال کی غزل کوئی پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے: '' اقبال کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں، مثلاً رشک و رقابت، فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع و بدائع اور زبان کی نمائش جن کے بغیر غزل، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعرا اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل کو شعرا کی طرح نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے کوئی ایسا رشتہ نہ تھا، اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع و تاثیر، شیرینی اور شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں وہ دلبری اور قاہری ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔''

ان نکات کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ نجم آفندی کی غزلوں پر اس عبارت کا حرف حرف منطبق ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ پروفیسر رشید صدیقی نے یہ ریویو اقبال کے کلام پر نہیں بلکہ نجم کی غزلوں پر کیا ہے۔ نجم کی غزلوں کا شمار بیسویں صدی کی ان پاکیزہ غزلوں میں ہوتا ہے جس سے فردوس کی خوشبو آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان غزلوں کو کوثر و تسنیم کے پاکیزہ پانی سے دھو کر صفحۂ قرطاس پر نازل کیا گیا ہے۔ نجم کی غزلوں میں انسان سازی، اقدار عالیہ، کردار سازی، عزت نفس، مساوات، برادری اور اخوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اشعار میں گیرائی کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل کی گہرائی موجود ہے۔ نجم حسن بیان سے زیادہ حسن عمل کو اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ ان کے

کلام میں واعظ، زاہد، مولوی اور قومی سربراہ اس لیے معتوب ہیں کہ وہ حسن عمل سے خالی ہیں۔

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی اس اندھیرے کا اُجالا اور ہے

انھیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرمِ عمل کر دو اندھیرے میں خط تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے معروف غزل گو شاعر مولانا حسرتؔ موہانی اور حجمؔ آفندی میں بہت سی قدریں مشترک ہیں، اگرچہ مولانا حسرتؔ موہانی، حجمؔ آفندی سے عمر میں بڑے تھے۔ حسرتؔ موہانی کی طرح حجمؔ بھی ایک عاشق مزاج شاعر، ایک دل سوز رہنما، ایک مسلمان جو نماز اور روزہ کا پابند اور ایک حق آگاہ شخصیت تھے۔ حجمؔ، حسرتؔ کی طرح بیک وقت پکے مسلمان کے ساتھ سوشلسٹ بھی تھے۔ وہ حسرتؔ کی طرح کانگریس سے بھی وابستہ تھے اور بڑے صاحبِ کردار و ملنسار شخص تھے۔ جس طرح علامہ سید سلیمان ندوی نے حسرتؔ کو بیسویں صدی کا ابوذر غفاری کہا ہے اس لقب کے حجمؔ بھی حق دار نظر آتے ہیں۔

حجمؔ آفندی نے حسرتؔ کی طرح حکومت برطانیہ اور انگریزوں کے خلاف مہم چلائی۔ جیسا کہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ جب کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہوا اور سکول کے ہیڈ ماسٹر رام چندر نے کہا کہ تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے، اس جملہ کا اثر بارود کے ڈھیر میں چنگاری سا ہوا اور پھر ساری عمر، انگریزوں کے ظلم و جور کے خلاف احتجاج کرنے میں صرف کردی۔ چنانچہ انہی دنوں ایک خفیہ انجمن بھی بنائی تھی جو انگریزوں کے خلاف بغاوتی منصوبے تیار کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ حسرتؔ کی طرح حجمؔ بھی کھدر پوش تھے اور اس کھدر پوشی سے بدظن ہوکر جب حجمؔ کے انگریز عہدہ دار نے ان کا تبادلہ دہلی سے کسی معمولی دور دراز مقام پر کردیا تو حجمؔ نے انگریز کی نوکری سے استعفیٰ پیش کردیا۔

حجمؔ حسرتؔ کی طرح انگریز کو حاکم نہیں بلکہ غاصب سمجھتے تھے اور حسرتؔ کی طرح حجمؔ کو بھی جیل کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حسرتؔ کو با مشقت قید ہوئی اور حجمؔ کو بغیر مشقت کے۔ حجمؔ کی جیل میں لکھی نظموں، رباعیوں اور قطعات کے مجموعہ کو ''شاعر اہل بیٹ جیل میں'' عنوان سے ۱۹۳۸ء میں شائع بھی کیا گیا۔

حسرتؔ موہانی نے جیل میں کہا تھا:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

حجمؔ نے جیل سے آواز دی تھی:

دلِ شاعر تمنا بن گیا ہے سرفروشی کا
تمنا کس کو کہتے ہیں تمنا دیکھنے آؤ
سلاخوں ہی سے آکر جھانک لو ہم دردمندوں کو
تماشا بن نہیں سکتے تماشا دیکھنے آؤ

حسرتؔ کی طرح حجمؔ نے بھی غزل کے لہجہ میں غم روزگار اور سیاسی مطالب کو پیش کیا۔ ''شاعرِ اہل بیتؑ جیل میں'' کتابچہ میں شامل دوغزلوں کے چند اشعار اس کامیاب روش کے گواہ ہیں۔

جنھیں تم نے خلافِ وقت سمجھا بے محل جانا — انھیں آہوں سے ممکن ہے ہوا کا رُخ بدل جانا
خدا کی شان اُن کو سلح کی کرنی پڑیں باتیں — بہت دشوار نکلا میرا باتوں میں بہل جانا
جناب حجمؔ ہیں مسند نشیں کچھ دن سے زنداں میں — تقاضائے ادب ہے جانے والے سر کے بل جانا

ارادہ جب اٹل ہے انقلاب آنے سے کیا ہوگا — نہ بدلے گا یہ دل دنیا بدل جانے سے کیا ہوگا
بحمد اللہ محفل کی فضا میں نے بدل ڈالی — اٹھا دو اب مجھے اب میرے اٹھ جانے سے کیا ہوگا
نگاہِ خشم گیں دعوت نہ بن جائے تبسم کی — ہم ایسے منچلوں پر آگ برسانے سے کیا ہوگا

اِسے سہل انگاری نہ کہیں تو کیا کہیں کہ اس عظیم اردو ادب میں آج تک کوئی جامع کتاب سہل ممتنع پر موجود نہیں۔ مختلف کتابوں میں چند اشعار سہل ممتنع پر ملتے ہیں لیکن اس عظیم شعر پر جو آسان طرز بیان میں عمدہ مضمون کی عکاسی کرتا ہے۔ مطالب موجود نہیں۔ اردو کے دو بڑے شاعر غالبؔ اور انیسؔ کے درمیان اسی موضوع پر چشمک آرائی ہوئی۔ میر انیسؔ نے کہا تھا:

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا

اس شعر کو غالبؔ نے مہمل کہا اور بتایا کہ سہل کا تضاد ادق ہے اور یہ ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں میر انیسؔ حق بجانب ہیں۔ سہل اور ادق عربی کے سہ حروفی لفظ ہیں۔ ادق کے معنی باریک اور دقیق بھی ہیں چنانچہ میر انیسؔ فرما رہے ہیں میرا وہ کلام جو باریک اور دقّت طلب ہے، وہ میں نے سہل لفظوں میں یوں باندھا ہے کہ دوسرے اس کو باندھ نہیں سکتے۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں سہل ممتنع کے اشعار ملتے ہیں۔ تجمّل کے کچھ شعر دیکھئے۔

تجمّل کیا روکے گی یہ دنیا مجھے میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

اب اتنی تو ہمت کیے جایئے اجل آئے تک ہی جیے جایئے

خاک کے پتلوں پر ہنستی ہے زمیں آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

اپنے اپنے بنالئے ہیں خدا ہر پرستش میں خود پرستی ہے

مسخ ہوتے ہیں ارادے بارہا کوئی شاید کار فرما اور ہے
(حضرت علیؑ کے قول کی عکاسی ہے)

تجمّل دنیا میں بہت سے کام ہیں آدمی درکار ہے جن کے لئے

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے اب کر چکے گناہ تو پروا نہ کیجئے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت اٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

جگر آفندی نے کہا تھا: ع : دردِ دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں:

چنانچہ اس دردِ دل نے جگر سے خوبصورت غزلیں کہلوائیں جس میں اخلاق و کردار کی تعلیم، عزتِ نفس کی اہمیت، عظمت انسان، معاملات عشق، تصوف، غم جاناں کم اور غم دوراں زیادہ کی عکاسی ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ مختلف اصنافِ سخن کے مطالب بھی اس میں رچے ہوئے ہیں۔ غزل کی ردیف میں جگر کے چند شعر دیکھئے:

فلسفہ، منطق، سیاست، موعظہ، حکمت حدیث علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل

حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ، مرثیہ کتنے عالم اپنے دامن میں اُٹھا لائی غزل

میرؔ و غالبؔ کی غزل جگر اور ثاقبؔ کی غزل تجھ سے ارض تاج نے کی بزم آرائی غزل

زادیۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل

جگر میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ کیوں نہ کرتی میرے در پہ ناسیہ سائی غزل

میرؔ حقی میر عشق کے امام ہیں۔ اقبالؔ نے بھی عشق ہی کو سرمایۂ حیات کہا ہے اور عقل کو اس کے مقابل خام اور کمتر بتایا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

جگر آفندی بھی عشق کے عاشق ہیں اور اسے زندگیِ جاودانہ کا نسخہ بتاتے ہیں۔ یہ عشق بازاری اور کوٹھے کا عشق کا نہیں، یہ وہ چوما چاٹی کی چٹخارنہیں جس سے شعرا کے شعری صفرے بھرے پڑے ہیں بلکہ یہ پاکیزہ مضمون عشق کی قوت اور عشق کی عظمت کا نقیب ہے۔

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

فطرت عشق جو دے ساتھ تو آسکتا ہے ساری دنیا کے مقابل تنِ تنہا کوئی

طاقتیں مسلّم ہیں علم و عقل کی لیکن عشق کو تعلق کیا ان پناہ گاہوں سے

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں　　زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہوجانا

جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو　　کمالِ غم سے وہ نصف النہار پیدا کر

نجم صاحب کو راستہ دینا　　مذہبِ عشق کے امام آئے

خدا کو میں نے بہ فیضانِ عشق مان لیا　　خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ　　زبردستی اگر بدلا نہ جائے

اخلاق و کردار سے نمو پانے والی قدر کو عزتِ نفس بھی کہتے ہیں۔ یہ خود داری قناعت توکل اور خودی کی خو رکھتی ہے۔ یہ غرور نہیں، تکبر و نخوت نہیں، بلکہ ہر انسان کا حق ہے۔ شاہ و گدا، امیر و غریب، مزدور و منعم، آقا اور غلام سب عزتِ نفس کے حق دار ہیں۔ یہ پیام بڑی شاعری میں نظر آتا ہے۔ نجم جیسا شاعر ان اشعار میں اپنی خودی کا متعارف ہی نہیں، بلکہ دوسرے افراد کی عزتِ نفس کا طلب گار بھی ہے۔

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم　　کم سے کم عزتِ انساں کے تو حق دار ہیں ہم
ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر　　آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم
دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار　　کون کہتا ہے زمانے کے لئے بار ہیں ہم

اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے　　کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی　　کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

نجم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے　　میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

جہاں تک عزتِ نفس اور شاعر کے جذبات سے مخلوط فخر و مباہات کا سوال ہے، وہاں تجمّل تعلّی میں منفرد ہیں۔ حسب، نسب، کسب، مذہب، وطن، قوم، زبان، اور فکر و خیال پر مطمئن ہی نہیں بلکہ مشکور بھی ہیں۔ طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تعلّی کے چند شعر یہاں درج ہیں:

تجمّل فطرت ہے مری ولولۂ شعر و ادب — میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

اے تجمّل کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چہرے اُتارے

تجمّل مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی — گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے تجمّل — میں اک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانہ کا

پچپن برس کے ملکِ سخن پر تصرفات — تیری ثنا گری ہے مرے گھر کی کائنات

زمینِ سخن آسماں بن گئی ہے — وہ گردوں سے اے تجمّل تارے اُتارے

تجمّل کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا — پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اگلتا ہے

تجمّل یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر — کس تبسم کا خزانہ مرے آب و گل میں ہے

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیتِ شعر و سخن — جس کسی محفل میں پہنچے تجمّل ہم ہی ہم رہے

کریں گے تجمّل کیا اردو کے دشمن قدر اردو کی — جو پشتئ سپاہی ہو وہ لشکر کی زباں سمجھے

میں نجمؔ خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

فضل خالق سے مرے افکار میں اشعار میں فلسفہ ہے نجمؔ غالبؔ کا زبانِ میرؔ ہے

نجمؔ کو اردو سے بڑی محبت ہے۔ اردو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چار پشتوں سے مدح محمدؐ و آل محمدؐ اسی زبان میں، اس خانوادے کا منصب رہی ہے۔ شاعری کے زیر و بم نجمؔ کے استخوان بندی میں شامل ہیں۔ دل سے نکلے ہوئے اشعار اردو کے حق میں ملاحظہ کیجئے:

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے نجمؔ میری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

آج اردوئے معلّٰی کی اشاعت کے لئے یہ غنیمت ہے کہ نجمؔ نکتہ داں باقی رہا

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجمؔ کُنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

میں خود ہوں مطمئن اے نجمؔ ادب کی خدمت سے جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم تمھیں کیا قدر ہو اردو زباں کی

ہم نے منزلت دی ہے نجمؔ نظم اردو کو ہر زمینِ شعر پر ہم نے آسماں اتارا ہے

میں پھیلاتا ہوں نور اے نجمؔ اپنے کنجِ عزلت سے زمینِ شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

اردو میں ہے نجمؔ مری نغمہ سرائی نغمہ عجمی اور نہ لہجہ عربی ہے

اعلان غربت کا اب اردو زباں سے ہے پوچھے تو کوئی یہ ادب یہ لہجہ کہاں سے ہے

اردو شاعری کا گھسٹا پٹا مضمون بے وفائی ہے۔ تجمّ کے ہاں یہ مضمون غم جاناں سے زیادہ غم دوراں میں نظر آتا ہے۔ تجمّ کی بلند شخصیت اور کمال فن کے حاسدوں نے ان کی زندگی دوبھر کردی تھی۔ خود داری اور قناعت، طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چاپلوسی، خوشامد اور حکمراں نوازی سے نفرت تھی۔ چنانچہ دشمن بہت آسانی کے ساتھ نقصان پہنچا دیتے تھے۔ تجمّ آفندی اردو ادب کے شاید وہ تنہا شاعر ہیں جو بیس سال سے زیادہ دربار سے منسلک رہے، لیکن کبھی تعریف اور مدح نہ کی۔ تجمّ کے پاس ایک شعر بھی کسی حکمراں کی شان میں نہیں ملے گا۔

مارا ہے کس کے داؤں نے دنیا سے کیا کہوں　　میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

کہاں وہ عہد گذشتہ کی دوستی اے دوست　　وہ دشمنی کی شرافت وہ دوستی نہ رہی

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن　　کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

مصیبت پر میری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں　　بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت　　دشمن بچے گا اب نہ مرے انتقام سے

بہت ممنون ہوں احباب کی چشم عنایت کا　　مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی

دشمنی مرا کیا بگاڑے گی　　دوست بن کر مجھے تباہ کریں

جو دوستوں پہ بھی چھپ کے وار کرتے ہیں　　بھلا وہ کیا کسی دشمن کا سامنا کرتے

اس تحریر کے اختتام پر ہم مختلف منتخب غزل کے اشعار جو مقصدِ زیست، آمیزش دین و دنیا، واعظ، خطیب اور مولوی حضرات کے ریاکارانہ رویہ سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، جن کا مقصد

آگہی اور انسانی اقدار کو نمایاں کرنا ہے، یہاں نمونتاً پیش کیے جا رہے ہیں:

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے　　زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

عیش کیا سخت سزا دیتا ہے　　مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے

بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل　　ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

میرے لئے آرام کہاں　　مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا　　تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور
ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور　　معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

زہے جلال کے شاہوں کو دستِ قدرت نے　　کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں　　ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست　　اِسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کنج فہم کا　　مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

رحمت نے گنہگاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا　　واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی　　کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے نجم اک انسان اعظم کی

اٹھا کر دہر سے رسمِ محبت اہل دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی

کس کو خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گہر تک

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اُس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پہ جس کو غرور تھا

اے نجم میں پتلا ہوں رنگ اور تلوّن کا
کس رنگ میں لکھے گی دنیا مرا افسانہ

نجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر
کس تبسم کا خزانہ میرے آب و گل میں ہے

ہر ایک در پہ نہ جا نجم داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہوکر

دیکھ اے واعظ مرا عرش سخن
میں ترے منبر پہ جاکر کیا کروں

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا
یارب مجھے دنیا سے گناہگار اٹھالے

ہماری فکر کا اندازہ دیکھ کر اے نجم
فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اتر آئی

نجم بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ بوئے گل　　واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے

کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں　　اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

ترتیبِ عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن　　آخر یہ قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں　　جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

کسی دن جا ملے گی روح ایک دن حقیقت میں　　کہاں تک واسطہ اے جمؔ آب و گل کے زنداں سے

اے جمؔ مدح آلِ نبی میں گزار دوں　　اللہ عمرِ خضر جو مجھ کو عطا کرے

میں جمؔ نہیں واقف آسائشِ دنیا سے　　کچھ نوحہ و ماتم ہی نکلیں گے مرے گھر سے

جمؔ ہم نکلے جو ارضِ تاج سے　　خسروِ بے تاج ہوکر رہ گئے

جمؔ اربابِ غرض نے دل کے ٹکڑے کر دیے　　زندگی نعمت سہی نعمت سے بھی دل بھر گیا

میں جمؔ خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ　　مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

راس آئے جناب جمؔ تمھیں　　سالکِ جادۂ وفا ہوتا

میرزا جمؔ سے نہ کچھ کہنا　　چاہے جو کچھ یہ کج کلاہ کریں

مہر و مہ بھی ہیں تجمّ دنیا میں آدمی سے مگر یہ بستی ہے

میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے تجمّ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

تجمّ یہ نشانی ہے اہل دل کی دنیا میں ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

شاعر سمجھ کے تجمّ کو سمجھے ہیں سادہ دل واقف نہیں ہیں آپ بھی اس کج کلاہ سے

تجمّ میں قائل نہیں ہوں انکسار و عجز کا میں ہوں سلطانِ سخن اور فکر برحق ہے ندیم

ہم تجمّ چار روز کے مہمان ہیں مگر رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

○

اختر انصاری اکبرآبادی

آسمانِ شعر و ادب کے نجم

جناب باقر زیدی کا ارشاد ہے کہ یادوں کے دریچوں کو وا کرو، بھولی بسری باتوں کو دُہراؤ۔ ریگزارِ سندھ میں رہتے ہوئے بھی ارضِ تاج کو تصورات کی دنیا میں لاؤ اور پھر یہی نہیں ارضِ تاج سے ارضِ دکن پر کمند ڈالو اس لیے کہ جناب ابنِ بزمؔ جناب نجمؔ کا مولد اکبرآباد تھا اور مسکن دکن، جناب بزمؔ نے ترکِ وطن کر کے دکن میں محفل جمائی تھی، بیٹا باپ سے کیسے جُدا رہتا۔ جناب نجمؔ کو بھی سرزمینِ تاج چھوڑ کر دکن جانا پڑا۔ ان کو وطن چھوڑنا پڑا اور اپنے میاں نظیرؔ نے وطن پر اشرفیوں کی تھیلیاں قربان کر دیں، اس لیے کہ شاہوں کے دربار میں سب کچھ تھا مگر وہ تاج محل نہیں تھا جس کا مینارہ صبح کو دیکھنے کے بعد میاں نظیرؔ شام تک شاداں و فرحاں رہتے تھے، دَور دَور کی بات ہے، زمانے میں تغیرات آتے رہتے ہیں۔ زمین بھی گردش میں رہتی ہے۔ کبھی کبھی راستے بھی بدل دیتی ہے۔ میاں نظیرؔ بھی آج زندہ ہوتے تو نہ معلوم اُن پر کیا گزرتی، کہاں جاتے کہاں رہتے کہ زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔

''یادیں'' تو پرچھائیاں بن چکی ہیں۔ ان میں تسلسل قائم نہیں رہا۔ تسلسل قائم بھی کیسے رہتا۔ ملکوں کے نام بدل چکے ہیں، ہندوستان اور پاکستان۔ ہم پاکستان میں ہیں اور ارضِ تاج، ہندوستان میں۔ تاج محل کی ٹھنڈی نشیلی چاندنی کی یاد بھی اب دھندلا گئی ہے۔ پھر یادوں کو مربوط رکھنے کے لیے دماغ اور جسم کی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اب کہاں، نہ وہ دماغ نہ وہ صحت۔ میں شاعرِ انقلاب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی کے دماغ و دل کی توانائی کہاں سے لاؤں، ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔'' جوشؔ تو ہماری اُس کھوئی ہوئی عظمت کا روشن مینار ہیں جس

سے ہم اہلِ قلم پہچانے جاتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کے حافظۂ صحت کا یہ عالم کہ سب کچھ یاد اور سب کچھ یادوں کی برات میں محفوظ۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی قلم بند کر دیا جائے تو بات آگے بڑھانے میں آسانی ہوگی۔ جوشؔ صاحب کے والدِ بزرگوار بھی شاعر تھے۔

جوشؔ صاحب خود نوعمری سے ہی مشغلۂ شعر فرماتے تھے۔ مگر والد صاحب پر یہ انکشاف اس وقت ہوا جب ایک مشاعرے میں ''سامنا'' ہوگیا۔ جوشؔ صاحب کی عمر اس وقت یہی پندرہ سولہ کا سن ہوگی۔ جوشؔ صاحب کو مشاعرے میں خوب داد ملی اور والد صاحب کو مقابلتاً بہت کم۔ آخر خانصاحب ٹھہرے۔ مشاعرے کے بعد گھر پہنچنے پر صحن میں غیظ و غضب کے عالم میں ٹہل رہے تھے کہ جوشؔ صاحب دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئے۔ ایک کڑکتی ہوئی آواز آئی۔

''شبّیر خاں ادھر آؤ، سنو! آج سے تمہاری شاعری بند، ہم اپنی توہین گوارا نہیں کر سکتے۔''

کسی مشاعرے کی کیفیت کا سراغ تو نہیں ملا مگر اندازہ یہی ہے کہ بزمؔ اور نجمؔ جب بھی کسی محفلِ مشاعرہ کی رونق ہوتے ہوں گے تو سامعین کی توجہ کا مرکز نجمؔ ہی بنے ہوں گے۔ حضرت بزمؔ آفندی کی قادرُ الکلامی برحق، مگر اسی دور میں نوحؔ ناروی اور یاسؔ یگانہ بھی تھے۔ جناب نوحؔ فراموش کر دیے گئے مگر یگانہؔ آج بھی موضوعِ گفتگو ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ، شگفتہ بیانی کچھ اور کہتی ہے اور قادر الکلامی کچھ اور۔ نجمؔ آفندی کے دل کا گداز، شگفتہ بیانی کا مظہر تھا، اور منفرد اندازِ بیان، سونے پہ سہاگہ۔

کم و بیش ۳۵، ۳۶ سال کی بات ہے اور وہ بھی اکبرآباد کی۔ رعناؔ اکبرآبادی سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ جب بھی میں تاج گنج سے شہر آتا تو حضرت رعناؔ و صباؔ سے ملاقات ضروری سمجھتا۔ ملاقات اور تجدید ملاقات کے مواقع نکلتے ہی رہتے تھے۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں رعناؔ صاحب سے ملنے گیا۔ بیٹھک کا دروازہ وا تھا، رعناؔ صاحب دروازے کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ اچانک رعناؔ صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا نجمؔ صاحب سامنے سے آرہے ہیں، میں نے کہا نجمؔ صاحب یہاں کہاں، وہ تو دکن میں محفل جمائے ہوئے ہیں۔

یہ فقرہ مکمل ہو رہا تھا کہ السلام علیکم، وعلیکم السلام سے کمرہ گونج اُٹھا۔ نجمؔ صاحب کی آواز

خاصی بھاری بھرکم تھی، تعارف ہوا، پہلا تعارف ۔ دکن سے وطن آمد کی وجہ معلوم ہوئی کہ آج کمپنی پارک میں مجلس ہے ۔ نجم صاحب کو مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ اور نسیم امروہوی بھی آئے ہوئے ہیں ۔ نسیم صاحب کے مرثیے تو سُنے تھے، مگر نجم صاحب کا مرثیہ سننا تو درکنار دیکھا بھی پہلی بار تھا، دل نے کہا آج کربلا والوں کی محفل میں ضرور جاؤ اور نسیم و نجم کا طمطراق دیکھو۔ مرثیہ لکھنا آسان کام تو نہیں ہے ۔ لکھنے والا خود تصویر درد بن جاتا ہے ۔ چنانچہ ہم کشان کشاں پہنچے، اور گریاں گریاں واپس آئے ۔ مرثیہ لکھنا تو مشکل ہے ہی مگر پڑھنا اور بھی زیادہ کارے دارد۔

سچی بات کہتے ڈر لگتا ہے ۔ نسیم امروہوی کچھ اس انداز میں مرثیہ سُنا رہے تھے جیسے کوئی واقعات اور سانحات بیان کر رہا ہو۔ لہجہ بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا مرثیہ ۔ مگر حضرت نجم کے تیور ہی اور تھے ۔ وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے ۔ لوگ سر دُھن رہے تھے ۔ جیسے یہ واقعہ آج ہوا ہے ۔ مرثیے میں درد تھا ۔ کرب تھا اور وہ خود تصویر درد ۔ باتیں پرانی ۔ انداز نیا ۔ پھر بیان سبحان اللہ ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نجم صاحب کے مرثیے کا اثر میں کئی دن تک محسوس کرتا رہا۔ کلام اور بیان کی یہ تاثیر کسی کسی کو ملتی ہے ۔

جناب نجم سے پہلی ملاقات کے بعد وقفے وقفے سے کئی ملاقاتیں ہوئیں ۔ گفتگو بھی سُنی، کلام بھی ۔ پڑھنے اور سُنانے میں خود اعتمادی کے تیوروں نے لطف دیا ۔ یہ اعتماد ذات کا اعتماد ہی نہ تھا بلکہ فن کا اعتماد بھی تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اعتمادِ ذات کے جوہر جب ہی کھُلتے ہیں جب شاعر علم و فن کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے ۔

نجم آفندی نے مرثیے بھی لکھے ۔ غزلیں بھی کہیں، نظمیں بھی تصنیف کیں اور تضمین کے فن کو بھی آزمایا ۔ اُن کی زنبیلِ شاعری میں سب کچھ تھا۔ ہر صنف شعر پر انہیں دسترس حاصل تھی ۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی اتنا کہ جتنا خرچ کیجیے، بڑھتا ہی جائے ۔ علم و آگہی کا یہ عالم کہ بیدار دماغی تحسین و آفریں کہے ۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ قیامت ہوتے تھے ۔ بلا ہوتے تھے ۔ کسی گھر بند نہیں، بلکہ ہر دروا۔

وقت جیسے جیسے گزرتا جاتا ہے، ادب و شعر کی شاخیں پھیلتی جاتی ہیں ۔ عصر حاضر میں شاعر کے افکار کے جائزے سے پہلے نظریۂ شعر کی بات ہوتی ہے ۔ پہلے اسکول تھے ۔ دبستان تھے ۔

انھیں سے شاعر پہچانا جاتا تھا۔ اب نظریات کی بات ہوتی ہے۔ غمِ جاناں، غمِ دوراں کے علیحدہ علیحدہ تذکرے ہوتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ کسوٹیاں وضع کی جاتی ہیں۔ پہلے وطن اور قوم کی ترجمانی کا تصور سب سے اہم تھا۔ قوم و ملّت کی اصلاح کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اگر اقبالؔ علمی قد کی بلندی کے ساتھ نہ آتے تو شاید فرسودہ خیال کہلاتے۔ حالیؔ اور اکبرؔ بڑا کام کر گئے مگر نظریات کے اسیر انہیں کہاں مانتے ہیں، نظریات تو مغرب سے آئے ہیں۔ ان نظریاتی مبلغین کے سامنے وہ مقصدیت کہاں جس کی مسلم قوم کو ضرورت ہے۔ جناب نجمؔ کی متعدد نظموں کی روشنی میں یہ فیصلہ غیر حقیقی نہیں ہوگا کہ وہ مزاجاً حالیؔ اور اقبالؔ سے قریب ہیں اور ان کے یہاں ملک و ملّت اور وطن اور قوم کا واضح تصور ہے۔ وہ شاعری کے ذریعہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں، کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی خدمت جو عظمت کی ضامن ہو۔

نجم صاحب کا تمام کلام سامنے نہیں ہے اور اگر جملہ ذخیرۂ شعر و ادب پیشِ نظر بھی ہوتا تو حادثاتِ ارضی و سماوی سے عصرِ حاضر میں آدمی کو اتنی مہلت کہاں کہ سب کچھ پڑھے لکھے۔ نیرنگیِ زمانہ کا بُرا ہو۔ حالات ایک حساس شاعر کو بیقرار رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مرثیہ لکھتا ہے اور کبھی نوحہ، کبھی طنز کرتا ہے اور کبھی تنقید۔ یہ عذر نہیں حقیقت ہے۔ یہ گریز نہیں اظہارِ حال ہے۔ اس کا جواز بھی نجمؔ صاحب کی چند نظموں میں موجود ہے۔ جس میں قوم کی بے راہروی کا شکوہ ہے۔ ماتم ہے۔ دُکھ ہے ملال ہے۔ ملک و ملّت کی بقاء اور استقامت کے لیے قوم میں جو جذبۂ خلوص و عمل ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔ اُس کا دور دور پتہ نہیں۔ حال ایسا کہ مستقبل کا کوئی روشن اشارہ نہیں ملتا، ماضی ایسا جو حال اور مستقبل پر نکتہ چینی ہے کہ کیا تھے اور کیا ہو گئے تم۔ یہ کون کہے، کون سمجھائے کہ ایسا کیوں ہوا۔ آج جو حال ہے، آج جو عالم ہے اُس کا اظہار نجمؔ آفندی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

یہ نقشہ ہے کہ اُمیدوں پہ جیسے پھر گیا پانی
یہ صورت ہے کہ ارمانوں کی جیسے لُٹ گئی دنیا

شعاعِ مہرِ فطرت کا تبسم بن کے آتی ہے
مذاقِ بے محل سے جل رہا ہے سینۂ صحرا

وہ عالم ہے جہاں ہو اجتماعِ جسم وجاں مشکل
فقط حدِ نظر پر ہیں زمین و آسماں یک جا
کوئی حائل نہیں فطرت کی ترتیبِ مناظر میں
اب اک اہلِ نظر ہو اور یہ عالم بے حجابی کا
حقیقت بستیوں کی ایسے ویرانوں میں کھلتی ہے
ستارے ڈوبتے ہیں چین سے سویا کرے دنیا

ان اشعار میں طنز بھی ہے اور اظہارِ حقیقت بھی، یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ تاحدِ نظر زمین و آسمان تو یک جا نظر آئیں، مگر مخلوقِ خدا میں اتحاد نہ ہو۔ بستیاں ایسی جن کا عالم درد دیکھ کر ستارے ڈوب جائیں مگر بے ضمیری اور بے حجابی اپنے مقام پر رہے۔ اس تمام زیر و بم کو تجمّل آفندی نے فطرت کے ساتھ مذاق بے محل کہا ہے، اور اس بے محل مذاق سے آبادی تو کیا سینۂ صحرا بھی بسمل اُٹھا ہے۔ یہ دردمندی اور یہ احساس تجمّل کی شاعری کی ایک ایسی لازوال سچائی ہے، جس کے سبب وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

○

ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی

نجم آفندی کی غزل گوئی

نجم آفندی کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے۔ معروف شعراء کے خانوادے سے تعلق رکھنے کی بنا پر بچپن ہی سے ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ نجم آفندی جنہوں نے آگے چل کر نوحہ نگاری، قصیدہ نگاری اور سلام نگاری میں نام پیدا کیا، اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کرتے ہیں۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں اس دور کے معروف غزل گو، شاہ نیاز احمد وارثی کی ایک غزل کی تضمین کرتے ہوئے شاعری کی ابتدا کی۔ اس تضمین کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔

زہے عزّ و جلا لے بوترا بے فخر انسانے[1]
علی مرتضیٰ مشکل کشائے شیر یزدانے

نجم آفندی اپنے والد بزم آفندی سے اصلاح لیتے رہے اور اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے سیماب اکبر آبادی اور دیگر معروف شعراء کی موجودگی میں ایک مشاعرے میں جو غزل پیش کی اس کا مطلع تھا۔

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے[2]
قبر عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

نجم آفندی کی، غزل سے یہ دلچسپی عمر بھر قائم رہی، اگر چہ بعد ازاں انھوں نے رثائی ادب کو زادِ آخرت کے طور پر حرزِ جاں بنائے رکھا۔ وہ مشاعروں سے زیادہ مذہبی مجالس، محافل،

---

[1] نور الحسن ہاشمی' ادب کیا ہے' سرفراز قومی پریس، لکھنؤ س ۔ن۔ص 70

[2] نجم آفندی (خودنوشتہ مشمولہ مجلہ النجم ص 275

مسالموں اور مقاصدوں میں شرکت کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ بایں وجہ ان کی زندگی میں غزل کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ ان کے ایک خط سے ان کی دوسو کے قریب غیر مطبوعہ غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ نجم آفندی کی غزلوں کا پہلا انتخاب، جس میں صرف پچاس غزلیں شامل ہیں، ان کی وفات کے چار سال بعد ''لہوقطرہ قطرہ''[1] کے نام سے شائع ہوا۔ گویا غزلوں کی کثیر تعداد اب بھی غیر مطبوعہ ہی ہے۔

گزشتہ صفحات میں بیسویں صدی کے جن غزل گوشعراء کا ذکر کیا گیا ہے، نجم آفندی نے ان کی موجودگی میں اپنی غزل کا چراغ جلائے رکھا۔ انھوں نے اپنی غزل میں جہاں ان شعراء اور اس عہد کے مجموعی رجحان کے اثرات قبول کیے، وہاں اس مقبول صنف سخن میں اپنی منفرد آواز کے ذریعے الگ سے اپنی پہچان بھی کرائی ہے۔ جب کوئی اہم غزل گو کسی سے اثرات قبول کرتا ہے تو اس کو اندھی تقلید نہیں بننے دیتا، بلکہ اپنے تجربے کے پیش نظر استفادہ کرتا ہے تاکہ شخصی تجربے کو ذات کی سطح سے بلند کیا جاسکے۔ نجم آفندی کے پاس سلام اور نوحے کے حوالے سے ایک ایسی مضبوط اور توانا آواز موجود تھی جسے صدائے احتجاج یا ظلم کے خلاف کلمۂ حق کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اہل بیتؑ سے محبت رکھنے کے باعث ایک ایسی محبت موجود تھی جس میں غم کو تقدس حاصل تھا۔ اس تناظر میں انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے عہد کی ملی جلی آوازوں سے استفادہ کیا۔ ان آوازوں میں ایک اہم آواز اقبالؔ کی تھی۔ نجم آفندی کی شعری جہت کے تعین میں حالیؔ اور اقبالؔ کی اصلاحی شاعری کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کی عمومی شعری روایت کی تقلید میں نجم آفندی بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کرتے ہیں لیکن قوم کی اصلاح کی خاطر غزل کو سے زیادہ ملی شاعر کے طور پر اپنی پہچان کراتے ہیں۔ نجم آفندی کی غزل میں بھی ہمیں حالیؔ اور اقبالؔ کی بُو باس محسوس ہوتی ہے۔ نجم آفندی نے لہجے اور موضوع، دونوں سطحوں پر اقبالؔ کے اثرات کو قبول کیا جس کی ایک مثال ان کی اس غزل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

لہو کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر　　خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر
سبک خرامیِ برق و شرار پیدا کر　　جو رہگزار نہ ہو رہگزار پیدا کر

---

[1] نجم آفندی 'لہوقطرہ قطرہ' کراچی پرنٹنگ محل، ناظم آباد، ص 276

فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر　　دلِ غریب محبت شعار پیدا کر
نگاہِ ناز کی یہ سرد مہریاں تو بہ　　نگاہِ شوق سے برق و شرار پیدا کر
تصورات کے نقش و نگار کیا ہوں گے　　تصرّفات میں نقش و نگار پیدا کر
غرور ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کر　　سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر
جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو　　کمالِ غم سے وہ نصف النہار پیدا کر

یہ اشعار پڑھ کر جہاں ردیف کے حوالے سے ذہن ''سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر'' کی طرف منتقل ہوتا ہے، وہاں ایسے موضوعات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں جو اقبالؔ کی شاعری سے مخصوص ہیں۔ اقبالؔ بھی لہو کے جوش کا قائل ہے۔ وہ برق و شرار سے تحرک کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں بھی غم ایک بڑی طاقت ہے اور عشق اپنا جہان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ثمین فاطمہ ''لہو قطرہ قطرہ'' کے دیباچے میں لکھتی ہیں۔

> ''اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنف شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع، حقائق کی رنگارنگی کو غزل میں سمو کر یہ بات ثابت کردی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ حسن و عشق، مضامینِ تصوف اور تمام تر مسائل حیات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل کی غزلیں صحت مند تخیل، جاندار طرز بیان اور توانا فطری جذبات کا مرقع ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ کے بعد صرف نجمؔ صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی تو بے جا نہ ہوگا۔''[1]

ان سطور کے آخر میں اگر چہ دیباچہ نگار کی رائے شدید طور پر مبالغہ آمیز نظر آتی ہے، تاہم اس سے ایک بات کا ضرور پتا چلتا ہے کہ نجمؔ نے اقبالؔ کے بنائے ہوئے راستے پر نہ صرف قدم رکھے بلکہ ایک طرح سے غزل میں اقبالؔ ہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھے۔

نجمؔ کے عہد میں یاسؔ یگانہ کی انا پرستی نے نجمؔ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ وہ اس سے صرف اس حد تک متاثر ہوئے کہ اس کی بلند آہنگی کو قبول کر کے اسے اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ یگانہ مذہب گریز رویوں پر زیادہ زور دیتا ہے جب کہ نجمؔ آفندی مذہب کو بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ نظریاتی

---

[1] نجمؔ آفندی خودلوشت مشمولہ مجلہ انجم ص 275

اختلاف کے باوجود وہ یگانہ سے متاثر ہیں۔ اس کی وجہ نظریئے سے زیادہ نجم کا یگانہ سے شخصی تعلق ہوسکتا ہے، جو حیدر آباد میں قیام کے دوران ایک عرصے تک دونوں کے درمیان رہا۔ نجم پر یگانہ کے اثرات کو واضح کرنے سے پہلے یگانہ کا یہ شعر دیکھیں:

سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا
سب تیرے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا

اب نجم آفندی کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ موضوع میں بُعد کے باوجود نجم کے اشعار پر یگانہ کا لہجہ کس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔

وقت کی پرستش ہے آدمی کا مذہب کیا — مدت مہذب کیا قوم نا مہذب کیا
موت کے سوا اب ہے زندگی کا مطلب کیا — دل ٹٹولنے والے دل میں رہ گیا اب کیا

یگانہ کا ایک شعر ہے:

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

نجم آفندی کا یہ شعر دیکھئے:

دولت و علم کی منزل میں ہُوا ہے اکثر
اپنی ہستی پہ کوئی اور گماں ہو جانا

نجم کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل میں یگانہ کی انا اور بلند آہنگی سے متاثر ہیں۔ اور وہ ان عناصر کو اپنی غزل میں شامل کر کے دراصل اپنی انا پرستی اور بلند آہنگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ نجم کے عہد کے ایک اور بڑے شاعر اکبر الہ آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اکبر کی شاعری کا بنیادی وصف گہرا طنز ہے۔ جب انھیں اخلاقی پستی دکھائی دیتی ہے تو وہ اپنی حسِ طنز و مزاح کو کام میں لاتے ہیں اور زندہ رہنے والے اشعار تخلیق کرتے ہیں۔ نجم آفندی اپنی غزلوں میں جب اخلاقی پستی اور زوال کی بات کرتے ہیں تو ان کے ہاں مزاح تو پیدا نہیں

ہوتا البتہ اکبر کے طنز کے طور طریقے ضرور جھلکنے لگتے ہیں۔

مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں　　جناب شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا

نجم کے عہد پر غالب کے اثرات بڑے وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس عہد میں کوئی غزل کہے اور غالب کے اثرات سے پہلو بچا لے۔ نجم نے اگرچہ قوافی بدل کر غالب کی فضا سے نکلنے کی شعوری کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غالب کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ غالب سے بچتے بچتے اقبال کی شعری قلم رو میں داخل ہو گئے ہیں۔ نجم کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھیں۔ قافیہ بدلا ہوا ہے۔ غالب نے ''بیاں اور گماں'' وغیرہ قوافی استعمال کیے ہیں۔ اقبال نے بھی اس زمین میں غزل کہی لیکن اقبال کی غزل دیکھ کر کہیں یہ گمان نہیں گزرتا کہ انھوں نے غالب کی زمین کو استعمال کیا ہے۔ لیکن نجم کی غزل دیکھ کر فوراً خیال غالب کی طرف جاتا ہے۔ غالب کی غزل کے اشعار دیکھیے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اقبال کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اور اب نجم کے اشعار دیکھیے۔

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور　　مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور　　معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا　　تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وفا اور

(''لہو قطرہ قطرہ'' ص 22)

اس منزل میں غالب اور اقبال کے ملے جلے اثرات صاف مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔ نجم آفندی کی ایک اور غزل بھی غالب کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں بھی نجم نے قافیہ بدل کر غالب کے اثر سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کے اثرات جیسے ہر شعر سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ غالب کے اشعار ہیں:

ہے یہاں روئے سخن حسنِ حقیقت کی طرف　　اہلِ ظاہر کے لیے ہے وجہ رسوائی غزل

(لہوقطرہ قطرہ) ص45

اس طرح تجمّل اپنی ایک رباعی میں فلسفہ غزل میں بیان کرتے ہیں:

رنج و غم سہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں　　جب میں چُپ رہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں

مری غزلوں سے ٹپکتا ہے میرے دل کا لہو　　دردِ دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں

(لہوقطرہ قطرہ) ص45

تجمّل آفندی کے ان شعری نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے حال دل کے اظہار کے لیے دیگر اصناف کے مقابلے میں غزل ہی کو قابل اعتنا سمجھا ہے۔ بنیادی طور پر نوحہ نگار ہونے کے باعث تجمّل نے غزلیہ اشعار میں بھی شہادت امامؑ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں میں شہادت امامؑ محض بین نہیں، بلکہ اس تاریخی واقعہ کے پاتال میں اتر کے ایک تجزیاتی انداز میں صورتحال کو سمجھنے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ ظلم کو ظلم کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انسان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کی طرح انسان کی خودی اور خود داری کے اثبات پر زور دیا ہے۔ ان کی روشن خیالی، انسان کی خود داری کے نقوش جگہ جگہ پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن　　کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا

ہر ایک در پر نہ جا تجمّل داد کی خاطر　　کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

(غ م)

کمالِ فن مرے دست طلب سے دور نہ تھا　　مگر قبول نہ تھی شرطِ انکسار مجھے

(غ م)

آساں ہی سہی ہم سے خوشامد نہیں ہوتی　　دشوار ہے وہ کام جو کرنا نہیں آتا

(غ م)

شریک حال تھی عہدِ جنوں میں خود داری　　زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

(غ م)

حق نا شناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجم　　خود داری سخن کو سخن داں سے کام ہے
(ص108)

کوشش تو نجم دولتِ دنیا نے کی بہت　　بھولے سے بھی "نعم" نہ کہا میں نے "لا" کے بعد
(غ م)

درج بالا اشعار کی روشنی میں ایک ایسے انسان کا تصور نگاہوں میں ابھرتا ہے جس میں انا اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسا انسان جو بلند نشینی کے خواب دیکھتا ہے۔ احساس کمتری کو اپنے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے شعروسخن اور کمال فن پر بھی کسی سے داد کا طالب نہیں ہے کیونکہ شعروسخن پر داد طلب کرنے کو وہ بھیک کے مترادف سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر محبوب التفات برتنے میں غرور کا مظاہرہ کرے تو نجم آفندی ایسے التفات کو بھی پسند نہیں کرتے۔

باعثِ زندگی سہی، میں وہ قبول کیوں کروں　　ساتھ ہے التفات کے ان کا غرورِ التفات
(لہوقطرہ قطرہ)

نجم کے اشعار میں شاعرانہ تعلّی کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اکثر غزل گو شعراء نے اپنی شاعرانہ عظمت کو بیان کرنے کے لیے تعلّی کے اشعار کہے ہیں۔ نجم آفندی نے ان اشعار میں ایک تو روایت کا بھرم رکھا ہے، دوسرے ان میں ان کی افتادِ طبع کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ اگرچہ شاعرانہ تعلّی کی ایک سے زیادہ وجوہ ہوسکتی ہیں مگر ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب کوئی خوددار شاعر یہ دیکھتا ہے کہ اس کی وہ پذیرائی نہیں ہورہی جس کا وہ مستحق ہے، تو وہ ردعمل میں آکر تعلّی کا شکار ہوجاتا ہے۔ نجم آفندی کے ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے لفظ کی قدر و قیمت کا پوری طرح احساس تھا۔ شاعرانہ تعلّی کے حوالے سے نجم کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زورِ طاقت کیا　　وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

حق ناشناس مجھ سے ملاتے نہیں نظر　　جس دن سے سامنا مری فکر و نظر کا ہے
(لہوقطرہ قطرہ ص45)

اے نجم کتنے اہل سخن نے میرے سخن کے چربے اتارے
(لہوقطرہ قطرہ)

حجم کی غزل میں موضوعات کے تنوع کا اوپر ذکر ہوا۔ حجم نے غزل کے روایتی موضوعات میں بھی یکسانیت سے ہٹ کر بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھا جائے تو عشق، غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اس سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے ہاں عشق کی الگ الگ کیفیات کار فرما نظر آتی ہیں۔ حجم آفندی کا تصور عشق دبستان دہلی کے شعراء کے مزاج کے قریب ہے۔ وہ درد میں نشاط کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور نشاط میں درد کی، ان کی داستان عشق بے زبان کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔ وہ راز کی بات چھپاتے ہیں۔ جب شام غم آتی ہے تو چاند بھی کمہلایا ہوا لگتا ہے۔ وہ غم عشق میں فریاد کو کفران نعمت سمجھتے ہیں۔ حجم آفندی عشق کی گہری کیفیتیں بیان نہیں کرتے بلکہ معلوم کیفیتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے اشعار کی بُنت ایسی ہوتی ہے کہ ان میں ایک تازہ کاری کا احساس موجود رہتا ہے۔ ان کے تصور عشق کے حوالے سے حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ دردمندی ہی دراصل ان کے ہاں عشق کا دوسرا نام ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ دردمندی غزلوں سے دل کا لہو بن کر ٹپکے۔ اس حوالے سے حجم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مری زندگی سے اب بھی ترا فاصلہ بہت ہے　　مرے دل تک آنے والے میرے درد دل تک آ

(لہو قطرہ قطرہ) ص 19

کتنے سودے ہو رہے ہیں درد دل کے نام پر　　کس قدر پچھتا رہا ہوں بات کہہ کر راز کی

کچھ کمی شام غم کے اثر میں نہیں　　چاند کمہلا گیا رات ڈھلنے لگی

(غ م)

کفر نعمت ہے غم عشق میں فریاد نہ کر　　زیست کی شان یہ ہے موت کو بھی یاد نہ کر

(غ م)

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے　　عرض کرنا ہے تو کر، آج کچھ ارشاد نہ کر

(غ م)

ہوا جو ذکر محبت کے درد مندوں کا
ہمارا نام بھی شاید برائے نام آیا

(غ م)

کانپ اٹھا میں دیکھ کر دردِ محبت کا اثر　　رو دیا وہ سنگدل بھی مجھ کو سمجھانے کے بعد
(غ م)

ان اشعار کو پڑھ کر ایک اور بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ نجم دبستان دہلی کے ہم مزاج ہونے پر بھی کہیں کہیں ان سے مختلف ہیں۔ مثلاً وہ خودسپردگی کے مرحلے سے نہیں گزرتے ہیں۔ وہ روتے ہیں تو ساتھ ان کا محبوب بھی روتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا انسان ہے۔ وہ نجم کی باتوں پر ردعمل ظاہر کرتا ہے اور کبھی تخاطب میں نجم آفندی کے تیور بھی دیکھنے والے ہوتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں نجم آفندی کی غزل پر اقبال کے جن اثرات کا ذکر ہوا، وہ محض زبان وبیان کی حد تک تھے۔ نجم کے کلام میں اقبال کی ایک فکری جہت، جس کا تعلق حرکت وعمل سے ہے، ایک مستقل حیثیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ نجم نے اپنے نوحوں، رباعیوں، منقبتوں اور سلاموں کی طرح اپنی غزلوں میں بھی درسِ عمل دیا ہے اور طرح طرح سے قوم کے احساسِ خفتہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ نجم آفندی زندگی کو میدانِ عمل بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمل میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ دل میں اندھیرا ہو تو حسنِ عمل سے وہاں اجالا ہوسکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر حوصلہ سلامت ہو تو اکیلا آدمی، کارواں ہوکر منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی　　اس اندھیرے کا اُجالا اور ہے
(لہو قطرہ قطرہ) ص 60

موت کو بھی دو قدم ہٹنا پڑا　　زندگی میدان میں جب ڈٹ گئی
(لہو قطرہ قطرہ) ص 33

کیا خاکِ مذلت سے ابھرتی نہیں قومیں　　کیا ڈوب کے نبضوں کو ابھرنا نہیں آتا
(غ م)

عزم محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر　　راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر
(غ م)

انھیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرم عمل کر دو اندھیرے میں خطِ تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا
(غ م)

درس عمل کی بات کرتے ہوئے نجم آفندی اپنے عہد کی سائنسی رفتار سے بھی کہیں کہیں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے عہد میں امریکہ اور روس میں چاند تک پہنچنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے مرثیے 'معراج فکر' میں بھی ایک بند چاند کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ اور غزلوں میں بھی اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ یہ سفر بھی ان کے ہاں عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے زمیں پہ جس کے لیے چاندنی اُتر آئی
(لہو قطرہ قطرہ ص 41)

کرتے رہو تم تا بہ قمر جانے کی کوشش جانا ہے مجھے خالقِ صد شمس و قمر تک
(غ م)

سب نے اپنے اپنے مقصد کے بنا رکھے ہیں چاند اپنی اپنی حد میں سب نے چاند تک پرواز کی
(غ م)

نجم آفندی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت ہمارے شاعروں کا ایک پسندیدہ موضوع سرمایہ ادرانہ نظام کی مخالفت کرنا تھا۔ اقبالؔ، جوشؔ اور راشدؔ کے ہاں سرمایہ داری کے خلاف شدید طنز ملتا ہے۔ نجم آفندی نے بھی محدود سطح پر اس موضوع کو اردو غزل میں بیان کیا ہے۔

فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر دلِ غریب محبت شعار پیدا کر
(لہو قطرہ قطرہ) ص 11

غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کر سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر
(غ م)

درج بالا موضوعاتی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نجم آفندی نے زیادہ تر اپنے عہد کے موضوعات اختیار کیے لیکن روایت کے مکمل شعور کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کہیں کہیں انھوں نے روایتی غزل کے پیش پا افتادہ مضامین بھی باندھے لیکن ان میں وہ نیا پہلو تلاش نہ

کر سکے اور تازہ کاری پیدا نہ کر سکے۔ ایسے مضامین میں انھوں نے روایتی شاعری کے کرداروں، مثلاً واعظ، شیخ، رند، زاہد کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

گناہ نشر کیے اُس کے خوب واعظ نے　　خدا کی راہ میں جس جس کا دل دکھانا تھا
(لہوقطرہ قطرہ) ص 30

دیکھ اے واعظ مرا عرشِ سخن　　میں ترے منبر پہ جاکر کیا کروں
(غ م)

سنتا ہوں کہ سیدھے ہیں بہت حضرتِ واعظ　　دھوکے میں چلے آئے تھے میخانے کے در تک
(غ م)

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا　　یا رب مجھے دنیا سے گنہگار اٹھالے
(غ م)

کہہ دے کوئی واعظ سے کہ یہ سجدہ گزاری　　محدود نہیں ہے طلب سجدہ و سر تک
دے رہے تھے بے عمل درسِ عمل　　ہم بھی سب سن کر سمجھ کر رہ گئے
(غ م)

نجم آفندی نے ان شعری کرداروں کو خالصتاً روایتی معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی واعظ وہی عالم بے عمل، لوگوں کو جہنم سے ڈرا کر اپنا مطلب نکالنے والا، شیخ وہی دوہری شخصیت کا مالک، رند وہی مست مئے خود اور زاہد وہی پارسا جو اپنی پارسائی پر اتراتا پھرتا ہے اور دوسرے کو گنہگار تصور کرتا ہے۔

نجم آفندی کی غزل کے یہ ملے جلے رنگ ایک ایسے شاعر کا پتا دیتے ہیں جو بیک وقت قدیم اور جدید کے رویوں کی آمیزش سے ایک ایسا شعری پیکر تخلیق کرتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ فنی اور تخلیقی سطح پر فن کی نئی دنیاؤں کا متلاشی بھی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ نجم کی غزل اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے روایت اور اپنے عہد کے اسلوب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں وہ سوز و گداز پیدا کیا جس کی جڑیں ان کے رثائی کلام میں موجود ہیں۔ نجم اپنے تخیل اور اسلوب کے زور پر ان جڑوں پر

ایسا شجر سایہ دار استوار کرتے ہیں جو غزل کی فضا میں برگ و بار پیدا کرتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزل لطفِ کلام اور اثر کے اعتبار سے انہیں بیسویں صدی کے قابل ذکر غزل گو شعراء میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے۔

○

محترمہ ثمین فاطمہ

نجم کی غزلیں

لفظ غزل میں عشق اور وارداتِ عشق، حسن اور جلوہ طرازیِ حسن، واقعاتِ ہجر، لذتِ وصال، بادہ وساغر، شراب وشباب اور گریۂ وتبسم کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ خمریات کے علاوہ ریختہ پر بھی کافی توجہ دی جاتی رہی۔ اس کے علاوہ چشم وابرو، خط رخسار اور تشبیب وفراز بدن کا ذکر، غزل کی چاشنی سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح غزل اپنے ارتقائی منازل میں صرف انہی موضوعات کا مظہر رہی۔ انشا، مصحفی، شیفتہ وناسخ سب اسی روش پر چلتے رہے۔ اس طرح غزل کی ایک مخصوص ہیئت بن گئی اور غزل اپنی اسی ہیئت کی بنا پر پہچانی جانے لگی۔ اس وقت یہ سوچا بھی نہ جاسکتا تھا کہ غزل کو کسی اور قالب میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔ اسرارِ کائنات، جام وسبو کی تہ سے نکل کر سطح جام تک آسکتے ہیں۔ پرانی روایات اور فرسودہ رواج پر زلف محبوب سے خطِ تنسیخ کھینچی جاسکتی ہے، تشبیب وفراز بدن کے بجائے تشبیب وفرازِ زندگی سے لوگوں کو آشنا کرایا جاسکتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے غزل کے لیے کسی قدر الگ راہ متعین کی تھی۔ لیکن صرف اسی حد تک کہ طنز کے لہجے میں عذاب وثواب، جنت ودوزخ اور حوروغلمان کے تذکرے کرتے رہے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ غالبؔ کے بعد کوئی شاعر اردو غزل کو کسی نئی نہج پر لا کھڑا کرے گا۔ لیکن علامہ اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنفِ شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع، حقائق کی رنگارنگی کو غزل میں سمو کر یہ بات ثابت کردی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ عشق وحسن، مضامین

تصوف اور تمام تر مسائلِ حیات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل کی غزلیں صحت مند تخیل، جاندار طرز بیان اور توانا فطری جذبات کا مرقع ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل، غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ کے بعد صرف نجمؔ صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی، تو بے جا نہ ہوگا۔

نجمؔ صاحب کے ذہنی شعور اور ان کی غزلوں کی ہیئت کے پیشِ نظر ان کا دور اقبالؔ کے اواخر سے شروع ہوکر جوشؔ اور فیضؔ کے ساتھ چلتے ہوئے احمد فرازؔ، عبید اللہ علیمؔ، کشور ناہیدؔ اور فہمیدہؔ ریاض سے پہلے ہی ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں پھر خط وخالِ محبوب، نشیب وفراز بدن اور عریانیت و فحاشی کے موضوعات ملتے ہیں۔ نجمؔ صاحب کا مجموعہ غزلیات ''لہو قطرہ قطرہ'' صنفِ غزل میں ایک عظیم اور قیمتی سرمائے کا اضافہ ہے اور ان اقدار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن سے اقبالؔ نے غزل کو آشنا کیا، اس نہج کا آئینہ دار ہے، جس کو انقلابیوں نے پسند کیا، ان مسائل کو سموئے ہوئے ہے، جو ادب برائے زندگی کا خاصہ ہیں۔

نجمؔ صاحب کے یہاں غزل زندگی اور اس کے ماحول کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر سموکر نہایت لطیف انداز میں پائیدار ادب کو جنم دیتی ہے، ان کی غزلوں میں اختصار ہے، خیال کی گہرائیاں ہیں، فکر کی بلندیاں ہیں، یہ غالبؔ کی طرح صرف یہ تمنا کرکے نہیں رہ جاتے کہ

ع: کاش کہ پر ے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

بلکہ وہ پستی ہمت کے شاکی ہیں۔ ان کے یہاں بلندی کی حد نہیں ملتی کہ

حریف عزم نہ ہوتی جو پستیِ ہمت
نہ جانے کتنی بلندی پر آشیاں ہوتا

اقبالؔ کی خودی ان کے یہاں خودداری کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ راہ عشق میں بھی راہِ رضا سے ہوکر گزرتے ہیں۔ دل کے تلاطم کی ترجمانی کے

لیے وہ نغمہ کے بجائے نوحہ کا انتخاب کرتے ہیں ۔

گزاردوں شبِ غم ایک ہی تبسم میں
سحر کے رُخ پہ ستارہ سا جگمگاؤں کیا
شبِ غم نہ ہوگی چراغوں سے روشن
یہ تارے کدھر جگمگانے چلے ہیں

لیکن میرؔ کی طرح وہ زودار آواز میں فریاد وفغاں نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ناکامیِ عشق پر گریہ کناں ہیں۔ اس کے برعکس ان کے کلام میں اعتماد اور یقین ہے۔

آئیں گے ضرور وہ ان سے یوں کہے کوئی
ان کی راہ، جاں نثار دیکھتا چلا گیا

ان کے نزدیک صرف غزل جلوہ طرازیِ حسن اور وارداتِ عشق کی متحمل نہیں ہوتی بلکہ

قصیدہ عرض کیجیے تجمّ شانِ حسن میں کوئی
وہ کہتے ہیں غزل ارشاد فرمانے سے کیا ہوگا

مرزا غالبؔ کی واعظ سے درِ میخانہ پر ملاقات ہوتی ہے تو وہ آنکھیں چُرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس تجمّ صاحب آنکھیں چرا کر نکل نہیں جاتے، بلکہ جناب شیخ کی مزاج پُرسی کرتے ہیں۔

مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں
جنابِ شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا

مفت کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالبؔ اس انفرادی تجربہ کو زمان ومکان کی حدود سے آزاد کر کے تجمّ

صاحب یوں آفاقیت عطا کرتے ہیں کہ

رنگ لائیں گی غلط سرمستیاں ہر دَور میں
لٹتا جائے گا یونہی میخانہ میخانے کے بعد

علامہ نجم آفندی صاحب جوشؔ کی طرح انقلاب کے بلند و بانگ نعرے نہیں لگاتے، نہ ہی چیخ و پکار اور توڑ پھوڑ کا شور مچاتے ہیں، بلکہ وہ صرف دھیمی آواز میں پیامِ انقلاب دیتے ہیں۔

جناب نجم آفندی نے چھوٹی بحروں میں بھی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمیں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ تصوف میں ڈوب کر نہیں رہ جاتے، حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں، نشتریت نہیں۔ اسرارِ حیات و کائنات کا ذکر ضرور کرتے ہیں، لیکن اس میں الجھ کر نہیں رہ جاتے۔

ان کا یہی دھیما دھیما انداز— ہلکی آواز میں صدائے انقلاب— نرم روی سے حقائق کی نشان دہی— عشق مگر عقل کی رہنمائی کے ساتھ— پندونصائح کا دفتر کھول کر نہیں بیٹھ جاتے۔ نہ مشکل قوافی کا انتخاب— ان کا یہی وہ منفرد اسلوب ہے جو صنفِ غزل میں انھیں ایک منفرد، ممتاز اور جاوداں مقام عطا کرتا ہے۔

○

مطبوعہ غزلیات

1

مرا دل ہے نقشِ دوامِ محبت
مری ہر نظر ہے پیامِ محبت

محبت کا مفہوم سمجھو نہ سمجھو
سنا ہوگا تم نے بھی نامِ محبت

بہت کوششیں کیں حریفوں نے اب تک
بگڑنے نہ پایا نظامِ محبت

دو عالم جسے محترم جانتے ہیں
کیا اس نے خود احترامِ محبت

بڑی اس کی قسمت میسّر ہو جس کو
دعائے محبت سلامِ محبت

مرے واسطے عہدِ مجنوں سے اب تک
امانت رہے صبح و شامِ محبت

یہ اے نجمؔ تم حق پرستوں سے کہہ دو
مبارک ہو سودائے خامِ محبت

2

کفرِ نعمت ہے غمِ عشق میں فریاد نہ کر
زیست کی شان یہ ہے موت کو بھی یاد نہ کر

دل کی وسعت ہی تمنا کے لیے ہے لیکن
ہمتِ دل سے جو کم ہو اُسے آباد نہ کر

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

عزمِ محکم ہو تو گر گر کر سنبھلتا ہے بشر
راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

دلِ خود دار کی توہین ہے اے دردِ ستم
کون کم ظرف یہ کہتا ہے کہ بیداد نہ کر

ان کی آنکھوں میں ہے رقصاں ابھی پندارِ ستم
مجھ سے کہتے ہیں کہ گزرے ہوئے دن یاد نہ کر

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت
غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

زورِ تخیل سے پیدا ہی نہ ہو شکلِ عمل
فکرِ آزاد کو اتنا بھی اب آزاد نہ کر

(3)

مست وہ عیش میں ہیں غم سے گریزاں ہیں ہم
سونیوالوں کو خبر کیا ہے کہ بیدار ہیں ہم

حسن کا زعمِ نظر عشق کا معیار ہیں ہم
سب نے لوٹا ہے ہمیں اہلِ گہر بار ہیں ہم

نہ تو مرنے کے نہ جینے کے سزاوار ہیں ہم
آپ کی مشقِ ستم کے لیے درکار ہیں ہم

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم
کم سے کم عزتِ انساں کے تو حقدار ہیں ہم

ہم نے تاریک زمانوں کو دکھائے ہیں چراغ
کلمۂ کُن کی قسم مطلعِ انوار ہیں ہم

اتفاقات کے بل پر یہ رعونت یہ غرور
پھر کہو آنکھ ملا کر کہ روا دار ہیں ہم

در زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

اپنے مستقبلِ روشن کی خبر دینے کو
ماضی و حال کے مٹتے ہوئے آثار ہیں ہم

دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار
کون کہتا ہے زمانے کے لیے بار ہیں ہم

بے تحاشہ ہمیں دعویٰ نہیں آزادی کا
آدمیت کے شکنجے میں گرفتار ہیں ہم

فیصلہ دورِ تشدد کا بھی ہو گا اک دن
جو اٹھا رکھی ہے فطرت نے وہ تلوار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہو کر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گنہگار ہیں ہم

بات کہنا ہے ترے عہد میں کتنا مشکل
کچھ نہ کہنے پہ بھی ہر وقت گنہگار ہیں ہم

ہم کو معلوم ہیں آئین محبت کی حدود
بے نیازِ روشِ صبح و زُنّار ہیں ہم

صلح مقصود اگر ہے تو یہ جھگڑا کیوں ہو
تم گنہگار نہیں خیر گنہگار ہیں ہم

جمؔ اس عہد میں بے قدر ہے کیوں جنسِ وفا
کوئی اتنا نہیں کہتا کہ خریدار ہیں ہم

(4)

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سُنا ہے
شاید کوئی رستہ میں مری طرح گرا اور

اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقدیر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

اللہ گلہ کر کے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اس نے کہا اور

کتنے بھی ہوں کشتے مرضِ حرص و ہوا کے
بیمار کی موت اور ہے مرگِ شہدا اور

کیا زیرلب اے دوست ہے اظہارِ جسارت
حق ہو کہ وہ ناحق ہو ذرا لے تو بڑھا اور

یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا مُنعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور

یہ دَور جو اے نجم ہے اردو کا مخالف
اس دور میں اردو کی ہوئی نشو ونما اور

5

مری نظر میں نہ معیارِ صبح و شام آیا
تڑپ گیا میں جب اس کا زباں پہ نام آیا

اسے بھی بھر ہی دیا جب اجل کا جام آیا
کہاں کہاں یہ متاعِ حیات کام آیا

عجب نہیں مرے عفوِ خطا کی صورت ہو
سزا کے واسطے میں ایسا تیز گام آیا

یہ لوگ حضرتِ واعظ کو بھولنے کے نہیں
جو میکشوں میں کبھی وقتِ فیضِ عام آیا

ستم شعاروں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم سہے
خیال میں بھی نہ احساسِ انتقام آیا

جو پی کے آئے تھے نشّے اتر گئے ان کے
میں اُٹھ کے جب درِ ساقی سے تشنہ کام آیا

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے
وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

شہیدِ عشق وہاں خود پہنچ چکا تھا مگر
برسمِ دہر اُدھر سے اِدھر سلام آیا

کوئی تو دردِ محبت کا چارہ گر ہو گا
ہزار بار یہ دل میں خیالِ خام آیا

ہُوا جو ذکر محبت کے درد مندوں کا
ہمارا نام بھی شاید برائے نام آیا

سُخن طرازوں میں تنقید کی غرض سے سہی
کلامِ نجم کا بھی ذکرِ لا کلام آیا

6

خدا کی یاد کو بھی میکدہ میں آنا تھا
ہمیں بھی اپنا مصلّا الگ بچھانا تھا

بھری بہار تھی پھولوں میں آشیانہ تھا
میں سوچتا ہوں حقیقت تھی یا فسانہ تھا

کہا یہ کس نے ہمارا بھی اک زمانہ تھا
یہ بات کر کے کچھ اپنا ہی دل دُکھانا تھا

پیامِ حق تہِ تیغِ ستم سناتا تھا
یہ وار بھی دلِ قاتل پہ کر کے جاتا تھا

چمن پہ روپ، نشیمن میں دلکشی نہ سہی
گری ہے برق تو موسم بڑا سہانا تھا

نگاہ پھیر لی فطرت نے حسن دے کے فقط
بغیر عشق تمھیں آدمی بنانا تھا

اجل نے کی ہے وہ عجلت کہ سانس لے نہ سکے
ذرا حیاتِ دو روزہ پہ مسکرانا تھا

نہ غم کو تھی نہ حوادث کو دشمنی مجھ سے
کبھی کبھی مرے احساس کو جگانا تھا

خدا کو میں نے بفیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

گناہ نشر کیے اس کے خوب واعظ نے
خدا کی راہ میں جس جس کا دل دکھانا تھا

ملال کس کو ہے دشمن نہیں وہ دوست سہی
مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

قدم قدم پہ خطا کی ہے ابن آدم ہوں
نئے گناہ مگر سلسلہ پُرانا تھا

جو ہار بیٹھے تھے ہمت وہ اب کدھر جاتے
خیال و خواب کی منزل ہی اک ٹھکانا تھا

رہِ وفا میں بڑا بول کوئی کیوں بولے
کہاں گئے وہ جنھیں میرے ساتھ آنا تھا

میں نجمؔ حال کا مفہوم ہی سمجھ نہ سکا
مری نظر میں گزرتا ہوا زمانہ تھا

7

سچ ہے کہ وہ قریبِ رگِ جاں ضرور تھا
پاسِ ادب سے میں ہی ذرا دور دور تھا

سجدے میں کل کسی کا سرِ پُر غرور تھا
دن پھر گئے تو ردِ عمل بھی ضرور تھا

مارا ہے کس کے داؤں نے دنیا سے کیا کہوں
میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

آنکھوں نے جان ڈال کے دل رکھ دیا تھا نام
دل کیا تھا میرے ذوقِ نظر کا شعور تھا

سنتا ہوں منتظر تھیں ہزاروں حقیقتیں
میں عشرتِ خیال کے نشہ میں چور تھا

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر
کہنا یہی پڑے گا ہمارا قصور تھا

انھیں جو اَب کی بار قیامت ہی بن کے ہم
جینے کے واسطے ہمیں مرنا ضرور تھا

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پہ جس کو غرور تھا

سب اقتدار ملتے ہی مصرف میں آگیا
کم ظرف کے دماغ میں جتنا فتور تھا

کیا رنگ و روپ آیا ہے کافر کے حسن پر
کتنا مری نگاہِ محبت میں نور تھا

عرفانِ نفس تھا جنھیں ان کا سکوں نہ پوچھ
میں کم نصیب اپنی حقیقت سے دور تھا

8

کسی دن داغِ گمراہی رہے گا ان کے سر ہو کر
جو اپنی راہ چلتے ہیں ہمارے راہ بر ہو کر

بضاعت کیا رہے گی مصرفِ نقد و نظر ہو کر
غنیمت ہے جو کوئی عیب رہ جائے ہنر ہو کر

نئی قیدیں بڑھیں منت گزارِ بال و پر ہو کر
دوائے دردِ دل آئی عذابِ دردِ سر ہو کر

سکوں حاصل ہے مجھ کو بندگی میں بھی محبت کی
تمہیں راحت نہیں ملتی خدائے سیم وزر ہو کر

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر

وہ کیا جانیں کہ تیور اور ہیں اب جذبۂ دل کے
یہ سمجھے ہیں کہ رہ جائے گا کچھ دن شور شر ہو کر

دیا کرتا ہے انساں اپنے دل کو بھی فریب ایسا
خبر سب کچھ ہے اور بیٹھے ہوئے ہو بے خبر ہو کر

نہ پوچھو دہر میں کچلی گئی ہے زندگی کتنی
کہیں بید ست و پا ہو کر کہیں بے بال و پر ہو کر

کبھی عزم و عمل کی طاقتوں میں خم نہیں آیا
دکھائی آنکھ دنیا نے بہت زیر و زبر ہو کر

خدا معلوم دل سے کیا جوابِ تلخ ملتا ہے
محبت کا پیام آیا ہے محرومِ اثر ہو کر

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر

دلِ پُر درد کو بے درد دنیا کیا سمجھتی ہے
سہے گا وار تنہا امنِ عالم کی سپر ہو کر

زمانہ ہو چکا باطل کی افسانہ طرازی کا
حقیقت رنگ لائی ہے نوائے کارگر ہو کر

اجل ہو گی وہ کیسی جینے والے سوچتے ہوں گے
اجل کو ڈھونڈتا ہوں زندگی سے بہرہ ور ہو کر

نہ عزمِ آہنی تھا جن کی قسمت میں نہ منزل تھی
پڑے ہیں رہ گزر پر کشتگانِ سیم وزر ہو کر

حریفوں کو مبارک ہو برائے نام آزادی
یہ آئی ہے انھیں کے گھر حیاتِ مختصر ہو کر

ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے جمؔ کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

9

احساسِ التجا بھی نہیں التجا کے بعد
اللہ کیا سکون ملا ہے دعا کے بعد

حاصل ہوا یہ سعیِ دلِ مبتلا کے بعد
اے دوست پھر زوال ہے نشو ونما کے بعد

تقدیر اُس کی جس کو یہ منزل نصیب ہو
اک شکر کا مقام ہے صبر و رضا کے بعد

کیا اقتضاء ہے تیرے کرم کا یہ ہے سوال
یہ میں بھی جانتا ہوں سزا ہے خطا کے بعد

رندوں میں اور بڑھ گیا رحمت کا اعتبار
واعظ ترے بیانِ عذابِ خدا کے بعد

نظریں ہماری جوہرِ قابل ہیں یا نہیں
دیکھیں گے ایک جلوۂ ہوش آزما کے بعد

کتنا خدا سے قرب کچھ اہلِ وفا کو ہے
کس کس کی یاد آئی ہے یادِ خدا کے بعد

غم کی فضا میں کوئی نہ آیا بروئے کار
دل بجھ گئے ترے دلِ دردآشنا کے بعد

انجام سعیٔ فکر و عمل کا خدا پہ چھوڑ
امید ہی خبر کی نہ رکھ مبتدا کے بعد

دنیا رسا ہو تا بہ حقیقت مجال ہے
لوٹی ہے پچھلے پاؤں ہر اک ارتقاء کے بعد

دیکھا ہے کس نے چہرۂ ہستی پہ رنگ و روپ
اہلِ وفا سے پہلے اور اہلِ وفا کے بعد

اک مشتِ خاک ہی سہی نسبت تو دیکھیے
کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

کوشش تو حجم دواتِ دنیا نے کی بہت
بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

10

ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا
کسے زبانِ محبت کا اعتبار آیا

فضائے شوق میں جو اپنے جی کو مار آیا
حیات و موت کی سرحد پہ رُستگار آیا

غرورِ عشق میں سر نذر کر دیا میں نے
نگاہِ ناز کا اک قرض تھا اُتار آیا

خود اپنے حسنِ طبیعت کا عیش کیا کم تھا
خیال میں نہ کبھی عیشِ روزگار آیا

رہِ طلب میں بڑی روک تھام تھی لیکن
قدم بڑھا دیے جس نے وہ ہاتھ مار آیا

شریک حال تھی عہدِ خزاں میں خود داری
زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

نہ جانے کس کو پکارا تھا اس کی رحمت نے
تڑپ کے میں نے صدا دی گنہگار آیا

نئے نئے جو سنے ہر فضا میں نام اس کے
بغیر نام کے ہی میں اُسے پکار آیا

کُجا تصورِ حق تہ ملی نہ باطل کی
مرے خدا، میں بہت ہاتھ پاؤں مار آیا

کسی نے اپنی محبت کا تذکرہ جو کیا
مجھے بھی یاد مرا خوابِ خوشگوار آیا

یہ اور بات ہے ہم خود چمن میں رہ نہ سکیں
خدا، کا شکر زمانہ تو پُر بہار آیا

کبھی مزاج ٹٹولا نہ عصرِ حاضر کا
خیال عہدِ گذشتہ ہزار بار آیا

لگا کے تجمّ محبت میں آخری بازی　　شعورِ فکر و نظر کی رقم بھی ہار آیا

11

جو اپنے دل کے طلاطم کا ترجماں ہوتا　　زباں پہ جس کی ہے نغمہ وہ نوحہ خواں ہوتا
حریفِ عزم نہ ہوتی جو پستیٔ ہمّت　　نہ جانے کتنی بلندی پہ آشیاں ہوتا
کبھی تو جا کے خدائی سے بندگی ملتی　　بُرا ہی کیا تھا جو سجدہ نہ درمیاں ہوتا
تمہارے ذوقِ تکلّم کا یہ تقاضہ ہے　　تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں　　جنابِ شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا
گزر رہے ہیں محبت میں دن غنیمت ہے　　مزاج کرتے جو کوئی مزاج داں ہوتا
گناہ اور ہے جبرِ گناہ ہے کچھ اور　　جو معترض ہے وہ اے کاش نکتہ داں ہوتا
بہار آئی تھی کچھ زخمِ دل ہرے ہوتے　　یہ سوز و ساز کا موسم نہ رائیگاں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری　　زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا
شریکِ حال نہ ہوتی جو تجمّ خود داری　　ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

12

نہ پوچھئے غمِ دوراں میں کیا اثر دیکھا　　خود اپنے حال پہ کس کس کو نوحہ گر دیکھا
منازلِ غمِ ہستی کو عمر بھر دیکھا　　مآل یہ ہے کہ جیسے بیک نظر دیکھا
مزاجِ دوست نے بھولے سے جب اِدھر دیکھا　　نگاہِ شوق میں اک حسن جلوہ گر دیکھا
رہِ رضا میں سہارے بغیر چل نہ سکے　　بڑے بڑوں نے مرا ہاتھ چھوڑ کر دیکھا
کچھ ایسے نقش مری خستگی نے چھوڑے ہیں　　غرورِ حسن بھی تھرّا گیا جدھر دیکھا
گناہگاروں کے اتنے بڑے سے مجمع میں　　خدا کا شکر مجھے اس نے اک نظر دیکھا
قصیدے جن کی زبانوں پہ دردِ دل کے رہے　　انھیں بھی ہم نے گرفتارِ دردِ سر دیکھا
خدا بھلا کرے احباب کی نگاہوں کا　　ہمارا حال تھا نا دیدنی مگر دیکھا
عمل کی حد میں وفا کا بڑا مقام سہی　　بیاضِ عشق میں اک حرفِ مختصر دیکھا
اسے بھی خلقتِ انسانیت پہ ناز ہوا　　جب اس نے کون و مکاں دیکھ کر اِدھر دیکھا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی
ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا

مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا نجمؔ
وہ رنگ چہرہ یومِ انیسؔ پر دیکھا

13

زمانے کی فضا میں انقلاب آنے سے کیا ہوگا
نہ بدلے گا یہ دل دنیا بدل جانے سے کیا ہوگا

کبھی جھوٹی تسلی سے کسی کی پیاس بجھتی ہے
ہمیں سمجھائیں اپنے دل کو سمجھانے سے کیا ہوگا

انہیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرم عمل کر دو
اندھیرے میں خطِ تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا

کوئی تدبیر کیجے میں نہیں تقدیر کا قائل
مری حالت پہ لفظوں میں ترس کھانے سے کیا ہوگا

بحمد اللہ محفل کی فضا میں نے بدل ڈالی
اٹھا دو اب مجھے اب میرے اٹھ جانے سے کیا ہوگا

ملے گی کچھ نہ کچھ دیوانگی ہر مردِ میداں میں
یہی کہتی رہے دنیا کہ دیوانے سے کیا ہوگا

نگاہِ خشمگیں دعوت نہ بن جائے تبسم کی
ہم ایسے من چلوں پر آگ برسانے سے کیا ہوگا

خدا رکھے یہی زندہ دلی ہوگی سواب بھی ہے
گئی گزری جوانی کے پلٹ آنے سے کیا ہوگا

نشیمن میں بھی رہ جائے قفس کا دردِ سر شاید
رہا ہو کر گلستاں کی ہوا کھانے سے کیا ہوگا

قصیدہ عرض کیجے نجمؔ شانِ حسن میں کوئی
وہ کہتے ہیں غزل ارشاد فرمانے سے کیا ہوگا

14

دے کے دل، میں بے قرار دیکھتا چلا گیا
اپنے غم کا شاہکار دیکھتا چلا گیا

اس کو راہِ عشق پر لے کے آئے بھی تو کیا
اپنے حسن کی بہار دیکھتا چلا گیا

چھیننے کی چیز تھا اک میرا عزمِ مستقل
انقلابِ روزگار دیکھتا چلا گیا

موت نے اُتار لی جب نقابِ زندگی
زندگی کا پردہ دار دیکھتا چلا گیا

کیا ضرور تھا کہ وہ غم کی بات پوچھ لے
دو جہاں کا غم نثار دیکھتا چلا گیا

کائناتِ حسن تھی آئینہ در آئینہ
میں بہار در بہار دیکھتا چلا گیا

آئیں گے ضرور وہ ان سے یوں کہے کوئی
ان کی راہ جاں نثار دیکھتا چلا گیا

زندگی بھی خواب تھا اے خوابِ زندگی
خوشگوار و ناگوار دیکھتا چلا گیا

پھر خمارِ غم ہوا غم کو پھر نظر لگی
پھر مجھے ستم شعار دیکھتا چلا گیا

آہ کر رہا تھا جو سانس بھی نہ لے سکا　　فیضِ جبر واختیار دیکھتا چلا گیا
عید ہی سہی مگر میکدے میں ہم نہ تھے　　تجمّل ابرِ نو بہار دیکھتا چلا گیا

15

کھل گیا جامۂ ہستی کا گراں ہو جانا　　دیکھیں اس بزم سے انھیں تو کہاں ہو جانا
جان لیوا ہے ترا جانِ جہاں ہو جانا　　کس وناکس کے قریبِ رگ جاں ہو جانا
ساتھ دوگے مرا تم بھی کو زبانی ہی سہی　　حق کو اک روز ہے جاری بزباں ہو جانا
دل کا آئینہ سلامت مجھے منظور نہیں　　آئینہ دیکھ کے دم بھر کو جواں ہو جانا
اس سے کیا صبر کے معیار میں فرق آتا ہے　　عظمتِ غم سے مرا اشک فشاں ہو جانا
ہائے وہ مجھ پہ زمانے کی نگاہِ تنقید　　ہائے وہ اپنی ہی نظروں سے نہاں ہوجانا
کہیں ان آنکھوں سے جاتی ہے حقائق پہ نظر　　دل کو خود چاہیے چشمِ نگراں ہو جانا
وقت آنے پہ مجھے دوست بنانا ہی پڑا　　راس آیا نہ انھیں دشمنِ جاں ہو جانا
کیسا میدانِ عمل دیکھ کے دل بیٹھ گیا　　کیسا آساں تھا ارادوں کا بیاں ہو جانا
دولت وعلم کی منزل میں ہُوا ہے اکثر　　اپنی ہستی پہ کوئی اور گماں ہو جانا
اپنے اوہام کو الہام سمجھنے والے　　کچھ ہنسی کھیل ہے کیا حق بزباں ہو جانا
عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں　　زندگی میں ہے فراقِ تن وجاں ہو جانا
کیسی حسرت سے مری بے عملی نے دیکھا　　کتنی دل سوز امیدوں کا دھواں ہو جانا
تجمّل بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے　　تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہو جانا

16

خوابِ خوش کہنے ہی کو اپنا تھا اپنا کچھ نہ تھا　　حرفِ آزادی سنا تھا ہم نے سمجھا کچھ نہ تھا
کون کہتا ہے کہ دنیا میں ہمارا کچھ نہ تھا　　جب تک اپنے فرض کا احساس تھا کیا کچھ نہ تھا
ہاتھ خالی اپنی منزل سے چلا سوئے عدم　　اے مسافر کچھ ترے قبضہ میں تھا یا کچھ نہ تھا
بات کہنے کی نہیں لیکن حقیقت ہے یہی　　میری ہستی سے جو سب کچھ ہے وہ تنہا کچھ نہ تھا
ان کی اک کروٹ پہ ہو جاتی ہے دنیا مضطرب　　میں تڑپتا تھا مگر میرا تڑپنا کچھ نہ تھا

پُر سکوں تھی میرے دل کی طرح مسجد کی فضا
کتنے فتنے آج اٹھے ہیں کل یہ جھگڑا کچھ نہ تھا

دامنِ دولت تھا جب تک دامنِ اغیار میں
آپ بھی تھے ہم بھی تھے یہ میرا تیرا کچھ نہ تھا

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی
کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

ہم کو کس کس نے نہ سکھلائے طریقے صبر کے
اپنے اوپر وقت جب آیا طریقہ کچھ نہ تھا

اعترافِ معصیت تھی میکشی کے ساتھ ساتھ
میکدے میں نازِ تسبیح و مصلّا کچھ نہ تھا

سو ارادے تھے عمل کے حوصلہ کو کیا کریں
اب تو کہنے کے لیے ان کا ارادہ کچھ نہ تھا

فطرتِ انساں پہ جب تک عشق تھا پَرتو فگن
جوہرِ انسانیت کو حجمؔ خطرہ کچھ نہ تھا

17

پھر نہ اٹھا کوئی فتنہ حشر ہو جانے کے بعد
رہ گئی خاموش دنیا میرے افسانے کے بعد

وہ تسلی دینے آئے ہیں ستم ڈھانے کے بعد
کیا کروں گا اب یہ تحفہ گھر ہی لٹ جانے کے بعد

اس بھری دنیا میں اک انساں نظر آتا نہیں
زعم کتنا بڑھ گیا انسان کہلانے کے بعد

میکدے میں مجھ پہ جو ہنستے ہیں ان کو کیا خبر
کتنے پیمانے انھیں گے میرے پیمانے کے بعد

میری پیشانی پہ اک بل بھی نہ آئے گا نظر
دیکھنا میری طرف دنیا بدل جانے کے بعد

کھل گئی تیری زباں ذوقِ سماعت اب کہاں
کیا کہے کوئی ترے ارشاد فرمانے کے بعد

کانپ اٹھا میں دیکھ کر دردِ محبت کا اثر
رو دیا وہ سنگدل بھی مجھ کو سمجھانے کے بعد

تم کہاں تک جاگ سکتے ہو سحر ہونے کو ہے
شمع محفل کو بھی نیند آتی ہے پروانے کے بعد

بجلیوں کی شوخیوں کو ایک مصرف چاہیے
آپ کا عشرت کدہ ہے میرے ویرانے کے بعد

رنگ محفل اب کسی فنکار کے بس کا نہیں
دیکھئے کیا ہو مجھے محفل سے اُٹھوانے کے بعد

خاک ہو کر ہم نشیں اکسیر ہونا ہے مجھے
کیا کہیں راحت ملے گی خاک ہو جانے کے بعد

رنگ لائیں گی غلط سرمستیاں ہر دور میں
لٹتا جائے گا یونہی میخانہ میخانے کے بعد

حجمؔ فکرِ حُب میں اک حرفِ آخر اور ہے
ہم ٹھہرنے کے نہیں پیغام پہنچانے کے بعد

18

جنوں کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر
خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر

سُبک خرامی برق و شرار پیدا کر
جو رہ گزار نہ ہو رہ گزار پیدا کر

فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر
دلِ غریب محبت شعار پیدا کر

قدیم زاویۂ فکر سے جہاں کو نہ دیکھ
نظر مناسبِ لیل ونہار پیدا کر

غرور بندگی و ہوشِ بندگی کب تک
جبیں سے سجدۂ مستانہ وار پیدا کر

نگاہِ ناز کی یہ سرد مہریاں توبہ
نگاہِ شوق سے برق و شرار پیدا کر

نئی حیات ہو عہدِ حیات کا حاصل
اس ابتدا سے یہ انجام کار پیدا کر

تصورات کے نقش و نگار کیا ہوں گے
تصرّفات میں نقش و نگار پیدا کر

غرور ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کے
سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر

نظر سے عجز نہ جھلکے زباں پہ آہ نہ ہو
فضائے جبر سے یہ اختیار پیدا کر

ہزار رنج اُٹھا لے یہ بارِ غم نہ اٹھا
نہ بھول کر بھی کوئی غمگسار پیدا کر

جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو
کمالِ غم سے وہ نصف النہار پیدا کر

جو بڑھتے بڑھتے اک احساسِ کمتری بن جائے
نہ اس طرح کا غمِ انکسار پیدا کر

مجھے ہو فتح کیا امید اس کو بیم وشکست
دلِ حریف میں بھی اعتبار پیدا کر

وہ جنگ کی کہ لبِ زخم پر ہنسی بھی نہ ہو
کوئی مقابلۂ خوشگوار پیدا کر

حکومتوں کے بھی جھک جائیں سر ترے آگے
وہ دل وہ حوصلۂ اقتدار پیدا کر

جو پھانس بن کے رگِ دل کی روح کہلائے
کہیں سے وہ خلش ساز گار پیدا کر

گلہ ہو شکر ہو تقریر ہو کہ شعر ہو جمؔ
یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

19

پہنچیں گے نہ گمراہ تری راہ گزر تک
قسمت کے سکندر ہیں پلٹ آئیں جو گھر تک

کیا ذکر ہے نشہ کا تری بزم میں ساقی
چہرے بھی اُتر جائیں گے آثارِ سحر تک

کیوں آ گئے تم ہر کس و ناکس کی نظر میں
کیا نور تھا رُخ پر مری پاکیزہ نظر تک

سُنتا ہوں کہ سیدھے ہیں بہت حضرت واعظ
دھوکے میں چلے آئے تھے میخانہ کے دَر تک

مارے گئے کچھ یوں بھی غمِ عشق کے رہرو
پہنچی نہ کسی قافلہ والے کو خبر تک

اُبھریں گے کبھی جادۂ تقدیس کے دھبّے
انسان فرشتہ ہی سہی نقد و نظر تک

ناکامِ ازل پوچھتا پھرتا ہے ہر اک سے
وہ کس کی دعا ہے جو پہنچتی ہے اثر تک

اک شب تو محبت کی عبادت میں گزر جائے
اللہ بچالے جو شبِ غم کی سحر تک

کرتے رہو تم تا بہ قمر جانے کی کوشش
جانا ہے مجھے خالقِ صد شمس و قمر تک

ہم کیا ہیں میسر نہیں موسیٰ کو تحمل
سنتے ہیں کہ بات آہی گئی ذوقِ نظر تک

کہہ دے کوئی واعظ سے کہ یہ سجدہ گزاری
محدود نہیں ہے طلبِ سجدہ و سر تک

اک پَل میں بھی ہے معرفتِ حُسن کا امکاں
وقفہ ہے بہت روشنیِ برق و شرر تک

اللہ رے اس کی نگہِ ناز کی قوت
کھینچی ہے لکیر ایک مرے دل سے جگر تک

کس کو ہے خبر مرحلے طے کتنے کئے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گُہر تک

دل اپنا جلاتا ہوں شبِ غم تو یہ غم ہے
یہ آگ پہنچ جائے نہ دامانِ سحر تک

اللہ میں کب سے پسِ دیوار پڑا ہوں
کتنی یہ کٹھن راہ ہے دیوار سے دَر تک

فرمودۂ غالبؔ کے موافق ہوں میں اے نجمؔ
جینے کا یقیں کس کو ہے آہوں کے اثر تک

20

سوئے ابل بھی جائیں گے اس کرّ و فر سے ہم
گیتی بھی تھرتھرائے گی گزرے جدھر سے ہم

آج اپنے ہی چمن میں ہیں بے بال و پر سے ہم
اللہ گھر میں رہ کے بھی باہر ہیں گھر سے ہم

میداں میں سر بلند تھے تیغ و تبر سے ہم
زنداں میں سر نہ پھوڑیں گے دیوار و در سے ہم

کیا جانے اتحاد ہو یا اور افتراق!
جس دن اُدھر سے آپ اٹھیں اور ادھر سے ہم

تم نے ہنر کو عیب سے بدتر بنادیا
کچھ عیب بھی کیا تو کریں گے ہنر سے ہم

بیگانہ دردِ سَر سے ہے وہ دردِ دل کجا
کھٹکا یہ ہے الجھ نہ پڑیں چارہ گر سے ہم

بخشا ہے ظرف دیکھ کے فطرت نے دردِ دل
لائے نہیں اٹھا کے کسی رہ گزر سے ہم

تاریکیوں میں روشنیاں پھیلتی گئیں
کتنے چراغ جل گئے گزرے جدھر سے ہم

اُٹھ جائے روئے حسن سے پردہ حجاب کا
باتیں کریں گے عشق کے پیغامبر سے ہم

رات آگئی یہ بیچ میں کس تیرہ بخت کی
بیدار ہوچکے تھے پیامِ سحر سے ہم

راس آئیں شاید ان کو یہ ہنگامہ سازیاں
منزل کو جا رہے تھے اس شور و شر سے ہم

تم نے تو خوب راہ میں کانٹے بچھائے ہیں
بچ بچ کے چل رہے ہیں شعورِ نظر سے ہم

طوفان یہ تھمے تو ملے فرصتِ عمل
بیٹھے ہیں ہار مان کے فکر و نظر سے ہم

جینا ہمارا مرگِ مسلسل سے کم نہیں
اس حال میں بھی جیتے ہیں مرنے کے ڈر سے ہم

کیا بال و پر ہیں قوتِ پرواز کے بغیر
کس درجہ دیدہ زیب ہوئے بال و پر سے ہم

جوشِ عمل بڑھا بھی تو اتنی زباں کھلی
زنداں کوئی ملے تو بدلتے ہیں گھر سے ہم

وہ بھی ہیں چل پڑے جو ستاروں کی راہ پر
اور آپ چاہتے ہیں کہ باز آئیں سر سے ہم

کیا بیچ میں سے بات کٹی ہے نہ پوچھئے
کچھ کہہ رہے تھے زندگیٔ مختصر سے ہم

وحدت ہماری حاصلِ نوعِ بشر ہے نجمؔ
وابستہ ہیں جو دامنِ خیر البشرؐ سے ہم

21

حدِ گناہ میں آجاتی ہے نگاہ کبھی
بشر سے ہوتے ہیں کتنے گناہ نا معلوم

وہ اقتدار سہی ناگہاں نصیب نہ ہو
رہے گا دل پہ بھی کچھ اقتدار کیا معلوم

سنوارے لب کے نئے سر سے جب چمن فطرت
بہار کس کی ہو کس کی خزاں خدا معلوم

ٹھٹک کے رہ گئے نا آشنائے راہِ وفا
رُکے نہ وہ جنہیں اپنا مقام تھا معلوم

ہے بال بال گنہگار خود میں کہہ دوں گا
کریں گے جبرِ مشیت سے اور کیا معلوم

شعورِ خیر سے امکانِ شر ہُوا معلوم
خرد زدوں کو یہ قدرت کے کھیل کیا معلوم

بشر نے رازِ حقیقت کیا ہے کیا معلوم
تمام فکر و نظر اور تمام نا معلوم

بہت زمانے سے تھا ذوق کارفرمائی
چلو تمہارا بھی معیار ہوگیا معلوم

ہر آدمی سے میں حق بات کہتے ڈرتا ہوں
یہ حق ہوا ہے فرشتوں کو بھی بُرا معلوم

بہت سے ایسے فسانے تو سنتے آئے تھے
بدل ہی جائے گی دنیا یہ کس کو تھا معلوم

بچا ہوں وار سے دشمن کے بارہا لیکن
ابھی ابل کو ہیں رستے ہزارہا معلوم

جو دردِ عشق ترا حاملِ حیات نہیں
سوال ہے تری ہستی جواب نا معلوم

غضب کیا مری آنکھوں میں ڈالدیں آنکھیں
پلائیں گے مجھے کتنی شراب کیا معلوم

کوئی حسینؑ کا ایثار حجم کیا سمجھے
کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

22

مجھے کرنا ہے کچھ پروانۂ آتش بجاں ہوکر
وہ شعلہ بن کے جلنا یا سلگنا ہو دھواں ہوکر

کہیں ہوتی ہے احسانوں کی گنتی مہرباں ہوکر
یہ باتیں دل میں رہتی ہیں حسابِ دوستاں ہوکر

گرا ہو سعی برحق میں صنفِ ناتواں ہوکر
ضرورت ہے تو اٹھوں خاکِ مقتل سے جواں ہوکر

بہت اڑتے ہوئے دیکھے ہیں دامن دھجیاں ہوکر
یہ پروازِ تشدد رہ نہ جائے رائیگاں ہوکر

رہے صدیوں کسی کے در پہ سنگِ آستاں ہوکر
دماغ اب عرش پر ہیں امتیازِ جسم و جاں ہوکر

ہوئی ہو ابتداء جس کی عذابِ ناگہاں ہوکر
نہ جانے کیا بلا ہوگی وہ آزادی جواں ہوکر

کشش ہے خاک کی یا بے نیازی خاکساری کی
بہت سرکش اُتر آئے زمیں پر آسماں ہوکر

کوئی حق کا دھنی اٹھے تو باطل تھم نہیں سکتا
ہم اپنے حق سے خود بیٹھے ہوئے ہیں بدگماں ہوکر

زہے جوشِ عمل کچھ ہنسنے والے کر لیے پیدا
وہ جذبہ کیا جو آخر رہ گیا انگڑائیاں ہوکر

سلامت ہمت منزل نہ دے گا ساتھ گر کوئی
اکیلا اپنے دم سے بڑھ چلوں گا کارواں ہوکر

گنہ کیا سر پہ لیتے آزماتے کس کی رحمت کو
خدا کے خوف نے جنبش نہ کی بارِ گراں ہوکر

امیدِ عافیت کیا کیا پھلی پھولی ارے توبہ
زمیں کانپی لہو برسا وہ گزرے ہیں جہاں ہوکر

اُلٹ پھیر اس کی قدرت کے سمجھ ہی میں نہیں آئے
بہار آئی دلیلِ اعتباراتِ خزاں ہوکر

دلِ بیگانۂ ہمت کو یارب کیا کرے کوئی
جو پتھر بن کے ٹھیرا کاش اُڑ جاتا دھواں ہوکر

نہ ٹکّر لے سکی کوئی مرے شوقِ شہادت سے
ہزاروں نعمتیں آئیں نصیبِ دشمناں ہوکر

عجب کیا دم نکل جاتا جو کم ظرفوں کا سنتے ہی
نوید آتی اگر کوئی حیاتِ جاوداں ہوکر

گری جب آشیاں پر ہم نے تب بجلی کو پہچانا
ہزاروں بارگزری ہے قریبِ آشیاں ہوکر

یہ دن چڑھتا ہوا پھولوں کے یہ اُترے ہوئے چہرے
چمن میں کیا بہار آئی ہے تصویرِ خزاں ہوکر

23

بن گئی قوسِ قزح جب لے کے انگڑائی غزل
فکر کے ظلمت کدہ میں روشنی لائی غزل

فلسفہ، منطق، سیاست، موعظہ، حکمت، حدیث
علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل

حمد و نعت و منقبت، نوحہ، قصیدہ، مرثیہ — کتنے عالم اپنے دامن میں اٹھالائی غزل
رزم میں بھی کارفرما بزم میں بھی نغمہ کار — نازشِ اسکندری و فخرِ دارائی غزل
جوہر فرہاد و مجنوں نَے دَمن کا رنگ و روپ — لذّتِ شیرینی و اندازِ لیلائی غزل
اللہ اللہ دامنِ پیغمبری تک دسترس — رفعتِ فکرِ سلیماں بَن کے اِترائی غزل
میرؔ و غالبؔ کی غزل ہے تجمّل و ثاقبؔ کی غزل — تجھ سے ارضِ تاج نے کی بزم آرائی غزل
زادۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں — یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل
ابتدائے آفرینش سے یہی ہوتا رہا — عشق نے آنسو بہائے حسن نے گائی غزل
مسکرائی فطرتِ غم درد نے تعظیم دی — شاعرِ حساس کی رَگ رَگ میں لہرائی غزل
ہے یہاں روئے سخن حسنِ حقیقت کی طرف — اہلِ ظاہر کے لیے ہے وجہ رسوائی غزل
لگ گئے تہذیب کی رنگینیوں میں چار چاند — ہم نے اس دنیا کے جس گوشے میں پہنچائی غزل
حضرتِ سوداؔ الجھ کر شوخیوں میں رہ گئے — میرؔ صاحب کو بڑی کاوش سے ہاتھ آئی غزل
یہ غزل گو سب سے پہلا صاحبِ دیواں ہوا — پاگئی لطفِ ولیؔ سے شانِ والائی غزل
کوئی اس کو اپنے منصب سے ہٹا سکتا نہیں — آج تک تو کررہی ہے کار فرمائی غزل
تجمّل میرے ہموطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ — کیوں نہ کرتی میرے در پر ناصیہ سائی غزل

24

دلی جذبات کے برعکس یہ صورت گری کب تک — بنامِ زندگی آخر فریبِ زندگی کب تک
رہے گا نا مکمل یہ نظامِ دلبری کب تک — خدایا تیری دنیا میں محبت اجنبی کب تک
فقیر اللہ کے سمجھے ہوئے تھے اس حقیقت کو — سرِ انساں پہ ٹھیرے گی کلاہِ خسروی کب تک
کسی دن یہ پہیلی بوجھنی ہے حضرتِ دل سے — پرائی عقل میں اور اپنی دولت میں کمی کب تک
عمل کی راہ سے بھی ربط ہے کچھ عزمِ منزل کو — خیال وخواب کے ماحول میں آوارگی کب تک
ابل کی نیند بھی میں سو گیا پھر چوکنا کیسا — نہ جانے وقت کے احساس نے آواز دی کب تک
کبھی تو ایک سجدہ اس کا ہنستے کھیلتے کرلیں — خدا کی یاد میں یہ بندگی بے چارگی کب تک
بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے — کسے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

نہ غش کی بے شعوری ہے نہ غفلت خوابِ راحت کی
شعورِ زیست میں یہ وقت کی غارت گری کب تک

سرِ منبر نظر تھی دل تھا سجدے میں محبت کے
خدا معلوم واعظ نے کہانی سی کہی کب تک

محبت کر رہی تھی درد کی پیغمبری کب سے
محبت سے بچاتا جان اپنی آدمی کب تک

فرشتہ ہوں کوئی جو درد سمجھوں گا نہ دشمن کا
بھلا انسان سے انسان کی بے گانگی کب تک

کبھی یہ سوچتا ہوں تجمّل میں اشعار پر اپنے
چڑھیں گی ان کی نظروں میں یہ آیاتِ جلی کب تک

25

آڑ ہے کعبہ کی سجدہ روئے جاناں کی طرف
فطرتاً انساں کا دل جھکتا ہے انساں کی طرف

جاؤں گا اس بزم میں نا خواندہ مہماں ہی سہی
غور سے دیکھیں گے وہ نا خواندہ مہماں کی طرف

ایک طوفانِ محبت ہوں میں رُکتا ہوں کہیں
کیا سمجھ کر انگلیاں اٹھتی ہیں طوفاں کی طرف

عیش کی راتیں مبارک دل جلاؤ یا چراغ
میں خطِ مشرق میں ہوں صبحِ درخشاں کی طرف

آئینہ کا سامنا ہوتے ہی تیور بنس دیے
کہہ دیا کیا دیکھ کر جاناں نے جاناں کی طرف

عزمِ خالص چاہیے تدبیرِ منزل کے لیے
پاؤں میداں کی طرف اٹھیں کہ زنداں کی طرف

سیکھ لے نا آشنا میری نظر سے اضطراب
موجِ رقصاں کی طرف آموجِ رقصاں کی طرف

وسعتِ ہمت سلامت رنجِ مشکل مل گیا
میں نے پہلو بھی نہ بدلا عیشِ آساں کی طرف

گرتی پڑتی آ رہی ہے جس طرف جاتے ہو تم
دیکھتے کیا ہو نگاہِ پابجولاں کی طرف

اے محبت رہنما بن اے وفا تقدیم کر
لے چلا ہوں آفتِ دل آفتِ جاں کی طرف

منہ اندھیرے کس طرف دیکھوں شبِ غم دیکھنا
شمعِ گریاں کی طرف یا صبحِ خنداں کی طرف

پوچھنا تھا چھپنے والے سے جو مل جاتا کہیں
آپ ہندو کی طرف ہیں یا مسلماں کی طرف

آج کل سنتے ہیں تجمّل کچھ پر ملتی ہے داد
یوں زمانہ رُخ نہیں کرتا غزل خواں کی طرف

26

اُٹھ گیا کرتا تھا جو کچھ وہ بھی کہاں باقی رہا
میں اک اس کی بے نیازی کا نشاں باقی رہا

اِس بہارِ جانستاں میں پوچھتا پھرتا ہوں میں
کیا چمن میں کوئی میرا ہم زباں باقی رہا

خاطی و باغی سہی اللہ کا بندہ تو ہوں
یہ تو رشتہ میرے اس کے درمیاں باقی رہا

جا و بیجا مدح کرنے تک وہ دشمن تھا مرا
عیب جوئی جب سے کی دشمن کہاں باقی رہا

ان کے آگے سب وفا کی داستاں گم ہوگئی
ہر زباں پر ایک حرفِ الاماں باقی رہا

جہل کی ضد پر زبانِ عقل و دانش تھم گئی
اک سکوتِ حق جوابِ جاہلاں باقی رہا

زندگی کے سب بلند آہنگ دعوے رہ گئے
زیرِ لب اک احتجاجِ ناتواں باقی رہا

میں نے یوں راہِ طلب کی سختیوں سے جنگ کی
میرا جذبہ کارواں در کارواں باقی رہا

ہم دکھا دیں گے تصرف ہو کسی معصوم کا
آدمیت کا اگر نام و نشاں باقی رہا

آج اُردوئے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ نجمؔ نکتہ داں باقی رہا

27

اس قدر شدتِ احساس میں ڈوبا ہوں میں
آہ دشمن بھی جو کرتا ہے تڑپتا ہوں میں

ہوں بُرا دیدۂ ہستی میں کہ اچھا ہوں میں
آج تک خالقِ ہستی کو گوارا ہوں میں

حل کیے میں نے ہزاروں ہی مسائل لیکن
سر پہ موت آگئی جب زیست کو سمجھا ہوں میں

عرصۂ حشر ہوئی جاتی ہے دنیا یارب
کوئی اتنا نہیں کہتا کہ شناسا ہوں میں

مجھ پہ اللہ کے بندوں ہی نے توڑے ہیں ستم
میں یہ کہتا رہا اللہ کا بندہ ہوں میں

ہمت آفزا ہو کوئی یہ مرا ماحول نہیں
آپ ہی اپنے ارادوں کا سہارا ہوں میں

میری بگڑی ہوئی رفتار پہ ہے ان کی نظر
ہوش اڑتے ہیں ذرا بھی جو سنبھلتا ہوں میں

اللہ اللہ یہ ہے میری بُرائی کا وقار
اچھے اچھوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوں میں

زاہدِ خشک سمجھتے ہیں گنہگار مجھے
اور گنہگار سمجھتے ہیں فرشتہ ہوں میں

میکدہ میں مرے ساتھی بھی تھے ہمدرد بھی تھے
جب سے مسجد میں ٹھکانا ہے اکیلا ہوں میں

درسِ حکمت نے بتایا مجھے اک مُشتِ غبار
دل کی وسعت کا اشارہ ہے کہ دریا ہوں میں

خُود پرستی کو گنہگار سمجھنے والے
یہ نہ سمجھے کہ گنہگار خود اپنا ہوں میں

یہ نہ بھولے سے بھی سمجھا کوئی قسمت کا دھنی
اتفاقات کی دنیا کا نمونہ ہوں میں

ابھی دیکھا ہے کہاں ولولۂ صبر و سکوں
کثرتِ غم نے یہ سمجھا ہے کہ تنہا ہوں میں

تجھ سا مظلوم زمانے میں نہ ہوگا کوئی
کارفرمائے محبت تن تنہا ہوں میں

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجمؔ
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

28

کبھی یوں کہیں سر جھکانے چلے ہیں
جدھر ہم چلے آستانے چلے ہیں

ستائے ہوئے ہیں ستانے چلے ہیں
تہِ تیغ ہم مسکرانے چلے ہیں

کسی کی نظر میں سمانے چلے ہیں
جہاں دل نہیں دل بتانے چلے ہیں

وہ کہہ دیں جفا کو وفا کی کسوٹی
کہیں ایسے حیلے بہانے چلے ہیں

شبِ غم نہ ہوگی چراغوں سے روشن
یہ تارے کدھر جگمگانے چلے ہیں

کہاں کی قیامت قیامت یہی ہے
خطائیں ہیں کچھ بخشوانے چلے ہیں

وہ پہلے محبت کی صورت بنالیں
محبت کی باتیں بنانے چلے ہیں

لبھاتے ہیں کیوں مجھ کو دنیا کے جلوے
مسافر سے کیا دل لگانے چلے ہیں

کہیں نامِ دوزخ سُن آئے ہیں واعظ
یہی آڑ لے کر ڈرانے چلے ہیں

نہ دیکھیں گے پھر کر مسافر عدم کے
یہ سب اپنے اپنے ٹھکانے چلے ہیں

چمن کے دُلارے تھے یہ غنچہ و گل
جو خوشبو سے کلیاں بسانے چلے ہیں

بگڑ کر قلمکارِ قسمت سے نجمؔی
محبت کی بگڑی بنانے چلے ہیں

29

پینگ ان سے بڑھ رہے ہیں وہ دل پہ چھا رہے ہیں
امید کی فضا میں جھولا جھلا رہے ہیں

بے خود ہے ساری محفل محفل پہ چھا رہے ہیں
خاموش ہیں زبانیں دل گنگنا رہے ہیں

آئیں تو سہی کہ میں ان کو زندگی بنالوں
جو میری موت بن کر تشریف لا رہے ہیں

جیسے میں اُلٹے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا
راہِ وفا کے ذرّے آنکھیں دکھا رہے ہیں

دیکھی ہے ہم نے دنیا رازِ کرم نہ پوچھو
صبر آزما چکے اب جبر آزما رہے ہیں

کیا سانس اکھڑ رہی ہے کیا دم الٹ رہا ہے
ہم شامِ زندگی کا اک گیت گا رہے ہیں

اِک نقش آب و گِل کو جلوہ بنا دیا ہے
اے حسن کے تماشے ہم دل بڑھا رہے ہیں

کوئی خودی سمجھ لے یا بے خودی سمجھ لے
دنیا خراب کر کے اک گھر بنا رہے ہیں

میرے سکونِ غم پر اب حسن مضطرب ہے
خود داریوں کے صدقے جلوے بلا رہے ہیں

اُس عیش کے تصدق انسان بن گیا ہوں
زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

میں سوچتا تھا دل ہی اس سمت بڑھ رہا ہے
میں دیکھتا ہوں وہ بھی نزدیک آ رہے ہیں

اشکوں کی رَو میں تجھی دل کا لہو بہا کر
غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

30

کبھی چتون سے وضع کارفرمائی نہیں جاتی
فضائے درد میں بھی شانِ دارائی نہیں جاتی

بچا کر گوشۂ دامن گزر جا دورِ ہستی سے
لپٹ جاتی ہے دامن سے تو رسوائی نہیں جاتی

ہزاروں کارپردازانِ قدرت ہیں مگر پھر بھی
خدائے یکہ و تنہا کی یکتائی نہیں جاتی

سخنور کو ہے تنہائی میں بھی لطفِ غزل خوانی
مفکر ہو تو محفل میں بھی تنہائی نہیں جاتی

میسر ہے زمانہ بھر کی ہمدردی و دلچسپی
کسی منزل میں نادانوں کی دانائی نہیں جاتی

جُھکا جاتا ہے اک انساں کے آگے بانیِ قدرت
غرورِ آدمیت کی جبیں سائی نہیں جاتی

وہی لفظوں کی خوش نظمی وہی ترتیب کے تیور
جنابِ تجمّل کی نظموں سے رعنائی نہیں جاتی

31

راہِ رضا میں کہیں مصرفِ گناہ نہیں
سفر طویل تھا دامن پہ گردِ راہ نہیں

براہِ راست یہ مانا کہ رسم و راہ نہیں
تری طرف تو ہے تجھ پر اگر نگاہ نہیں

خدا کا شکر ہے حالِ تباہ پر اپنے
تمہارے حدِ تصور تلک تباہ نہیں

شعورِ نطق سے میں اپنی ہی پناہ میں ہوں
پناہ ڈھونڈنے والوں ہی کو پناہ نہیں

اُٹھے جہاں سے تو ایسا بھی کفرِ نعمت کیا
تماشا ختم ہوا اور زباں پہ واہ نہیں

مبارک اہلِ حسد کو گناہِ بے لذت
گناہ بھی تو بہ اندازۂ گناہ نہیں

مری نگاہ نے کی دور دور کی تنقید
قریب ہوں مگر اپنی طرف نگاہ نہیں

خدا شرافتِ عزم و عمل نصیب کرے
کلاہ کج ہو یہ معیارِ کج کلاہ نہیں

تری نگاہ میں ہیں اس کا شکر کر اے دوست
تری نگاہ کی تخلیق مہر و ماہ نہیں

نمودِ حُسن پہ سو بار میں نے دل سے کہا
مقامِ شکر ہے ظالم مقامِ آہ نہیں

گرادیا نہ بلندی نے ان کو یہ کہہ کر
جہاں پناہ ہیں انسانیت پناہ نہیں
زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے نجم
مری نظر میں تغلّی کوئی گناہ نہیں

32

سوچتا ہوں مصرفِ حق سعی باطل میں نہ ہو
کوئی جذبہ میرے دل کا آپ کے دل میں نہ ہو
اے مسافر اس طرح گم عیشِ حاصل میں نہ ہو
تیری منزل دور ہے تو خوابِ منزل میں نہ ہو
شورِ طوفاں سر پہ ہے اور آنکھ کھلتی ہی نہیں
یوں کوئی سویا ہوا آغوشِ ساحل میں نہ ہو
ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا دیر و حرم میں بے خبر
دیکھ ان کا گھر کسی ٹوٹے ہوئے دل میں نہ ہو
دردو غم کا لحن بھی کچھ عیش کے نغموں میں ہے
بیکسوں کا خون شاملِ رنگِ محفل میں نہ ہو
روئے لیلیٰ دیکھ تو لے تیرا دل محمل سہی
کوئی تیرے وہم کی مخلوق محمل میں نہ ہو
کشمکش ہے مشکلوں کی نازشِ انسانیت
مجرمِ انسانیت ہے وہ جو مشکل میں نہ ہو
جتنی چاہیں اُن ترانی وقت کے بندے کریں
جب کوئی اللہ کا بندہ مقابل میں نہ ہو
دیکھئے نیچی نگاہوں نے کیا دل کا سوال
بدنمائی ہے جو غیرت چشمِ سائل میں نہ ہو
سب سے بڑھ کر نقشِ انساں کی بلندی ہے یہی
جس کا حق مارا گیا وہ فکر باطل میں نہ ہو
کچھ اضافہ کر کے اٹھو نجم بزم شعر میں
وقت کا مصرف کہیں تحصیل حاصل میں نہ ہو

33

بھر تو دے موت ذرا عمر کے پیمانے کو
وقت لکھے گا لہو سے مرے افسانے کو
دشمن جاں ہی سہی رہبرِ منزل نہ سہی
روشنی موت دکھاتی رہی پروانے کو
غم غلط ہوتے تھے میخانے میں کل کی ہے یہ بات
موجِ غم آج بہالے گئی میخانے کو
دستِ ہمت کی ہے توہین دعا کیا کرتا
عار سمجھا کیا تقلید بدلوانے کو
پاؤں سے ان کے نکلتے ہوئے دیکھی ہے زمیں
ہاتھ سے رکھ بھی نہ پائے تھے جو پیمانے کو
راہِ تدبیر میں حائل ہو تو کعبہ ڈھا دیں
آج سینے سے لگائے ہیں جو بُت خانے کو
کوشش ضبط نے چہرے کی بدل دی رنگت
کس نے روکا تھا ستم کر کے تڑپ جانے کو
اب یہ قسمت کہ رہوں ذوقِ عمل سے محروم
سر پہ آنکھوں پہ رکھا آپ کے فرمانے کو

کچھ جنوں نے بھی تماشائے خبر دیکھ لیا　　کتنے دیوانے بنے دیکھ کے دیوانے کو

34

پھر اِدھر دیکھتے چلے جاؤ　　بے خبر دیکھتے چلے جاؤ
عرش سے اس طرف ملیں گے قدم　　فرش پر دیکھتے چلے جاؤ
تم پہ صدقہ ہزارہا نظریں　　اک نظر دیکھتے چلے جاؤ
تابِ معراج بال و پر میں نہیں　　بال و پر دیکھتے چلے جاؤ
ظلم سہتے ہیں کچھ نہیں کہتے　　دَر گذر دیکھتے چلے جاؤ
تم پہ نظریں ہیں دونوں عالَم کی　　تم اِدھر دیکھتے چلے جاؤ
ہم غریبوں کا پوچھنا کیسا　　خوش ہیں گر دیکھتے چلے جاؤ
دل ملے ہیں پڑے ہوئے بھی کہیں　　رہ گذر دیکھتے چلے جاؤ
دَر بدر کرکے ڈھونڈتے ہو مجھے　　دَر بدر دیکھتے چلے جاؤ
واقعاتِ حیات بس کے نہیں　　عمر بھر دیکھتے چلے جاؤ

35

میرے دل میں جو دل تمہارا ہو　　دل سے دل کو بڑا سہارا ہو
بات ہی اور ہے اشارے کی　　بات کیوں ہو کوئی اشارا ہو
اس نے اُلٹی ہیں محفلیں اکثر　　جس کو بیگانگی نے مارا ہو
دل ہے دل کا جہاں سوال آئے　　وہ ہمارا ہو یا تمہارا ہو
ہم ہیں اس بے گناہ کے قاتل　　جو گنہ گار کا سہارا ہو
اُس کا عہدِ حیات کیا جس نے　　وقت کٹنے کو دن گزارا ہو
میرے دَر پر ذرا اُتر آئے　　میری قسمت کا جو ستارا ہو
آج میری طرف ہے روئے سخن　　اب کسے بے رُخی گوارا ہو
حجم اُس کے خلاف جانا ہے　　جس طرف زندگی کا دھارا ہو

سُنو گے مجھ سے میری ڈوبتی کشتی کا افسانہ
گناہوں کے تلاطم میں بھی تیور تھے ملوکانہ

رہے گا حشر تک رندوں میں اک ذوقِ حریفانہ
اٹھا کر اپنے سر پر کون لے جاتا ہے میخانہ

کسی میکش سے کیا الجھوں نہیں یہ شانِ رندانہ
نظر ساقی پہ رکھتا ہوں باندازِ حریفانہ

خبر کیا تھی کہ یہ تمہید ہوگی گھپ اندھیرے کی
بظاہر شمع روشن دیکھ کر آیا تھا پروانہ

خدا محفوظ رکھے خود پرستی خود نمائی سے
ان آئینوں میں جو منہ دیکھ لے ہو جائے دیوانہ

سنائی میں نے جس جس کو کہانی اپنے عصیاں کی
نگاہیں اس کی کہتی تھیں یہی ہے میرا افسانہ

اب اس سے بڑھ کے ہوگی کیا قیامت ان کے جلوے کی
نظر بازوں میں پیدا ہو گئے انداز جانانہ

جو سر لے کر حکومت تھی تو سر دیکر فراغت تھی
کہاں وہ نزدِ میداں اب کہاں وہ کھیل مردانہ

بڑے ہمدرد ہیں احباب تدبیریں بتاتے ہیں
محبت میں کہیں چلتے ہیں آئینِ حکیمانہ

بھیانک ہے بہر پہلو اگر ملتی نہیں دنیا
جو مل جائے تو ہو جاتی ہے ہر کروٹ عروسانہ

مری نظروں نے تولے ہیں بہت شہکار فطرت کے
ترے حسنِ مکمل کا مری آنکھیں ہیں پیمانہ

37

نگاہِ دوست کی بے التفاتی رائیگاں کیوں ہو
خدا وہ دن نہ لائے مجھ پہ دشمن مہرباں کیوں ہو

نہا کر خوں میں بھی ٹھنڈا کوئی آتش بجاں کیوں ہو
سلامت شانِ خود داری زباں پر الاماں کیوں ہو

ستم مجھ پر کئے جاؤ ستم میرے سر آنکھوں پر
مگر دادِ ستم دینے کو میری ہی زباں کیوں ہو

زمیں جب پاؤں سے نکلی تو ہم باز آگئے سر سے
کہ ایسے وقتِ بد میں دوش پر بارِ گراں کیوں ہو

عزورِ حسن ہوتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا
بلندی آسماں تک ہو بلندی آسماں کیوں ہو

بڑا دھوکہ ہے فطرت کے نظامِ حسن میں ورنہ
تم ایسے خوش جمالوں پر محبت کا گماں کیوں ہو

کہاں جاتے ہو منہ پھیرے مری آنکھوں کو تڑپا کر
تماشا بن کے کیوں جاؤں اشارا رائیگاں کیوں ہو

طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے
میں کہتا ہوں کہ سجدہ میرے ان کے درمیاں کیوں ہو

براہ راست دل لے لو براہِ راست جاں لے لو
محبت کوئی میرے یا تمہارے درمیاں کیوں ہو

تمہیں کو ہو مبارک یہ خدائی یہ خدا بینی
گلوں شکووں کے نرغہ میں کسی کا امتحاں کیوں ہو

ہنسی آنے لگی رونے کے بدلے اپنی حالت پر
یہ خمیازہ محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو

یہ صورت ہے کہ برگ و بار پہچانے نہیں جاتے
چمن ہی وہ نہیں پر آستاں ہی آستاں کیوں ہو

شکستہ پا ہو جب اے نجم یہ ذوقِ سفر کیسا
دلیل کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

38

مسلسل قہقہوں سے ہے تلافی شدتِ غم کی
دماغوں کی فضا بدلی ہوا لگتے ہی پرچم کی

مری نظروں میں اب کیا قدر ہو عیشِ دو عالم کی
شہیدانِ وفا کے غم سے قیمت بڑھ گئی غم کی

وہ کیا جانیں حقیقت اپنے سرکش عہدِ محکم کی
بلا دیتی ہے دل انسان کا نبضوں کی ادھم کی

بہت ممنون ہوں احباب کی چشمِ عنایت کا
مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی

خدائی کر گئے کچھ اہلِ دل انساں کے پیکر میں
بدل دی عشق کے بندوں نے صورت نظمِ عالم کی

مٹا سکتے نہیں وہ دشمنی سے میرا یہ جذبہ
خدا رکھے محبت ہے شرافت نسلِ آدم کی

لہو کے گھونٹ پی کر بھی کہیں سیری نہیں ہوتی
بجھاتی ہے کسی کی تشنگی اک بوند شبنم کی

اُٹھا کر دہر سے رسمِ محبت اہلِ دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی

شعورِ عشق کا اک ناز ہے یہ ناسیہ سائی
وہ سجدہ کیا غلاموں کی طرح گردن اگر خم کی

نگاہیں میری کہلاتی ہیں نظارے تو ان کے ہیں
اب ان سے کیا کہوں کیوں روشنی آنکھوں کی مدھم کی

تنگ ظرفوں پہ کچھ بجتی نہیں فطرت کی فیاضی
نہ آیا نور پیشانی پہ قسمت بھی اگر چمکی

جو زندہ دل تھے ہنستے کھیلتے جن کی گزرتی تھی
انہیں بھی ہم نے دیکھا آخری اک سانس لی غم کی

عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے نجم اک انسانِ اعظم کی

39

کس کرب سے وہ رات قفس میں بسر ہوئی
جس کی سحر بہار کی پہلی سحر ہوئی

دنیا کو دیکھتا ہوں کدھر سے کدھر ہوئی
کیا وقت آگیا کہ وفا دردِ سر ہوئی

نغمہ کی صبح و شامِ غزل کس کے دم سے تھی
ہم قید ہوگئے تو چمن کی خبر ہوئی

فطرت کا جبر تھا مرا اظہارِ دردِ دل
ہوتی نہ تھی یہ غم کی اہانت مگر ہوئی

دنیا کے ہیر پھیر سے بچنا محال تھا
میں دور ہٹ گیا تو وہ نزدیک تر ہوئی

دیکھا چمن کا رنگ بھی سیرِ چمن بھی کی
اب کس امید پر ہوسِ بال و پر ہوئی

انسانیت پر رحم نہ کھاؤں تو کیا کروں
کیسی اسیر مسئلۂ خیر و شر ہوئی

نادیدنی تھے کتنے مناظر نہ پوچھیے
اچھی گناہگارِ تماشہ نظر ہوئی

دادِ ستم بھی دی ہے ستم بھی اٹھائے ہیں
کب تک بڑھے گی بات بہت درگزر ہوئی

کیا مطمئن تھے ذکرِ عذاب و ثواب سے
جتنی بھی دیر یادِ خدا میں بسر ہوئی

غالبؔ کی طرح معترفِ میرؔ ہوں میں تجمؔ
فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

40

جب میں چاہوں گا شبِ غم مختصر ہوجائے گی
جب اٹھے گی چشمِ بے پروا سحر ہوجائے گی

چیخ اٹھا جس دن دعا جان اثر ہوجائے گی
جب سنیں گے تب زمانے کو خبر ہوجائے گی

ہم پہ وقت آیا مگر دنیا نے کروٹ بھی نہ لی
ہم اسی دھوکے میں تھے زیروزبر ہوجائے گی

موجِ بیدردی پہ تکیہ ہو کہ موجِ درد پر
ظالم و مظلوم دونوں کی بسر ہوجائے گی

آج کی دنیا کو میں اپنا بنا کر کیا کروں
کل یہی دنیا بعنوان دگر ہوجائے گی

حُسن کے تیور پہ اک بل ڈال دے گا عشق اگر
روح بحر و بر خلافِ بحر و بر ہوجائے گی

زندگی مشکل تو ہے ان کے مریضِ عشق کی
جاودانی زندگی ہوگی اگر ہوجائے گی

ہم دکھادیں گے نشیمن ہم سے کتنی دور ہے
حسرتِ پرواز جس دن بال وپر ہوجائے گی

آشریکِ درد ہوجا ورنہ اے ناز آفریں
دردِ دل کی چارہ سازی دردِ سر ہوجائے گی

فردِ قسمت اس طرف ہوگی اُدھر فردِ عمل
تجمؔ ظاہر قدرتِ عیب و ہنر ہوجائے گی

41

محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی
یہ بجلی ہر خس و خاشاک سے ٹکرا نہیں سکتی

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

گرا کر عرش سے بھی حسن بے پروا نے دیکھا ہے
کوئی عالم ہو میری آدمیت جا نہیں سکتی

متانت آچکی ہے ان کے لہجہ ان کی باتوں میں
وہ چاہیں لاکھ چہرے پر متانت آ نہیں سکتی

نہ سمجھو دوست کی حد تک کمال اپنی محبت کا
ابھی ناقص ہے دشمن کو اگر تڑپا نہیں سکتی

گرا ہوں رُو بقبلہ جب بھی ٹھوکر میں نے کھائی ہے
مری خود داری ایسی ویسی ٹھوکر کھا نہیں سکتی

کبھی تیرِ نگاہِ ناز خالی جا نہیں سکتا
کوئی نیکی بھی ایسے وقت آڑے آ نہیں سکتی

نشیمن میرا رہنے دو چمن پر آنچ گر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

حقائق ہی رہیں گے حجم میری فکر کا حاصل
خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

42

بیکسوں کی صفِ ماتم پہ ہے رقصاں کوئی
انقلاب آئے گا پھر گردشِ دوراں کوئی

کیا ڈرائے گا مجھے موت کا عنواں کوئی
میرا دشمن نہیں نزدیک رگِ جاں کوئی

چشمِ عبرت ہے نہ ہے دیدۂ گریاں کوئی
یوں لُٹا ہوگا نہ آباد گلستاں کوئی

چل پڑی موجِ ہوا زلزلہ ساماں کوئی
آندھیاں تیز ہیں ٹھہرے گا نہ ایواں کوئی

اس تلاطم پہ ہے دنیا کا توازن قائم
چشمِ ظاہر سے نہاں ہے کہیں انساں کوئی

کل نہ سمجھا کہ ہے خطرے میں وطن کی عزت
آج میّت پہ ہے انگشت بدنداں کوئی

حشر ہے کاتبِ تقدیرِ بشر کیا ہوگا
ہوگیا بڑھ کے اگر دست و گریباں کوئی

ہنس چکے تو سنی ہے یہی تاریخ اُمم
زینتِ قصر کوئی رونقِ زنداں کوئی

دیکھئے کس کو حقیقت کی حدیں ملتی ہیں
دَرپئے دل ہے کوئی درپئے جاناں کوئی

شکر لازم ہے جو دو چار گھڑی بھی رہ جائے
اپنے حالات و خیالات کا مہماں کوئی

صورتیں جبر و تشدد کی اُتر جائیں گی
پردۂ غیب سے ہوگا جو نمایاں کوئی

غم سے بھی لطف اٹھاتا ہوں مسرت کی طرح
میری ہمت پہ ہے کیوں چاک گریباں کوئی

لُوٹ کر مجھ کو قناعت سروساماں پہ نہ کی
لے گیا ساتھ غرورِ سروساماں کوئی

لے گئی ایک نظر حال بھی مستقبل بھی
یوں نہ ہوجائے بُرے وقت میں ارزاں کوئی

پاؤں پھیلے ہوئے ہیں وسعتِ آزادی میں
مسندِ عیش پہ ہے طفلِ دبستاں کوئی

جان کا روگ ہے یہ خلوتِ ہستی کیا ہے
سر کہیں پھوڑ نہ لے بندۂ احساں کوئی

کتنے شکوے مجھے کرنے ہیں مزے لے لیکر
دو ہی باتوں میں نہ ہوجائے پشیماں کوئی

نیند آنے کی ہے امید نہ موت آنے کی
روک لے کیسے خیالات کا طوفاں کوئی

وہ نہ چاہیں گے تو کیا حال نہ بدلے گا کبھی
ان کے بس کا ہے مرا خوابِ پریشاں کوئی

داغ روشن ہیں غریبوں کا لہو جلتا ہے
نہ چراغاں ہے کہیں اور نہ شبستاں کوئی

حجم فطرت سے مری ولولۂ شعر و ادب
میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

43

عجب کیا عیش کی غفلت میں سارا دن گزر جائے
کہ ہوش اس دور میں اکثر قریبِ شام آتا ہے

کسی نے بے تکلف بڑھ کے قبضہ کرلیا اپنا
کوئی کہتا رہا یہ تیری خاطر جام آتا ہے

مصیبت پر مری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں
بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

شعورِ دردِ دل رکھتے ہیں یہ خاصانِ دولت بھی
تڑپ جاتے ہیں جب ذکرِ صلائے عام آتا ہے

بدل دیتی ہے دنیا مختلف مفہوم و معنی میں
جب آتا ہے اُدھر سے ایک ہی پیغام آتا ہے

ابھی اک زلزلہ ہوگا شریکِ رقصِ مے خانہ
ابھی تو جام بے اندیشۂ انجام آتا ہے

گزر جاتی ہے اک تازہ قیامت حجم کے دل پر
کسی کے لب پر ارضِ تاج کا جب نام آتا ہے

44

کیوں اس کو چھیڑتے ہو شبِ غم کے نام سے
وہ بدنصیب دل جو دھڑکتا ہے شام سے

تقدیم انقلاب کی خاطر بڑے بڑے
گھبرا کے اُٹھ کھڑے ہوئے اپنے مقام سے

اے دوست یہ شریعتِ انساں میں کفر ہے
دھوکہ نہ دے کسی کو محبت کے نام سے

میں نظم و ضبطِ زیست کا قائل نہیں مگر
مرنا بھی چاہتا ہوں بڑے اہتمام سے

گیتی کو زلزلہ ہے لرزتی ہے کائنات
سرکے ہیں کس کے پاؤں وفا کے مقام سے

غمخوار بن کے آئے تھے اللہ رے سلوک
بات اور بڑھ گئی سخنِ نا تمام سے

دیکھے تو کوئی شکل مرے ہم صفیر کی
چہرہ اُتر گیا ہے محبت کے نام سے

سجدے میں اک تصور بے جا سہی مگر
آگے میں بڑھ گیا ہوں بہت پیش امام سے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ مرے انتقام سے

میرے حدودِ ذکر میں اے طائرِ ہوس
پَر جل اٹھیں گے گرمیِ زورِ کلام سے

تنہا تھا میں گناہ کے اقسام سیکڑوں
کوشش تو کی نکل نہ سکا اژدہام سے

بس حاصلِ کلام رہے مدعائے دل
اتنا ہی واسطہ ہے خدا کے کلام سے

ایسے قلم اٹھانے کی نوبت نہ آئے تجمّ
جس طرح کھینچ لے کوئی تلوار نیام سے

45

زندگی غم میں گزرتی ہے رواداری سے
مسلکِ عشق بچاتا ہے دلآزاری سے

نیند کلیوں کی اُڑی آنکھ کھلی سبزے کی
جاگ اٹھا سارا چمن میری گرفتاری سے

جن کی ہشیاری کے دنیا میں نشانے تھے بہت
وہ بھی مارے گئے خود اپنی ہی ہشیاری سے

بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل
ایک ذرّہ نہیں محفوظ اداکاری سے

سوچ لو یہ بھی ذرا بات بگڑ جاتی ہے
کام دیکھے تو ہیں بنتے ہوئے غداری سے

آپ اظہارِ عداوت میں تکلف نہ کریں
دل لرزتا ہے محبت کی ریاکاری سے

عہدِ غفلت میں دلوں کی یہ کشاکش تھی کہاں
کس قدر فتنے جگائے گئے بیداری سے

حالِ دل حضرتِ واعظ کا تو معلوم نہیں
ہم کو تسکین ہے احساسِ گنہگاری سے

مجھ کو فرصت ہے کہاں اے خلشِ صوم وصلوٰۃ
جذبۂ دردِ محبت کی پرستاری سے

صفتیں دوزخ و جنت کی خدا ساز سہی
سابقہ ہے ابھی انسان کی فنکاری سے

کس مصیبت میں لطافت مری تخیل کی ہے
تجمّ بے چین ہوں لفظوں کی گرانباری سے

46

انساں سے لاکھ دور ہوں انساں سے کام ہے
اک دن اسے بھی قربِ رگِ جاں سے کام ہے

دل کو لگے گی ان کے تو سمجھیں گے سوزِ غم
فی الحال سوزِ شمعِ فروزاں سے کام ہے

کیوں کیجئے تصور نا ممکن و محال
جب تک فضائے عالمِ امکاں سے کام ہے

ممکن ہے کام گردشِ دوراں کو مجھ سے ہو
میری بلا کو گردشِ دوراں سے کام ہے

وہ منزلِ حیات میں ہے تنگِ اہلِ دل
جس دل کو اپنے درد کے درماں سے کام ہے

غنچوں کو اک تبسمِ موہوم کے لیے
کتنا عظیم صبحِ درخشاں سے کام ہے

دستِ عدو بڑھا بھی تو رسوا کرے گا کیا
پہلے مجھے خود اپنے گریباں سے کام ہے

میرا ہے تجربہ کہ ٹھہرتی ہے کم بہار
کب تک تمہیں بہارِ گلستاں سے کام ہے

تابوت و شامیانہ و قبر و چراغ و گل
اللہ آج بھی سروساماں سے کام ہے

حق ناشناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجم
خود داریِ سخن کو سخنداں سے کام ہے

47

شب ہے تمام صبح کا تارا نظر میں ہے
اک سانس مجھ میں ایک چراغ سحر میں ہے

محدود جستجو تری برق و شرر میں ہے
وہ آگ اور ہے جو غمِ معتبر میں ہے

ہمت نہیں تو بیٹھ رہو پاؤں توڑ کے
اک عمر ہوگئی کہ ارادہ سفر میں ہے

یہ میرا صبر و ضبط یہ ماحولِ عیش و غم
تنہا ہوں اور ساری خدائی نظر میں ہے

دل مرکزِ حیات ہے ہر اعتبار سے
دل بجھ گیا تو خیر میں لذّت نہ شر میں ہے

یہ دیس گھر بنا کے بھی پردیس ہی رہا
کیسی انوکھی ریت تمہارے نگر میں ہے

یہ اور بات ہے کہ ہو ماحول ہی غلط
حق کا شعور ورنہ مزاجِ بشر میں ہے

بے ساختہ زباں پر درود آرہا ہے نجم
اک روشنی سی منزلِ فکر و نظر میں ہے

48

مرتے مرتے اہلِ دل کیا سختیاں دیکھا کیے
چارہ گر نبضیں نگاہیں رازداں دیکھا کیے

لڑ گئیں نظروں سے نظریں دل سے دل ٹکرا گیا
ہل گئے طبقے زمیں کے آسماں دیکھا کیے

پست ہمت زندگی بھر زندگی کی دوڑ میں
کاروانِ گرد و گردِ کارواں دیکھا کیے

باغباں بھی فکر میں تھا گھات میں صیاد بھی
دو نگہباں تھے کہ میرا آشیاں دیکھا کیے

پھر نہ ہو گمراہ کوئی راہ رَو اس فکر میں
دیر تک ہم اپنے قدموں کے نشاں دیکھا کیے

چار دن گلشن میں پروازِ بہاراں دیکھ کر
دیکھنی تھی سست رفتار خزاں دیکھا کیے

دل مٹے نظریں ہوئیں رخصت زبانیں کٹ گئیں
اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ زباں دیکھا کیے

حق پرستوں کو کچلتے ہی رہے قابو پرست
ناتواں یہ مصرفِ تاب و تواں دیکھا کیے

دیکھتیں آنکھیں ذرا فرقِ من و تو رہ گیا
دو قدم پر تھا متاعِ دو جہاں دیکھا کیے

ان پہ رحمت جو چمن میں شاخِ گل کی آڑ سے
ایک بجلی آشیاں در آشیاں دیکھا کیے

پست ہمت کیا پہنچتے منزلِ مقصود تک
راہ و منزل کو جو طوفاں درمیاں دیکھا کیے

یہ وہی بجلی گری ہے آشیاں پر ہم جسے
رقص میں اکثر قریب آشیاں دیکھا کیے

ہم پہ وقت آیا تو خود داری شریک حال تھی
حجمؔ اربابِ غرض دامن کشاں دیکھا کیے

49

اے تنگ نظر عشق کے جذبوں کو جگا لے
سوتے ہیں ترے دل کے اندھیرے میں اُجالے

کافر تری آنکھیں ہیں مئے حسن سے مخمور
تھوڑی سی محبت کی شراب اور ملا لے

دنیا سے اٹھے جاتے ہیں اربابِ محبت
فطرت کہیں توفیقِ محبت نہ اٹھا لے

ممنون ہوں کس کس کا میں اک زیست کی خاطر
ہر ذرّہ کو موقع ہے کہ احسان جتا لے

گرتے مجھے دیکھا کیے اللہ کے بندے
میں رہ گیا کہتا ہوا اللہ بچا لے

دنیا کے تلاطم سے مجھے ربط ہے اتنا
بیٹھا ہوں روایاتِ محبت کو سنبھالے

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا
یارب مجھے دنیا سے گنہگار اٹھا لے

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

اللہ رے محبت کو محبت کی فضا میں
حجمؔ اس نے کیا ہے مجھے خود میرے حوالے

O

غیر مطبوعہ غزلیات

(50)

رہتے ہیں دُور مرحلۂ غم سے آدمی
آگے کہاں ملیں گے تمہیں ہم سے آدمی

معدوم سی ہے قیس کی فرہاد کی مثال
گزرے بہت زمانہ میں رُستم سے آدمی

یہ سن کے راستے کے اُٹھائے ہیں سنگ و خشت
اس شہر میں ہیں شعلہ و شبنم سے آدمی

کیوں آتشِ حسد کی فضا میں ہیں جاں بلب
کیا ربط چاہتے ہیں جہنّم سے آدمی

واعظ کسی شہیدِ محبت کا فیض ہے
مانوس ہوگیا جو غم و ہم سے آدمی

کیا کیا فریب دے کے پچھاڑا غرور نے
کن کن بلندیوں سے گرے دھم سے آدمی

باطن میں پست اور ہیں ظاہر میں سر بلند
یہ چشم اعتبار میں مدھم سے آدمی

بھیجا گیا حرم کدۂ زشت و خوب میں
گھبرا گیا تھا ایک ہی عالم سے آدمی

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت
بنتے ہیں حجم دیدہ پُر نم سے آدمی

(51)

دل ہم سے نہ سنبھلا دل ہی تو ہے
آساں نہ ہوئی مشکل ہی تو ہے

منزل کوئی ان کی اور نہیں
منزل کی طلب منزل ہی تو ہے

سو ہم نے وفا کے وار کیے
بسمل نہ ہوا قاتل ہی تو ہے

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت
اُٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

طوفاں کو ہٹا کر پار اُتر
دو ہاتھ پہ وہ ساحل ہی تو ہے

کیا تجمّل فریبِ دل سے بچیں　　دنیا میں فریبِ دل ہی تو ہے

(52)

یہ خود داری ہے یا بیگانگی ہے رنگِ محفل سے　　نظر کس کس سے مل جاتی ہے دل ملتا نہیں دل سے
اجل اپنی سی کر کے ہٹ گئی آخر مقابل سے　　جو زندہ دل تھے زندہ ہی اٹھے دنیا کی محفل سے
کسی صورت انھیں اپنے ستم کی داد لینی ہے　　تڑپ لوں گا بآسانی ہنسی آئے گی مشکل سے
سرِ منزل پہنچ کر ان کو دم لینا مبارک ہو　　مسافر اُلٹے قدموں بھی پلٹ آتے ہیں منزل سے
وطن میں دوستِ کیسے کوئی دشمن بھی نہیں شاید　　مجھے کس کی نگاہیں ڈھونڈھتی آئیں گی ساحل سے
کہیں احساسِ حق گوئی پہ بھی پانی نہ پھر جائے　　زباں کھلتی نہیں اندیشۂ اقدارِ باطل سے
نظارہ اس کی قسمت میں ہے لیلائے حقیقت کا　　وہ دیوانہ جو چونک اٹھے خیال و خواب محمل سے
تعین کی حدیں توڑیں ہیں اکثر دستِ ہمت نے　　خدا چاہے تو آگے بڑھ چلوں گا دل کی منزل سے
کہیں آساں تھا اس ہنگامۂ ہستی میں نیند آنا　　بڑی مشکل تھی جو حل ہو گئی تدبیرِ قاتل سے
کسے اس کی خبر تھی ان کو آزادی میں ترسیں گے　　اسیری میں جو نغمے کر لیے پیدا سلاسل سے
انھیں بھی تجمّل دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر　　جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

(53)

صلوٰۃ و صوم سے آئینِ سرکشی نہ بنا　　خدا کے نام کو سرمایۂ خودی نہ بنا
تجھے مکارمِ اخلاقِ آدمی کی قسم　　کسی حقیر تمنا کو زندگی نہ بنا
میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن　　کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا
عمل سے پہلے عطا کر خیال کی قوت　　خیال ہی میں جو بگڑا وہ پھر کبھی نہ بنا
بڑی نوازشِ فطرت ہے روحِ زندہ دلی　　اسے تمسخرِ دربارِ خسروی نہ بنا
دکھائے کون خدا کو یہ عہد خونخواری　　کسی نے خوب کہا تھا کہ آدمی نہ بنا
ہر ایک در پہ نہ جا تجمّل داد کی خاطر　　کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

(54)

ملی ہے موت بھی قسمت سے شاہکار مجھے　　کہ تیز کرنی پڑی خود چھری کی دھار مجھے

خبر تو دل سے ملی ہے ہزار بار مجھے
کبھی تو میں بھی سنوں، اس طرح پکار مجھے

مظاہرے تو ہیں دونوں طرف محبت کے
نہ اعتبار انہیں ہے نہ اعتبار مجھے

کمالِ فن مرے دستِ طلب سے دور نہ تھا
مگر قبول نہ تھی شرطِ انکسار مجھے

خدا کا شکر ہے دشمن سے خود عوض نہ لیا
ملی تھی خیر سے توفیقِ انتظار مجھے

وہ اپنا روپ ہی جی بھر کے دیکھ لیں کچھ دن
دکھا رہے ہیں جو آئینہ بہار مجھے

یہ کائنات بجز انتظار کچھ بھی نہیں
قدم قدم پہ ہے تکلیفِ انتظار مجھے

مزاجِ دوست نے مرضی پہ اپنی ڈھال لیا
سپرد کرکے دو عالم کا اختیار مجھے

یہ اور کیا ہے جو فطرت کا احتجاج نہیں
جب اپنا عزم و عمل خود ہو ناگوار مجھے

مرے بدن پہ ٹھہرتا نہیں لباس ریا
نظر نظر میں بنا دو گناہ گار مجھے

بدل نہ جائے گا میرے لیے نظامِ چمن
نہ ہو پسند جو نشو و نمائے خار مجھے

ہوا شعورِ محبت کا انتخاب آخر
نہ کرسکا جو کوئی درد بے قرار مجھے

کبھی یہ فیض بھی ہوتا ہے خاکساری کا
سمجھ رہا ہے زمانہ فریب کار مجھے

خدا نہ ہوگا کوئی خاصۂ خدا ہوگا
دکھائی جس نے محبت کی رہگزار مجھے

میں خود ہوں مطمئن اے نجمؔ ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

(55)

زیست کی حد ہے جہاں تک ہمت مردانہ ہے
آدمی تاریخ ہے اور آدمی افسانہ ہے

خم کہیں بھرپور ہے خالی کہیں پیمانہ ہے
تو کہاں سوئی ہوئی اے جرأتِ رندانہ ہے

ساری دُنیا اک فریب جلوۂ جانانہ ہے
یہ حرم ہے دور سے نزدیک سے بت خانہ ہے

وقت کا میری طرح اُن کو بھی ہے شکوہ مگر
میرے شکوہ کا ذرا انداز بے باکانہ ہے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانے میں تھی
یہ زمانہ دیکھتا ہے آگ میں پروانہ ہے

کچھ ہوا دیدیں اگر بیرونِ در کی کوششیں
گھر جلانے کے لیے حاضر چراغ خانہ ہے

تشنگیِ شوق منزل تک سلامت لے کے جا
ہوشیار اے راہ رو ہر موڑ پر میخانہ ہے

پرسشِ احوال پر جُز شکر کچھ کہتے نہیں
بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

(56)

خاکے جو بنے عزم و عمل سے شہدا کے
فطرت نے مرتب کیے آئین وفا کے

وہ اہل نہ ہوں گے کبھی میدان وغا کے
دل جن کا بلا دیتے ہیں لفظوں کے دعا کے

اندازۂ محفل تو مجھے دور سے بھی تھا
کچھ اور بھرم کھول دیا پاس بٹھا کے

ہم حق کے طلب گار ہیں سائل تو نہیں ہیں
کیوں لے کوئی دیتے ہو جو تم ہاتھ اٹھا کے

گزری ہے نسیمِ سحری صحنِ چمن سے
غنچوں کو ہنسا کے کبھی شبنم کو رُلا کے

اچھا تو ہے کتنوں کو تباہی سے بچا یا
قسمت نے نمونہ مجھے عبرت کا بنا کے

وہ قُرب ہے مرکز سے یہ مرکز سے ہے دوری
قائل ہیں ہم اس طرح جزا اور سزا کے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن
کہہ دے جو میرے عیب میرے سامنے آ کے

رحمت نے گنہگاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا
واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

نجم اُن کے میری طرح پرستار بہت ہیں
بندوں کی خدائی میں جو بندے تھے خدا کے

(57)

مجھے بھی دل پہ میرے اختیار ہے کہ نہیں
کوئی خیال کا پروردگار ہے کہ نہیں

بلند ہوں گے کہاں تک لہو کے فوّارے
زمین پہ کوئی سجدہ گزار ہے کہ نہیں

اسی اصول پہ تسکینِ خواہشات کو دے
خزاں کسی کی کسی کی بہار ہے کہ نہیں

میں سوچتا ہوں مقامِ عمل میں نجم ابھی
بہت ہیں عزم کوئی استوار ہے کہ نہیں

(58)

موت لائے زندگانی لے گئے
پھول کلیوں کی جوانی لے گئے

ہو گیا خاموش جس کے سامنے
حرفِ غم میری کہانی لے گئے

دل ملا تھا ان سے ان کو دے دیا
آج اپنی مہربانی لے گئے

لے گئی اس در پہ دنیا دردِ دل
ہم بھی اپنی بے زبانی لے گئے

غم بھی اک دھوکا تھا راہِ عشق میں
ہم فریبِ شادمانی لے گئے

نجم چپ بیٹھا ہوں ان کی یاد میں
جو مری جادو بیانی لے گئے

(59)

میرے نفس نفس میں اشارہ سفر کا ہے
دنیا سے کیا کہوں کہ ارادہ کدھر کا ہے

مقصد سرورِ دل کا نہ کیفِ نظر کا ہے
عشق اک اہم سوال وقارِ بشر کا ہے

کتنی دراز میری شبِ غم ہے اے خدا
کس سنگ دل کے ہاتھوں میں دامن سحر کا ہے

اک اک قدم پہ عشق میں سجدہ گزار ہوں
منزل کا اعتبار نہیں رہ گزر کا ہے

کھوئے ہوئے ہیں اپنے ہی پندارِ حسن میں
کیا جانے وہ مقام جو اہلِ نظر کا ہے

سر پھوڑ لوں قفس سے یہ جی چاہتا ہے آج
اہلِ چمن میں ذکر مرے بال و پر کا ہے

حق ناشناس مجھ سے ملاتے نہیں نظر
جس دن سے سامنا مری فکر و نظر کا ہے

چاہے تو حسن میں بھی نکالے ہزار عیب
کیا اعتبار لذتِ نقد و نظر کا ہے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط
اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

میرے سوا کسی کو نہیں میری معرفت
چرچا جگہ جگہ مرے عیب و ہنر کا ہے

دنیا کے زشت و خوب ہیں میری نظر میں تجمّ
کس کس سے واسطہ میرے ذوقِ نظر کا ہے

(60)

کیا خبر تھی زندگی کا مدعا بدلیں گے ہم
ہر نئی کروٹ پہ قسمت کے خدا بدلیں گے ہم

فرض ہے کیا روندتے جانا گل و گلزار کو
دورِ منزل سلامت راستا بدلیں گے ہم

شورشِ مزدور ہے بے حبِّ سرمایہ غلط
وقت آئے گا کہ وضعِ ماسوا بدلیں گے ہم

نبضِ ہستی پر ہے صدیوں سے ہماری انگلیاں
جب مرض میں ہوگی تبدیلی دوا بدلیں گے ہم

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا
مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

پیروی میں ہے سیاست، پر سیاست ہوگی تجمّ
جب زمانے میں کوئی پہلو نیا بدلیں گے ہم

(61)

کچھ عقل نے بگاڑا کچھ عشق نے سنوارا
انسانیت نے پائی پھر زندگی دوبارا

توہینِ عشق برحق میں نے نہ کی گوارا
دنیا نے میری خاطر کیا کیا نہ روپ دھارا

طے کتنی منزلیں کیں پر سوچتا ہوں اکثر
شب صبح تک گزاری دن شام تک گزارا

دم بھر سکوں نہ پایا احساسِ زندگی سے
جیتے ابھی بہت دن فکر و نظر نے مارا

اک وہ بھی بے کسی کا عالم تھا زندگی میں
جب نام لے کر اپنا میں نے ہی خود پکارا

یوسف کہا جو تم کو تو چیں بہ جبیں ہوئے کیوں
جائز ہے ہر زباں میں تشبیہ و استعارا

کیا کیا مقابلے تھے فرزانگی سے میری
ہارا تو یہ زمانہ دیوانگی سے ہارا

کیا عشق کی فضا میں زعمِ فرد کی ہستی
ہتھیار رکھ دیئے سب سرکش نے دم نہ مارا

بدلا ہے تجمّل کیسا معیارِ شعر فہمی
جب سطحِ شاعری سے نغمے نے سر ابھارا

(62)

نازِ تسبیح و مصلّا اور ہے
زیرِ خنجر ہو جو سجدا اور ہے

مسخ ہوتے ہیں ارادے بار ہا
کوئی شاید کار فرما اور ہے

کل ہمیں ہم تھے وہ دنیا اور تھی
اب تمہیں تم ہو یہ دنیا اور ہے

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی
اس اندھیرے کا اجالا اور ہے

کج روی تعلیم ہے ماحول کی
ورنہ فطرت کا تقاضا اور ہے

ختم ہے دم بھر میں یہ بازی گری
ایک دو سانسوں کا دھوکا اور ہے

ڈرتے ڈرتے میں خدا کہہ دوں مگر
وہ نہ کہہ دے میرا بندہ اور ہے

تجمّل کہہ سُن کر بہت کچھ کر لیا
کچھ نہ کہنے کی تمنّا اور ہے

(63)

مرا آغوشِ نظر یاد آیا
جلوۂ دوست کو گھر یاد آیا

آنکھ ہنگامۂ محشر میں کھلی
فتنۂ راہ گزر یاد آیا

غیرتِ عشق بھی ہاتھوں سے گئی
دل اگر بارِ دِگر یاد آیا

اب ملاتے نہیں دنیا سے نظر
کوئی گستاخ نظر یاد آیا

آپ کے در پہ ملا سر اپنا
سجدہ یاد آیا تو سر یاد آیا

ہوشِ ہستی پہ ہُوا جوشِ کرم
دل اِدھر درد اُدھر یاد آیا

آج بیٹھے ہیں وہ شمشیر بکف
کس گنہگار کا سر یاد آیا

نجم یہ فکر ہے نذرِ غالبؔ غالبؔ خستہ جگر یاد آیا

(64)

فضائے عشق میں لایا گیا ہوں دو عالم سے نکلوایا گیا ہوں
مری دل بستگی دنیا سے دیکھو کہ جیسے بارہا آیا گیا ہوں
دوا دے کر تھکے جب چارہ فرما دعائیں دے کے بہلایا گیا ہوں
خوشی بھی اک تڑپ تھی درد و غم بھی بہر تقدیر تڑپایا گیا ہوں
نہ سمجھا نجم جب میں رازِ ہستی محبت دے کے سمجھایا گیا ہوں

(65)

خداوندیاں ہیں ستم رانیاں ہیں یہی بندہ پرور جہاں بانیاں ہیں
میں آسائشِ دل کا پیغامبر تھا نہ ہونے سے میرے تن آسانیاں ہیں
مسرت کی محفل بھی دیکھی ہے ہم نے حکایاتِ غم کی فراوانیاں ہیں
امیدیں تھیں کیا مجھ کو معصومیت کی گناہوں پہ دنیا کو حیرانیاں ہیں
دماغوں کی اے کاش ہوتی رسائی جہاں تک زبانوں کی جولانیاں ہیں
محبت کے ارماں وفا کی امنگیں یہ معصوم بچوں کی نادانیاں ہیں
بہت نجم اہل سخن ہم نے دیکھے خوش الحانیاں ہیں خوش الحانیاں ہیں

(66)

میں نے دیکھا ہے شباب آتا ہوا کائناتِ حسن ٹھکراتا ہوا
دونوں عالم کی نگاہیں لُٹ گئیں تو کہاں جاتا ہے شرماتا ہوا
آستاں پیدا کروں گا آستاں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہوا
شکر ہے آتا ہے اب تیرا خیال کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتا ہوا
حادثے کیا کیا مری نظروں میں ہیں دل سے دل دیکھا ہے ٹکراتا ہوا
میں حریمِ ناز میں در آگیا پردۂ کونین سرکاتا ہوا
نجم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

(67)

بچ کے جو طوفانِ غم سے تر گئے — ناخدا کیسا خدا سے پھر گئے
اپنے کانوں تک دھمک پہنچی نہیں — کیا بلندی ہوگی جس سے گر گئے
جی رہے ہیں کچھ شہیدانِ وفا — بچ گئی انسانیت دل پھر گئے
ذہن مشکل کی طرف جاتا نہیں — کس قدر آسانیوں میں گھر گئے
تجمّ اب دونوں ہیں آوارہ وطن — دیس سے اردو گئی شاعر گئے

(68)

دنیا جسے ملتی ہے محبت نہیں ملتی — باطل کے سہارے سے حقیقت نہیں ملتی
کیا کیا نہ ملے قدرت وحکمت کے خزانے — انساں کو مگر نبضِ مشیت نہیں ملتی
ہستی کے گزرگاہ کے بے درد مسافر — رستے میں پڑی درد کی دولت نہیں ملتی
اٹھتی ہی نہیں حسن پہ میری نگہہ شوق — جب تک نگہِ ناز سے دعوت نہیں ملتی
تم خواب میں موجود تصور میں ہو حاضر — احساسِ نظر کو کبھی راحت نہیں ملتی
میں جان وفا اور وہ دشمن ہیں وفا کے — انسان سے انسان کی فطرت نہیں ملتی
کیا دل میں تلاطم ہو تو کیا خون میں گرمی — بازارِ وفا سرد ہے قیمت نہیں ملتی
دنیا کی نظر دیکھ کے روپوش ہیں جلوے — کھوئی ہوئی اللہ کی قدرت نہیں ملتی

(69)

پھر غم و درد کی دھوپ ڈھلنے لگی — پھر خیالات کی رو بدلنے لگی
عاشقی دور حاضر میں پنپنے کی کیا — سن رہے ہیں خرد پاؤں چلنے لگی
تم تو چپ ہوگئے ذکرِ غم چھیڑ کر — بات میں بات آخر نکلنے لگی
رحم کیجئے محبت کے احساس پر — آبروئے وفا خوں اگلنے لگی
کچھ کمی شامِ غم کے اثر میں نہیں — چاند کملا گیا رات ڈھلنے لگی
کوئی نیکی ضرور آڑے آئی کلیم — ہوش واپس ہوئے نبض چلنے لگی
میری دیوانگی کی ادا دیکھ کر — ان کی فرزانگی ہاتھ ملنے لگی

سوزِ غم سے مرا دل سلگتا رہا　　آگ دکھلاتے ہی شمع جلنے لگی
آج دادِ سخن پر ہیں چیں بر جبیں　　تجمّل اب ان کو ہر بات کھلنے لگی

(70)

جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر　　گھر میں بھر لے ساری دنیا لوٹ کر
اپنے آئینہ پہ نازاں ہے فلک　　رہ گیا تھا اک نظر میں ٹوٹ کر
کس قدر ہے سازو سامانِ حیات　　جی گئے خوفِ خدا سے چھوٹ کر
چشمِ ظاہر ہی سے دنیا کو نہ دیکھ　　رہ نہ جائیں دل کی آنکھیں پھوٹ کر
دانۂ گندم سے ہیں محروم آج　　پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر
ہم سے پہلے بارہا جو لٹ چکے　　آج اکڑتے پھر رہے ہیں لوٹ کر
تجمّل اب دنیا فضا پر بار ہے　　کاش گرجاتا یہ تارا ٹوٹ کر

(71)

اللہ اللہ اہل دل کی دسترس　　ظلم کے طوفاں کی چھاتی پھٹ گئی
حاصل حکمت ہیں اب خونریزیاں　　علم جب حد سے بڑھا مت گھٹ گئی
موت کو بھی دو قدم ہٹنا پڑا　　زندگی میدان میں جب ڈٹ گئی
لٹ رہا تھا درد دل روزِ ازل　　تم کہاں تھے جب یہ دولت بٹ گئی
چاند بھی نکلا تو گہنایا ہوا　　ہم یہ سمجھے تھے کہ بدلی چھٹ گئی
بڑھتے بڑھتے درد ملت بڑھ گیا　　گھٹتے گھٹتے آدمیت گھٹ گئی
میں چراغ عقل روشن کرچکا　　اب نظر میری طرف سے ہٹ گئی
مرحبا اے رشتۂ لطف و کرم　　بات جیسے درمیاں سے کٹ گئی
تجمّل فیضِ نا امیدی دیکھنا　　غم گیا کھٹکا گیا آہٹ گئی

(72)

سنا سب کچھ جو سننا تھا کہا سب کچھ جو کہنا تھا　　وہ دنیا سے بگڑتا کیوں جسے دنیا میں رہنا تھا
اسیرِ ظلم نے فطرت بدل دی موم و آہن کی　　وہی لوہے کی ہتھکڑیاں وہی پھولوں کا گہنا تھا

یہ بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ ہوتا گوشۂ دل میں
ترے غصہ کا جذبہ جس کو آنسو بن کے بہنا تھا

بہت سے کام تھے دنیا میں کرنے کے جو کر جاتے
جفائیں بھی اٹھانی تھی وفا کا غم بھی سہنا تھا

ہوئے احباب رخصت تجمّ اپنا دردِ دل کہہ کر
کسی نے کچھ نہ پوچھا ہم سے کچھ ہم کو بھی کہنا تھا

(73)

سکونِ دل کی لذت چاہتا ہوں
فقیری میں یہ دولت چاہتا ہوں

حکومت کی محبت دشمنوں کو
محبت کی حکومت چاہتا ہوں

سیاست کا اندھیرا چھا رہا ہے
ذرا نورِ صداقت چاہتا ہوں

انہیں یہ پاؤں پھیلانا مبارک
کہیں میں بھی سکونت چاہتا ہوں

بہت کیا چاہتا ہوں آدمی سے
ذرا سی آدمیت چاہتا ہوں

گئے تجمّ اہلِ دل دنیا سے کتنے
بس اب میں بھی اجازت چاہتا ہوں

(74)

بلا ہے محبت ہماری تمہاری
یہ دوزخ ہے جنت ہماری تمہاری

جفا کا نیا کس نے مسلک نکالا
وفا تھی شریعت ہماری تمہاری

ملے کس طرح بے نگاہیں ملائے
زمانہ کو فرصت ہماری تمہاری

اٹھالو کہ رہنے دو اپنے دو عالم
رہے گی محبت ہماری تمہاری

تمہارے لیے دل بنایا ہے ہم نے
اب آگے ہے قسمت ہماری تمہاری

سنبھل جاؤ تم بھی کہ ہم بک چکے ہیں
محبت ہے قیمت ہماری تمہاری

کہاں تجمّ اب عارفِ حسن کوئی
نظر ہے غنیمت ہماری تمہاری

(75)

کوئی ڈوبے کوئی اُبھر آئے
وہ دعا دے کے پار اتر آئے

یوں بھی حسنِ عمل چھپاتے ہیں
جیسے کوئی گناہ کر آئے

دل پہ احساں ہے نشترِ غم کا
نقشِ انسانیت اُبھر آئے

خاک و خوں میں نہا کے میداں سے
کتنے جانباز بن سنور آئے

کچھ اصولِ حیات ذہن میں تھے　　منبروں پر بیان کر آئے
فکر برحق سے جاوداں کردے　　جب ترا عہد مختصر آئے
دیکھ لی شان رہنمائی کی　　تجمّل خود ہی نہ راہ پر آئے

(76)

میرے مزاجِ درد کو رسوا نہ کیجئے　　آتا نہیں یقین تو پوچھا نہ کیجئے
للّٰہ یہ نوازشِ بے جا نہ کیجئے　　میری نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجئے
رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے　　اب کرچکے گناہ تو پروا نہ کیجئے
یہ دردِ دل سے جنگ یہ غم سے مقابلے　　فطرت سے بات بات پہ جھگڑا نہ کیجئے
جس نے سمجھ کی بات کہی دل پہ چوٹ لی　　آتا ہے دل میں بات کو سمجھا نہ کیجئے
مفہوم زندگی ہے محبت کا ایک دن　　دو دن کی زندگی پہ بھروسا نہ کیجئے
کہدو نئے زمانے کی ترچھی نظر سے تجمّل　　ہم آپ جارہے ہیں تقاضا نہ کیجئے

(77)

کیا اپنا سانس لینا آہیں سی بھر رہے ہیں　　دن غم میں کیا گزرتے ہم خودگزر رہے ہیں
قائم رہے الٰہی خود داریٔ محبت　　تم یاد آرہے ہو ہم یاد کررہے ہیں
ہستی کسی کے غم میں برباد کر رہا ہوں　　مٹی نکھر رہی ہے ذرّے سنور رہے ہیں
فکر و نظر میں کتنا دلچسپ فاصلہ ہے　　دیکھا تو جی رہے ہیں سوچا تو مر رہے ہیں
کیا ہم سے پوچھتے ہو اس دل کی سادگی کو　　یہ ان کے دل سے پوچھو جو رنگ بھر رہے ہیں
اے تجمّل گارہا ہے میری غزل وہ ظالم　　نغموں کی بانسری سے نالے گذر رہے ہیں

(78)

فکر و دانش آزما کر کیا کروں　　اک بلا دنیا پہ لاکر کیا کروں
میرا غم بھی میرے قابو کا نہیں　　فطرتاً آنسو بہاکر کیا کروں
اپنے دل کو دل بناکر کیا کیا　　تیرے دل کو دل بناکر کیا کروں
جس کی ہو بنیاد میری مفلسی　　اس درِ دولت پہ جاکر کیا کروں

جاگنے والے ابھی جاگے نہیں　　سونے والوں کو جگا کر کیا کروں
بندگی بے چارگی سی ہوگئی　　بندہ پرور سر جھکا کر کیا کروں
دیکھ اے واعظ مرا عرشِ سخن　　میں ترے منبر پہ جا کر کیا کروں
تجمّل خود ہوں میں بہارِ جاوداں　　پھر گلوں پر خار کھا کر کیا کروں

(79)

کچھ ایسی وضع کے دل ایسے غم بھی ہوتے ہیں　　ہم اپنے حال پہ بے آنسوؤں کے روتے ہیں
شمار ان کا نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں　　وہ کم نصیب جو پاتے ہیں کچھ نہ کچھ کھوتے ہیں
بنایا جاتا ہے کعبہ کے سامنے کعبہ　　خدا پرست یہ سجدے کہاں ڈبوتے ہیں
ستم کی چھائی ہے بدلی لہو برستا ہے　　زمانہ جاگ اٹھا ہم مزے میں سوتے ہیں
خراب جلوۂ ظاہر تجھے خبر کیا ہے　　گناہگار بہت بے گناہ ہوتے ہیں
انہیں بھی شوق ہے معصومیت کے جامہ کا　　سنا ہے دامنِ فطرت کے عیب دھوتے ہیں
جناب تجمّ یہ شعر آفرینیاں کب تک　　بہت سے آپ کے ساتھی لحد میں سوتے ہیں

(80)

کیسی خموشی کیسے اشارے　　حق کہہ گئے ہم بانکے
سیکھے نہیں تم احساں کرنا　　مرتے نہیں ہم تلوار مارے
ہارے ہوئے تو ہارے ہوئے تھے　　جیتے ہوئے بھی آخر میں ہارے
اللہ اب تک جینا نہ آیا　　راتیں بھی کاٹیں دن بھی گذارے
منشا کسی کا حکمت کسی کی　　الزام مجھ پر سارے کے سارے
کتنے ہی ڈوبے کتنے ہی اُبھرے　　بیٹھے رہے ہیں دریا کنارے
ہاں ہاں بڑھے جا تنہا مسافر　　اپنے بھروسے اپنے سہارے
اے تجمّ کتنے اہلِ سخن نے　　میرے سخن کے چہرے اُتارے

(81)

خوش رہے خاک چھاننے والا　　میرا ہر عیب جاننے والا

ہاتھ دھوکر بھی مطمئن نہ ہوا — خونِ ناحق میں سانے والا
چپ ہیں بڑھ بڑھ کے بولنے والے — مرمٹا جی میں ٹھانے والا
جان پہچان کر بھی ہو انجان — تم سے اچھا نہ جاننے والا
جنبشِ لب کہاں سے لاتا ہے — جیت کر ہار ماننے والا
رو پڑے ایک دن خدا نہ کرے — غم میں ہنسنے کی ٹھاننے والا
جاگتا ہے کہ سورہا ہے حجم — چادرِ ماہ تاننے والا

(82)

پوچھتے کیا ہو جلالت اُس حریمِ ناز کی — میرے دل کو منزلت حاصل نئے انداز کی
عشق اک منزل ہے معیارِ نیاز و ناز کی — موت یہ سرکش کی ہے اور زندگی سر باز کی
میں شبِ غم کے طلاطم میں اکیلا ہوں مگر — آس ہے اک جانی پہچانی ہوئی آواز کی
آخری سانسیں ہیں لب پر وردِ دل آتا نہیں — ہے ابھی تک جستجو پیرایۂ آغاز کی
کتنے سودے ہورہے ہیں درد دل کے نام پر — کس قدر پچھتا رہا ہوں بات کہہ کر راز کی
رکھ دیا ہے زندگی کس نے سکونِ دل کا نام — یہ بھی کوئی زندگی ہے موت کے انداز کی
آج تک ہیں میری فریادیں فضا میں بے اثر — ایسی ناکامی اور اتنی زندگی آواز کی
وقت سے آخر کو دو دو ہاتھ ہوکر ہی رہی — ابتدا میں ہم نے ہر شوخی نظر انداز کی
سب نے اپنے اپنے مقصد کے بنا رکھے ہیں چاند — اپنی اپنی حد میں سب نے چاند تک پرواز کی
یوں سمجھ میں آنہیں سکتا شعورِ زندگی — موت دیکھی ہی نہیں تم نے کسی جاں باز کی
حجم فن شعر پر کیا منحصر ہے انقلاب — اب ہے دنیا میں محبت بھی نئے انداز کی

(83)

دنیا سے گزرتا ہے گزرنا نہیں آتا — جس کے لیے جیتے ہیں وہ مرنا نہیں آتا
آساں ہی سہی ہم سے خوشامد نہیں ہوتی — دشوار ہے وہ کام جو کرنا نہیں آتا
میداں میں نکھرتی ہے دلیروں کی جوانی — ہر آئینہ خانہ میں سنوارنا نہیں آتا
کیا خاک مذلت سے ابھرتی نہیں قومیں — کیا ڈوب کے نبضوں کو اُبھرنا نہیں آتا

اس وہم میں ہیں طاقت امروز کے مالک
چڑھتے ہوئے دریا کو اترنا نہیں آتا

سنتا ہوں کہ انساں سے بہت ڈرتے ہیں اے نجم
انساں جنہیں اللہ سے ڈرنا نہیں آتا

(84)

کسے غرض تھی جو ہؤ کی فضا میں جا ملتا
تلاش کوئی نہ کرتا اگر خدا ملتا

یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جاتے
قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا

ترے خیال میں ہوتی فدا بھی جان اگر
ترا خیال کبھی تو عمل سے جا ملتا

سکونِ قلب کوئی رہ گزر کی چیز نہیں
اٹھا کے لے ہی نہ آتے اگر پڑا ملتا

حیات وعلم ونشاط و ملال و دانش و مرگ
بشر کو اور لباس بشر میں کیا ملتا

ستم ہی تھا جو کہیں معرفت میں کھو جاتے
جناب نجم کہاں آپ کا پتا ملتا

(85)

جی رہے ہیں سہل و ممکن کے لیے
زندگی پائی تھی اس دن کے لیے

ایسے ایسے بھی ہیں مردِ اعتبار
کھودیا ظاہر کو باطن کے لیے

اب تو جنت ہم پہ واجب ہوگئی
عمر بھر ترسے ہیں ممکن کے لیے

کیسے کیسے عزمِ محکم دل میں ہیں
جمع کر رکھے ہیں کس دن کے لیے

ہائے وہ طفلی وہ عہدِ بے شعور
موت بھی آساں ہے اس سن کے لیے

نجم دنیا میں بہت سے کام ہیں
آدمی درکار ہے جن کے لیے

(86)

مجھے بھی دل پہ مرے اختیار ہے کہ نہیں
کوئی خیال کا پروردگار ہے کہ نہیں

چمن کے سینچنے والے ذرا نگاہ تو کر
نمود غنچہ و گل ہو نہار ہے کہ نہیں

بلند ہوں گے کہاں تک لہو کے فوارے
زمین پر کوئی سجدہ گذار ہے کہ نہیں

ہر انتظار ہے کیا زندگی سے وابستہ
کسی کو موت کا بھی انتظار ہے کہ نہیں

یہ عیش پر ہے بھروسہ یہ غم سے بے ربطی
نظر میں گردش لیل و نہار ہے کہ نہیں

اسی اصول پہ تسکین خواہشات کو دے
خزاں کسی کی کسی کی بہار ہے کہ نہیں

میں سوچتا ہوں مقام عمل میں تجمّل ابھی
بہت ہیں عزم کوئی استوار ہے کہ نہیں

(87)

تعمیر آدمیت ترکیب رنگ و بو ہے
تہذیب آدمیت یا آگ یا لہو ہے

جب کھو گیا تو ڈھونڈا جب ہٹ گیا تو پوچھا
اب کچھ مری ضرورت موضوع گفتگو ہے

دنیا بنا رہے ہیں عقبیٰ خراب کر کے
دنیا کی ابتدا سے یہ نظمِ جستجو ہے

اچھے ہوں یا بُرے ہوں دونوں یہیں رہیں گے
میں ہوں تری نظر میں میری نظر میں تو ہے

عمرِ رواں سے آگے پاتا ہوں تیری منزل
ذوقِ گناہ تجھ میں کیا قوت نمو ہے

میں پاک دامنی کے دعویٰ سے ہوں مبرا
وہ اور کچھ ہیں جن پر تکلیف شست و شو ہے

ان پر نظر نہ رکھوں جن کی ضمانتوں میں
ملت کی عافیت ہے مذہب کی آبرو ہے

ہم نے شرف دیا ہے اے تجمّل اس زباں کو
اردو ہمارے گھر کا اندازِ گفتگو ہے

(88)

ستم کو مذہب و ملت کا آسرا نہ رہے
جہاں میں اب تو جہاں ہم رہیں خدا نہ رہے

زمانہ آج فراموش و در گذر کردے
ترا گناہ جو تجھ کو پکارتا نہ رہے

بساط عجز سے اٹھ کر ہے عزم مستحکم
یہ دیکھ لے کہیں پہلو کوئی دبا نہ رہے

شکستہ پائی بھی تھی کارواں کی میری بھی
وہ کارواں نہ رہے وہ شکستہ پا نہ رہے

مٹا سکے گا کہاں تک نشانِ گمراہی
کہیں کہیں ترا نقشِ قدم پڑا نہ رہے

میں آپ گھونٹ دوں اپنی سخنوری کا گلا
روش جو فکر کی اے تجمّل حامیانہ رہے

(89)

حال پر بارہا زوال آئے
نہ مگر وقتِ عرض حال آئے

تنگ دل منہ پھرا کے میداں سے
کیسی اچھی اجل کو ٹال آئے

دل کی پاکیزگی ارے توبہ
یادِ دشمن بھی بے ملال آئے

دور تک آدمی نہیں ملتا
آدمیت کا جب سوال آئے

اب وہ اپنا ہو یا مقابل کا
شکر ہے ہم لہو میں لال آئے

مردہ دل دل سنبھالتے ہی رہے
دل جلے حوصلے نکال آئے

ساعتوں میں بھی جو گنے نہ گئے
مدتوں ایسے ماہ و سال آئے

آنکھ میں آنکھ ڈالنا کیسا
دل میں کافر کے دل نہ ڈال آئے

اس کی محفل ہے اس کا میداں ہے
جس کو اپنی سی بول چال آئے

تجم بیٹھے ہیں پاؤں توڑ کے یوں
جیسے دنیا کو دیکھ بھال آئے

(90)

یہ بھی ہے کوئی زندگی کیا یہی کائنات ہے
تیرا سکون الحذر موت ہے یا حیات ہے

میرے ہی جیسے آدمی سجدہ گزار ہر طرف
میرا ہی جیسا آدمی مالک شش جہات ہے

ہائے وہ شام بے خودی ہائے وہ جام بے خودی
پوچھ رہے ہیں سرنگوں صبح ہوئی کہ رات ہے

جان پہ کھیل جا فقط کھیل ہے ایک سانس کا
زیست سے بھی ہے مخلصی موت سے بھی نجات ہے

ان کی تونگری سے ہے سب کو نیاز کا شرف
میری غریب زندگی مانع التفات ہے

آج بدل گئی جگہ اپنی ہی چال ڈھال سے
اوج فلک پہ ہم ہی تھے تجم یہ کل کی بات ہے

(91)

اے درپے سیاست آگاہِ راز ہوجا
ہنگامہ سے الگ رہ ہنگامہ ساز ہوجا

کیا میری بندگی اور کیا تیری بے نیازی
پیدا کر اک مقابل اور بے نیاز ہوجا

پستی کے خرمنوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں
اپنی بلندیوں سے تو نے نواز ہوجا

اللہ کا کوئی حق گردن پہ رہ نہ جائے
بندوں سے منہ پھراک کر محوِ نماز ہوجا

وحدت سے تو بھی کرلے اک اور شان پیدا
محفل نئی جما کر محفل طراز ہوجا

محتاج شرح جو ہو وہ تجم شاعری کیا
ہر شعر پر یہ قدغن دنیائے راز ہوجا

(92)

زندہ دلوں نے بارہا بحر فنا سے دی نجات
یہ نہ سنبھالتے اگر ڈوب گئی تھی کائنات

کہتے ہیں وہ فضول ہیں آپ کے سب توقعات
ان کا خدا بھلا کرے چھین لی میرے منہ کی بات

اس کو خبر نہیں ابھی میری حیاتِ عشق کی
موت سمجھ رہی ہے یہ خاک میں مل گئی حیات

آ گیا دل وجود میں جمع ہوئیں جب ایک جا
حسن کی کچھ تجلیاں عشق کی کچھ خصوصیات

فرشِ زمیں پہ ہم نشیں فرش ہے بوریے کا بھی
اب تو بہت ہی بڑھ چلا حوصلہ تکلفات

حسن ہو یا وہ عشق ہو ہے کوئی واجب الوجود
مجھ کو یقین کیوں نہ ہو خود ہوں شریک ممکنات

دیکھ رہے ہیں یوں مجھے وقت کے اعتبار پر
جیسے انھیں کے ہاتھ ہے آج نظامِ کائنات

کون مجھے یہ لے چلا شوق کی راہ راست پر
کھل گئی غم کی چاندنی ڈھل گئے سب توہمات

زیست حرام ہوگئی دیکھیے اور کیا کریں
عقل کی یہ جسارتیں فکر کے یہ تصرفات

باعثِ زندگی سہی میں وہ قبول کیوں کروں
ساتھ ہے التفات کے ان کا غرور التفات

جس کی عطا تھی زندگی حجم اسی کے در پہ تھا
جتنی بڑھیں عنایتیں اور بڑھے مطالبات

(93)

بادۂ تلخ کام کیا کرتا
نشۂ مے قیام کیا کرتا

دل کی گہرائیوں میں جانا تھا
عالمانہ کلام کیا کرتا

دوریٔ منزل و سفر توبہ
لغزشِ چند گام کیا کرتا

رو دیے بے بسی پہ دشمن کی
جذبۂ انتقام کیا کرتا

یہ مداوائے درد دل تو نہیں
میں دعا اور سلام کیا کرتا

ترکِ صوم و صلوٰۃ کی ٹھہری
اور میں بے امام کیا کرتا

بیش و کم ہے نظامِ فطرت حجم
آدمی انتظام کیا کرتا

(94)

جلوے ترے نظر میں سموئے ہوئے سے ہیں
مجھ کو جو پا گئے ہیں تو کھوئے ہوئے سے ہیں

کیا پوچھتے ہو عشق کی ناکامیوں کا درد
روئے اگر نہیں ہیں تو روئے ہوئے سے ہیں

ہنگامۂ مجاز و حقیقت ہے ہر طرف
اک ہم ہی درد عشق میں سوئے ہوئے سے ہیں

آنکھوں کا اتہام ہے آنکھیں کہاں ہیں اب
دھبّے گناہِ دید کے دھوئے ہوئے سے ہیں

تم خود ہی دیکھ لوگے غمِ زندگی میں ہم
ڈوبے ہوئے سے ہیں کہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

اوراقِ گل سے کس نے یہ کی دعوتِ نظر
شبنم کے آنسوؤں میں بھگوئے ہوئے سے ہیں

کیا ڈھونڈتی ہے تجمّل نگاہِ سخن شناس ہم اپنے کیف شعر میں کھوئے ہوئے سے ہیں

(95)

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی قصورِ فکر و نظر ہے جو تشنگی نہ رہی
ہوئی تھی خاک سے پاک اور خاک بھی نہ رہی وہ مشتِ خاک جو مفہومِ آدمی نہ رہی
پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردہ مگر نگاہ محبت کبھی چھپی نہ رہی
کہاں وہ عہد گذشتہ کی دوستی اے دوست وہ دشمنی کی شرافت وہ دشمنی نہ رہی
کچھ ان کا رحم و کرم بھی ہے ذمہ دار اس کا نگاہ میں کوئی ہستی گناہ کی نہ رہی
ہمیشہ موت کے بعد اہلِ دل کو پہچانا وہ کون تھا جسے دنیا پکارتی نہ رہی
چھپا رکھے ہیں زمانے سے کتنے عیب اپنے خدا کی شان حقیقت بھی گفتنی نہ رہی
زمانہ ہوتا موافق تو کیا نہ کچھ کرتے دلِ غریب میں جذبات کی کمی نہ رہی
مری جگہ ہے یہ دنیا کا آئینہ خانہ جو دیدنی تھی وہ صورت بھی دیدنی نہ رہی
پڑا جو وقت تو مرحوم کہہ دیا دل کو یہ کس زبان سے کہہ دیں کہ زندگی نہ رہی
ہنسی خوشی کا یہ کیسا گناہِ بے لذت خوشی خوشی نہ رہی جب ہنسی ہنسی نہ رہی
ہر اک کی لغزشیں دیکھیں ہر اک کو ٹوک دیا مری نگاہ تھی اور مجھ کو دیکھتی نہ رہی
صلہ کچھ اس کے سوا تجمّل کو نہیں منظور اگر ذریعہ عزت یہ شاعری نہ رہی

(96)

قفس میں جو ہمیں توہینِ غم نظر آئی وہ درد اٹھا ہے کہ پھر دل کی چوٹ ابھر آئی
ہزار مرحلوں سے زندگی گزر آئی قدم اکھڑ گئے جب راہِ راست پر آئی
بلائے عشق ہزاروں کی جان پر آئی نجات خلق کی اک آرزو نہ بر آئی
ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا اجل کے سائے میں کیا زندگی نکھر آئی
عذاب ہوگئی راہِ ثواب ارے توبہ ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی
کوئی بچا نہ زمانے میں جبرِ فطرت سے لبِ وفا پہ بھی اک آہِ مختصر آئی
کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

باب پنجم

رباعیات

(591) عدد

فہرست رباعیات

شمار	عنوانات	تعداد	صفحہ نمبر
-1	حمدیہ رباعیات	(2)عدد	568
-2	نعتیہ رباعیات	(31) عدد	569
-3	منقبتی رباعیات	(99) عدد	574
-4	قرآنی رباعیات	(2) عدد	587
-5	غدیری رباعیات	(9) عدد	588
-6	ولائی رباعیات	(26)عدد	590
-7	عزائی رباعیات	(7) عدد	594
-8	رباعیات مباہلہ	(3)عدد	596
-9	عشقیہ رباعیات	(10)عدد	597
-10	فکری رباعیات	(89) عدد	599
-11	قومی رباعیات	(93) عدد	611
-12	اخلاقی رباعیات	(72)عدد	623
-13	سماجی رباعیات	(28)عدد	633
-14	رباعیات واعظ	(12)عدد	637
-15	متفرق رباعیات	(26) عدد	639
-16	رباعیات شاعر	(29) عدد	643
-17	ذاتی رباعیات	(49)عدد	647
-18	فارسی رباعیات	(4) عدد	654
	کل رباعیات:	(591) عدد	

حمدیہ رباعیات

(1)

کیا حسن وضیاء، سورۂ الحمد میں ہے　　روحِ دوسرا، سورۂ الحمد میں ہے
لائے گا کہاں سے حمد کرنے والا　　جو حمدِ خدا سورۂ الحمد میں ہے

(2)

توحید کا ربط کیا سخن دانی سے　　مرعوب ہوں جلووں کی فراوانی سے
کوشش وہ سمجھنے کی ترے کیوں کرتا　　عرفاں ہے ترا جسے حیرانی سے

○

منقبتی رباعیات

(1)

جلوہ سے ہوا عالمِ امکاں آباد　　عالم نے کہا جلوۂ جاناں آباد
پیدا جو ہوئے خانہ کعبہ میں علیؑ　　کعبہ نے کہا خانۂ احساں آباد

(2)

کس شان سے دامنِ رسالتؐ میں کِھلا　　ایسا کوئی گُل نہ باغ جنّت میں کِھلا
تامہدیؑ دیں علیؑ کی خوشبو نکلی　　جو پھول بھی گلشنِ امامت میں کِھلا

(3)

اللہ کے گھر میں آنے والا آیا　　دیوار کو در بنانے والا آیا
کہہ دو اصحابِ کہف سے جاگ اٹھیں　　سوتی دنیا جگانے والا آیا

(4)

دنیا میں خدا کا دین لانے والا　　قرآن کا وہ حسین لانے والا
اللہ کے گھر سے ڈھونڈھ کر لاتا ہے　　سب سے پہلا یقین لانے والا

(5)

کیا بازوئے مصطفیٰؐ نے پائیں آنکھیں　　مولودِ خدا شناسِ حق ہیں آنکھیں
دیکھی تو نبیؐ کی پہلے صورت دیکھی　　اسلام کی روشنی میں کھولیں آنکھیں

(6)

ہر جان و دل علیؑ مہ عید ہوا　　سنتے ہیں یہ دور قابلِ دید ہوا
پتی پتی نہ کیوں ہو جنت بہ بغل　　کھلتے ہی یہ گل بہارِ توحید ہوا

(7)

ہے امن واماں کا گھر وطن کی صورت — دنیا میں ہے جنت کے چمن کی صورت
اسلام کو دامن میں علیؑ نے اپنے — پالا ہے حسینؑ اور حسنؑ کی صورت

(8)

دین و دنیا میں کار فرمائی لی — بندوں میں خدا سے شانِ یکتائی لی
آمد سے نبیؐ کی یا علیؑ حق چونکا — تم آئے کہ اسلام نے انگڑائی لی

(9)

بے پردہ ہوئی کلی کلی کی خوشبو — اللہ کے آیاتِ جلی کی خوشبو
ایمان کا جب غنچۂ بے داغ کھلا — پتی پتی میں تھی علیؑ کی خوشبو

(10)

دنیا کو یہ آفتاب دینے والا — فردوس کو یہ شباب دینے والا
وہ کون ہے اور اگر یداللہ نہیں — اٹھے تو کوئی جواب دینے والا

(11)

انصاف سے دل کو تھام لیتے ہیں نبیؐ — حق کے لفظوں سے کام لیتے ہیں نبیؐ
آیا جب سامنے فضیلت کا سوال — آخر کو علیؑ کا نام لیتے ہیں نبیؐ

(12)

واعظ مجھے معلوم ہے جوہر تیرا — کیا دور ہے فردوس میں ہو گھر تیرا
کوثر کی ہے تشنگی تو لے یہ بھی سہی — ساقی میرا ہے اور کوثر تیرا

(13)

دنیا میں کہاں علیؑ سا انساں پیدا — ہوش آتے ہی کیا کیا ہوئے ساماں پیدا
پہلے یہی مادر نے خبر دی ہوگی — کعبہ میں ہوئے تھے تم مری جاں پیدا

(14)

جو پھول کھلا تیری محبت میں کھلا — دنیا میں کھلا کہ باغ جنت میں کھلا
کعبہ کے چمن سے جاکے لے آئے نبیؐ — اسلام کا گل علیؑ کی صورت میں کھلا

(15)

ہوتی ہے جو کچھ اس کی رضا دیتا ہے
کیا جانیے کیا لیتا ہے کیا دیتا ہے
پیدا ہوتا ہے اپنا کعبہ میں امامؑ
بندے لیتے ہیں اور خدا دیتا ہے

(16)

توصیفِ علیؑ کسی کا مقدور نہیں
اس باب میں بحث ہم کو منظور نہیں
خود وجہہ خدا نقشِ خدا کہتے ہیں
نزدیک نصیریت سے ہیں دور نہیں

(17)

میخانہ وحدت سے منگالے کوئی
یا پھر مرا ظرف آزمالے ساقی
اب ساقیٔ کوثر پہ جمی ہیں نظریں
ساغر میرے آگے سے اٹھالے ساقی

(18)

کوئی تو خفی کوئی جلی کہتا ہے
مولاؑ ہے مرا یہ ہر ولی کہتا ہے
سنتے نہیں تم یہ ہے سماعت کا قصور
غنچہ کھلتے ہی یا علیؑ کہتا ہے

(19)

وہ صوم و صلوٰۃ کی ہے منزل ساقی
گم صم ہیں جہاں زاہدوں کے دل ساقی
ھو حق ہے یہاں جشن ہے بیداری ہے
رندانِ بلا کی ہے یہ محفل ساقی

(20)

سر جھکتے ہیں سب کے سربلند اتنا ہے
حیراں ہے زمانہ فتح مند اتنا ہے
اللہ نے نام دے دیا ہے اپنا
بندہ ہے مگر اس کو پسند اتنا ہے

(21)

ہر قوم کی نظروں میں گرامی ہیں علیؑ
اک عام برادری کے حامی ہیں علیؑ
اس وقت کا اتحاد ہے اس کا گواہ
دنیا میں اخوت کے پیامی ہیں علیؑ

(22)

دیتی ہے حدیث یہ گواہی ساقی
ہے ذکر ترا یاد الٰہی ساقی
اب کیا دے گا کوئی نصیری کا جواب
ایمان کا حافظ ہے خدا ہی ساقی

(23)

غافل سُن جائیں باخبر کی باتیں　　بے کار ہیں سب اِدھر اُدھر کی باتیں
مولودِ حرم نبیؐ کی آغوش میں ہے　　بندے پوچھیں خدا کے گھر کی باتیں

(24)

سُن آئے ہیں خود نبیؐ وصی کی آواز　　معمورۂ عرش پر علیؑ کی آواز
رکھتے نہیں گوش ہوش مومن اے حجم　　دل کی دھڑکن میں ہے کسی کی آواز

(25)

مولود علیؑ سا جب کہ پائے کعبہ　　پھر نور سے کیوں نہ جگمگائے کعبہ
اللہ یہ اہتمام مہمانیٔ دوست　　صدیوں پہلے پڑی بنائے کعبہ

(26)

وہ کون ومکاں کا رازِ ایجاد آیا　　وہ مالکِ عزّتِ خدا داد آیا
لاریب خدا نہیں وہ لیکن بخدا　　بھولے ہوئے بندوں کو خدا یاد آیا

(27)

دل میرا امامِ ازلی کہتا ہے　　سرچشمۂ آیاتِ جلی کہتا ہے
اس وقت کی کشمکش نہ پوچھو مجھ سے　　جب کوئی خدا کوئی علیؑ کہتا ہے

(28)

حق کے چہرے پہ جگمگاہٹ آئی　　دیوار میں در کھلنے کی آہٹ آئی
آنے والے کی شان اللہ اللہ　　کعبہ کے لبوں پہ مسکراہٹ آئی

(29)

الفاظ نے کونین کی پہنائی لی　　معنی نے اجازتِ پذیرائی لی
پیدا جو لسانِ حق ہوا کعبہ میں　　اسلام کے پیغام نے انگڑائی لی

(30)

انسان سمجھ سکے گا کیا شانِ علیؑ　　ہے نفسِ خدا خطاب شایانِ علیؑ
پورا قرآن لے کے آئے ہیں مگر　　جبریلؑ کو حاصل نہیں عرفانِ علیؑ

(31)

کرتا ہے قوی ، دل کو خیالِ حیدرؑ　　تاریخ ہے محروم مثالِ حیدرؑ
بدر و احد و خندق و خیبر کی قسم　　قدرت کا جلال ہے جلالِ حیدرؑ

(32)

شمشیر تری جنبش ابرو سے نبیؐ　　تھی تیری سپر حلقۂ گیسوئے نبیؐ
ظاہر ہے محمدؐ کی شجاعت تجھ سے　　اے صلِ علیٰ قوتِ بازوئے نبیؐ

(33)

لے کر درِ دولت کا سہارا اترا　　پاکر یدِ قدرت کا اشارا اترا
اللہ رے زہراؑ کی عبادت کا شرف　　تسبیح بنانے کو ستارہ اترا

(34)

دل رازِ حیات پاگیا ہے ساقی　　اک جام خودی مٹا گیا ہے ساقی
رندوں کے سب اختلاف مٹ جائیں گے　　شہزادۂ سلح آگیا ہے ساقی

(35)

پھر تحفۂ صد زخم جگر لیتا ہوں　　اک صبر کی سِل سینہ پہ دھرلتا ہوں
یاد آتا ہے جب اسوۂ زیبائے حسنؑ　　میں اہلِ جفا سے سلح کرلیتا ہوں

(36)

آخر پھر وقتِ ناؤ نوش آہی گیا　　وہ سبز قبا زلف بدوش آہی گیا
للہ پھر اک جام عطا کر ساقی　　صدقہ ہونے کو اس پہ ہوش آہی گیا

(37)

یہ فکر و نظر کا کیا محل ہے ساقی　　واعظ کے دماغ میں خلل ہے ساقی
پیتا ہوں مئے ولا بتقریبِ حسنؑ　　واللہ یہ احسن عمل ہے ساقی

(38)

کعبہ کی قسم جادۂ حق ملتا ہے　　مفہومِ غم و رنج و قلق ملتا ہے
ہر دور میں ہوتی ہے عزائے شبیرؑ　　ہر قوم کے انساں کو سبق ملتا ہے

(39)

مسلم سمجھیں حسینؑ کا ہے جو مقام ہر قول و عمل ہے اک الٰہی پیغام
ایثار اسی کا ہے نظامِ اخلاق کردار اسی کا ہے متاعِ اسلام

(40)

کاشانۂ دل کو جگمگا دیتا ہے پروانۂ حُریت بنا دیتا ہے
یہ نامِ حسینؑ ایک مظلوم کا نام بنیادِ حکومت کو ہلا دیتا ہے

(41)

شاہنشہ مشرقین کہنا ہی پڑا اسلام کے دل کا چین کہنا ہی پڑا
دنیا نے بہت کلمہ حق ضبط کیا پھر چیخ کے یا حسینؑ کہنا ہی پڑا

(42)

اسلام کے پیشوا امام جعفرؑ ایمان کے رہنما امام جعفرؑ
اک سجدہ منفرد کی حسرت ہے مجھے مل جائے جو نقشِ پا امام جعفرؑ

(43)

وہ عارف خشک و تر امام جعفرؑ ایمان کے راہبر امام جعفرؑ
اربابِ تصوف کو ہے نسبت ایسی ہر دل میں ہیں جلوہ گر امام جعفرؑ

(44)

اے صاحبِ علیٰ شان امام جعفرؑ سب کو نہیں عرفان امام جعفرؑ
پہنچے گی کہاں تک نظر اہلِ زمیں تا عرش ہے ایوان امام جعفرؑ

(45)

دل موسیٰ کاظم ترا شیدائی ہے اسلام نے تجھ سے تازگی پائی ہے
موسیٰ کو سر طور تھی جلوہ کی تلاش جلوہ تری نظروں کا تماشائی ہے

(46)

دنیا میں غمِ عشق ہے ہم سے قائم ہم ہیں غمِ عشق کے کرم سے قائم
اس مقصد کونین کا دم بھرتے ہیں کونین ہیں جس کے دم قدم سے قائم

(47)

کاشانۂ قلب میں اترنے والا　　فطرت کے حدود سے گزرنے والا
میں ہوں خاموش بے زباں ہے مرا دل　　آخر یہ ہے کون بات کرنے والا

(48)

کتنے میکش ہیں آزمالے ساقی　　منہ پر ہیں بہت نقاب ڈالے ساقی
تلوار کی نوک سے الٹ دے پردے　　آجا مرے ذوالفقار والے ساقی

(49)

منزل پہ ہے اب رقصِ رگ جاں دیکھو　　اکھڑی ہوئی سانسوں کو غزل خواں دیکھو
ہے جشنِ ولادتِ امام آخرؑ　　دیکھو مری آنکھوں میں چراغاں دیکھو

(50)

مہدی کے ظہور حق کی ساعت ہوگی　　انسان کی صورت میں مشیت ہوگی
دیدار کا مسئلہ بجا ہے لیکن　　کچھ حشر سے پہلے یہ قیامت ہوگی

(51)

دنیا پہ نئی شان سے چھائے گی نماز　　ہر آنکھ میں ہر دل میں سمائے گی نماز
سمجھے گا امامت کو زمانہ اس دن　　جس دن یہ نبوت کو پڑھائے گی نماز

(52)

مشکل ہے دو آتشہ تو ہلکی ہی سہی　　رنگیں نہ سہی شراب سادی ہی سہی
مینائے ظہور مانگنے آئے تھے　　خمخانہ غیبت کی گلابی ہی سہی

(53)

افسانہ درد تشنگاں آپہنچا　　تا گنگ و جمن یہ کارواں آپہنچا
عباسؑ کے ہاتھوں کا سہارا لے کر　　اسلام کہاں تھا اور کہاں آپہنچا

(54)

ہمنام خدا نبیؐ کی خوبو والا　　حمزہؓ کی طرح سے زوربازو والا
دونوں عالم ہیں دونوں زلفوں کے اسیر　　کس گھر کا چراغ ہے یہ گیسو والا

(55)

دنیا کو یہ حال زار معلوم نہیں ایسا کوئی غم زدوں میں مغموم نہیں
اولاد نہ تھی جو کرتیں بھائی پہ فدا کلثوم کی طرح کوئی مظلوم نہیں

(56)

اے صل علیٰ رتبۂ اُمِ کلثوم اسرارِ خدا بشر کو ہوں کیا معلوم
معصوموں کی فہرست میں شامل بھی نہیں اور اس پہ یہ عالم ہے کہ بالکل معصوم

(57)

تلوار کا رخ پسند کرنے والے کونین کو درد مند کرنے والے
ہر عہد میں سر جھکیں گے چوکھٹ پہ تری اِنسان کو سر بلند کرنے والے

(58)

یہ راہِ خدا میں کد و کاوش تیری وہ حیرت ہرنگاہ کوشش تیری
اسلام پہ اے حسینؑ یہ واجب ہے کرتا رہے تاحشر پرستش تیری

(59)

مظلوم کا غم چین کہاں لیتا ہے کیا کیا عوض ضبط فغاں لیتا ہے
سینوں سے تڑپ کے دل نکل آتے ہیں جب صبرحسینؑ چٹکیاں لیتا ہے

(60)

کیا شورِ فغاں جہانِ اسلام میں ہے تاثیر عجب حسینؑ کے نام میں ہے
یہ لطف ہے راہِ حق میں جانبازی کا دنیا بے چین اور وہ آرام میں ہے

(61)

ایسا کوئی دردِ آشنا پھر نہ ملا دنیاکو شہیدِ کربلا پھر نہ ملا
لاکھوں گزرے حسین اے بنتِ نبیؐ جیسا ترا حسینؑ تھا پھر نہ ملا

(62)

رتبے جو بڑے ہوئے ہیں گھٹ جائیں گے نااہل جگہ چھوڑ کے ہٹ جائیں گے
جس روز وہ غیبت کا حجاب اٹھے گا چہروں سے بہت نقاب الٹ جائیں گے

(63)

حق کی قوت سے کام لینا ہوگا　　ہم دیتے ہیں جو پیام لینا ہوگا
گرتا ہوا یوں کوئی نہ سنبھلا اب تک　　دنیا کو علیؑ کا نام لینا ہوگا

(64)

کس وہم حیات میں ہے محرومِ حیات　　وابستہ ظہور سے ہے مقسومِ حیات
جس دن وہ پیمبرِ حیات آئے گا　　اس روز بدل جائے گا مفہومِ حیات

(65)

وہ حاصلِ انتظام آنے ہی کو ہے　　وہ مصلح روزگار آنے ہی کو ہے
ہیں قوم میں کچھ اس کے سپاہی تیار　　اب وارثِ ذوالفقار آنے ہی کو ہے

(66)

ملت ہے بہت مرتبہ دان عباسؑ　　معلوم بھی ہے عزت و شان عباسؑ
ایثار بھی ہے وفا بھی خود داری بھی　　کیا صرف علم ہی ہے نشانِ عباسؑ

(67)

دنیا میں نیا جہاں بسالے آجا　　آجا خضرا کے بسنے والے آجا
منظور ہے قتلِ عام حاضر ہیں یہ سر　　تلوار لیے عبا سنبھالے آجا

(68)

پہلو میں کسی کے دل رہا ہے دیکھو　　اک نور سے نور مل رہا ہے دیکھو
آغوش نبیؐ میں مسکراتے ہیں حسینؑ　　دیکھو وہ پھول کھل رہا ہے دیکھو

(69)

جو میری طرح علیؑ کا دم بھرتا ہے　　کس عالم حیرت میں بسر کرتا ہے
اللہ تو کہنے کا نہیں ہوش میں ہوں　　بندہ کہتے ہوئے بھی جی ڈرتا ہے

(70)

کس نے جز ختمِ مرسلینؐ پہچانا　　ہم نے تم نے کبھی کہیں پہچانا
مولاؑ کو خدا کہا نصیری نے اگر　　اتنی سی خطا ہے کہ نہیں پہچانا

(71)

میں تولا سے عبادت کا بھرم رکھتا ہوں　　درد دل سوز جگر دیدۂ نم رکھتا ہوں
دل کی قوت کے لیے ذکر خدا سے پہلے　　یا علیؑ کہہ کے مصلے پہ قدم رکھتا ہوں

(72)

کرتا ہوا ورد یا علیؑ جاؤں گا　　مرنا کیا میں اور جی جاؤں گا
دشمن مجھے زہر دے کے دیکھے تو ذرا　　ساقی ترا نام لے کے پی جاؤں گا

(73)

ہر دور میں حیدریؑ رہے ہیں ساقی　　تیری ہی ولا میں جی رہے ہیں ساقی
نشہ کبھی دم بھر کو اترنے نہ دیا　　چودہ سو برس سے پی رہے ہیں ساقی

(74)

دنیا سے بصد زندہ دلی اٹھتا ہوں　　غم کیا ہے مجھے خوشی خوشی اٹھتا ہوں
محفل یہ فضائل کی ہے اے موت ٹھہر　　میں ذکرِ علیؑ سن کے ابھی اٹھتا ہوں

(75)

بندوں پہ خدا کا فضل کیا کیا نہ ہوا　　رتبہ یہ بجز علیؑ کسی کا نہ ہوا
اعزاز بہت ملے رسولوں کو مگر　　کعبہ میں کوئی رسولؐ پیدا نہ ہوا

(76)

میں اور ترا واقفِ اسرار بنوں　　کیوں عشق میں یا علیؑ خطا کار بنوں
تو عین خدا ہے کیا یہ رتبہ کم ہے　　کیوں تجھ کو خدا کہہ کے گنہگار بنوں

(77)

سب عید کے دن بُرے بھلے ملتے ہیں　　کیا کیا جھک جھک کے من چلے ملتے ہیں
بے جا ہے تو درگزر کریں گے مولاؑ　　ہم آج نصیری سے گلے ملتے ہیں

(78)

تھا ایک ضرور ناؤ کھینے والا　　ہے نامِ محمدؐ کوئی لینے والا
اللہ ہے بے نیاز الفاظ و صدا　　یہ کون تھا کُن کا حکم دینے والا

(79)

دیوار کا منشا ہے کہ در سے آئیں — جائیں کہ بشر کسی کے گھر سے آئیں
اے بنتِ اسد شق ہے جدار کعبہ — گھر جس کا ہے وہ چاہے جدھر سے آئیں

(80)

پڑھتا ہوا اللہ کا فرمان آیا — یہ کون نبیؐ کا جان پہچان آیا
قرآن اترا ہے جن پہ ان سے پوچھو — پہلے کس کی زباں پہ قرآن آیا

(81)

گرتی ہوئی عظمت کو سنبھالا جس نے — لکھوا لیا قدرت سے قبالا جس نے
کعبہ اس کا ہے کعبہ والا اس کا — اصنام کے قبضہ سے نکالا جس نے

(82)

دنیا میں علیؑ نئی سحر لائے ہیں — قرآں کی زبانِ معتبر لائے ہیں
جبریلؑ کے آنے سے بہت دن پہلے — بھائی کی رسالت کی خبر لائے ہیں

(83)

اس دور کا ساغر بھی ہرا ہو ساقی — صہبائے مودّت سے بھرا ہو ساقی
مئے جام میں آچکی ہو جب موت آئے — سینہ پہ مگر جام دھرا ہو ساقی

(84)

آغوش نبیؐ میں مسند آرا ہیں حسنؑ — اے مصحفِ حُسن پہلا پارا ہیں حسنؑ
کیا سمجھے گا ان کی قدر و قیمت کوئی — زہراؑ کے تبسم کا سہارا ہیں حسنؑ

(85)

ہے عینِ شباب پر وفورِ غیبت — دینے کو ہے لو چراغِ طورِ غیبت
غیبت سے نہ کیوں ہوگا ظہورۂ جلوہ — جلوہ سے ہوا ہے جب ظہورِ غیبت

(86)

نشہ کی جو تکمیل ضرور ہوجائے — ساقی کی نقاب اٹھے حضوری ہوجائے
کُل میکدۂ جہان پر قبضہ کرلیں — غیبت کی جو مئے آج ظہوری ہوجائے

(87)

کثرت ہو گلوں کی تو چمن بنتا ہے　　کتنے حرفوں سے اک سخن بنتا ہے
مولا کا مرے نام ہے کس درجہ حسیں　　سو خوبیوں سے لفظ حسن بنتا ہے

(88)

ہم شانِ حسین کوئی گذرا ہی نہیں　　امت نے مقام اس کا سمجھا ہی نہیں
اُڑے وہ نہ آتا تو یہ عالم ہوتا　　جیسے کبھی اسلام کہیں تھا ہی نہیں

(89)

خطرہ میں تھی ہر مردِ خدا کی محنت　　ارباب نظر کی عقلا کی محنت
ایثار کی تکمیل نہ کرتے جو حسین　　بے سود تھی سارے انبیاؑ کی محنت

(90)

سب نے اپنی جبیں جھکائی ہوتی　　جب تک ہر ایک کے رسائی ہوتی
آجاتے جو اس پریم نگری میں کہیں　　بھارت میں حسین کی خدائی ہوتی

(91)

ہم سے ہے ولا کا آستانہ قائم　　ہر باغ و بہار و آشیانہ قائم
ذرہ ذرہ ہے زیر بار احساں　　اپنے قائم سے ہے زمانہ قائم

(92)

دنیا کو رہ راست پہ لانا ہے ضرور　　بگڑا ہوا دستور بنانا ہے ضرور
یہ دور عبوری ہے ٹھہرنے کا نہیں　　اک مصلحِ اخلاق کو آنا ہے ضرور

(93)

میں چھوڑ کے فرش بے خودی اٹھتا ہوں　　طوفاں کی طرح کبھی کبھی اٹھتا ہوں
بے جان بنا دیتی ہے جب مردہ دلی　　عباسؑ کا نام لے کے جی اٹھتا ہوں

(94)

وفورِ تشنہ لبی کی وفا کو فتح کیا　　علم بدوش اٹھا کربلا کو فتح کیا
جلال و قوّتِ عباسؑ پوچھتے کیا ہو　　فراتِ وفا کو فتح کیا

قرآنی رباعیات

(1)

انسان کا ذریعہ نجات آہی گیا　　منشور خدائے کائنات آہی گیا
تبلیغ تھی ناتمام قرآں کے بغیر　　وہ آخر دستور حیات آہی گیا

(2)

تفسیر غلط کا جب مزا آئے گا　　خود صاحبِ تفسیر چلا آئے گا
منبر کی بلندیوں پہ گھٹ جائیں گے دم　　قرآن جو بولتا ہوا آئے گا

○

غدیری رباعیات

(1)

باقی نہ رہا سروں میں سودا ساقی
آ دیکھ خلافت کا تماشا ساقی
نشہ کیسا خمار آنکھوں میں نہیں
اب آنکھ ملاتی نہیں دنیا ساقی

(2)

اظہارِ حقیقت میں جری ہوں ساقی
اربابِ نفاق سے بری ہوں ساقی
نغمہ ہے ولا کا اور غدیری لہجہ
میں فضلِ خدا سے حیدری ہوں ساقی

(3)

یہ دھوپ رسالتؐ کے مہ و انجم پر
شدت موسم کی اور ہم پر تم پر
اٹھی درقبلہ سے وہ بلخ کی گھٹا
واللہ یہ برسے گی غدیرِ خم پر

(4)

ساقی کے تبسم کی فضا لائیں گے
تھوڑی سی بھلا شراب کیا لائیں گے
جس روز پہنچ گئے ہم ایسے میکش
اے دشت غدیر خم اٹھا لائیں گے

(5)

چودہ سو برس گزر گئے ہیں جب سے
دن کاٹے ہیں دشمنوں میں کس کس ڈھب سے
یہ طول حیات ہے یہ ہے آبِ حیات
میں جام غدیر پی رہا ہوں کب سے

(6)

رندان خوش انجام کے پیارے ساقی
اے میری امیدوں کے سہارے ساقی
پہنچا دے کوئی لہر حضوری میں تری
بیٹھا ہوں غدیر کے کنارے ساقی

(7)

کب سے ہم دل کو ہیں تھامے ساقی　　کعبہ والے غدیر والے ساقی
سر پھوڑنے دے اذن جو سجدہ کا نہیں　　رندوں کے بھی کچھ ناز اٹھالے ساقی

(8)

کیا کہہ گئے تھے رسولؐ بطحا والے　　معنی پہنا رہے ہیں دنیا والے
اولیٰ سمجھے مگر نہ سمجھے پھر بھی　　سمجھے مولا کی شان مولا والے

(9)

بھر دے گا مئے ولا سے بل تھل ساقی　　لٹوا دے گا بہار اوّل ساقی
ہیں خمِ غدیر پر اکٹھے سب رند　　جنگل میں منا رہا ہے منگل ساقی

ولائی رباعیات

(1)

تیری ہی ولا کا ہے سہارا ساقی　　میخوار کو تشنگی نے مارا ساقی
اب خم سے بھی بھرتی نہیں نیت مری　　اک جام ملے ترا اتارا ساقی

(2)

بستر در حیدرؑ سے اٹھائے نہ کبھی　　ہٹ کر اس در سے سر جھکائے نہ کبھی
ہم دیکھنے والے ہیں ان انسانوں کے　　قدسی بھی نگاہ میں سمائے نہ کبھی

(3)

مولاؑ کو ربط ہے دل درد آشنا کے ساتھ　　ہم یوں ہیں ساتھ جیسے ہو بندہ خدا کے ساتھ
اوروں پہ بھی شفیق سہی اس کا غم ہے کیا　　اہلِ ولا کی بات ہے اہلِ ولا کے ساتھ

(4)

کیا جانے نصیری کو یہ کیا یاد آیا　　کس کا مفہوم و مدعا یاد آیا
اللہ رے تاثیر مئے حُبِّ علیؑ　　دو گھونٹ پیے تھے کہ خدا یاد آیا

(5)

جذبہ کوئی غلط ابھرتا ہی نہیں　　بے ذکر علیؑ پہ دل ٹھہرتا ہی نہیں
اٹھتی ہے نگاہِ غیر کیوں میری طرف　　میں اور کسی کی مدح کرتا ہی نہیں

(6)

مستِ مئے الفت کو شرابی سمجھے　　غافل دلِ رنگیں کو گلابی سمجھے
اللہ رے ادا شناسی اہلِ ولا　　ملتے ہی نگاہ بو ترابی سمجھے

(7)

دانائی سے نسبت ہو کہ نادانی سے — مرعوب ہوں جلووں کی فراوانی سے
کوشش میں سمجھنے کی ترے کیوں کرتا — حاصل ہے بہت کچھ مجھے حیرانی سے

(8)

نشہ میں ولا کے غرق رہنے والے — نادانوں کے طعن و طنز سہنے والے
اک دن انھیں مرنا بھی اسی نام پہ ہے — جیتے رہیں یا حسینؑ کہنے والے

(9)

انسان ہوتا ہے غم اٹھانے سے بلند — تمکینِ سلف کا بھید پانے سے بلند
جن کو ہے ولائے راکبِ دوشِ نبیؐ — ہوجاتے ہیں وقت اور زمانے سے بلند

(10)

ذرّہ ایک ایک آفتابی ہوجائے — جس پھول کو حکم دوں گلابی ہوجائے
مداح کو آنکھ اٹھاکے دیکھے تو کوئی — لرجائے نظر تو بوترابی ہوجائے

(11)

پوچھو نہ مری دل کی لگی کا عالم — ایسا دیکھا ہے کم کسی کا عالم
میں عالم منقبت سے نکلا نہ کبھی — کلکتہ کا ہو کہ بمبئی کا عالم

(12)

جذباتِ محبت کی تجارت سے گزر — اے دوست نہ آئینِ مودّت سے گزر
توفیقِ ولا ہی کوثر و جنت ہے — کوثر کا خیال چھوڑ جنت سے گزر

(13)

سمجھے ہی نہیں ہمیں زمانے والے — جیتے رہیں عقل کے خزانے والے
ہم بات میں بات کیوں کریں گے پیدا — ہم لوگ ہیں دل سے دل بنانے والے

(14)

قرآن و حدیث کا تقاضا کیا ہے — یہ اجرِ رسالت کا اشارہ کیا ہے
دعویٰ ہو تولا کا مبارک تم کو — پہلے یہ سمجھ لو کہ ''تولا'' کیا ہے

(15)

رہبر کوئی جز فکرِ خدا ساز نہ لے
ہاں قرض کسی کے طرز و انداز نہ لے
آقا ہے ترا علیؑ سا مافوق بشر
جبریل بھی دے تو پر پرواز نہ لے

(16)

زاہد تجھے معلوم ہے کیا کام آئے
اِس راہ میں کون رہنما کام آئے
ممکن ہے ترا داغ جبیں ہو بیکار
شاید مرا نقشِ کفِ پا کام آئے

(17)

دل کو غم شیرؑ میں کستا ہوا جا
ایثار کے گل کدوں میں بستا ہوا جا
اے دوست ! یہ موت کیا بگاڑے گی ترا
تو اِبرِ حیات بن برستا ہوا جا

(18)

یوں دور کیا غم کا جھمیلا ہم نے
ساحل پہ لگا دیا تھا میلا ہم نے
اللہ رے افراط مئے حُبِّ علیؑ
پینے سے بچی تو رنگ کھیلا ہم نے

(19)

سرمایہ نازش دلا دے ساقی
اک عمر کی مدت کا صلا دے ساقی
سب شاعروں کی آنکھ بچاکر کہہ دوں
اپنی جھوٹی مجھے پلا دے ساقی

(20)

مستانہ وار آوارہ نگاہوں کی نہ پوچھ
دوزخ میں نکلتی ہوئی راہوں کی نہ پوچھ
تو اپنے ثوابوں کو گنے جا زاہد
ہم رند ہیں رندوں کے گناہوں کو نہ پوچھ

(21)

مے پی ہوش و حواس کھودے زاہد
لے جام میں نیکیاں ڈبو دے زاہد
یہ کیف ثواب میں نہ آئے گا کبھی
ایک روز گناہ کرکے رو دے زاہد

(22)

پیمانہ آفتاب دے کر سوجا
جامِ مژدۂ صد عذاب دے کر سو جا
سونا تو ہے تا صبحِ قیامت ظالم
تھوڑی سی مجھے شراب دے کر سوجا

(23)

اچھا یہ گناہ کا قرینہ ٹھہرا　　اس گھاٹ پہ اب مے کا سفینہ ٹھہرا
جائز ہے حرام شئے بھی جینے کے لیے　　پینے کی رہی کہ پی کے جینا ٹھہرا

(24)

زاہد مجھے معلوم ہے نیت تیری　　نیت ہے گنہ گار شریعت تیری
دوزخ جنت کا فیصلہ ہونے تک　　دوزخ میری اور جنت تیری

(25)

بھردے ساقی ضرور بھر دے ساقی　　تاریک فضا ہے نور بھردے ساقی
شیشہ رکھ دے نقاب چہرہ سے اٹھا　　ساغر میں مئے طہور بھردے ساقی

(26)

دامن پھر بے خودی کا چھونا ساقی　　پھر ہوش کی رہزنی نے لوٹا ساقی
بے کیفی سے ہے دست طلب میں رعشہ　　بھردے بھردے کہ جام ٹوٹا ساقی

○

عزائی رباعیات

(1)

وہ دین الٰہی کا سفینہ منبر　　تطہیر حیات کا قرینہ منبر
اس عہد میں دیکھتا ہوں اللہ اللہ　　دنیا کی ترقی کا ہے زینہ منبر

(2)

سکتہ میں ہوں قوّتِ لسانی کی طرح　　دل بجھ گیا مرحوم جوانی کی طرح
کیا ذکرِ مصائب پہ ندامت ہے مجھے　　احباب نے سن لیا کہانی کی طرح

(3)

کیونکر قدرت کا مدعا سمجھے گا　　بے ذکر غم حسینؑ کیا سمجھے گا
اسلام کا مشکل ہے سمجھنا اے دوست　　سمجھے گا غلط اگر خدا سمجھے گا

(4)

میں نے بخدا یہ غم کا عالم دیکھا　　کس کس کو نہ بادیدۂ پُرنم دیکھا
ہندو تو ہیں صدیوں سے عزادار حسینؑ　　انگریز کو کرتے ہوئے ماتم دیکھا

(5)

سب سے عظیم حسن عمل ہے غم حسینؑ　　کتنی مخالفت ہو اٹل ہے غم حسینؑ
اس غم کے ساتھ فکر و نظر بھی جو ہو نصیب　　ہر عقدۂ حیات کا حل ہے غم حسینؑ

(6)

معمورۂ عرش تک گیا نورِ حیات　　اے صلِ علیٰ جلوہ گرِ طورِ حیات
ترمیم نہ کرسکا پھر اس میں کوئی　　شبیرؑ بنا گئے جو دستور حیات

(7)

بے درد بھی درد مند ہوسکتا ہے　　ایثار یہ کارمند ہوسکتا ہے
شبیرؑ کے اسوہ سے کوئی لے تو سبق　　انسان کتنا بلند ہوسکتا ہے

○

رباعیاتِ مباہلہ

(1)

کتنے عالم میں صاحب دل نکلے　　ہنگامۂ دوجہاں کا حاصل نکلے
قدرت نے بھری بزم میں ڈالی جو نظر　　کل پانچ مباہلہ کے قابل نکلے

(2)

کونین کو اعزاز دکھائے نہ گئے　　اسلام پہ حق ان کے جتائے نہ گئے
تم کہتے ہو اہلِ بیت اور بھی تھے　　دورانِ مباہلہ میں لائے نہ گئے

(3)

کیا حق کی مخالفت میں خرسند ہوئے　　حقدار ملامتوں کو دہ چند ہوئے
عترت کے ہر اک شرف پہ کی بحث فضول　　آیت سے مباہلہ کی دم بند ہوئے

○

عشقیہ رباعیات

(1)

ہوتی ہے بُری دل کی لگی کیا جانو
یہ من کی پریت مکھ کی ہنسی کیا جانو
ساجن کی ابھی نگاہ دیکھی ہی نہیں
یہ پیت کی ریت تم سکھی کیا جانو

(2)

مے اپنے پریم کے اشارے کی پلا
کھینچی ہوئی راوی کے کنارے کی پلا
آ دل کے حرم کدہ میں پرگھٹ ہوجا
لا مہر و وفا کے گوردوارے کی پلا

(3)

ہو حق میں گزرنے کا کہیں طور بھی ہے
یہ دور حیات کا کوئی دور بھی ہے
دِل اپنا ہے مسجد میں نہ میخانہ میں
ایسی کوئی دلچسپ جگہ اور بھی ہے

(4)

کب جائزہ دیر و حرم لیتا ہوں
ہستی کی خبر تا بہ عدم لیتا ہوں
انسان ہوں یہ خیال آجاتا ہے
تھک جاتا ہوں اور عرش پہ دم لیتا ہوں

(5)

زاہد کو ہے جام کی نہ مینا کی خبر
کیا جانے غریب روزِ فردا کی خبر
تم تو آئے ہو ایسے گھبرائے ہوئے
جیسے لائے ہو ختمِ دنیا کی خبر

(6)

نشہ میں خودی کے جھومتے جائیں گے
جائیں گے تو بے کہے سنے جائیں گے
بیٹھے تو اٹھانے سے ہم اٹھنے کے نہیں
روکا جو کسی نہ تو چلے جائیں گے

فکری رباعیات

(1)

اے فکر کے داغ روشنی دھیمی کر
اے شمع دماغ روشنی دھیمی کر
اک شب تو سکون سے گزر جانے دے
دانش کے چراغ روشنی دھیمی کر

(2)

آنکھوں میں یہ اشکوں کی نمی کیا معنی
پوری محفل میں برہمی کیا معنی
آثارِ حیات میں کمی ہونے دو
احساسِ حیات میں کمی کیا معنی

(3)

زخم دل ناتواں سیو سینے دو
جی بھر کے مئے کشوں پیو پینے دو
کوشش بیجا ہے امنِ عالم کے خلاف
مفہومِ حیات ہے جیو جینے دو

(4)

اے روحِ تصورات اب ساتھ نہ چھوڑ
اے جانِ تصرفات اب ساتھ نہ چھوڑ
اب کچھ آنکھوں سے اٹھ چلے ہیں پردے
اے روشنیٔ حیات اب ساتھ نہ چھوڑ

(5)

یہ صبح کی تازگی یہ آرام کی رات
گرمی سورج کی چاندنی کی برسات
سب کے دامن پہ ہیں لہو کی چھینٹیں
انسان نے بگاڑ دی ہے تصویرِ حیات

(6)

دنیا ہمدرد آج مزدور کی ہے
حالت یہی چار سمت جمہور کی ہے
تیرہ سو برس سے کہتے آئے ہیں ہم
اب سمجھے ہو تم بات ذرا دور کی ہے

(7)

دنیا سے نہ غم اور نہ خوشی لے کے چلے — اِک ولولۂ پردہ دری لے کے چلے
کوئی تو گناہ لے گیا کوئی ثواب — ہم اپنا شعور آگہی لے کے چلے

(8)

ذرّات کو چھانتے چلے جاتے ہیں — اسرار کو جانتے چلے جاتے ہیں
منہ سے نہ کہیں دل سے یہ منکر شاہد — اللہ کو مانتے چلے جاتے ہیں

(9)

پہنچیں گے نہ عقل دور رس تک معنی — ڈھونڈے گا نہ تو بانگِ جرس تک معنی
اللہ ابھی تو لفظِ بے معنی ہے — مل جائیں گے آخری نفس تک معنی

(10)

اپنی طاقت کا بھید پائے ہوئے ہے — طاقت کے خدا سے لَو لگائے ہوئے ہے
ناقابلِ تقسیم وہ ذرّہ جس میں — لاکھوں کی اجل منہ کو چھپائے ہوئے ہے

(11)

اسلام ہے عالم میں نشانِ تہذیب — قرآن ہے معنی و بیانِ تہذیب
عترت سے ہے (تہذیب مودت) قائم — تہذیب ہے یہ روح روانِ تہذیب

(12)

مصرف ہیں نئے نئے زمانوں کے لیے — موضوع جدا جدا فسانوں کے لیے
قرآن ضعیفوں کے لیے اُترا ہے — یورپ کی فلاسفی جوانوں کے لیے

(13)

کیا کہتے ہو اس بات کا امکان نہیں — جیسے مجھے آپ اپنی پہچان نہیں
کیوں بار نہیں اٹھا سکے گا غم کا — کیا دل میں خدا نخواستہ جان نہیں

(14)

آثار میں شانِ کبریائی تو نہیں — در پر کوئی حرف جبہ سائی تو نہیں
بے مال و کمال و علم انساں تو رہا — صد شکر کہ دعویٔ خدائی تو نہیں

(15)

حق جس کا بھی او ظلم کے بانی نہ دیا
دو روز کا لطف زندگانی نہ دیا
کیا کیجئے گلہ یہ ہے وہ دنیا جس میں
انسانوں کو انسانوں نے پانی نہ دیا

(16)

سمجھیں گے وہی جو ہیں سخندانِ غزل
کیونکر نہ ہو سربلند ایوانِ غزل
اصناف میں جب نیا اضافہ ہوگا
بڑھ جائے گی اِک دلیل احسانِ غزل

(17)

ہر فکر سے ہر غم سے نجات اپنی ہے
موت اپنی ہے فرصتِ حیات اپنی ہے
تو حاصل کائنات خود ہے اے دوست
کیا سوچ رہا ہے کائنات اپنی ہے

(18)

قدرت کا نظام ہے عناں گیر حیات
ممکن نہیں حد سے بڑھ کے تدبیر حیات
آئے گی ضرور وقت پر آئے گی
ڈرتے ہو اجل سے یہ ہے تحقیرِ حیات

(19)

کچھ یہ بھی خبر ہے تجھ کو مغرورِ حیات
تاریک ہوا ہے کس قدر نورِ حیات
آنے ہی کو ہے تیغ بکف صاحبِ عصرؑ
اب غور سے دیکھ اپنا دستورِ حیات

(20)

سب فلسفۂ حیات کہہ دیتا ہوں
اِک حرف میں کائنات کہہ دیتا ہوں
شاعر ہوں مجھے دماغِ تفصیل کہاں
سوبات کی ایک بات کہہ دیتا ہوں

(12)

دامن بھی ہے مجلس میں بھگونے کے لیے
آہیں بھی ہیں اشکوں میں سمونے کے لیے
یہ واقعۂ عظیم اے اہلِ عزا
کیا حُسنِ طلب ہے صرف رونے کے لیے

(22)

آلام کا سامنا کروگے کہ نہیں
ملّت سے کبھی وفا کروگے کہ نہیں
اے مجلسِ حاضری کے حاضر باشو
کچھ حق نمک ادا کروگے کہ نہیں

(23)

یہ مرکزِ درس کم سوادوں کا نہیں　　ماخذ کمزور اعتقادوں کا نہیں
مجلس مولد ہے جرأت وہمت کا　　معیار یہ منتوں مرادوں کا نہیں

(24)

کیا ارضِ فرات جگمگا دیتی تھی　　ذرّات کو خون سے جِلا دیتی تھی
قربانیٔ شبیرؑ کو سمجھے کیا ہو　　کیا خاک میں تاثیرِ شفا دیتی تھی

(25)

ایثار کی روشنی میں آنکھیں نہ کھلیں　　ہمت کی مصوری میں آنکھیں نہ کھلیں
گہوارۂ بے شیر پہ روئے تو بہت　　گہوارۂ زندگی میں آنکھیں نہ کھلیں

(26)

مفہوم عزا جاننے والے کم ہیں!　　احسان کو گردانے والے کم ہیں
شبیرؑ! ترے ماننے والے ہیں بہت　　لیکن ترے پہچاننے والے کم ہیں

(27)

بے شک وجہ نجات ہوجاتے ہیں　　ہاں نازشِ کائنات ہوجاتے ہیں
رازِ غمِ شبیرؑ سمجھ لے جو کوئی　　آنسو آبِ حیات ہوجاتے ہیں

(28)

دعویٰ تو بہت ہے طینت فاضل کا　　دریا ہے بڑا پتہ نہیں ساحل کا
تو فاتحِ خیبر ہی علیؑ کو سمجھا　　وہ فاتحِ اعظم ہے دماغ و دل کا

(29)

اسلام کا یہ نظامِ دستوری دیکھ　　یہ عہدِ قدیم وطرز جمہوری دیکھ
ہے آج کی اشتراکیت پر نازاں　　سلماں کی گورنری و مزدوری دیکھ

(30)

مایوسِ شفا کو آسرا دیتے ہیں　　آیات کو تعویذ بنا دیتے ہیں
ہشیار تو لیتے نہیں قرآں سے سبق　　بے ہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

(31)

دل خیر سے استوار اتنا بھی نہیں — دانندۂ روزگار اتنا بھی نہیں
وعدہ پہ ہے انساں کے بھروسہ جتنا — اللہ پہ اعتبار اتنا بھی نہیں

(32)

انسان کی عظمت کے نگہبان بھی ہو — مسلم ہو سلامتی کا عنوان بھی ہو
اسلام پیامِ امن ہے یاد رہے — سنّی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

(33)

اب شغل بجز نفس پرستی کیا ہے — خود پست بنے ہیں ورنہ پستی کیا ہے
انسان، محمدؐ وعلیؑ سے گزرے — کیا کہتے ہو انسان کی ہستی کیا ہے

(34)

وہ عقل و خرد کے مسئلوں میں نہ ملیں — ہاں فکر و نظر کے مرحلوں میں نہ ملیں
خوش باشوں میں ہوچکی بہت ان کی تلاش — اب شرط سہی جو دل جلوں میں نہ ملیں

(35)

آنکھیں کرلو خراب پڑھتے پڑھتے — تفسیر وفقہ کے باب پڑھتے پڑھتے
جب حسنِ عمل نہیں تو حاصل کیا ہے — ہوجاؤ جو خود کتاب پڑھتے پڑھتے

(36)

دنیا کا یہ نقش نظر آتا ہے مجھے — کچھ رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے
نزدیک ہو یا دور ہو طوفاں کوئی — بڑھتا ہوا سایہ نظر آتا ہے مجھے

(37)

ملتے رہے نظروں کو سہارے کتنے — بہتے رہے روشنی کے دھارے کتنے
کب کا جاگا ہوا تھا نیند آہی گئی — تارے کرتے رہے اشارے کتنے

(38)

دل کے آئینہ پر جلا کون کرے — یوں عشق کو عالم آشنا کون کرے
کہتا نہیں حق کوئی انا الحق کیسا — اب دار ورسن کا سامنا کون کرے

(39)

میں ذات و صفات ہی نہ سمجھا ابتک　　سیدھی سی یہ بات ہی نہ سمجھا ابتک
کیا سمجھوں گا عید اور محرم کے رموز　　مفہوم حیات ہی نہ سمجھا ابتک

(40)

ہر بات سے ایک بات پیدا ہوگی　　ہر ذرہ سے کائنات پیدا ہوگی
دل موت کی تقدیم سے ڈرتا کیوں ہے　　ہر موت سے اِک حیات پیدا ہوگی

(41)

آسایش صبح و شام لے لیتی ہے　　سب کیف و سرورِ جام لے لیتی ہے
دنیا بے فیض دل کی دشمن کیوں ہو　　فطرت خود انتقام لے لیتی ہے

(42)

دل رنج و الم میں ہو سراپا راضی　　دو دن کی مسافرت میں کیا ناراضی
دنیا سے نہ کر تارکِ دنیا نفرت　　بندے راضی تو میرا مولا راضی

(43)

نعمت ایک ایک یاد آسکتی ہے　　دل میں اُمید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سو غم تیرے　　اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

(44)

کون اپنے ضمیر کی خبر لیتا ہے　　مشکل سے کوئی یہ درد سر لیتا ہے
اِس دور میں جذبۂ صداقت اکثر　　بچوں کی زباں سے بات کرلیتا ہے

(45)

انساں ابھی کیا کیا نہ ستم ڈھائے گا　　ہمت ہے تو چاند تک پہنچ جائے گا
فتنوں سے زمین ہوچکی ہے معمور　　اب جاکے وہاں فساد پھیلائے گا

(46)

بیجا ہے اگر اپنا ہی اپنا غم ہے　　کر خدمتِ خلق دم میں جب تک دم ہے
دیکھا نہیں خار و گل سے شبنم کا سلوک　　شبنم سے بھی کیا تیری بضاعت کم ہے

(47)

رہرو اک بار لڑکھڑائے جیسے — آہٹ کوئی بیخودی میں آئے جیسے
ٹوٹا مرا دل تو ان کو محسوس ہوا — شیشہ کا گلاس ٹوٹ جائے جیسے

(48)

انسانوں کا آپس میں جھگڑنا کیسا — بیکار کی الجھنوں میں پڑنا کیسا
سب کے لیے رہ گذر ہے دنیا اے دوست — حیراں ہوں کہ رہ گذر پہ لڑنا کیسا

(49)

مانا کہ بہت علم کی برسات ہوئی — محروم عمل رہے تو کیا بات ہوئی
ہم کو یہ قلق ہے کہ ہمیں کچھ نہ ہوئے — دنیا میں ہزار دن ہوئے رات ہوئی

(50)

مے خوار تو ہیں سہو و خطا کے گھر میں — واعظ کو سکوں نہیں خدا کے گھر میں
ہے قابلِ رحم بد نصیبی اُس کی — جو دور ہو درماں سے دوا کے گھر میں

(51)

کیوں ہوش و خرد سے کوئی بیگانہ بنے — لازم ہے یہ فکر کیا بنے کیا نہ بنے
تاریخ جو بن گئے بشر تھے وہ بھی — ہمت کا تصور تھا جو افسانہ بنے

(52)

جب لطفِ حیات میں کمی پاتا ہے — جب شدّتِ آرام سے تھک جاتا ہے
منعم تجھے اس وقت بھی بھولے سے کبھی — مزدور کی محنت کا خیال آتا ہے

(53)

احساس جگا کے جیسے خوشبو جائے — یا ہاتھ سے دل بدل کے پہلو جائے
وہ تجھ سے مصافحہ کی لذت اے دوست — جیسے کوئی چاند کی کرن چھو جائے

(54)

ہارے ہوئے ہیں تجھ سے زمانے والے — حیراں ہیں تری تھاہ نہ پانے والے
رفتار سے ہے گردش دَوراں عاجز — شاباش ہَوا کے رُخ پہ جانے والے

(55)

اعمال کے بعد کام اِک اور بھی کر — تمکینِ حیات و موت کا طور بھی کر
خوابانِ ثواب! اِس میں اِک راز بھی ہے — عاشور کے اعمال پہ کچھ غور بھی کر

(56)

معنی کی یہ اعجاز نمائی یارب — لفظوں نے بھی زباں کہاں سے پائی یارب
تو کام و دہن صوت و صدا سے ہے بری — یہ کُن کی صدا کہاں سے آئی یارب

(57)

کیا درد نے پھر قدم کو لغزش دی ہے — کیا پھر انہیں تکلیف نوازش دی ہے
سنتا ہوں کہ عرش ہل گیا ہے ان کا — کیوں پردۂ دل کسی نے جنبش دی ہے

(58)

تو ہے تری ذات ہے تو کچھ اور بھی ہے — سیدھی سی یہ بات ہے تو کچھ اور بھی ہے
اپنی ہستی میں ڈھونڈ رازِ ہستی — حساس حیات ہے تو کچھ اور بھی ہے

(59)

منہ تو نے چڑاتے ہوئے دیکھا ہی نہیں — آنکھیں تو دکھاتے ہوئے دیکھا ہی نہیں
آئے ہوئے دیکھا ہے ابھی دولت کو — بے پاؤں کے جاتے ہوئے دیکھا ہی نہیں

(60)

فطرت میں گناہ ہے کہ شامل ہے ابھی — دل پر ہو کچھ اختیار مشکل ہے ابھی
بجلی پہ حکومت ہے ہوا پر قبضہ — انسان مگر جبر کا قائل ہے ابھی

(61)

گذری ہوئی محفلوں کو رونے ہی کو ہیں — یہ سچ ہے کہ ہیں مگر نہ ہونے ہی کو ہیں
سن لو کچھ ہم سے زندگی کی باتیں — آنکھوں میں ہے نیند ہم بھی سونے ہی کو ہیں

(62)

اسرارِ حیات سر پٹکتے ہیں یہیں — کیا دونوں جہاں کے دل دھڑکتے ہیں یہیں
تاروں کی ہنسی تو دیکھ او برق جمال — جیسے تارے فقط چمکتے ہیں یہیں

(63)

ناکامیٔ تدبیر کا وسواس نہ ہو　　کتنی دشواریاں ہوں پر یاس نہ ہو
میدانِ عمل میں پاؤں اس طرح جما　　آتے رہیں زلزلے اور احساس نہ ہو

(64)

دل ہے تو نماز بھی ہے روزا بھی قبول　　دنیا بھی قبول ترکِ دنیا بھی قبول
بے درد کا جینا ہے نہ مرنا برحق　　دل میں ہے اگر درد اشارہ بھی قبول

(65)

معیاد کی تکمیل بہر طور کرو　　یاں فلسفۂ حیات پر غور کرو
ہم جاتے ہیں پھر کھلے گا بابِ زندان　　کچھ دن ابھی انتظار تم اور کرو

(66)

مرکز سے نظامِ ہوش ہٹ جائے گا　　ہر سلسلۂ خیال کٹ جائے گا
ہاتھوں کی لکیروں پہ کہاں جاتا ہے　　پردہ اُلٹا تو دل الٹ جائے گا

(67)

افسانۂ بے دار دلی چھوڑ گئے　　آوازہ درد پروری چھوڑ گئے
دل والوں پہ کچھ اجل کا قابو نہ چلا　　مرنے کو چلے تو زندگی چھوڑ گئے

(68)

تکمیلِ غمِ حیات ہوگی کہ نہیں　　آزادیٔ پئے جہات ہوگی کہ نہیں
تم دوسری دنیا کی سناتے ہو خبر　　دنیا سے کبھی نجات ہوگی کہ نہیں

(69)

مرکز کی طرف سب جزو کل جائیں گے　　اسرار نبود وبود کھل جائیں گے
یہ چاند یہ سورج یہ ستارے یہ زمیں　　شبنم کی طرح فضا میں گھل جائیں گے

(70)

ہاں اپنے گناہوں سے خجل جائے گی　　ہاں بحرِ کرم کے متصل جائے گی
کیا جانیے خاک ہوئے ستارے کتنے　　دنیا بھی اُسی خاک میں مل جائے گی

(71)

وہ حسن کہ خود حسن بھی دیوانہ ہو　　تیور ایسے کہ جن کا افسانہ ہو
بھٹکا ہوا دنیا میں فرشتہ جیسے　　حیران ہو ماحول سے بیگانہ ہو

(72)

تو کیا کرے اے مظاہر بے دردی　　قدرت نے تری آنکھ قیامت کردی
پہلے تو شبِ غم کی سیاہی گھولی　　پھر آتشِ تابناکِ انجم بھردی

(73)

بننے کی نہیں کبھی جو دم میں دم ہیں　　دو طرح کی مشکلیں ہیں دوہرے غم ہیں
ہے تیز مزاج وہ نگارِ نازک　　اور خیر سے بد دماغ شاعر ہم ہیں

(74)

دل میں طوفان دم کہاں لیتا ہے　　منزل کس رخ پہ کارواں لیتا ہے
ذرہ ذرہ ہے اک حیاتِ بے تاب　　رگ رگ میں یہ کون چٹکیاں لیتا ہے

(75)

سوتے سے جگائے گی جو تقدیر تجھے　　قدرت کرلے گی جب بغل گیر تجھے
کیا خواب عدم ہے اور کیا خواب وجود　　مل جائے گی وہ خواب کی تعبیر تجھے

(76)

کم ہوتے ہیں ایسے جنہیں غم ہوتا ہے　　یہ اور ستم بعد ستم ہوتا ہے
انساں کو جہالت سے بچائے اللہ　　اس درد کا احساس بھی کم ہوتا ہے

(77)

کیا کج نگاہ عارفانہ لے کر　　چلتا ہے مجھے ساتھ زمانہ لے کر
دم بھر جو تردود میں قدم رکھتا ہے　　قسمت بڑھتی ہے تازیانہ لے کر

(78)

وہ حسن کی زینت جسے درکار نہ ہو　　سجدہ سے جہاں نگاہ کو عار نہ ہو
اندھیر یہ کیا ہے اے نظامِ فطرت　　ایسے قالب میں روح بیدار نہ ہو

(79)

دنیا میں بہت گزر گئے ہیں ایسے — کیا پوچھتے ہو کہ جی رہے ہیں کیسے
شیریں بھی ہو مختصر بھی ہو دور حیات — اچھی طرح گایا ہوا نغمہ جیسے

(80)

دے کر یہ دماغ و دل نمایاں کرنا — علم و حکمت کو زیرِ فرماں کرنا
فطرت سے تعجب ہے یہ سب کچھ کرکے — انسان کو پھر خاک سے یکساں کرنا

(81)

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں — خوش خوش آتے ہیں خوش چلے جاتے ہیں
پھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد — کھلتے ہیں مہک دیتے ہیں مرجھاتے ہیں

(82)

اٹھا ہے نظر سے آج پردا جیسے — دیکھا ہے نیا نیا تماشا جیسے
اے صبح محبت یہ تری شادابی — تخلیق ہوئی ہے آج دنیا جیسے

(83)

دنیا تصویرِ خوف بن جاتی ہے — ہر وار پہ کانپتی ہے تھرّاتی ہے
دنیا میں اگرچہ روز آتی ہے اجل — دنیا کو نئی سی شے نظر آتی ہے

(84)

ہے رنج بہت خوشی کے لمحے کم ہیں — کیسی دنیا میں یا الٰہی ہم ہیں
ارباب حواس وہوش کا ذکر نہیں — بچوں کے لیے بھی چھوٹے چھوٹے غم ہیں

(85)

کب تک یہ سلوکِ بے محابا مجھ سے — کب تک یہ مذاقِ ذکر فردا مجھ سے
جنت کے سکون کی خبر دیتے ہو — انساں ہو تو پوچھو غمِ دنیا مجھ سے

(86)

بے حسنِ عمل ہے یہ تمنائے بہشت — کہتے ہیں کہ دنیا میں اُتر آئے بہشت
ہے میری تمھاری آرزو میں یہ فرق — میں کہتا ہوں دنیا ہی نہ بن جائے بہشت

(87)

سجتے ہیں چمن میں جگمگاتے ہوئے پھول ہر ذوق نظر کو آزماتے ہوئے پھول
جب توڑنے اٹھتا ہوں یہ آتا ہے خیال کچھ کہہ نہ اٹھیں یہ مسکراتے ہوئے پھول

(88)

نعمت ایک ایک یاد آسکتی ہے دل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سو غم تیرے اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

(89)

امید غلط عالمِ انسانی سے دو روز کے عیش تن آسانی سے
دنیا کا ہے ابتدا سے دستور یہی ہے سو کا بھلا ایک کی قربانی سے

○

قومی رباعیات

(1)

شبیرؑ نے راہِ حق میں کیا کیا نہ دیا — ہم نے ہی ثبوت کچھ وِلا کا نہ دیا
کاندھا جو ضریح کو دیا بھی تو کیا — جب بھائی نے بھائی کو سہارا نہ دیا

(2)

دو اشک بہا کے شاد و مسرور ہے تُو — افسوس کہ منزل سے بہت دور ہے تُو
ماتم کے لیے ہاتھ ہیں آزاد مگر — شبیرؑ کی پیروی سے مجبور ہے تُو

(3)

آقا سے جہانداری و دارائی لے — دامن پھیلا کے شانِ یکتائی لے
عباسؑ کی طرح زورِ احساس دکھا — میدانِ عمل میں آکے انگڑائی لے

(4)

اے مومنِ غم طراز ماشا اللہ — اے مردِ زمانہ ساز ماشااللہ
مخصوص ہے صدر میں امیروں کی جگہ — مجلس میں بھی امتیاز ماشااللہ

(5)

ملت میں کمی نہیں عزاداروں کی — بیشک ہے یہی شان وفا داروں کی
اپنی مجلس میں دیکھ اے منعمِ وقت — کتنی تعداد ہوگی ناداروں کی

(6)

کیوں قوم کے اوبار کی ہو ان کو خبر — جن کو نہیں شبہات نجاست سے مَفر
کیا ڈوبتی ناؤ کو اُبھاریں گے بھلا — جو حوض میں ڈوبے رہیں چوبیس پہر

(7)

طوفان میں اشکوں کے اُبھرنا سیکھو ماتم کی جلالت میں سنورنا سیکھو
ہاں اے غمِ شبیرؑ میں جینے والو جینا تمہیں آتا ہے تو مَرنا سیکھو

(8)

بیدرد بھی دَرد مند ہوسکتا ہے ایثار پہ کار بند ہوسکتا ہے
شبیرؑ کے اُسوہ سے کوئی لے تو سبق انسان سر بلند ہوسکتا ہے

(9)

تکلیف میں دم کسی کا بھرنا کیسا غفلت میں کوئی نفس گزرنا کیسا
ہر سانس میں ہو وردِ زباں نامِ علیؑ یہ وقت پڑے پہ یاد کرنا کیسا

(10)

ناکامیٔ تدبیر کا وسواس نہ ہو چنتون کبھی آماجگہِ یاس نہ ہو
میدانِ عمل میں پاوں اس طرح جما آجائے قیامت بھی تو احساس نہ ہو

(11)

سجادہ پہ سب گناہ لے جاتا ہے سجدوں سے معاملت کئے جاتا ہے
اے خلقِ خدا پہ ظلم کرنے والے کس منہ سے خدا کے سامنے جاتا ہے

(12)

دولت ہے بدستور ستم ڈھائے ہوئے بیٹھے ہیں غریب رنج وغم کھائے ہوئے
دنیا میں جگہ میں کھڑے ہونے کی کچھ لوگ پڑے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے

(13)

دولت یونہی دنیا کی ہَوا کھاتی ہے آتی ہے کہیں سے اور کہیں جاتی ہے
میرے تو نصیب کا دیا بُجھ ہی گیا کو تیرے چراغ کی بھی تھرّاتی ہے

(14)

افلاس پہ مامور نظر آتا ہے مرکز سے بہت دور نظر آتا ہے
دستور بدل گیا حکومت بدلی مزدور بدستور نظرآتا ہے

(15)

انسان کی جنسِ خام کہلاتے ہیں ناقابلِ احترام کہلاتے ہیں
سیدھے سچّے جری جفا کش مزدور کیا ظلم ہے یہ عوام کہلاتے ہیں

(16)

تو قوم کی اصلاح پہ آمادہ ہے یا شہرتِ تحریر کا دلدادہ ہے
نغموں کا یہ انبار مضامین کی پوٹ بکواس ہے جب دل کا ورق سادہ ہے

(17)

الفاظ عمل تک پہنچتے اے کاش اب تک ہے وہی جدید نوحوں کی تلاش
اب سبطِ پیمبرؐ کی صفِ ماتم پر یا قوم کی تنظیم ہو یا قوم کی لاش

(18)

کس کام کے ہیں یہ بندہ پرور جلسے یہ قوم کے جلسے سے تونگر جلسے
بھوکے مرتے ہیں کتنے مفلس و مجبور ماتم ہے گھروں میں اور باہر جلسے

(19)

صدیوں سے مصیبت میں گرفتار ہیں ہم حق ہے کہ مساوات کے حقدار ہیں ہم
بے جا ہے یہ توڑ پھوڑ لیکن اے دوست مزدور نہیں وطن کے معمار ہیں ہم

(20)

غفلت میں اگرچہ قوم سوتی ہے ابھی ساقی تیرا نام لے کے روتی ہے ابھی
گردش میں تیرا جام ولا ہے اب تک پوجا تیری تلوار کی ہوتی ہے ابھی

(21)

یہ شانِ ولا اے دلِ ناکام نہیں اب تک بھی اخوت کی روش عام نہیں
عترت سے محبت کا ہے دعویٰ لیکن آپس میں محبت کا کہیں نام نہیں

(22)

پھر ذلّت عاجزی کا پابند ہوا پھر عیب خوشامد کا ہُنر مند ہوا
پھر لے کے چلی غرض کسی کے در پر ایک اور اضافۂ خداوند ہوا

(23)

مجلس کو نہ اِک نقشِ سادہ سمجھو　　مفہومِ عزا کو بالارادہ سمجھو
منت کا جو پہنا ہے کلاوہ تم نے　　مولا کی اطاعت کا قلادہ سمجھو

(24)

مجلس میں گئے بزم فضائل دیکھی　　سو بار مسالمہ کی محفل دیکھی
جس دَرد کی منزل میں ہُوا اپنا گذر　　بیدردیِ ذاتیات شامل دیکھی

(25)

کیوں نشۂ ہستی کسی عنوان چڑھے　　نخوت کی بلندی پہ نہ انسان چڑھے
اے میرے علَم بدوش یہ مانگ دُعا　　سایہ میں علم کے قوم پروان چڑھے

(26)

افطار و سحر کے وقت کچھ کھالیتا　　تاویل سے احباب کو سمجھا لیتا
دولت ہوتی اگر تو اُجرت دے کر　　روزہ کسی مزدور سے رکھوا لیتا

(27)

سب شرع کے حکم قابلِ غور نہیں　　کیا دَور یہ غور و فکر کا دَور نہیں
تیرے لیے بس نماز روزہ کے سوا　　اے دوست فروع دین کچھ اور نہیں

(28)

آپس کے تعلقات مذہب میں نہیں　　شاید یہ تصورات مذہب میں نہیں
تیرے لیے ہے نماز و روزہ مذہب　　دنیا کے معاملات مذہب میں نہیں

(29)

دل بھی ہو اصول پر ذرا مشکل ہے　　دل چار طرف ہے اور آخر دل ہے
اتنی تو ہمیں بھی عدل سے ہے نسبت　　عدل اپنے اصولِ دین میں شامل ہے

(30)

علم و دولت کے بت سجا رکھے ہیں　　سر سجدۂ ناحق میں جھکا رکھے ہیں
ملت کو ہے کیا خدائے واحد سے غرض　　اُس نے دو دو خدا بنا رکھے ہیں

(31)

آرائشِ صورت و قیافہ کرلو　　تیار کوئی اور لفافہ کرلو
ہر ایک گناہِ نو کی تکمیل کے بعد　　سامانِ تقدس میں اضافہ کرلو

(32)

تقلید ہوئی نہ حشر سامانوں کی　　سرباز و نظر بلند انسانوں کی
انصارِ حسینؑ کی روش پر نہ چلے　　راہیں پامال کیں عزا خانوں کی

(33)

اشعار پہ واہ واہ کرنا ہے ہمیں　　افسانۂ غم پہ آہ کرنا ہے ہمیں
مجلس کا ہوا کبھی نہ مقصد پورا　　مجلس سے فقط نباہ کرنا ہے ہمیں

(34)

گھر کے قصوں میں وقت کھویا کچھ دیر　　پھر ذکرِ حسینؑ سُن کے رویا کچھ دیر
مجلس میں گزر گئی بہرحال اچھی　　جاگا کچھ دیر اور سویا کچھ دیر

(35)

ایمان غمِ کربلا پہ لائے ہوئے ہیں　　انصار اگرچہ دل پہ چھائے ہوئے ہیں
وہ خلعتِ زیست موت کو دے کے گئے　　ہم زیست کو بھی موت بنائے ہوئے ہیں

(36)

جذبات بلند ہیں نہ احساس قوی　　ایسی نسبت اور ایسی بیگانہ روی
کس زعم پہ اپنے کو سمجھتا ہے تو　　وابستۂ ''خانوادۂ مرتضوی''

(37)

جب قوم پہ وقت آپڑے مشکل کا　　ایثار دکھا حسینیوں کے دل کا
دنیا پہ کھلے گی یہ حقیقت اُس دن　　تو مرد ہے طوفان کا یا ساحل کا

(38)

اب صاحبِ دل کہاں قرینے والے　　طوفان بھی لے گئے سفینے والے
مرنے جینے کی رسم جاری ہے فقط　　مرنے والے رہے نہ جینے والے

(39)

کیا مالکِ اشتر نے جھنجوڑی ہیں صفیں
ہر جنگ میں صاف کر کے چھوڑی ہیں صفیں
تیرے لیے ہے نفس کا میدانِ جہاد
کچھ تو نے برائیوں کی توڑی ہیں صفیں

(40)

ہر گوشۂ قلب میں لیے وسعتِ خیر
حسّاس نگاہوں سے کرو دین کی سَیر
پھر ہو وہی عزم و استقامت حاصل
پھر قوم میں پیدا ہوں ''سعید'' اور ''زہیر''

(41)

ٹھہریں نہ ہوا کے آبگینے پہ قدم
دم بھر نہ رکیں فلک کے سینے پہ قدم
لے نامِ علیؑ اور سرِ عرش پہنچ
رکھ کر مہ خورشید کے زینے پہ قدم

(42)

ہر فکر و نظر میں انقلاب آتا ہے
تشبیہ و تماثیل کا باب آتا ہے
اس وقت بھی تجھ کو یاد آتی نہیں موت
جب وقتِ غروب آفتاب آتا ہے

(43)

کس طرح بدل گیا یہ معیارِ حیات
کیوں سرد ہوئی گرمیِ بازارِ حیات
جس قوم نے سرکی مہمِ کرب و بلا
اُس قوم میں ملتے نہیں آثارِ حیات

(44)

شبیرؑ کا دَردِ دل سنانا ہے تجھے
سوتی ہوئی دنیا کو جگانا ہے تجھے
تو آپ ہی انسان ابھی تک نہ بنا
انسان کو انسان بنانا ہے تجھے

(45)

سنبھلے گی نہ اپنی حالتِ زار کبھی
چونکیں گے نہ غفلت سے عزادار کبھی
شبیرؑ سے درس غیر قوموں نے لیا
قربانیاں جاتی نہیں بے کار کبھی

(46)

محفل میں نشہ مئے تولّا کا چڑھا
خیبر کی خبر سُن کے درود اور پڑھا
راہیں کیا کیا علیؑ کی سیرت سے ملیں
دِل نعرۂ صلوات سے آگے نہ بڑھا

(47)

کس دن کے لیے راہِ محبت پہ چلا — سانچے میں نہ تو صبر و قناعت کے ڈھلا
اپنی تنخواہ کی کمی پر شکوہ — افلاس پہ اہلبیتؑ کے صلِ علیٰ

(48)

اٹھا نہ قدم عمل کا بڑھنے کے لیے — ہمت کی بلندیوں پہ چڑھنے کے لیے
مولاؑ کا ہر اک معرکۂ علم و عمل — سنتے رہے ہم درود پڑھنے کے لیے

(49)

آنکھوں میں تری زبان پر صلِ علیٰ — جذبہ کوئی اِن حدوں سے آگے نہ چلا
اللہ وہی قوم ہو سب سے پیچھے — جس قوم میں ہو معرکۂ کرب و بلا

(50)

کس برتے پہ حیدری تو کہلاتا ہے — اپنی ہستی میں کیا جھلک پاتا ہے
تیرا دل بھی نہیں ہے تیرے بس میں — مغرب سے وہ آفتاب پلٹاتا ہے

(51)

آقا سے جہانداری و دارائی لے — دامن پھیلا کے شانِ یکتائی لے
عباسؑ کی طرح زورِ احساس دکھا — میدانِ عمل میں آکے انگڑائی لے

(52)

ساکن ہو دلوں میں نہ تکدّر کی طرح — مذموم نہ بن لفظِ تنفّر کی طرح
آفاق میں حریت کو بدنام نہ کر — آزادی کی سانس لے مگر حُر کی طرح

(53)

ہاں سرِّ خفی نصِ جلی کہہ کے اُلٹ — اے صاحبِ زور ازلی کہہ کے اُلٹ
کیا صرف کتابوں کے اُلٹتا ہے ورق — دنیا کا ورق بھی یا علیؑ کہہ کے اُلٹ

(54)

اے سینہ شگاف غم اُٹھانے والے — اے درد بدل قدم اُٹھانے والے
آلودۂ خونِ حق شعاری تو نہیں — یہ ہاتھ جو ہیں علَم اُٹھانے والے

(55)

عباسؑ کے نام کا اُٹھاتے ہیں علَم　　کھاتے ہیں اُسی جری کی ہر بار قسم
اتنا تو سبق اُس کی شہادت سے لیا　　اس سے بڑھ کر اب اور کیا کرتے ہم

(56)

ایسی ہے نہ قیصر کی نہ فغفور کی شب　　سرمایہ پرست کی نہ مزدور کی شب
احساس ہو قوم میں تو دن پھیر نہ دے　　ہجرت کی یہ رات اور یہ عاشور کی شب

(57)

ایسا تھا کہاں شمع سرِ طور کا دن　　جلوہ سے قریب کا ہویا دور کا دن
وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں　　جس قوم کے ورثہ میں ہو عاشور کا دن

(58)

منعم ہے تو یہ آتش افلاس بجھا　　اُٹھ اپنی غریب قوم کی پیاس بُجھا
تو شمع جلاتا ہے عزا خانوں میں　　للّٰلہ نہ اپنی شمع احساس بُجھا

(59)

مجلس واجب ہے، تم پہ ماتم واجب　　ہر حال میں شبیرؑ کا ہے غم واجب
شبیرؑ نے سر دیکے بچایا ہے جسے　　اس قوم کی خدمت ہے بہت کم واجب

(60)

گوشہ میں وہ دولت کا خزینہ دیکھو　　ماتھے پہ وہ علم کے پسینہ دیکھو
ہے ان کے خلاف شان ماتم کرنا　　حلقہ سے الگ دست بسینہ دیکھو

(61)

تکمیل نیاز و نذر کرلیتے ہیں　　اس راہ میں قرض بیشتر لیتے ہیں
بھوکوں کو نوالہ نہیں ملتا لیکن　　سب پیٹ بھرے ہی پیٹ بھرلیتے ہیں

(62)

یوں حال غریبوں کا سدھر سکتا ہے　　ڈوبا ہوا حوصلہ اُبھر سکتا ہے
منعم ہے تو کر قوم کی عسرت کا علاج　　حصّہ مجلس کا پیٹ بھر سکتا ہے

(63)

کیا پھرتا ہے دامن کو سنبھالے بندے
تقدیس کی آغوش کے پالے بندے
بندہ ہے تو اللہ کے بندوں کو نہ بھول
اللہ کی یاد کرنے والے بندے

(64)

افطار کے سامان سے مطبخ بھر جائے
جو زیرِ گلو جائے وہ لقمۂ تر جائے
ہوتی نہیں ایسے روزہ داروں کو خبر
فاقہ سے اگر کوئی پڑوسی مرجائے

(65)

حیرت ابھی واقفِ اسرار نہیں
تفسیرِ مودّت سے خبردار نہیں
مانا شبِ عاشور میں بیدار ہے تو
بیداری کے مفہوم میں بیدار نہیں

(66)

مفہوم شہادت کو بھلادے ملت
مجلس کو بھی اک رسم بنادے ملت
تقریر کا آج کوئی معیار نہیں
منبر پہ جسے چاہے بٹھادے ملت

(67)

رکتے ہیں بھلا ہمّتِ کامل والے
منجدھار میں سب کود پڑے دل والے
جیسے کوئی زندگی کے دن گنتا ہے
لہریں گنتے کھڑے ہیں ساحل والے

(68)

دل میں ترے درد کی بھی لے ہے کہ نہیں
کردار میں ملتی ہے کوئی شے کہ نہیں
ہے حب علیؑ سفینہ نوح مگر
تیری بھی سفینہ میں جگہ ہے کہ نہیں

(69)

آنسو تو بہت آنکھ کے پیمانے میں
کیا رنگ ہے زندگی کے افسانے میں
دل بھی ترا پاک ہے، زباں بھی طاہر
یہ دیکھ کے پاؤں رکھ عزا خانے میں

(70)

حسرت ہے اگر تجھے یہ ادراک نہیں
جامہ کی بساط کیا جو دل پاک نہیں
تو رونقِ منبر ہو کہ ہو خاک نشیں
کردار ہے اصل چیز پوشاک نہیں

(71)

ہے رفعت نفس کا سبب بیداری — زیبا ہے پر اس طرح سے کب بیداری
دل میں زرویم لب پہ اللہ غنی — اے عامل بت سازی و شب بیداری

(72)

اچھی سحری لذیذ تر افطاری — ہر روز ہو عیش صوم کی تیاری
احکامِ شریعت جو سمجھنے بھی نہ دے — ایسی دولت سے ہے بھلی ناداری

(73)

زندہ قوموں کے یوں نشاں ملتے ہیں — ابھرے ہوئے نقشِ رفتگاں ملتے ہیں
یوں ذکر علیؑ کا اہل عالم سے کرو — سب چیخ اٹھیں علیؑ کہاں ملتے ہیں

(74)

ہم نے مانا ابھی سویرا ہے بہت — غفلت کی نوازشوں نے گھیرا ہے بہت
اٹھ حسنِ عمل کی شمع روشن لے کر — جانا ہے جدھر تجھے اندھیرا ہے بہت

(75)

ہستی کی نمود کچھ تماشا تو نہیں — تو ایک ہی اللہ کا بندہ تو نہیں
کس کس کے حقوق تجھ پہ ہیں غور تو کر — دنیا میں ترا وجود تنہا تو نہیں

(76)

جو خدمتِ خلق عمر بھر کرکے گیا — تکلیف محبت میں بسر کرکے گیا
اُس کے لیے ہے موت بھی پیغامِ حیات — وہ معرکۂ حیات سر کرکے گیا

(77)

تو زورِ حیات آزمانے کا نہیں — یوں بزمِ عمل میں بار پانے کا نہیں
قومیں حق مانگتی ہیں شمشیر بکف — تجھ کو یارا زباں ہلانے کا نہیں

(78)

جب تک مری زباں میں کس ہے سن لے — جب تک سننے پہ تیرا بس ہے سن لے
سنسار کو سکھ ملا ہے میرے دکھ سے — میرے دکھ میں پریم رس ہے سن لے

(79)

اب تک وہی نخچیریٔ و صیادی ہے　　اب تک وہی تفرقوں کی ناشادی ہے
باتیں تو بہت کچھ ہیں عمل ہے محدود　　اس دور میں تقریر کی آزادی ہے

(80)

ملت پہ عجیب بے حسی طاری ہے　　کیا نام کی زندگی وبیداری ہے
ہم سایہ ہیں یوں مفلسی و بے خبری　　فاقے ہیں کہیں اور کہیں افطاری ہے

(81)

ایمان کی بہار لے کے عید آئی ہے　　روزوں کا نکھار لے کے عید آئی ہے
نا محرمِ راز عید تیری خاطر　　اک قرض کا بار لے کے عید آئی ہے

(82)

ہر ذرّے سے اک سحاب پیدا کردے　　ہر قطرہ سے آفتاب پیدا کردے
آتا ہے تیرا حسینؑ سا مردِ عمل　　جب چاہے تو انقلاب پیدا کردے

(83)

شبیرؑ نے راہِ حق میں کیا کیا نہ دیا　　ہم نے ہی ثبوت کچھ ولا کا نہ دیا
کاندھا جو ضریح کو دیا بھی تو کیا　　جب بھائی نے بھائی کو سہارا نہ دیا

(84)

اک خواب و خیال کوثر آشامی ہے　　جذبات کا مدوجزر ہنگامی ہے
مجلس سے نکل کے رخ کدھر ہے یہ دیکھ　　غافل ابھی تشنگی میں کچھ خامی ہے

(85)

مانا کہ دماغ عقل برساتا ہے　　ہمت سے زمیں زیر نگیں لاتا ہے
میرے لیے اے کارکنانِ قدرت　　دل لاؤ جو تاج و تخت ٹھکراتا ہے

(86)

اک حسرتِ بے پناہ پیدا کرلے　　آنکھیں نہ سہی نگاہ پیدا کرلے
غافل عذر شکستہ پائی کیسا　　بے پاؤں کے چل وہ راہ پیدا کرلے

(87)

جینا ہے تو مرجانے کا آہنگ رہے　　حق کے لیے باطل سے سدا جنگ رہے
جادہ ہو وفا کا عشق ہو راہ نما　　دو روز کی زندگی ہے ست سنگ رہے

(88)

اعجاز نہیں حضور رس ہو جانا　　آوارۂ جادۂ ہوس ہو جانا
تو بالِ ہما تو ہے پر اتنا سُن لے　　آساں ہے بہت پرمگس ہو جانا

(89)

رُکتے ہیں کہیں ہمّتِ کامل والے　　منجدھار میں سب کود پڑے دل والے
جیسے کوئی زندگی کے دن گنتا ہو　　لہریں گنتے کھڑے ہیں ساحل والے

(90)

زردار تکلّف کے سوا کیا جانیں　　مزدور کی زیست کا مزا کیا جانیں
کھانا پینا نظام اوقات پہ ہے　　جو پیٹ بھرے ہیں اشتہا کیا جانیں

(91)

نادان ہے جو مفلسی کا غم کھاتا ہے　　سُن میرا مشاہدہ جو فرماتا ہے
دولت آتی ہے جب کسی کے گھر میں　　شیطان آتا ہے اور خدا جاتا ہے

(92)

اب اور ہی نقشا نظر آتا ہے مجھے　　کچھ رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے
نزدیک ہو یا دور ہو طوفان کوئی　　بڑھتا ہوا سایا نظر آتا ہے مجھے

(93)

ہنگامۂ بیدار دلی چھوڑ گئے　　آوازۂ درد پروری چھوڑ گئے
دل والوں پہ کچھ اجل کا قابو نہ چلا　　مرنے کو چلے تو زندگی چھوڑ گئے

○

بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے
زمیں پہ جس کے لیے چاندنی اتر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

کسے گلہ ہے حریفوں کی مسکراہٹ کا
ہمیں تو خود بھی ہنسی اپنے حال پر آئی

خدا ہی خیر کرے بے ضرر جہالت کا
بشر کے علم کی تلوار باڑھ پر آئی

کسے نصیب ہے مقتل کا آئینہ خانہ
وہ چنچلوں کی جوانی تھی بن سنور آئی

زہے سلیقہ فطرت جہاں بھی آئی ہے
نویدِ امن بہ تقریب شور و شر آئی

ہماری فکر کا انداز دیکھ کر اے نجم
فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اتر آئی

(97)

بیٹھے ہو کب سے منہ کو موڑے
نام بڑا اور درشن تھوڑے

سوئے ہوئے سے جاگے ہوئے ہیں
کون جگائے کون جھنجھوڑے

کون بلا تھی آس نہ ٹوٹی
اس کی گلی میں پاؤں بھی توڑے

آپ کی کرپا بھی ہے نرالی
دل ہیں کہ جیسے پکے پھوڑے

پریم کا بندھن ٹوٹے کیوں کر
جان چھڑالیں ہاتھ تو چھوڑے

دل کو نہ سمجھو مفت کا سودا
کس نے اپنے ہاتھ مروڑے

نجم یہ اچھی پریم کتھا ہے
دل کے پھپھولے اور نہ پھوڑے

(98)

اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی
کہاں گم ہوگئی وہ شاہراہِ زندگی اپنی

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے
بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

بدلنا ہی پڑا ہم کو بساط دہر کا نقشہ
یہ سمجھے تھے بدل جائے گی حالت آپ ہی اپنی

زہے قسمت اسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

کبھی ترمیم کر لیتے ہیں احکامِ شریعت میں
ابھی حد نا خدائی ہے خدا کی بندگی اپنی

ادھر بھی دیکھ لینا اک نظر دورِ سحر والو
چراغ صبح لے کر جارہا ہے روشنی اپنی

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا
وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

(99)

بہت بڑھ چلی زندگانی ہماری
کہاں رہ گئی تو جوانی ہماری

محبت نے روکا وفا نے سنبھالا
فرشتوں نے کی پاسبانی ہماری

نہ سمجھے وہ دردِ محبت ہمارا
ہمیں تک رہی مہربانی ہماری

دو عالم تصدق ترے چشمِ نم پر
سنی ہے کسی سے کہانی ہماری

محبت میں روتے ہیں اور جی رہے ہیں
یہ دل اور یہ سخت جانی ہماری

یہ چتون مبارک یہ تیور سلامت
اسی روپ میں تھی جوانی ہماری

حکومت ہے جن کی یہ تجم ان سے کہہ دو
کبھی تھی یہ دنیائے فانی ہماری

(100)

نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا
یہ جلال و جبر دیکھو اسے مان لے زمانا

مجھے اس روش سے دنیا کی بڑا سکوں ملا ہے
مرے غم کو غم نہ سمجھا مرے دل کو دل نہ جانا

میں ہزار ظلم سہہ کر بھی وفا کا درس دوں گا
مرے عشق پر ہے واجب تمھیں آدمی بنانا

جو زمانہ کی روش پر ابھی ناز کر رہے ہیں
وہ پلٹ کے دیکھتے ہیں تو بدل گیا زمانا

انھیں اپنے دل سے بڑھ کر مرے دل کی قدر ہوتی
کبھی زندگی میں ہوتا جو نصیب چوٹ کھانا

میں گزر تو کر رہا ہوں ابھی درگزر سے لیکن
مرا ہاتھ ہوگا کاری جو پڑے گا ہاتھ اٹھانا

مری زندگی سے اب بھی ترا فاصلہ بہت ہے
مرے دل تک آنے والے مرے دردِ دل تک آنا

یہ بہت بلند منزل ہے میرے شعورِ غم کی
کبھی مسکرا کے رونا کبھی رو کے مسکرانا

مجھے آرزوے نغمہ نہ غمِ تلاشِ مطرب
مرے عشق معتبر کا ہے نفس نفس ترانا

دلِ اہلِ معرفت کو ہے سخن عزیز میرا
مجھے مسند صدارت پہ جگہ نہ دے زمانا

(101)

کہوں گا کچھ نہ قلبِ ناتواں کی
یہ منزل ہے فریبِ دوستاں کی

کہاں کی رہ گزر منزل کہاں کی
چھٹی جاتی ہیں نبضیں کارواں کی

چمن کی آبرو محفوظ رہتی
لٹا دیتے جو دولت آشیاں کی

ابھی ربطِ جبین و آستاں کیا
یہ سجدہ بھی کڑی ہے درمیاں کی

انھیں آیا نہ طرزِ بندگی بھی
خدائی اور خداوندی کہاں کی

گزرتی ہے یہ جس پر اس سے پوچھو
قیامت ہے خموشی نکتہ داں کی

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم
تمھیں کیا قدر ہو اردو زباں کی

فقیرِ رہ گزر کا پوچھنا کیا
زمیں زیرِ قدم ہے کل جہاں کی

مکاں میری نظر میں کیا سمائے
میں وسعت دیکھتا ہوں لامکاں کی

(102)

زمیں بوئے خوں سے مہکتی رہی
ستاروں کی چھاتی دھڑکتی رہی

زبانوں سے اغماض کرتے رہے
نگاہوں میں دنیا کھٹکتی رہی

بہت کام انسان نے بے جا کیے
بہت عقل انساں جھجکتی رہی

قوانین فطرت نہ بدلے گئے
خرد زور کر کرکے تھکتی رہی

بہت حکمتوں سے سنوارا مگر
نگاہوں سے وحشت ٹپکتی رہی

صداقت کی آنکھیں بھی جھجکی نہیں
سیاست کی بجلی چمکتی رہی

قدم جادۂ زہد ہی پر رہے
نظر دشمنوں کی بہکتی رہی

وہ فکرِ سخن کا نشیمن گیا
کہ بلبل نہ تھی اور چہکتی رہی

مسیحا نفس بن گیا آدمی
مگر آدمیت سسکتی رہی

مرے منہ سے جھڑتے رہے پھول حجم
زباں شاخ گل سی لچکتی رہی

(103)

زخم دل زخم زباں سب سہہ گئے
وقت کے مارے ہوئے چپ رہ گئے

آپ کی دریا دلی بھی دیکھ لی
کتنے دریا آنسوؤں میں بہہ گئے

دے رہے تھے بے عمل درس عمل
ہم بھی سب سن کر سمجھ کر رہ گئے

بے زبانی بھی زباں بن کر رہی
کچھ نہ کہنا تھا مگر کچھ کہہ گئے

حرف حق برداشت کے قابل نہ تھا
کتنی چوٹیں تھیں جو ناحق سہہ گئے

غفلت امروز کے سیلاب میں　　کل کے سارے کارنامے بہہ گئے
تجمّ ہم نکلے جو ارضِ تاج سے　　خسروِ بے تاج ہوکر رہ گئے

(104)

خوب بیٹھے ہیں بہم سمجھے ہوئے　　ہم کو تم اور تم کو ہم سمجھے ہوئے
ناسمجھ بھی ہیں یہ غم سمجھے ہوئے　　امتیازِ بیش و کم سمجھے ہوئے
دیر تک وہ بیٹھ کر سمجھا گئے　　دیر سے بیٹھے ہیں ہم سمجھے ہوئے
جادۂ خیر البشرؐ سے دور ہیں　　مسلکِ خیرؐ الامم سمجھے ہوئے
اللہ اللہ آدمی کی بے بسی　　جی رہا ہے غم کو غم سمجھے ہوئے
وہ براہ فخر ہیں اہل دول　　کیا تجارت کو کرم سمجھے ہوئے
وہ زیادہ سے زیادہ ہوں اگر　　جن کو تم ہو کم سے کم سمجھے ہوئے
تجمّ کتنے ہوں گے عرقی کی طرح　　نشتر لا و نعم سمجھے ہوئے

(105)

گھر میں خزاں کا دور چمن میں بہار ہے　　اب اے دلِ غیور تجھے اختیار ہے
میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے　　کیا اس سے بڑھ کے اور دلیل بہار ہے
ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گزر چکے　　اب وہ ہیں ان کا وقت ہے اور اعتبار ہے
یارب حسین پھولوں کی غنچوں کی خیر ہو　　سنتے ہیں باغباں کو غرورِ بہار ہے
یہ سوچتے ہیں عیش جنھیں راس آگیا　　باقی خدا کے بندوں کو غم ساز گار ہے
میں فرش میکدہ پہ بھی ہوں مثل بوئے گل　　واعظ غریب مسند ومنبر پہ بار ہے
کچھ کرلیا اسی نے جو یہ سوچ کر اٹھا　　میری ہے جیت سارے زمانے کی ہار ہے
کچھ دل پہ جبر کرنے کی عادت بھی ڈال لیں　　کل ہو نہ ہو جو آج انھیں اختیار ہے
درکار شت و شو میں ہو کتنا لہو ابھی　　کیا جانے ان کے دل میں کہاں تک غبار ہے

(106)

وقت کی پرستش کیا آدمی کا مذہب کیا　　ملت مہذب کیا قوم نا مہذب کیا

موت کے سوا اب ہے زندگی کا مطلب کیا
دل ٹٹولنے والے دل میں رہ گیا اب کیا

نظم اگر ہے عالم کا بے شعور ہاتھوں میں
فطرتِ منظم کیوں جلوۂ مرتب کیا

کچھ فضا بدلنے دو بے بسی کو ٹلنے دو
یاد آنہ جائیں گے پھر گناہ کے ڈھب کیا

اپنی زندگی کو جو زندگی سمجھتے ہیں
وہ غریب سمجھیں گے زندگی کا مطلب کیا

ہیں بڑے بڑے دعوے اب تو مہربانی کے
جی گئے تو دیکھیں گے مر گئے تو مطلب کیا

اور بھی کوئی مذہب ہے سوا محبت کے
میرا ہے یہی مذہب پوچھتے ہو مذہب کیا

کچھ مری خموشی سے فائدہ اٹھا لیجئے
آپ کو بھی آتے ہیں بات چیت کے ڈھب کیا

جان بھی نہیں اپنی اور کون اپنا ہو
میرے پاس ہے اب کیا میرے پاس تھا جب کیا

اک نگاہ میں آخر کیسی عذر خواہی تھی
دل میں تھے گلے کتنے ختم ہو گئے سب کیا

تجمّ سوچتا ہوں میں کچھ مجھے سکوں دے گی
چاندنی کی بارش میں یہ ڈھلی ہوئی شب کیا

یوں تو سو بہانے ہیں تجمّ کچھ نہ کرنے کے
قصد ہے تو کر ڈالوں آج کل اور اب تب کیا

(107)

تبسم ہو کہ آنسو چشمِ تر میں
ہم ہی ہم ہیں زمانے کی نظر میں

جہاں وسعت ہوئی فکر و نظر میں
بڑھے کچھ اور آنسو چشمِ تر میں

محبت کے جہاں معبد بنے ہیں
ہمارا خون ہے دیوار و در میں

غرورِ کارواں سے کوئی کہہ دے
بہت مارے پڑے ہیں رہ گزر میں

خبر کیا خانہ بربادوں کی تم کو
خدائی ہے خداوندی ہے گھر میں

شبِ غم رنگ لائی جاتے جاتے
لگادی آگ دامانِ سحر میں

جفا ہو اپنی حد پر یا وفا ہو
بہت کم ہے محبت کی نظر میں

اجل آنے سے پہلے کچھ نہ سمجھے
بہت کچھ تھا حیاتِ مختصر میں

(108)

زورِ سخن سے اک جہاں روز بنا بنا دیا
میں نے ہی خود ہزار بار اپنا غرور ڈھا دیا

پاؤں تلے سے ناگہاں کیسی زمیں نکل گئی
کس کو مٹا رہے تھے تم کس نے تمھیں مٹا دیا

ان کے چراغ مہر و مہ میرے بغیر کچھ نہیں
رونقِ آب و رنگ ہے میری نگاہ کا دیا

شانہ بلا زمیں ہلی کانپ گئے دماغ و دل
عمرِ ستم دراز ہو آج مجھے جگا دیا

نظمِ حیات ہے یونہیں سلسلۂ حیات میں
مجھ کو کسی سے کیا ملا میں نے کسی کو کیا دیا

سختیِ راہ ایک تھی میرے تمھارے واسطے
جس کا تھا دل بڑھا ہوا اس نے قدم بڑھا دیا

نجم خدا سے آج تک راست معاملت نہیں
بندۂ در اسی کا ہوں جس نے مجھے جگا دیا

(109)

عشق تھا حسن کارساز ان کا
آج کہہ دیں گے ان سے راز ان کا

بے نیازی سے یوں بھلا بیٹھے
جیسے تم تھے جواب ناز ان کا

نالہ نالہ جنون دل میرا
نغمہ نغمہ سکون ساز ان کا

کیا تصور بھی ان کے بس کا نہیں
آئینہ لا شبِ دراز ان کا

آپ بیتی نہیں حقیقت بھی
مرحبا فتنۂ مجاز ان کا

چپ ہوں لیکن یہ خامشی کب تک
ہر کلی تھی چمن میں راز ان کا

عشق اس دن سے کفر کہلایا
جب سے میں ہوں شریکِ نازان کا

دل بہت اہلِ دل کے توڑے ہیں
کیا فسانہ ہے جانگداز ان کا

نجم ہر شعر میں ترنم ہے
آج شاعر ہے نے نواز ان کا

(110)

راہِ وفا کے راہی کچھ ہم سفر بنالے
مشکل یہ مرحلہ ہے آساں مگر بنالے

میں تو یہ چاہتا ہوں اپنا اسے بنالوں
یوں ہی سہی وہ مجھ کو اپنا اگر بنالے

جادے کی جستجو کیا کیسی تلاشِ رہبر
منزل کر اک معین اک رہ گزر بنالے

دنیا بنا کے لے گا کیا دورِ زندگی میں
میں دل بنا رہا ہوں تو دل میں گھر بنالے

یہ زشت و خوب دونوں مجبور زندگی ہیں
تو اپنی ہر نظر کو لطفِ نظر بنالے

دنیا کے معرکوں میں فاتح رہے گا اکثر
ذہنی لطافتوں کو تیغ و سپر بنالے

کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیل
تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنالے

حملے مسرتوں کے چاروں طرف سے ہوں گے
اے غم نواز غم کو پائندہ تر بنا لے

کب تک رہیں گے آخر شام و سحر کے شکوے
تو جیسے چاہتا ہے شام و سحر بنا لے

ہر عیب سے ہے مشکل دامن بچا کے چلنا
جس عیب کی ہوس ہو اس کو ہنر بنا لے

پھر دو جہاں بھی تیرے کون و مکاں بھی تیرے
اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنا لے

تن میں بھی چاہتا ہے من کا اگر اجالا
داغوں کو اپنے دل کے شمس و قمر بنا لے

اتنا تو زندگی پر ہے اختیار تجھ کو
آسان تر بنا لے دشوار تر بنا لے

اے تجم ہر جگہ کچھ درکار ہے سلیقہ
زنداں میں بھی ہو کچھ دن رہنا تو گھر بنا لے

بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے
وہ پیرہن ہوں جو یوسف کو کھو کے ناز کرے

نہ اقتدارِ دو روزہ پہ کوئی ناز کرے
کسے خبر ہے وہ کل کس کو سرفراز کرے

خدا جو اہلِ مصیبت سے سرفراز کرے
غریب عشق نہ کیوں درد دل پہ ناز کرے

کھڑا ہوں آئینہ خانہ میں ہاتھ پھیلائے
جہاں میں کیا کوئی دستِ طلب دراز کرے

ہر انقلاب کا ساتھی ہر اقتدار کا دوست
تغیرات کا غم کیوں زمانہ ناز کرے

جو سوچتا ہوں وہ دنیا سے کہہ نہیں سکتا
خدا کسی کو نہ یوں مبتلائے راز کرے

کہیں نہ دل کی طہارت میں فرق آجائے
نظر نہ جانب گل کوئی پاکباز کرے

وہ زور ہے کہ پنپتی نہیں حقیقت بھی
بجا ہے ناز اگر فتنۂ مجاز کرے

خدا کے بندوں کا بندہ ہے جو خدا کا نہیں
بہت غرور نہ پروردۂ نیاز کرے

جو ایک آنچ محبت کو سہہ نہیں سکتا
وہ کیوں زبان سے تفسیرِ سوز و ساز کرے

کسی میں جان ہے جو ٹوک دے مشیت کو
کرم اگر غمِ عصیاں پہ غم نواز کرے

سکونِ دل سے تمنا ہے ایک سجدہ کی
خدا نصیب اگر فرصتِ نماز کرے

اٹھوں گا اپنے ہی بل پر اگر اٹھا زندہ
نہ میرے حال پہ احسان چارہ ساز کرے

کسی کو تجم خوشی ہو تمہارے غم سے اگر
دعا کرو کہ خدا عمرِ غم دراز کرے

112

کیوں اے فضائے درد کہیں دل نہیں رہا
کیا امرِ حق کو خطرۂ باطل نہیں رہا

دل مرکزِ جمال کے قابل نہیں رہا
جب عشق کا شعور ہوا دل نہیں رہا

سجدہ بھی اب تو ان کے مرے درمیاں نہیں
اک یہ بھی نقطۂ حدِ فاصل نہیں رہا

میں نے عمل کی راہ میں ناکامیاں سہیں
تخئیل کامیاب کا قائل نہیں رہا

ہر سر پہ ایک تاج رعونت ہے جلوہ گر
جب سر کسی کا تاج کے قابل نہیں رہا

پہنچا رہِ طلب میں وہ منزل پہ بے تکاں
جس کو خیال دوریٔ منزل نہیں رہا

کیا مسکرا کے موت کی دیتے ہو تم خبر
میں کچھ دنوں سے زیست کا قائل نہیں رہا

وہ کاروانِ عشق سے کس دن الگ رہے
میں کب فضائے حسن میں شامل نہیں رہا

مانگی ہے ان سے موت نہ مانگی تھی زندگی
دامن کبھی یہ دامن سائل نہیں رہا

آسانیوں کے دور کا حاصل نہ پوچھئے
سب کچھ ہے صرف حوصلۂ دل نہیں رہا

میں نے لیا ہے قوت بازو سے اپنا حق
شرمندۂ نوازش باطل نہیں رہا

گمراہ بھی ہوں تجھ تو ہوں معرفت کے ساتھ
میں ناشناس جادۂ و منزل نہیں رہا

113

موت کی آغوش میں بھی زیست کا دم خم رہے
کروٹوں پر کروٹیں لے دم میں جب تک دم رہے

حسن کی عظمت اسی میں ہے کہ عہدِ غم رہے
تا قیامت کشتگان عشق کا ماتم رہے

زندگی یہ ہے کہ میرے بعد میرا غم رہے
رہتی دنیا تک دلِ بیدار و چشم نم رہے

کیا خبر کتنے ابھی آئیں گے ایسے آج کل
آج تم ہی تم سہی کل تک تو ہم ہی ہم رہے

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں
ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

نقشِ آب و گل کی ایسی خودسری اچھی نہیں
سرکشِ نافہم گردن میں ذرا سا خم رہے

میرے غم پر اس کا طنز اس کا تبسم سب درست
جھوٹ ہی کہہ دے کوئی ہم غم سے نامحرم رہے

زندگی کی راہ میں کتنا ہجومِ شوق تھا
پاشکستہ چل پڑے ہمت شکستہ تھم رہے

کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولت دنیا زیادہ آدمیت کم رہے

ذہنِ انسانی ہے رقصاں منزلِ ایجاد میں
دیکھیے کب تک نظامِ عافیت برہم رہے

مجھ سے یہ بھی چاہتا ہے عہدِ روشن آپ کا
شمعِ دانش گل چراغِ زندگی مدھم رہے

رہروؤں کو امتیازِ جادہ و منزل نہیں
واہ کیا اندھے بیچ میں اربابِ ہمت تھم رہے

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

وہ ہمیشہ لے کے ابھرے اک پیامِ انقلاب
دامنِ دولت پہ جو قطرے لہو کے جم رہے

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیت شعر و سخن
جس کسی محفل میں پہنچے تجم ہم ہی ہم رہے

(114)

بے حسوں کو درد کی منزل میں لا سکتا ہوں میں
ضد پہ آجاؤں تو دل سے دل بنا سکتا ہوں میں

میں یہ کہتا ہوں کہ محفل میرے ساتھ اٹھ جائے گی
یہ نہ کہیے تجھ کو محفل سے اٹھا سکتا ہوں میں

لاکھوں پروانے ہیں دنیا میں چراغ دیر کے
آدمی ہوں کفر پر ایمان لا سکتا ہوں میں

مجھ کو واعظ رشک مسجد کی امامت پر ہو کیا؟
جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

غم کی یہ تاریک راتیں اور تسلی کا پیام
شمع کی زحمت نہ کیجئے دل جلا سکتا ہوں میں

زیست کے احساس میں ہے مسکراہٹ آپ کی
موت کے احساس میں بھی مسکرا سکتا ہوں میں

اس کو اپنے خانۂ دل میں بلالوں تو سہی
جس کی منزل ڈھونڈھ سکتا ہوں نہ پا سکتا ہوں میں

روشنی یکساں ہے میری عرش ہو یا فرش ہو
تجم ہر بزمِ سخن میں جگمگا سکتا ہوں میں

(115)

غریبوں کی جسارت پر وہ منہ حیرت سے تکتے ہیں
کہ ان کمزور سینوں میں بھی شاید دل دھڑکتے ہیں

کریں کیا بندگانِ وقت حق کہتے جھجکتے ہیں
گلے میں لفظ اظہارِ حقیقت کے اٹکتے ہیں

مزا ہے بے پئے کہنے کا حق سو بات ناحق ہو
وہ مے نوشوں میں ہیں کم ظرف جو پی کر بہکتے ہیں

نظر والو حقیر و ناتواں ہم ہیں مگر ایسے
کہ آج اتنی بڑی دنیا کی نظروں میں کھٹکتے ہیں

مخالف بھی مزے لیتے ہیں کیا کیا میری ہمت کے
مرا صبر و تحمل دیکھتے ہیں اور بھڑکتے ہیں

بظاہر حاصلِ محفل تبسم ہی تبسم ہے
کسے معلوم کن سینوں میں انگارے دہکتے ہیں

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے
جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

بہت کم ہیں محبت کی روش کے جاننے والے
جو سر کے بل نہیں چلتے انہیں کے پاؤں تھکتے ہیں

سراپا جرم ہو کر بھی میں بندہ ہوں وہ خالق ہے
کہیں اس طرح کے مضبوط رشتے ٹوٹ سکتے ہیں

ستم ہے جرم اپنے غم کو طشت از بام کر دینا
ہم اپنا درد دل کہتے نہیں ہیں یہ کر تو سکتے ہیں

(116)

نہ گدائی مجھے دے اور نہ سلطانی دے
فتنہ گر اک نگہِ ناز کی قربانی دے

کن کی آواز پہ کیا جلد لیا میں نے وجود
اور کچھ دے کہ نہ دے دادِ سخن دانی دے

ہم سے دیوانوں کو سجتی ہیں ادائیں ایسی
یوں ترا شوق جسے چاک گریبانی دے

عشق کی فطرتِ فیاض سے کچھ دور نہیں
مجھ کو غم تم کو مرے غم کی پریشانی دے

دست و بازوے ستم سرد ہوئے جاتے ہیں
کوئی مظلوم ترس کھا کے گرانجانی دے

دینے والے تو خدائی مجھے دے سکتا ہے
اک ذرا بڑھ کے محبت کی جہانبانی دے

(117)

شکستہ ہوش نہیں ہوں شکست پاؤں کیا
اجل پہ ناز ہے کہیے اجل تک آؤں کیا

نظر خود ان کی ہے نیچی نظر ملاؤں کیا
فریبِ حسن سلامت میں دل دکھاؤں کیا

جمی ہے دیر سے پندار حسن کی محفل
غرورِ عشق کا قصہ کوئی سناؤں کیا

یہ سن رہا ہوں کہ آفاق میں تمہیں تم ہو
میں اپنی مستیِ بیجا کو بھول جاؤں کیا

یہ نازِ حسن مری عاشقی کے دم سے تھے
تمہارے دل میں ہوں بولو زبان تک آؤں کیا

زبانِ شوق کھلی ہے مزاجِ دوست بحال
کسی حسین تمنا کے گیت گاؤں کیا

سوائے غم نہ دیا کچھ تمہارے جلوے نے
یہ سوچتا ہوں تکلف سے مسکراؤں کیا

مرا صحیفۂ اعمال دیکھنے والے
ترے حضور میں ذوقِ گناہ لاؤں کیا

گذاردوں شبِ غم ایک ہی تبسم میں
سحر کے رخ پہ ستارہ سا جگمگاؤں کیا

بجانِ عشق نئی زندگی کی فکر میں ہوں
تری نظر کی بگاڑی ہوئی بناؤں کیا

(118)

عشق کو حسن بنانے کو چلے
لے تری راہ پہ آنے کو چلے

کارواں آپ ہی منزل تو نہیں
عمر گزری ہے زمانے کو چلے

تم بھی گھر جاؤ کہ وقت آخر ہے
ہم بھی اب اپنے ٹھکانے کو چلے

جس جگہ ہوتی ہے دنیا مدہوش
ہم وہاں ہوش میں آنے کو چلے

حشر کا نام سن آئے ہیں کہیں
کچھ مرے دوست ڈرانے کو چلے

آشیاں بنتے ہیں آتی ہے بہار
اک قفس ہم بھی بنانے کو چلے

تابِل درد کہاں دل میرا
کیوں گنہگار بنانے کو چلے

(119)

ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے یہ دولت میری
ہے خیالات کی دنیا پہ حکومت میری

حسن ہے میرا خدا عشق شریعت میری
آج تک بحث طلب ہے بشریت میری

موت کہلائی شہادت مرے سر دینے سے
خود یہ خنجر کی زبانی ہے روایت میری

کر چکا وضع غمِ عشق کے آئین و اصول
اب نہ ان کو ہے نہ دنیا کو ضرورت میری

ہے جو اک حال میں عالم ترے جلوہ کی قسم
رہ گئی ہے ترے آئینہ میں حیرت میری

دل کا کیا ذکر ہے دنیا سمٹ آتی لیکن
صبر مسلک ہے مرا درد ہے دعوت میری

میں بناتا ہوں حسیں دیکھ کے سر دینے کو
عشق ہے جوش مرا حسن ہے قدرت میری

نام تو ساتھ نہ جائے گا خدا حافظ ہے
ایک رہ جائے گی دنیا میں امانت میری

بارہا پیرہنِ عشق میں دیکھا ہے تجھے
تا ابد ہے ترے جلوہ کو ضرورت میری

(120)

درد ہے خیال ان کا زندگی ہے خواب ان کا
عشق حسن فطرت ہوں مجھ سے لو جواب ان کا

گھونٹ خود لہو کے ہم پی کے رہ گئے ورنہ
خون دل سے بھر دیتے ساغرِ شراب ان کا

حسن بے تماشا بھی کیا کوئی تماشا ہے
ان کے دیکھنے والے دیکھتے ہیں خواب ان کا

آج میرے شانوں پر منتشر وہ گیسو ہیں
آج خوابِ ناز ان کا آج نازِ خواب ان کا

عشق کا خمار اپنا کلفتِ خمار اپنی
حسن کی شراب ان کی نشۂ شراب ان کا

121

میرے ہونٹوں پر تبسم میرے دل میں ہائے ہے
مجھ سے اپنا حال جانے کیسے دیکھا جائے ہے

ہو نہ ہو صبحِ قیامت جانے والے ہم بھی ہیں
بڑھ رہی ہے شامِ غم دیکھیں کہاں تک جائے ہے

جان لب پر آچکی ہے اب گئی اور اب گئی
دیکھئے کب تک ہمارا آنے والا آئے ہے

شاید ان کے درد کی سب منزلیں طے ہوگئیں
دل ہے اب ٹھہرا ہوا سینہ میں دم گھبرائے ہے

اے شہیدِ عشق ہو تیری طرح سب کو نصیب
موت کیسی موت جس سے زندگی شرمائے ہے

آپ دو آنسو بھی اپنے حجم پی سکتے نہیں
پینے والا ڈگڈگا کر زہر بھی پی جائے ہے

122

حریمِ ناز کا پردہ اٹھا کے چھوڑ دیا
نظر جو مجھ سے ملی مسکرا کے چھوڑ دیا

مجھے نزاکتِ ہستی پڑھانے والے نے
فضائے عشق میں قیدی بنا کے چھوڑ دیا

چلے تھے دامنِ دل تھام کر سنبھل نہ سکے
تری نگاہ کے مرکز پہ آکے چھوڑ دیا

بتوں نے کی تھی مری سمت بھی نگاہِ کرم
مگر خدا کا گنہگار پا کے چھوڑ دیا

ہمیں سے حجم امیدِ ثواب کیا کہنا
ہمیں گناہ کی منزل میں لا کے چھوڑ دیا

123

ان کو دیکھا بے خودی سی ہوگئی
موت آئی زندگی سی ہوگئی

ہم سے پہلے تھا نظامِ عاشقی
ہم جو آئے برہمی سے ہوگئی

آہ کی دل نے وہ جلوہ دیکھ کر
پھر فضا میں خامشی سی ہوگئی

عشق آئینہ تھا ان کے حسن کا
اپنی صورت اجنبی سی ہوگئی

ہم نے کافر سے ملائی تھی نگاہ
ہر طرف پھر بے خودی سی ہوگئی

کس کو سمجھائیں محبت کا اثر
زندگی میں چاندنی سی ہوگئی

124

کہاں ہے محبت کو کیا ہوگیا
تقاضائے فطرت کو کیا ہوگیا

وہ دھڑکن بھی اب دل کی باقی نہیں
گناہوں کی دولت کو کیا ہوگیا

دھواں دل سے نکلا ہے نغمے کجا
یہ سازِ حقیقت کو کیا ہوگیا

مجھے بت پرستی پہ حیرت ہے خود
نظر کی لطافت کو کیا ہوگیا

وہ محشر میں لیں گے حسابِ کرم
یہ چشمِ عنایت کو کیا ہوگیا

ستم ہے کہ تابِ کرم بھی نہیں
کلیجے کی طاقت کو کیا ہوگیا

تماشائے تکرار جلوہ ہے کیوں
اداکارِ قدرت کو کیا ہوگیا

صلہ ہے محبت کا باغِ جناں
خداوندِ نعمت کو کیاہوگیا

سبق شکر کا جب سے تم دے گئے
زبانِ شکایت کو کیا ہوگیا

لبوں پر اب آہیں مچلنے لگیں
غرور محبت کو کیا ہوگیا

(125)

دردِ دل حاصل نظر پایا
ہم نے دل زندگی سے بھر پایا

غم سے کچھ ہوچلی تھی دلچسپی
یہ زمانہ بھی مختصر پایا

ان کے جلوہ کا شور سنتے تھے
ان کے جلوہ کو اک نظر پایا

کوئی حد ہی نہیں ہے منزل کی
ان کی منزل کو رہ گزر پایا

ہائے معصوم زندگی میری
عمر بھر میں خراب کر پایا

(126)

ہم دکھائیں گے جوش آئے ہو افسانوں میں
حق کی قوت ہے اگر سوختہ سامانوں میں

تم سمجھتے ہو فقط حسن کے ایوانوں میں
زیست اک اور بھی ہے عشق کے میدانوں میں

اتنے مجرم نظر آئیں گے نہ زندانوں میں
جتنے آزاد گنہگار ہیں ایوانوں میں

شوق کی آگ رُکے گی نہ دبے گی اے دوست
اُڑ کے پہنچے گی یہ پروانوں سے پروانوں میں

قیمتی عمرِ ابد سے ہے گذر جائے اگر
ایک ساعت بھی محبت کے زباں دانوں میں

مدفنوں پر جو شہیدانِ محبت کے ملی
مسجدوں میں ہے وہ رونق نہ صنم خانوں میں

کوئی محروم رہے اب نہیں ساقی کو غرض
جتنی میخانوں میں تھی آگئی پیمانوں میں

کیا مٹائے گی ہم ایسوں کو زمانہ کی روش
نام لکھا ہوا ہے کب سے گراں جانوں میں

بس کسی کا نہ چلا موجِ ہوا کے آگے
ایک سیلاب تھا ذرّوں کا بیابانوں میں

روئے گی چشمِ تماشا کہ ہنسے گی اے نجم
تم نظر آؤ گے جب چاک گریبانوں میں

127

وہ دور چلے گا تا بہ کجائے جس کی سبیل عام نہیں
یا رات گزر کر صبح نہیں یا صبح گزر کر شام نہیں

یہ اور ہے کیا اے دوست اگر انصاف کا قتلِ عام نہیں
مردہ ہیں تو ہیں بے گور و کفن زندوں میں ہمارا نام نہیں

پہلو میں برائے نام ہے دل اب درد کا دل میں نام نہیں
مومن ہیں مگر ایمان نہیں مسلم ہیں مگر اسلام نہیں

باقی نہ رہے جب ضبط کی حد اک چیخ نکل ہی جاتی ہے
اندازِ تغافل عام سہی کیا رسمِ بغاوت عام نہیں

کل ہاتھ میں خالی جام تھا اک اب قبضہ ہے میخانے پر
اب اس سے غرض کیا ساقی کو خالی تو کسی کا جام نہیں

جس نام کے بل پر جیتے تھے وہ چھین لیا ناکامی نے
اب کام کی منزل آئی ہے اب نام سے کوئی کام نہیں

ایسے بھی تو مرنے والے تھے جو آج کے دن تک جیتے رہے
میں عزم و عمل کی راہ پہ ہوں یہ موت مرا انجام نہیں

کیا ہم سے چھپائے بیٹھے ہو اظہار کی ساعت آنے دو
محفوظ ہے کتنے سینوں میں وہ راز جو طشت از بام نہیں

معیارِ عمل سمجھے ہی نہیں تم دل کی روش کیا سمجھو گے
مزدور ہوں لیکن ایسا ہوں جس کو ہوسِ انعام نہیں

کچھ خونِ جگر سے لکھنا ہے مجھ کو ابھی لوحِ گیتی پر
الفاظ ابھی الفاظ نہیں پیغام ابھی پیغام نہیں

اے نجم جلالِ معنی ہے الفاظ کے حسن و صورت میں
حاصل ہے یہ پختہ کاری کا سرمایۂ فکرِ خام نہیں

128

محبت کی وہ آہٹ پا نہ جائے
اداؤں میں تکلف آ نہ جائے

تری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی ہیں
کریں کیا جب تجھے دیکھا نہ جائے

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ
زبردستی اگر بدلا نہ جائے

حقیقی موت یہ ہے زندگی کی
تڑپ ہو دل میں اور تڑپا نہ جائے

محبت راہ چلتے ٹوکتی ہے
کسی دن زد میں تو بھی آ نہ جائے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں
جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

میں امیدِ کرم پر جی رہا ہوں
یہ دھوکا ہے تو یہ دھوکا نہ جائے

کہاں ہم دردِ دل لے کر چلے ہیں
مزاجِ دردِ دل پوچھا نہ جائے

جوانی تجمّل صاحب کی جوانی اکڑتی جھومتی پھر آ نہ جائے

(129)

اب اتنی تو ہمت کیے جایئے اجل آئے تک ہی جیئے جایئے
غریبوں کے گھر بھی چمکتا ہے چاند ادھر بھی اجالا کیے جایئے
بہرحال ہے میکدہ میکدہ جب آہی گئے تو پیئے جایئے
ابھی دل ہے پہلو میں اپنی جگہ نگاہوں کو دھوکے دیئے جایئے
کبھی تجمّل طوفاں اٹھانا بھی ہے کہاں تک یہ آنسو پیئے جایئے

(130)

ترے نام کو رہگزر دے رہا ہوں یہ دنیا ترے نام پر دے رہا ہوں
مرا ہم سفر ہے پیامِ محبت ستارے ستارے خبر دے رہا ہوں
زمیں تا زمیں پاؤں پھیلانے والو میں دشمن کو بھی دل میں گھر دے رہا ہوں
وہ سمجھیں گے کیا لذّتیں درد دل کی کسے زحمتِ درد سر دے رہا ہوں
کہاں تک نہ روئیں مرے حال دل پر میں غم ان کے احساس بھر دے رہا ہوں
مرا سوزِ دل دیکھ لے گا زمانہ گرجتے برستے شرر دے رہا ہوں
محبت کی حد میں جو تم ہو سو ہم ہیں یہ جذبہ نظر در نظر دے رہا ہوں
دلوں کی کشاکش میں میدان لوں گا نہ سر لے رہا ہوں نہ سر دے رہا ہوں
یہاں جو ہے اپنی خبر جانتا ہے میں اے تجمّل اپنی خبر دے رہا ہوں

(131)

کائناتِ غم کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں پھول سا دل ہے مگر آہن سے ٹکراتا ہوں میں
اب نقابِ چہرۂ فطرت اٹھاتا ہوں میں سجدہ گاہ فکر میں بڑھتا چلا جاتا ہوں میں
اپنی ہستی سے کبھی وہ منزلت پاتا ہوں میں زندگی کو موت کو دونوں کو ٹھکراتا ہوں میں
مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ اربابِ کرم پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہو جاتا ہوں میں
دل کی وسعت اور ہے محفل کی وسعت اور ہے بیٹھ جاتا ہوں جہاں کچھ بھی جگہ پاتا ہوں میں

ذہنِ انسانی پہ قبضہ میری مظلومی کا ہے
ظلم ہوتا ہے کسی پر یاد آجاتا ہوں میں

اپنا دل اپنی زباں اپنی نظر اپنا ضمیر
اپنے ہی قبضہ میں ہوں اب کس کے ہاتھ آتا ہوں میں

کل سے کتنے زندگی کے کے دور بدلے آج تک
اور سلجھانے میں الجھاتا چلا جاتا ہوں میں

جادۂ شمشیر ہو زنداں ہو یا دار و رسن
میری جولاں گاہ ہیں جاتا ہوں میں آتا ہوں میں

مشغلے اتنے ہیں تیرے یاد رکھنے کے لیے
تجھ کو اتنے مشغلوں میں بھول بھی جاتا ہوں میں

کوئی خوش خوش جب نظر آتا ہے قید و بند میں
دیکھ کر خود اپنی آزادی کو شرماتا ہوں میں

جب مرے مفہوم کو دنیا سمجھتی ہی نہیں
کچھ نہ کچھ کہہ سن کے اپنے دل کو سمجھاتا ہوں میں

کلمۂ حق ہوں غرور دوست دشمن کے لیے
دیکھتے رہتے ہیں سب دل میں اتر جاتا ہوں میں

کج روی کی چل نہیں سکتی صداقت کے خلاف
راہ ہو جاتی ہے سیدھی جس پہ آجاتا ہوں میں

میری پستی پر نظر کر اپنی ہستی دیکھ کر
اے خدائے آب و گل انسان کہلاتا ہوں میں

حجم مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی
گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

لب پہ کس کس کا نام آتا ہے
ایک ہی نام کام آتا ہے

وقت کا جب پیام آتا ہے
زد میں ہر اک نظام آتا ہے

ہر نفس تیز گام آتا ہے
کوئی ان کا پیام آتا ہے

منزلیں راستے سے ہٹ جائیں
کاروانِ عوام آتا ہے

پھر مبارز طلب ہوا غمِ عشق
دیکھئے کون کام آتا ہے

فرش پر ان کے خاکساروں کو
عرش سے بھی سلام آتا ہے

ذکر اہل کمال پر چپ ہوں
لب پہ اپنا ہی نام آتا ہے

کل ہی ٹھکرا چکے ہیں ہم جس کو
پھر لبالب وہ جام آتا ہے

ہے کوئی راہ روکنے والا
دل سے دل کو پیام آتا ہے

دیکھئے کب تری عدالت کا
فیصلہ بے نیام آتا ہے

موت کی نیند سونے والا ہوں
وقتِ عیش دوام آتا ہے

مرہی جاتا ہوں جب تکلف سے — جینے والوں میں نام آتا ہے
ہوشیار اے رہینِ صحن چمن — دانہ آتا ہے دام آتا ہے
کتنا گہرا ہے کس قدر خالی — میرے حصے کا جام آتا ہے
رخصت اے مسندِ حیات و نشاط — موت کا نام جھام آتا ہے
تجم کو دیکھ کر یہ کس نے کہا — شاعرِ تلخ کام آتا ہے

(133)

کیا سکوں دے گی نئے دور کی روداد مجھے — ہے تباہی گل و گلشن کی ابھی یاد مجھے
پتہ پتہ نظر آنے لگا صیّاد مجھے — واہ کیا خوب کیا قید سے آزاد مجھے
راس آئی ہے بہت آپ کی بیداد مجھے — اسی منزل میں تو آیا ہے خدا یاد مجھے
شکر ہے ہوش تو ہے کچھ مجھے بربادی کا — تم تو آپے میں نہیں دیکھ کے برباد مجھے
زندگی غیر کے احسان سے منظور نہیں — آج لے لوں جو ملے مرگِ خدا داد مجھے
دردِ دل پر یہ ملا ان کی سیاست سے جواب — مطمئن کر نہ سکی آپ کی روداد مجھے
سخت جانی سے ہے میری اسی دنیا کو گلہ — اسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
مشتبہ میرا تبسم مرا گریہ مخدوش — یہ وفا کی یہ محبت کی ملی داد مجھے
اپنی ہمت کے مطابق ہے ہر انسان کی فکر — کوئی ناشاد سمجھتا ہے کوئی شاد مجھے
عرض کرتے ہوئے گزرا ہے زمانہ بے سود — دی ہے احساس نے اب ہمت ارشاد مجھے
خیر گذری نہ کھلی وعظ و نصیحت کو زباں — آگئی اپنے گناہوں کی فضا یاد مجھے
ظلم ہے قوتِ بازو کے سہارے پہ اُدھر — ہے اِدھر صبر کی توفیق خداداد مجھے
ذہنِ عالم پہ شہادت ابھی قبضہ دے گی — ذہنِ قاتل میں کیا ہے ابھی آباد مجھے
میں چمن میں بھی رجز پڑھتا ہوا آیا تھا — لالہ و گل نے سکھائی ہے یہ فریاد مجھے
تجم تقدیر کی گردش سے میں دبنے کا نہیں — پست ہمت نہ کرے وقت کی افتاد مجھے

(134)

اعلان غیریت کا اب اُردو زباں سے ہے — پوچھے تو کوئی یہ لب و لہجہ کہاں سے ہے

سمجھو نہ یہ مقابلہ اک نیم جاں سے ہے
رشتہ ہمارا زندگیٔ جاوداں سے ہے

سامانِ زندگی سے نہ تابِ فغاں سے ہے
جتنی امید حوصلۂ جانستاں سے ہے

اک دل ہی میرے پاس متاعِ جہاں سے ہے
اُس کی طلب زمین سے ہے آسماں سے ہے

سنتا ہوں کچھ خلش انہیں طرزِ بیاں سے ہے
طرزِ بیاں سے کیا ہے مری داستاں سے ہے

کیا زندگی مراد اسی این و آں سے ہے
مرعوب کس قدر تو زمیں آسماں سے ہے

کثرت سہی گلوں کی چمن بولتا نہیں
یہ زندگی کی لہر مرے آشیاں سے ہے

طفلی میں بے خرد تھا جوانی میں بے حواس
میں کیا کہوں گناہ کی منزل کہاں سے ہے

پستی سے بے نیاز بلندی پہ یہ غرور
جھک کر تو دیکھ تیری بلندی کہاں سے ہے

شامل تو کارواں میں ہوں اب اور کیا کہوں
اک درد کا سا ربط مجھے کارواں سے ہے

فطرت کا مقتضا ہے یہ اظہارِ دردِ دل
میرا ہے یہ قصور کہ میری زباں سے ہے

اب تک ہوا نہ تکملۂ ذوقِ بندگی
کچھ واسطہ جبیں سے ہے کچھ آستاں سے ہے

ان کی خزاں میں دیکھئے کس کی بہار ہو
جن کی بہار آج ہماری خزاں سے ہے

یہ میرا امتحاں ہے کہ خود اس کا امتحاں
اک مشتِ خاک کو بھی شرف امتحاں سے ہے

زیرِ قدم زمیں سے توقع نہیں یہاں
ایسے بھی ہیں امید جنہیں آسماں سے ہے

حیرت سے دیکھتے ہیں خداوندِ ظلم و جور
اب تک مری زباں کو حذر الاماں سے ہے

اے دوست اس فضا میں حقائق سے ہوشیار
بینی تو ہمات کی سرحد جہاں سے ہے

دنیا مجھے ضعیف سمجھ کر نہ ہوں دلیر
اب اس کا سامنا مرے عزم جواں سے ہے

تخلیقِ کائنات کا عنوان دیکھنا
اے مجرم ابتدائے محبت کہاں سے ہے

ہونا لفظوں میں ادا عشق کا وہ جوش نہ تھا
میں ترے حسن کا آئینہ تھا بے ہوش نہ تھا

کیا اُگے گا کسی بے کس کی لحد پر سبزہ
خاک میں جوش کہاں خون میں وہ جوش نہ تھا

جام کیا جام تھا ساقی نے جو بھر کر نہ دیا
ڈگڈگا کر نہ پیا جس نے وہ مے نوش نہ تھا

کس کی آواز نے اے خوابِ گراں چونکایا
در و دیوار بتاتے ہیں مجھے ہوش نہ تھا

شکر ہے تا بہ لحد ان کی امانت لایا
حق ہے دنیا جو یہ کہتی ہے سبکدوش نہ تھا

تری آواز تو کرتی ہے عدم کو موجود
تو بھی خاموش تھا گر میں ہمہ تن گوش نہ تھا

فطرتِ حسن ہے اقرار محبت لینا
آج خاموش سہی کل تو وہ خاموش نہ تھا

تری طاعت میں اطاعت کا ہوا حق نہ ادا
تھا میں ناکام پر احکام فراموش نہ تھا

پا گئے عشق کے دامن میں حیاتِ جاوید
اہل باطن کے لیے موت کا آغوش نہ تھا

ہائے کب حضرتِ اخضر نے غزل کہوائی
نجم جب فرطِ الم سے مجھے کچھ ہوش نہ تھا

(136)

وہ بھی تھا وقت کہ محفل میں تری بار نہ تھا
حشر میں تو کوئی کہہ دے کہ گنہگار نہ تھا

تا دمِ نزع مجھے یاد یہ اقرار نہ تھا
موت جب آئی تو سمجھا کہ میں بیمار نہ تھا

دل کی تقدیر کہ یہ سلح پہ تیار نہ تھا
غم اک آزار سہی درپے آزار نہ تھا

شام کے بھولے ہوئے صبح شب غم آئے
صبح وہ صبح قیامت تھی کہ بیمار نہ تھا

سوی گل کس کی پُر از شوق نگاہیں نہ اٹھیں
کون گل گشت چمن کر کے گنہگار نہ تھا

کرب تھا موت کا خمیازۂ صبحِ آغاز
شام انجام کی تصویر تھی بیمار نہ تھا

جی دھڑکتا ہے اسیرانِ چمن ہی سے ہوں
آج سنتے ہیں قفس رونقِ دیوار نہ تھا

میری کشتی تھی خیالات کے طوفانوں میں
تری رحمت نہ سنبھالے تو گنہگار نہ تھا

راہ اب دیکھتے کیا شامِ لحد تھی سر پر
دن ڈھلے تک تو کوئی دل کا خریدار نہ تھا

خودکشی سہل تھی پر نفس کشی کام آئی
یعنی میں خون بہا کر بھی گناہ گار نہ تھا

نجم اک عمر میں احباب پہ یہ راز کھلا
جتنا بدنام تھا میں اُتنا گنہگار نہ تھا

(137)

عشق حسنِ فطرت ہے دل جو یوں پگھلتا ہے
اپنی روشنی میں آپ مثل شمع جلتا ہے

ہر طرح بہار آئے دل کہیں بہلتا ہے
جوشِ گل ارے توبہ خون سا اُبلتا ہے

یہ جو دردِ الفت سے آتی ہے صدا پیہم
موت سے کوئی اپنی زندگی بدلتا ہے

جادۂ حقیقت سے پاؤں آشنا کیا ہوں
دل کی جب یہ حالت ہے مصلحت پہ ملتا ہے

ایک وجہِ تسکیں ہے طاعت و اطاعت کیا
حق ادا نہیں ہوتا حوصلہ نکلتا ہے

حجم کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا
پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اگلتا ہے

(138)

مرنے والا مرتے مرتے سختیاں دیکھا کیا
چارہ گر نبضیں نگاہیں رازداں دیکھا کیا

عالم تخئیل کی بے ربطیاں دیکھا کیا
میں زمیں پر رہ کے خوابِ آسماں دیکھا کیا

میں انہیں آنکھوں سے حسن بے نشاں دیکھا کیا
ان کا جلوہ چار عنصر درمیاں دیکھا کیا

کرلیا صیّاد کو پابند فکرِ صید نے
اک نگہباں تھا کہ میرا آشیاں دیکھا کیا

دل کوئی پہلو میں تڑپا تھا کہ میں دیوانہ وار
بزمِ آب و رنگ کی نیرنگیاں دیکھا کیا

کاروانِ رنگ و بو نے گل کی مٹی کی خراب
باغباں گل کو خرابِ کارواں دیکھا کیا

سختیاں کرتی گئیں نزدیک مقصد سے مجھے
مشکلوں میں دن بہ دن آسانیاں دیکھا کیا

وسعتِ ہمت نے رکھا ہر کس و ناکس سے غیر
بیکسی میں حالت درد نہاں دیکھا کیا

ہوگیا وقتِ مناسب نیک و بد پیش نظر
سامنے رکھی ہوئی اک داستاں دیکھا کیا

امتحاں ذوقِ نظر کا تھا نمودِ عیب وحسن
صانعِ قدرت کی خوش ترکیبیاں دیکھا گیا

ہر قدم پہلا قدم تھا منزلِ تسلیم میں
انتہا تک ابتدائی داستاں دیکھا کیا

وسعتِ دنیا سے باہر تھا مرا ذوقِ نظر
ایک جلوہ وہ بھی بے نام ونشاں دیکھا کیا

مجھ کو لے ڈوبا کہاں دنیائے فانی کا شباب
راہِ جنت میں شبابِ جاوداں دیکھا کیا

میرے قابو میں نہ تھی اے حجم مرگِ ناگہاں
تھیں مقدر زیست کی بدنظمیاں دیکھا کیا

(139)

یہیں آئے دن رہیں گے جو فسادِ باغباں سے
تو قفس میں جارہوں گا میں نکل کے آشیاں سے

میں جہانِ غم میں رہ کر ہوں الگ غم جہاں سے
نہ شریک کارواں ہوں نہ جدا ہوں کارواں سے

وہ ستم نصیب لے گا ترا نام کس زباں سے
جو اماں طلب ہوا ہو کبھی دورِ آسماں سے

ہے عبث فضول دعوی مجھے جسم ناتواں پر
وہ زمیں میں صرف ہوگا جو بچے گا آسماں سے

کبھی محو خوابِ طفلی کبھی بے خودی جوانی
مری زندگی کی یارب ہوئی ابتدا کہاں سے

مجھے ہر طرف سے یکساں نظر آ رہی ہے منزل
نہ قفس سے دیر ہے کچھ نہ ہے قربِ آشیاں سے

مری بے بسی نے دے دی کبھی آہ کی اجازت
میں قفس میں آگ لایا ہوں چھپا کے آشیاں سے

یہ بہارِ باغِ جنت کی ہوس پہ ہے تعجب
کہ اسیرِ آب و گل کو یہ ہوا لگی کہاں سے

وہ شباب خواب پیکر پہ جہاں کی بدگمانی
وہ دبی ہوئی لطافت کسی تہمتِ گراں سے

انہیں آج سانس لینا بھی ہوا قفس میں مشکل
جو ہوا میں پھر رہے تھے کبھی سیرِ آشیاں سے

یہ نمو نے جوشِ گل کے میں چمن سے پوچھتا ہوں
کہ نکالے ہیں خزانے یہ دبے ہوئے کہاں سے

یہ سکونِ دل کا عالم کہ گمانِ بے دلی پر
غمِ عشق ڈھونڈ لایا یہ تسلیاں کہاں سے

یہ تو حجمؔ آپ کی ہی ہے وہ دوامِ شعر کوئی
مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے

140

رنگ کچھ سے کچھ ہوا نیرنگِ عالم دیکھ کر
خوئے صرصر دیکھ کر احسانِ شبنم دیکھ کر

بجھ چلا تھا دل مرا زادِ سفر کم دیکھ کر
کیا تسلّی ہوگئی سرمایۂ غم دیکھ کر

گریۂ غیر اختیاری ہو کہ اشکِ داد خواہ
پھیر لیتے ہیں نظر وہ چشمِ پُرنم دیکھ کر

نام اُسی کا زندگی ہے گر تو ہوگی موت کیا
شوقِ مرنے کا ہوا جینے کا عالم دیکھ کر

یہ بھی تھا تقدیر میں دشمن سے آنکھیں جھک گئیں
دوستوں کو پیکرِ اندازِ مبہم دیکھ کر

جی اٹھی مردہ دلوں کی حسرتِ پامال بھی
انقلابِ عام کے ساماں فراہم دیکھ کر

رہ گئے وہ بیچ میں جی چھوڑ کر اہلِ ہوس
صبر و ضبطِ عشق کے آئینِ محکم دیکھ کر

حجمؔ افراطِ محبت نے مجھے گم کر دیا
میں نے آنکھیں بند کر لیں شدتِ غم دیکھ کر

141

لائی غفلت مجھے دنیا کی ہوا کھانے کو
دل بڑھا صحنِ دو عالم سے نکلوانے کو

یاد رکھے گا زمانہ مرے افسانے کو
جی رہا ہوں کسی امید پہ مرجانے کو

شوقِ واجب نے کیا عشق میں انجام بخیر
لوگ سمجھیں کہ اجل لائی تھی مروانے کو

منحصر تھا حدِ فانوس پہ جلنا مرنا
آتشِ شوق نہ کافی ہوئی پروانے کو

فتنہ دہر لحد میں نہیں سونے دیتے
حشر سے پہلے ہی موجود ہیں چونکانے کو

کارنامے کہیں مٹتے ہیں وفا کیشوں کے
کیوں وہ اٹھے ہیں نشاں قبر کے مٹنے کو

حجم ہر سانس ہے ممنون فضائے بنگال
اور پَر درد بنایا مرے افسانے کو

142

روتے نہ کٹے اور تڑپتے نہ بسر ہو
کیا قہر ہے وہ رات بھی جس کی نہ سحر ہو

تاحدِ نظر خارِ بیاباں گلِ تر ہو
اے ذوقِ نظر معجزۂ حسن نظر ہو

اب حشر ہو فتنہ کوئی بیدار اگر ہو
آنکھیں جو کھلیں روزِ قیامت کی سحر ہو

نیرنگِ طبیعت ہو کہ نیرنگ نظر ہو
عالم ہو کوئی پھر بھی مری چشم نہ تر ہو

اب منزلِ مقصود ہو یا راہ گزر ہو
وہ بھی تو مسافر ہے جو نیت بہ سفر ہو

دم لے مری آنکھوں میں ذرا برقِ تجلّی
بے وجہ گنہگار نہ آغوشِ نظر ہو

عشق اک گہرا لطف میں تھا آپ سے باہر
ایسا بھی نہ دنیا میں کوئی دستِ نگر ہو

اے سالکِ بدست مرے دل سے خبردار
جذبات کی دنیا نہ کہیں زیروزبر ہو

ہے جوہرِ قابل میں نہاں سہو و خطا بھی
یعنی کہ فرشتہ نہ ہو انسان بشر ہو

آغوشِ لحد میں بھی نہیں راحتِ کامل
ہم آج چلے جائیں اگر امن کا گھر ہو

143

وہ حسن سے بے تابو اک عشق میں دیوانہ
دو پیکرِ رقصاں ہیں یا شعلہ و پروانہ

اللہ رے تری وسعت اے نغمۂ مستانہ
دو حرف میں پنہاں تھا کونین کا افسانہ

کچھ حد ہے تجلّی کی اے جلوۂ جانانہ
معمور ہے آبادی معمور ہے ویرانہ

قسمت نے کیا مجھ کو کیا راز سے افسانہ
تھا علمِ الٰہی میں اک دن مرا کاشانہ

اک شعلۂ فانی پر مٹ جائے گا پروانہ
انجام سے غافل ہے آغاز کا دیوانہ

بے لطف سے بیٹھے ہیں کچھ داد و رسن والے
اے عشق وفا پیشہ اک لغزش مستانہ

ترتیبِ عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن
آخر یہ قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

میں کان لگائے ہوں اک شوق کے عالم میں
ساکت ہے فضا بالکل خاموش ہے ویرانہ

یہ جذبۂ الفت بھی اک قسم جنوں نکلا
دنیائے تمدن کا ایک فعل حکیمانہ

خود حسن چمکتا ہے فطرت کی شعاعوں میں
اسباب نمایش ہیں کیوں آئینہ و شانہ

مظلوم کی آہوں میں بیکس کی نگاہوں میں
اے نفسِ شقی دیکھا قدرت کا ستم خانہ

یہ حکمت آب و گل یہ فطرت رنگ و بو
انداز ملوکانہ سامان فقیرانہ

باہر ہوں تری حد سے اے فلسفۂ دنیا
سو راز پہ بھاری ہے اب بھی مرا افسانہ

اس سروخموشی سے اک پھول بھی ہے بہتر
یہ خندۂ بے معنی یہ گریۂ مستانہ

اے حجم میں پُتلا ہوں رنگ اور تلون کا
کس رنگ میں لکھے گی دنیا مری افسانہ

(144)

جس کو سو آسانیاں تھیں وہ بھی کچھ مشکل میں ہے
میں سمجھتا ہوں تمہارا دل بھی میرے دل میں ہے

جذبۂ دردِ محبت کو مسلسل دیکھ کر
پوچھتا پھرتا ہوں دنیا کون سی منزل میں ہے

ذبح کرتا ہے مجھے روتا ہے میرے حال پر
میری فطرت بھی خدا رکھے میرے قاتل میں ہے

بندگی کا حق بتاتا ہوں خداوندی کو میں
ہاتھ پھیلانے کا دھبّہ دامنِ سائل میں ہے

یاد کر ظالم مرے دل کا تڑپنا یاد کر
حیرتِ جلوہ کا سناٹا تری محفل میں ہے

سعی حاصل میں بھی اک لذت ہے دو دن چار دن
پوچھئے ہم سے مزا جو سعیٔ لا حاصل میں ہے

مرحبا ذوقِ اسیری قدرت فکر و نظر
دہنے بائیں جس کو دیکھا قیدِ آب و گل میں ہے

یہ دعا مانگی مرے دل میں نہ ہو کچھ انقلاب
انقلابِ دہر شامل انقلاب دل میں ہے

دوسری دنیا سے کیوں آئے پیامِ زندگی
روح اپنی کوششیں آزادیٔ کامل میں ہے

حجم یہ خندہ جینی ہر بلائے عشق پر
کس تبسم کا خزانہ میرے آب و گل میں ہے

(145)

ان کا سکوں تباہ کئے جارہا ہوں میں
اپنی طرف نگاہ کئے جارہا ہوں میں

دنیا بھی آرہی مرے بعد راہ پر
دنیا کو گردِ راہ کئے جارہا ہوں میں

بندوں سے بے تکان ملاتا ہوا نگاہ
اللہ کے گناہ کئے جارہا ہوں میں

کتنی ہے کفر عشق کی نازش نہ پوچھئے
اسلام کو گواہ کئے جارہا ہوں میں

146

وہ جلوہ گر نہیں تو نگاہوں میں کیا رہے
آنکھیں ہوں بند عیب پہ پردہ پڑا رہے

وہ دن بھی تھے کہ آپ مرے ہم نواز ہے
جب اپنے دل میں درد تھا درد آشنا رہے

خود باغباں نے ضد میں اُجاڑے ہیں آشیاں
ہم تو یہ چاہتے تھے چمن بولتا رہے

ہم رند ہیں مجالِ تقرب کہاں ہمیں
واعظ کو حوصلہ ہے وہی باخدا رہے

ذوقِ طلب یہ ہے جو حضوری نہ ہو نصیب
در پر گنہگار محبت پڑا رہے

اے دوست یہ شعورِ محبت کا فرض ہے
دشمن کی طرح اپنی طرف دیکھتا رہے

دنیا میں اہلِ شر نے جو روکی عمل کی راہ
ہم بھی خیال و خواب کی دنیا میں جا رہے

سوچے گی تجھ فطرتِ انساں ہمارے بعد
کب تک چراغ سوز محبت بجھا رہے

147

شراب و شعر و نغمہ کے اثر کی یاد آتی ہے
جگر کی یاد اندازِ جگر کی یاد آتی ہے

وہ جلوہ اب کہاں اس جلوہ گر کی یاد آتی ہے
جدھر اٹھتی ہیں نظریں اک نظر کی یاد آتی ہے

تری محفل میں اربابِ سخن کی نغمہ کاری ہے
یہ سنتے ہیں کہ تجھ نوحہ گر کی یاد آتی ہے

عدو کیا لطف اٹھائیں گے مری آشفتہ حالی سے
مجھے اک دوست کے ذوقِ نظر کی یاد آتی ہے

وطن میں ناروا ہے فتنہ و شر کا تصور بھی
مگر پردیس میں ہر خیر و شر کی یاد آتی ہے

زباں پر آ کے جس نے دو دلوں میں تفرقہ ڈالا
بہت اک ایک حرف مختصر کی یاد آتی ہے

بڑھے جاتے ہیں حد سے محفلِ عشرت کے ہنگامے
خدا چاہے تو اب تیغ و سپر کی یاد آتی ہے

تڑپ جاتا ہوں اس نیرنگیٔ تنظیم فطرت پر
جب اپنے عیب کی اپنے ہنر کی یاد آتی ہے

خبر کیا تھی کہ ہوگا یوں کبھی احساس تنہائی
خدا کی شان گھر میں دشت و در کی یاد آتی ہے

تصوّر بھی چمن کا زہر ہوتا ہے نگاہوں کو
قفس میں جب غرور بال و پر کی یاد آتی ہے

148

بہت ہیں یوں تو پروانے حرم کی شمع سے پوچھو
ابھی کس کس کے سینے میں چراغ دیر جلتا ہے

سکونِ دل کے دو پہلو ہیں اور دونوں معطل ہیں
نہ میرا زور چلتا ہے نہ ان کا زور چلتا ہے

زمانے سے شکایت کیا موافق ہو مخالف ہو
زمانہ کیا کسی کو دیکھ کر پہلو بدلتا ہے

سکوں سے دو گھڑی رہنا نہیں اس کے مقدر میں
محبت کا مسافر عمر بھر گرتا سنبھلتا ہے

نہ رونا آئے کیوں کر حالِ نا کامِ محبت پر
وہاں دل کی حقیقت کیا جہاں پتھر پگھلتا ہے

یہ وہ منزل ہے جس میں حسن کا بھی بس نہیں چلتا
لرز جاتی ہے دنیا عشق جب تیور بدلتا ہے

(149)

درِ ساقی کھلے اک سجدۂ مستانہ ہو جائے
نمودِ شب سے پہلے ختم یہ دنیا نہ ہو جائے

نگاہیں میری ان کی لڑ گئیں ہیں خیر ہو یارب
قرینہ ہے کہ دونوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

محبت جبر کرتی ہے نہ حسن اصرار کرتا ہے
جسے بیگانگی توفیق دے بیگانہ ہو جائے

ہجومِ نا امیدی بڑھ چلا ہے چیخ اٹھوں گا
وہ ساعت آ گئی ہے جب دعا افسانہ ہو جائے

اجازت ہو تو میں دنیا میں کوثر کی بنا ڈالوں
یہاں بھی اک تمہارے نام کا میخانہ ہو جائے

کمی ہے حسنِ منزل میں مرے نورِ محبت کی
میں جب چاہوں مکمل جلوۂ جانا نہ ہو جائے

کوئی پوچھے تمہاری بے نیازی چاہتی کیا ہے
خوشامد کرتے کرتے آدمی دیوانہ ہو جائے

جنابِ شیخ مسجد کی ذرا مشکل ہے آبادی
جہاں کہیے ابھی آباد اک میخانہ ہو جائے

غزل ہو جم میری اور زباں اس نغمہ پرور کی
مرا ہر لفظ ہونٹوں پر اب پیمانہ ہو جائے

(150)

حسن ہے ان کا ایک قیامت راز قیامت کیا کہیے
ہائے ہمارا حسنِ طبیعت، حسنِ طبیعت کیا کہیے

اب نہ تھمیں گے آنکھ سے آنسو چھیڑ نے والے چھیڑ گئے
خواب سا بیٹھے دیکھ رہے تھے غم کی نزاکت کیا کہیے

آنکھ ملانا کھیل نہیں ہے نامِ محبت کیا لیجے
دل کی رگوں سے کھنچ رہے ہیں روحِ محبت کیا کہیے

(151)

امرِ حق میں خاموشی حوصلہ کی پستی ہے
اب خدا پرستی کیا مصلحت پرستی ہے

جس کے گوشے گوشے سے زندگی برستی ہے
ایک جنس مہنگی ہے ایک جنس سستی ہے

پستی ہو یا رفعت ہو دنیا ہو یا جنت ہو
آدمی کی رونق ہے آدمی کی بستی ہے

آب و گل کے عنصر میں یہ تضادِ فطرت ہے
عندلیب نالہ کش گل خموش ہستی ہے

(152)

میرا وہ غم رہا نہ وہ ان کی خوشی رہی
دونوں کے دل بدل گئے دنیا وہی رہی

دیکھا کئے بہت مجھے ترچھی نگاہ سے
کچھ روز دوستی کے لیے دشمنی رہی

جب لے کے دردِ عشق ہم آئے تو دن پھرے
برسوں یہ کائنات معطل پڑی رہی

اپنا خیال آتے ہی اک حشر آگیا
جب تک ترا خیال رہا خامشی رہی

دل میں تو ہے وہ شاہدِ مقصود جلوہ گر
آنکھیں بھی دیکھ لیں گی اگر زندگی رہی

سر کرلیا تھا ہم نے محبت کا معرکہ
اللہ جانتا ہے تمہاری کمی رہی

دیکھا تو آج ہے وہی غم رہنمائے دل
سنتا ہوں مدتوں مرے غم پر ہنسی رہی

فتنے اٹھے بہت ہمیں جنبش نہ دے سکے
بیٹھے رہے خموش قیامت کھڑی رہی

بجھی رہی نہ خو ہمیں عجز و نیاز کی
ہم زد پہ تھے مگر یہ بلا دور ہی رہی

(153)

کون خدا خدا کرے وقت کا مقتضا نہیں
وقت پڑے تو پوچھنا کوئی خدا ہے یا نہیں

سب کو گماں ہے وہ نظر داد طلب ہمیں سے ہے
روئے سخن ہے ہر طرف یہ کوئی دیکھتا نہیں

ان کی بساطِ عیش پر میرے لیے جگہ نہ تھی
کوئی یہ ان سے پوچھتا دل میں جگہ ہے یا نہیں

آئینہِ خیال پر پھر کوئی ابرِ غم اٹھا
رات ابھی سے ہوگئی دن تو ابھی ڈھلا نہیں

ان کو سکون کیوں نہ ہو مجھ کو جنوں کیوں نہ ہو
ان کی جفا جفا تو ہے مری وفا وفا نہیں

میرے لیے بہ فیضِ عشق سارا جہاں خموش ہے
دل کی زبان کھل گئی اب کوئی بولتا نہیں

شمعِ جمال تو بھی کیا طور کے ساتھ بجھ گئی
اب کبھی شوقِ دید میں آگ لگے گی یا نہیں

داغِ وفا تو رہ گئے دامنِ کائنات پر
یوں نہ مٹا سکو گے تم جیسے کبھی میں تھا نہیں

تو ہی خدائے دل سہی کیسے کہوں کہ دل میں آ
دل میں سوائے غم ہے کیا غم ترے کام کا نہیں

(154)

اُس نظر کی چوٹ کھاکر رہ گئے
ہم ہی تھے جو مسکرا کر رہ گئے

واہ کیا مرنے چلے تھے بے اجل
زندگی سے ہاتھ اٹھاکر رہ گئے

جانے والے ان کی منزل کے بہت
دل ہی دل میں پھیر کھا کر رہ گئے

ان کی سج دھج کا نہ نکلا ایک بھی
نام کیا کیا لب پہ آکر رہ گئے

ہم کہاں تکلیف خود بینی کہاں
دل کو آئینہ بنا کر رہ گئے

کیا قیامت ہے تمھاری سادگی
اچھے اچھے رنگ لاکر رہ گئے

پاک بازانِ ازل پر رحمتیں
کن گنہ گاروں میں آکر رہ گئے

ہم ہی اچھے دل کی دل میں رہ گئی
جو سنا پائے سنا کر رہ گئے

آستاں نزدیک تھا ہم دور تھے
اپنے اوپر رحم کھا کر رہ گئے

خاک کے پتلوں پر ہنستی ہے زمیں
آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

بڑھ چلے تھے دل کی منزل سے مگر
نجم کچھ آہٹ سی پا کر رہ گئے

(155)

دشمنی سہی لیکن دوست بن کے مارا ہے
اپنے سر چڑھانے کو میرا بوجھ اتارا ہے

زیست کو بنایا ہے موت کو سنوارا ہے
جب سے آدمیت کا ہم نے روپ دھارا ہے

ہے یہی ہمیشہ سے لین دین دنیا کا
کل یہ سب ہمارا تھا آج سب تمھارا ہے

سب ہی مرد میداں ہیں رزم گاہِ عالم میں
جیت اسی کی ہے جس نے بڑھ کے ہاتھ مارا ہے

تم براہ آزادی سانس لے نہیں سکتے
کل ہزار شکوے تھے آج سب گوارا ہے

موت سے گزرنا کیا زندگی گزار آئے
زندگی تلاطم تھی موت اک کنارا ہے

ایک دن مجھے تم نے بھول کر پکارا تھا
جب سے آج تک میں نے بارہا پکارا ہے

اپنے اپنے موقع پر سب ہی کہہ گزرتے ہیں
کیا تمھیں نے کچھ کہہ کر کوئی تیر مارا ہے

آج تک تو جیتا ہوں اپنے ہی سہارے پر
چاہتے ہیں یہ کہہ دوں آپ کا سہارا ہے

خاک ڈالنے والے تو بجھا نہیں سکتے
دل ہمارے سینہ میں مستقل شرارا ہے

پستی و بلندی میں سب کے کام آیا ہوں
فرش نے صدا دی ہے عرش نے پکارا ہے

حکمت بشر تو بہ خود بشر نہیں سمجھے
ہار کر بھی جیتا ہے جیت کر بھی ہارا ہے

ہم نے منزلت دی ہے نجم نظمِ اردو کو
ہر زمین پر ہم نے آسماں اتارا ہے

156

مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے
ٹھہر جاؤں تو باقی ہے گزر جاؤں تو فانی ہے

جب ان کے دل سے کچھ آواز آئے گی تو چونکیں گے
مری فریاد ہے لیکن ابھی میری زبانی ہے

نہ ہم ہیں اب نہ تم ہو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا
نہ جانے کون سے رخ پر خیالوں کی روانی ہے

ابھی کیسے بھلا دوں گا میں اپنے دل کی بربادی
ابھی تو ان کی نظروں میں غرور کامرانی ہے

وہ مردہ دل جئیں گے خاک جن کا یہ عقیدہ ہو
جہاں تک سانس آتی ہے وہاں تک زندگانی ہے

محبت کا فسانہ ختم کیا ہوگا قیامت میں
قیامت ایک دن کی ہے محبت جاودانی ہے

جوانی آئی جان آئی غم آیا موت آتی ہے
ابھی کیا جانئے کس کس سے طاقت آزمانی ہے

میں پھیلاتا ہوں نورا ے حجم اپنے کنج عزلت سے
زمین شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

157

امید صبح کیوں دلِ حسرت اثر نہیں
کیا وہ خدائے شب ہے خدائے سحر نہیں

دنیا ہے تنگ دل میرا مدِ نظر نہیں
جو زندگی میں آج نہیں عمر بھر نہیں

آیا سوالِ مرگ تو دیکھوں گا ان کی ضد
ہاں سب کے نام پر ہے مرے نام پر نہیں

اب دل کو چاہیے ترے جلوہ پہ اعتبار
ہم کہہ چکے مجالِ فریب نظر نہیں

دیکھے گی کائنات جو ہم اٹھ کھڑے ہوئے
کروٹ بدل رہے ہیں کسی کو خبر نہیں

جائز سہی نوازشِ کونین کے لیے
محتاج یک نظر مرا ذوقِ نظر نہیں

دنیا کو فکر مفت کرم داشتن ہے کیوں
کرلوں گا خود گناہ فرشتہ اگر نہیں

کیسی سحر میں رات اک اپنی بنا تو لوں
یوں لاکھ بار بھی اگر آئے سحر نہیں

توبہ کے توڑنے کا تکلف نہ پوچھیے
توبہ کا ڈر ہے آج سے پینے کا ڈر نہیں

دشمن بٹھا دیا ہے کوئی اپنی راہ میں
آواز کس طرف سے یہ آئی اِدھر نہیں

آنکھوں کا احتجاج کہ اک بار اور بھی
جلوہ کا انکسار کہ بارِ دگر نہیں

شاید مری دعا میں نہ ہو مستیِ دعا
کس منہ سے یہ کہوں کہ دعا میں اثر نہیں

کیا کہہ کہ اپنی حسن سے میں آنکھ پھیرلوں
دنیا کو دیکھنا تو گناہِ نظر نہیں

چلنے کا قصہ ہے تو زمین آسمان کیا
کیوں در گزر کروں جو کوئی رہگزر نہیں
شاید چراغ سوزِ محبت کا بجھ گیا
اندھیر ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں

158

تجھ میں ہو اگر جرأت رندانہ اٹھالے
پیمانہ ہے جو حاصلِ میخانہ اٹھالے
ممکن ہے کہ ہم سا کوئی دیوانہ اٹھالے
آساں ہو غمِ عشق تو دنیا نہ اٹھالے
جب دل غمِ امروز سے دیوانہ اٹھالے
کیوں بڑھ کے نقابِ رخ فردا نہ اٹھالے
اے دوست بس اب مسندِ شاہانہ اٹھالے
ہمت سے بچھائی تھی دلیرانہ اٹھالے
میخانہ سے اٹھ جاؤں اگر ہوش میں رہ کر
دنیا سے مجھے لغزش مستانہ اٹھالے
دشمن کے لیے تحفۂ جاں لے کے چلا ہوں
ہمت ہو تو یہ ضربِ شریفانہ اٹھالے
میں مملکتِ حسن کا سلطان بنادوں
جو عشق کا اک ناز فقیرانہ اٹھا لے
کاشانہ پہ ہو بار تو جینے کا مزا کیا
اے مردِ عمل دوش پہ کاشانہ اٹھالے
اب دل میرے ہاتھوں پہ سنبھلتا نہیں مجھ سے
بڑھ کر کوئی اپنا کوئی بیگانہ اٹھالے
رستہ میں کہیں ہوش وخرد کھوئے ہیں میں نے
مل جائے تو اے لغزشِ مستانہ اٹھالے
یا حسرتِ پیمانہ میں ساقی کی طرف دیکھ
یا اپنی طرف دیکھ کے پیمانہ اٹھالے
غم ہے بہت اے دوست خوشی کم ہے جہاں میں
جو کچھ بھی تری ہمت مردانہ اٹھالے
وہ کون ہے اے تجمّ جو میخانہ میں آکر
ساغر میرے آگے سے حریفانہ اٹھالے

159

نگاہیں میری پہچانے مرا دردِ نہاں سمجھے
کبھی تو کوئی دشمن ہی محبت کی زباں سمجھے
قفس کو جو قفس اور آشیاں کو آشیاں سمجھے
چمن والے سہی رنگِ چمن لیکن کہاں سمجھے
پسینہ کو بھی اپنے جوہرِ تاب و تواں سمجھے
بہت سمجھے ہمارے خون کو جو رائیگاں سمجھے
جوابِ عرضِ مطلب پر نہیں سمجھے نہ ہاں سمجھے
زباں دانِ محبت کیا سیاست کی زباں سمجھے
ارادے دیکھ کر میرے بلائے ناگہاں سمجھے
اکیلے دم کو یہ اہلِ زمانہ کارواں سمجھے
مسلسل زندگی کی سختیوں نے کروٹیں بدلیں
جواں مردِ محبت موت کی اٹھکھیلیاں سمجھے

کسی دن آسماں کو ہم بنالیں گے زمیں اپنی
زمیں ان کو مبارک جو زمیں کو آسماں سمجھے

یہی شانِ قناعت ہے تو باز آئے قناعت سے
کوئی بے خانماں کیوں کر قفس کو آشیاں سمجھے

میں صورت دیکھتا ہوں سب کی اپنا درد دل کہہ کر
بھری محفل میں یارب کوئی تو کہہ دے کہ ہاں سمجھے

سلامت ہمتِ غم آڑ لی ہے کج کلاہی کی
کہ دل پر آفتیں آئیں ابھی دنیا جواں سمجھے

وہ کیا جانیں محبت میں بلائے رشک شامل ہے
ابھی اپنا ہی غم سمجھے ہیں میرا غم کہاں سمجھے

ملے ایسا تو کوئی سننے والا قصہ غم کا
نظر میری سی ہو میرا سا دل میری زباں سمجھے

یہ سجدے لینے والے اتفاقاتِ بلندی سے
بڑے انسان ہیں انسان کی عظمت کہاں سمجھے

یہی ذوقِ سفر ہے کیا یہی کیا شوقِ منزل ہے
جہاں تھک کر زمیں پر گر گئے آرام جاں سمجھے

کریں گے حجم کیا اردو کے دشمن قدر اردو کی
جو پشتینی سپاہی ہو وہ لشکر کی زباں سمجھے

کہنے کو حقیقت کی تلخی پتھر سا کلیجا کون کرے
ناحق کی تو چوٹیں بلکی تھیں حق بات گوارا کون کرے

دنیا میں نظر بھی حسن بھی ہے یہ ہمت بے جا کو کرے
دل دے کے تو سودے ہوتے ہیں سر دے کے یہ سودا کون کرے

احباب کو اپنا کون کہے اغیار کو اپنا کون کرے
اس آتی جاتی دنیا میں یہ اپنا پرایا کون کرے

بیٹھے تو سہی ہیں مرنے کو مرنے کی تمنا کون کرے
اے گرمیٔ محفل، محفل سے اٹھنے کا ارادہ کون کرے

منظور ہو کیوں خود داری کو اظہارِ مسرت غم کی جگہ
دل کی تو گرہ کھلتی ہی نہیں آنکھوں سے اشارا کون کرے

اربابِ کرم کی منزل سے سجدوں کے تقاضے ہوتے ہیں
اللہ کو سجدہ جب نہ ہوا انسان کو سجدہ کون کرے

گمراہ سہی اے ذوقِ سفر بڑھتے تو چلے ہی جاتے ہیں

اب راہ پہ قسمت آ ہی گئی اب راہ کی پروا کون کرے
اخلاص و عمل میں ربط نہیں ایثار سے دل بیگانہ ہے
اسلام ہی جب پلّے میں نہ ہو پھر کفر سے جھگڑا کون کرے
ممکن ہو تمہاری خاطر ہو فریاد سے توبہ کرلینا
احساس تو اپنے بس کا نہیں احساس سے توبہ کون کرے
جلوے بھی جھلک دیتے ہیں مگر جب دیکھنے والی آنکھیں ہوں
دنیا میں اُجالا تم نے کیا آنکھوں میں اُجالا کون کرے
اس نشر گہہ عالم میں کہیں پیغام صداقت ہو تو کوئی
معنی ہیں الگ مفہوم جدا لفظوں پہ بھروسا کون کرے
امید تعاون کس سے کریں پھر جذبۂ دل سو جائے گا
اک موج اٹھی ہے دریا میں اس موج کو دریا کون کرے
کیا ذوقِ نظر کی تسکیں ہو ان چلتے پھرتے جلوؤں میں
پہلو میں ہمارے دل ہے مگر شایانِ تمنّا کون کرے
اب حسنِ طلب کا لطف نہیں اب دادِ طلب ملتی ہے کہاں
سمجھے بھی کوئی آنکھوں کی زباں نظروں سے تقاضا کون کرے

(161)

طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے
میں کہتا ہوں کہ سجدہ میرے ان کے درمیاں کیوں ہو
غرورِ حسن ہوتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا
بلندی آسماں تک ہو بلند ہی آسماں کیوں ہو
بڑا دھوکا ہے فطرت کے نظامِ حسن میں ورنہ
تم ایسے خوش خیالوں پر محبت کا گماں کیوں ہو
خدا ناکردہ کوئی اپنا دشمن آپ ہو جائے
یہ کس بل ہے یہ تیور ہیں تو پھر دنیا جواں کیوں ہو
براہِ راست دل لے لو براہ راست جاں لے لو
محبت میں کوئی میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو
ہنسی آنے لگی رونے کے بدلے اپنی حالت پر
یہ خمیازہ محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو
شکستہ پا ہو جب اے حجم یہ ذوقِ سفر کیسا
دلیل کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

(162)

دل وفا کا مزار کیوں نہ رہے
خواب گاہِ بہار کیوں نہ رہے

ذوقِ غم استوار کیوں نہ رہے
میری جیت ان کی ہار کیوں نہ رہے

داغِ دل شعلہ زار کیوں نہ رہے
تم جہاں ہو بہار کیوں نہ رہے

شوخیِ حکمتِ بشر توبہ
روحِ فطرت پہ بار کیوں نہ رہے

تم ہی مالک سہی زمانے کے
ہم میں اور تم میں پیار کیوں نہ رہے

دوستی میں نزاکتیں ہیں بہت
دشمنی پائیدار کیوں نہ رہے

زندگی میں سکوں نہیں ملتا
موت کا انتظار کیوں نہ رہے

(163)

راہ پر لا نہ سکی گردشِ ایام مجھے
جھوٹ کہتا ہوں تو منزل پہ نہ ہو شام مجھے

دیکھ اے ذوقِ نظر برقِ تجلّا تو نہیں
نظر آتا ہے کوئی لرزہ براندام مجھے

میری خاطر ابھی زنجیر نے کھولی ہے زباں
ابھی خنجر سے ملے گا ترا پیغام مجھے

کر کے توبہ تری رحمت کا تعین کردوں
کچھ مناسب نظر آتا نہیں یہ کام مجھے

میری ہی سمت ہیں اب شام و سحر کی نظریں
کہ بنانی ہے نئی صبح نئی شام مجھے

میں ترے نام کی تسبیح پڑھا کرتا ہوں
سننے والے دیے دیتے ہیں ترا نام مجھے

خود پرستی ہے وہ شاید کہ خود آگاہی ہے
حق پرستوں نے دیا ہے کوئی الزام مجھے

کرمِ عام کی جنت مجھے منظور نہیں
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے کرمِ عام مجھے

صبحِ روشن ہے درخشاں تو یقیں ہے مشکل
آج برسوں میں نگاہوں سے پڑا کام مجھے

جب تک اندازِ ہوس شاملِ پرواز نہ تھا
نہ تو دانہ نظر آیا نہ کہیں دام مجھے

جن کے اقبال کا سورج ہی نہ ہوتا تھا غروب
نظر آتے ہیں وہ خورشید لب بام مجھے

ان کے بگڑے ہوئے تیور میرا دکھا ہوا دل
تجسّم اچھا نظر آتا نہیں انجام مجھے

(164)

دن گزرتا ہے شب آتی ہے سحر ہوتی ہے
جی رہا ہوں تو بہر حال بسر ہوتی ہے

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

کچھ غریبوں کی شب ایسی ہی بسر ہوتی ہے
گھر میں اندھیر زمانے میں سحر ہوتی ہے

کس قیامت کی کشاکش ہے دوراہے پہ نہ پوچھ
نہ ادھر ہوتی ہے دنیا نہ اُدھر ہوتی ہے

یہ نہ کہنا پڑے اک دن شبِ عشرت والو
ہائے ایسی بھی زمانہ میں سحر ہوتی ہے

غیرتِ عشق کے تیور ہی کہے دیتے ہیں
یہ نہ پوچھے کوئی کس طرح بسر ہوتی ہے

سوچتا کیا ہے شبِ غم بھی گزر جائے گی
دیکھتا کیا ہے گھڑی بھر میں سحر ہوتی ہے

دل زندہ کہیں لیتا ہے کسی کا احسان
مہرباں موت ہی ہوتی ہے اگر ہوتی ہے

انقلاب آتے ہیں تشکیل توازن کے لیے
وحدت امن جہاں زیرو زبر ہوتی ہے

(165)

نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب درد والے
محبت کے مالک محبت اٹھالے

اب اس پر بھی ہے غیرتِ عشق راضی
ہمارا نہ بن ہم کو اپنا بنالے

بدلتا نہیں ہے مزاجِ محبت
جفا آزما لے وفا آزما لے

سُنا ہے تمہیں سے تمہیں مانگتے ہیں
بڑے بے جگر ہیں طلب کرنے والے

محبت میں ہے یہ نزاکت کا پہلو
ہمیں کر گئے ہیں تمہارے حوالے

کوئی جان لے کر بھی اب دل نہ دے گا
کہاں دل کے بدلے میں دل دینے والے

کسی کی بڑی کاوشوں کے ثمر میں
یہ گر ہیں دلوں کی زبانوں کے چھالے

وطن میں ہیں جیسے کوئی بے وطن ہو
کسی پر خدا یہ مصیبت نہ ڈالے

یہاں دل ہی دل ہیں اور افسردگی ہے
کہیں ایک دل ہو تو سو دل سنبھالے

جہنم میں جاؤں تو اے حجم رضواں
اٹھاکر جہنم کو جنت میں ڈالے

(166)

موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے
مرتے مرتے زندگی کا گیت گانا چاہیے

جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہلِ دل
پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانا چاہیے

آو دل کے مسئلہ کا حل بتادیں ہم تمہیں
بات کرتے ہو تو پہلے مسکرانا چاہیے

جنگ کے سامان کی ہولی جلانا چاہیے
توڑ کر دستِ ہوس ایندھن بنانا چاہیے

خستگیٔ عشق کی رسمِ کہن بدلیں گے ہم
بے خودی کیسی خودی کا رنگ لانا چاہیے

زندگی یہ ہے جدھر ہم ہوں ہوا اُس رخ کی ہو
کون کہتا ہے ہوا کے رخ پہ جانا چاہیے

سر اٹھا کر جلوہ زار ایشیا سے ہر طرف
امنِ عالم کی فضا کو مسکرانا چاہیے

اس قدر بے کیف اگر گزری تو کیا گزری حیات
ایک شب کی شب تو پھولوں میں بسانا چاہیے

رشک دشمن کیا بلا ہے شاد باش دوست کیا
آپ اپنی داد دے کر دل بڑھانا چاہیے

سوچتا ہوں حسن عشوہ کار سے کھا کر فریب
آج موجودات کو اپنا بنانا چاہیے

فرض ہے حفظِ مراتب عزتِ نفسِ حیات
موت سے دو اک قدم آگے ہی جانا چاہیے

پاؤں پھیلانا ہے تہذیب وتمدن کے خلاف
بیٹھنے اٹھنے کا سب ہی کو ٹھکانہ چاہیے

ہلکی ہلکی تھپکیاں کیسی ہوائے لطف کی
زلزلہ کوئی زمینِ دل پہ آنا چاہیے

وسعتِ کونین کم ہے اپنی ہستی کے لیے
اپنے دل میں اپنی آنکھوں میں سجانا چاہیے

آمد و شد ہر نفس کی دے رہی ہے یہ پیام
حق کو آنا چاہیے باطل کو جانا چاہیے

(167)

ظالم مری نظر میں محبت کا زہر ہے
مجھ سے نظر ملا جو محبت کا ڈر نہیں

عزت کی موت مانگنے نکلا ہوں عشق سے
ذلت کی زندگی مجھے مدنظر نہیں

اومستِ عیش نیند کے مارے ابھی نہ اٹھ
کروٹ بدل رہا ہے زمانہ سحر نہیں

آزادیٔ خیال نہ آزادیٔ عمل
قیدی کی طرح گھر جو نہیں ہے تو گھر نہیں

مجھ پر نگاہ دیر و حرم اٹھ رہی ہے مجم
سجدہ مجھے قبول نہیں ہے کہ سر نہیں

(168)

شباب نام ہے غفلت کی نیند آنے کا
حوادثات کو تابو نہیں جگانے کا

قلق ہے اشکِ ندامت میں ڈوب جانے کا
ملا نہ خون میں اپنے مزا نہانے کا

نمودِ عشق کو دار ورسن سے کیا نسبت
بہت بلند ہے معیار آزمانے کا

دل حریص ہے مایوسیوں کے نرغہ میں
مزا ملا ہے ہوا پر مکاں بنانے کا

جگہ ملے کہیں سجدہ کی سرگزاروں کو
قفس کا تنگ ہے دامن نہ آشیانے کا

عدم سے جانب ہستی چمن سے سوئے قفس
ہر انتظام میں ہے دخل آنے جانے کا

نیازِ عشق کجا اور نمازِ خوف کجا
ادائے فرض میں ہے فرق سر جھکانے کا

میں زادِ راہ سے محروم اور سفر درپیش
اجل کو ہوش کب آیا مرے جگانے کا

بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے حجم
میں ایک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانے کا

169

بھری دنیا پہ جب ڈالی نگاہِ آخری میں نے
تو سوچا کس لیے دو دن کو یہ تکلیف کی میں نے

ازل میں لے لیا پورا متاعِ بندگی میں نے
محبت اس سے کیا مانگی خدائی مانگ لی میں نے

لیا ہے نذرِ جاں دے کر مقامِ آگہی میں نے
زمانہ چیخ اٹھا کچھ کہہ کے جب چپ سادھ لی میں نے

کہیں دیکھا نہ اتمامِ صراطِ بندگی میں نے
الٰہی اِک نظر میں ساری دنیا دیکھ لی میں نے

وفا کا اعتراف اُس نے زباں سے کرلیا آخر
محبت کی بڑی مظبوط گتھی کھول دی میں نے

خودی ہے بیخودی ہے بندگی ہے کفر ہے کیا ہے
دوا بھی چھوڑ دی میں نے دعا بھی چھوڑ دی میں نے

نہ پہنچا ایک بھی منعم مقامِ کامیابی تک
لیے ہیں امتحاں کتنے بہ فیضِ مفلسی میں نے

ہنسی آئی مجھے خود یہ دورنگی دیکھ کر اپنی
کبھی زور آزمایا اور کبھی فریاد کی میں نے

خدا رکھے یہ واعظ بے عمل اچھا مقرّر ہے
کہانی سی کہی اس نے کہانی سی سنی میں نے

مجھی کو میری بربادی کا وہ الزام دیتے ہیں
چھپا رکھی تھی جیسے دوستی میں دشمنی میں نے

صدائے عشق آئی حسن کی ناز آفرینی پر
ترے قدموں پہ رکھی تھی کلاہِ خسروی میں نے

کوئی آساں نہ تھا اظہارِ درد و مدعا کرنا
بڑی مشکل سے کی الفاظ کی مورت گری میں نے

کسی دن نجم کہنا ہے خدائے بندہ پرور سے
ترے لطف وکرم سے لی ہے تابِ سرکشی میں نے

170

اسے کیا ہو دماغِ خاکساری
جو آلودہ ہے خاکِ سیم و زر میں

سحر بھی آئے گی بزمِ طرب کی
کچھ آنسو جمع کرلو رات بھر میں

مری ایذا پسندی کچھ نہ پوچھو
جگہ کرلی دلِ بیداد گر میں

وہ مل جائیں کبھی میں پوچھ بیٹھوں　　یہ کب تک جنگ ہوگی خیروشر میں
عمل ساری حقیقت کھول دے گا　　چھپا ہوں اعتباراتِ نظر میں
یہ آزادی یہ آزادی کا جلوہ　　چراغِ شام ہے مفلس کے گھر میں
ہمارا سا سکونِ دل کہاں ہے　　بڑی الجھن ہے اربابِ خبر میں
ہوا ہے میری بے ربطی سے اے حجم　　بہت کچھ رابطہ عیب و ہنر میں

(171)

کعبہ و دیر سے پیام آئے　　تیری جانب جو چند گام آئے
لب پہ مستی میں تیرا نام اے　　ہوش اتنا کہ نا تمام آئے
عشق کا معرکہ معاذ اللہ　　کیسے کیسے جوان کام آئے
پھر مجھے آرزوئے زیست ہوئی　　پھر ترے لب پہ میرا نام آئے
یوں بسر کر جہانِ فانی میں　　صبح رخصت نہ ہو کہ شام آئے
پھر دکھاتی ہے ان کو قدرت حسن　　پھر کوئی خوش نصیب کام آئے

(172)

کہہ چکے سب کہہ کے اب کیا کیجئے　　کچھ نہ کہنے کی تمنا کیجئے
موت آئیگی یہ غم کیا کیجئے　　پہلے ماتم زندگی کا کیجئے
درد لیجئے دل کا سودا کیجئے　　وہ ازل کا عہد پورا کیجئے
اِک اچٹتی سی غریبوں پر نظر　　کام کچھ تو راہِ مولا کیجئے
جان و دل دے کر بھی سستی ہے یہ جنس　　کچھ غمِ عشق اور مہنگا کیجئے
میرے دل سے کام لیں گے تا کجا　　اپنے دل میں درد پیدا کیجئے
بے نیازی اس قدر کس کام کی　　بھولے بھٹکے حال پوچھا کیجئے

(173)

محبت میں محبت کے تقاضے بھول جاتے ہیں　　ہم ان کو یاد کیا کرتے وہ خود ہی یاد آتے ہیں
سحر آتی ہے جب نزدیک تارے جھلملاتے ہیں　　یہ ظالم آخری لمحوں پہ اپنے مسکراتے ہیں

جنہیں توفیق دیتی ہے فدا کاری محبت کی
وہ اپنی زندگی دے کر بھی دل سے دل بناتے ہیں

جسے وہ یاد فرمائیں کہیں رکتا ہے روکے سے
زمانہ دیکھتا رہتا ہے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ہماری سمت جب اُٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی
ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کر کے چھپاتے ہیں

محبت کا ہے کیا معیار اس کا فیصلہ کیا ہو
کچھ ان کے غم میں روتے ہیں کچھ ان کی دُھن میں گاتے ہیں

بہتر سردئے ہیں ایک دن میں سرگذاروں نے
بڑی مشکل سے انساں عشق پر ایمان لاتے ہیں

چھپاؤں تجم ان سے کس طرح آثار چہرے کے
جو میرے ضبط غم کو دیکھ کر گھبرائے جاتے ہیں

(174)

میرے دل میں جو دل تمہارا ہو
دل سے دل کو بڑا سہارا ہو

اس نے الٹی ہیں محفلیں اکثر
جس کو بیگانگی نے مارا ہو

بات ہی اور ہے اشارے کی
بات کیوں ہو کوئی اشارا ہو

مجھ سا خوددار اور یہ وحشت
جیسے تم نے مجھے پکارا ہو

دل ہے دل کا جہاں سوال آئے
وہ ہمارا ہو یا تمہارا ہو

آج میری طرف ہے روئے سخن
اب کسے بے رخی گوارا ہو

ہم ہیں اس بیگناہ کے قائل
جو گنہگار کا سہارا ہو

اس کا عہد حیات کیا جس نے
وقت کٹنے کو دن گذارا ہو

میرے در پر ذرا اُتر آئے
میری قسمت کا جو ستارا ہو

ہم تو ہندوستان والے ہیں
کاش ہندوستاں ہمارا ہو

تجم اس کے خلاف جانا ہے
جس طرح زندگی کا دھارا ہو

(175)

محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی
یہ بجلی ہر خس و خاشاک سے ٹکرا نہیں سکتی

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

گرا کر عرش سے بھی حسن بے پروا نے دیکھا ہے
کوئی عالم ہو میری آدمیت جا نہیں سکتی

متانت آچکی ہے ان کے لہجے ان کی باتوں میں
وہ چاہیں لاکھ چہروں پر متانت آ نہیں سکتی

نہ ہوں فکر و نظر جب تک محبت کی بلندی پر
بشر کی شان خود اس کی سمجھ میں آ نہیں سکتی

نہ سمجھو دوست کی حد تک کمال اپنی محبت کا
ابھی ناقص ہے دشمن کو اگر تڑپا نہیں سکتی

حیات چند روزہ لے تو آئی مجھ کو منزل تک
حریمِ ناز کا پردہ مگر سرکا نہیں سکتی

میں دنیا سے بچا کر اپنے دل کو حق بجانب ہوں
یہ دنیا میرے دل کی وسعتوں کو پا نہیں سکتی

کبھی تیرِ نگاہ ناز خالی جا نہیں سکتا
کوئی نیکی بھی ایسے وقت آڑے آ نہیں سکتی

نشیمن میرا رہنے دو چمن میں آنچ اگر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

خوشی ہو یا ہو غم اک ٹھیس ہے دل کی لطافت پر
سمجھ میں ہر کس و ناکس کے یہ بات آ نہیں سکتی

گرا ہوں روانقبلہ جب بھی ٹھوکر میں نے کھائی ہے
مری خودداری ایسی ویسی ٹھوکر کھا نہیں سکتی

ہمیشہ دل دکھائے گا خدا کی راہ میں واعظ
یہ رندوں کو برا کہنے کی عادت جا نہیں سکتی

کرم پر ان کے آجاتے ہیں آنسو میری آنکھوں میں
مصیبت ہو کسی عنوان کی رُلوا نہیں سکتی

محبت کے عوض ان سے محبت بھی نہ چاہوں گا
مری غیرت کبھی دستِ طلب پھیلا نہیں سکتی

حقائق ہی رہیں گے تجمّم میری سعی کا حاصل
خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

(176)

نور ہے کہ ظلمت ہے عشق کی بلا جانے
شمع کے اُجالے میں سور ہے ہیں پروانے

حسن جلوہ آرا کی ندرتیں وہی جانے
عشق ایک جذبہ ہے ان گنت ہیں افسانے

کوئی کچھ نہیں کہتا آپ کے تغافل کو
دوست آئے ہیں اب تک سب ہمیں کو سمجھانے

امن کے محافظ بھی ضبط کر نہیں پاتے
جب کبھی چھلک اٹھے درد و غم کے پیمانے

اٹھ گئے ہیں محفل سے کیسے کیسے دل والے
مڑ کے بھی نہیں دیکھا ناشناس دنیا نے

وقت کا تقاضا ہے دوش دیجیے کس کو
ہے کمی حقائق کی بڑھ چلے ہیں افسانے

سب کو مل نہیں سکتا عشقِ دوست کا منصب
دل ڈبوئے ہیں کتنے شوقِ بے محابا نے

ہم بنانے والے ہیں ہم بگاڑنے والے
کیا کہیں برستے ہیں آسماں سے ویرانے

مجھ کو خود نہیں ہے جب اپنی معرفت حاصل
میں گلہ کروں کس سے کون مجھ کو پہچانے

اعتبار حق ہو یا اعتبار ناحق ہو
آج تک جلایا ہے اعتبار فردانے

آپ اپنی صورت پر خلق کر کے انساں کو
عشق کی بنا ڈالی حسنِ کار فرمانے

تجمّ ہم موحد ہیں ہم پہ کیا اثر ہوتا
بے شمار بدلے ہیں رنگ روپ دنیا نے

177

ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا
کسے زبانِ محبت کا اعتبار آیا

فضائے شوق میں جو اپنے جی کو مار آیا
حیات موت کی سرحد پہ رستگار آیا

غرورِ عشق میں سر نذر کر دیا میں نے
نگاہِ ناز کا ایک قرض تھا اتار آیا

خود اپنے حسن طبیعت کا عیش کیا کم تھا
خیال میں نہ کبھی عیشِ روزگار آیا

رہِ طلب میں بڑی روک تھام تھی لیکن
قدم بڑھا دیئے جس نے وہ ہاتھ مار آیا

شریک حال تھی عہد خزاں میں خود داری
زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

نہ جانے کس کو پکارا تھا اس کی رحمت نے
تڑپ کے میں نے صدا دی گناہگار آیا

نئے نئے جو سُنے ہر فضا میں نام اُس کے
بغیر نام کے بھی میں اُسے پکار آیا

کجا تصورِ حق تہ ملی نہ باطل کی
مرے خدا میں بہت ہاتھ پاؤں مار آیا

لگا کے تجمّ محبت میں آخری بازی
شعورِ فکر و نظر کی رقم بھی ہار آیا

کسی نے اپنی محبت کا تذکرہ جو کیا
مجھے بھی یاد مرا خوابِ خوشگوار آیا

178

عفتِ قلب کے سوا کچھ بھی نہ تھا گناہِ عشق
عقل نے جائزے لیے ذہن گناہ گار کے

دل ہو کہ چشمِ شوق ہو ہیں یہی کردگارِ حسن
تم ہو نمونۂ حسیں قدرت کردگار کے

عہدِ حیات سربسر عالم انتظار ہے
اہلِ خرد بھی ہیں اسیر وحشت انتظار کے

رند ہیں اب بھی رقص میں ساغر مئے کے ساتھ ساتھ
بوالہوسوں کا ذکر کیا رہ گئے تھک کے ہار کے

پھر وہی ہم ہیں اور وہی رہگزر فنا کی خاک
رنگ بہت بدل چکے پر ہیں اسی غبار کے

حیرتِ حسن کچھ نہ پوچھ عالمِ عشق کیا کہوں
خاک لحد پہ دیکھ کر نقش جبینِ یار کے

اپنی ہوئی نہ کوئی شئے منظرِ کائنات میں
دل پر کچھ اختیار تھا رہ گئے دل کو مار کے

بزمِ سخن میں آ گئے تجمّ خودی کو چھوڑ کر
بن گئے کب سے آدمی رخت جنوں اُتار کے

179

مرے شعر نشتر نشاں اور بھی ہیں
ترے نام کی چٹکیاں اور بھی ہیں

زر وسیم سے تھیلیاں بھرنے والے
تقاضائے تاب و تواں اور بھی ہیں

ہمیشہ ادھر ہی نہ برسیں گے بادل
زمیں اور بھی بستیاں اور بھی ہیں

ہمیں اک نہیں دور مقصد سے اپنے
زمانہ میں بے رطبیاں اور بھی ہیں

ابھی ایک ہی لی ہے دنیا نے کروٹ
غریبوں کی شہہ زوریاں اور بھی ہیں

تمہیں اپنا بحرِ کرم ہو مبارک
جہاں ہم ہیں پیاسے وہاں اور بھی ہیں

محبت ہے کیوں جمؔ ہندوستاں سے
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

180

اٹھوں گا زندۂ جاوید ہوکر بزم امکاں سے
بڑی جمعیت خاطر ہے اس خوابِ پریشاں سے

خدا محفوظ رکھے چارہ گر کے بار احساں سے
وہ کیا جانے انہیں ہے درد سے نسبت کہ درماں سے

یہ محرومِ تجلّی منہ جو تکتے ہیں پشماں سے
جو بس چلتا تو لذّت چھین لیتے چشمِ حیراں سے

تو ازن کر رہا ہوں اپنے دردِ عشقِ پنہاں سے
غمِ دیر و حرم لے کر مسلماں نا مسلماں سے

جئے تا حشر پر اٹھنا ہے اک دن بزمِ امکاں سے
قیامت ہے جو پیاس انساں بجھائے آبِ حیواں سے

بھروسہ کر خدا پر ناخدا وہ بھی تو انساں تھے
سلامت لے گئے جو اپنی کشتی بیچ طوفاں سے

رہے گی قبر پر بھی حشر تک نعم البدل ہوکر
اُداسی ساتھ لے آئے ہیں ہم اسبابِ زنداں سے

خدا جانے نظر کس بدنظر کی لگ گئی دل کو
زمانہ چونک اٹھا تھا اختلاطِ درد و درماں سے

تصور ہی میں ہوجاتا سکونِ عافیت حاصل
کوئی تصویر بن جاتی جو تخئیل پریشاں سے

سنا تھا بے سروسامانیاں مرغوب ہیں ان کی
میں گھبرا کر نکل آیا طلسمِ سازوساماں سے

دلِ ذوق آشنا دیکھیں کہاں سے پھول چنتا ہے
بہارِ عارضی سے یا بہارِ باغ رضواں سے

کسی دن جا ملے گی روح اس بحرِ حقیقت میں
کہاں تک واسطہ اے جمؔ آب و گل کے زنداں سے

181

جنہیں تم نے خلافِ وقت سمجھا بے محل جانا
انہیں آہوں سے ممکن ہے ہوا کا رُخ بدل جانا

جہنم کے سے تیور ہوں تو ہم جنت کو ٹھکرا دیں
کوئی جنت سے جانا ہے گلستاں سے نکل جانا

ستاروں کی بلندی اپنی پستی دیکھتا ہوں میں
ضیا پاشی سے مشکل ہے مری چتون کا بل جانا

خدا کی شان اُن کو سلح کی کرنی پڑیں باتیں
بہت دشوار نکلا میرا باتوں میں بہل جانا

مبارک منتِ صیاد و ترکِ زحمتِ زنداں
یونہی اے جانے والے موت بھی آئے تو ٹل جانا

قیامت تک اداکارِ محبت یاد رکھیں گے
محبت کے ترانوں کا مرے لفظوں میں ڈھل جانا

جناب حجم ہیں مسند نشیں کچھ دن سے زنداں میں
تقاضائے ادب ہے جانے والے سر کے بھل جانا

182

مسکراہٹیں سیکھیں قہر کی نگاہوں سے
دادِ سرکشی لے لی ہم نے کجکلاہوں سے

کیا کہیں محبت کا راز کم نگاہوں سے
ہم نے دل بنائے ہیں آنسوؤں سے آہوں سے

طاقتیں مسلّم ہیں علم و عقل کی لیکن
عشق کو تعلق کیا ان پناہ گاہوں سے

اپنی معرفت کا ہم ایک دن سبق دیں گے
دیکھتے چلے جاؤ اجنبی نگاہوں سے

جبر کا شکنجہ تھا میری ناتواں گردن پر
موت نے چھڑایا ہے زندگی کی بانہوں سے

اس کے حق کا مجرم ہوں یہ بھی اس کی رحمت ہے
خود بچالیا مجھ کو مبتذل گناہوں سے

فرش پر ہے تخت ان کا عرش پر دماغ اپنا
کیا فقیر رہتے ہیں دب کے بادشاہوں سے

زندگی کا بھی جن کو حق دیا نہ دنیا نے
حکم انقلاب آیا ان کی قتل گاہوں سے

سارے مسئلے حل ہیں مسلکِ محبت میں
ان کی راہ ملتی ہے بے شمار راہوں سے

حجم یہ نشانی ہے اہلِ دل کی دنیا میں
ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

183

زحمت کریں نہ میرے لیے جلوہ گاہ سے
میں آپ آرہا ہوں محبت کی راہ سے

ہلچل ہے زندگی میں غمِ بے پناہ سے
آتی ہے کس کے خون کی بو قتل گاہ سے

جب چل کھڑے ہوئے ہیں تری جلوہ گاہ سے
جو کچھ بھی ہو پلٹ کے نہ آئیں گے راہ سے

کل ذوقِ جستجو کا اڑایا گیا مذاق
بنتی ہے شمع آج مری گردِ راہ سے

ہم بھی خدا پرست ہیں تم بھی خدا پرست
یہ چوٹ کس کے دل پہ لگی لا الٰہ سے

کیا ہوگا فیصلہ مری ذوقِ نگاہ کا
دنیا کو دیکھتے ہیں سب اپنی نگاہ سے

تھا مئے کا تذکرہ تو بہت مئے کہیں نہ تھی
ہم سو سلام کرکے اٹھے خانقاہ سے

ہر انقلابِ دہر ہے تمہیدِ انقلاب
طوفان اک اٹھے گا میری قتل گاہ سے

کیا سخت باز پرس ہے میدانِ حشر کی
جیسے کہ سابقہ ہو کسی قرض خواہ سے

ہو زندگی دراز مرے ذکرِ خیر کی
تسکین ہورہی ہے بہت واہ واہ سے

فطرت بھی اپنے فرض سے غافل ہے کس قدر
سنتا ہوں بے نیاز ہیں وہ اشک و آہ سے

اے دوست طے نہ ہوں گی حقائق کی منزلیں
شقِ تصورات سے ذوقِ نگاہ سے

شاعر سمجھ کے حجم کو سمجھے ہیں سادہ دل
واقف نہیں ہیں آپ بھی اس کجکلاہ سے

184

روئے فرزانگی سیاہ کریں
دلِ دیوانگی میں راہ کریں

زندگی بھر اِدھر اُدھر دیکھا
آج اپنی طرف نگاہ کریں

غم میں توفیق وہ تبسم کی
کیوں تماشائے اشک و آہ کریں

آؤ دونوں برے بھلے مل کر
جس طرح ہوسکے نباہ کریں

آدمی سے ہو کیوں نظر نیچی
اپنے اللہ کا گناہ کریں

دشمنی میرا کیا بگاڑے گی
دوست بن کر مجھے تباہ کریں

میرزا حجم سے نہ کچھ کہنا
چاہے جو کچھ یہ کجکلاہ کریں

185

ختم دم بھر میں کارِ ہستی ہے
کیا اجل کی دراز دستی ہے

ناز بے جا نہ کر بلندی پر
ہر بلندی کی اصل پستی ہے

کل ہمیں کچھ جنونِ ہستی تھا
آج انہیں کچھ غرورِ ہستی ہے

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزت کی موت سستی ہے

اپنے اپنے بنا لیے ہیں خدا
ہر پرستش میں خود پرستی ہے

موت کا ایک دن ہے اک ساعت
زندگی رات دن برستی ہے

مہر و مہ بھی ہیں مجسم دنیا میں آدمی سے مگر یہ بستی ہے

186

رازِ ہستی ہے مبتلا ہونا کہیں بندہ کہیں خدا ہونا
ہائے آسانیاں نہ ہونے کی کیسا دشوار ہوگیا ہونا
نہ ہوئے کچھ جو سوچتے ہی رہے درد ہونا ہے یا دوا ہونا
چشمِ احباب میں بھی کھٹکا ہوں کیا بُرا تھا مرا بھلا ہونا
آدمیت بغیر دنیا میں ہائے وہ آدمی نما ہونا
راس آئے جناب مجسم تمہیں سالک جادۂ وفا ہونا

187

اس کی دنیا کو برا کہتا ہے کیا کیا کوئی خیر ایسی ہی بنادے کہیں دنیا کوئی
دشمنوں سے کرے کس بات کا شکوہ کوئی دوستوں میں مرا درد نہ سمجھا کوئی
کار فرما نہ ہو جو طاقتِ یکتا کوئی کس سے ترک کرے اپنا ارادہ کوئی
کل کی بات سجائی تھی یہ محفل ہم نے آج محفل میں نہیں پوچھنے والا کوئی
ہم نشیں سلسلۂ عیش نہ ٹوٹے ان کا کیا قباحت ہے اگر دل کہیں ٹوٹا کوئی
سینکڑوں فتنے اٹھائے اسی دنیا کے لیے لے گیا سر پہ اٹھا کر نہ یہ دنیا کوئی
فکرِ عصیاں میں گرفتار ہوں پہ فکر بھی ہے میرے اللہ نہ ہو دیکھنے والا کوئی
خواہشِ امن بجا امن کی کوشش برحق جب ضرورت ہو اٹھا دیجئے جھگڑا کوئی
ان کی رفتار کے انداز خدا خیر کرے جیسے دیکھا ہے نہ گرتا نہ سنبھلتا کوئی
مل گئے آج مقدر سے جناب واعظ ہم نے دیکھا نہ تھا دنیا میں فرشتا کوئی
نظر آتی نہیں فطرت کے خزانہ میں کمی پیاس کیا خاک بجھائے اب دریا کوئی
فطرتِ عشق جو دے ساتھ تو آسکتا ہے ساری دنیا کے مقابل تنِ تنہا کوئی
سایۂ حق میں بھی مل جاتی ہے ناحق کو پناہ کبھی چھپ جاتا ہے سچوں میں بھی جھوٹا کوئی
دوستوں سے بھی یہ ہر وقت کا خطرہ ہے مجھے میرے دشمن سے نہ لے لے مرا بدلا کوئی

حرفِ حق کے لیے درکار ہے ہمت ورنہ　　کیا سمجھتا نہیں فطرت کا تقاضا کوئی
رحم اے جذبۂ خود دار جئے گا کب تک　　اپنے کاندھے پہ لیے اپنا جنازا کوئی

(188)

دل میں رکھ حال جو دل خواہ نہیں　　یہ تماشائے سرِ راہ نہیں
اپنے حق میں ہیں حق آگاہ بہت　　میرے حق سے کوئی آگاہ نہیں
بدگمانی کا گنہگار نہ بن　　راہ گم کردہ ہوں گمراہ نہیں
زندگی ہے عمل و حُسنِ عمل　　زندگی آہ نہیں واہ نہیں
اپنے ہم جنس کے آگے بھی نہ جھک　　تیری منطق میں جو اللہ نہیں
درد ہے درد کسی دل میں بھی ہو　　تو اسی راز سے آگاہ نہیں
کس حکومت کے ہوا خواہ ہو حجم　　حجم جب اپنے ہی ہوا خواہ نہیں

(189)

مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے　　ٹھہر جاؤں تو باقی ہے گزر جاؤں تو فانی ہے
محبت میری رگ رگ میں شرابِ ارغوانی ہے　　کہاں کا نشۂ مے میرا نشہ جاودانی ہے
جوانی آئی جاں آئی غم آیا موت آئی ہے　　ابھی کیا جایئے کس کس سے طاقت آزمانی ہے
غلط پڑتی ہیں درد و غم کی بھٹکائی ہوئی نظریں　　براہ راست جب دیکھے کوئی دنیا سہانی ہے
میں پچھتاتا ہوں کیا کیا اپنا غم کہہ کر زمانہ سے　　سناتا ہوں جسے کہتا ہے میری ہی کہانی ہے
گمانِ بدغلط راہِ طلب کے ذرّہ ذرّہ پر　　قدم کیوں کر اٹھیں اپنے ہی دل سے بدگمانی ہے
محبت میں نہ جینے کا ارادہ ہے نہ مرنے کا　　اہل پر فیصلہ ٹھہرا تو اب جینے کی ٹھانی ہے
مزاجِ درد سے بگڑا ہوا انداز پرسش ہے　　کہیں ایسا نہ ہو کہہ دوں تمہاری مہربانی ہے

(190)

کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا　　تلاش کوئی نہ کرتا اگر خدا ملتا
یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جاتے　　قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا
ترے خیال میں ہوتی ذرا بھی جان اگر　　ترا خیال کبھی تو عمل سے جا ملتا

ابھی تلاش میں اب تک ہے ذہنِ انسانی
کسی طرح سے وہ کھویا ہوا سرا ملتا

سکونِ قلب کوئی رہ گزر کی چیز نہیں
اٹھا کے لے ہی نہ آتے اگر پڑا ملتا

حیات و علم و نشاط و ملال و دانش و مرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

ستم ہی تھا جو کہیں معرفت میں کھو جاتے
جنابِ نجم کہاں آپ کا پتا ملتا

(191)

اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی
کہاں گم ہوگئی وہ شاہ راہِ زندگی اپنی

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے
بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

بدلنا ہی پڑا ہم کو بساطِ دہر کا نقشہ
یہ سمجھے تھے بدل جائے گی حالت آپ ہی اپنی

زہے قسمت اُسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

کبھی ترمیم کر لیتے ہیں احکامِ شریعت میں
ابھی ورنہ خدائی ہے خدا کی بندگی اپنی

ادھر بھی دیکھ لینا اک نظر دورِ سحر والو
چراغ صبح لے کر جا رہا ہے روشنی اپنی

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا
وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

(192)

دیکھوں تو راہِ غم میں کوئی ہم رکاب ہے
کچھ دوست کہہ رہے تھے یہ کارِ ثواب ہے

ظاہر ہے ایک باب نہاں ایک باب ہے
یہ کائناتِ دہر ادھوری کتاب ہے

یہ ظاہری سکوں روشِ اضطراب ہے
اک انقلاب اور پسِ انقلاب ہے

اپنی خرابیوں پہ کسی کی نظر نہیں
ایک ایک کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

جب دل کا تھا شباب محبت کا دور تھا
اس دور میں دماغ بشر کا شباب ہے

پیدا ہوئے زمانہ مردہ پرست میں
نا کام زندگی تھی ابھی کامیاب ہے

کچھ اور بڑھ چلوں وہ اگر مطمئن نہیں
اب تک تو صبر ان کے ستم کا جواب ہے

میں اب کسی عذاب کے قابل رہوں گا کیا
ہر اک گناہ اپنی جگہ خود عذاب ہے

وہ بھی تھے خواب کو جو حقیقت بنا گئے
ہم زندگی کو خواب ہی سمجھیں تو خواب ہے

دیکھو تو ان کو دے کے نویدِ سکون مرگ
جن کی حیات اک ہمہ تن اضطراب ہے

تم جس کو اقتدار سمجھ کر ہو بے حواس
یہ عالم خیال میں تعمیرِ خواب ہے

یارب میں زندگی کے عطیہ کو کیا کہوں
درپیش ایک ایک نفس کا حساب ہے

سو جس نے کامیابی کی راہیں بتائی ہیں
وہ ایک میری کوششِ ناکامیاب ہے

(193)

فریضۂ غم الفت نہ کیوں ادا کرتے
یہ کچھ نماز نہیں ہے جسے قضا کرتے

جو دردِ عشق میں دل کو نہ مبتلا کرتے
کسے خبر ہے کہ ہم حال اپنا کیا کرتے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے
اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے

جو ناتواں ہیں وہ گر کر نہیں اٹھا کرتے
خیال خام یہ رہتا تو جی کے کیا کرتے

حرم کی شمعِ فروزاں ہیں بت کدہ میں سہی
یہاں پہنچ تو گئے ہم خدا خدا کرتے

دعا پہ کیوں دلِ خود دار ہوگیا راضی
ستم ہے شرم جو آئی کہا دعا کرتے

ابھی بہت ہیں یہ دو چار آخری سانسیں
خدا نخواستہ کیوں ترکِ مدّعا کرتے

ترے کرم کی ہے بنیاد مفلسی جن کی
وہ کیوں ترے درِ دولت پہ التجا کرتے

خدا کا شکر کہ دل ہی نہیں رہا ورنہ
ترے سلوک پہ دل سے یوں ہی اٹھا کرتے

جب اہلِ درد سے قربانیاں طلب ہوتیں
ہم اپنے خونِ تمنا سے ابتدا کرتے

عجیب شان کی ہے انتہا پسندی بھی
کہیں تو اپنے ستم کی وہ انتہا کرتے

زہے جلال کہ شاہوں کو دستِ قدرت نے
کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے

مزہ تھا جب سرِ منزل غرورِ منزل کا
ہمارے نقشِ قدم کو نہ رہنما کرتے

اگر وہ داد نہ دیتے نیاز مندی کی
تو ہم غرورِ محبت پہ اکتفا کرتے

جو دوستوں پہ بھی چھپ چھپ کے وار کرتے ہیں
بھلا وہ کیا کسی دشمن کا سامنا کرتے

بھلے رہے وہ زمانہ میں ہم نوا ہوکر
خدا کی راہ میں کس کس سے دل بُرا کرتے

میں مجسم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ
مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

(194)

تدبیر اگر فاتحِ تقدیر نہیں ہے
انسان بجز پیکرِ تصویر نہیں ہے

کیا اب بھی کوئی دور ہے آزادیٔ کامل
اب اک خطِ زنجیر ہے زنجیر نہیں ہے

میں سر بگریباں ہوں تو تنہا ہے زمانہ
خود جرم ہے یہ جرم کی تعزیر نہیں ہے

یوں ہار کے رفتار زمانہ سے نہ بیٹھو
جیسے کہ بس اب موت میں تاخیر نہیں ہے

ان کاتبِ اعمال فرشتوں سے کہے کون
ہر اک عمل قابل تحریر نہیں ہے

اب نیند ہے عزت کی نہ بیداری ہمت
شمشیر نہیں سایۂ شمشیر نہیں ہے

کیوں آئنہ کے سامنے اس روپ میں آیا
پاداش عمل ہے مری تصویر نہیں ہے

آنچ آتے ہی الزام کی دل ہوگیا پانی
کہتا ہی رہا میں مری تقصیر نہیں ہے

مل جائے تو اس وضع سے دنیا کو نہ برتو
جیسے کوئی اس خواب کی تعبیر نہیں ہے

دل کہتا ہے کچھ اور نظر اور زبان اور
کیا بات بنے بات میں تاثیر نہیں ہے

ہاتھ اٹھے ہیں کھلتی نہیں آواز دعا میں
انسان ہوں غصہ تو گلوگیر نہیں ہے

اک حشر بھی اٹھا نہیں رفتار عمل سے
شاید وہ دل آویزی تقریر نہیں ہے

اکسیر نہ کہنا مری خاکستر دل کو
میں خوش ہوں کہ دل خاک ہے اکسیر نہیں ہے

الفاظ بھی آزاد ہیں انداز بھی آزاد
قسمت سے کوئی دست بہ شمشیر نہیں ہے

دل موم بناؤں غمِ ہستی میں کہ فولاد
یارب یہ مرے ہاتھ کی تعمیر نہیں ہے

بسمل تمہیں کردیتا ہے کیوں لفظِ محبت
اک بات ہے تلوار نہیں تیر نہیں ہے

میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے نجمؔ
بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

جیسے میں الٹے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا
راہِ وفا کے ذرّے آنکھیں دکھا رہے ہیں

دیکھی ہے ہم نے دنیا رازِ کرم نہ پوچھو
صبر آزما چکے اب جبر آزما رہے ہیں

کیا سانس اکھڑ رہی ہے کیا دم الٹ رہا ہے
ہم شامِ زندگی کا اک گیت گا رہے ہیں

اک نقش آب و گل کو جلوہ بنا دیا ہے
اے حسن کے تماشے ہم دل بڑھا رہے ہیں

کوئی خودی سمجھ لے یا بیخودی سمجھ لے
دنیا خراب کرکے اک گھر بنا رہے ہیں

میرے سکون غم پر اب حُسن مضطرب ہے
خودداریوں کے صدقے جلوے بلا رہے ہیں

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں　　زیر قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں
میں سوچتا ہوں دل ہی اس سمت بڑھ رہا ہے　　میں دیکھتا ہوں وہ بھی نزدیک آ رہے ہیں

اشکوں کی رو میں بجھی دل کا لہو بہا کر
غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

○

نعتیہ رباعیات

(1)

ہے نورِ محمدیؐ سراپا باقی　　دنیا فانی ہے وجہ دنیا باقی
بندوں کا بھی محبوب خدا کا بھی حبیب　　اب اور دو عالم میں رہا کیا باقی

(2)

حاصل تھی جسے نام ونسب کی معراج　　جس کے لیے تھی رحمتِ رب کی معراج
کیا پوچھتے ہو نعت کو شاعر کا مقام　　توصیفِ پیمبرؐ ہے ادب کی معراج

(3)

مفہومِ رسولؐ عربی ہیں احمدؐ　　مکّی مدنی مطلبی ہیں احمدؐ
گذرے ہیں ہزار آدم و عالم بھی اگر　　ہر آدم و عالم کے نبی ہیں احمدؐ

(4)

محفوظ ہے اسلامِ رسولؐ عربی　　اے صلِ علیٰ نامِ رسولؐ عربی
ہر دور میں اخلاق کی تکمیل ہوا　　سرمایۂ پیغامِ رسولؐ عربی

(5)

کیا حسن کا معیار لیے آئے رسولؐ　　کس کس کو نصیب ہے تولائے رسولؐ
ہے وحدہٗ لا شریک بھی میرا شریک　　اَحدیت کی حد میں ہے وہ شیدائے رسولؐ

(6)

موزوں تھے سب انبیاء بنوت کے لیے　　مخصوص محمدؐ تھے ہدایت کے لیے
مطلوب ہیں بندوں کے خدا کے محبوب　　ایسا تو رسولؐ ہو رسالت کے لیے

(7)

بیکار یہ جسم و روح کی بحث ہے آج　　سر پر مرے آقاؐ کے ازل سے ہے یہ تاج
کیا اُس کے لیے عرش پہ جانے کا سوال　　جب فرش پہ حاصل ہو مقامِ معراج

(8)

قدرت سے ملی ہے چشمِ بینا اے دوست　　تو نے کبھی دیکھا کبھی سمجھا اے دوست
یہ کون ہیں بھاگتے ہیں دنیا کی طرف　　دینداروں سے بھاگتی ہے دنیا اے دوست

(9)

کتنا ہی حسین ہو خیالِ سرورؔ　　سمجھے گا نہ تو صورتِ حالِ سرورؔ
اللہ جمیل ہے اگر یاد تجھے　　اس آئینہ میں دیکھ جمالِ سرورؔ

(10)

پابوس نہ کیوں ہوں بحر و بر ختمِ رُسلؐ　　حیران ہو جب فکرِ بشر ختمِ رُسلؐ
اب تیرے مقام کا تعین کیا ہو　　جنّت ہے تری راہگذر ختمِ رُسلؐ

(11)

دنیا میں نہ تھی شئی کوئی شایانِ رسولؐ　　سمجھیں گے وہی جن کو ہے عرفانِ رسولؐ
اللہ کا ہے کوئی محل اور نہ مقام　　یہ عرش حقیقت میں ہے ایوانِ رسولؐ

(12)

ایوانِ رسولؐ کا ہے ٹکڑا طیبہ　　کس میں ہے یہ دم کہے ہمارا طیبہ
آخر یہ زمیں پر کہیں رہتے سہتے　　جنت سے انہیں کے لیے آیا طیبہ

(13)

وہ سرِّ خفی نصِ جلی کی معراج　　اِس شان کی تھی کہاں کسی کی معراج
حاصل اُسے عرش پر بھی تھی فرش پر بھی　　کیوں بحث میں لاتے ہو نبیؐ کی معراج

(14)

زور اپنا جو دکھلائیں محمدؐ والے　　کونین سے ٹکرائیں محمدؐ والے
یہ عالمِ امکاں ہے مسلّم لیکن　　ممکن نہیں مٹ جائیں محمدؐ والے

(15)

آدم مابین آب و گِل تھے جب سے　　روشن تھی فضا نورِ حبیبِ رب سے
اپنی ہستی سے بے خبر آدم زاد　　کیا جانے کہ ہے ذاتِ محمدؐ کب سے

(16)

شاہانِ جہاں کی کجکلاہی نہ چلی　　یاں ایک کی بھی جہاں پناہی نہ چلی
اللہ رے فقرِ مصطفاؐ کے تیور　　ان کے آگے کسی کی شاہی نہ چلی

(17)

احساسِ حیات کو جگانے والا　　حکمت کے حدود کو بڑھانے والا
کتنے پیغمبروں کے بعد آیا ہے　　انسان کو انسان بنانے والا

(18)

رفعت کا وہ کس فضا میں محتاج رہا　　جس کے سر پر ازل سے یہ تاج رہا
معراجِ سرِ عرش ہے کیوں بحث طلب　　وہ فرش پہ بھی صاحبِ معراج رہا

(19)

یوں پہلے پہل تو سامنا کیا کرتا　　چپ چاپ خدا کا نور دیکھا کرتا
جس راہ سے لے گئی حلیمہ اُس کو　　میں ہوتا تو ہر قدم پہ سجدا کرتا

(20)

روشن گر کائناتِ ممکن آیا　　تکمیلِ نوازشات کا سن آیا
کعبہ آواز دے خلیلِ حق کو　　جس دن کی دعا مانگی تھی وہ دن آیا

(21)

دنیا میں پیمبروں کا سلطان آیا　　انسان کی عظمت کا نگہبان آیا
سیرت ایسی بدل دیا نظمِ جہاں　　صورت ایسی کہ جس پہ قرآن آیا

(22)

خدمت یہ کسی نبیؑ ولی سے نہ ہوئی　　وابستہ کسی پیمبری سے نہ ہوئی
کامل تھے سبھی مگر محمدؐ کے سوا　　اخلاق کی تکمیل کسی سے نہ ہوئی

(23)

مدہم تھا چراغ روشنی پوری کی　　تعمیرِ نجاتِ آدمی پوری کی
اللہ رے پیغمبرِ خاتمؐ کا کمال　　ہر ایک پیمبر کی کمی پوری کی

(24)

اُس حلقۂ اربابِ ولا میں ہوتے　　انصار میں ہوتے رفقا میں ہوتے
سنتے ہیں کہ ہر نبی کو حسرت یہ رہی　　ہم اُمتِ محبوبِ خدا میں ہوتے

(25)

اے خیرِ بشر کاشفِ اسرارِ حیات　　تیری ہی تجلّیاں ہیں انوارِ حیات
انسان ہیں اپنی کوششوں کی حد میں　　آزادِ حیات اور گرفتارِ حیات

(26)

تکمیلِ نمودِ کبریائی نہ ہوئی　　پوری غرض جلوہ نمائی نہ ہوئی
تو ذکرِ احد میں شان دیکھ احمدؐ کی　　یہ وہ ہیں بغیر ان کے خدائی نہ ہوئی

(27)

ہر چیخنے والا جو نبی ہوجائے　　پیغام خدا کا دل لگی ہوجائے
ہے ختمِ نبوت پہ نبوت کی ہوس　　کم ہے یہ شرف کہ آدمی ہوجائے

(28)

ہنگامۂ زیست میں کمی کیا معنی　　مرجھائی ہوئی دل کی کلی کیا معنی
الفت میں نبیؐ کی دل اگر زندہ ہے　　یہ موت کی شکل زندگی کیا معنی

(29)

ساقی مجھے مستِ مئے وحدت کر دے　　تقدیمِ رسالت کے لیے شہپر دے
طیبہ میں پہنچنے کا ہے ارماں دل کو　　فاراں پہ جو چمکی تھی وہ بجلی بھر دے

(30)

ممکن نہیں اور کوئی جذبہ بھر دو　　ترک الفت پہ دل کو مائل کردو
اب تک مجھے یاد ہے کسی کا کہنا　　اس ہاتھ پہ چاند اس پہ سورج دھر دو

(31)

عاشق ہے خدا انہیں بنایا جب سے　　یوسفؑ بھی حسیں نہیں حبیبؐ رب سے
ایسا فقاش ہو تو ایسا نقشہ　　نقشِ اول ہے اور بہتر سب سے

○

اخلاقی رباعیات

(1)

پتھر کا جگر ہو ظلم سہنے کے لیے
حق کی خاطر تباہ رہنے کے لیے
منہ بھی ہے زبان بھی ہے منہ میں لیکن
دل چاہیے دل کی بات کہنے کے لیے

(2)

کیا نامِ خدا بہ شدّومد کہتے ہیں
کہتے ہیں تو بے حساب وحد کہتے ہیں
بھولے سے کسی کی خود بھی کرتے ہیں مدد
دن رات جو یاعلی مدد کہتے ہیں

(3)

حق بات پہ اڑ کے بیٹھ بوذر کی طرح
اُٹھ شیر صفت مالکِ اشتر کی طرح
سرمایہ پرستوں کی خوشامد میں نہ رہ
دولت کو دعا نہ دے گداگر کی طرح

(4)

بھولے سے کبھی عقل کے ناخن لیتا
تاریخ نہ قصہ کی طرح سُن لیتا
دولت کی ہوا سے دور رہ کراے کاش
سلمان کی طرح ٹوکری بُن لیتا

(5)

احسان نہ لے کسی کا ناداری میں
فرق آتا ہے کیا شانِ وفاداری میں
سرمایہ پرستوں کے طریقوں پہ نہ جا
کیوں فکرِ نمائش ہے عزاداری میں

(6)

ہر جذبۂ غیرت سے اثر لیتا ہوں
خود دار ہوں کب یہ دردِ سر لیتا ہوں
نیچی نہیں اس کے ایک بندہ سے نگاہ
اللہ کے سو گناہ کر لیتا ہوں

(7)

اے نقطہ اتحادِ روح و پیکر ہیں تجھ میں حیاتِ ابدی کے جوہر
جینا جو نفس کے آنے جانے تک ہے ایسے جینے سے ہے نہ جینا بہتر

(8)

جو نفس کے خیر خواہ ہوجاتے ہیں اپنے لیے خوش نگاہ ہوجاتے ہیں
افعال کا ذکر کیا یہ دنیا وہ ہے الفاظ جہاں گناہ ہوجاتے ہیں

(9)

ہر لمحہ نئی ہوا میں بھرتے دیکھا ہرگام پہ ہوش سے گزرتے دیکھا
دنیا کا تال سم عیاذاً باللہ اچھے اچھوں کو رقص کرتے دیکھا

(10)

مفلس کی ریاضتوں میں کیا رکھا ہے افلاس نے علم کو دبا رکھا ہے
دیکھا مذہب کے غمگساروں میں بھی سب نے دولت کو سر چڑھا رکھا ہے

(11)

دنیا کی چراگاہ سے راحت کی نوید مذہب کے گھٹا ٹوپ سے عزت کی نوید
ہوجہل کے ساتھ جوڑ دولت کا اگر ہر بزم سے ملتی ہے صدارت کی نوید

(12)

کیسے کیسے ورق دلوں کے اُلٹے اُلٹے، واللہ اور اچھے اُلٹے
اے لمحۂ آزمائش و دورِ عمل کن کن چہروں سے تو نے پردے اُلٹے

(13)

جو سب کا ہے مالک یہ پیام اُس کا ہے عزت غرباء کی احترام اُس کا ہے
سرکش! یہ امانت میں خیانت کیسی ہاتھ اپنے سہی مگر سلام اُس کا ہے

(14)

مظلوم کی کچھ آئینہ داری تو کرو ایثار کے سلسلے کو جاری تو کرو
رونے کا ثواب بھی ملے گا بیشک اشکوں سے چمن کی آبیاری تو کرو

(15)

کیا ہے جو کہیں حق بہ زباں جاری ہے — شبیرؑ کے حق کا کوئی اقراری ہے
اقوال حسینی ہیں عمل ہے کچھ اَور — اے دوست! میں کیا کہوں یہ غداری ہے

(16)

یہ آئینۂ دل میں کدورت کیسی — مذموم خیالات کی دعوت کیسی
جس دل میں تولاّ کی جگہ ہو غافل — اس میں کوئی ناروا بضاعت کیسی

(17)

بڑھتی چڑھتی جو سوزِ دل کی لَو ہے — آنکھوں میں تلاش و جستجو کی ضَو ہے
تنظیمِ حیات کا سلیقہ ہے اگر — انسان کا ہر نفس حیاتِ نو ہے

(18)

بیجا ہے گناہوں پہ طرارے بھرنا — فطرت پہ اِک الزام کا چھپر دھرنا
انسان و گناہ میں تعلق برحق — منصب ہے ترا ترکِ تعلق کرنا

(19)

کیا کہیے نگاہِ عارفانہ لے کر — چلتا ہے مجھے ساتھ زمانہ لے کر
دم بھر جو تردّد میں قدم رُکتا ہے — قسمت بڑھتی ہے تازیانہ لے کر

(20)

ہر سمت نظر میں بُوئے خوں آتی ہے — سرگشتہ جستجوئے خوں آتی ہے
تہذیب و زباں تجارت و قوم و وطن — اِن لفظوں سے آج بوئے خوں آتی ہے

(21)

دولت کے نشہ میں یہ دریدہ دہنی — آساں ہے غریبوں کی تجھے دل شکنی
اے پیرو دینِ حق یہ مسلک تیرا — جیسے کہ ہے بیگانۂ خلقِ حسنی

(22)

اے لذّتِ ہل اتی میں کھونے والے — اذکارِ سلف پہ شاد ہونے والے
فاقہ سے ہیں دن بھر کے پڑوسی کتنے — اے رات کو پیٹ بھر کے سونے والے

(23)

اِک خطرۂ بے پناہ ایماں کے لیے　　اِک نشترِ مستقل رگِ جاں کے لیے
اپنوں میں نہ تکریم نہ غیروں میں گذر　　افلاس بڑا جُرم ہے انساں کے لیے

(24)

یوں بات نہ اب تلخ نوائی سے بدل　　اے دوست نہ طرزِ دلربائی سے بدل
تقدیر سے آگیا زمانہ تیرا　　لے تُو ہی بُرائی کو بھلائی سے بدل

(25)

اخلاقِ حسینؑ سے سروکار بھی ہو　　دنیا کی نمایشوں سے بے زار بھی ہو
دولت سے ہے بے نیاز جو مردِ عمل　　مزدور بھی ہو اور عزا دار بھی ہو

(26)

دنیا میں غمِ حیات لایا ہوں میں　　ہر زخمِ جگر پہ مسکرایا ہوں میں
جو موت حیات جاوداں بنتی ہے　　اُس موت کی جستجو میں آیا ہوں میں

(27)

ساحل پہ ہیں کچھ ناؤ ڈبونے والے　　طوفان میں کچھ ہیں جان کھونے والے
ہنسنے والوں کا دل بڑھانے کے لیے　　مل جاتے ہیں ہر عہد میں رونے والے

(28)

کس زعم نے ہے دماغ گھیرا تیرا　　منہ کس نے ہے آشتی سے پھیرا تیرا
دنیا اے بے خبر کسی کی نہ ہوئی　　دنیا میں بہت ہوا ہے میرا تیرا

(29)

کرنے کا ہے جو کام بہر طور کرو　　کردار کی تربیت پہ بھی غور کرو
پھر ہم بھی کہیں گے یہ بآواز بلند　　تعلیم کا معیار بلند اور کرو

(30)

ہم عہد کے نغمات سناتے ہی رہے　　واعظ کی زباں پہ وعظ آتے ہی رہے
دم بھر بھی نہ رفتارِ زمانہ ٹھہری　　ہم کیا ہیں سب اپنی اپنی گاتے ہی رہے

(31)

یہ رشک و حسد کی رَو میں کیا چاہتے ہو
سمجھا تھا میں کچھ اپنا بھلا چاہتے ہو
چڑھنے کی فلک پر نہیں کرتے کوشش
مجھ کو بھی زمیں پہ کھینچنا چاہتے ہو

(32)

ہوجائے گا معدوم یہ غم ہے شاید
فانی ہے یہ روح یہ الم ہے شاید
ہر قطرۂ شبنم ہے فضا میں محفوظ
شبنم سے بھی ہستی تری کم ہے شاید

(33)

نشتر ہمدردیوں کے سہتے نہ پھرو
ہر موجِ ہوا کے ساتھ بہتے نہ پھرو
بندے ہو کسی کے اس کا احساس رہے
ایک ایک سے دل کا درد کہتے نہ پھرو

(34)

کیا راہِ غرض میں لوٹتا جاتا ہے
کیا کمتر و ناچیز بنا جاتا ہے
اللہ کے آگے نہیں جھکتا جو سر
بندے کے حضور میں جھکا جاتا ہے

(35)

دنیا کی مری نظر میں کیا ہستی ہے
ویرانہ کی ممنون ہے جو بستی ہے
آخر میں نظر اٹھا کے دیکھوں کس کو
ہر قصرِ بلند کی بنا پستی ہے

(36)

واجب ہے ہر ایک اہلِ زر کی دعوت
احباب و عزیز ذی اثر کی دعوت
نادار غریبوں کے لیے ماہ صیام
افطار کی دعوت نہ سحر کی دعوت

(37)

بادل کی طرح گرجنے والے دیکھے
ہتھیار بدن پہ سجنے والے دیکھے
چپ چاپ عمل کے گرم میدانوں میں
اپنی ہستی کو تجنے والے دیکھے

(38)

انساں ہے تو فطرت سے یہ دولت لے لے
سرمایۂ ایثار و محبت لے لے
خوشبو دیتے ہیں نیک و بد کو یکساں
پھولوں سے مزاج کی لطافت لے لے

(39)

تقریر ہو کچھ غلط خیالی ہی سہی　　اظہارِ کمال بے کمالی ہی سہی
دیوانہ بھی ہو تو صدرِ محفل کردو　　کیسہ پُر ہے دماغ خالی ہی سہی

(40)

تقدیر نظام ہوش برہم کردے　　ممکن ہو تو زندگی کے دن کم کردے
سیرت کا ہے کیا سوال صورت دیکھو　　جیسے کوئی عصیاں کو مجسم کردے

(41)

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں　　خوش خوش آتے ہیں خوش چلے جاتے ہیں
پھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد　　کھلتے ہیں مہک دیتے ہیں مرجھاتے ہیں

(42)

چڑھتی ہوئی دھوپ دم میں ڈھل جاتی ہے　　گردوں کی طرح نظر بدل جاتی ہے
تیری ہی زمیں ہے جیسے اس طرح نہ چل　　یہ پاؤں سے بھی کبھی نکل جاتی ہے

(43)

آئیں نہ مری سمت مسافر نظریں　　تسکین کے احسان سے قاصر نظریں
دل اور کسی طرف' نظر اور کہیں　　میں نے دیکھی ہیں غیر حاضر نظریں

(44)

دل ہو تو سکونِ دل کا عالم بھی ہے　　ہو عینِ ہوس تو بزمِ ماتم بھی ہے
ہم خود ہوں جہنمی تو کیا اس کا علاج　　جنت بھی ہے دنیا میں جہنم بھی ہے

(45)

بلبل رودادِ غم سناتے ہی رہے　　غنچہ کچھ کہہ کے مسکراتے ہی رہے
دم بھر بھی نہ رفتارِ زمانہ ٹھہری　　ہم کیا ہیں سب اپنی اپنی گاتے ہی رہے

(46)

کیوں ساتھ ہر ایک پیشرو کے ہولے　　پاسِ خاطر سے کس لیے منہ کھولے
چہرہ پہ شگفتگی لبوں پر دل ہو　　الفاظ ادا زباں سے ہوں دل بولے

(47)

پندار نہیں علم و یقیں کی زینت　　ملبوس نہیں دینِ مبیں کی زینت
کیا چیز ہے انکسار اللہ اللہ　　ہر سجدۂ برحق ہے جبیں کی زینت

(48)

وقف کا سرمایہ کیا سہو و خطا کا مال ہے　　کیا کسی بیدرد حق نا آشنا کا مال ہے
اے مسلماں دستِ ناحق سے بچانا ہے ضرور　　ایک پیسہ بھی اگر ہے تو خدا کا مال ہے

(49)

سوتے ہوئے جذبہ کو جگا کر دیکھو　　نیکی سے بدی کا دل ہلاکر دیکھو
پھر بھول کے بھی وہ سر اٹھانے کا نہیں　　دشمن پہ یہ وار آزما کر دیکھو

(50)

انسان ہے خود ہی چارہ ساز اپنے لیے　　دل میں ہے اگر تو ہے گداز اپنے لیے
اللہ کو کیا نماز روزہ کا ثواب　　اپنے لیے روزہ ہے نماز اپنے لیے

(51)

انساں کو بہت گرارہا ہے انساں　　ٹھہرو دم بھر اِک آرہا ہے انساں
وہ رُوپ بھی دیکھ لے گی دنیا اک دن　　جس روپ میں جگمگارہا ہے انساں

(52)

احساس کا انداز بدل جائے گا　　گرتا ہوا معیار سنبھل جائے گا
سمجھے گا تو زندگی کا مقصد اس وقت　　جب دل سے ترے اَنا نکل جائے گا

(53)

آغاز اچھا ہو جس کا انجام اچھا　　انساں ہے وہی اے دل ناکام اچھا
مشہور ہے بد اچھا ہے بدنام بُرا　　ہم کہتے ہیں بداچھا نہ بدنام اچھا

(54)

خوددار کسی کا آسرا لیتے ہیں　　دوگام میں کارواں کو جالیتے ہیں
کس نے یہ کہا جگہ نہیں محفل میں　　ہمت کے قدم جگہ بنا لیتے ہیں

(55)

خاکسترِ سیم و زر جبیں سے نہ اٹھا
احساں کوئی دور سے قریں سے نہ اٹھا
رکھ دستِ طلب فضائے عالم سے بلند
تارے بھی پڑے ہوں تو زمیں سے نہ اٹھا

(56)

ناداں ہیں جو اس زعم میں کھوجاتے ہیں
مرتے ہوئے زندگی کو رو جاتے ہیں
ہو دامنِ دولت میں ولادت تیری
ایسے بہت اتفاق ہوجاتے ہیں

(57)

دولت سے ہم احتراز فرما نہ سکے
قابو میں تھے ہاتھ اور سر کا نہ سکے
سب خاک میں مل گیا قناعت کا غرور
جب پاؤں پہ گر پڑی تو ٹھکرا نہ سکے

(58)

ہر گام پہ تیوریاں بدلتا ہوا جا
سر پائے غرور سے کچلتا ہوا جا
ہے ایک گڑھا قبر کا منزل تیری
چلتا ہوا جا تو کہ مچلتا ہوا جا

(59)

تھم جا کہ ہے اس راہ سے پھرنا بھی تجھے
دریا میں ہے ڈوبنا بھی ترنا بھی تجھے
نخوت نے بلند کردیا ہے جتنا
اتنی ہی بلندی سے ہے گرنا بھی تجھے

(60)

منہ گریۂ حسرت سے نہ ڈھل جائے کہیں
یہ وقت نہ مثلِ شمع گھل جائے کہیں
او بستر عیش پر اکڑنے والے
کس خواب میں ہے آنکھ نہ کھل جائے کہیں

(61)

افلاس ہے یہ نام گناہوں کے لیے
بھٹکی ہوئی زندگی کی راہوں کے لیے
دیکھا یہ تمول کی فضا کا عالم
جیسے یہ جگہ وقف ہے آہوں کے لیے

(62)

ہر چند کہ ہے تاک میں صیاد ابھی
باقی ہے یہ نعمتِ خدا داد بھی
آواز بھی قید ہیں نگاہیں بھی اسیر
صد شکر کہ احساس ہے آزاد ابھی

(63)

لطف غمِ زندگی تجھے کیا معلوم　　کس چیز کی ہے کمی تجھے کیا معلوم
منعم تری تخلیق ہوئی تھی جس وقت　　فطرت کس دُھن میں تھی تجھے کیا معلوم

(64)

اس داد و دہش کو مختشم سمجھا ہے　　سمجھا ہے بہت اگر تو کم سمجھا ہے
ہم نے دیکھے ہیں بے شمار اہلِ کرم　　تو اپنی تجارت کو کرم سمجھا ہے

(65)

قرأت کی یہ ہنگامہ طرازی کیسی　　یہ شانِ نماز اور نمازی کیسی
سر سجدہ میں گردن پہ دو عالم کے حقوق　　اللہ رے یہ شعبدہ بازی کیسی

(66)

آثار میں شانِ کبریائی تو نہیں　　در پر کوئی صرف جبہ سائی تو نہیں
بے مال و کمال و علم انساں تو رہا　　صد شکر کہ دعویٰ خدائی تو نہیں

(67)

اک اک سے گرفتارِ بلا مانگ چکے　　عالم کے طبیبوں سے شفا مانگ چکے
تدبیر کے بندوں کو دعا کب سوجھی　　جب سارے زمانے سے دوا مانگ چکے

(68)

تبدیل فضائے بزمِ عالم نہ کرو　　اس جنت ارضی کو جہنم نہ کرو
مہمان ہو مہمان کی حد سے نہ بڑھو　　دنیا کا نظام امن برہم نہ کرو

(69)

نافہموں سے کیا دست و گریباں ہونا　　دنیا میں بہر حال یہ ساماں ہونا
نا اہلوں کی پرورش ہے دنیا کا اصول　　ہر جوہرِ قابل کو ہے قرباں ہونا

(70)

فطرت کردے گی تجھ کو عریاں اک دن　　ہوجائے گا ظاہر غمِ پنہاں اک دن
دریا میں ڈبودے گا اگر اپنا گناہ　　ساحل پہ بہا لائے گا طوفاں اک دن

(71)

تصویر کی طرح سامنے آئیں گے　　الفاظ تلک فضا میں لہرائیں گے
تاریکی میں جس قدر ہوئے ہیں اعمال　　اک دن سب روشنی میں آجائیں گے

(72)

دولت کی فضا میں خاک راہی کب تک　　انسان کی یہ ذلت و خواری کب تک
مسجودِ ازل کو منہ دکھانا ہے کبھی　　قبلہ کے خلاف سرگزاری کب تک

○

سماجی رباعیات

(1)

مایا مائی ہے اور لونا ہے تو　　سنسار کی ہاٹ میں کھلونا ہے تو
سمجھا ہی نہیں آپ کو مورکھ لو بھی　　باہر بھیتر تمام سونا ہے تو

(2)

دنیا پہ ستم نفس پہ بیداد کرے　　بھولے سے نہ اصل اپنی کبھی یاد کرے
جیسے تری تخلیق ہیں یہ رات یہ دن　　جس طرح سے چاہے انہیں برباد کرے

(3)

ہے قابلِ اعتنا نہ بیداد نہ داد　　اے حجم خلافِ شان ہوگی فریاد
ہوتے ہیں نئے ستم تو کیا اس کا گلہ　　کرتی ہے ضرورت زمانہ ایجاد

(4)

ست کی بنسی بجائے جاؤ ساتھی　　سوتی دنیا جگائے جاؤ ساتھی
کتنا بھی ہو بوجھ بھار تھکنے کا نہیں　　سیوا کی ڈگر پہ گائے جاؤ ساتھی

(5)

جس پر جو کچھ پڑے گی سہہ جائے گا　　مجبور فنا کی رو میں بہہ جائے گا
کیا ہند میں اتحاد ہوگا نہ کہیں　　بدنام فساد ہوکے رہ جائے گا

(6)

راضی تو نہ ہونا تھا مگر راضی ہیں　　جتنے تھے خلاف اہل نظر راضی ہیں
ٹڈی دل کے مقابلہ کی خاطر　　سب مشترکہ دفاع پر راضی ہیں

(7)

بھارت کو بہر حال سنورنا ہے ضرور — عزت کے منازل میں ابھرنا ہے ضرور
ہنگاموں سے جاتا ہے حکومت کا وقار — ایوان میں ضبطِ نفس کرنا ہے ضرور

(8)

کر مشقِ فصاحت و بلاغت اے دوست — مل جائے گی کرسیٔ صدارت اے دوست
تدبیر کی فکر بے محل ہے بالکل — تقریر کی آج ہے حکومت اے دوست

(9)

زر ہو تو خرید لے کہ دشوار نہیں — یہ عہدِ تجارت ہے خبردار نہیں
اعزاز خطابات شرافت شہرت — ہے کونسی شئی جو سرِ بازار نہیں

(10)

کیا تجھ کو حقایق سے یہ بیزاری ہے — رفتار میں گفتار میں عیاری ہے
دنیا کو فلم سمجھ رہا ہے شاید — کیا تیرا کمال بھی اداکاری ہے

(11)

یہ زعمِ حکومت ہے پُرانا دھوکا — پھر جذبۂ ارباب ولا کو ٹوکا
بغداد نے ''یک ہزار وسی سال'' کے بعد — پھر زائرِ شیرؑ کا رستہ روکا

(12)

فطرت کردیگی تجھ کو عریاں اک دن — ہوجائے گا ظاہر غم پنہاں اک دن
دریا میں ڈبو دے گا اگر اپنا گناہ — ساحل پہ بہا لائے گا طوفاں اک دن

(13)

اس کے لیے ہیں ایک سپید اور سیاہ — آئی اب فطرت پہ کبھی آہ نہ واہ
مرجھا گئے کچھ پھول چمن میں کھل کر — یا ہوگئی دنیا میں کوئی قوم تباہ

(14)

حل ہوگئیں ساری مشکلیں کیا کہنا — ٹوٹیں وہ جمود کی سلیں کیا کہنا
ہڑتال فساد لوٹ مار آگ لہو — یہ حُسنِ عمل کی منزلیں کیا کہنا

(15)

آزاد کو اک قید ہے فغفوری بھی ہے بار گراں قبائے دستوری بھی
تو اپنے لیے جگہ معین کرلے دنیا میں غلامی بھی ہے مزدوری بھی

(16)

یوں بھی منزل کی راہ لی جاتی ہے کس فکر میں ہے دھوپ ڈھلی جاتی ہے
پیچھے ہٹنے کی حد ہے کوئی کہ نہیں دنیا آگے بڑھی چلی جاتی ہے

(17)

ہر دور میں سلح وآشتی کا مفہوم پاکیزہ سلیس زندگی کا مفہوم
مسلم ہو تو ہے اس کی حفاظت واجب اسلام میں ہے سلامتی کا مفہوم

(18)

جیتا ہوں کہ جیسے کوئی مجبورِ حیات دیتا نہیں روشنی مجھے نورِ حیات
میں جس کی حفاظت کے لیے آیا تھا میں نے ہی بگاڑا ہے وہ دستورِ حیات

(19)

تنقیدِ حیات کرکے جینا ہے مجھے اِس نقش میں رنگ بھر کے جینا ہے مجھے
جی کر مرنا مرے حریفوں کے لیے میں اور بشر ہوں مرکے جینا ہے مجھے

(20)

یہ آٹھ پہر رحمت رب کیا کہنا یہ صبح عجم شام عرب کیا کہنا
کیا خوب ہوا آج قرآن السعدین نو روز کا دن قدر کی شب کیا کہنا

(21)

اے دامنِ دولتِ و امارت کے پلے زیبا ہے غریب سے اگر بچ کے چلے
مزدور کی منتشر ہیں آہیں جس میں جب جانیں کہ اس فضا میں تو سانس نہ لے

(22)

ہر ذرّہ کا دعویٰ کہ ہوں بھارت کا شباب ہر موج ترقی کی ہوائیں بیتاب
اللہ کرے کہ سچ یہ افسانے ہوں ہے گردنِ راوی پہ عذاب اور ثواب

(23)

بھارت ہے چمن جان چمن ہیں ہم لوگ
کیا قابلِ شرط و ریب وظن ہیں ہم لوگ
آپس میں بھی مول تول ہوتا ہے کہیں
اس دیس کے انمول رتن ہیں ہم لوگ

(24)

دل کوئی نہ اپنی چشم نم سا دیکھا
احساسِ مسرت کو بھی غم سا دیکھا
کچھ چھونپڑیاں جلی ہوئیں کچھ لاشیں
یہ ہم نے تماشائے انسا دیکھا

(25)

مزدور کی زحمتوں سے نسبت بھی نہ ہو
محنت کیسی خیالِ محنت بھی نہ ہو
اُن کا حق کیا ہے دولتِ دنیا پر
جن کو کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہ ہو

(26)

دنیا میں بزرگی کا نشاں ہے عورت
ہے قابل تعظیم جہاں ہے عورت
شاعر سلطان فلسفی پیغمبر
بچے ہیں سب اُس کے اور ماں ہے عورت

(27)

دل تیرا مساوات سے گھرا ہی گیا
غیروں کے اصول کا اثر چھا ہی گیا
اے گانگریس اے ہند کی منظورِ نظر
تجھ کو بھی حکومت کا نشہ آ ہی گیا

(28)

کس جگہ غیرت کے جذبے کھوگئے
سُن رہے ہیں شیر دل یا سوگئے
پنتھ کہتے ہیں کہ اس تحریک سے
اہلِ یوپی بدعقیدہ ہوگئے

○

رباعیاتِ واعظ

(1)

دل میں بھی نماز جلوہ گر ہے کہ نہیں
روزہ کی حقیقت پہ نظر ہے کہ نہیں
اللہ کے حق کی فکر رکھنے والے
بندوں کے حقوق کی خبر ہے کہ نہیں

(2)

کیا تجھ کو امیرِ مومنیں سے نسبت
پہلے پیدا تو کر کہیں سے نسبت
جَو کھائے ہیں عمر بھر وہ ایسا تھا امیر
تجھ کو بھی ہے کچھ نانِ جویں سے نسبت

(3)

تو قیس صفت دل کا قوی ہے کہ نہیں
کیوں پیروِ مسلم جری ہے کہ نہیں
دنیا کو پیامِ کربلا دیتا ہے
سچ کہہ مولاؑ کا ایلچی ہے کہ نہیں

(4)

الفاظ میں کربلند ایوانِ عمل
آواز کے لحن میں رہے شانِ عمل
تقریر میں چاہے جتنا آگے بڑھ جا
مجلس میں تو ہوتا نہیں میدانِ عمل

(5)

عالم ہے تو قرآن پہ عامل بھی ہو
خاکِ درِ اہلبیتؑ منزل بھی ہو
اے دوست تری عباقبا کے نیچے
اللہ کرے درد بھرا دل بھی ہو

(6)

قول اور عمل میں مطلقاً میل نہیں
عقبیٰ کے منڈھے چڑھے یہ وہ بیل نہیں
لغزش ہے قدم میں کیا قدم رکھتے ہو
منبر ہے رسولؐ کا کوئی کھیل نہیں

(7)

ذی علم خوشامدی بھی دیکھے ہم نے — ملت کے مہنت جی بھی دیکھے ہم نے
دربار کے شاعر تو بہت ہیں لیکن — دربار کے مولوی بھی دیکھے ہم نے

(8)

آدرسِ عمل کے وار کر سامنے آ — دل والوں کے دل شکار کر سامنے آ
واعظ تری تبلیغ سر آنکھوں پہ مگر — چہرہ سے نقاب اُتار کر سامنے آ

(9)

دل میں بنیاد دردِ دل محکم ہو — شیرؔ کا غم بھی، قوم کا بھی غم ہو
اب ایسے بشر کو ڈھونڈھتی ہیں آنکھیں — انسان زیادہ ہو وہ، عالم ہو

(10)

افلاس سے بے رخی تمول سے لگاؤ — لانے کو ہے رنگ یہ بگاڑ اور بناؤ
کمزور عقیدتیں سنبھالیں کب تک — یہ گھیر عمامے کا عبا کا پھیلاؤ

(11)

کاندھے پہ عبا فرق پہ عمامہ ہے — دل میں حرص و ہوا کا ہنگامہ ہے
تجھ سے تو ہے اک جاہلِ مطلق اچھا — جب علم ترا فریب کا جامہ ہے

(12)

آساں تھا بہت قاریٔ قرآں ہونا — مسجد کی صفوف میں نمایاں ہونا
اک عمر گزر گئی یہ کوشش کرتے — اب تک آیا نہیں مسلماں ہونا

O

متفرق رباعیات

(1)

کیوں کر نہ کریں ہم احترامِ غالبؔ
کچھ کم ہے یہ حاصلِ کلامِ غالبؔ
دنیا کے ہر اک ملک ہر اک ملت میں
تبلیغ ہے اردو کی بنامِ غالبؔ

(2)

مدت سے ہیں ہم مدح سرائے غالبؔ
دل میں ہے ہر اہل دل کے جائے غالبؔ
یورپ میں بھی ہے آج ہماری تقلید
پہنچی ہے کہاں کہاں نوائے غالبؔ

(3)

کشمیر میں کیا شام و سحر کی ہم نے
اک آہ کی جس سمت نظر کی ہم نے
کانٹوں میں کسی کی یوں نہ گذری ہوگی
جس درد سے پھولوں میں بسر کی ہم نے

(4)

ہے تیرے عروج میں بھی پستی کشمیر
تکلیف بھی راحت بھی ہے سستی کشمیر
جنگل ترا فردوس ہے بستی دوزخ
اعراف ہے گویا تری مستی کشمیر

(5)

چاندی سونا پگھل رہا ہے تو کیا
محلوں میں چراغ جل رہا ہے تو کیا
اہلِ کشمیر سیر و سراب نہیں
شاہی چشمہ اُبل رہا ہے تو کیا

(6)

افلاس کی طرح کوئی شئے عام نہیں
جنت سہی کشمیر پہ آرام نہیں
آنکھوں میں نشاط ہے زبانوں پہ نشاط
اور دل میں کہیں نشاط کا نام نہیں

(7)

پھولوں کے جگہ جگہ نشیمن دیکھے　　کشمیر کے جنگلوں میں گلشن دیکھے
پھوٹی ہوئی انسانوں کی قسمت دیکھی　　ٹوٹے ہوئے شاعروں کے مدفن دیکھے

(8)

ٹھہر ٹھہر کہ دو عالم بلائے دیتی ہے　　ترے لبوں پہ نہیں تیرے اختیار کی لے
نشاط میں کہیں سامانِ غم نہ ہوجائے　　بدل گئی ترے نغمہ سے آبشار کی لے

(9)

اے عزتِ حور ہم بھی کشمیر میں ہیں　　سنتے ہیں حضور ہم بھی کشمیر میں ہیں
جب تم ہی نہیں تو کچھ نگاہوں میں نہیں　　کشمیر سے دور ہم بھی کشمیر میں ہیں

(10)

پھولوں کا چمن میں آشیانہ کردے　　اللہ حقیقت کو فسانہ کردے
انسان کے ہاتھوں اسے برباد نہ کر　　کشمیر کو فردوس روانہ کردے

(11)

کشتی ٹھہراؤ درد ظاہر کرلیں　　شکرِ نعمت ادا مسافر کرلیں
ممنون ہیں دعوت نظر کی آنکھیں　　کشمیر کو اک سلامِ آخر کرلیں

(12)

ہیں برف کے تودے کہ گھلے جاتے ہیں　　پھولوں کو لگے ہیں پَر اڑے جاتے ہیں
فطرت بھی تو کشمیر کی گرویدہ ہے　　چشمے ہیں کہ پاؤں پوجتے جاتے ہیں

(13)

غم سب سے بڑا ہے کار سازِ احساس　　ہر ایک نہیں واقف رازِ احساس
جس نے کبھی دل پہ چوٹ کھائی ہی نہو　　کیا جانے وہ لطفِ دل گدازِ احساس

(14)

فطرت کی ہے سب زندہ دلی تیرے لیے　　دنیا میں ہے سب شگفتگی تیرے لیے
دن کو کھلتے ہیں پھول تیری خاطر　　شب کو رہتی ہے چاندنی تیرے لیے

(15)

پھر صبح نہ ہو وہ شام آئے کوئی — یوں میری طرف مستِ خرام آئے کوئی
جس طرح ستارے سے ستارے کی طرف — لپٹا ہوا نور میں پیام آئے کوئی

(16)

منزل کا سراغ پالیا خوب ہوا — بڑھ کر اگلوں کو جالیا خوب ہوا
قربان ترے لطف و کرم کے یارب — چلتے پھرتے اٹھا لیا خوب ہوا

(17)

بندے ہی سہی آن مگر کیوں ٹوٹے — ان کی ضد تھی یہ کچھ تو منہ سے پھوٹے
بات اُن کی رہی اور نجات اپنی ہوئی — مرنے کی دعا مانگ کے سستے چھوٹے

(18)

ہروادیٔ عیش سے گذر لیتا ہوں — بے دور شراب جام بھر لیتا ہوں
افلاس بھی وجہہ پارسائی نہ ہوا — تخیل میں سو گناہ کر لیتا ہوں

(19)

یوں بھی جیتے ہیں جن کا دل گردہ ہے — ہے اپنے لیے تو زندگی مردہ ہے
دنیا کی نگاہ میں سماؤں کیوں کر — بالیدہ ہے روح جسم افسردہ ہے

(20)

تخیّل میں لہر تگ و دو روز آیا — ہمراہ لیے خوشی کی رَو روز آیا
کرّار کی ظاہری خلافت کے طفیل — تقویم کا تاج پہنے نو روز آیا

(21)

یہ عیشِ نظر بہشت ارضی ساقی — موجِ اثرو مئے گرامی ساقی
دل بھر کے پلا کہ قلبِ پنجاب میں ہوں — ستلج سے گذر گئی ہے کشتی ساقی

(22)

دنیا کو دوائے درد و آلام ملے — جذبہ کو سکون دل کو آرام ملے
کیا بات ہے اِس فضائے جالندھر کی — کافر کو جہاں پیامِ اسلام ملے

(23)

اللہ رہے نگہبانِ پنجاب ہے حدِ نظر پہ کاروانِ پنجاب
ہاں ہند کے سر پہ تاج رکھو گے تمہیں شاباش ہے اے زندہ دلانِ پنجاب

(24)

اک عالمِ طور عالمِ غش دیکھا مسجد کیا ایک حسنِ دلکش دیکھا
دل نے سرمایۂ تجلی پایا آنکھوں نے مرے خواب مراکش دیکھا

(25)

سانچے میں محبت کے ڈھلا ہے اسلام غم خانوں میں گھٹنیوں چلا ہے اسلام
حاصل ہے اسیروں پہ فضیلت ہم کو ہم ایسے غریبوں میں پلا ہے اسلام

(26)

دنیا کو ادب سکھانے اسلام آیا قرآن لیے خدا کے پیغام آیا
ہم نے جو نہ کی قدر اٹھائی ذلت اگلوں نے جو سمجھا تو انھیں کام آیا

O

رباعیاتِ شاعر

(1)

کچھ اور ہے اربابِ نظر کی فہرست
دنیا نے بنا رکھی ہے گھر کی فہرست
دعبلؔ بن جا یہاں فرزدقؔ بن جا
کس نے دیکھی ہے اُن کے در کی فہرست

(2)

دنیائے اَدب میں اِک بھرم رکھتا ہے
مذہب کا اَلم قوم کا غم رکھتا ہے
تو خود بھی نظر آتا ہے کاغذ پہ کہیں
جس وقت کہ ہاتھ سے قلم رکھتا ہے

(3)

قوت سے ترے سخن کی انکار نہیں
مدّاحوں میں ہمسر کوئی زنہار نہیں
اشعار میں ہے درسِ عمل بھی لیکن
اِس درس کا مظہر ترا کردار نہیں

(4)

نا اہلوں کی وہ عزیز ہستی شہرت
معیوب سہاروں سے ہُمستی شہرت
اپنائے گا کیوں جوہرِ قابل کوئی
یہ شعرو ادب کا ننگ سستی شہرت

(5)

جب عالم بالا سے خبر آتی ہے
عارف کے دل میں نور بن جاتی ہے
گر ترک ادب نہ ہو تو یہ بھی کہدوں
شاعر کی زباں یہ شعر کہلاتی ہے

(6)

افکار کی کھیتیاں ہری ہیں مجھ سے
اسرار نے جھولیاں بھری ہیں مجھ سے
شاہوں کو شکست دی ہے خود داری نے
شاعر ہوں حکومتیں ڈری ہیں مجھ سے

(7)

حیرت ہے اگر پھول ہو خوشبو کے خلاف　　شانہ کی روایات ہوں گیسو کے خلاف
دنیا کی ذرا ستم ظریفی دیکھو　　اردو ہی میں گفتگو ہے اردو کے خلاف

(8)

الفاظ و معانی کا چمن یاد آیا　　اردو کی غزل کا بانکپن یاد آیا
اپنی ہستی کی قدر محسوس ہوئی　　جب مشغلہ شعر و سخن یاد آیا

(9)

شاعر ہوں و مرا طرز سخن ہے آزاد　　حق گوئی کی دھن میں فکر و فن ہے آزاد
آزادی ہے کیا خوب کہ آپس ہی میں　　لڑنے کو ہر اک ننگ وطن ہے آزاد

(10)

لازم ہے کہ ہو ذوق طلب صحت مند　　آئین حیات روز و شب صحت مند
حکمت کا تقاضا ہے یہ شاعر کے لیے　　کردار صحیح ہو ادب صحت مند

(11)

ہو یا نہ ہو کوئی منتظر آؤں گا　　دنیا کے جگانے پہ مصر آؤں گا
جس کا شاعر ہوں اس کو آنا ہے ابھی　　میں حجتِ حق کے ساتھ پھر آؤں گا

(12)

شاعر کیا اپنی شان دکھلاتا ہے　　مطرب اغماض کس سے فرماتا ہے
ہم آپ ہی درد دل کریں گے موزوں　　رونا گانا کسے نہیں آتا ہے

(13)

پندار میں اپنے مست و خر سند سہی　　غالبؔ کا جگر میرؔ کا دلبند سہی
تخئیل کے ہذیان کو قرآں نہ سمجھ　　دنیائے ادب کا تو خداوند سہی

(14)

آسان ہے اللہ سے منکر ہونا　　یا معرفت نبیؐ سے قاصر ہونا
اس شان سے اپنی شاعری کا اقرار　　جیسے کہ بڑا فخر ہے شاعر ہونا

(15)

شاعر ہوں مذاق رنگ و بو کہتا ہے　　خود دار ہوں طرز گفتگو کہتا ہے
اُس وقت میں دیتا ہوں نظر کو زحمت　　جب حسن نگاہ رو برو کہتا ہے

(16)

مشہور جہاں میں خوش نگاہی ہے مری　　شاعر ہوں حسینؑ کا یہ شاہی ہے مری
کفرو بدعت کے بل نکالے جس نے　　اُس کے صدقہ میں کجکلاہی ہے مری

(17)

منظور ہے اے حسینؑ کس کی خاطر　　تو اور نگاہ ظاہری کی خاطر
اک نظمِ سکون روح شاعر کے لیے　　اک گیت رباب زندگی کی خاطر

(18)

میدانِ عمل میں کوئی قاصر سمجھے　　غائب کوئی تو کوئی حاضر سمجھے
اب داور محشر سے بھی حسن ظن ہے　　شاید وہ بھی غریب شاعر سمجھے

(19)

سکھ کی بنسی بجاے جاؤ ساجن　　جاتی دنیا ہے گائے جاؤ ساجن
کیسے دن کے رات کا ہے آنا جانا　　چوری چوری ہی آئے جاؤ ساجن

(20)

الفاظ کا ہو اثر نہ کیوں کر باطل　　اعمال ہیں سب میرے مقرر باطل
تصنیف صحیح اور مصنف ہے غلط　　آواز مری حق میں سراسر باطل

(21)

ذہنوں کی بلندی سے اتر جائیں گی　　مانند عذاب درد سر جائیں گی
باقی رہ جائے گا مرا عہد سخن　　دنیا سے حکومتیں گزر جائیں گی

(22)

شاعر ہے تہہ دل جو زباں رکھتا ہے　　بنیادِ حیات جاوداں رکھتا ہے
جذباتِ صحیح پیش کردے اپنے　　اتنی ہمت کوئی کہاں رکھتا ہے

(23)

کوئل نے بھی حشر اٹھا دیا ہے ہمدم　　احساس کو تھرتھرا دیا ہے ہمدم
فریاد کناں ہے کسی شاعر کی یہ روح　　دنیا نے جسے بھلا دیا ہے ہمدم

(24)

یہ لحن یہ آواز ترانہ صورت　　بکھرے ہوئے بال والہانہ صورت
پیدا نہ کرے گا دلِ شاعر ہرگز　　یہ تیرا فریبِ شاعرانہ صورت

(25)

ہاں خیر سے فرصت ہی من و تو کی نہیں　　میں نے تو کسی کی راہ بھی روکی نہیں
دنیا میں ہوں میں ایک ہی شاعر یعنی　　اس تنگ ستارہ میں جگہ دو کی نہیں

(26)

وہ کیف وہ آہنگِ خدا ساز کہاں　　وہ قلب کی تسکین کا انداز کہاں
تخئیل کی شعر میں لطافت کیسی　　الفاظ کہاں روح کی آواز کہاں

(27)

دیوان لیے بغل میں کیا پھرتا ہے　　ایک ایک کے در پہ کیوں پڑا پھرتا ہے
سلطان سخن ہے تو گدائی کیسی　　کیوں داد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے

(28)

اِک خاک نشیں ہوں بُو ترابی ہُوں میں　　اُٹھوں تو دلیل کامیابی ہُوں میں
شاعر ہوں حسینؑ کا یہ نسبت ہے مری　　دُنیا سُن لے کہ انقلابی ہُوں میں

(29)

احساس کو قوّتِ نمو دیتا ہوں　　لفظوں کو مجال گفتگو دیتا ہوں
شاعر ہوں مرے دم سے ہے یہ جوشِ حیات　　میں قوم بنا کے آبرو دیتا ہوں

○

ذاتی رباعیات

(1)

کچھ شعر جو منقبت میں کہلاتا ہے
کس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں تیرے کردار پہ ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہل بیتؑ کہلاتا ہے

(2)

کیوں جامِ شراب ارغوانی مانگوں
کیوں میں دو دن کی زندگانی مانگوں
مل جائے کہیں جو میرا بانکا ساقی
میدان کی موت لوں جوانی مانگوں

(3)

خود نفس پہ اپنے ظلم ڈھاؤں نہ کہیں
میں وردِ دعا سے ہاتھ اٹھاؤں نہ کہیں
معبود مجھے دواتِ دنیا سے بچا
مفہومِ حیات بھول جاؤں نہ کہیں

(4)

ڈوبا ہوا ہوں غم میں ابھرنے کے لیے
آئینِ حیات وضع کرنے کے لیے
مرمر کے جی رہا ہوں کتنے دن سے
اک قابلِ رشک موت مرنے کے لیے

(5)

جب زیرِ زمیں سلا کے آئے گا مجھے
دو چار قدم میں بھول جائے گا مجھے
اس دن ترا حافظ ہے خدا ہی اے دوست
جب میرے کسی شعر میں پائے گا مجھے

(6)

شاعر ہوں مجھے ملا ہے شاعر کا نصیب
دوری ہے مسرت سے بہت غم ہے قریب
میرے لیے آرام کہاں دنیا میں
مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

(7)

آثارِ فنا کو دیکھتا رہتا ہوں　　رفتارِ بقا کو دیکھتا رہتا ہوں
اک دن ہوں قفس توڑ کے اڑنے والا　　دنیا کی ہوا کو دیکھتا رہتا ہوں

(8)

برباد ہوں پر دیارِ آباد کا ہوں　　ممنون طبیعتِ خدا داد کا ہوں
اے تجمّ زبانِ میر میری ہے زباں　　بلبل جو میں باغِ اکبر آباد کا ہوں

(9)

ارمان ہوں لیکن نہ نکلنے والا　　دل ہوں نہ کبھی مگر بہلنے والا
ہستی ہے مثالِ شمع میری اے تجمّ　　دن کو خاموش شب کو جلنے والا

(10)

کردیں ہمدرد آشیانہ خالی　　غمخواروں سے ہوجائے زمانہ خالی
آنسو تسکین دیتے رہتے ہیں مجھے　　ہوتا نہیں فطرت کا خزانہ خالی

(11)

ہر عیب سے پاک زندگی ہوجائے　　ایثار کی دل میں روشنی ہوجائے
ہوتی ہے خدا دوست بشر کی خواہش　　دشمن سے بھی میری دوستی ہوجائے

(12)

عصیاں ہو کہ ہو ثواب پی لیتا ہوں　　ملتی ہے تو بے حساب پی لیتا ہوں
کھاتا نہیں حق کسی کا بھولے چوکے　　دانستہ مگر شراب پی لیتا ہوں

(13)

آئی ہے خبر جشن کی چلنا ہے مجھے　　یا شاہِ نجف کہہ کے سنبھلنا ہے مجھے
جکڑا ہوا میں ضعف کی زنجیر میں ہوں　　اس قید کو توڑ کر نکلنا ہے مجھے

(14)

سو طرح کے غم میں مبتلا رہتا ہوں　　خود اپنا مزاج پوچھتا رہتا ہوں
چہرے سے کھلے غبار خاطر کیوں کر　　خوش وضع لباس میں چھپا رہتا ہوں

(15)

میری خلقت ہے غم اٹھانے کے لیے
احباب کے ظلم بھول جانے کے لیے
دشمن کی تلاش کس لیے ہے اے دوست
موجود ہوں میں فریب کھانے کے لیے

(16)

مجبور نہ محکوم نظر آتا ہوں
رنجور نہ مغموم نظر آتا ہوں
پلّے پہ ہو دنیا تو بڑا ظالم ہوں
تنہا ہوں تو مظلوم نظر آتا ہوں

(17)

پہلو نہ بدل مجھے ڈبونے کے لیے
ہر روز نئی فضا میں کھونے کے لیے
اے نفس ٹھہر کہ خاکساری تیری
دھوکہ تو نہیں بلند ہونے کے لیے

(18)

آنکھوں کی زباں سے بولتا رہتا ہوں
خاموش نظر میں تولتا رہتا ہوں
کچھ لے کے گزر رہا ہے یا دے کے مجھے
ہر لمحہ کا دل ٹٹولتا رہتا ہوں

(19)

ہے رفعتِ نفس دردمندی میری
پندار نہ جان خود پسندی میری
کیوں سطحِ محبت پہ نہ آئی دنیا
پستی کا قصور ہے بلندی میری

(20)

غم کا چہرہ خوشی کا غازہ ہوں میں
تقدیر کا اک شکار تازہ ہوں میں
اس شان اس اہتمام ظاہر پہ نہ جا
پھولوں میں چھپا ہوا جنازہ ہوں میں

(21)

سب جھومتے ہیں سخن کی تاثیر یہ ہے
شاعر ہوں علی کے در کا تقدیر یہ ہے
یہ میرے گلے میں ہار پھولوں کا نہیں
میں اک سگ آستاں ہوں زنجیر یہ ہے

(22)

احساں ہو کسی کا کیوں گوارا مجھ کو
اب دے نہ سکے گا کوئی دھوکا مجھ کو
برہم سی نظر آتی ہے دنیا مجھ سے
اچھا ہے بری نظر سے دیکھا مجھ کو

(23)

کثرت کہیں پائی کہیں قلت پائی　　کیا چیز یہاں حسبِ ضرورت پائی
اک سانس کا کھیل ہے بس اب دنیا میں　　دم بھر میں خدا چاہے تو فرصت پائی

(24)

بیگانہ غم ہو کس کا دل گردہ ہے　　بے نعمتِ درد زندگی مردہ ہے
دنیا کی نگاہ میں سماؤں کیوں کر　　بالیدہ ہے روح جسم افسردہ ہے

(25)

مصروفِ غمِ در بدری ہیں اے دوست　　باندھے ہوئے رختِ سفری ہیں اے دوست
بجھتی ہوئی شمعیں تو بہت دیکھ چکے　　اب ہم بھی چراغ سحری ہیں اے دوست

(26)

ہنگامۂ ہستی میں سمو جاؤں گا　　اک دن اسی شور و غل میں سو جاؤں گا
میں جس نے بتائیں سینکڑوں کو راہیں　　بچوں کی طرح بھیڑ میں کھو جاؤں گا

(27)

کہتا ہے تو بہر ہوس نام نہ کہہ　　ہر شعر کو اللہ کا پیغام نہ کہہ
جو کچھ ہے ترے دماغِ فاسد کا نچوڑ　　او مستِ غرور اس کو الہام نہ کہہ

(28)

بزم مدحت میں دیکھیں بھالیں گے مجھے　　خود اٹھ کے وہ پاس اپنے بٹھالیں گے مجھے
مئے پی کے والا کی لڑکھڑاؤں گا اگر　　موجود ہیں جبریل سنبھالیں گے مجھے

(29)

میں اک حقیر شاعرِ بزمِ غدیر ہوں　　کشکول در بغل ہوں حضورِ امیر ہوں
اے دوست ایسی ویسی فقیری نہیں مری　　سب سے بڑے امیر کے در کا فقیر ہوں

(30)

پینا دیکھو مرا پلانا دیکھو　　لغزش کا یہاں نہیں ٹھکانہ دیکھو
چودہ سو برس ہیں اور چودہ معصوم　　دیکھو مرا معصوم زمانہ دیکھو

(31)

جائز نہ کبھی کبر و ریا کو سمجھا　　برحق نہ کسی اہلِ خطا کو سمجھا
انسان کو انساں کے سوا کیا سمجھوں　　جب غیر خدا نہ میں خدا کو سمجھا

(32)

عصیاں کے حدود میں نکل جاتا ہوں　　اپنی ہستی سے چال چل جاتا ہوں
فطرت مری نہیں بدلتی مجھ سے　　فطرت سے کبھی میں خود بدل جاتا ہوں

(33)

اے خالق حسن دل سنبھلنے کا نہیں　　تحقیق کے پھندے سے نکلنے کا نہیں
مٹی کی حقیقت کو نمایاں کر دے　　مٹی کے کھلونوں سے بہلنے کا نہیں

(34)

اقرار گناہ سے کبھی عار نہیں　　ہوں مستِ شراب مست پندار نہیں
زاہد کی نجات میں ذرا شک ہے مجھے　　بندہ ہے خدا کا اور گناہگار نہیں

(35)

ہونے کو ہے کیا عذاب حاصل کے سوا　　تعبیر غلط پردۂ حائل کے سوا
مجھ پر تو عذاب آخرت آج بھی ہے　　کچھ اور نہیں دوریٔ منزل کے سوا

(36)

یہ ولولۂ مزاج عالی کیا ہے　　یہ سلسلہ غلط خیالی کیا ہے
کس وہم میں ہیں مجھے مٹانے والے　　مجھ میں اب چیز مٹنے والی کیا ہے

(37)

سمٹی ہوئی کائنات ہستی دیکھی　　سیّال نگاہوں میں تسلّی دیکھی
بڑھتے بڑھتے نظر نظر میں ڈوبی　　اس کی آنکھوں میں روح اپنی دیکھی

(38)

تیرا بندہ ہوں کج کلاہی کی قسم　　گن گاتا ہوں تیرے داد خواہی کی قسم
سکّہ میرا ہے اور خطبہ تیرا　　اقلیمِ سخن کی بادشاہی کی قسم

(39)

الفاظ کے پیکر میں سمایا ہی نہیں
پانی انسان کے لب تک آیا ہی نہیں
کیوں سوز بنا ہے مرے ساز دل میں
نغمہ جو کسی زباں نے گایا ہی نہیں

(40)

اے داورِ کائنات و دارائے جہاں
اک لطف نظر ادھر بھی آ تائے جہاں
امید پہ میں دل کو بچا لیتا ہوں
جب رات سمیٹتی ہے اجزائے جہاں

(41)

آسایشِ تن میں نہیں حصّہ میرا
ناکام ہے دل دماغ رسوا میرا
اب روح کہیں اُس کا نہ کردے انکار
اللہ سے باقی ہے جو رشتہ میرا

(42)

پرشوق نگاہوں کو بدل بھی ڈالا
دنیا تری آرزو کو مل بھی ڈالا
ہر بار نیا وجود دینا ہی پڑا
تخئیل میں سو بار کچل بھی ڈالا

(43)

ہاں میر صفت مزاج والا ہوں میں
کل کے غالبؔ تھے آج والا ہوں میں
اردو مرے دیس کی زباں ہے پیارے
معلوم ہے ارض تاج والا ہوں میں

(44)

تمہید نشاط جاودانی لے جا
ناکام روح کامرانی لے جا
آخر کو اُتر گیا جوانی کا نشہ
لے مجھ سے مرے دل کی جوانی لے جا

(45)

جلوہ کی لطافت میں سمو جاتا ہوں
سر تا بقدم سکون ہوجاتا ہوں
اے کیف تمام اے نشاط کامل
میں تجھ سے نظر ملا کے سو جاتا ہوں

(46)

دنیا تیرے ستم کی ہستی کیا ہے
دو لفظ ہیں بیش وکم کی ہستی کیا ہے
میں چھیڑ رہا ہوں اپنے احساس کو خود
میں خالقِ غم ہوں غم کی ہستی کیا ہے

(47)

دل کو دلّی نہ لکھنؤ نے مارا　　اپنے ہی چمن کے رنگ و بو نے مارا
ہر لفظ میں ہے میرؔ کے اشعار کا درد　　کس کے اندازِ گفتگو نے مارا

(48)

دنیا تیری ہزار پہلو بدلے　　بدلی ہے کبھی اور نہ مری خو بدلے
تیرا ہی دیا ہوا ہے احساسِ خودی　　میں تجھ سے بدل جاؤں اگر تو بدلے

(49)

دیکھا دنیا کو اور ڈٹ کر دیکھا　　جاتے جاتے پلٹ پلٹ کر دیکھا
مفہوم نہ سمجھا دلِ دیوانہ مزاج　　نزدیک پہنچ کے دور ہٹ کر دیکھا

فارسی رباعیات

(1)

لطف و کرم خاص کہ ساقی بخود دارد نہ یکی مثال در غیب و شہود
از مدحِ نبیؐ و آل باہوش شدیم ایں طرفہ شراب است ز مینائے وجود

(2)

در قصر نشیند کہ سرِ رہگذرے دل نیست چودلدار شود بے خبرے
تعبیر بجا کنند از خواب و خیال آن عشق بنا شد کہ ندارد اثرے

(3)

ازحد بگذشت خود نمائی تو کجاست دریںجۂ ظلم است خدائی تو کجاست
انساں شدہ مغرور مثالِ فرعون اے مالک مُلکِ کبریائی تو کجاست

(4)

دارد چہ عجب بہار ایں منزل ما صد شکر اگر قرار گیرد دل ما
باشد کہ بارض کربلا جذب شود از شہر مدینہ است آب و گل ما

باب ششم

قطعات

(498) عدد

فہرست

شمار	عنوانات	تعداد	صفحہ نمبر
-1	حمدیہ قطعہ	(1)عدد	658
-2	نعتیہ قطعات	(3) عدد	659
-3	منقبتی قطعات	(103)عدد	660
-4	اخلاقی قطعات	(25)عدد	674
-5	قومی قطعات	(71)عدد	678
-6	قطعات واعظ	(11)عدد	688
-7	ذاتی قطعات	(33)عدد	690
-8	قرآنی قطعات	(3)عدد	695
-9	عزائی قطعات	(7)عدد	696
-10	فکری قطعات	(26)عدد	698
-11	قطعات شاعر	(8)عدد	702
-12	ولائی قطعات	(12)عدد	704
-13	سماجی قطعات	(146)عدد	706
-14	غدیری قطعات	(7)عدد	725
-15	تصوفی قطعات	(2)عدد	726
-16	فارسی قطعات	(2)عدد	727
-17	متفرق قطعات	(40)عدد	728
	کل قطعات	498عدد	

حمدیہ قطعہ

(1)

آنکھیں ہیں محوِ خواب ستارے بلند ہیں — ہے گُل جہاں پہ رات کا پردہ پڑا ہوا
میں تیرے سامنے ہوں کرم کا امیدوار — شاہوں کے در ہیں بند ترا دَر کھلا ہوا

نعتیہ قطعات

(1)

یا مصطفیٰؐ نظامِ تن و جاں بنا دیا — تخلیقِ کائنات کا عنواں بنا دیا
صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر — اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا

(2)

محبت میں محبت کے تقاضے رنگ لاتے ہیں — ہم ان کو یاد کیا کرتے نبیؐ خود یاد آتے ہیں
ہماری سمت جب اٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی — ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کرکے چھپاتے ہیں

(3)

دنیا میں ہے آوازہ قرآں کی فصاحت کا — انساں کوئی کیا سمجھے انداز مشیت کا
موضوع یہ نازک ہے میں کیسے زباں کھولوں — معراج سنادے گی لہجہ اب قدرت کا

منقبتی رباعیات

(1)

درِ دولت وہ پیمبرؐ کا ہو یا خانۂ حق
غیر کا دخل ہو یہ اس کو گوارا نہ ہوا
اور بنی بھی کوئی سرورِ عالم کی نہ تھی
اسی باعث کوئی پھر کعبہ میں پیدا نہ ہوا

(2)

اذن کے طالب ہیں اس کے در پر آ کر عرش سے
کس قدر ہمت طلب جبریل کا ہر گام ہے
دوپہر کی دھوپ میں ہے میرے جذبہ کا یہ رنگ
مدح کرتا ہوں تو کہتا ہوں سہانی شام ہے

(3)

ولادت کی مسرت سے فضا مخمور ہے ساقی
تری محفل کا ہر ذرّہ چراغِ طور ہے ساقی
میں اک ذرّہ سے بھی کم ہوں مگر تیری عنایت سے
مرے چہرہ پہ بھی کچھ میکشی کا نور ہے ساقی

(4)

علیؑ کو حق ملا کونین کی فرمانروائی کا
حکومت کی مگر پہلو بچا کر کبریائی کا
وہ بندہ ہے دکھا دو علم و دولت کے غلاموں کو
خدا کہلا کے بھی دعویٰ نہیں کرتا خدائی کا

(5)

تولا کی ہوا کیسی سرور انگیز ہے ساقی
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز ہے ساقی
مجھے ڈر ہے کہ تا آئی نہ اس مصرع پہ کہہ اُٹھے
بہت پی لی ہے اس نے آج نشہ تیز ہے ساقی

(6)

مدحِ علیؑ میں درد کی صورت گری ملی
دنیا کو جو نصیب نہیں وہ خوشی ملی
مولاؑ کا نام جب کبھی آیا زبان پر
ہر بار مجھ کو ایک نئی زندگی ملی

(7)

خلوصِ مدح سے یہ حاصل فکر و نظر لوں گا
یہاں راحت سے گذرے گی وہاں جنت میں گھر لوں گا
میں ہوں اس فاتحِ اعظم کا بندہ کیا سمجھتے ہو
علیؑ کا نام لے کر دونوں عالم فتح کرلوں گا

(8)

لگائے پھرتے ہیں قرآن کو جو سینوں سے
وہ کاش حرفِ مودّت کے نکتہ داں ہوتے
خدا سے ربط نہ ہوتا بغیر حُبِّ علیؑ
اگر ہزار بھی قرآن درمیان ہوتے

(9)

خدا ہوتے تو پھر انسانیت کو فخر ہی کیا تھا
بڑی تسکین دل ہوتی ہے شاہِ لافتا کہہ کر
خدا کا شکر ہے انسانِ کامل ہی علیؑ ٹھہرے
نصیری نے مزا ہی کھودیا تھا سب خدا کہہ کر

(10)

خدا کے ہاتھ سے تخریب بھی تعمیر ہوتی ہے
چمن سے ماہتِ گل چاک کرکے پیرہن نکلی
یہ سنتے ہیں شگاف اک پڑ گیا دیوارِ کعبہ میں
اسی رخنہ سے مستقبل کے سورج کی کرن نکلی

(11)

ہر وقت یا علیؑ کا نغمہ زبان پر ہے
توفیق کیا ہے میری دنیا کو کیا خبر ہے
اک اک نفس میں قرآں میں ختم کررہا ہوں
مولاؑ کا نامِ نامی قرآنِ مختصر ہے

(12)

ذاتِ والائے علیؑ ہے حُسن جس کا نام ہے
عشق اُس کی ذات سے ایمان ہے اسلام ہے
نیک و بد سب جانتے ہیں وہ ہیں آقا ہم غلام
بیچ میں اب کاتبِ اعمال کا کیا کام ہے

(13)

بنائے کعبہ پڑی اہتمام کی خاطر
ولادتِ شہِ عالی مقام کی خاطر
یہ احترام یہ خاطر خدا کو تھی منظور
پیمبروں نے بنایا امام کی خاطر

(14)

گرے اصنام پیشانی کے بل حیدرؑ کی آمد سے
ہوا رخصت خدائی دورِ وہ دور عبوری تھا

بہت سجدے لیے تھے آدمی سے جاہلیت میں
بتوں سے بھی تو اک سجدہ کرالینا ضروری تھا

(15)

ترے میلاد کی محفل میں نوشا نوش ہے ساقی
قیامت کا تلاطم ہے غضب کا جوش ہے ساقی

خدا وہ کہہ رہا ہے تجھ کو میں خاموش سنتا ہوں
نصیری ہوش کھو بیٹھا مجھے کچھ ہوش ہے ساقی

(16)

خدارا آج جی بھر کر پلا نو روز ہے ساقی
بلا نوشوں کی ہو حق پر نہ جا نو روز ہے ساقی

کوئی دشمن نہیں بہکا ہوا اک دوست ہے اپنا
نصیری کی بھی خاطر کر ذرا نو روز ہے ساقی

(17)

جب غیروں کا تھا قبضہ وہ وقت گیا ساقی
میخانے میں اب ہر سو اک شور ہے یا ساقی

ہے صبح ازل یہ دن رندوں کی شریعت میں
ہر روز پرانا ہے نو روز نیا ساقی

(18)

بہت ہلکی سہی اس وقت مئے نوشوں کو دے ساقی
مسلماں کو بہر صورت عقیدت اس سے ہے ساقی

پھڑک جاتا ہوں میں داد و دہش کی کارسازی پر
جب اس منزل میں کافر بولتے ہیں تیری جے ساقی

(19)

یہ کیا علاجِ دلِ بیقرار کرتے ہیں
وہ کون ہیں جو فضائل شمار کرتے ہیں

علیؑ کے ذکر پہ ہو یا خدا کی قدرت پر
ہم ایک سجدۂ بے اختیار کرتے ہیں

(20)

اگرچہ ذرّہ ذرّہ ہے علیؑ کا جاننے والا
ہر اک اہلِ بصیرت ہے جلالت ماننے والا

ازل سے تا ابد اتنی بڑی دنیا کی محفل میں
پیمبرؐ کے سوا کوئی نہیں پہچاننے والا

(21)

کونین جھومتے ہیں مسرت کے جوش میں
کس درجہ اہتمام سے شادی کسی کی ہے

میں کہہ رہا تھا یہ کہ صدا آئی غیب سے
بیٹا خدا کے گھر کا ہے بیٹی نبیؐ کی ہے

(22)

آخری نفس تک بھی اس کا ہی سہارا ہے — جس نے دردِ دل دے کر نفس کو سنوارا ہے
موت سے گذرنا کیا زندگی گذار آئے — زندگی تلاطم تھی موت اِک اشارا ہے

(23)

تیرا اک اک لفظ ہے عینِ شریعت یا علیؑ — ہے ترا اک اک نفس روحِ طریقت یا علیؑ
با عمل عالم ہوں یا ہو صوفیِ درد آزما — تجھ سے دونوں خانوادوں کو ہے بیعت یا علیؑ

(24)

مربوط نبوت سے امامت ہے بلا فصل — پیکر سے یو نہیں روح کو قربت ہے بلا فصل
اس طرح بلا فصل خلافت ہے علیؑ کی — جس شان سے کُن اور مشیت ہے بلا فصل

(25)

خدا صفات و پیمبر نظیر ہو نہ گیا — کوئی علیؑ کے سوا دستگیر ہو نہ گیا
نبیؐ کے بعد بہت سے امیر بن بیٹھے — کوئی امیر جناب امیرؑ ہو نہ گیا

(26)

عشق نے سر رکھ دیا قدموں پہ منزل دیکھ کر — حُسن نے دل دیدیا انسانِ کامل دیکھ کر
یا علیؑ تھے یا محمدؐ چودھویں معصوم تک — امرِ خالق تھم گیا تحصیل حاصل دیکھ کر

(27)

دونوں عالم محوِ حیرت تھے یہ منزل دیکھ کر — ایک ہی انداز کا ہر صدر محفل دیکھ کر
یا علیؑ تھے یا نبیؐ تھے، چودھویں معصوم تک — امرِ خالق تھم گیا تحصیل حاصل دیکھ کر

(28)

سرِّ خفی کا چلّہ اصلِ جلی کا چلّہ — اُترا ہے عرشِ حق سے حق کے ولی کا چلّہ
مولائی جمع ہیں سب حج ہو رہا ہے شاید — کعبہ بنا ہوا ہے مولا علیؑ کا چلّہ

(29)

ایسی کسے نصیب ہے نسبت کسی کے ساتھ — جچتا نہیں کسی بھی نبی و ولی کے ساتھ
مولا کو نامِ پاک سے ہے ربط اس قدر — جیسے یہ لفظ خلق ہوا ہے علیؑ کے ساتھ

(30)

نمودِ دائرہ ماسوا کسی نے کہا — بنائے خلقتِ ارض و سما کسی نے کہا
نصیریوں پہ ہے الزام کیا خدا کے لیے — کسی نے نفسِ خدا اور خدا کسی نے کہا

(31)

ربط مستحکم ہے اللہ و نبیؐ کے نام سے — واسطہ ایسا نہیں ہوتا کسی کے نام سے
کچھ بھی ہو لیکن مجھے اک بات کہنی ہے ضرور — حل ہوئی ہے میری ہر مشکل علیؑ کے نام سے

(32)

بیٹے کی جگہ ملا علیؑ سا بھائی — بیٹی کی ضرورت تھی پیمبر کے لیے
خالق کی مشیت میں یہ گذرا ہوگا — سر چاہیے تطہیر کی چادر کے لیے

(33)

امینِ وحی طلب گارِ اذن ہوتے ہیں — یہ عزّ و شان ہے زہراؑ کے آستانے کی
ہوا حسینؑ سے بیعت طلب یزید انھیں — کبھی بدلتی ہے یوں بھی ہوا زمانے کی
وجودِ حضرت حجتؑ سے اس کو ہے انکار — جسے غرض ہو مودّت سے ہاتھ اٹھانے کی

(34)

اس سے بنیادِ مجالس کا ہوا استحکام — غمِ شبیرؑ کی تبلیغ میں کی عمر تمام
صفِ نسواں میں نہ ہوتے ہیں پیمبرؐ نہ امامؑ — ورنہ کچھ دور نہ تھا اس سے امامت کا مقام

(35)

زینبؑ و کلثومؑ اور حسنینؑ سے لختِ جگر — خانۂ پُرنور میں اسلام ہی اسلام ہے
کم نہیں از روئے فطرت باپ کا غم بھی مگر — اس سے بڑھ کر دل میں دردِ ملّتِ اسلام ہے
حجمؔ جس کے مدح گستر ہوں خدا اور مصطفیٰؐ — اُس کی مدحت میں زباں کھلنا بھی مشکل کام ہے

(36)

پیکر معصومیت اسلام کا دل فاطمہؑ — کائنات آدم و عالم کا حاصل فاطمہؑ
خود رسول اللہ بھی تشریف فرما تھے مگر — منزلِ تطہیر میں تھی صدرِ محفل فاطمہؑ

(37)

کیا جلالت کا شرف فاطمۂ زہراؑ کو ملا
غنچۂ کون و مکاں اس کے تصدق میں کھلا
مدح میں خوف سے تھراتی ہے فکرِ شاعر
نام لینے سے لرزتا ہے دلِ اہل ولا

(38)

فاطمہؑ اسلام کی پیغمبری کا نام ہے
صنفِ نسواں میں وہی پیغمبرِ اسلام ہے
ایسی بیٹی ہے کہ خود تعظیم کرتے ہیں رسولؐ
کوئی کہہ سکتا ہے دنیا میں یہ مسلک عام ہے

(39)

فاطمہؑ کا درد دل ہے زندگی اسلام کی
جو نہ سمجھے اُس کا معیارِ عقیدت خام ہے
پوچھنا ہے کوئی گوشہ مدحِ اہل بیت کا
مجھ کو جبریلِ امیں سے اک ذرا سا کام ہے
دیدنی قول نبیؐ میں ہے مقام اس لفظ کا
ہم مودّت کہتے ہیں لفظ محبت عام ہے

(40)

ہے اُس کے در پہ کہاں عام خادموں کی جگہ
جہاں بلال ہے سلمان ہے ابوذر ہے
مباہلہ کی فضا بھی ہے دیدنی اے دوست
اس ایک لفظ میں اس کی ثنا کا دفتر ہے
شریک وہ بھی ہے ملت کی رہ نمائی میں
محلِ فخریہ اسلام کا مقدّر ہے
خدا کے اذن سے حاضر ہوئے ہیں روحِ امیں
قیام پھر بھی پئے اذن اس کے در پر ہے

(41)

کوئی کہدے یہاں اس کے فضائل کا نتیجہ ہے
غلط ثابت کروں گا میں اُسے یہ میرا ذمّہ ہے
کتاب اللہ سے اُس کا مقابل کیا کرے کوئی
وہ ہے اُم الکتاب اور فاطمہؑ اُم الائمہ ہے

(42)

فاطمہ کے لاڈلوں کا یہ لڑکپن دیکھنا
پیٹھ پر آ بیٹھے سجدہ میں جو پیغمبرؐ گئے
اللہ اللہ کس قدر دنیا پڑا سجدے کو طول
کھیل بھی ان کے عبادت میں اضافہ کر گئے

(43)

کتابوں میں ہو مدحت یا زمانہ کی زباں پر ہو
خدا شاہد فضائل کا یہ اُس کے ایک شمّہ ہے
کتاب اللہ سے اس کا مقابل کیا کرے کوئی
وہ ہے اُم الکتاب اور فاطمہؑ ام الائمہ ہے

(44)

یہ عروسی اور یہ شادی تھا خدا کا انتخاب — فاطمہؑ بنتِ نبیؐ مولودِ کعبہ بُو تراب
ذرّہ ذرّہ، پتہ پتہ، غنچہ غنچہ، پھول پھول — کہہ رہے تھے آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

(45)

نبیؐ کے بعد عجب دورِ انقلاب ہوا — ہر ایک امر حقیقت خیال و خواب ہوا
سب انتخابِ خلافت میں اُن کو بھول گئے — مباہلہ کے لیے جن کا انتخاب ہوا

(46)

تولا شعورِ دوامِ حسنؑ ہے — یہ ہر اہلِ دل کا نظامِ حسنؑ ہے
مری جنگ یا سلح جو کچھ ہے جس سے — بنامِ حسینؑ اور بنامِ حسنؑ ہے

(47)

حسینؑ عالمِ انسانیت کے مایۂ ناز — شعورِ فکر میں ہے قوم کی حیات کا راز
کبھی تو سمجھیں گے مفہومِ مجلس و ماتم — شہیدِ کرب و بلا تیرے غم کی عمر دراز

(48)

ولولۂ حیات میں روحِ رواں حسینؑ ہیں — دَرد کی کائنات میں جانِ جہاں حسینؑ ہیں
فکرونظر کی شب میں ہےان کے ہی دم سے چاندنی — عزم وعمل کی صبح پر نورِ نشاں حسینؑ ہیں

(49)

نیزہِ جانستاں پہ بھی درسِ کلام حق دیا — مصحفِ کردگار کا حُسنِ بیاں حسینؑ ہے
عرش سے بھی بلند تھی اس کی صلواۃ زیرِ تیغ — شورِ صلواۃ ہے حسینؑ زورِ اذاں حسینؑ ہے
اب بھی علم بدوش ہے قوتِ بازوے حسینؑ — راہِ خدا کا آج بھی نام ونشاں حسینؑ ہے
نورِ نظر علیؑ کا ہے لختِ جگر بتولؑ کا — جانِ و دل رسولؐ کا راحتِ جاں حسینؑ ہے

(50)

حسینؑ ابن علیؑ اے نورِ وحدت روحِ یکتائی — ترے اطوار میں روح ازل کی کارفرمائی
ترے دم سے غریبوں کی زباں پر حرفِ حق آیا — تیرے تیور سے مظلوموں کے دعوے میں توانائی

(51)

وہ سبطِ نبیؐ حق کا ولی ہے اسلام — وہ مرکزِ آیاتِ جلی ہے اسلام
اسلام کو پوچھے جو زمانہ اے دوست — کہدے کہ حسین ابن علیؑ ہے اسلام

(52)

درِ نجف پہ سناتا ہوں نغمۂ ارنی — مجھے بھی حسرتِ آوازِ لن ترانی ہے
یہ کربلائے وفا جس میں سو رہے ہیں حسینؑ — یہی زمین محبت کی راج دھانی ہے

(53)

اہلِ دل گنوا رہے تھے اپنی اپنی قوم کے — وہ شہیدانِ وفا جن سے ہے قومی زیب و زین
یک بیک محفل میں سناٹا سا طاری ہوگیا — اک اب خاموش سے آواز آئی ''یا حسینؑ''

(54)

فہم انسانی سے بالا تر ہے معیارِ حسینؑ — خالقِ عزت سے پوچھو عزتِ کارِ حسینؑ
کردگارِ حسن کی ناز آفرینی دیکھنا — دو امامؑ اور اک نبیؐ ہے ناز بردارِ حسینؑ

(55)

سر بسر شانِ خدا ہے ذاتِ والائے حسینؑ — سیکڑوں ہیں طاقتیں زیرِ کفِ پائے حسینؑ
ساری دنیا ہوگئی شخصی حکومت کے خلاف — پھر کہاں اُس کا ٹھکانہ جس کو ٹھکرائے حسینؑ

(56)

اک طرف بابِ نجف، اک سمت دربارِ حسینؑ — یہ ہے سرکارِ علیؑ اور وہ ہے سرکارِ حسینؑ
دامِ آزادی میں دنیا مجھ کو لا سکتی نہیں — میں گرفتارِ علیؑ ہوں میں گرفتارِ حسینؑ

(57)

تیری منزل کیا سمجھ سکتی ہے دنیا اے حسینؑ — ہے تو ہی ابناء نا میں جلوہ فرما اے حسینؑ
پاؤں پھیلائے علیؑ و فاطمہؑ کی گود میں — تو رسولؐ اللہ کی زلفوں سے کھیلا اے حسینؑ

(58)

تیغ کے پانی سے کھیتی ظلم کی پھُک جائے گی — نہضِ بدعت چلتے چلتے خوف سے رُک جائے گی
کفر کو تو سرنگوں ہونا ہی ہے پیشِ حسینؑ — گردنِ اسلام بھی احسان سے جھُک جائے گی

(59)

بڑھ چلوں گا کچھ خس و خاشاک ہو جانے کے بعد
گرمیٔ سوز وِلا سے چاک ہو جانے کے بعد
اب نجف کے کارواں کی گرد بنتا ہے مجھے
اک نئی خدمت ملے گی خاک ہو جانے کے بعد

(60)

ساکنِ دیر اک بشر پوچھ رہا تھا کل یہ بات
کون ہے جس کی ذات سے کعبہ کی زیب و زرین ہے
کرتے رہے کچھ اہلِ علم دل کے ورق الٹ پلٹ
میری زباں پہ نام تھا میں نے کہا حسینؑ ہے

(61)

انسانیت کو مطلعِ انوار کر دیا
ہر قوم کو حسینؑ نے بیدار کر دیا
اشکوں کی نذر لاتے ہیں اپنے بھی غیر بھی
کس کس کو اے حسینؑ عزا دار کر دیا

(62)

رہبری کرتے ہوئے برچھیوں پر سر دیکھے
پھر زمانہ میں نہ اس شان کے رہبر دیکھے
قاتل آتے ہوئے ڈرتے تھے قریب شیرؑ
کس نے ایسے کسی مظلوم کے تیور دیکھے

(63)

تیرا نفسِ مطمئن قرآن کا دل ہے حسینؑ
مقصدِ خلقت ترے سجدہ کا حاصل ہے حسینؑ
کیا عجب ہے آخری اک ترا سجدہ دیکھ کر
کوئی کہہ اٹھتا کہ تو سجدہ کے قابل ہے حسینؑ

(64)

خدا کے ڈھونڈھنے والے تجھے خدا نہ ملا
مجھے حسینؑ سا انسان دوسرا نہ ملا
کچھ ان کے عشق میں مل جائے تو عجب کیا ہے
صلہ عبادت موہوم کا ملا نہ ملا

(65)

دل ہے پہلو میں تو سمجھو عزت کارِ حسینؑ
ہر فضا میں روشنی دیتے ہیں انوارِ حسینؑ
اس کے بندوں میں مسلمانان عالم ہی نہیں
غیر مسلم بھی ہزاروں ہیں پرستارِ حسینؑ

(66)

غمِ حسینؑ نے بخشا دلوں کو سوز و گداز
درِ حسینؑ سے کیا کیا نہیں ملے اعزاز
تمام اہلِ تصوف ہیں اس کے حلقہ بگوش
کوئی غریب نواز ان میں ہو کہ بندہ نواز

(67)

یہ اہتمام تھا کس مردِ حق نما کے لیے
خدا کے بندے ذرا غور کر خدا کے لیے
حسینؑ کو جو ملے حق سے باپ ماں بھائی
نہ مرتضیٰؑ کے لیے تھے نہ مصطفیٰؐ کے لیے

(68)

اُسوۂ شبیرؑ نے باطل کو حیراں کردیا
چہرۂ اسلام کو مہرِ درخشاں کردیا
حق کہو آلِ پیمبرؐ کا کہ دینِ حق کہو
جس کو دنیا نے چھپایا تھا نمایاں کردیا

(69)

ذکرِ حسینؑ سے یہ قرار و قیام ہے
اسلام کے پیام کی تبلیغ عام ہے
بیجا نہیں ہے دینِ حسینیؑ کہیں اگر
کلمہ حسینؑ کا ہے محمدؐ کا نام ہے

(70)

وہ اہلِ دل نہ کیوں کرنازشِ علم وعمل ٹھہرے
فدا انسانیت کے جان و دل اس حق پرستی پر
میسر اب کہاں دنیا کو ایسا مصلحِ اعظم
تہ خنجر گلا ہو انگلیاں ہوں نبضِ ہستی پر

(71)

شہیدِ ظلم کلیجے بلا دیئے تونے
حسینؑ درد کے دریا بہا دیئے تونے
ہر اک ذرّہ بےحس میں اک تڑپ بھر دی
دماغ وضع کئے دل بنا دیئے تونے

(72)

اللہ اللہ یہ سعادت یہ شرف یہ امتیاز
چار اماموں کی ولادت سے رجب ہے سرفراز
شکر کے سجدے میں خم ہے اوجِ گردوں پر بلال
آؤ اس کے ساتھ ہی پڑھ لیں مودّت کی نماز

(73)

یارب وہ آستانِ جلالت نصیب ہو
لوحِ جبیں کو پھر وہی قربت نصیب ہو
اچھا ہے ایک زاہدِ شب زندہ دار سے
وہ جس کو خواب میں بھی زیارت نصیب ہو

(74)

اگر حسینؑ نہ تخلیقِ کربلا کرتے
یہ حوصلے یہ عزائم یہ دل کہاں ہوتے
خدا سے ربط نہ ہوتا بغیر ذکرِ حسینؑ
اگر ہزار بھی قرآن درمیاں ہوتے

(75)

کوئی کچھ بھی کہہ کے اپنے دل کو سمجھائے حسینؑ
اے علیؑ و فاطمہؑ کی گود کے پالے حسینؑ

جس کا ماتم نام رکھ چھوڑا ہے یہ ماتم نہیں
تیرا ڈنکا بج رہا ہے کربلا والے حسینؑ

(76)

تحقیق اہلِ علم میں ہے عرش بارگاہ
تخئیل اہلِ فکر میں انسانیت پناہ

تیرے مقام تک کوئی پہنچا نہ اے حسینؑ
واللہ یہ مفکر و عالم ہیں گردِ راہ

(77)

سر اہلِ دل کا جھکتا ہے اسی جانب جدھر حق ہے
امامِ موسیٰ کاظم کا ہر انسان پر حق ہے

خدا کا شکر ہے شامل ہیں ہم جس کے غلاموں میں
وہی الکاظمین الغیظ کی تفسیر برحق ہے

(78)

نبیؐ خلق ہوئے تیری تولا کے لیے
لمحۂ فکر ہے وارفتۂ دنیا کے لیے

تیرے بابا نے ترا نام جو موسیٰ رکھا
فخر ہے تا بہ ابد حضرتِ موسیٰ کے لیے

(79)

ولادت سے امامِ عصر کی ہیں دو جہاں روشن
مسرت کا اثر یکساں ہے دشت و در پہ شہروں پر

غریبوں کے عریضے بھی امیدِ دست بوسی میں
چلے جاتے ہیں ہنستے بولتے دریا کی لہروں پر

(80)

تیری ہی آمد پہ قومی منزلت کا حصر ہے
تو رئیس اہلِ دل ہے تو امامِ عصر ہے

نامکمل ہے نظامِ زندگی تیرے بغیر
ہر عبادت تیری فرقت میں نمازِ قصر ہے

(81)

گردش میں عدو ہوں گے اور دور میں پیمانہ
آباد تو ہونے دو ساقی سے یہ میخانہ

جب ہوگا جلوس اس کا اورنگِ خلافت پر
اس روز بڑھادیں گے پیاسوں کا عزا خانہ

(82)

امامِ عصر دنیا ایک طوفانی سمندر ہے
مگر طوفاں میں کشتی کھینے والے اب بھی جیتے ہیں

قیامت آنے والی ہے یہ پروا ہو نہ ہو لیکن
تری قدموں کی آہٹ لینے والے اب بھی جیتے ہیں

(83)

تمہیں قائم تمہیں وجہ قیامِ روح و پیکر ہو — تم اک رازِ خدا ہو راز کا اظہار کیونکر ہو
تمہیں ہو عالمِ باطن تمہیں ہو جلوے ظاہر — تمہیں پردے کے اندر ہو تمہیں پردے کے باہر ہو

(84)

ولادت اس کی برحق ہے ظہور اس کا مقرر ہے — کہ اس کی ذات سے دنیا کا مستقبل مقدر ہے
یہ شانِ ورثہ داری کس کو عالم میں میسر ہے — نظر کرار کی زہرا کا دل ذہنِ پیمبرؐ ہے

(85)

تیرا مقامِ فقر ہے اجلالِ حیدری — تیرا متاعِ ناز حسینی غضنفری
آئین ساز سروریٔ دو جہاں ہے تو — اللہ تیرے دل میں ہے احساسِ کمتری

(86)

عباسؑ مزاجِ شرف و معنی عظمت — اجلالِ مشیت ہے تیری شانِ جلالت
تو ہے وہ بشر جس نے حدیں توڑ کے رکھ دیں — سنتے تھے کہ محدود ہے انسان کی طاقت

(87)

صبر سے وضع کیا اس نے اسیری کا مزاج — شکر سے کر کے بلند اپنے مصائب کا نظام
اس کے ایثار پہ حیران ہے عقلِ بشری — کم نہیں شانِ شہادت سے اسیری کا مقام

(88)

اے شریعت کے پرستار شجاعت کے دھنی — نازشِ ملت اسلام اویس قرنی
ماں کی خدمت کا یہ جنت سے بھی بڑھ کر ہے بدل — کہ رسالت کو پسند آیا ترا حسنِ عمل

(89)

عباسؑ کی مثال علیؑ کے سوا کہاں — چہرہ بھی نور بارِ علم بھی ہے ضوفشاں
اس منصبِ جلیل کے قابل تھا اور کون — شبیرؑ کے ہاتھ میں تھیں حیدرؑ کی انگلیاں
صورت وہ تھی کہ حسن تھا یوسفؑ کا دم بخود — قوت یہ تھی کہ شیر کی جیسے کلائیاں

(90)

دنیا اسے کیا سمجھے یہ روز اہم کیا ہے
عشرہ کے مقابل میں تاریخِ اُمم کیا ہے
عباسؑ کی مٹھی میں ہے قوم کا مستقبل
اسلام کی عزت ہے کاندھے پہ علم کیا ہے

(91)

بہت مشکل ولا کا راستہ ہے
کہ اس دعوے کی شاہد کربلا ہے
خبر بھی ہے تجھے ہمنامِ عباسؑ
کہ ساتھ اس نام کے شرطِ وفا ہے

(92)

زورِ وفا سے خلق کو حیران کر گئے
کانپے فلک یہ تیغ سنبھالے جدھر گئے
آبِ رواں سے ناخنِ پا بھی نہ تر کیا
عباسؑ بحرِ خوں میں گلے تک اتر گئے

(93)

حیدری نشاں جس نے دوش پر سنبھالا ہے
کیا بلند منزل ہے کیا بلند و بالا ہے
چھا گئی ہے یوں ہیبت بازوے حسینؑ کی
جیسے آج دریا کا رخ بدلنے والا ہے

(94)

منکر سے معجزہ کے یہ میرا سوال ہے
اب معجزہ کے حق میں ترا کیا خیال ہے
عباسؑ نے محال کو ممکن بنا دیا
دریا سے تشنہ کام پلٹنا محال ہے

(95)

دل ترا بغاوت پر مائل نظر آتا ہے
اس طرح ترا بچنا مشکل نظر آتا ہے
سجدے کر اسی رخ پر اے کشتیٔ بے ساحل
عباسؑ کے قبضہ میں ساحل نظر آتا ہے

(96)

زندگی کا تاجِ سر انسانیت کا دل بنے
آخری قربانی و ایثار کی منزل بنے
خالقِ کل نے جو کی بزمِ جہاں آراستہ
کربلا والے مجاہد زینتِ محفل بنے

(97)

کیا ذکر جنگ سلح حسنؑ کی ہوئی یہ قدر
مسلم کچھ ایسے ہیں جنہیں یہ بھی نہیں پسند
ان کے لیے سوال نہیں سلح و جنگ کا
دراصل اہلبیتؑ کی ہستی نہیں پسند

(98)

پہنچا کہاں کہاں تک یہ درد دل ہمارا　　کس کس نے کربلا کے غم کا لیا سہارا
اصغرؑ کی مدح کرکے انگریز ایک شاعر　　عنوانِ نظم رکھے ''معصوموں کا ستارا''

(99)

سپر متاع شریعت کی بن گئی زینبؑ　　بچا کے دینِ محمدؐ کی زندگی زینبؑ
اب اس سے بڑھ کے امامت کا فرض کیا ہوگا　　کبھی حسینؑ محافظ رہے کبھی زینبؑ

(100)

خدا کا حکم تھا ہوجاؤ صادقین کے ساتھ　　یہی سبیل ہے اوہام سے رہائی کی
بشر تھے عالمِ فکر و نظر میں کھوئے ہوئے　　مباہلہ نے صداقت کی رہنمائی کی

(101)

مظاہرہ تھا یہ واجب ضرور واجب تھا　　نمود جلوۂ خیرالامور واجب تھا
زمینِ کرب و بلا پر جہاد قاسمؑ سے　　شجاعتِ حسنیؑ کا ظہور واجب تھا

(102)

سبط نبیؐ کے گھر کی تنویر ہے سکینہؑ　　سادات ہاشمی کی توقیر ہے سکینہؑ
اس شان پر نہ کیوں ہوں اہلحرم تصدق　　زہراؑ کے بچپنے کی تصویر ہے سکینہؑ

(103)

کھلیں انسان کی آنکھیں ذہنیت میں انقلاب آیا　　افق پر عالمِ انسانیت کا آفتاب آیا
دُلھن کی طرح قاسمؑ نے سنوارا حق کے مقصد کو　　اسی کے دم سے معیارِ شہادت پر شباب آیا

اخلاقی قطعات

(1)

مولا کا استغاثہ ہے ترے حافظہ میں — مجلس کی حاضری سے منبر کی آگہی سے
یہ قول بھی سنا ہے سلطانِ کربلا کا — عزّت کی موت اچھی ذلّت کی زندگی سے

(2)

غلط روی کا سلامت روی میں نام نہ لے — غرور و نخوت و نفسانیت کا نام نہ لے
ہم اُس کو نازشِ انسانیت سمجھتے ہیں — جو اقتدار پہ دُشمن سے انتقام نہ لے

(3)

نازشِ خلقت فروغِ آدمیت بن گیا — کاروانِ خلق میں وجہِ فضیلت بن گیا
احسنِ تقویم کا خلعت تو پہلے ہی سے تھا — علمِ آدم کے لیے تاج خلافت بن گیا

(4)

غم سوا ہوگا اگر دیدۂ دل باز رہا — اب وہ اگلا سا نہ انجام نہ آغاز رہا
دوستی عہدِ گذشتہ کی نہ پوچھیں احباب — دُشمنی میں بھی شرافت کا اِک انداز رہا

(5)

نماز دیکھ کسی شخص کی نہ روزہ دیکھ — تو ارتباط نہ بندہ کا اور خدا کا دیکھ
امیرِ متقیاں کا یہ قول ذہن میں رکھ — معاملات میں آپس کے زہد و تقویٰ دیکھ

(6)

تہذیبِ عمل ہے آخرت کی کھیتی — بے خون جگر بڑھ نہیں سکتی اے دوست
تجھ کو ہیں جب اپنے چار آنسو بھی عزیز — یہ بیل منڈھے چڑھ نہیں سکتی اے دوست

(7)

جب پلٹتے ہیں متاعِ آب و گل کے سوگوار — دفن کر کے پیکرِ بے روح اِک انسان کا
اس یقیں پر یہ بھی سب ہر پھر کے آئیں گے ضرور — ذرّہ ذرّہ دیکھتا ہے مُڑ کے گورستان کا

(8)

اپنے کردار کا انجام ہے یہ سود و زیاں — انقلابات سے غیروں کو سروکار نہیں
بحر و بر ہم نے خریدے تھے ابھی کل کی ہے بات — آج ہم بکتے ہیں اور کوئی خریدار نہیں

(9)

وہاں کیا ذکر کے قابل ہے دل اپنا دماغ اپنا — جہاں جامِ سفالی سے بھی بدتر ہو ایاغ اپنا
یہاں اپنی بھری محفل بھی ہے مرہون تاریکی — کچھ اہلِ دل خلا میں بھی جلا آئے چراغ اپنا

(10)

بے عمل انسان تو ایک مہرۂ بے زور ہے — پہلی بازی میں بساطِ دہر کی پٹ جائے گا
صفحۂ گیتی پہ کچھ اپنا نوشتہ چھوڑنا — ورنہ اک دن صورتِ حرفِ غلط مٹ جائے گا

(11)

دل سے برسوں کے تعلق کو بھلا دیتی ہے — لطف اخلاص کی محفل سے اٹھا دیتی ہے
کچھ خبر ہے تجھے اک جنبشِ لب ایک نظر — دوست کو دوست سے بیگانہ بنا دیتی ہے

(12)

تابِ گویائی کہاں حق بات سننا شاق ہے — جس کو دیکھو کجروی میں شہرۂ آفاق ہے
بے تکلف اپنی لغزش کا جو کر لے اعتراف — آج کس انساں میں اتنی جرأتِ اخلاق ہے

(13)

اس دور میں کون سوچتا ہے — کیا کرنا ہے اور کیا نہ کرنا
اک عام اصول بن گیا ہے — وعدہ کرنا وفا نہ کرنا

(14)

لمحۂ عیش غم و درد میں ڈھل جاتا ہے　　وار تقدیر کا تدبیر پہ چل جاتا ہے
اپنی املاک سمجھ کر سرو ساماں کو نہ دیکھ　　وقت کے ساتھ ہی ماحول بدل جاتا ہے

(15)

ہوس کی راہ پہ میں دل سے ہارتا ہی رہا　　غلط روی پہ یہ ظالم اُبھارتا ہی رہا
کسی صدا پہ نہ کی مڑ کے اِک نظر میں نے　　مرا ضمیر مسلسل پکارتا ہی رہا

(16)

ہر چند ہر اک سانس ہے انعام خدا کا　　یاد آئے نہ آرام میں پیغام خدا کا
توہین عبادت ہے عبادت یہ نہیں ہے　　نازل ہو کوئی خوف تولیں نام خدا کا

(17)

کررہا ہے کب سے ہمت آزمائی آدمی　　غور سے دیکھے یہ شانِ ارتقائی آدمی
حکمت وجرأت سے ہومعمور جس کا دل دماغ　　اِس بھری دنیا میں کہلائے خلائی آدمی

(18)

رشتہ بہت ہے نازک تکمیلِ دوستی کا　　میں گُر بتارہا ہوں آسان زندگی کا
رہنا بہت ہی کم ہے اس منزلِ عمل میں　　ہو دوست ایک ہی کا دشمن نہ ہو کسی کا

(19)

بے فکر ونظر آنکھوں ہی آنکھوں کٹی رات　　ایسا نہ ہو دن باتوں ہی باتوں میں گذر جائے
سب کھوچکا اے دوست ضمیر اپنا بچالے　　انسان ہے زندہ ابھی انسان نہ مر جائے

(20)

ہم ہی اچھے ہیں کہ خوش رہتے ہیں ہر عالم میں ہم　　کس دوعملی میں ہیں اے دل واعظانِ محترم
عید اِدھر آئی اُدھر رخصت ہوا ماہِ صیام　　اِس کے آنے کی خوشی ہے اس کے جانے کا ہے غم

(21)

توہمات کی صورت کشی سے ڈرتے ہیں　　بلا سے دیو سے جن سے پری سے ڈرتے ہیں
جہاں میں ایسے ہی انساں ملیں گے کثرت سے　　کہ جو خدا کے سوا ہر کسی سے ڈرتے ہیں

(22)

زمیں بوئے خوں سے مہکتی رہی ستاروں کی چھاتی دھڑکتی رہی
مسیحا نفس بن گیا آدمی مگر آدمیت سسکتی رہی

(23)

خوب کہہ سن کے رنگ دیکھ لیا کیا زباں پر اب اپنا حال آئے
دور تک آدمی نہیں ملتا آدمیت کا جب سوال آئے

(24)

رفتار دیکھتے ہیں فدا کاریوں کی ہم اب وہ غرور وجہ تسلّی نہیں رہا
میدانِ کارزار میں آجائیں عورتیں جب کوئی مرد قوم میں باقی نہیں رہا

(25)

جب فیصلہ زمانِ ماضی ہوگا اللہ بڑے بڑوں کا قاضی ہوگا
تو آج ہو رزقِ مختصر پر راضی تھوڑے سے عمل پہ کل وہ راضی ہوگا

قومی قطعات

(1)

نعمتِ حاصل مبارک جانِ حاصل تک بھی جا
جس کے مدفن کی ہے دھن اس مردِ کامل تک بھی جا

کربلا سے اور آگے منزلِ شبیرؑ ہے
کربلا تک جانے والے اُس کی منزل تک بھی جا

(2)

نمودِ قوتِ نانِ شعیر دیکھتے ہیں
کمالِ شوق سے یہ داروگیر دیکھتے ہیں

غمِ حسینؑ بھی یارب کوئی تماشہ ہے
غریب کرتے ہیں ماتم امیر دیکھتے ہیں

(3)

کیا یہ ہے زندگی کا نصب العین
یہ ہے تقلیدِ سیّد کونینؐ

دل دُکھاتے رہو غریبوں کا
اور کہتے رہو "حسینؑ حسینؑ"

(4)

عمل سے رہ گیا محروم ذوقِ آگہی کیونکر
ترے دل نے غلط کوئی کی بے ربطی سہی کیونکر

زباں کچھ اور کہتی ہے روش کچھ اور ہے تیری
لسانِ اللہ سے وابستگی باقی رہی کیونکر

(5)

تو نیاز و نذر کی تکمیل میں ہے مبتلا
ہے مرادوں منّتوں میں تیری دولت کی بقا

جی رہا ہے تو ضرورت سے سوا آرام میں
مرنے والے مَر رہے ہیں بے دوا اور بے غذا

(6)

تجھ سے روزہ چاہتا ہے چشم تر کا اہتمام
نفس کی تہذیب پاکیزہ نظر کا اہتمام
سب عبادت سب ریاضت بے مزہ ہو جائے گی
ذہن میں رکھا جو افطار و سحر کا اہتمام

(7)

آنسوؤں کا جو تقاضا ہو تو بھر دے بل تھل
کربلا والوں کے ایثار کا مقصد نہ بدل
چند لفظوں میں یہ ہے اُسوۂ انصار حسینؑ
وسعتِ فکر و نظر حوصلۂ عزم و عمل

(8)

دیکھ لوں میں جاگتی آنکھوں شباب دردِ دل
دَرد کا طوفان بن اے اضطرابِ دردِ دل
آ گیا جانکاہ خطرہ میں نصابِ دینیات
چونک اٹھ للہ ملت کے نصابِ دردِ دل

(9)

ہے سپرد اہلِ علم ایک ایک بابِ دینیات
ایسی نگرانی میں یہ حالِ خرابِ دینیات
دیکھئے نا اتفاقی کا نتیجہ دیکھئے
آ گیا آپس کے جھگڑے میں نصابِ دینیات

(10)

فریب کار نمائندگانِ ملت نے
تباہ کی ہیں جہاں میں شریعتیں کتنی
غرض کی آڑ میں مُلّائے بے حقیقت نے
چُھپا چُھپا کے رکھی ہیں حقیقتیں کتنی

(11)

تیرا دولت پہ ہے **قبضہ تو مبارک ہو تجھے**
تجھ پہ قبضہ نہ کہیں اپنا جمائے دولت
مجھ سے دولت کے طلب گار یہ نکتہ سن لے
گھر میں آ جائے مگر دل میں نہ آئے دولت

(12)

نہ جانے کس قدر فتنے اُٹھا کر زندگانی میں
نظر آتا ہوں کتنا خوش فریب کامرانی میں
کوئی میرے ثقہ ہونے پہ شک کر ہی نہیں سکتا
بہت سے عیب چُھپ جاتے ہیں ٹوپی شیروانی میں

(13)

کردار ائمہ کی جھلک بھی تو نہیں
ملّت روتی ہے آج تک جن کے لیے
ناپید ہے خلقِ حسینؑ اور عزمِ حسینؑ
مجلس کی بنا ہوئی تھی اس دن کے لیے

(14)

یہ بلندی ہو مبارک اے جوانِ سر بلند
اے زمینِ دَرد و غم کے آسمانِ سر بلند
اِک ذرا کردار کی اپنے بلندی دیکھ لے
پھر اُٹھا عباسؑ غازی کا نشانِ سر بلند

(15)

گھر کے قصوں میں وقت کھویا کچھ دیر
پھر ذکرِ حسینؑ کرکے رویا کچھ دیر
مجلس میں گزر گئی بہر حال اچھی
جاگا کچھ دیر اور سویا کچھ دیر

(16)

بزمِ فلک کے آئنہ داروں سے ڈر گئے
فطرت کے چند کارگزاروں سے ڈر گئے
سب حال بندگی و عقیدت کا کھل گیا
کتنے خدا کے بندے ستاروں سے ڈر گئے

(17)

گلا حفاظت زنجیر وسیم و زر میں نہیں
غلام ہم بھی ہیں اُس کے یہ فضلِ داور ہے
دیا ہے ہم نے مودّت لقب زراہِ ادب
ہماری زیست محبت کی زندگی پر ہے
ہم اہلبیتؑ کے ہیں ایسے ماننے والے
کہ جن میں میثمِ تمار سا دلاور ہے
قلم کے بدلے اٹھالیں گے وقت پر تلوار
مجھے یقیں ہے یہی عزم ہر سخن ور ہے

(18)

کوئی ہم نامِ محمدؐ کوئی ہم نام علیؑ
دل میں دردِ ملّت اسلام ان کا سا نہیں
یہ برائے نام نسبت ہوگئی حاصل تو کیا
نام ان کے سے ہیں لیکن کام ان کا سا نہیں

(19)

ہر جگہ ہے اہلِ دولت کے لیے ساماں الگ
نذر کے موقع پر بھی بچھتا ہے دستر خواں الگ
یوں غریبوں سے یہ ہر منزل میں رہتے ہیں جدا
جیسے قبلہ ہے امیروں کا الگ قرآں الگ

(20)

نگاہِ وقت کا کیا اعتبار کرتے ہیں
حریف کیوں ہوسِ کارزار کرتے ہیں
علیؑ کا نام ہی کافی ہے سن رکھے دنیا
ہزار وار پہ ہم ایک وار کرتے ہیں

(21)

کیا اختلالِ ذہنیت چارہ گر میں ہے — مدت سے مبتلا وہ اسی دردِ سر میں ہے
سارے جہاں کے واسطے ہیں چارہ سازیاں — اُس کی خبر نہیں ہے جو بیمار گھر میں ہے

(22)

مجلس کے جو ختم پر پلٹتے دیکھا — حضار کو ٹولیوں میں بٹتے دیکھا
تعریف کسی کی اور کسی پر تعریض — خالی باتوں میں وقت کٹتے دیکھا

(23)

تزکیہ نفس کا ہے ماحصلِ صوم و صلوٰۃ — سونے والوں کو یہ پیغام ہے بیداری کا
یوں گلے مل لیے رسماً تو نتیجہ معلوم — عید ہے عہد محبت کا رواداری کا

(24)

مجلسوں سے قوم کی تنظیم ہونی چاہیے — کچھ تو حالِ زار کی ترمیم ہونی چاہیے
مقصدِ شبیرؑ کی تفہیم ہونی چاہیے — عام اب مظلوم کی تعلیم ہونی چاہیے

(25)

تاریکیاں ہیں ملّت بیضا کی تاک میں — کچھ قوم کی حیات کا سامان کیجئے
سرکار دو جہاں کی محبت کے نام پر — آپسی کے اختلاف کو قربان کیجئے

(26)

کتنے ہوں گے دعویدار اسلام کے — دوسروں کے غم کو غم سمجھے ہوئے
جادۂ خیرالبشرؐ سے دور ہیں — مسلکِ خیرالاممؑ سمجھے ہوئے

(27)

گذاری ہے کبھی اس شان سے بھی زندگی میں نے — دیا ہے اہلِ دنیا کو شعورِ حق رسی میں نے
فضائے عالم امن واماں کا پوچھنا کیا ہے — نہ شمشیر بھی حق سے نہ کی پہلو تہی میں نے

(28)

قدم اٹھائیے ناکامیوں سے ڈرنا کیا — شکست و فتح کے قصے ہزار ہوتے ہیں
شمار ان کا نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں — وہ کم نصیب جو پاتے ہیں کچھ نہ کھوتے ہیں

(29)

ہم اہل نہ تھے اس منزل کے خود اپنی حقیقت دیکھ چکے
گفتارِ سیاست خوب سنی رفتارِ سیاست دیکھ چکے
کیا دیں گے سہارا غیروں کو جب اپنے مسائل حل نہ ہوئے
تقریر کا حاصل دیکھ لیا تدبیر کی قوت دیکھ چکے

(30)

ملت کا تقاضا ہے کہ ہستی سے گذر جا
میرے لیے جینا ہے تو اپنے لیے مرجا
دریا سے تجھے پار اُترنا ہے بہر حال
طوفان کے کاندھے پہ قدم رکھ کے اُتر جا

(31)

عزم و استقلال و ہمّت چاہیے
آدمی دریا کا رُخ بھی موڑدے
موت برحق ہے تو کوئی حق پرست
موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دے

(32)

جو بات تھی ترے اسلاف میں وہ بات نہیں
بُرا نہ مان مسلماں کے یہ صفات نہیں
تو چلتی پھرتی ہوئی ایک لاش ہے اے دوست
حیات ہے مگر اسلام کی حیات نہیں

(33)

کیا خبر تھی زندگی کا مدعا بدلیں گے ہم
اپنا جادہ اپنی منزل بارہا بدلیں گے ہم
حق سے بیگانہ بنادے گا غم دنیا ہمیں
ہر نئی کروٹ پہ قسمت کی خدا بدلیں گے ہم

(34)

بچے بچے کی نظر ہے چاند پر
چاندنی سے ہر مکاں معمور ہے
یہ نہ سمجھا کوئی انساں آج تک
کس قدر نزدیک کتنی دور ہے

(35)

کون سے دن کے لیے ہیں یہ حکایاتِ قدیم
جگمگاتے ہوئے فانوسوں میں آیاتِ قدیم
لے کے پہنچے انہیں میدانِ عمل تک اغیار
ہم سناتے رہے دنیا کو روایاتِ قدیم

(36)

یہ اختلافِ لسانی پہ دو بدو کیسی
جو بول چال میں ہے فرق دل تو ایک رہیں
عزیز ہے اگر اپنی زباں کا عزو وقار
زبان پاک رہے اور خیال نیک رہیں

(37)

بجلی کی کڑک تھی جن کی آواز　　بادل کی طرح گرج رہے تھے
وہ آج ہیں رقص میں جو کل تک　　ہتھیار بدن پہ سج رہے تھے

(38)

کامیابی کا یہ انداز یہ عنوان نہیں　　اپنی گذری ہوئی ناکامیوں کو یاد نہ کر
عزم محکم ہو تو گرگر کے سنبھلتا ہے بشر　　راہ تدبیر میں اندیشہ افتاد نہ کر

(39)

یہ اہلِ عقل مسلم کے لیے زیبا نہیں ہوتا　　خلوصِ قلب اس عنوان سے پیدا نہیں ہوتا
حقیقت ہے یہی کوئی برا مانے بھلا مانے　　جو معمولات میں حائل ہو وہ روزہ نہیں ہوتا

(40)

ایک صف میں نظر آجائیں جو ہنگام نماز　　عصرِ حاضر میں یہ اسلام کا سمجھو اعجاز
شرط مسجد نہیں مسجد سے نکل کر دیکھو　　کسی محفل میں ہیں یکجا کبھی محمود و ایاز

(41)

اسلام کا شعار ہے تنظیم اتحاد　　اخلاق کا شعور ہے تکریم اتحاد
وہ فرض پنجگانہ ہو یا ہو صلوٰۃِ عید　　ملتی ہے ہر نماز سے تعلیم اتحاد

(42)

نام کس کا اتحادِ ملّت اسلام ہے　　ہم سے پوچھو وہ حسینؑ ابن علیؑ کا نام ہے
جو غم شبیرؑ میں ہیں ان کو اس کا غم نہیں　　زندگی کی صبح ہے یا زندگی کی شام ہے

(43)

بغیر سعی کہاں دل کا مدعا ملتا　　خیال و خواب کی سرگشتگی میں کیا ملتا
ترے خیال میں ہوتی ذرا بھی جان اگر　　کہیں تو بڑھ کے عمل کی حدوں سے جا ملتا

(44)

ایک اور ایک دو بھی ہوتے ہیں　　ایک اور ایک مل کے گیارہ بھی
جن کو قدرت نے دی ہے عقلِ سلیم　　ان کو کافی ہے اک اشارہ بھی

(45)

ضرورت ہے محبت کی سبق نفرت کا پڑھتی ہے
کہیں دنیا میں کوئی قوم یوں پروان چڑھتی ہے
یہ مصرف علم کا ہے اور یہ عالم نوجوانوں کا
تعصب بڑھ رہا ہے جس قدر تعلیم بڑھتی ہے

(46)

اچھا ہے نہیں گر ہوس طبل و علم
اندھیر ہے یہ دوات و خامہ بھی نہ ہو
آواز ہے کیا اُس کی اثر کیا اس کا
جس قوم کا ایک روز نامہ بھی نہ ہو

(47)

جس قوم نے سرکی مہم کرب وبلا
اس قوم میں ملتے نہیں آثار حیات
وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں
جس قوم کے ورثے میں ہو عاشور کا دن

(48)

کردار پہ اپنے رکھ نگاہِ تنقید
خود اپنے لیے شاہد عینی ہوجا
تو مجلس و ماتم میں حسینؑ ہے ضرور
ہر رنگ میں اے دوست حسینی ہوجا

(49)

کیا ترے ذوقِ ستم نے جوش پیدا کردیا
رمگِ تسلیم و رضا کچھ اور گہرا کردیا
ایک اشکِ غم تھا اب تک جذبۂ بے اختیار
جس نے اپنا خون شامل کرکے دریا کردیا

(50)

پھر وہی تیور قیامت خیز دکھلانے لگے
پھر زمین و آسماں ہیبت سے تھرانے لگے
یہ اقلیت ہماری یہ فدا کاروں کی بھیڑ
کیا فرشتے قید ہونے کے لیے آنے لگے

(51)

بڑھا کر جادۂ مہرو وفا کی آبرو آیا
تعال اللہ پیدل سندھ سے تا لکھنؤ آیا
تولائی مسافر تجھ کو طی ارض ممکن تھا
تری خاک قدم آنکھوں پہ کس رستہ سے تو آیا

(52)

وہی انسانۂ دل دوز پھر دہرانے والے ہیں
سخن کا شعر کا نغمہ کا طوفاں لانے والے ہیں
جگہ ہو صدر میں خالی در زنداں کھلا رکھے
حکومت کو خبر کر دو کہ ہم آنے والے ہیں

(53)

عالم غیرت اسیری بے سرو سامانیاں — زیست کی دشواریاں ہیں موت کی آسانیاں
امتحاں کچھ اور باقی ہو تو حاضر ہم بھی ہیں — پانچ جانوں کی تو اب تک دے چکے قربانیاں

(54)

عمر کم عزم زیادہ ہے یہ دکھلا جانا — کہیں آلام و مصائب سے نہ گھبرا جانا
اپنی جانب سے کمی آئے نہ قربانی میں — ہم اگر جیل میں مرجائیں تو تم آجانا

(55)

لے بڑھاؤ درد کی الفاظ کو مدھم کرو — وا عمل کی قوتوں سے دیدۂ عالم کرو
وقت ہے یہ کام کا تقریر کا موقع نہیں — آدمی بھیجو زیادہ اور باتیں کم کرو

(56)

نجم دل والوں کی شانِ امتیازی دیکھنا — درس اہل بیت کی جلوہ طرازی دیکھنا
جیل بھی گھر بن گیا ہے وسعتِ اخلاق سے — اہلِ فیض آباد کی مہماں نوازی دیکھنا

(57)

موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے — مرتے مرتے زندگی کا گیت گانا چاہیے
جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہلِ دل — پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانا چاہیے

(58)

بہر خدا نہ جیل رکھیں قدم ابھی — مردانِ حق پرست میں باقی ہے دم ابھی
کیوں اتنی مضطرب ہیں کنیزانِ سیدہ — کہہ دے یہ ان سے کوئی زندہ ہیں ہم ابھی

(59)

روتے ہیں جیل میں بھی مظلوم کربلا پر — ایثار کی خوشی میں یہ غم بھی کررہے ہیں
یہ دن کی ہے مشقت وہ شب کا ہے فریضہ — چکّی بھی پیستے ہیں ماتم بھی کررہے ہیں

(60)

ہوئی نہ فتح میسر تو قوم سن رکھے — براہ راست ارادہ نہیں ہے آنے کا
عجب نہیں جو ابل کھول دے درمقصود — قفس میں ہوکے بھی رستہ ہے آشیانے کا

(61)

مرحبا اے خطۂ فیروز پور ہر جتھے میں شان ہے سیلاب کی
اللہ اللہ یہ تری دریا دلی زندہ باد اے آبرو پنجاب کی

(62)

کیا دے گی وہ نگاہِ ستم آفری ہمیں رکھنا ہے اپنی قوتِ حق پر یقیں ہمیں
یوں خواب سلح دیکھ کے کچھ دن جئے تو کیا امید سلح تادمِ آخر نہیں ہمیں

(63)

دل میں رہ جائے گی پھر کوئی نہ کوئی کاوش حق و باطل میں کہیں سلح ہوا کرتی ہے
موت کے درد سے بدتر ہے جو مانگے سے ملے زندگی قوتِ بازو سے ملا کرتی ہے

(64)

یہ خوشنما عمارت یہ نقش ساحرانہ تہذیب آدمی کا فکری نگار خانہ
دنیا کی دولتیں سب گر جاتی ہیں نظر سے جس وقت دیکھتا ہوں یہ علم کا خزانہ

(65)

جب اپنی منفعت ہر ہر برائی برملا جائز کوئی پوچھے ہوا کیوں کر یہ امر ناروا جائز
جہاں سے کل اٹھا ہے مردم افرنگ کا قبضہ اسی بھارت میں کتنے آج تک قبضے ہیں ناجائز

(66)

درندوں کو بھی یہ حیواں صفت شرمائے جاتا ہے جبینِ آدمیت پر پسینہ آئے جاتا ہے
یہ کیسی پیاس خونخواری کی ہے سیری نہیں ہوتی یہ کیسی بھوک ہے انساں کو انساں کھائے جاتا ہے

(67)

یہ مشکل ہے کہ دل میں کچھ ہمارا درد لے جائیں سوائے شکر یہ لے جائیں گے کیا دیکھنے والے
ہم اپنی دھن میں بیٹھے ہیں وزیر ہوں کہ لیڈر ہوں بہت آئے اور آئیں گے تماشا دیکھنے والے

(68)

نوائے درد وہ نا مہرباں نہ روک سکا زمیں نہ روک سکی آسماں نہ روک سکا
دہن پہ مہر لگائی قلم پہ بندش کی مگر کوئی مرے دل کی زباں نہ روک سکا

(69)

عزت سے آبرو سے بٹھائے گئے ہیں ہم
چھ بار اس دیار میں آئے گئے ہیں ہم

دو چار سال تک یہ نہ آنے کی ہے سزا
قیدی بنا کے شان سے لائے گئے ہیں ہم

(70)

نہ دیکھی اور نہ قید ایسی سنی ہم نے فسانوں میں
کمی آنے نہ پائی کچھ حکومت کے خزانوں میں

زہے حسن تدبر گھر ہی مظلوموں کو زنداں تھے
کہ دورات ایک دن پابند رکھا ہے مکانوں میں

(71)

دے کے یہ دولت کوئی لیتا ہے ناداری کہیں
یوں بھی ممکن ہے بھلا ترکِ وفاداری کہیں

حب ہلدیث شامل جن کے آبِ گِل میں ہے
وہ مسلماں چھوڑ سکتے ہیں عزاداری کہیں

قطعاتِ واعظ

(1)

یہ عمامہ، یہ عبا، یہ اوجِ منبر پر نشست
یہ سمجھنا ہے غلط جیسے کہ ہے گھر پر نشست
پہلے اتنا دیکھ لیجئے، پاؤں اس قابل بھی ہیں
یہ نشستِ منبری ہے قوم کے سر پر نشست

(2)

راہ و منزل سے بے خبر آئے
دردِ ملت کے چارہ گر آئے
کچھ اصولِ حیات ذہن میں تھے
منبروں پر بیان کر آئے

(3)

سلام میں سبقت اور پھر غریبوں پر
نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف
غرور علم کا عالم! ارے معاذاللہ
کہ جیسے دوش پہ رکھی ہے درسگاہِ نجف

(4)

جزوِ تن اچھی سے بھی اچھی غذا
زیبِ تن بہتر سے بھی بہتر لباس
ذکر لب پر فقر اہلِ بیتؑ کا
مرحبا اے واعظ معنی شناس

(5)

خدمت میں جو وارد ہو کوئی صاحبِ دولت
تعظیم کو بڑھتا ہے عمامہ بھی عبا بھی
تعظیم کا کیا ذکر ہے پہلو بھی نہ بدلیں
آجائے اگر صورتِ مفلس میں خدا بھی

(6)

مرحبا محراب و منبر احتشام
شرع کی صورت گری ہے اس کا نام
یہ ترا منصب، یہ دوہری زندگی
مقتدی ہے گھر میں مسجد میں امام

(7)

خود ساختہ مُلا کے پیرایۂ حکمت نے — پروردۂ صحت کو بیمار بنا ڈالا
مذہب کے مسائل میں ڈالے ہیں وہ اُلجھاوے — آساں شریعت کو دستور بنا ڈالا

(8)

بلاکو کی روش تقلیدِ چنگیزی نہیں جائز — سکونِ عافیت میں فتنہ انگیزی نہیں جائز
خدا جانے روا رکھتے ہیں کیونکر مذہبی قاید — کسی مذہب کسی ملت میں خونریزی نہیں جائز

(9)

اکثر مطالبات کو ٹالے ہوئے تو ہوں — مرضی پہ اپنی شرع کو ڈھالے ہوئے تو ہوں
اٹھتا نہیں ہے بارِ تقدس اگر تو کیا — عمامہ و عبا کو سنبھالے ہوئے تو ہوں

(10)

علم و عمل کی دنیا کیسی بدل گئی ہے — کردار بھی نئے ہیں رفتار بھی نئی ہے
اللہ کس نظر سے یہ انقلاب دیکھیں — سرمایہ دار آگے اور پیچھے مولوی ہے

(11)

اے عزت واقتدارِ ظاہر کے غلام — نسبت ہے تجھے علی سے بیشک لاریب
کس فخر سے ذکر اس کی مزدوری کا — اُس کے لیے فخر اور تیرے لیے عیب

ذاتی قطعات

(1)

فریبِ نفس میں کھویا ہوا میں خود نکلا
متاعِ نیک سے نا آشنا میں خود نکلا
بُرا جو ڈھونڈنے اُٹھا کبیر کی مانند
تو کائنات میں سب سے بُرا میں خود نکلا

(2)

سختیٔ نزع بہر حال سہوں گا اے دوست
ایسے موقع پہ نہ خاموش رہوں گا اے دوست
اُس کے مفہوم کی دوں گا نہ جھلک بھی میں تجھے
آخری سانس میں جو شعر کہوں گا اے دوست

(3)

یہی خطا ہے اسے تو خطا سمجھ نہ سمجھ
نہ اہلِ کبر سے ہوں اور نہ خود پسند ہوں میں
تجھے غرور جو ہے اپنی بے نیازی کا
مجھے بھی ناز ہے تیرا نیاز مند ہوں میں

(4)

مجھے تو آخری ساعت سے بھی کچھ کام لینا ہے
بگاڑوں زندگی سے کیوں فریبِ زندگی کہہ کر
سناؤں گا میں اپنی موت کو بھی نغمۂ مدحت
گذرتے وقت کو بھی روک لوں گا یا علیؑ کہہ کر

(5)

جو کچھ بھی محبت میں محبت کا خدا دے
جینے کے ادارے ہیں نہ مرنے کے ارادے
اے حسن کسی کو تو وفاؤں کا صلا دے
میرے سے بہت ہیں مجھے اپنا سا بنا دے
تو خود بھی ہے کھویا ہوا اے صاحبِ جلوہ
کچھ خیر ہے پردے تو نگاہوں کے اٹھا دے

(6)

آشیاں بنتے ہیں آئی ہے بہار
اک قفس ہم بھی بنانے کو چلے
قابلِ درد کہاں دل میرا
کیوں گنہگار بنانے کو چلے

(7)

تقریب میں شادی کی امید کرم برحق
کرّار کے در سے بھی بی بی کے پدر سے بھی
میں دونوں گھرانوں کا شاعر ہوں میں لے لوں گا
انعام اِدھر سے بھی انعام اُدھر سے بھی

(8)

اپنی ہستی میں کبھی وہ منزلت پاتا ہوں میں
زندگی کیا موت کیا دونوں کو ٹھکراتا ہوں میں
مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ ارباب کرم
پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہوجاتا ہوں میں

(9)

تڑپتے رہتے ہیں جو صبح و شام حاضر ہیں
نگاہِ لطف کے سب تشنہ کام حاضر ہیں
یہ سر کہیں نہیں جھکتے اس ایک در کے سوا
سلام لیجیے مولا غلام حاضر ہیں

(10)

یہ بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ ہوتا گوشۂ دل میں
خیال اظہار غم کا جس کو آنسو بن کے بہنا تھا
ہوئے احباب رخصت اپنا اپنا درد دل کہہ کر
کسی نے کچھ نہ پوچھا ہم سے کچھ ہم کو بھی کہنا تھا

(11)

موت برحق ہے مجھے سمجھا رہی ہے بار بار
یہ پیامِ نظم فطرت لا رہی ہے بار بار
ایک بار آئی زلیخا کی جوانی لوٹ کر
میری بیماری پلٹ کر آرہی ہے بار بار

(12)

اب نہ وہ انساں نہ وہ منظر نہ وہ عالم رہے
اہل دل کے واسطے اے دوست غم ہی غم رہے
کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولت دنیا زیادہ آدمیت کم رہے

(13)

سخت جانی سے مری ہے اسی دنیا کو گلہ
اسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
زندگی غیر کے احسان سے منظور نہیں
آج لے لوں جو ملے مرگِ خدا داد مجھے

(14)

ترا ذوقِ جستجو ہے عیش پستی کی طرف
رخ ہے میری آگہی کا غم پرستی کی طرف
تجھ کو ہے میرے سخن کی رہبری سے کیا گلہ
میں تجھے لے جارہا ہوں راز ہستی کی طرف

(15)

وقف کر کے جان و دل قربان جانے کے لیے
سب سے باز آیا انھیں اپنا بنانے کے لیے
میرے مولا کو خبر ہے میرے دل کے حال کی
میں نصیری ہی سہی سارے زمانے کے لیے

(16)

وطن کے عشق میں ڈوبا ہوا آتش بجاں ہوں میں
وطن ہے مرے ہر اک گوشۂ دل میں جہاں ہوں میں
مری نظروں میں جذباتِ محبت رقص کرتے ہیں
مری رگ رگ سے آتی ہے صدا ہندوستاں ہوں میں

(17)

حکومت اور نہ دولت چاہتا ہوں
سلوک آدمیت چاہتا ہوں
انھیں یہ پاؤں پھیلانا مبارک
کہیں میں بھی سکونت چاہتا ہوں

(18)

محبت کی تبلیغ مسلک ہے میرا
خیالات کو بال و پر دے رہا ہوں
پیام سخن کی بلندی نہ پوچھو
ستارے ستارے خبر دے رہا ہوں

(19)

انقلابات کا نشانہ ہوں
مصرفِ گردش زمانہ ہوں
تجھ سے وابستگی اور اس پہ یہ غم
تو حقیقت ہے میں فسانہ ہوں

(20)

فورِ شوق میں دھونی رما کے بیٹھ گیا
ادب کی راہ سے آیا اور آ کے بیٹھ گیا
نصیب اس کے جو دنیا کا عیش ٹھکرا کر
حسین ٹیکری سے دل لگا کے بیٹھ گیا

(21)

رنج و غم سہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں
جب میں چپ رہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں
میری غزلوں سے چھلکتا ہے مرے دل کا لہو
درد دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں

(22)

زندگی میں کب تک ہیں سختیاں نہیں معلوم
کب نگاہِ فطرت ہو مہرباں نہیں معلوم
برق و باد واقف ہیں موسمِ خزاں واقف
کیا بہار کو میرا آشیاں نہیں معلوم

(23)

سرمایہ طراز شعر و حکمت ہم ہیں
کھولی ہیں سخنوری کی راہیں ہم نے
سرمایہ پرستوں کی حقیقت کیا ہے
دیکھی ہیں بڑے بڑوں کی نبضیں ہم نے

(24)

گناہگار سہی حق شعار ہوں مولاؑ
نگاہِ لطف کا امیدوار ہوں مولاؑ
غریب ہو کے شرف ہے مجھے امیروں پر
غمِ حسینؑ کا سرمایہ دار ہوں مولاؑ

(25)

وہ جس پر یا علیؑ کندہ ہے میرا جام ہے ساقی
مری تقدیر میں نو روز کا انعام ہے ساقی
یہی مصحف یہی عترت یہی نغمہ یہی نعرہ
زمیں سے آسماں تک ایک ہی تو نام ہے ساقی

(26)

محبت کے تڑپتے برق پاروں میں تمھیں دیکھا
ان اشکوں کے روپہلی آبشاروں میں تمھیں دیکھا
خوشی میں دور تھے مولاؑ مصیبت میں قریب آئے
خزاں میں تم نے تسکیں دی بہاروں میں تمھیں دیکھا

(27)

ملی فضائل آلِ نبیؐ کے سایہ میں
جہانِ علم و ادب کو یہ وسعتِ الفاظ
یہ سب حسینؑ کے ایثار کا تصدق ہے
غزل میں درد قصیدے ہیں شوکتِ الفاظ

(28)

فکر شاعر کا ہو کیا اس سے بلند اور مقام
مدحت آلِ پیمبرؐ ہے اور اللہ کا نام
نجم میں کیوں نہ ہوں وابستہ دامانِ علیؑ
میرا مسلک ہے محبت و محبت کا امام

(29)

تخصیص امیری و فقیری نہ رہی
کرنے یہ غریبوں کی مدارات آیا
یکساں ہوئیں نعماتِ الٰہی تقسیم
اسلام لیے عدل و مساوات آیا

(30)

کس لطف سے فرماتے ہیں تو چپ کیوں ہے
شیریں دہنوں میں ہے ستائی میری
ہوتی ہیں یہ تقدیر کی باتیں اے نجم
بھاتی ہے انہیں تلخ نوائی میری

(31)

بولوں جو میں کچھ زبان پکڑے دنیا　　بیداد ہو داد کے عوض میں حاصل
چپ ہوں تو ہوں شکوہ سنج احباب اے حجم　　گویم مشکل و گر نگویم مشکل

(32)

ہنستی ہیں یا بسورتی ہیں کلیاں　　موجیں لڑتی ہیں یا گلے ملتی ہیں
اتنی بھی خبر نہیں خبر کیا ہے تجھے　　فطرت کی حدیں حجم کسے ملتی ہیں

(33)

ہے طابگارِ فرائض کردگار　　اور طالب ہیں سنن کے مصطفاؐ
طالبِ نان و نمک اہلِ و عیال　　نفسِ امّارہ ہے طالب عیش کا
ہیں فرشتے طالبِ صدقِ عمل　　اور ہے شیطان کا کچھ مدّعا
روح کی طالب ہے مرگِ منتظر　　جسم کی طالب لحد ہے برملا

یہ طلب اور یہ تقاضے جس سے ہوں
صبح کیا اُس کی اور اُس کی شام کیا

قرآنی قطعات

(1)

تیس پاروں سے فصاحت کا وہ دریا بہ گیا
ہر فصیحِ عصر خاموشی سے تیور سہہ گیا

سیدھے سادے لفظ و معنی کی جلالت دیکھ کر
فلسفہ قرآن کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا

(2)

قرآن کی تعلیم کا یہ طور ہے کوئی
آیات کی تشریح کا بھی دور ہے کوئی

تو صرف تلاوت کی ہی خدمت پہ ہے مامور
مفہوم سمجھنے کے لیے اور ہے کوئی

(3)

دیکھو تو ہے قرآن میں سب کچھ موجود
حکمت بھی شریعت بھی سیاست بھی ہے

اللہ نے بھیجا ہے مکمل قانون
ہے دین بھی دنیا کی حقیقت بھی ہے

عزائی قطعات

(1)

یہ شدّتِ غمِ دنیا تجھے مبارک ہو — کسے خبر کوئی بے چین ہے کہ چین سے ہے
ہمارے آگے حقیقت نہیں کسی غم کی — کہ ربط و ضبط ہمارا غمِ حسینؑ سے ہے

(2)

بیگانہ اس فضا سے جو ہیں ان کو کیا خبر — آواز سن رہے ہیں فقط شور و شین کی
جس کی کوئی مثال نہیں کائنات میں — اک ایسی درس گاہ ہے مجلس حسینؑ کی

(3)

سب سے عظیم حسنِ عمل ہے غمِ حسینؑ — کتنی مخالفت ہو اٹل ہے غمِ حسینؑ
اس غم کے ساتھ فکر و نظر بھی جو ہو نصیب — ہر عقدۂ حیات کا حل ہے غمِ حسینؑ

(4)

اب عہد مختصر ہو کہ ہو زندگی دراز — دو دو ہیں جب مرے غم ہستی کے چارہ ساز
ذکرِ خدا بھی کرتا ہوں مدحِ حسینؑ بھی — یہ بھی مری نماز ہے وہ بھی مری نماز

(5)

گناہ گار اطاعت گذار حاضر ہیں — غریب قوم محبت شعار حاضر ہیں
سجا کے لائے ہیں سینوں میں داغ ماتم کے — غمِ حسینؑ کے سرمایہ دار حاضر ہیں

(6)

ہندو بھی ہیں غمخوار حسینؑ ابن علیؑ کے — کب اس کے غم و درد کا بادل نہیں گرجا
بھارت کی زمیں مجلس و ماتم کا ہے مرکز — سب اس کے عزا دار ہیں راجا ہوں کہ پرجا

(7)

حیراں ہوں مری شانِ مودّت پہ فرشتے — ہر آہ مرے دل کی تولا کا نشاں ہو
لے جاؤں گا محشر میں پئے نذرِ پیمبرؐ — غم پرچم عباسؑ کے سایہ میں جواں ہو

فکری قطعات

(1)

ہر قوم کو ہے دعوتِ فہم و ادراک — ہر دور میں ہے غور طلب فکرِ حسینؑ
اخلاق کا معیار سمجھنا ہے اگر — آ مجلسِ غم میں اور سُن ذکرِ حسینؑ

(2)

ہیتا ہیوں کے ہنگاموں میں تدبیر سکوں فرماتی ہے — دیتی ہے غموں سے فرصت بھی اور دشمنِ جاں کہلاتی ہے
اے دوست مقامِ حیرت ہے اس موت سے ڈرتا ہے انسان — جو گود میں اپنی انساں کو بچوں کی طرح لے جاتی ہے

(3)

پیغمبرِ گناہ سے بخشش کا آسرا — دوزخ کی آگ سے طلبِ راحت جناں
حدِ گناہ مکرِ ثنائے امیرِ شام — دور از ثوابِ مدحتِ مولائے دوجہاں
کہنے کو اسم پاک محمدؐ سکونِ روح — فرمان کلنا کی اذیت سے نیم جاں
فرعون کی مدد سے رسائی کلیم تک — یوسفؑ کے بدلے اک حبشی روحِ کارواں

(4)

دل میں خون بھی خون میں جوش بھی ہے — پھر خیر سے یہ عالمِ خاموش بھی ہے
کیا سانس کا مول تول معلوم نہیں — خالی جاتی ہے سانس کچھ ہوش بھی ہے

(5)

جائزہ لے وقت کا ایک ایک پل کی فکر کر — آج کا دن تیری پیشی میں ہے کل کی فکر کر
موت کو تو اک دن آنا ہے آئیگی ضرور — موت کی کیا فکر ہے حسنِ عمل کی فکر کر

(6)

مرثیہ کو عیش کی باتوں سے کیا ہے واسطہ
اپنی تعریفوں کی خواہش میں یہ شامت آگئی

ابتدائی لغزشیں تھیں ساقی نامہ اور بہار
رفتہ رفتہ رقص و موسیقی کی نوبت آگئی

(7)

موضوع کی تلاش ہے قطعات کے لیے
گرمی کا زور چاہیے برسات کے لیے

ملتا ہے یوں مسبب الاسباب کا پتہ
لازم ہے اک سبب ہو ہر اک بات کے لیے

(8)

دبے جارہے ہیں حقائق بھی جن میں
حکایات کی وہ فراوانیاں ہیں

عمل کی بھی اے کاش ہوتی رسائی
جہاں تک دماغوں کی جولانیاں ہیں

(9)

یہی انسان ہے جس کا چراغ ہوش مدہم ہے
یہی انسان اسرارِ خداوندی کا محرم ہے

اگر ہو جستجوئے علم کی توفیق کیا کہنا
کتابیں ہوں اور آنکھیں ہوں تو عمرِ خضر بھی کم ہے

(10)

نیّتِ امروز و فردا تا کجا
چار دن امروز و فردا اور ہے

ختم ہے دم بھر میں کارِ زندگی
ایک دو سانسوں کا رشتا اور ہے

(11)

ہم ہیں قدرت کے اک اشارے تک
وقت کے آخری سہارے تک

زندگی ایک لہر ہے اے دوست
اس کنارے سے اُس کنارے تک

(12)

علم و حکمت کی حدیں انسان پاسکتا نہیں
رستمِ دستاں بھی طاقت آزما سکتا نہیں

چور لے جاتے ہیں جس کو وہ بضاعت اور ہے
یہ وہ دولت ہے جسے کوئی چرا سکتا نہیں

(13)

معنیٔ عرفان و مفہومِ بصیرت علم ہے
کارزارِ دہر میں انساں کی قوت علم ہے

سیم و زر کی دولتوں کے پہرہ داروں سے کہو
خرچ کرنے سے جو بڑھتی ہے وہ دولت علم ہے

(14)

سفر تھا کون سا ایسا جو بے جھجک نہ ہوا — رہے گا پوری طرح کامیاب شک نہ ہوا
بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست — اسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

(15)

مخالف کو نہیں معلوم امرِ حق کی ابجد تک — یہاں ہے معرفت محسوس سے معقول کی حد تک
سمجھ جائے گی دنیا جب علیؑ کا شیر آئے گا — خدا والی خلافت ہے محمدؐ سے محمدؐ تک

(16)

عید اپنے اہتمام سے آئی گذر گئی — دنیا میں کرکے جلوہ نمائی گذر گئی
دل کو اگر سکوں نہ ہوا آج کل سہی — اے دوست کیا خدا کی خدائی گذر گئی

(17)

طور سینا ہے جو سینہ علم سے معمور ہے — ہر شریعت ہر طریقت کا یہی دستور ہے
مال و زر قارون کا ورثہ ہے اے دنیا طلب — علم ورثہ انبیاؑ کا ہے خدا کا نور ہے

(18)

ارسطو نے کہا رونا ہمیں بزدل بناتا ہے — خدا ملتا ہے رونے سے کبیرا کی یہ ہے بانی
دل حساس دیکھا فرق حکمت اور محبت کا — کہیں ہے مادی فطرت کہیں جذبہ ہے روحانی

(19)

مٹا سکے گا کہاں تک نشانِ گمراہی — کہیں کہیں ترا نقش قدم پڑا نہ رہے
زمانہ آج فراموش و در گذر کردے — ترا گناہ جو تجھ کو پکارتا نہ رہے

(20)

بجا طلب سے زعمِ سخا سے بلند ہے — فکرِ حیات و خوفِ قضا سے بلند ہے
مسجود ہے ملک کا تو اے بندۂ خدا — تیرا مقام شاہ و گدا سے بلند ہے

(21)

نظمِ حیات ہے یہی سلسلۂ حیات میں — وقت نے بہر آگہی فکر سا رہنما دیا
سختی راہ ایک تھی میرے تمھارے واسطے — جس کا تھا دل بڑھا ہوا اس نے قدم بڑھا دیا

(22)

وہ پختہ کار جو عزمِ صمیم رکھتے ہیں — کسی فضا میں بھی بیدل نہیں ہوا کرتے
ابھی بہت ہیں یہ دو چار آخری سانسیں — خدا نخواستہ کیوں ترک مدعا کرتے

(23)

بقا ہے کس کو فقیری ہو یا امیری ہو — نہ بوریئے کی حقیقت ہے کچھ نہ کرسی کی
رہا مزاج نہ کوئی مزاج داں باقی — جب آ کے پیکِ اجل نے مزاج پرسی کی

(24)

رمضاں کی ہے کس قدر عظمت — ان سے کہنا ہے جو نہیں آگاہ
ہر مہینہ کو ہم سے نسبت ہے — یہ مہینہ مگر ہے شہر اللہ

(25)

کیا موت زندگی کے ستارے چمک گئے — مولا مری نگاہوں سے پردے سرک گئے
مدہوش ہی سہی مگر اتنا تو یاد ہے — تم ہاتھ تھام کر مرا منزل تلک گئے

(26)

بہت اونچا بہت اونچا ابھی انساں کو جانا ہے — دماغوں کی عمل داری ہے حکمت کا زمانا ہے
فسادِ ارض کی رفتار سے ہم نے تو یہ سمجھا — جبینِ ماہ پر بھی خون کا ٹیکہ لگانا ہے

قطعاتِ شاعر

(1)

وہ احترام ادب کا وہ لطفِ سخن گیا
وہ یادگار عہد سلفِ بانکپن گیا
اس دور کے مشاعرے اللہ کی پناہ
شاعر اب ایک آلہ تفریح بن گیا

(2)

جس دور سے گزر کے ہم آئے ہیں ہم نشیں
نشتر ہے آج حافظے میں اس کی یاد بھی
اس دور میں سنا ہے تغزل کے ساتھ ساتھ
ملتی ہے شاعروں کو ترنم کی داد بھی

(3)

تجھے مکارم اخلاق آدمی کی قسم
کسی حقیر تمنا کو زندگی نہ بنا
کسی کے در پہ نہ جا بہر داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گداگری نہ بنا

(4)

دعوتوں کا وہ تسلسل ہے کہ خالق کی پناہ
خواب و خور اپنی خوشی سے امر مشکل ہوگیا
حضرت سائلؔ کا مصرع یاد آتا ہے مجھے
شعر کہنا حیلہ روزیٔ سائلؔ ہوگیا

(5)

آج کہلاتی ہے بے راہ روی اسٹائیل
اب زمانے کو ہے مرغوب یہی اسٹائیل
بات اکھاڑے سے یہ بزم شعرا تک پہنچی
شعر بھی ہونے لگے اب تو فری اسٹائیل

(6)

محفل کا لطف کیا ہے جو شور و شغب نہیں
شاعر کو کسرِ شان کا احساس بھی نہیں
جی بھر کے کیجیے بے ادبی کے مظاہرے
اس دور کا مشاعرہ بزمِ ادب نہیں

سائلؔ: نواب سراج الدین احمد خاں

(7)

شاعر کوئی بے مدحت حیدرؑ نہیں ہوتا
ہر سیفِ زباں صاحب جوہر نہیں ہوتا
حق بات پہ ہم کرتے ہیں دل کھول کے تعریف
کم ظرف کوئی شیعۂ حیدرؑ نہیں ہوتا
پروا نہیں دنیا کی محبانِ علیؑ کو
ملتے ہیں وہاں باغ یہاں گر نہیں ہوتا
قرآن سے بے فیض ہیں کتنے ہی مسلماں
اک حرف مودّت بھی میسر نہیں ہوتا

(8)

کچھ ترنم کچھ تمسخر کی روش درکار ہے
آج اہلِ ذوق کو سنجیدگی سے عار ہے
اور سب کچھ ہو چکا اس دور نا ہموار میں
رقص بھی کرنے لگے شاعر تو بیڑا پار ہے

ولائی قطعات

(1)

محبت پر بنا رکھی ہے جس نے بزمِ ہستی کی
کوئی اس کا بھی ہو محبوب فطرت کا تقاضا ہے

سمجھتا ہے ہر اہلِ دل مسلماں اس حقیقت کو
محبت اس کی عزت سے تولا در تولا ہے

مودّت ہے اگر جاری رہے نغمہ مودّت کا
کوئی سنتا نہیں سنتا اب اس کا سوچنا کیا ہے

یہ مدحت اور مودّت ہے اگر امید جنت میں
یہ دردِ دل نہیں ہے جحم دردِ دل کا سودا ہے

(2)

ہائے وہ جام تولا کہ لنڈھانے والے
یاد رکھیں گے یہ ہمت بھی زمانے والے

پاؤں کٹتے تھے جب اس سمت کا رخ کرنے پر
سر کے بل جاتے رہے میکدے جانے والے

(3)

صوم و صلوٰۃ والے مری جستجو کریں
سب میکدہ میں میری طرح ہاؤ ہو کریں

ڈوبا ہوا ہوں بادہ خمِ غدیر میں
دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

(4)

جان ہے کیا عشق مولا میں بچانے کے لیے
میری ہستی درس ہوگی اک زمانے کے لیے

اے تولا کے سمندر اے غدیرِ درد دل
میں سہارا چاہتا ہوں ڈوب جانے کے لیے

(5)

علی کے نام کا رندوں میں بھی اثر دیکھا
زبانِ اہل تصوّف پہ جلوہ گر دیکھا

میں ہاؤ ہوئے نصیری میں ہوگیا شامل
بہت گناہ تھے یہ بھی گناہ کر دیکھا

(6)

پوچھے کوئی خلوص کے جذبے کدھر گئے
مولا کا نام آتے ہی دل جیسے مر گئے

رجعت کا دن بھی اہلِ ولا کی نظر میں ہے
ابھرا جو آفتاب تو چہرے اتر گئے

(7)

ڈرتا نہیں وہ سر کہ جبینی سے وقت کی
ساقی کے در پہ چودہ جو صدیاں گزار دے

اترے جو سر بھی تن سے تو آئے گی یہ صدا
یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

(8)

وہ کافر ہے جسے پینے سے کچھ انکار ہو ساقی
جسے توفیق ہے وہ میرا حصہ دار ہو ساقی

ابھی میں چاردہ صدسالہ تقریب مسرت میں
گلا رکھتا ہوں موج مے اگر تلوار ہو ساقی

(9)

عشقِ حسینی سے نہ اگر ابتدا کرے
نااہل ہے جو نیتِ عشقِ خدا کرے

مسلم رہے گا کتنی نمازیں قضا سہی
کافر ہے جو نماز مودت قضا کرے

(10)

ایسا تو سر بلند نہیں ہے کسی کا نام
اس نام سے بلند ہے پیغمبری کا نام

اس وقت دوسروں سے توسل سہی مگر
مشکل کا وقت آئے تو لینا علی کا نام

(11)

گردن مینا میں ہیں کچھ ہاتھ ڈالے اک طرف
کچھ ہیں تسبیح و مصلا کو سنبھالے اک طرف

مشق سجدوں کی کہیں ہے دورِ ساغر ہے کہیں
خانقاہی اک طرف میخانے والے اک طرف

(12)

وقف کر کے جان و دل قربان جانے کے لیے
سب سے باز آیا اسے اپنا بنانے کے لیے

یہ غدیرِ خم کے میکش کو ہے ساقی سے امید
روٹھ جاؤں گا تو آئے گا منانے کے لیے

○

سماجی قطعات

(1)

اٹھاتا ہوں قلم جب میں کسی تحریر کی خاطر
زباں جب کھولتا ہوں بزم میں تقریر کی خاطر
دل اپنا تھام کر مولاؑ کا دامن تھام لیتا ہوں
جب ایسا وقت نازک ہو علیؑ کا نام لیتا ہوں

(2)

اپنے مسکن کو بنایا بارگاہِ اصغریؑ
میر سلطاں علی نے کی ہے یہ صورت گری
آپ کے فرزند جن کا نام نامی بو تراب
جو ولائے اہلبیتؑ مصطفیٰؐ میں تھے جری
اس کے حق میں وقف کر کے یہ مکان وجایداد
پا گئے کچھ اور اربابِ ولا میں برتری
اور فکر و غور اگر کرتے نوشتِ انتخاب
اس سے بہتر نام ہوتا بارگاہِ بو ترابؑ

(3)

اس مہینہ میں حکمِ خدا سے ہوتی ہے
بتولؑ و رضیہؑ و مرضیہؑ کی سالگرہ
یہ سیّدہؑ کا مہینہ ہے اس کے صدقے میں
مبارک آپ کو ہو سیّدہؑ کی سالگرہ

(4)

خوشی پر غم کا نرغہ ہے خوشی فریاد کرتی ہے
یہ کسی زندگی ہے زندگی فریاد کرتی ہے
منائے جا رہے ہیں یوم مولاؑ تیرے دشمن کے
تجمّ سے دوستوں کی بے بسی فریاد کرتی ہے

(5)

موجیں دکھا رہا ہے گنگ و جمن کا سنگم
اب کیا جلا سکیں گے طعنوں کی آگ والے
پی جائیں جامِ الفت پیاسے کہاں ہیں آئیں
دل کی لگی بجھانے اٹھے پراگ والے

(6)

تو جہاں میں عیشِ جنت پائے جا ذکرِ دوزخ سے ہمیں دھمکائے جائے
رات دن سودا کیے جا کفر سے رات دن ایمان کے گن گائے جائے

(7)

مذہب کے بھی چپو کا سہارا لوں گا اپنے مطلب کی ناؤ کھینے کے لیے
اے دوست یہ لین دین آسان نہیں سب کچھ دے دوں گا ووٹ لینے کے لیے

(8)

ادھر شرمندۂ تاثیر تقریریں نہیں ہوتیں یہاں ہر شئی کی قیمت رات دن چڑھتی ہی جاتی ہے
کیے جاتے ہیں جس تیزی سے نظم و ضبط کے وعدے گرانی بھی اُسی رفتار سے بڑھتی ہی جاتی ہے

(9)

کیا غلط تصور ہے حریت کا بھارت میں عقل کیا کہیں تھک کر سوگئی ہے کچھ دن سے
زر زمیں زن پہلے تھے فساد کا باعث اب زبان بھی شامل ہوگئی ہے کچھ دن سے

(10)

بنی آدم ہیں سب لیکن یہ کیسی آدمیت ہے فسادوں کے لیے دو دن کی دنیا میں بھی فرصت ہے
لڑائی اختلافِ مذہب و ملت پہ کیا معنی؟ جسے کہتے ہیں مذہب وہ محبت ہی محبت ہے

(11)

تجارت بڑھتی جاتی ہے محبت گھٹی جاتی ہے خدا کے منتخب مرکز سے دنیا ہٹتی جاتی ہے
جہاں بھی سلسلہ ہے فرقہ وارانہ فسادوں کا وہاں اپنی چھری سے اپنی گردن کٹتی جاتی ہے

(12)

مطالبات کا دریا چڑھا ہوا ہے بہت ہوئی ہیں ملک میں کتنی ریاستیں تعمیر
یہی رہے گا زبان و بیاں کا پاس اگر نہ جانے کتنی زبانیں ابھی ہوں دامن گیر

(13)

نکلا ہے فتح کرنے پہاڑوں کو قافلہ یہ بھی ضرور عزم و عمل کا نشان ہے
عزم و عمل کی راہ میں ''بھاوے'' کو دیکھیے دل فتح کر رہے ہیں یہ پیری میں جان ہے

(14)

بشر کو اپنی طاقت پہ ناز کیا معنی
کہاں سے آئی یہ طاقت خدا کے حکم بغیر
ہر اک ذرہ اطاعت میں ہے کمر بستہ
وہ جس دیار کو چاہے بنادے غارِ دیر

(15)

وقت کے ہاتھ نے کیا خوب یہ الٹا ہے ورق
طالب علم بھی دیتے ہیں سیاست کا سبق
اب وہ تعمیر کا اقدام کہ تخریب کا ہو
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

(16)

خود کشی قتل فسادات الٰہی توبہ
یہ ہیں آزادی کے دن رات الٰہی توبہ
کل جو امیدیں تھیں آج ان پہ ہنسی آتی ہے
وہ خیالات یہ حالاتِ الٰہی توبہ

(17)

سوتیر ہے نزول بلا تک پڑے ہوئے
آنکھیں کھلیں جو وقت کے تیور کڑے ہوئے
اربابِ حل و عقد کی منزل نہ پوچھیے
بیٹھے سب آ کے باتیں ہوئیں اٹھ کھڑے ہوئے

(18)

کیا مستقل مزاج حکومت ہے واہ واہ
تعریف کا مقام ہے بے ریب و اشتباہ
نازک ہے ہر لحاظ سے یہ دور حاضرہ
اتنے مطالبے ہیں کہ اللہ کی پناہ

(19)

بے انتہا ہے زیست کا بگڑا ہوا نظام
ان کا قصور کیا ہے جو بے چین ہیں عوام
چاروں طرف سے ایک ہی آواز ہے بلند
کب ہوگی قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام

(20)

وسعت ہے جن کے قلب میں جو ہیں نظر بلند
ان کا وقار ہوتا ہے شام و سحر بلند
حق بات کہہ کے سب کی نگاہوں پہ چڑھ گئے
کیوں ہوں نہ پھر جہاں میں ''چرن سنگھ''[1] سر بلند

---

[1] مرادآباد کے فساد پر اسمبلی میں چرن سنگھ کی حق گوئی کا واقعہ سن کر

(21)

اچھا ہے دل میں آپ کے ہے درد ویٹنام
سب چاہتے ہیں جنگ کی ہو جائے روک تھام

اپنے وطن کے حال زبوں پر بھی اک نظر
اتنی تو فکر کیجئے کھائیں گے کیا عوام

(22)

کسی پرچہ میں دیکھی اک خبر جس کا یہ مطلب ہے
غریبوں کی پریشانی سے کچھ مطلب نہیں ہوگا

اضافہ خوردنی اشیاء میں چاہے جتنا ہو جائے
مگر موٹر کی قیمت میں اضافہ اب نہیں ہوگا

(23)

جدھر اٹھائیے نظریں زباں کا جھگڑا ہے
غرض یہ ہے کہ حکومت ہمارے ساتھ چلے

مطالبہ کا مگر یہ عجیب ہے انداز
زبان چل نہیں سکتی اگر تو ہاتھ چلے

(24)

خود کشی قتل کوئی حادثہ سیر و سفر
زیست محفوظ گھروں کی ہے نہ بازاروں کی

صبح ہی صبح یہ ہے ذوقِ نظر کی دعوت
سرخیاں خون ہوئی جاتی ہیں اخباروں کی

(25)

زخم دل ناتواں سیو سینے دو
جی بھر کے مئے سکوں پیو پینے دو

کوشش بیجا ہے امنِ عالم کے خلاف
مفہوم حیات ہے ''جیو جینے دو''

(26)

سرکار یہ آزادئ جمہور نہیں ہے
دستور بہ اندازۂ دستور نہیں ہے

اِس دور میں رکشا کا چلانا بھی ہے مشکل
رکھشا ہی ہماری تمہیں منظور نہیں ہے

(27)

سیم و زر کے جھاڑ سے منہ موڑ لیں
کیوں نہ ہر قیمت پہ رشتہ جوڑ لیں

ناک میں ہیں اچھے اچھے پاکباز
ڈال ہاتھ آئے تو ڈالر توڑ لیں

(28)

اچھا نہیں ہے روز نیا راگ چھیڑنا
بیجا ہے اتحاد کے مشرب سے دشمنی

بھارت خدا کے ماننے والوں کا ملک ہے
تحریک ریڈ گارڈ ہے مذہب سے دشمنی

(29)

اختلاف مذہبی کے باوجود ملک کی تنظیم کو سب ایک ہیں
اپنے بھارت کی حفاظت کے لیے سارے مذہب اہل مذہب ایک ہیں

(30)

مالک ہے کوئی میرا اتنی خبر نہیں ہے کتنے ہیں مجھ پہ احساں کیا مانتا نہیں ہوں
میرا گناہ سمجھے دنیا کہ بے گناہی میں جانتا ہوں اس کو پہچانتا نہیں ہوں

(31)

مانا کہ ربط ہے مجھے سارے جہاں کے ساتھ سن لو کہ یہ میرا دل ہے ہمیشہ زبان کے ساتھ
سارا جہاں حسین مرقع سہی مگر ہندوستان کی بات ہے ہندوستاں کے ساتھ

(32)

کیا حادثوں کا زور ہے اللہ کی پناہ کل تک جو تھا سکون میسر نہیں ہے آج
انسان ہی مخالف انسانیت نہیں فطرت بھی کائنات پہ چیں برجبیں ہے آج

(33)

فکر کی زور آوری میں علم کے پندار میں اپنی اپنی بانسری ہے اپنا اپنا راگ ہے
ایک شعلہ بن کے رہ جائے نہ یہ دنیا کہیں جذبۂ حب وطن کیا ہے بھڑکتی آگ ہے

(34)

غلط کاری غلط کاری کا بدلہ ہو تو کیا حاصل غلط انسان اپنے نفس کی تسکین کرتے ہیں
بڑے ناداں ہیں جو قانون اپنے ہاتھ میں لے کر خود اپنے ملک کے قانون کی توہین کرتے ہیں

(35)

اسیر جنگ لو ممبا کے قتل ہونے سے جسے بھی دیکھئے ہے اس بہیمیت کے خلاف
جو غیر ملک سے رکھتے ہیں اتنی ہمدردی فساد گھر کا بھی روکیں ذرا قصور معاف

(36)

ہمت و عزم تو ہے سعی کا امکان تو ہے عزت نفس ہے محفوظ یہ ایقان تو ہے
آپ سے زاویۂ فکر جدا ہے میرا بینک بیلنس نہیں تن میں مگر جان تو ہے

(37)

عمل کی جگہ انجمن سازیاں ہیں — کھلونے بناتے ہیں بہلانے والے
مداوا ہے اتنا غریبوں کی خاطر — ترس کھا رہے ہیں ترس کھانے والے

(38)

لاکھ فرقے ہوں خدا ایک ہے پیغمبر ایک — ایک قرآن کی تنزیل کا اقراری ہوں
ایک قبلہ کی طرف سب کی پڑھاتا ہوں نماز — وزن توحید سے کونین پہ میں بھاری ہوں

(39)

جو وطن کا دوست ہو اہل وطن کا غمگسار — فرقہ وارانہ تعصب سے ہو جس کے دل کو عار
وہ جوانِ قوم جس کا حسن ہو انسانیت — زندگی اس کی عروسی موت ہے اس کا سنگھار

(40

دولت برطانیہ بھی مضطرب — امریکہ بھی ہے پریشاں روس بھی
رفتہ رفتہ ساری دنیا کے لیے — ایک خطرہ بن گیا لاؤس بھی

(41)

دل مانتا نہیں کہ نہ تائید ان کی ہو — جن کو ہے اپنی جان سے پیارا مطالبہ
انصاف کی یہ بات ہے سکھ حق پہ ہیں اگر — اُن کا مطالبہ ہے ہمارا مطالبہ

(42)

دنیا کو اعتراف پڑوسی کے حق کا ہے — اس حد پہ آکے ختم ہے بیگانگی کی بات
سب کو پسند آئے نہ آئے یہ مشورہ — دل کو ضرور لگتی ہے نمبودری کی بات

(43)

عمریں ہوئیں ہیں جن کی زر و سیم میں بسر — دیکھو تو ایسے درد کے ماروں کی خودکشی
کسی موڑ پر یہ آج غذائی سوال ہے — حیرت میں ڈالتی ہے ستاروں کی خودکشی

(44)

انداز تو سوال کا ایسا بُرا نہیں — اللہ جانتا ہے اثر اُن پہ ہو نہ ہو
بیٹھے رہو کے بعد ہے دہلی چلو کی دوڑ — اس کا جواب خیر سے ''آگے بڑھو'' نہ ہو

(45)

کس درجہ بدنما ہے بنارس کا واقعہ — اچھا کیا سلوک یہ علم و ہنر کے ساتھ
تاریخ میں رہے گا لطیفہ کی شانسے — قدر اساتذہ بھی گھٹی قدر زر کے ساتھ

(46)

کسی سے پر چاپلوسی اور کسی پر رعب کی بارش — یہی اس دور کے کچھ لیڈروں کی رہنمائی ہے
حکومت اور پبلک میں بنے ہیں واسطہ لیکن — کہیں ہے بندگی ان کی کہیں ان کی خدائی ہے

(47)

کیپ ٹاؤن سے یہ آئی ہے خبر — کل ''سیاست'' میں اسے دیکھا گیا
یہ سنا ہے اک جواں لڑکی کا دل — اک جواں تقدیر بوڑھا پاگیا

(48)

ہر حکومت کے لیے وجہ سعادت بن جائے — ملک والوں کے لیے عین ضرورت بن جائے
حال کھل جائے جو سازش کا تو بدعت ٹھہرے — کامیابی جو میسر ہو تو رحمت بن جائے

(49)

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ ماجرائے خطاب — کوئی خلاف ہو یا کوئی ہمنوائے خطاب
وہاں خطاب کی داد دہش کے کیا معنی — جہاں مخالف دستور ہو عطائے خطاب

(50)

خطرناکی دور میں ہے ہر حکومت کا نظام — دیکھئے کب تک رہے تنظیم کہنہ کا قیام
نوجوانوں کا یہی رجحان ہے اب ہر طرف — روس کو تسلیم کیجیے امریکہ کو ہو سلام

(51)

اک مسلماں روس میں اسلام کا بدخواہ ہے — علم قرآں کو مضر کہتا ہے کیا گمراہ ہے
کام اس خود کام کا جو کچھ ہے ظاہر ہے مگر — واہ رے جبر مشیت نام عبداللہ ہے

(52)

نظم فطرت ہے یہی کچھ عیب ہوتا ہے ضرور — ہر فضا میں حسن کی صورت گری کے ساتھ ساتھ
یہ تعصب کی نگاہوں میں ہے سو عیبوں کا عیب — لفظ مسلم بھی ہے یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ

(53)

دوگانہ عید کا ملبوس نو چہرے پہ تابانی — گلے ملنا مسرت میں یہ سب کچھ سربسر حق ہے
کوئی ماحول ہو سرمایہ داری ہو کہ مزدوری — اگر پاکیزگی ہے نفس میں بھی عید برحق ہے

(54)

صدر جمہوری ہو کوئی شاہ ہو یا ہو وزیر — ہم غریبوں کی طرح آرام سے سوتا نہیں
حکمراں ہوتی ہے خود اس پر سیاست وقت کی — درحقیقت وہ کسی پر حکمراں ہوتا نہیں

(55)

دل میں کیا درد تھا کیا جذبۂ ہمدردی تھا — جب تلک خیر سے بگڑے ہوئے حالات رہے
آج بیگانہ پستی ہے بلندی جن کی — وہ بھی کل تک یہی کہتے تھے مساوات رہے

(56)

کتنے قائد کتنی تحریکیں ہیں کتنا اختلاف — اپنے بھارت کی زمیں ہے آج کل دشت مصاف
مستقل ہے صوبہ داری مسئلوں کا سلسلہ — یہ ترقی کے نہیں آثار گستاخی معاف

(57)

خلوص کی ترے اقدام میں کمی تو نہیں — خیال و خواب میں تدبیر برتری تو نہیں
جو ملک و قوم کی خدمت کو کھینچتی ہے تجھے — وہ زندہ باد کے نعروں کی دلکشی تو نہیں

(58)

دنیائے محبت میں ہے جلوہ نما بھارت — دیتا ہے زمانہ کو پیغامِ وفا بھارت
بے مصرف و نا واجب الزام نہ دے کوئی — ہوجائے اگر برہم بھارت ہے مہا بھارت

(59)

وہاں اے دوست کسی دل سے روا ہے حسنِ آزادی — جہاں انسان ملک و قوم کی تفریق فرمائے
ہمارا قصد بھی ہے یوم آزادی منانے کا — اگر ہر ملک میں انسانیت کا راج ہوجائے

(60)

یہودی بھی یہاں ہیں پارسی بھی ہیں مسیحی بھی — ہر اک فرقہ اسی بھارت میں میٹھی نیند سوتا ہے
یہ ارباب نظر میں مسئلہ ہے غور کے قابل — تصادم جب بھی ہوتا ہے مسلمانوں سے ہوتا ہے

(61)

ہاتھ کیا آتا ہے تقریر کے ایوانوں سے
بات بنتی نہیں تحریر سے عنوانوں سے
درس و تدریس بہت اور عمل ہے مفقود
کام چلتا نہیں ان کاغذی انسانوں سے

(62)

وہ کیسی سرزمین ہے جس میں یوں دن رات ڈھلتے ہیں
فقط دعوؤں کی حد تک شرع کے احکام چلتے ہیں
جہاں با ضابطہ ہے احترام کعبہ و زمزم
وہیں سے رقص و موسیقی کے بھی چشمے اُبلتے ہیں

(63)

کتنے بھارت میں ہوئے سال کے اندر یہ فساد
پیسی جائے گی مسلسل اقلیت کب تک
اب تو ارباب حکومت کوئی تدبیر کریں
منتخب لفظوں میں تبلیغ و ہدایت کب تک

(64)

بمبئی تک آنے جانے میں کشش اک یہ بھی ہے
حسن فطرت رونما ہوتا ہے کس کس ٹھاٹ سے
محو ہوجاتی ہیں سب طول سفر کی زحمتیں
ریل گاڑی جب گذرتی ہے گھنڈالا گھاٹ سے

(65)

یہ فکر ونظر کی دنیا ہے عنوان بدلتے رہتے ہیں
سب زور یہاں امکان پہ ہے امکان بدلتے رہتے ہیں
امکان کا بھی چلتا نہیں بس عنوان دھرا رہ جاتا ہے
دنیا سے بڑی اک حاقت فرمان بدلتے رہتے ہیں

(66)

بھارت کی زندگی میں وہی انتشار ہے
جب دیکھئے فساد ہی بر روئے کار ہے
درکار شست وشو کو ہے کتنا لہو بھی
اے چارہ گردلوں میں کہاں تک غبار ہے

(67)

یہ عیش پر ہے بھروسہ یہ غم سے بے ربطی
نظر میں گردشِ لیل و نہار ہے کہ نہیں
اسی اصول پہ تسکین خواہشات کو دو
خزاں کسی کی، کسی کی بہار ہے کہ نہیں

(68)

یاد ہے عہد گذشتہ بھی ہمیں
آپ کا بھی عہد زیر غور ہے
سوچتے ہیں فیصلہ ہوتا نہیں
قابلِ تعریف کس کا دور ہے

(69)

ان اہلِ اقتدار سے کہنا ہے یہ ہمیں — چمٹے ہوئے ہیں شوق میں جو اپنی سیٹ سے
اِس شغل سے ملے کبھی فرصت تو سوچئے — فرصت ملے گی دیس کو کب مار پیٹ سے

(70)

اس مرتبہ ہوا ہے نئی شان سے درود — لائے کہیں نہ کوئی خرابی مرن برت
اب سلسلہ چھڑے گا سوال و جواب کا — میداں میں آگیا ہے جوابی مرن برت

(71)

جسارت گرچہ یہ ترکِ ادب معلوم ہوتی ہے — نکل جاتی ہے منہ سے بات جب معلوم ہوتی ہے
کسی کا اشتیاق خود نمائی ہے مری ہستی — بظاہر اک عطائے بے سبب معلوم ہوتی ہے

(72)

ہندوپاکستان کامل بل کے عنوانِ دفاع — یہ نئی تجویز بے چون و چرا دلچسپ ہے
جو مدبر ہیں مخالف اِس نئی تجویز کے — ان میں ''بخشی جی'' کا لہجہ بھی ذرا دلچسپ ہے

(73)

مرحبا ڈاکٹروں اور حکیموں کا وجود — پردہ بن جاتے ہیں اکثر یہ گنہگاری کا
شکر کی جا ہے کہ ماہِ رمضان آتے ہی — مل گیا سرٹیفکٹ رخصت بیماری کا

(74)

تجھ سے ہے رشتہ اخوت کا اگر — بے حسی میں رہ نہ جائے ٹوٹ کر
دانۂ گندم سے ہیں محروم آج — پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر

(75)

بہت برا ہے یہ شیوہ منافقت ہے یہ — کہ دوستی کی ردا میں ہو دشمنی لپٹی
گوالکر[1] کا بیاں قابلِ ستائش ہے — کہی وہ بات کہ رکھتی نہیں لگی لپٹی

---

[1] گوالکر: ہندوستانی قائد

(76)

جھوٹ سچ سے قوم کو بھڑکائے جا　　مورکھوں سے لیڈری منوائے جا
اپنے دامن پر بھی چھینٹ آنے نہ دے　　دوسروں کو خون میں رنگوائے جا

(77)

ابھی اس دور میں ایسے بھی کچھ انساں ہیں ورنہ　　ہمارا حال کچھ ہوتا کسی کے چوٹ کیا لگتی
خدا کی شان کتنے راست گو حق آشنا نکلے　　کسے امید یہ تھی کوئی کہہ دے گا خدا لگتی

(78)

وطن سے عشق ہو انسانیت سے انساں سے　　نصیب ہوتا ہے جو کچھ بھی جس کے بھاگ میں ہے
اگر یقیں نہ ہو ''بھاوے'' سے پوچھئے جا کر　　عجیب لطف محبت کی دوڑ بھاگ میں ہے

(79)

کچھ رنگ شیروانی پہ ہولی کا پڑ گیا　　چیں برجبیں ہوا تھا کہ شرما گئی نظر
دیکھا جو میں نے غور سے اے دوست کیا کہوں　　دھبے ملے گناہوں کے دامن پہ کس قدر

(80)

ہمیں تو خیر سے تبخیر بھی تھی نزلہ بھی　　کسے خبر کدھر آیا کدھر گیا رمضاں
وہ ڈاکٹر کی عنایت ہو یا طبیب کی ہو　　خدا کا شکر بہ عزت گذر گیا رمضاں

(81)

ہر چیز کی ہے نقل ہر اک شئی میں ملاوٹ　　دنیا میں ہے کیا صنعت و حرفت کی ترقی
ہر فکر و نظر کے لیے ہے غور کے قابل　　یہ علم کی کثرت سے جہالت کی ترقی

(82)

وہی سمجھیں گے اس الزام اس تنقید کا مقصد　　جو اس کی بات کو کچھ بات کی تہہ تک سمجھتے ہیں
یہ بدعنوانیاں ایران کی دیمک سہی لیکن　　بہت نقاد امریکہ کو بھی دیمک سمجھتے ہیں

(83)

اتحادی گیت اردو ہی میں گائے جائیں گے　　مثل ماضی شان ہوگی حال و استقبال کی
دے جزائے خیر اس اُردو کے حامی کو خدا　　کس قدر سندر تھی یہ تقریر سندرلال کی

(84)

بھوک ہڑتال ایسا نسخہ ہاتھ آیا ہے ہمیں
جوہر اک آب و ہوا میں کارکن ہے بے عدیل

حق ہو یا ناحق ہو اپنی بات منوا لیجیے
ہر مرضی کی ہے دوہر ایک دعوے کی دلیل

(85)

قمار بازی ہو ناناوتی کے کیس میں بھی
جوے کی بات کہاں سے کہاں پہ آٹھہری

کہا تھا کیا اسی دن کے لیے یہ شاعر نے
کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

(86)

اہل زر جو ہیں انہیں زر کار جامہ چاہیے
لیڈروں کو سوٹ واعظ کو عمامہ چاہیے

ہم سے تم کیا پوچھتے ہو عید کے دن بھی ہمیں
ایک نامہ دوست کا اِک روز نامہ چاہیے

(87)

جتنی زمیں دبائی بڑھی خلق کی نمود
اس طرح گرم و سرد جہاں کو سموتے ہیں

دعوت قبول کرلی ہے چواین لائی نے
کچھ باذاق آدمی معلوم ہوتے ہیں

(88)

رخصت ہے اب قدامت ہر سانس آخری ہے
بے چین ہے تمدن تہذیب رو رہی ہے

کچھ بڑھ گیا ہے خطرہ بوڑھوں کی آبرو کا
ہر نوجواں نے اپنی ٹوپی اتار لی ہے

(89)

وہیں تحریک ترک اسلحہ بھی
وہیں ہے قوت بَم کی نمائش

فضائے امن کیا پیدا کرے گی
یہ دھمکی اور دم خم کی نمایش

(90)

محبت اتحاد و قوم کا جذبہ ہے بنیادی
دعا مانگو محبت کی بڑھے بھارت کی آبادی

تعصب فتنہ انگیزی گرانی ہوگی جب رخصت
منایا جائے گا اُس دن حقیقی جشنِ آزادی

(91)

کوئی ہے پوچھنے والا وطن میں
یہاں بے موت کتنے مررہے ہیں

ذرا گھر میں بھی تو چل پھر کے دیکھیں
جو دنیا بھر کا دورہ کررہے ہیں

(92)

بات ہو اختلاف آرا تک — نہ کہ لفظوں کی گرم بازاری
کس قدر بڑھ چلی ہے بھارت میں — "واک آؤٹ" کی تیز رفتاری

(93)

میری طرف سے کہہ دے کوئی یہ ان سے جا کر — کرتے ہیں جو ملاوٹ اشیائے خوردنی میں
سنگین جرم ہے یہ ہلکا اسے نہ سمجھیں — اِس کا شمار بھی ہے بھارت کی دشمنی میں

(94)

تا گا جو محبت کا کبھی ٹوٹ گیا — دم بھر میں بنی بات بگڑ جائے گی
پہلے تو ہے جوڑنا ہی مشکل اے دوست — اور جُڑ بھی گیا تو گانٹھ پڑجائے گی

(95)

چپراسی کا لفظ آج مطبوع نہیں — اس عہدے کو معتبر کہا جائے گا
کیا اردو زباں کی عزت افزائی ہے — چپراسی پیامبر کہا جائے گا

(96)

اہل جہاں نے آج گھٹادی ہے قدر زر — ڈوبے ہوئے اگرچہ ہیں دولت کی چاہ میں
اُن کا ہے قول جن کا توکل خدا پہ ہے — بے قدر ہے ازل سے ہماری نگاہ میں

(97)

فطرت ہی آدمی کی ہے صورت گرِ وطن — دل کو نہ کیوں عزیز ہو ہر منظرِ وطن
تکلیف بھی اگر ہو تو آرام ہی سمجھ — بھارت کی سرزمیں ہے تری مادرِ وطن

(98)

ہر مرض کی ہے دوا ایک اکیلا نسخہ — بو علی سینا بھی لکھ سکتے نہ ایسا نسخہ
جا ہو بے جا ہو نکل آتا ہے ہر کام اے دوست — بھوک ہڑتال کا ہاتھ آیا ہے اچھا نسخہ

(99)

بہت آساں ہے جلتی دھوپ کو برسات کہہ دینا — ضرورت ہو اگر جائز ہے دن کو رات کہہ دینا
بشر وہ غیر معمولی بشر ہے جس کا شیوہ ہو — سیاست کی فضا میں رہ کے سچی بات کہہ دینا

(100)

مشہور ہے تمدن و تہذیب میں جو ملک — تعریف کیا کرے کوئی اُس کے نظام کی
بد نام کررہا ہے وہ انسانیت کا نام — اب تک نہ جنگ بند ہوئی ویٹنام کی

(101)

عقل سے انسان کوسوں دور ہے — اپنے عہدے پر اگر مغرور ہے
اب وہ چپراسی ہو کوئی یا وزیر — کام کی اجرت جو لے مزدور ہے

(102)

نشہ دولت کا اُتر جائے تو جنت ہوجائے — ظلم کی آگ ٹھٹھر جائے تو جنت ہوجائے
میرے سر آنکھوں پہ جنت کی توقع لیکن — یہی دنیا جو سنور جائے تو جنت ہوجائے

(103)

کیسا بدل گیا ہے بڑے بھائی کا مزاج — مشکل انہیں زبان کی ہے روک ٹوک بھی
پھرتے تھے ننگے پاؤں ابھی کل کی بات ہے — جوتی بھی اب ہے پاؤں میں جوتی میں نوک بھی

(104)

آسائش وطن کی ہر اک کو جستجو ہے — جائیں گے کیوں یہاں سے یہ کیسی گفتگو ہے
اچھے ہوں یا بُرے ہوں دونوں یہیں رہیں گے — اب اتحاد ہی میں اس گھر کی آبرو ہے

(105)

ترقی کا سبق بھارت کی پبلک پڑھتی جاتی ہے — سیاست اس کی دنیا کی نظر پر چڑھتی جاتی ہے
نکل جائے گی اک دن دوڑ میں ہر ملک سے آگے — گرانی بڑھ گئی ہے بڑھ رہی ہے بڑھتی جاتی ہے

(106)

کردیتا ہے انسان اک انسان کو قتل — لغزش کبھی ایسی بھی ہوا کرتی ہے
اُس قوم کے سنگ و سخت دل کو دیکھو — جو دوسری قوم کو فنا کرتی ہے

(107)

تحریک لے کے آئے ہیں گورا بہت نئی — جمہوریت ہو اور جماعت نہ ہو کوئی
اتنا بڑھا خلوص تو آئے گا وہ بھی دن — پابند حکم سب ہوں حکومت نہ ہو کوئی

(108)

اقبالؔ نے کیا ہے جو محکم یقیں کا ذکر　　سوسنترا کا آج وہی ہے اصول کار
امید کو یقیں سے بدلتے ہیں اس طرح　　دستور بن گیا ہے یہاں قبل اقتدار

(109)

قدرتاً حصہ ہے دونوں کا برابر ملک میں　　لاکھ بیگانہ کوئی سمجھے یہ جب بھی ایک ہیں
غیر کا ہے قول اس کو مارک کر لیجئے ذرا　　''مارک'' فرماتے ہیں اردو اور ہندی ایک ہیں

(110)

اخبار پڑھ کے مجھ سے یہ اک دوست نے کہا　　کس سے کہیں کہ کوئی علاج اس کا کیجئے
بڑھتی ہی جارہی ہے یہ تعداد خودکشی　　جی چاہتا ہے اپنا گلا گھونٹ لیجیے

(111)

یوں دماغ و دل میں سب کچھ ہے خدا کے فضل سے　　ولولے پرواز کے ہیں حوصلے تیزی کے ہیں
واقعہ یہ ہے ابھی آزادئ کامل نہیں　　پہلے تھے انگریز کے قیدی اب انگریزی کے ہیں

(112)

ہر اک فضا میں گنہگار بیش و کم ٹھہرے　　رہے یہ حال تو سینوں میں کیسے دم ٹھہرے
نوازشوں کا تسلسل ارے خدا کی پناہ　　کہیں فساد ہوا ذمہ دار ہم ٹھہرے

(113)

کس طرح مٹے ہند سے یہ فرقہ پرستی　　تقریر ہی تقریر ہے تدبیر نہیں ہے
حق بھی ہے زبانوں پہ تو اس کا ہے یہ عالم　　الفاظ ہی الفاظ ہیں تاثیر نہیں ہے

(114)

ان کا یہ دور عیش سلامت　　بیٹھے ہیں ہم سے کیوں منہ موڑ کے
یہ تو کچھ ایسی بات ہے جیسے　　نام بڑا اور درشن تھوڑے

(115)

ذہنی ترقیوں کا یہ عنواں ہے دوستو　　یہ کانگریس کا فتح نمایاں ہے دوستو
ذاکر حسین ہوگئے جمہوریہ کے صدر　　اب اتحاد ملک درخشاں ہے دوستو

(116)

بھارت تمھارا دیس ہے اے طالبان علم — سن لو ذرا جو میری گزارش کا ہے نچوڑ
ایسا ہے اپنے دیس میں تخریب کا عمل — جیسے خود اپنے گھر میں کرے کوئی توڑ پھوڑ

(117)

کیسی خموشی کیسے اشارے — ہم حق کہیں گے ہانکے پکارے
سیکھے نہیں تم احساں کرنا — مرتے نہیں ہم تلوار مارے

(118)

قوم ہو اگر زندہ فرد فرد زندہ ہے — اہل دل کو دنیا میں اور چاہیے اب کیا
اپنی زندگی کو جو زندگی سمجھتے ہیں — وہ غریب سمجھیں گے زندگی کا مطلب کیا

(119)

تقریر و نغمہ کاری و تزئین و روشنی — وابستہ کیا انھیں سے شعورِ حیات ہے
جمہوریت کا جشن ہی ہوتا رہا تو کیا — جمہور کو سکون بھی کچھ ہو تو بات ہے

(120)

بمبئی حرف محبت کا بھی مصرف ہے کہیں — ایک طوفانِ تجارت عمل و قول میں ہے
دم گھٹا جاتا ہے اس داد و ستد سے میرا — سانس لینا بھی تو مشکل ترے ماحول میں ہے

(121)

مطرب بزم سیاست کچھ خبر بھی ہے تجھے — غم کے راگوں کی ہے کثرت زندگی کے ساز پر
کیا اثر اُلٹا ترے اندازِ فن کاری کا ہے — فتنے بڑھتے جارہے ہیں امن کی آواز پر

(122)

زہے بنیاد تقسیمِ لسانی — سب اپنا اپنا حق جتلارہے ہیں
کہیں اک دن برس جائیں نہ کھل کر — اکالی دلی کے بادل چھارہے ہیں

(123)

اپنی اپنی ہر ایک کہہ جائے گا — ہر ضرب نئی سامعہ سہہ جائے گا
مٹ جائیں گی ساری اشتراکی قدریں — اسلام کا اشتراک رہ جائے گا

(124)

کتنے ہیں وہ فسانے جو بن گئے حقیقت　　کتنی حقیقتوں کو رُسوا کیا خدا نے
دنیا سمجھ رہی ہے یہ روس امریکہ　　بس دو حقیقتیں ہیں باقی ہیں سب فسانے

(125)

نونہالوں کے لیے یہ درس کی تنظیم ہے　　علم کی حد تک فقط افہام ہے تفہیم ہے
تربیت اک لفظ بے مفہوم ہے اس دور میں　　جس طرف بھی دیکھیے تعلیم ہی تعلیم ہے

(126)

مال حاضر تھا جان حاضر تھی　　ختم لیکن یہ سلسلہ نہ ہوا
وہ خریدار تھے ضمیر کے بھی　　میرا ان کا معاملہ نہ ہوا

(127)

محاذ جنگ ہو، اے ہم وطن یا سلح کی منزل　　وقار اپنا ہو جس میں وہ رہے پیش نظر صورت
حقیقت کیا ہے زر کی، جان بھی قرباں کردیں گے　　وطن کی لاج رکھتے ہیں بہر قیمت بہر صورت

(128)

جس دل پہ محبت کی ہو چھاپ اچھا ہے　　دنیا اچھی ہے تو جو آپ اچھا ہے
سو بات کی ایک بات سن رکھ اے دوست　　جھگڑا ہے بُرا میل ملاپ اچھا ہے

(129)

فطرت کے نظام سے ہے کتنا غافل　　دو روز کی زندگی پہ پھولا ہوا ہے
انسان کو قتل کرنے والا انسان　　کیسا اپنی اصل کو بھولا ہوا ہے

(130)

کیا ہے انسان اک انسان کو قتل　　لغزش کبھی ایسی بھی ہوا کرتی ہے
اس قوم کے سنگ وسخت دل کو دیکھ　　جو دوسری قوم کو فنا کرتی ہے

(131)

بے انتہا ہے زیست کا بگڑا ہوا نظام　　ان کا قصور کیا ہے جو بے چین ہیں عوام
کب ہوگی قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام　　چاروں طرف سے ایک ہی آواز ہے بلند

(132)

یہ سنتے ہیں۔ کیا پرنام گاندھی جی نے قاتل کو — رہے گی ہند کی تاریخ میں یہ داستاں باقی
سلام اس کو نہ سمجھو قوم کے منہ پر طمانچہ ہے — قرینہ ہے کہ صدیوں تک رہے جس کا نشاں باقی

(133)

کیوں کر نہ ارتباط وفا کے چلن سے ہو — انساں وہ کیا جسے نہ محبت وطن سے ہو
عزت رہے وطن کی محبت ہے اس کا نام — وہ جنگ ہو کہ سلح مگر بانکپن سے ہو

(134)

جو لوگ سیم و زر کے مہروں سے کھیلتے ہیں — مل جل کے وقت کی اب گاڑی ڈھکیلتے ہیں
لاکھوں کا کر رہے تھے دل کھول کر جو سودا — دوکانیں بند کر کے اب تاش کھیلتے ہیں

(135)

فطرت ہی آدمی کی ہے صورت گرِ وطن — دل کو نہ کیوں عزیز ہو منظرِ وطن
تکلیف بھی اگر ہو تو آرام ہی سمجھ — بھارت کی سرزمیں ہے تری مادرِ وطن

(136)

متاعِ حال قرباں کر کے مستقبل بنانا ہے — بڑی ہل چل ہے دنیا میں بڑا نازک زمانہ ہے
تفکر سے تدبر سے قلم سے زور سے زر سے — کسی صورت بھی ہو بھارت کی عزت کو بچانا ہے

(137)

کیوں کر نہ کرے ناز و فصاحت اردو — سرمایۂ صد عزت و حرمت اردو
ہندی کی مٹھاس اور عربی کا اجلال — رکھتی ہے عجب طرح کی شوکت اردو

(138)

ارمان ہو لیکن نہ نکلنے والا — دل ہو نہ کبھی مگر بہلنے والا
ہستی ہے مثال شمع میری اے نجم — دن کو خاموش شب کو جلنے والا

(139)

حیرت ہے اگر پھول ہو خوشبو کے خلاف — شانہ کی روایات ہوں گیسو کے خلاف
دنیا کی ذرا ستم ظریفی دیکھو — اردو ہی میں گفتگو ہے اردو کے خلاف

(140)

کر مشقِ طلاقت وفصاحت اے دوست — مل جائے گا منصب سیاست اے دوست
تدبیر کا ذکر بے محل ہے بالکل — تقریر کی ہے آج حکومت اے دوست

(141)

اب بھی ہیں دنیا میں مذہب سینکڑوں — مرنے جینے کو خدا کے نام پر
دیدنی ہے انتخاب ریڈگارڈ — پہلا حملہ مذہبِ اسلام پر

(142)

اللہ کے وجودِ ذی جود کا عقیدہ — سنتے ہیں ہورہا ہے سارے جہاں سے رخصت
یہ سب صحیح لیکن اتنا تو ہم کہیں گے — آخر میں سب کے ہوگا ہندوستان سے رخصت

(143)

اچھی چلی ہے نشہ مئے کے خلاف بات — انسانیت کی دشمنِ جاں ہے یہ بدصفات
بھارت میں دن اک ایسا بھی آئے خدا کرے — کرسی کے اور عہدہ کے نشہ سے ہو نجات

(144)

تشدّد کے رستہ سے حق مانگتے ہیں — عوامی افق کی یہ بیداریاں ہیں
حکومت سے غیروں کی آزاد ہوکر — گرفتاریاں ہی گرفتاریاں ہیں

(145)

خاص ہستیاں ہیں دو اس جہانِ فانی میں — اک طبیبِ جسمانی اک طبیبِ روحانی
کسی قدر اہم ہوں گی ذمہ داریاں ان کی — جن کی سرپرستی میں ہے مزاجِ انسانی

(146)

سلح کرلیتے ہیں یوں بھی صاحبانِ علم دو — میں تمہیں قبلہ کہوں اور تم مجھے قبلہ کہو
یوں سمجھ لیجے اسے اک فارسی کی ہے مثل — من ترا حاجی بگویم تومرا حاجی بگو

○

غدیری قطعات

(1)

بدنام میگسار ہوں برنا و پیر میں
اتنی پلا نہ جلسۂ عید امیر میں
ساقی کسی کو نشہ میں دل مانتا نہیں
دونوں جہاں کہیں نہ ڈبودوں غدیر میں

(2)

بلغ کو رہبرِ ہمہ گیری بنا دیا
بنیادِ کائناتِ امیری بنا دیا
اس لحن اُس زبان اُس آیت کے میں نثار
قرآں کی لے کو جس نے غدیری بنا دیا

(3)

معلوم تو ہوگا تجھے ہم رندوں کا عالم
غم اپنے لیے سال میں سوروز ہے ساقی
ہو تیری اجازت تو عزا دار حسینؑ
ہنس بول لیں کچھ آج کہ نو روز ہے ساقی

(4)

سر تقویم پر ہے تاج یا نو روز ہے ساقی
غدیری میکشوں کا مدعا نو روز ہے ساقی
یہی تو دن ہے تیری ظاہری مسند نشینی کا
جبھی تو سال کا فرمانروا نو روز ہے ساقی

(5)

سکون دل کے لیے کچھ پیام آجائے
کبھی زباں پہ ہمارا بھی نام آجائے
غلام جمع ہیں در پر سلام کی خاطر
خدا کرے کہ جواب سلام آجائے

(6)

شگفتہ مثل گل چہرے ہیں آثار حسینؑ میں
خوشی کیونکر نہ ہوگی آج سرکار حسینؑ میں
کہاں جاتا ہے راہ راست میں تجھ کو بتاتا ہوں
غدیری جشن ہے اے دوست دربار حسینؑ میں

(7)

تقسیم جو ہونے لگی صہبائے غدیر
سینوں میں حسد کے آبلے بیٹھ گئے
قرآن بھی نہ پھر حلق سے نیچے اترا
جو پی نہ سکے ان کے گلے بیٹھ گئے

○

تصوفی قطعات

(1)

وہ راہ محبت میں جانکاہیاں کیں ہم ایسے فقیروں نے بھی شاہیاں کیں
اسی دل سے عہدِ جوانی گزارا اسی ٹوٹے پیالے پہ جم جاہیاں کیں

(2)

انسانیت میں پاک ضمیری کا لطف ہے مغلوب ہو جو نفس تو پیری کا لطف ہے
عمامہ و عبا میں نہ احرام میں ہے فقر دل بھی فقیر ہو تو فقیری کا لطف ہے

فارسی قطعات

(1)

از دبستانِ حق دبیر آمد بزبان قلم صریر آمد
ساقیا جامہائے نور بیار بادۂ پیمائے الغدیر آمد

(2)

دمِ عیسیٰ نمود اختیارِ موسیٰ کاظم جمالِ یوسفی آئینہ دار موسیٰ کاظم
فدا گلزار ابراہیم صدقے صبرِ ایوبی جلالِ موسیٰ عمران نثارِ موسیٰ کاظم

متفرق قطعات

(1)

انیسؔ غم کدۂ کربلا کے سجدہ گزار
ترا کلام ہے یا مرثیت کے لیل و نہار

یہ راز تو نے بتایا ہے اہل عالم کو
نہ ہو یہ درد جو دل میں تو زندگی بے کار

شعورِ فکر نے غیروں پہ بھی کیا یہ اثر
کہ گوشے گوشے میں انسان ہوگئے بے دار

سنی سنائی نہیں بات آنکھوں دیکھی ہے
کہ ہندوؤں کو بھی دیکھا گیا ہے سینہ فگار

خصوصیات بہت کچھ تیرے کلام کی ہیں
ترے کلام سے پیدا ہوئے وہ نقش و نگار

ترے کلام سے اردو زباں کا وزن بڑھا
محاورات کا یکجا لگا دیا انبار

(2)

قدر دانی جس کو کہتے ہیں اسی کا نام ہے
دیدنی ہوگا یہ دن حسنِ عمل کے زور کا

کیا تعجب ہے صدا دے قوم کو قبرِ انیسؔ
جشن صد سالہ مبارک ڈاکٹر ٹیگور کا

(3)

چادر گل سے سجیں قبریں امیرؔ و داغؔ کی
قدر داں ہے قوم یہ مر کر بھی پھولوں میں تلے

دیکھ لو دونوں کے مدفن کیا انیسؔ اور کیا دبیرؔ
"برمزار ما غریباں نے چراغ نے گلے"

(4)

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقامِ انیسؔ
یہ فن مرثیہ گوئی میں اہتمامِ انیسؔ

حسینیت کی خدمت انیسؔ نے کی ہے
رہے گا تا بہ قیامت بلند نامِ انیسؔ

(5)

ہر قلب میں ہے عزت و تکریمِ مساوات
ہر قوم ہے اب حامیٔ تعلیمِ مساوات

اس رازِ محبت سے نہ تھا ایک بھی واقف
اسلام نے کی خلق میں تقدیمِ مساوات

(6)

واجب ہے مسلمان پہ تعظیمِ مساوات — قرآن نے دی ہے ہمیں تعلیم مساوات
بنیاد محبت ہے یہی نقطہ محبوب — کیوں مرکز اسلام نہ ہو میم مساوات

(7)

کیا مسافر نوازیاں کی ہیں — رہیں احباب اپنے شاد آباد
گھر ہے یہ منتوں مرادوں کا — اور آباد ہو مراد آباد

(8)

سب ہیں اس جگ میں جیتے جی کے کارن — ہم پیت نہ کرتے تھے اسی کے کارن
آئی ہے اجل ساتھ لیے جاتی ہے — ساجن سے بگڑ گئی سکھی کے کارن

(9)

سنسار کی ریت ناپی جوکھی سمرن — مالا کا وہ پھیر وہ انوکھی سمرن
ہم جانیں سکھی ہمارا سائیں جانے — من کی سمرن ہے سب سے چوکھی سمرن

(10)

ٹھہر ٹھہر کے دو عالم ہلائے دیتی ہے — ترے لبوں پہ نہیں تیرے اختیار کی لے
نشاط میں کہیں سامان غم نہ ہوجائے — بدل گئی ترے نغمہ سے آبشار کی لے

(11)

مجھے نزاکت ہستی بڑھانے والے نے — فضائے عشق میں قیدی بناکے چھوڑ دیا
بتوں نے کی تھی مری سمت بھی نگاہ کرم — مگر خدا کا گنہ گار پاکے چھوڑ دیا

(12)

بہت ٹھوکریں کھائیں گے کھانے والے — محبت کی دولت کو ٹھکرانے والے
اسی باغ کے پھول ہیں کیا دعا دیں — سلامت رہیں آگ بھڑکانے والے

(13)

اشکِ حسرت متصل بہتے رہے — اور غم بالائے غم سہتے رہے
اک مزے کی نیند لے لی آپ نے — جب تلک ہم دردِ دل کہتے رہے

(14)

حقیقتیں ہیں یہ دونوں خیال و خواب نہیں — تمھارے حسن مرے عشق کا جواب نہیں
غمِ فراق میں بھی ہے سکون کا عالم — ہمیں یہ پاسِ وفا ہے کہ اضطراب نہیں

(15)

وہم کی صورت گری کا سلسلہ بڑھتا رہا — زندگی گھٹتی رہی اور راستہ بڑھتا رہا
معنی مولا میں جتنی جستجو بے سود کی — فصل اتنا منزل بے فصل کا بڑھتا رہا

(16)

رواں تھا راہ غلط پر جو قافلہ نہ رہا — جو غاصبوں نے کیا تھا معاملہ نہ رہا
ازل کا سلسلۂ منتخب رہا قائم — وہ خانہ ساز خلافت کا سلسلہ نہ رہا

(17)

حجاز سے ہوئی رخصت عراق کو چھوڑا — پناہ ترک میں آئی عرب سے منہ موڑا
ملا نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا بھی — کہاں خلافتِ ناحق نے جاکے دم توڑا

(18)

تبرِ مومن سے خدا رکھے نکلتا ہے وہ نور — چار جانب ہے تولا کی فضا پھیلی ہوئی
کیوں ہمارے کنجِ مرقد میں سمٹ آئے نہ خلد — اس زمیں پر جب ہے خاک کربلا پھیلی ہوئی

(19)

سراجِ ملت حقا بنے افراد ملت میں — وہ محبت کی ولا کے دائرہ کی زیب و زینت میں
جبھی تو میر مومن مومنوں میں میر کہلائے — امیر المومنین کے خاص خادم ہیں حقیقت میں

(20)

زہے مدارج نور الہدیٰ وہ شاہِ چراغ — جو دے گئے تھے ہمیں ہے وہ زندگی باقی
بہت چراغ جلے اور بہت چراغ بجھے — مگر ہے ان کے چراغوں کی روشنی باقی

(21)

ہر ذہن میں روشن ہے پیامِ غالبؔ — ہر دل میں ہے آج احترامِ غالبؔ
ہم کو بھی یہ فخر ہے کہ اس دور میں ہیں — جس دور نے سمجھا ہے مقامِ غالبؔ

(22)

چشمہ کی طرف صبح ابلتی ہوئی دیکھی　　سورج کی کرن برف پہ جلتی ہوئی دیکھی
مشرق کے مسافر نے جہاں آنکھ دکھائی　　چاندی سی پہاڑوں پہ پگھلتی ہوئی دیکھی

(23)

دور تجھ سے جلوہ جانانہ کشمیر ہے　　مسلم کشمیر تو بیگانہ کشمیر ہے
وہ کہاں شامِ نشاط و صبح شالیمار میں　　جو ترے احساس میں افسانہ کشمیر ہے

(24)

پھولوں کے جگہ جگہ نشیمن دیکھے　　کشمیر کے جنگلوں میں گلشن دیکھے
پھوٹی ہوئی انسانوں کی قسمت دیکھی　　ٹوٹے ہوئے شاعروں کے مدفن دیکھے

(25)

ہم تو ہیں کاش تم بھی آجاو　　ہر نظر حسن افریں ہوجائے
ہائے کشمیر و جنّتِ کشمیر　　آشیانہ یہیں کہیں ہوجائے

(26)

کچھ یاد ہے کشمیر میں سبزہ پہ لب جو　　ساغر میں بھری تھی مئے انگور بہاوی
اتنا کسی انسان نے پیا ہوگا نہ پانی　　جتنی مجھے کافر تری آنکھوں نے پلادی

(27)

بہار خطّہ کشمیر اے معاذ اللہ　　گلوں کا ایسا خزانہ کہیں نہیں دیکھا
نظر کو جان بچاتے ہوئے یہیں پایا　　زمیں کو لعل اگلتے ہوئے یہیں دیکھا

(28)

تائید جو ہندوؤں نے فرمائی ہے　　ممنون ہر ایک حق کا شیدائی ہے
کل پریم کی متھرا میں بجی تھی بنسی　　آج اس کی صدائے بازگشت آئی ہے

(29)

چُن چُن لیے دنیا نے جواہر ریزے — کیا کیا نہ دُرِ بیش بہا ہات آئے
عالم ہوا اخلاقِ حسن سے معمور — اسلام کے ساتھ عدل و مساوات آئے

(30)

اک ساکن دیر نے پوچھا مجھ سے — تقلید نبیؐ کے کچھ نشاں ملتے ہیں
اسلام بہت خوب ہے مذہب لیکن — اے دوست مسلمان کہاں ملتے ہیں

31

یہ خوشنما عمارت یہ نقش ساحرانہ — سلام لیجئے مولا غلام حاضر ہیں
دنیا کی دولتیں سب گرجاتی ہیں نظر سے — جس وقت دیکھتا ہوں یہ علم کا خزانہ

32

توجہات کے سبب تشنہ کام حاضر ہیں — سلام لیجئے مولا غلام حاضر ہیں
بصد نیاز حضورِ امامؑ حاضر ہیں — اسی امید میں یہ سال بھر گذار ہے

33

وہ اس انداز سے نکلے کہ لاکھوں انگلیاں اٹھیں — ہلالِ عید آخر کیوں کسی معشوق سے کم ہو
کرے اغماض پھر کیوں کر نہ وہ صورت دکھانے میں — جو صرف شوق دنیا ہو جو محوِ دید عالم ہو

34

ان کو ستم کشانِ زمانہ سے کیا غرض — ہے معصوموں کو عید فقط مال و زر کی عید
میں رو دیا تھا دیکھ کے کپڑے پھٹے ہوئے — دیکھی ہے تجم میں نے کسی بے پدر کی عید

35

چلے مل بل کے دونوں سالِ نو کی پیشوائی کو — فدائی کانگریس کے لیگ کی محفل کے مستانے
خدا رکھے یہ اندازِ محبت کس نے دیکھے تھے — انھیں سکھلا دیا کس نے گلے ملنا خدا جانے
خدا میں تو ہے سب قدرت مگر نہ تجم حق یہ ہے — کہاں زنار کا ڈورا کہاں تسبیح کے دانے

36

جب کبھی خانۂ اللہ میں دیکھا کرے
سر بہ سجدہ کوئی دو چار ہی انساں نکلے
ہم سمجھتے تھے مسلمان بہت کم ہیں یہاں
عید کے دن تو مسلماں ہی مسلماں نکلے

37

ادا ہوتا نہیں جب فرض تو سنّت سے کیا حاصل
یہ صاحب وضع ناحق سر پہ اتنا بار لیتے ہیں
اُترتی ہی نہیں پتلون جن کی ایک لمحہ کو
وہ کیوں کر عید کے دن ٹکریں دو مار لیتے ہیں

38

عزت سے آبرو سے بٹھائے گئے ہیں ہم
چھ بار اس دیار میں آئے گئے ہیں ہم
دو چار سال تک یہ نہ آنے کی ہے سزا
قیدی بنا کے شان سے لائے گئے ہیں ہم

39

نہ دیکھی اور نہ قید ایسی سنی ہم نے فسانوں میں
کمی آنے نہ پائی کچھ حکومت کے خزانوں میں
زہے حُسنِ تدبر گھر ہی مظلوموں کو زنداں تھے
کہ دو رات ایک دن پابند رکھا ہے مکانوں

40

دے کے یہ دولت کوئی لیتا ہے ناداری کہیں
یوں بھی ممکن ہے بھلا ترکِ وفا داری کہیں
حُبِّ اہلبیتؑ شامل جن کے آب و گل میں ہے
وہ مسلماں چھوڑ سکتے ہیں عزا داری کہیں

باب ہفتم

نعت

-1	نجم آفندی کی نعت نگاری	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
-2	منتخب نعتیہ اشعار	(33)عدد
-3	فہرستِ نعت	(16) عدد

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم آفندی کی نعت نگاری

یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ جناب تحسین فراقی نے اپنے تحقیقی عمدہ مضمون ''جدید اردو نعت کوئی'' ایک جائزہ جو نعت نمبر شام و سحر 1982ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ تقریباً پچاس سے زیادہ اردو کے نعت گو شعرا کا تذکرہ کیا لیکن علامہ نجم آفندی کا نام تک نہیں لیا جبکہ نجم آفندی کے ہزار سے زیادہ عمدہ نعتیہ اشعار ان کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں جن سے کم و بیش سبھی پرستارانِ رسالتؐ واقف ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان کی بیشتر نعتیں جن کی مجموعی تعداد سولہ ہے، غیر مطبوعہ ہیں لیکن ان کے نعتیہ اشعار اور نعتیں ہمیشہ محافل میلاد کی رونق بنی رہیں اور بعض اشعار زبان زد عام بھی رہے۔ راقم نے نجم آفندی کا تمام تر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام ''کائنات نجم'' میں جمع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ کائنات نجم، نجم آفندی کی حیات، شخصیت، فن اور مجموعہ کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کی دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جس میں نجم کے صدہا نعتیہ اشعار، (31) اکتیس نعتیہ رباعیات، چار نعتیہ قطعات اور سولہ نعتیں شامل ہیں جو نجم کی ستّر (70) برس ریاضت کی کمائی ہیں۔ ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے اپنی کتاب نجم آفندی فکر و فن میں نعتیہ رباعیات کے ذیل میں بہت صحیح لکھا کہ ''نجم آفندی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کسی رباعی میں بھی ایسی بات پیش نہیں کی جو قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو۔ ان کے نزدیک عقیدت کا معیار یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے مسلمہ معیارات کو سامنے رکھ کر حضورؐ کی مدح کی جائے اور صحیح روایات کو بنیاد بنایا جائے نہ کہ محض عقیدت اور جذبات میں حضورؐ سے ایسی باتیں منسوب کی جائیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کے بارے میں ان کی رباعیات کسی نہ کسی

آیت قرآنی کی وضاحت کررہی ہیں۔نجم آفندی نے شمائل نبوی کے بیان کے بجائے، آپ کی سیرت اور اسوہ پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے۔نجم نے جہاں حضورؐ سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہاں مسلمانوں کو ایک ایسا راستہ بھی دکھایا ہے جس پر چل کر وہ دین و دنیا کی بھلائی حاصل کرسکتے ہیں اور آخرت میں سرخرو ہوسکتے ہیں۔''

اس مضمون میں ہم صرف چند نمونہ کے اشعار بغیر کسی تشریح وتبصرہ کے پیش کررہے ہیں، تاکہ ہر کس بقدر ہمّت خود اس سے فیض یاب ہوسکے لیکن نجم کا نعتیہ شاعری میں مقام متعین کرنے میں دقّت نہیں ہوگی۔نجم آفندی کا شمار صفِ اوّل کے جدید اردو نعت گوئی کے شعرا حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، ظفرؔ علی خاں، حفیظؔ جالندھری، احسان دانشؔ، حفیظ تائبؔ، عبدالعزیز خالدؔ وغیرہ میں ہوتا ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ نظام حیدرآباد کے صدر المہام (وزیر اعظم) مہاراجہ کشن پرشاد جن کی نعتوں کا مجموعہ ''ہدیۂ شادؔ'' ان کی زندگی میں شائع ہوچکا تھا، کسی شخصی محفل میں نعت سنا رہے تھے۔کسی منچلے نوجوان نے مہاراجہ کو مخاطب کرکے پوچھا۔مہاراجہ کیا آپ مسلمان ہوگئے ہیں جو ایسی عقیدت سے بھری نعت سنا رہے ہیں۔مہاراجہ نے اس نوجوان کو مخاطب کرکے فوراً جواب دیا۔تو خدا پرشاد ہے میں کشن پرشاد ہوں۔پھر مزید کہا کہ حضورؐ کے اخلاق حسنہ اور انسانیت پر احسانات نے مجھے اس بات پر وادار کیا کہ میں حضورؐ کی توصیف وتعریف میں نعت کہوں۔یقیناً غیر مسلم نعت گویوں نے سرکارِ کائنات کو اخلاق و کردار کا عظیم نمونہ اور انسان سازی کا عالی ترین قالب سمجھ کر نعتیہ مضامین کی ہر دور اور ہر موسم میں فصل اُگائی ہے۔آج کے پُرآشوب دور میں جہاں اسلامی اقدار کو مسخ کرنے کی بین الاقوامی تحریک جاری ہے حضورؐ کی ذات مقدس کو بھی غلط بیانی اور دروغ گوئی کے ذریعہ جارحیت کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔حضورؐ کو (معاذ اللہ) ایک جابر حکمراں کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اس لیے ہے کہ قرآن اگر موردِ قبول نہ ہوگا تو تلوار سے سر اُتارا جائے گا۔چنانچہ اس دور میں ایسی نعتوں کی ضرورت اس لیے بھی ضروری ہوگئی ہے کہ ظلمتِ کفر و نفاق کو چراغِ مصطفویؐ سے دور کیا جاسکے۔

حجم کے درجنوں نعتیہ اشعار ان مضامین پر موجود ہیں۔ اس موقع پر ہم کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔

دو عالم پر ہے قبضہ احمدِ مختارؐ کیا کہنا　　ترا قرآن کیا کہنا تری تلوار کیا کہنا
وہی ہے صحنِ مسجد اور وہی قصرِ حکومت ہے　　خدائے پاک کے گھر میں ترا دربار کیا کہنا

اک فیصلہ کن شان سے بھیجا ہے خدا نے　　قرآن بھی تلوار بھی ہے دستِ قوی میں

خدا کے گھر میں اُس نے فقر کی مسند پہ شاہی کی　　جہادِ زندگی میں کون ایسا مردِ میداں ہے

مجاہد کر دیا خوں خوار خوں آشام قوموں کو　　خدا کی راہ میں مصرف کیا اُس نے شجاعت کا

انسانیت، انسان سازی اور مکارم الاخلاق پر اشعار دیکھئے:

خدمت یہ کسی نبیؑ ولی سے نہ ہوئی　　وابستہ کسی پیمبری سے نہ ہوئی
کامل تھے سبھی مگر محمدؐ کے سوا　　اخلاق کی تکمیل کسی سے نہ ہوئی

احساسِ حیات کو جگانے والا　　حکمت کے حدود کو بڑھانے والا
کتنے پیغمبروں کے بعد آیا ہے　　انسان کو انسان بنانے والا

دنیا میں پیمبروں کا سلطاں آیا　　انساں کی عظمت کا نگہباں آیا
سیرت ایسی بدل دیا نظم جہاں　　صورت ایسی کہ جس پہ قرآں آیا

صورتِ گرِ ازل نے ترے اعتبار پر　　اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا
کہتی ہے ذہنیت یہ حجاز و عراق کی　　تیرا ہی کام تھا کہ مسلماں بنا دیا

وہ اک نورِ مجسّم تھا مگر اے ابنِ آدم سُن
تری سیرت بنانے کو اٹھایا بار صورت کا

ظہور اس کا نہ تھا تقسیم ملک و مال کی خاطر
اُسے دنیا میں جوہر بانٹنا تھا آدمیّت کا

اُسے انسان کے اخلاق کی تکمیل کرنی تھی
علیٰ آفاق میں پہلا ثمر تھا اس کی محنت کا

تلوار اٹھے یا دستِ دعا دونوں میں ہے شانِ حق کی رضا
مسجد کی روش میدان میں بھی سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

جو دینِ خدا کی دشمن تھی ہر بات پہ جس سے جنگ ہوئی
اک دن وہی دنیا چیخ اٹھی سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

میں سمجھا آدمی کا احسن تقویم ہو جانا
یہی صورت ہے جس پر حق کی صنعت ناز کرتی ہے

ترے اُسوہ نے کی اخلاق کی تکمیل دنیا میں
اسی معراج پر انساں کی عظمت ناز کرتی ہے

انساں کے خاکی پیکر میں اب شافعِ محشر آتے ہیں
جو دونوں جہاں کے مالک ہیں وہ بھیس بدل کر آتے ہیں

دیا جس پُرخطر صحرا میں درسِ معرفت اُس نے
وہی تہذیب کا اخلاق کا پہلا دبستاں ہے

بہت حیران تھی دنیا اس اندازِ حکومت پر
کوئی قصرِ حکومت ہے نہ حاجب ہے نہ درباں ہے

ہر دور میں اخلاق کی تکمیل ہوا
سرمایۂ پیغامِ رسول عربیؐ

شرع کا ہر مسئلہ ہے علم و حکمت کو قبول
فطرتِ انسانیت ہے ہم نوائے مصطفےٰ

مکمل کر دیا انسان کا دستورِ حیات اُس نے
رسولِ آخری ہے حرفِ آخر لے کے آیا ہے

کیا آدم کو پیدا جس خدا نے اس کا کیا کہنا
مگر مجھ کو محبت ہے خدائے آدمیت سے

یہ وہ انسان اعظم ہے شکستِ فاش دی جس نے
حکومت کی محبت سے محبت کی حکومت سے

بنی آدم ازل سے تا ابد ممنون احساں ہیں　　اسی نے آدمیت دی ہے ورنہ آدمی کیا ہے

مذموم تمدن کے صنم توڑے ہیں اس نے　　اک اور اضافہ یہ کیا بت شکنی میں

نعت درحقیقت حدیث دل ہے۔ وارداتِ قلبی کا صفحۂ قرطاس پر مظاہرہ ہے۔ عرفیؔ کے شعر کے مصداق تلوار کی دھار پر سفر ہوتے ہوئے بھی سیر گلشن فردوس ہے۔ جس کا جتنا قلبی اثر ہوگا، نعت اتنی ہی با اثر ہوگی۔ نعت کی تنقید کے معنی، گلِ نعت یعنی شعر کو نوکِ خار تنقید سے تتر بتر کرنا صحیح نہیں۔ اگر کسی نے اپنے کو حسانؓ دوراں یا حسانؓ مثل کہا ہے تو یہ تعلّی ہے اور خوبصورت تعلّی ہے۔ اُس میں خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ غالبؔ کے چہیتے شاگرد مہدی مجروحؔ نے بھی اپنی خوبصورت نعت کے مقطع میں کہا ہے۔

مدّاحِ سخ ہے دن رات مجروحؔ　　یہ اردو میں ہے ثنخوانِ محمدؐ

بعض لوگوں نے شاعر دربار رسالتؐ پر اعتراض کیا۔ لیکن حضورؐ کا دربار آج بھی سجا ہوا ہے ورنہ لاکھوں افراد نذرانۂ عقیدت لے کر مدینہ نہ جاتے اور ہر وہ شخص جو اس دربار میں حاضری دے گا وہ اپنے کو شاعر دربار رسالتؐ کہنے کا حق دار ہے۔ رند اور زاہد، صوفی اور مفتی کی کے میں فرق ہے اور نجمؔ اور دوسرے نجوم آسمان رسالتؐ، شاعر دربارِ رسالتؐ ہی ہیں۔

طلب یکساں ہے لیکن فرق یہ ہے رند و زاہد میں　　کوئی عشق نبیؐ میں نالہ کش کوئی غزل خواں ہے

اے نجمؔ میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ　　کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

فضائے عرش میں اے نجمؔ رہتا ہے دماغ اپنا　　فراز عرش سے اترے ہیں یہ اشعار کیا کہنا

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزو شرف　　نجمؔ فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفیٰؐ
میرے آباء کا شرف ہے میری فطرت کا خمیر　　نجمؔ صدیوں سے ہے فخرِ مدح آل مصطفیٰؐ

جب مدحِ پیمبرؐ کرتا ہوں وہ زورِ سخن بڑھ جاتا ہے　　اے نجمؔ سلامی دینے کو الفاظ کے لشکر آتے ہیں

نجمؔ مدّاحِ پیمبرؐ کی بلندی کو نہ پوچھ　　خاک پر بیٹھے تو سر عرش سے جا ملتا ہے
میں اپنے شعر لے کر نجمؔ اس منزل میں کیا جاؤں　　جہاں قرآن کی ایک ایک آیت ناز کرتی ہے

تا عرش یہ نغمے جائیں گے سکانِ فلک دہرائیں گے　　کہنے دو مجھے اے نجمؔ ابھی سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

اُسے یارب نہ ہو معلوم حالت نجمؔ کے دل کی　　غمِ اسلام کم ہے اور غمِ دوراں فراواں ہے

صرف مقطعوں ہی میں نہیں بلکہ نعتوں کے بہتے زلال میں بھی نجمؔ کے احساساتِ عجز و انکسار اور تعلّی کے کنول نظر آتے ہیں۔ یہ طرزِ بیان صرف اور صرف مدحتِ نبویؐ کے لطفِ خاص سے عطا ہوتا ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

قطرہ نے لیں جو تیری محبت میں کروٹیں　　بطنِ صدف میں گوہرِ غلطاں بنا دیا
یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی　　اک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنا دیا
سلطانِ کج کلاہ مقابل نہ ہو سکے　　جس کو رئیسِ دولتِ عرفاں بنا دیا

ایک اور نعت کا مطلع اور زیبِ مطلع کا انداز دیکھئے۔

کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں　　اور آگ لگا دی ہے مری تشنہ لبی میں
آزاد ہوں میں وسعتِ عشقِ نبویؐ میں　　الجھے ہوئے ہیں تنگ نظر بولہبی میں
وصلِ ابدی میں ہے نہ سحرِ ازلی میں　　احساس جو ہے عشقِ محمدؐ کی خودی میں

اسلام دینِ فطرت ہے اور پیامبر اسلام فطرت کا مکمل نمونہ۔ اسلامی اقدار اُس زمانے میں دنیا میں رونما ہوئے جب دنیا مساوات، امن اور شانتی، استعمار اور جمہوریت سے آشنا نہ تھی یعنی فلسفہ اور ان کی کتابوں میں اس کا تذکرہ تو تھا لیکن کوئی انھیں روبہ عمل لانے کی قدرت اور جرأت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ یہ ذاتِ ختمی مرتبت تھی جس نے غربت کو مٹانے، زر و زمین کو آتا اور غلام کے درمیان تقسیم کرنے، امن اور سلح کے پیغامات کو سراسر گیتی پھیلانے اور پیغامِ برادری

انسانوں کے درمیان بخصوص **ملت** اسلامیہ کے افراد کے درمیان اتحاد پر زور دیا۔ حجم کی نعتوں میں یہ مضامین بکھرے ہوئے ہیں۔ غریبوں اور غربت کے متعلق چند شعر دیکھئے۔

غریبِ قوم بن کر بن گیا ڈھارس غریبوں کی　　امیرِ خلق ہو کر بھیس بدلا اُس نے غربت کا

اسی کی حق پناہی سے ہوا ہے دسترس اتنا　　کہ آج افلاس کا ہاتھ اور دولت کا گریباں ہے

بہت دولت لٹائی جس کے ہاتھوں نے غریبوں میں　　مگر ہونے دیا دامن کو آلودہ نہ دولت سے

تجھے دولت حکومت عیش سب دیتی رہی دنیا　　مگر دنیا میں باقی ہے ترا انکار کیا کہنا

دنیا کے امن کے لیے کیا کوئی دوسری ہستی ایسی ہے جس نے صرف دفاعی جنگ کی اور مدینہ جیسے شہر میں دوسری اقلیتوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک برقرار رکھا۔

رحمت عالم خلافِ امن جا سکتا نہیں　　تھی دفاعی جنگ ہر جنگ و جدال مصطفیٰؐ

ابھی انسان سمجھا ہی نہیں تجویز امن اُس کی　　ابھی دنیا کے ہر اک موڑ پر طاقت رجز خواں ہے

جہاں میں سب سے پہلے تو پیام امن لایا تھا　　مساوات و محبت کے علم بردار کیا کہنا

مساوات اور برادری بخصوص **ملت** اسلامیہ کے فرقوں کے درمیان اتحاد پر حجم نے بڑے عمدہ اشعار نعت نگاری میں شامل کیے ہیں۔

نوعِ بشر کو نظم مساوات سونپ کر　　ہر دردِ اختلاف کا درماں بنا دیا

دیا تھا اس نے وہ درسِ مساواتِ روا داری　　کہ ہر اک قوم میں اب روح آزادی کی جولاں ہے

کیا تقویٰ کو شامل اس نے تہذیب و تمدن میں　　یہ نعمت گر نہیں تو منعم و مزدور یکساں ہے

اُسی خوانِ کرم کی ریزہ خوار اقوام عالم ہیں　　اُسی کا اک عطیہ اشتراکی درد درماں ہے

خدا بھی ایک ہے قرآں بھی قبلۂ پیمبرؐ بھی　　قیامت ہے کہ پھر ملّت کا شیرازہ پریشاں ہے
بھلا سکتے نہیں دل اس کی تحریک اخوت کو　　چراغ انسان کے احساس کا بے شک فزاواں ہے
اخوت کی بنا ڈالی اُسی نے بزم ہستی میں　　کسے معلوم تھا انسانیت کا کیا تقاضا ہے
جو عالم گیر پیغامِ اخوت لے کے آیا تھا　　اُسی کی قوم ہے محروم احساس اخوت سے

شاعری کی دوسری اصناف کی طرح نعت کے اظہار اور ابلاغ میں وسعتِ فکری کو بڑا دخل ہے۔ علامہ اقبالؔ کے نعتیہ اشعار میں غضب کا خلوص ہے جس کی جھلک علامہ حجمؔ آفندی کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔

اُسے کرنا تھا رشتہ عبد کا معبود سے محکم　　کہ اُس کو علم تھا انساں کی کمزوریِ فطرت کا

خالق کی مشیت پہ بھی کر ہی لیا قبضہ　　کیا آگئی انسانِ خدا ساز کے جی میں
تفریق پہ کس نے مجھے مامور کیا ہے　　کیوں فرق کروں عشقِ خدا عشقِ نبیؐ میں

خبر کیا تجھ کو تعلیم محمدؐ مصطفےٰؐ کیا ہے　　یہ حُسنِ احتیاط ایک امتزاجِ دین و دنیا ہے

رباعی

آدم مابین آب و گل تھے جب سے　　روشن تھی فضا نور حبیب رب سے
اپنی ہستی سے بے خبر آدم زاد　　کیا جانے کہ ہے ذات محمدؐ کب سے

حضور اکرمؐ کی تعلیمات سے بہرہ مند ہونے کے بجائے بعض لوگ فروعی اور غیر ضروری مسائل میں اپنی پوری توانائی صرف کر دیتے ہیں۔ معراج روحانی اور جسمانی کے مباحث، نوری یا خاکی ہونے کی بحث، فلسفہ اور دین و دنیا کے معمولی مسائل وغیرہ۔ حجمؔ کے چند اشعار ان کی پوری ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ خبر بھی ہے تجھے نان و نمک کے سائل　　اُس کے کوچہ میں گدائی سے خدا ملتا ہے
بھٹک کر رہ گئے رستہ میں سقراطی بقراطی　　تیری چوکھٹ پہ سجدے کر کے حکمت ناز کرتی ہے

نہ چھیڑو مبحثِ معراج روحانی و جسمانی　　دکھاؤ آئینہ جویائے حق کو اس کی سیرت کا

یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی　　اک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنادیا

میانِ آب و گل تھا آدمی جب وہ پیمبرؐ تھا　　مشیت ہی میں تھا اسلام وہ جب سے مسلماں ہے
خود اپنا نور نورِ بندگی نورِ خداوندی　　شبِ معراج اس کی غیرتِ صبح درخشاں ہے

بے کار یہ جسم و روح کی بحث ہے آج　　سر پر مرے آقا کے ازل سے ہے یہ تاج
کیا اس کے لیے عرش پہ جانے کا سوال　　جب فرش پہ حاصل ہو مقامِ معراج

تشکیل ہوئی تنظیم ہوئی ترتیب ہوئی تکمیل ہوئی　　کیوں ختم نہ ہو پیغامبری سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

یہ نام محمدؐ یہ اندھیرے کا اجالا　　سرنامۂ آیات ہے آیاتِ جلی میں
صدقے صنمِ ہند و صنادید عجم ہیں　　اللہ کی قدرت ہے لباس عربی میں

حضور اکرمؐ کی ذات اقدس مدینۃ العلم ہے۔ آپؐ علم لدنیؐ کے حامل تھے۔ یہ بھی حضورؐ کا معجزہ ہے کہ اس دور کے عالم اور پڑھے لکھے شخص کو کیوں کر معرفت پروردگار حاصل نہ تھی جسے ابوجہل کے نام سے یاد کیا۔ حضورؐ ظاہری طور پر لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے اس لیے آپ کا لقب اُمّی ہوا۔ مضامین نعت میں حضورؐ کا اُمّی ہونا ثانوی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ فارسی اور اردو کے شعرا نے اچھوتے، نادر اور خوب صورت اشعار لکھے۔ تجم کے دو چار اشعار، جو ان کی مزاجِ شاعری کے نقیب ہیں، تبرکاً یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

نگاہِ اہل ظاہر میں وہ اُمّی تھا مگر ایسا　　کتابِ زیست میں اصلاح دی ہے دستِ قدرت سے

تکوینی ہے علم اس کا جو کہلاتا ہے اُمّی　　یہ بات نہ آئے گی کبھی ذہنِ غبی میں

اُسی نے مصرفِ علم وعمل سے ہم کو سمجھایا　　غرورِ زندگی کیا ہے شعورِ زندگی کیا ہے

ازل کے دن سے جس کی انگلیاں ہیں نبضِ فطرت پر　　مزاج زور وزر بدلا ہے جس نے علم وحکمت سے

حضور اکرمؐ معلّم اخلاق اور زیست ہیں وہ تکوینی علم کے حامل ہیں۔

نعت میں منقبتی موضوعات کی رسم بھی بہت قدیم ہے۔عربی فارسی اور اردو نعت کی ابتدا ہی اس آمیزش کے ساتھ ہوئی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی نعتوں میں اہل بیتؑ کرام کی مدح وثنا مسلسل نظر آتی ہے لیکن اُن میں سب کی نسبت حضور اکرمؐ کے وجود سے بتائی جاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی عمدہ ہے کہ نجم آفندی کو نصیر الملت کی جانب سے شاعر اہل بیتؑ کا خطاب دیا گیا تھا۔

شاعر ہوں جن کا نجم وہ ہیں وجہ کائنات　　ممکن ہے تا ابد میرا نام و نشان رہے

مصاحب تیرے پیغمبرؐ فرشتے لشکری تیرے　　سپہ سالار اعظم حیدر کرارؑ کیا کہنا

ذبیح اللہ شامل تیرے اسلافِ مقدس میں　　شہید کربلا ہے تیرا ورثہ دار کیا کہنا

کلمہ کو کیوں کر نہ ہوں شیدائے آلِ مصطفیٰؐ　　کوئی بدقسمت ہی چاہے گا ملالِ مصطفیٰؐ

حشر تک فکر آفریں ہے ذہن انساں کے لئے　　عترت و قرآں متاعِ لا زوالِ مصطفیٰؐ

صورت وسیرت میں ہیں زہراؑ کے دونوں لاڈلے　　ہم جمالِ مصطفیٰؐ و ہم خیالِ مصطفیٰؐ

ترے اسلاف سے اخلاف سے آگے نہیں کوئی　　جہاں تک نسل آدم کی شرافت ناز کرتی ہے

نجم آفندی نے حضرت تمنا سندیلوی مرحوم کی فارسی نعت پر تضمین کر کے ایک خوبصورت فارسی میں نعت کہی ہے جس کے ایک بند پر اس تحریر کو تمام کرتا ہوں۔

از روئے تو صبح یافت تنویر　　وز زلفِ تو شب نمودہ تحریر

تو جانِ مصوری بہ تصویر　　از شمع رُخ تو دستِ تقدیر

برکرد چراغ آفرینش

منتخب نعتیہ اشعار

آنکھیں تو بچھا ہی رکھیں ہیں خاکسترِ دل کا فرش کرو
ہے عرش بھی جن کے زیرِ قدم وہ فرشِ زمیں پر آتے ہیں

جب مدحِ پیمبرؐ کرتا ہوں وہ زورِ سخن بڑھ جاتا ہے
اے تجمّل سلامی دینے کو الفاظ کے لشکر آتے ہیں

قطرہ نے لیں جو تیری محبت میں کروٹیں
بطنِ صدف میں گوہرِ غلطاں بنا دیا

یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی
اک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنا دیا

سلطانِ کج کلاہ مقابل نہ ہو سکے
جس کو رئیسِ دولتِ عرفاں بنا دیا

صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر
اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا

تجمّل مداحِ پیمبرؐ کی بلندی کو نہ پوچھ
خاک پر بیٹھے تو سرِ عرش سے جا ملتا ہے

میں سمجھا آدمی کا احسنِ تقویم ہو جانا
یہی صورت ہے جس پر حق کی صنعت ناز کرتی ہے

میں اپنے شعر لے کر تجمّل اس منزل میں کیا جاؤں
جہاں قرآن کی ایک ایک آیت ناز کرتی ہے

فضائے عرش میں اے نجم رہتا ہے دماغ اپنا
فرازِ عرش سے اترے ہیں یہ اشعار کیا کہنا

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزّ و شرف
نجم فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفیٰؐ

تشکیل ہوئی تنظیم ہوئی ترتیب ہوئی تکمیل ہوئی
کیوں ختم نہ ہو پیغامبری سرکارِ دو عالم صلِ علیٰ

مئے حُب نبیؐ کو واسطہ ہے میری فطرت سے
وہ کوئی اور ہوں گے جن کو مل جاتی ہے قسمت سے

نگاہِ اہل ظاہر میں وہ اُمّی تھا مگر ایسا
کتابِ زیست میں اصلاح دی ہے دستِ قدرت سے

وہ اک نورِ مجسم تھا مگر اے ابنِ آدم سُن
تری سیرت بنانے کو اٹھایا بار صورت کا

کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں
اور آگ لگادی ہے مری تشنہ لبی میں

آزاد ہوں میں وسعتِ عشقِ نبویؐ میں
الجھے ہوئے ہیں تنگ نظر بولہبی میں

اک فیصلہ کن شان سے بھیجا ہے خدا نے
قرآن بھی تلوار بھی ہے دستِ قوی میں

تکوینی ہے علم اس کا جو کہلاتا ہے اُمّی
یہ بات نہ آئے گی کبھی ذہنِ غبی میں

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربار رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

خدا بھی ایک ہے قرآں بھی قبلہ بھی پیمبرؐ بھی
قیامت ہے کہ پھر ملّت کا شیرازہ پریشاں ہے

بھلا سکتے نہیں دل اُس کی تحریک اخوت کو
چراغ انسان کے احساس کا بے شک فروزاں ہے

ابھی انسان سمجھا ہی نہیں تجویز امن اُس کی
ابھی دنیا کے ہر اک موڑ پر طاقت رجز خواں ہے

دیا تھا اس نے وہ درسِ مساواتِ رواداری
کہ ہر اک قوم میں اب روح آزادی کی جولاں ہے

اُسے انسان کے اخلاق کی تکمیل کرنی تھی
علیٰ آفاق میں پہلا ثمر تھا اس کی محنت کا

مکمل کردیا انساں کا دستورِ حیات اُس نے
رسولؐ آخری ہے حرفِ آخر لے کے آیا ہے

رحمتِ عالم خلافِ امن جاسکتا نہیں
تھی دفاعی جنگ ہر جنگ و جدالِ مصطفیٰؐ

یہ نامِ محمدؐ یہ اندھیرے کا اجالا
سرنامۂ آیات ہے آیاتِ جلی میں

ذبح اللہ شامل تیرے اسلاف مقدس میں
شہیدِ کربلا ہے تیرا ورثہ دار کیا کہنا

یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی
اک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنا دیا

جو عالم گیر پیغام اخوت لے کے آیا تھا
اُسی کی قوم ہے محروم احساسِ اخوت سے

کیا تقویٰ کو شامل اس نے تہذیب وتمدن میں
نعمت گر نہیں تو منعم و مزدور یکساں ہے

خبر کیا تجھ کو تعلیمِ محمد مصطفیٰؐ کیا ہے
یہ حُسن احتیاط ایک امتزاج دین و دنیا ہے

○

فہرستِ نعت

نمبر شمار	عنوانات	تعداد	صفحہ نمبر
-1	انسان کے خاکی پیکر میں اب شافعِ محشرؐ آتے ہیں	(7) اشعار	752
-2	اے وہ کہ تیرے نور کو عنواں بنا دیا	(19) اشعار	753
-3	دردِ دل کیا کہیں رستہ میں پڑا ملتا ہے	(11) اشعار	755
-4	محمدؐ پر خدا کی شانِ وحدت ناز کرتی ہے	(18) اشعار	757
-5	چمکا جو عرب دیس کی قسمت کا ستارا	(34) اشعار	759
-6	گروہِ انبیاؑ کے سیّد و سردار کیا کہنا	(13) اشعار	762
-7	جان ہے تیری امانت دل برائے مصطفےٰؐ	(22) اشعار	763
-8	کلمہ گو کیوں کر نہ ہوں شیدائے آلِ مصطفےٰؐ	(11) اشعار	764
-9	محمدؐ کائناتِ دو جہاں میں کار فرما ہے	(15) اشعار	765
-10	کیا نعت میں لے نغمے کی بڑھی سرکار دو عالم صلی علیٰ	(12) اشعار	767
-11	نمازِ دردِ دل پڑھنی ہے پیغمبرؐ کی مدحت سے	(16) اشعار	769
-12	حرا کا غار ہے فانوس کس شمعِ حقیت کا	(22) اشعار	771
-13	محمدؐ کی حقیقت دونوں عالم کی رگِ جاں ہے	(38) اشعار	773
-14	تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوش نما ستارے	(39) اشعار	775
-15	اے نورِ چراغ آفرینش اے روحِ نفاخِ آفرینش	(14) اشعار	778
-16	کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں	(13) اشعار	779

نعت

(1)

انسان کے خاکی پیکر میں اب شافعِ محشرؐ آتے ہیں
جو دونوں جہاں کے مالک ہیں وہ بھیس بدل کر آتے ہیں

آمد ہے اب ان کی عالم میں جن سے ہے وجودِ ارض و سما
اب ختم ہے سب کی راہبری کونین کے رہبر آتے ہیں

آنکھیں تو بچھا ہی رکھی ہیں خاکسترِ دل کا فرش کرو
ہے عرش بھی جن کے زیرِ قدم وہ فرشِ زمیں پر آتے ہیں

اصنام کے بندے کیا جانیں دراصل خدائی ان کی ہے
جو غارِ حرا سے گھر کی طرف اوڑھے ہوئے چادر آتے ہیں

دیدارِ نبیؐ ہوجائے تو پھر بوذرؓ سے کہیں سلمانؓ سے کہیں
ہم نے بھی وہ آنکھیں دیکھی ہیں ہم کو بھی وہ تیور آتے ہیں

کیا کوئی بچے گا میری طرح میکش ہوں میں ایسی محفل کا
جب سے مجھے پیتے دیکھا ہے کوثر کو بھی چکر آتے ہیں

جب مدحِ پیمبرؐ کرتا ہوں وہ زورِ سخن بڑھ جاتا ہے
اے نجمؔ سلامی دینے کو الفاظ کے لشکر آتے ہیں

○

نعت

(2)

اے وہ کہ تیرے نور کو عنواں بنا دیا
پرچم کشائے سلطنتِ جاں بنا دیا
شق ہوگیا قلم کا جگر تیرے نام پر
صبحِ ازل کا چاک گریباں بنا دیا
پیدا ہوئی جبیں کی ضیا سے فضائے عرش
سجدہ کا نقش عالمِ امکاں بنا دیا
ہستی ترے ظہورِ تبسم سے چونک اٹھی
اس کیفیت کو صبحِ درخشاں بنا دیا
کھولا نشانِ مہر نگاہِ جلال نے
چشمِ کرم اٹھی مہِ تاباں بنا دیا
بیداریوں کی نعمت پُر کیف شب کو دی
طاعت گزارِ زلفِ پریشاں بنا دیا
اِک پرتوی جمال کا دریا اُبل پڑا
موج نسیم و جوشِ بہاراں بنا دیا
قطرہ نے لیں جو تیری محبت میں کروٹیں
بطنِ صدف میں گوہر غلطاں بنا دیا
غنچہ سے لے کے قلبِ بشر تک ہر ایک کو

شرمندۂ نوازش و احساں بنا دیا
اقرارِ دوستی پہ ملے ساغرِ حیات
تیری ولا کو میکدۂ جاں بنا دیا
صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر
اِک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا
قدرت نے اِک نظام تن و جاں بنا دیا
انساں ترے نثار کہ انساں بنا دیا
یہ نطق کا شرف یہ طہارت زبان کی
اِک اک حدیثِ دوست کو قرآں بنا دیا
گم گشتگانِ راہ کو دے کر پیامِ ہوش
نبض آشنائے گردشِ دوراں بنا دیا
کہتی ہے ذہنیت یہ حجاز و عراق کی
تیرا ہی کام تھا کہ مسلماں بنا دیا
جھکوا لیے قدم پہ بڑے سرکشوں کے سر
پروانہ وار شعلوں کو رقصاں بنا دیا
سلطانِ کجکلاہ مقابل نہ ہو سکے
جس کو رئیسِ دولت عرفاں بنا دیا
نوعِ بشر کو نظمِ مساوات سونپ کر
ہر دردِ اختلاف کا درماں بنا دیا
اے صاحبِ شریعت سہلہ ترے نثار
کیا مرگ و زیست دونوں کو آساں بنا دیا

○

نعت

(3)

دردِ دل کیا کہیں رستہ میں پڑا ملتا ہے
حق کے محبوب سے نسبت ہو تو آملتا ہے

میں وہ سائل ہوں تجھے مانگ رہا ہوں تجھ سے
دیکھنا ہے مرے مولاؐ مجھے کیا ملتا ہے

دل کا کیا حال ہو حاصل جو حضوری ہوجائے
اُس کی فرقت میں تڑپنے سے مزا ملتا ہے

طور تک موسیٰؑ عمراں کی رسائی تھی فقط
عرش سے اس کی بلندی کا پتا ملتا ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے نان و نمک کے سائل
اُس کے کوچہ میں گدائی سے خدا ملتا ہے

اپنے امکان تصور کو دعا دیتا ہوں
جب مرا سر قدم پاک سے جاملتا ہے

کس میں دم ہے جو کرے حسنِ عمل کی توصیف
نام سے سلسلۂ صلِ علیٰ ملتا ہے

یہ جزا کم ہے کہ دیدارِ نبیؐ ہوگا نصیب

کس کو یہ فکر ہے کیا روزِ جزا ملتا ہے

ہٹ دھرم ہیں جو سمجھتے نہیں منزل اس کی
سب کو قرآن میں لو لاک لما ملتا ہے

اُس کے دَر سے ہمیں کیا کچھ نہ ملے گا اے دوست
غیر کو حوصلۂ صبرو رضا ملتا ہے

جشمِ مداحِ پیمبرؐ کی بلندی کو نہ پوچھ
خاک پر بیٹھے تو سر عرش سے جا ملتا ہے

نعت

(4)

محمدؐ پر خدا کی شانِ وحدت ناز کرتی ہے
خداوندی شریعت در شریعت ناز کرتی ہے
فرشتے کیا ہیں نبیوں کی ارادت ناز کرتی ہے
نبوت کیا ہے تکمیلِ نبوت ناز کرتی ہے
زہے بارِ امانت خود امانت ناز کرتی ہے
ملک ہیں محوِ حیرت آدمیت ناز کرتی ہے
میں سمجھا آدمی کا احسنِ تقویم ہو جانا
یہی صورت ہے جس پر حق کی صنعت ناز کرتی ہے
تری بے چینیاں برحق مگر آگے بڑھوں کیوں کر
ابھی اے حرفِ آخر اولیت ناز کرتی ہے
شعورِ ترجمانی پر ہے یا مفہومِ قدرت پر
نہ پوچھو کس پہ قراں کی فصاحت ناز کرتی ہے
جہادِ صبر کا موقف ہو یا ہو جنگ کا میداں
بہر صورت بہر پہلو شجاعت ناز کرتی ہے
حکومت اس نے کی پہلو بچا کر کبریائی کے
اسی نظمِ حکومت پر حکومت ناز کرتی ہے
وہ اک توحید کا ساغر وہ کثرت پینے والوں کی
دو عالم مست ہیں ساقی کی ہمت ناز کرتی ہے
خدا کے آخری پیغامبر اے حجتِ اوّل
تجھی پر ظاہر و باطن ہدایت ناز کرتی ہے

غرورِ آلِ ہاشم ہے تری شانِ یتیمی بھی
ابھی تک جس یتیمی پر جلالت ناز کرتی ہے
تجھے اک دشتِ غربت کا مسافر کردیا جس نے
ازل کی صبح سے وہ شامِ ہجرت ناز کرتی ہے
ترے اسلاف سے اخلاف سے آگے نہیں کوئی
جہاں تک نسلِ آدم کی شرافت ناز کرتی ہے
بھٹک کر رہ گئے رستہ میں سقراطی و بقراطی
تری چوکھٹ پہ سجدے کرکے حکمت ناز کرتی ہے
وہاں سے ابتدا ہے تیرے انوارِ نبوت کی
جہاں پیغمبروں کی قدر و قیمت ناز کرتی ہے
تیرے اُسوہ نے کی اخلاق کی تکمیل دنیا میں
اسی معراج پر انساں کی عظمت ناز کرتی ہے
مکمل ہوگئی تنظیمِ قدرت تیرے آنے سے
جہاں میں تیرے آنے کی مہورت ناز کرتی ہے
میں اپنے شعر لے کر تجم اس منزل میں کیا جاؤں
جہاں قران کی ایک ایک آیت ناز کرتی ہے

نعت

(5)

چمکا جو عرب دیش کی قسمت کا ستارا
کرتار نے آکاش سے اِک نور اُتارا

مکہ میں رسالت کی بچھائی گئی مسند
پیدا ہوئے ہاشم کے گھرانے میں محمدؐ

اِس طرح دُلہن بھی کوئی دیکھی نہ سنورتی
مکھڑے کی پڑی چھوٹ تو جگمگ ہوئی دھرتی

کیا جایئے کس بھیس میں کس روپ میں آیا
سنتے ہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں سایا

چھ سال میں ماں باپ جو پرلوک سدھارے
بچپن سے لڑکپن ہوا دادا کے سہارے

جب سر سے اُٹھا آپ کے دادا کا بھی سایا
اِک اور پریمی نے کلیجے سے لگایا

بچوں سے زیادہ یہ بھتیجے پہ فدا تھے
پالا ابو طالبؑ نے جو حضرت کے چچا تھے

چھوٹے ہی سے سن میں تھیں سمجھ بوجھ کی باتیں
کہتے تھے بڑے سوچ میں دن ہوں کہ ہوں راتیں

دایہ کی طرح سب کی نگاہوں میں بھلا تھا
یہ چار برس گھر میں حلیمہ کی پلا تھا

سُندر تھا جو ہر کام تو ہر بات تھی بالا
دایہ کو یہ اچرج تھا کہ بچہ ہے نرالا

بے وقت نہ کھایا کبھی، بے وقت نہ سویا
مچلا نہ کبھی دودھ کے کارن نہ وہ رویا

اِس چاند میں آنکھوں نے کوئی کھوٹ نہ پائی
جو من کی صفائی تھی، وہی تن کی صفائی

بھولے سے کبھی اپنی بڑائی نہ جتائی
بیٹوں کو حلیمہ کے سمجھتا رہا بھائی

باتیں نہ گھمنڈی کبھی ہردے میں سمائیں
یوں ساتھ دیا اُن کا کہ بھیڑیں بھی چرائیں

بچوں کی طرح اُس نے کوئی کھیل نہ کھیلا
اُس کے لیے دنیا میں تماشہ تھا نہ میلا

گاہک تھا وہ ہر آن غریبوں کی خوشی کا
سنسار میں دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا

بیتا وہ لڑکپن کا سمے آئی جوانی
انسان کے جیون کی گھڑی سب سے سُہانی

نردوش تھی جو پھول کی چندن کی طرح سے
جو پاک رہی صبح کے دامن کی طرح سے

ستونت تھا ایسا جسے دُشمن نے بھی مانا
صادق اُسے بچپن سے ہی کہتا تھا زمانا

نیکی نے بچایا تھا جوانوں کے چلّروں سے
وہ دور ہی رہتا تھا بُرائی سے بُروں سے

نربل کو بھی سکھ ہو، اِسی اُلجھن میں پڑا تھا
ودھوا سے کیا بیاہ کہ پُن اِس میں بڑا تھا

سَرپنچ بنا قوم کا جھگڑا بھی چُکایا
دھرتی کو بڑی سخت لڑائی سے بچایا

اَن جُھل کے لیے کرنا ہی پڑتا ہے یہ کنتھا
بیوپار بزرگوں کی طرح اُس کا چلن تھا

اُبھری ہوئی تھی ہاتھ میں ایمان کی ریکھا
بیوپار میں ایسا کوئی دھرمی نہیں دیکھا

کچھ دن میں نئی پیار کی صورت نظر آئی
پیدا ہوا اِک سب سے بڑا اُس کا فِدائی

اِک تاروں بھری رات نے آنچل جو سمیٹا
چوتھا ابو طالبؑ کو ملا چاند سا بیٹا

کعبہ میں ہُوا جس کا جنم یہ وہ بَلی ہے
اللہ کے گھر میں ہُوا پیدا کہ علیؑ ہے

گھر اُس کا چلن اُس کا وہی ذات وہی ہے
جو بات محمدؐ کی ہے ہر بات وہی ہے

جنتا کی بھلائی میں بہت رنج سہے ہیں
ہر کام میں اُن دونوں کے دل ایک رہے ہیں

جن باتوں میں تھی کھوٹ بہت اُن سے پرے تھے
بھولے سے نہ کی مورتی پوجا وہ کھرے تھے

دِل جس سے ملے ایسا نہ تھا میل کسی سے
لاکھوں میں محمدؐ کو محبت تھی علیؑ سے

جی لگتا تھا بستی سے الگ شہر سے باہر
استھان بنا رکھا تھا اِک غار کے اندر

جو قوم تھی وہ پاپ کے چکر میں پڑی تھی
انساں ہے کُرستے پہ یہ فکر اس کو بڑی تھی

کیا کشٹھ کی بھرمار ہے اپرادھ کا ریلا
بیٹھا وہ یہی سوچتا رہتا تھا اکیلا

کرتا تھا ہر اک اپنے قبیلے کی بڑائی
بے بات بھی ہوجاتی تھی آپس میں لڑائی

بدلہ کا لگا روگ تو کم ہی نہیں ہوتا
دادا کی جگہ لڑنے کو تیار ہے پوتا

آنند یہودی ہے جو مینہ سود کا برسے
عیسائی ہیں بھٹکے ہوئے عیسیٰ کی ڈگر سے

کچھ لوگ اسے اپنی سمجھتے ہیں جو بیٹی
دھرتی میں دبا دیتے ہیں پیدا ہو جو بیٹی

انسان نے انساں کا بنایا ہے یہ کیا حال
ہے جانوروں سے بھی غلاموں کا بُرا حال

کس اُور ہے سنسار کا بہتا ہوا دھارا
نیکی سے ہوسمبندھ تو مشکل ہے گزارا

کرتے ہی نہیں فرق بُرے اور بھلے میں
اوقات گزرتی ہے شراب اور جوئے میں

کب تک یہی ٹیائے کا بیوپار رہے گا
کب تک یہ اَدھا دُھند سا چار رہے گا

دن رات غریبی ہے ہیری کا نوالا
آنکھیں ہیں مگر کوئی نہیں دیکھنے والا

اِک روز اِسی دھیان میں اوڑھے ہوئے چادر
چُپ چاپ وہ لیٹا ہوا تھا غار کے اندر

دنیا کو بدلنے کا چلن سوچ رہا تھا
انسان کی مکتی کے جتن سوچ رہا تھا

جیسے کبھی گرمی میں بڑی پیاس لگی ہو
سامان نہ ہو کوئی، مگر آس لگی ہو

دُہرا ہی رہا تھا یہ کہانی ابھی مَن میں
پیدا ہوا اک بھاؤ نیا من کی لگن میں

جیسے کوئی جاگے ہوئے کو اور جگادے
لو جیسے کوئی پیار کے دیپک کی بڑھا دے

اِس آن میں جبریلؑ فرشتے کی زبانی
دھرتی پہ سُنی اُس نے یہ آکاش کی بانی

اے کملی میں لپٹے ہوئے اُٹھ ذکرِ خدا کر
دُنیا کو جگا دین کا پیغام سُنا کر

سب اُس کے سنگھاسن ہیں وہ پربت ہو کہ رائی
بندوں کو بتا پالنے والے کی بڑائی

گھر اپنے چلا سُن وہ کے یہ کام کی آواز
ہر اُور سے پیدا ہوئی پرنام کی آواز

اِک ایک نے ترلوک دھنی کہہ کے پکار
جنگل نے پہاڑوں نے نبیؐ کہہ کے پکارا

نعت

(6)

گروہِ انبیاؑ کے سیّدو سردار کیا کہنا
رئیس کاروانِ عالمِ انوار کیا کہنا

دو عالم پر ہے قبضہ احمدؐ مختار کیا کہنا
ترا قرآن کیا کہنا تری تلوار کیا کہنا

وہی ہے صحنِ مسجد اور وہی قصرِ حکومت ہے
خدائے پاک کے گھر میں ترا دربار کیا کہنا

شبِ اسری کی محفل تھی نیاز و ناز کی محفل
وہ آدھی رات اور وہ عالمِ بیدار کیا کہنا

تجھے دیکھا جن آنکھوں نے محبت کی نگاہوں سے
وہ آنکھیں اے زہے قسمت ترا دیدار کیا کہنا

جہاں میں سب سے پہلے تو پیامِ امن لایا تھا
مساوات و محبت کے علم بردار کیا کہنا

تجھے دولت حکومت عیش سب دیتی رہی دنیا
مگر دنیا میں باقی ہے ترا انکار کیا کہنا

ترا ہر اک عمل صلِ علیٰ حسنِ عمل ٹھہرا
حدیثِ دوست کہلائی تری گفتار کیا کہنا

چراغِ عقل روشن تیری انگلی کے اشارے سے
ترے انفاس کی خوشبو سے ہے گلزار کیا کہنا

مصاحب تیرے پیغمبرؑ فرشتے لشکری تیرے
سپہ سالارِ اعظم حیدرؓ کرار کیا کہنا

ذبیح اللہ شامل تیرے اسلافِ مقدس میں
شہیدِ کربلا ہے تیرا ورثہ دار کیا کہنا

مجھے بھی ان گرفتاروں میں لکھ لے کاتبِ قدرت
پیمبرؐ ہیں اسیرِ گیسوئے خم دار کیا کہنا

فضائے عرش میں اے نجم رہتا ہے دماغ اپنا
فرازِ عرش سے اترے ہیں یہ اشعار کیا کہنا

نعت

(7)

جان ہے تیری امانت، دل برائے مصطفےٰؐ
مجھ میں میرا کچھ نہیں ہے اے خدائے مصطفےٰؐ

فکرِ جنت چھوڑ اے نا آشنائے مصطفےٰؐ
جہتِ عارف ہے احساسِ ولائے مصطفےٰؐ

اتباعِ مصطفےٰؐ کر اے گدائے مصطفےٰؐ
بھیک مانگے سے نہیں ملتی رضائے مصطفےٰؐ

یہ زمیں کے ساکنوں کی پستیِ تخئیل ہے
عرش تک سمجھی ہے دنیا منتہائے مصطفےٰؐ

کون مرسل یوں ہُوا راہِ خدا میں گام زن
ہر مصیبت کی روش پر مسکرائے مصطفےٰؐ

دونوں عالم کے خزانوں پر تصرف تھا مگر
تحفۂ دردِ محبت لے کے آئے مصطفےٰؐ

مرحبا اے ریگزارِ یثرب و بطحا تجھے
تیرے بوسے اور دامانِ قبائے مصطفےٰؐ

شرع کا ہر مسئلہ ہے علم و حکمت کو قبول
فطرتِ انسانیت ہے ہم نوائے مصطفےٰؐ

اے اسیرِ فکر تفسیرِ دو عالم ہم سے پوچھ
نقشِ سجدہ ایک ہے اک نقشِ پائے مصطفےٰؐ

صبح نے آکر جو اُلٹا شامِ ہجرت کا نقاب
مرتضےٰؑ تھے سبز چادر میں بجائے مصطفےٰؐ

چار پشتوں سے مجھے حاصل ہے یہ عزو شرف
نجم فطرت ہے مری مدح و ثنائے مصطفےٰؐ

○

نعت

(8)

کلمہ کو کیوں کر نہ ہوں شیدائے آلِ مصطفیٰؐ
کوئی بد قسمت ہی چاہے گا ملالِ مصطفیٰؐ

اللہ اللہ منزلِ بذل و نوالِ مصطفیٰؐ
خالِ رُخسارِ شریعت ہے بلالِ مصطفیٰؐ

کاتبِ قدرت مری جمعیتِ خاطر تو کر
لکھ دے میرے نام پر آشفتہ حالِ مصطفیٰؐ

اس کا ہر مخلص مسلماں سر سے پا تک ہے کمال
کس کا منہ ہے جو کرے ذکرِ کمالِ مصطفیٰؐ

بدر سے تا نہرواں چمکی ہے تیغِ حیدریؓ
فتنہ گر دُنیا نے دیکھا ہے جلالِ مصطفیٰؐ

حشر تک فکر آفریں ہے ذہنِ انساں کے لیے
عترت و قرآں متاعِ لا زوالِ مصطفیٰؐ

عارفوں کے دیدہ و دل کو جو نسبت ہو تو ہو
سب کی قسمت میں کہاں خواب و خیالِ مصطفیٰؐ

رحمتِ عالم خلافِ امن جاسکتا نہیں
تھی دفاعی جنگ ہر جنگ و جدالِ مصطفیٰؐ

صورت وسیرت میں ہیں زہراؑ کے دونوں لاڈلے
ہم جمالِ مصطفیٰؐ و ہم خیالِ مصطفیٰؐ

خود اب قدرت نے فرمایا مشقت کم کرو
درجۂ محبوبیت پر تھا یہ حالِ مصطفیٰؐ

میرے آباء کا شرف ہے، میری فطرت کا خمیر
تجم صدیوں سے ہے فخرِ مدحِ آلِ مصطفیٰؐ

○

نعت

(۹)

محمدؐ کائناتِ دو جہاں میں کار فرما ہے
خدا کے دستِ قدرت میں ارادا ہی ارادہ ہے
ظہور اس کا نہ تھا جب تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا
ظہور اس کا ہوا جب سے اُجالا ہی اُجالا ہے
مکمل کردیا انساں کا دستورِ حیات اس نے
رسولؐ آخری ہے حرف آخر لے کے آیا ہے
بتایا اُس نے دولت کے مقابل دردِ دل لاکر
غرورِ زندگی کیا ہے شعورِ زندگی کیا ہے
خدا میں اور محمدؐ میں ہے ربطِ معنوی ایسا
تشہد میں بھی بندہ اس کو کہتے دل لرزتا ہے
قدِ زیبا پہ خلعت حُسن کا کیا راست آیا ہے
قبا محبوبیت کی ہے رسالت کا سراپا ہے
خبر کیا تجھ کو تعلیمِ محمدؐ مصطفاؐ کیا ہے
بہ حسن احتیاط ایک امتزاجِ دین و دنیا ہے
اخوت کی بنا ڈالی اُسی نے بزمِ ہستی میں
کسے معلوم تھا انسانیت کا کیا تقاضا ہے
شبِ اسریٰ حجابِ قدس اور قوسین کی منزل
یہ تعبیرات میں ساری حقیقت کی خبر کیا ہے
وہ شمعِ طور کی تنویر کیا خاطر میں لائیں گے
جن آنکھوں نے قدِ آدم خدا کا نور دیکھا ہے

نظر مصروفِ غور و فکر تیور انقلابی ہیں
نئے عنوان سے پیشِ نظر دنیا کا نقشا ہے
کوئی خامی نظر آئی نہیں دستور میں اس کے
بہت دیکھا حکومت نے بہت حکمت نے سمجھا ہے
کسی کو فکر امانت کی نہیں صبح و شبِ ہجرت
امانت دار ایسا دشمنوں کو بھی بھروسا ہے
خدا رکھے محبت اس کی یاد اُس کی خیال اُس کا
عبادت ہے یہی جس میں دلِ مومن دھڑکتا ہے
بشر ہونا ہے تیرا مشتبہ خیرالبشر ہے وہ
اسیرِ سہو و نسیان تو اُسے اپنا سا سمجھا ہے

نعت

(10)

کیا نعت میں لے نغمے کی بڑھی سرکار دو عالم صل علیٰ
قدرت کی زباں بھی بول اٹھی سرکار دو عالم صل علیٰ

کیا قلب و زباں پر قدرت تھی سرکار دو عالم صل علیٰ
بے وحی الٰہی بات نہ کی سرکار دو عالم صل علیٰ

تشکیل ہوئی تنظیم ہوئی ترتیب ہوئی تکمیل ہوئی
کیوں ختم نہ ہو پیغامبری سرکار دو عالم صل علیٰ

محبوب نہ تھا بندوں میں کوئی اللہ کے گھر میں تھی یہ کمی
کیا عبدِ واحد کی بات نبی سرکار دو عالم صل علیٰ

کچھ عرش ہی پر موقوف نہ تھا معراج تھی تجھ کو فرش پہ بھی
معراج کی تجھ سے شان بڑی سرکار دو عالم صل علیٰ

جو دینِ خدا کی دشمن تھی ہر بات پہ جس سے جنگ ہوئی
اِک دن وہی دنیا چیخ اٹھی سرکار دو عالم صل علیٰ

دونوں پہ حکومت ہے تیری اجسام پہ بھی ارواح پہ بھی
بے اذن کسی نے سانس نہ لی سرکار دو عالم صل علیٰ

اِک عمر کے قیدی چھوٹ گے سب کفر کے بندھن ٹوٹ گئے
تکبیر کی ایسی چوٹ پڑی سرکار دو عالم صل علیٰ

تلوار اٹھے یا دستِ دعا دونوں میں ہے شامل حق کی رضا
مسجد کی روش میدان میں بھی سرکار دو عالم صل علیٰ

ایثار نے تجھ سے درس لیا قدموں پہ گرے تسلیم و رضا
یہ حسن عمل کی شان رہی سرکار دو عالم صل علیٰ
انسان کی صف میں شامل بھی ادراک سے بالا منزل بھی
یہ سرِ خفی یہ نصِ جلی سرکار دو عالم صل علیٰ
تا عرش یہ نغمے جائیں گے سکانِ فلک دہرائیں گے
کہنے دو مجھے اے تجم ابھی سرکار دو عالم صل علیٰ

نعت

(11)

نمازِ درد دل پڑھنی ہے پیغمبرؐ کی مدحت سے
وضو کر اے شعورِ فکر شبنم کی لطافت سے

مئے حُب نبیؐ کو واسطہ ہے میری فطرت سے
وہ کوئی اور ہوں گے جن کو مل جاتی ہے قسمت سے

بنا کر حق نے سوئے مصطفیٰؐ دیکھا محبت سے
خوشا ذوقِ نظر صورت ملا دی اپنی صورت سے

مسلّم ہے خدا کی بے نیازی اس کو کیا کہئے
جسے پیدا کیا اپنے تعارف کی ضرورت ہے

یہ وہ انسان اعظم ہے شکست فاش دی جس نے
حکومت کی محبت کو محبت کی حکومت سے

نگاہِ اہلِ ظاہر میں وہ اُمی تھا مگر ایسا
کتابِ زیست میں اصلاح دی ہے دستِ قدرت سے

ملا تختِ نبوت جب یتیمِ آلِ ہاشم کو
خدائی ہوگئی محکم اس انسانی ریاست سے

کیا آدم کو پیدا جس خدا نے اس کا کیا کہنا
مگر مجھ کو محبت ہے خدائے آدمیت سے

نگارستانِ ہستی کی فضا جس نے بدل ڈالی
بساطِ کافری جس نے اُلٹ دی دستِ ہمت سے

ازل کے دن سے جس کی انگلیاں ہیں نبضِ فطرت پر
مزاجِ زور و زر بدلا ہے جس نے علم و حکمت سے
بہت دولت لٹائی جس کے ہاتھوں نے غریبوں میں
مگر ہونے دیا دامن کو آلودہ نہ دولت سے
ضرورت ہی نہ رکھی پھر کسی مرسل کے آنے کی
سنایا اس نے خالق کا پیام ایسی نصاحت سے
حیاتِ جاوداں کی اس نے ہی تفسیر کی ورنہ
تعارف ہی کسے تھا دردِ دل کی قدر و قیمت سے
نہ تھا سجدہ کا موقف درجۂ محبوبیت پاکر
اُسے بھی ذوقِ سجدہ تھا مگر سجدہ کی قسمت سے
مسلمانو صلوٰۃ و صوم کا انجام کیا ہوگا
جو بیگانہ رہا دل مصرفِ مہر و محبت سے
جو عالم گیر پیغامِ اخوت لے کے آیا تھا
اُسی کی قوم ہے محروم احساسِ اُخوت سے

نعت

(12)

حرا کا غار ہے فانوس کس شمعِ حقیقت کا
کہ ہر ذرّہ ہے سجدے میں نگارستانِ فطرت کا
فضا مخمور بھی ہے مست بھی ہے، منتظر بھی ہے
کہ پھر پہلو بدلنے کو ہے منظر اس کی قدرت کا
جواں یہ کون ہے شانوں پہ لٹکائے ہوئے گیسو
خلیل اللہ کی صورت ستارہ کنجِ عزلت کا
اُبلنے ہی کو ہیں ہر سانس سے چشمے ہدایت کے
سمندر دل میں موجیں مارتا ہے علم و حکمت کا
تعمق کہہ رہا ہے فکر ہے تعمیرِ قومی کی
نگاہیں کہہ رہی ہیں اہل ہے تنظیمِ ملت کا
تفکر تبصرہ کرتا ہے انسانی خصائل پر
زہے عہدِ جوانی شغل ہے یہ کنجِ خلوت کا
جبیں کا نور چھپ سکتا نہیں گردِ یتیمی سے
تجمل منہ سے بول اُٹھتا ہے شایانِ ریاست کا
سراپا جوہرِ قابل فقط اب دیر ہے اتنی
کہ دستِ غیب سر پر تاج پہنادے رسالتؐ کا
ہوئی ہے خاتمے کی مہر اس کے نام نامی پر
یہی ہے وہ نگیں جو اہل تھا مہرِ نبوتؐ کا
نہ چھیڑو مبحثِ معراج روحانی و جسمانی
دکھاؤ آئینہ جویائے حق کو اس کی سیرت کا

وہ آیا تھا جہاں میں رحمتہ للعالمینؐ بن کر
جسے تم جسم سمجھے ہو یہ پردہ تھا شریعت کا
ظہور اس کا نہ تھا تقسیم ملک و مال کی خاطر
اُسے دنیا میں جوہر بانٹنا تھا آدمیت کا
اُسے کرنا تھا رشتہ عبد کا معبود سے محکم
کہ اُس کو علم تھا انساں کی کمزوری فطرت کا
وہ اک نورِ مجسم تھا مگر اے ابن آدم سُن
تری سیرت بنانے کو اُٹھایا بار صورت کا
ہمیں اس فلسفے کے پیچ و خم سے تھا رہا کرنا
دکھانا تھا ہمیں اک راستہ سیدھی شریعت کا
بساطِ فقر موزوں ہو نہ ہو اس کے لیے لیکن
جتانا تھا اسے معیار دنیا کی حقیقت کا
غریبِ قوم بن کر بن گیا ڈھارس غریبوں کی
امیرِ خلق ہوکر بھیس بدلا اس نے غربت کا
مجاہد کردیا خونخوار خوں آشام قوموں کو
خدا کی راہ میں مصرف کیا اس نے شجاعت کا
نظر کے سامنے ہر وقت قانونِ الٰہی ہو
فریضہ رکھ دیا مسلم پہ قرآں کی تلاوت کا
وفا پیشہ غلاموں کو جگہ دی اپنے پہلو میں
دکھایا اس نے زینہ دین کی خدمت سے عظمت کا
اُسے قانونِ فطرت پر لگانا تھا خیالوں کو
کہ دنیا دیکھ لے اسلام ہے قانون فطرت کا
اُسے انسان کے اخلاق کی تکمیل کرنی تھی
علیٰ آفاق میں پہلا ثمر تھا اس کی محنت کا

○

نعت

(13)

محمدؐ کی حقیقت دونوں عالم کی رگِ جاں ہے
وہی مقصودِ خلقت ہے وہی مفہومِ انساں ہے

وہیں تک فکر پہنچے گی جہاں تک عقلِ انساں ہے
محمدؐ کو محمدؐ تک سمجھ لے کس کا امکاں ہے

خطابِ رحمتہ للعالمینؐ اُس کو ہی شایاں ہے
رسالت اسکا منصب ہے محبت اسکا احساں ہے

میانِ آب و گل تھا آدمی جب وہ پیمبر تھا
مشیت ہی میں تھا اسلام وہ جب سے مسلماں ہے

چراغِ طور روشن بھی ہوا گُل بھی ہوا لیکن
دلِ عارف میں اب تک اُس کے جلوہ سے چراغاں ہے

عبودیت کے پیکر میں وہ ہے روحِ خداوندی
فرشتے اب کہیں سمجھے ہیں کیا مفہومِ انساں ہے

خدا کے گھر میں اُس نے فقر کی مسند پہ شاہی کی
جہادِ زندگی میں کون ایسا مردِ میداں ہے

اُسی نے خاک کے پتلوں کو چونکایا یہ سمجھا کر
کہ پیکر میں خدا کی اک امانت روحِ انساں ہے

وہ لایا صورتِ قرآں میں قانونِ حیات ایسا
کہ حیرت میں ہے منطق فلسفہ سر درگریباں ہے

جلالت کوئی دیکھے اُس یتیمِ آلِ ہاشم کی
رئیسِ محفلِ قدسی امیرِ بزمِ امکاں ہے

اُسی کی حق پناہی سے ہوا ہے دسترس اتنا
کہ آج افلاس کا ہاتھ اور دولت کا گریباں ہے

خود اپنا نور، نورِ بندگی، نورِ خداوندی
شبِ معراج اسکی غیرتِ صبحِ درخشاں ہے

نہ آتا کس طرح وہ رحمتہ للعالمیں بن کر
تبسم جس کا ہلکا سا بہارِ صد گلستاں ہے

محبت اُس کی دل میں داغِ دل اُسکی محبت میں
چراغاں در چراغاں ہے بہاراں در بہاراں ہے

پیامِ درد اسکا عام ہے اس بزمِ ہستی میں
جو سہہ جائے وہ پتھر ہے تڑپ جائے تو انساں ہے

کیا تقویٰ کو شامل اس نے تہذیب و تمدن میں
یہ نعمت گر نہیں تو منعم و مزدور یکساں ہے

لیا ہے درسِ مرگ و زیست جس نے اسکی ہمت سے
اُسے جینا بھی آساں ہے اُسے مرنا بھی آساں ہے

دلیل اور اس سے بڑھکر ہوگی کیا ختمِ نبوت کی
وہی قانونِ فطرت ہے وہی آئینِ قرآں ہے

دیا تھا اُس نے وہ درسِ مساواتِ رواداری
کہ ہر اک قوم میں اب روحِ آزادی کی جولاں ہے

خدا کا نام لے کر ساری دنیا کے خلاف اٹھا
وہ پہلا رزم گاہِ حریت کا مردِ میداں ہے

اُسی خوانِ کرم کی ریزہ خوار اقوام عالم ہیں
اُسی کا اک عطیہ اشتراکی درود درماں ہے

بنالے وضع جو اس کی مسلماں ہے وہ صورت میں
جو اُسکی راہ پر چلتا ہے اُسکا دل مسلماں ہے

کبھی قوسین نے بوسے دیئے تھے جس کے گوشوں کو
جو اُس دامن سے ہے لپٹا ہوا جنت بداماں ہے

جگہ اسلام نے کرلی خزاں آباد عالم میں
لہو اُس کے جگر کوشوں کا مفہوم بہاراں ہے

خدا بھی ایک ہے، قرآں بھی، قبلہ بھی، پیمبر بھی
قیامت ہے کہ پھر ملت کا شیرازہ پریشاں ہے

قدم آگے نہیں بڑھتے مقامِ جاں نثاری میں
زبانیں کہہ تو دیتی ہیں مدینہ کوئے جاناں ہے

غلط مصرف کیا ہے اُسکے فیضِ علم وحکمت کا
دلوں میں ہے اندھیرا اور آنکھوں میں چراغاں ہے

طلب یکساں ہے لیکن فرق یہ ہے رندوزاہد میں
کوئی عشق نبیؐ میں نالہ کش کوئی غزلخواں ہے

ہم اُس کا ذکر سن کر دیکھتے ہیں زندگی اپنی
وہ اب تک گنبد خضرا سے ملت کا نگہباں ہے

ہمیں جذبات کی پستی پہ ہے اب سوچنا واجب
جو فاراں کی بلندی سے اٹھا تھا یہ وہ طوفاں ہے

خبر کیا متصل تھا کسقدر وہ ذات واجب ہے
یہ سنتے ہیں کہ نام اُسکا سرِ فہرستِ امکاں ہے

بہت سے نفس بالا کردیئے عیش دو عالم سے
یہ عالم اُس نے جب دیکھا بہت انسان ارزاں ہے

دیا جس پُرخطر صحرا میں درسِ معرفت اُس نے
وہی تہذیب کا اخلاق کا پہلا دبستاں ہے

بھلا سکتے نہیں دل اُس کی تحریکِ اخوت کو
چراغ انسان کے احساس کا بیشک فراواں ہے

بہت حیران تھی دنیا اس اندازِ حکومت پر
کوئی قصرِ حکومت ہے نہ حاجب ہے نہ درباں ہے

بتایا قوم کو اُس کے سپہ سالارِ اعظم نے
بشر کی موت اسکی زندگی کی خود نگہباں ہے

ابھی انسان سمجھا ہی نہیں تجویز امن اُس کی
ابھی دنیا کے ہر اک موڑ پر حاقت رجز خواں ہے

اُسے یارب نہ ہو معلوم حالت عجم کے دل کے
غمِ اسلام کم ہے اور غمِ دنیا فراواں ہے

○

نعت

(14)

تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے
تھا ایک ہو کا عالم میں تھا نہ میری ہستی
بے رونقی نہ رونق ویرانہ تھا نہ بستی
گویائی، نے خموشی، ہشیاری تھی نہ مستی
تھا کفر اور نہ ایماں ناحق نہ حق پرستی
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

تاریک تھی سراپا جب تک فضائے عالم
تھی کائنات جب تک مصروف خوابِ محکم
تھی بحر و بر کی ہستی جب ایک لفظِ مبہم
ہابیل کا نہ غم تھا جب تک نصیبِ آدم
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

تھے حسن و عشق پنہاں آئینہ تھا نہ حیراں
ساکن تھی بزمِ امکاں شہرت تھی اور نہ خواہاں
غم تھا نہ غم کے ساماں، شادی نہ اُس کا عنواں
دل تھا نہ دل کے ارماں، تھا درد اور نہ درماں
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

جب خاک کے پریشاں ذرّے سمٹ رہے تھے
جب آب و گل کے خلعت روحوں کو بٹ رہے تھے
جب نقشبندِ قدرت کایا پلٹ رہے تھے
فطرت کی سادگی سے جب رنگ چھٹ رہے تھے
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

جب گل فروشیوں کی مٹی نکھر رہی تھی
سو شکل سے زمیں کی دولت اُبھر رہی تھی
ترکیبِ عنصری کی دنیا سُدھر رہی تھی
اک اک ورق میں قدرت سو رنگ بھر رہی تھی
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

تقسیمِ عام نے دی جب شمع کو خموشی
پروانہ کو بتائے آئینِ عشق کوشی
دی گل کو بے نیازی بلبل کو دل فروشی
تہذیب نے سکھائی جب ہم کو ستر پوشی
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

آدم کی آنکھ نے جب دیکھیں تری ادائیں
طوفانِ نوحؑ میں تھیں جب مضطرب فضائیں
جب قوم عاد بگڑی اُلٹی چلیں ہوائیں
جب مصرِ کی زمیں پر نازل ہوئیں بلائیں
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

مچھلی کے پیٹ میں تھا یُونسؑ کا جب کہ مسکن
پہنچے جب آسماں پر ادریس اور سوزن
بہرِ خلیل جس دم آتش بنی تھی گلشن
ابن خلیل کی تھی جب زیرِ تیغ گردن
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

داؤد کا تھا نغمہ جب دل ہلانے والا
موسیٰ کو غش جب آیا جب ہوش نے سنبھالا

عیسیٰ کی قم کا تھا جب دنیا میں بول بالا
فاراں کی چوٹیوں پر جس دم ہُوا اُجالا
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

کعبہ کو جب بچانے آیا خدا کا لشکر
اصنام کی خدائی جب تھی حرم کے اندر
میدانِ بدر میں جب چمکی تھی تیغِ حیدرؑ
بطحا کے چاند سے تھے جب دو جہاں منور
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

تکمیل ہو رہی تھی انسانیت کی جس دن
اک سیل بہ رہی تھی نورانیت کی جس دن
نعمات بٹ رہی تھیں عرفانیت کی جس دن
بنیاد اُس نے رکھی وحدانیت کی جس دن
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

ممنون صد تماشا ہے تیری زندگی بھی
کچھ رشک بھی ہے مجھ کو حیرت بھی بیخودی بھی
تیرے نصیب میں تھی رحمت کی یہ گھڑی بھی
اللہ تو نے دیکھا وہ نورِ ایزدی بھی
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

اے کاش میں بھی پاتا وہ وقت وہ زمانہ
مٹ کر بھی بنتا میں خاکِ آستانہ
مثلِ اویسؓ ہوتا زندہ مرا فسانہ
پھر دل سے کیوں نکلتا یہ دل شکن ترانہ
تو جب بھی جلوہ گر تھا اے خوشنما ستارے

○

نعتِ فارسی

(تضمین بر اشعار حضرت تمنّا سندیلوی مرحوم)

(15)

اے نورِ چراغ آفرینش اے روحِ نفاخ آفرینش
اے نازِ وماغ آفرینش اے صدرِ اوتاغ افرینش
اوّلِ گلِ باغ آفرینش

منشائے محبت تو باشد مقصودِ حکایت تو باشد
موضوعِ نبوتؐ تو باشد تبلیغِ رسالتؐ تو باشد
مفہومِ بلاغ آفرینش

از روئے تو صبح یافت تنویر و ز زلفِ تو شب نمودہ تحریر
تو جاں مصوری بہ تصویر از شمعِ رُخ تو دستِ تقدیر
بر کرو چراغ آفرینش

یک صحبتِ مختصر نہ بودے ایں شام کجا سحر نہ بودے
ما ہیچ و زما خبر نہ بودے مقصود توئی دگر نہ بودے
گم گشتہ سراغ آفرینش

نظم تو نظامِ اہل دانش آئین تو لایق پرستش
فکر تو پناہ سعی و کوشش شرع تو فروغ چشمِ بینش
دینِ تو فراغ آفرینش

سرمست جمالِ حسنِ فطرت مخمور کمالِ صنع و حکمت
اے در نگہے یمِ محبت از صافیِ بادۂ ولایت
در نشہ دماغ آفرینش

چارہ گرِ دردِ صورتِ تُست درمان مرضِ حکایتِ تُست
ایں امن و سکون بدولت تست قربان توام کہ رحمتِ تُست
مرہم نہِ داغ آفرینش

○

نعت

(16)

کیا کام کیا فکر نے مدحِ نبویؐ میں
اور آگ لگادی ہے مری تشنہ لبی میں

وصلِ ابدی میں ہے نہ سحرِ ازلی میں
احساس جو ہے عشقِ محمدؐ کی خودی میں

آزاد ہوں میں وسعتِ عشقِ نبویؐ میں
الجھے ہوئے ہیں تنگ نظر بولہبی میں

یہ نام محمدؐ یہ اندھیرے کا اُجالا
سرنامۂ آیات ہے آیاتِ جلی میں

صدقے صنم ہند و صنا دیدِ عجم ہیں
اللہ کی قدرت ہے لباسِ عربی میں

اک فیصلہ کن شان سے بھیجا ہے خدا نے
قرآن بھی تلوار بھی ہے دستِ قوی میں

مذموم تمدن کے صنم توڑے ہیں اس نے
اک اور اضافہ یہ کیا بت شکنی میں

تکوینی ہے علم اس کا جو کہلاتا ہے اُمّی
یہ بات نہ آئے گی کبھی ذہنِ غبی میں

اک نقطۂ توحید سے ہے ربط دو عالم
کونین سے آگے ہے وہ اس نکتہ رسی میں

کیا ہوتا ہے مافوقِ بشر سوچ رہا ہوں
شامل وہ نہیں سہو وخطاے بشری میں

تفریق پہ کس نے مجھے مامور کیا ہے
کیوں فرق کروں عشقِ خدا عشقِ نبیؐ میں

خالق کی مشیت پہ بھی کر ہی لیا قبضہ
کیا آگئی انسان خدا ساز کے جی میں

اے عجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

○

باب ہشتم

قصاید اور منقبتیں

-1	نجم آفندی کی منقبت	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
-2	منتخب اشعار	قصاید اور منقبتیں
-3	فہرست کل قصاید اور منقبتیں	(81) عدد
-4	کل اشعار	(2519)عدد

فہرست قصاید اور منقبتیں

شمارہ	عنوان	مطلع	تعداد شعر	مدح	صفحہ نمبر
1	امیر المومنینؑ	نقابِ رخ ہٹی ایمان کے عہدِ منوّر کی	(31)	حضرت علیؑ	813
2	سیّدہ کونین	اے کہ ہستی ہے تری نازِ رسولِؐ بطحا	(33)	حضرت فاطمہؑ	814
3	شہزادۂ صلح	عالمِ خلق پہ چھائی ہوئی وہ کن کی صدا	(40)	حضرت امام حسنؑ	816
4	سید الشہداؑ	ذوقِ طاعت چاہتا ہے ایک سجدا اے حسینؑ	(30)	حضرت امام حسینؑ	818
5	شعاعِ لرزاں	چو بر شاخِ نازک گلِ تر بلرزد	(14)	حضرت علیؑ	819
6	نجم و شمس	ایں جادۂ تسلیم کہ بمود علی بود	(12)	حضرت علیؑ	820
7	بانگِ درا	فطرت خدا کے راز اگر برملا کہے	(37)	حضرت علیؑ	821
8	پارۂ نور	اے وہ ہستی کہ ترا عکسِ نظر تھا سرِ طور	(17)	حضرت علیؑ	823
9	حسین علیہ سلام	اے کہ تیرے خیال میں نشہ جامِ کوثری	(17)	حضرت امام حسنؑ	824
10	عریضہ	ایک ترا جمال ہے رونقِ بزمِ عنصری	(15)	حضرت امام مہدیؑ	825
11	جانِ بہار	نمودِ عالم ہوتھی فضائے تیرۂ تار	(98)	حضرت علیؑ	826
12	روحِ سخن	حُسنِ ازل تھا فقط غیرتِ صدانجمن	(116)	حضرت علیؑ	830
13	صبحِ لطیف	مسجودِ عقل و ہوش ہی فطرت کو وہ جوہر دیا	(112)	حضرت علیؑ	836
14	جلوۂ معصوم	قوتِ تخیل سے کچھ کام لے کر دیکھئے	(123)	حضرت علیؑ	841
15	ترتیبِ مناظر	کچھ ایسا مضطرب ہے ذرّہ ذرّہ دشتِ فاراں کا	(92)	حضرت علیؑ	846
16	شمعِ حقیقت	پچھلے سے تلاطم ہے دریا میں قیامت کا	(38)	حضرت علیؑ	850
17	نغمۂ کوہسار	اور بڑھیں گی نزہتیں گلشنِ روزگار کی	(118)	حضرت علیؑ	852

شمارہ	عنوان	مطلع	تعداد شعر	مدح	صفحہ نمبر
18	نازِ آفرینش	زہے لوح و قلم ایسے بھی نقطہ تھے مقدر میں	(77)	حضرت علیؑ	858
19	زمزمۂ روح	شبِ دراز میں نہاں جہانِ پُر بہار ہے	(77)	حضرت امام حسینؑ	861
20	شاہزادۂ نور	نہ ہوں مغرور نظریں وہم عرفانِ حقیقت سے	(62)	حضرت امام مہدیؑ	865
21	طرحِ نو	تولّا آج کیوں ہنگامہ زا ہنگامہ پرور ہے	(57)	حضرت امام مہدیؑ	868
22	ہمہمہ	زمانہ جنگ کا ہے مسئلہ زور آزمائی کا	(60)	حضرت علیؑ	870
23	خمِ غدیر	وہ ماہِ رجب مظہرِ اسرارِ الٰہی	(53)	حضرت علیؑ	873
24	مولائی	سنی مدحِ علیؑ ہم نے ستاروں کی زبانوں سے	(8)	حضرت علیؑ	876
25	منقبت	جلوہ گر عشقِ علیؑ مرتضیٰ آنکھوں میں ہے	(9)	حضرت علیؑ	876
26	قصیدہ	دماغ و فکر و قرطاس و قلم سے واسطا سمجھا	(20)	حضرت علیؑ	877
27	منقبت	خدا کا گھر درِ دولت ہے دارائے امامت کا	(35)	حضرت علیؑ	878
28	منقبت	اندھیرا تھا اجالا ہوگیا مرضیٔ داور کا	(11)	حضرت علیؑ	880
29	عرفان ابوطالبؑ	کوئی مانے نہ مانے آج ایمان ابوطالبؑ	(11)	حضرت ابوطالبؑ	881
30	تیرھویں رجب کی رات	دیدنی تھی وقت کی صورت گری کل رات کو	(22)	حضرت علیؑ	881
31	نغمۂ مستانہ	آج گھٹا کیا جھوم کے اٹھی	(26)	حضرت علیؑ	883
32	منقبت	اگر وہ خود نہ دلوں کے نگاہباں ہوتے	(15)	آلِ محمدؐ	884
33	منقبت	تیری خاطر نذر لایا ہوں ولائے بوترابؑ	(11)	حضرت علیؑ	885
34	منقبت	جب سے درِ علیؑ پر فخرِ گدا گری ہے	(15)	حضرت علیؑ	886
35	منقبت	اس ذات کی مدحت میں رواں میرا علم ہے	(14)	حضرت علیؑ	887
36	منقبت	مسکراتے ہیں نبیؐ کعبہ کا حاصل دیکھ کر	(14)	حضرت علیؑ	887
37	منقبت	اے صلِ علیٰ جلوۂ جانانہ علیؑ کا	(7)	حضرت علیؑ	888
38	منقبت	فراریوں سے ہے غفلت نہ رجزیوں سے غرض	(8)	حضرت علیؑ	889
39	قصیدہ	حُسن کی ہے جلوہ گاہ عشق میں ہوں نعرہ زن	(27)	حضرت حسنؑ	889

شمارہ	عنوان	مطلع	تعداد شعر	مدح	صفحہ نمبر
40	منقبت	پائی تھی نہ قرآں نے ابھی صورتِ فرماں	(41)	حضرت فاطمہؑ	891
41	منقبت	میرا مطلع ہے طلوعِ آفتابِ معرفت	(22)	حضرت امام حسنؑ	893
42	منقبت	اسلام کی تاریخ کا وہ عہد یگانہ	(24)	حضرت امام حسنؑ	894
43	منقبت	مرا دل فدائے امامِ حسنؑ ہے	(6)	حضرت امام حسنؑ	895
44	منقبت	صورت ہے ایک حُسن کہو یا حسنؑ کہو	(7)	حضرت امام حسنؑ	896
45	خالقِ نجات	پردہ تھا اک ازل کا زمیں تھی نہ آسماں	(70)	حضرت امام حسینؑ	896
46	قصیدہ	ساقی کی اک نظر سے اسرارِ حق ہیں روشن	(36)	حضرت امام حسینؑ	900
47	منقبت	صبر کی شمشیر والے درد و غم کے تاجدار	(12)	امام زین العابدینؑ	901
48	منقبت	صادقِ آلِ محمدؐ وارثِ خیرالانام	(11)	امام جعفرؑ صادق	902
49	فروغِ ملّت بیضا	شریعتوں کا خلاصہ ہیں جعفرؑ صادق	(12)	امام جعفرؑ صادق	903
50	منقبت	لسانِ قدرتِ یکتا امامِ جعفرِ صادق	(7)	امام جعفرؑ صادق	904
51	منقبت	اے کہ تجھ کو مہد میں آیا امامت کا پیام	(6)	امام محمد تقیؑ	905
52	مصدرِ کمال	حرامِ ناز میں نہاں سکونِ روزگار ہے	(25)	امام حجّتِ عصرؑ	905
53	عہدِ اضطراب	نقابِ رُخ الٹ دو حشر اٹھا رکھا ہے دنیا نے	(21)	امام حجّت عصرؑ	906
54	معرکہ	غضب کا معرکہ تھا اور قیامت کی صف آئی	(57)	امام حسینؑ	908
55	درشن کا سویرا	شعبان وہ اسلام کا ممدوح مہینہ	(38)	امام مہدیؑ	910
56	منقبت	اللہ رے تیری وسعت اے جلوۂ جانانہ	(11)	امام مہدیؑ	912
57	امامِ منتظر	جب توجہ آنے والے کی ادھر ہو جائے گی	(23)	امام مہدیؑ	913
58	روح کی فریاد	بدلا ہوا ہے دہر کا عنواں ترے بغیر	(21)	امام مہدیؑ	914
59	منقبت	رسوا ہو عین چوک میں اسلام کا نشاں	(34)	حضرت عباسؑ	916
60	منقبت	اسلام اے شرفِ جوہرِ شمشیر زنی	(20)	حضرت عباسؑ	917
61	قصیدہ	یہ بارگہِ عرش نشاں منزلِ عظمت	(46)	حضرت عباسؑ	919

شمارہ	عنوان	مطلع	تعداد شعر	مدح	صفحہ نمبر
62	منقبت	ثنائے ثانیِ زہراؑ میں کیا کروں تحریر	(14)	حضرت زینبؑ	921
63	منقبت	شرف کچھ کم نہیں عون و محمدؑ کی ولادت کا	(12)	حضرت عون و محمدؑ	922
64	قوم کی ماں	اے علیؑ کی لاڈلی آغوشِ زہراؑ کی پلی	(11)	حضرت زینبؑ	923
65	منقبت	آ گیا ہوں مدحِ اصغرؑ تک بہ عنوانِ حُسین	(17)	حضرت علی اصغر	924
66	منقبت	دینِ فطرت جو کرے گا استوار آ ہی گیا	(5)	حضرت علی اصغرؑ	925
67	منقبت	مظہرِ معصومیت اے فاطمہؑ کی ورثہ دار	(6)	حضرت زینبؑ	925
68	منقبت	عباسؑ ہیں نظر میں ولا کا شباب ہے	(19)	حضرت عباسؑ	926
69	منقبت	آیا مری زباں پہ جب مدح کا ترانہ	(34)	حضرت علیؑ	927
70	منقبت	حُسنِ حسنؑ کی مدح میں گزرے اگر حیات	(34)	امام حسنؑ	928
71	منقبت	حمد کی تحریک ہے جس میں وہ منظر دیکھئے	(16)	حضرت علی اکبرؑ	930
72	منقبت	داستاں اصغرؑ کی ہے تفسیرِ قرآنِ کریم	(12)	حضرت علی اصغرؑ	931
73	منقبت	کیا پوچھتے ہو شانِ علیؑ کے فقیر کی	(10)	حضرت علیؑ	932
74	قصیدہ	زبانِ کلک سے آواز بسم اللہ کی آئے	(39)	حضرت امام حسنؑ	933
75	منقبت	چار دن بھی نہ ملا آلِ نبیؐ کو آرام	(4)	حضرت ام کلثومؑ	935
76	عروس الکلام	تم تو ہوتے ہی نہ تھے آنکھ سے میری اوجھل	(54)	حضرت علیؑ	935
77	چودھویں کا چاند	ہوئی مصروفِ راحت لیلیٰ شب لے کے انگڑائی	(27)	امام مہدیؑ	938
78	زمزمہ	پھر بہار آئی ہے ساقی لا چھلکتے جام دے	(19)	غدیرِ خم	939
79	منقبت	منصور ہوا تختِ خلافت پہ جو قابض	(18)	آلِ محمدؐ	941
80	منقبت	محوِ طاعت تھے حضرتِ صادقؑ	(18)	امام جعفرؑ صادقؑ	942
81	شاعر	عجب یہ دور ہے شاعر کی زندگی کے لیے	(18)	حضرت علیؑ	943

منتخب اشعار

منتخب اشعار

صحابہ میں یہ تیری منزلت از روئے حکمت تھی — بقولِ بوعلی محسوس میں معقول تھا گویا

خورشید پلٹ آیا دروازۂ مغرب سے — قانون بدلتا ہے ان کے لیے فطرت کا

نہ تھی تیری حکومت میں ہوا سرمایہ داری کی — چراغ عافیت روشن تھا ہر مزدور کے گھر میں

یہ مطلعِ نفیس ہے کہ زمزمہ ہے روح کا — یہ طرز نو کی مدح بھی جہاں میں یادگار ہے

دلوں میں بت لیے کرتے ہیں کعبہ کی نگہبانی — تمسخر کر رہے ہیں آذری پندارِ قدرت سے

علی کعبہ میں ہیں دربار ہے مشکل کشائی کا — مسلمانوں چلو موقع ہے قسمت آزمائی کا

علی کی منقبت سے فکر بیگانہ رہی جس کی — خدا جانے وہ حمد و نعت کا مفہوم کیا سمجھا

تعجب ہے جو اس کے مرتبہ کو دوست کم سمجھے — شبِ ہجرت جسے دشمن محمدؐ مصطفیٰ سمجھا

علی کہنا زباں سے کس قدر آسان ہے لیکن — دلِ انساں تصور کر نہیں سکتا جلالت کا

جمع تھے تاآنی و عرفی ظہیر وانوری — حافظ و سعدی نظامی فرخی کل رات کو

لگائے پھرتے ہیں قرآن کو جو سینوں سے — وہ کاش صرف مودت کے نکتہ داں ہوتے

ادب نواز نہ ہوتا جو بابِ علم نبیؐ — یہ زور و شور زبان و بیاں کہاں ہوتے

خدا سے ربط نہ ہوتا بغیر عترت کے　　اگر ہزار بھی قرآن درمیاں ہوتے

صف شکن مشکل کشا اہلِ قلم معمارِ قوم　　اللہ اللہ بازوئے زور آزمائے بو ترابؑ

عام منبر سے جدا ہے میثمی منبر کی شان　　دار پر ہوتی ہے تفسیر ولائے بوترابؑ

اب نزع کی ہے ساعت اورلب پہ یاعلیؑ ہے　　جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ حرفِ آخری ہے

مولاؑ کو جانتے ہیں پہنچانتے نہیں ہیں　　آنکھوں کا دوش کیا ہے ذہنوں کی مفلسی ہے

اب خاک مل گئی ہے خاکِ درنجف میں　　وہ بندگی تھی اور یہ مفہوم زندگی ہے

توحید کی ہے محفل بدنام فرقہ بندی　　قرآں کی سورتوں میں اخلاص کی کمی ہے

میخانہ نجف سے جنت میں پہنچتے ہیں　　کیا جرم ہے محبت جس کی سزا ملی ہے

بشر کومعرفت حاصل نہ ہوگی ذاتِ حیدرؑ کی　　سمجھ لے آدمی کس طرح منزل آدمی گر کی

علیؑ کو چھوڑ کر قرآں سے ربط بے معنی　　اٹھالے وہ ضرورت ہو جسے بے روح پیکر کی

نمازیں وقت پر واجب ولا ہر وقت واجب ہے　　عبادت ہے حقیقت میں ولا آلِ پیمبرؐ کی

اِسی باعث تو پھر کوئی ہوا پیدا نہ کعبہ میں　　کہ بیٹی ہی نہیں تھی دوسری کوئی پیمبرؐ کی

تری مرضی پہ ہوا رحمتِ باری کا نزول　　اذن لے کر ترے کاشانہ میں قرآں اترا

ہے ترے دودھ کی تاثیر یہ قومی تعمیر　　اللہ اللہ ترے خونیں کفن و سبز قبا

آئے جبرئیل امیں عرش سے نسبت لے کر　　یہ وہ رشتہ ہے جہاں بیچ میں تھی وحیٔ خدا

دست و پا چوم کے عصمت نے لگائی مہندی　　چادر آیۂ تطہیر نے آنچل ڈالا

ہاشمی تیغوں کے سائے میں دلہن گھر سے چلی　　لافتا کا جو علیؑ باندھ کے آئے سہرا

باپ کے گھر سے ملا بخشِ امت کا جہیز　　دونوں عالم نے کیا حدِ ادب پر مجرا

جادۂ سلح کے رہبر حسنِ سبز قبا　　تو نے تخلیق کیا ولولۂ کرب وبلا

ہر افق پر ہے تری حُسنِ عمل کی روشنی　　تو ہی دنیا کے اندھیرے کا اُجالا اے حسینؑ

جرأت مظلوم ہو یا ہمت مزدور ہو　　تو نے کھینچا تھا یہ مستقبل کا خاکا اے حسینؑ

ہمدم جہاں میں نور میں شامل نسب میں ایک　　کس طرح کوئی تجھ کو نبیؐ سے جدا کہے

تعمیر قوم بت شکنی بخشش و عطا　　کونین کیوں نہ پھر تجھے دستِ خدا کہے

ہر سانس میں ہو بوئے ولائے ابوترابؑ　　ابھرے جو نبض ڈوب کے یا مرتضیٰؑ کہے

تجھ سے ہے نامِ حریت تجھ سے نظامِ حریت　　تو ہے امامِ حریت حُر ترا ایک لشکری

معصوم کی آغوش میں معصوم کو لاکر دیا　　دولت خدا کے گھر کی تھی دامن نبیؐ کا بھر دیا

نورِ رسالت سے ہوا نورِ امامت متحد　　اس اتحادِ حُسن نے قوموں کو یکجا کردیا

زاہد، سپاہی، فلسفی، حاکم، ولی، شاعر، ادیب　　کن مختلف اوصاف کا حق نے تجھے پیکر دیا

اب تک ہیں تیرے نام کے آفاق میں نعرے بلند　　قدرت نے جوشِ اسلام کا سب یا علیؑ میں بھر دیا

یداللہ و لسان اللہ و عین اللہ کو دیکھو　　حروفِ اولیں سے صاف ہوتا ہے علیؑ پیدا

کہتی ہے جسے فکر و نظر نہج البلاغہ　　رندوں کی زباں میں ہے وہ میخانہ علیؑ کا

کعبہ میں ولادت ہوئی مسجد میں شہادت　　اللہ کا گھر بن گیا کاشانہ علیؑ کا

دیکھ کے انباءنا ست ہے نبضِ سخن　　مصحفِ معبود پر کوئی نہیں طعنہ زن

عافیتِ ہل اَتا تیری غذائے لطیف　　آیۂ تطہیر کی شان ترا پیرہن

خالی ہیں جام نشہ نہ گھٹ جائے میکشو　　طاقِ ولا سے لاؤ صراحی اتار کے

بڑھ جائے گی کچھ اور بھی کعبہ کی آب و تاب　　آئیں گے جب قبائے امامت سنوار کے

اک دن یہ ہوں گے دوشِ پیمبرؐ پہ جلوہ گر　　کیوں لائے کوئی عرش سے کرسی اتار کے

رستی ہے لہو بن کر تہذیب کی مے ساقی　　دنیا کا تمدن ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ

شبیرؑ کے ماتم میں صاحب کی محبت میں　　روتا ہوا عاقل ہوں ہنستا ہوا دیوانہ

مدح میں ہے جن کی توحید و رسالت ہم زباں　　شاعری موقوف ان کی مدح پر ہو جائے گی

میں ہوں خلاقِ معانی تری مدحت کے طفیل　　دُر مضموں سے بھری رہتی ہے دل کی جھولی

میں جسے چاہوں بناؤں اُسے سلطانِ سخن　　میری تحویل میں ہے ملکِ سخن کی شاہی

پینے کو یہاں ملتی ہے اُس ہاتھ سے واعظ　　کونین کی طاعت سے گراں جس کی ہے ضربت

کبھی تو مدحِ اہلبیتؑ میں بھی صرف کر واعظ　　جو طعن و طنز سے مل جائے تجھ کو وقت فرصت کا

تشدّد لاکھ ہو ہم پر تدارک کچھ نہیں ہوتا　　نمونہ دیکھ لیجے آج اسلامی حکومت کا

جب ضرورت اک علیؑ کی پھر ہوئی میدان میں　　چھ مہینے کا علیؑ مردانہ وار آ ہی گیا

مدحت نہ کی علیؑ کی گر آخری نفس تک　　یہ مرگِ شاعری ہے اور خبطِ شاعرانہ

ہر شجرۂ تصوّف اس تک پہنچ رہا ہے　　لیکن کہی کسی نے یہ بات منصفانہ

مجرم ہوں میں غُلو کا قصر اُن کو ہو مبارک ہے دینِ شیخ صاحب اب درسِ ناصحانہ

جب حق کا مسئلہ ہو ڈرتا نہیں کسی سے ورنہ میری روش ہے اکثر مصالحانہ

مدح گو سرمایہ داروں کا نہ شاہوں کا غلام تجمّل بے زر ہی سہی شاعر ہے تیرا اے حسین

ہے ایک کیفیت میں رواں اپنا کارواں کیوں تجمّل منقبت کو نہ بانگِ درا کہے

ننگ ہے اس کا در غیر پہ سجدہ کرنا تجمّل اک آپ کی سرکار کا شاعر ہے حضور

نغمہ منقبت میں تجمّل ہیچ مے میرے سامنے حسنِ بیان فرخی زورِ کلامِ انوری

بکیف مدح ہوں غالبؔ کا ہمنوا اے تجمّل کہ با علی ولی مست و با خدا ہشیار

جوشِ ولا میں تجمّل میں چھوڑ گیا خود اپنا ساتھ حد مجھے روکتی رہی قوتِ اختیار کی

رہا محروم دو دن بھی جو شغلِ مدح گوئی سے اُسے اے تجمّل میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھا

نمازِ مدحت پڑھتا ہوں مودّت کے مصلّے پر دکھا دو تجمّل دنیا کو یہ رتبہ ہے سخن ور کا

جگہ فردوسؔی و دبیرؔ کی تجمّل کو ملتی قریب طائرِ سدرہ کچھ آشیاں ہوتے

وہ زباں دانِ محبت ہے خدا کے فضل سے تجمّل کا ورثہ ہے اندازِ ثنائے بوترابؑ

حق یہ ہے کہ سرکارِ نبوت کے سوا نجمؔ — معیار فضیلت کوئی سمجھا نہ علی کا

فضلِ خالق سے مرے افکار میں اشعار میں — فلسفہ ہے نجمؔ غالبؔ کا زبانِ میرؔ ہے

مصائب سینکڑوں ہیں غم ہزاروں مشکلیں لاکھوں — تمہارا نجمؔ ہے تنہا امامِ جعفرؑ صادق

کچھ دن سے تیری یاد کی محفل اُداس ہے — اب چل بسے گا نجمؔ غزل خواں ترے بغیر

ہو جو بیگانہ روی سے یہ زمانہ — ہے خلاف سب ترے علم میں ہے نجمؔ کی آشفتہ سری

میں نجمؔ اپنا فریضہ جانتا ہوں یہ ثنا کوئی — مرا مقصد نہیں اظہار اپنی قابلیت کا

پندرہ ماہ رجب کی نجمؔ دعوت جب ملی — اور کچھ دن زندگی کا اعتبار آ ہی گیا

ہم نجمؔ چار روز کے مہمان ہیں مگر — رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

رہے اے نجمؔ کیوں خالی صدارت بزم مدحت کی — ہمارے بعد کوئی اور قسمت کا دھنی آئے

پڑھتا ہوں میں نمازِ ولا جس پہ رات دن — منزل ہے آسماں سے بلند اُس حصیر کی

ماہ ہے چاندنی کا پھول ترے گلشن میں — مہر روشن ہے تری بزم کا ادنیٰ سا کنول

تری الفت میں جو ہوجائے بشر دیوانہ — اُس پہ سو جان سے قربان ہو عقلِ اوّل

راہ بھولے ترا زائر جو اندھیرے کے سبب ساتھ ہو مہرِ فلک شب کو جلا کر مشعل

سُن کے یہ مدحتِ مولیٰ کی ہوا چلنے لگی مطلع صاف ہیں مضمون کے اُڈے بادل

ہر ایک اپنے کو استادِ فن سمجھتا ہے یہاں جگہ ہے نہ عرفی نہ انوری کے لیے

جہاں ہو پیشِ نظر اپنے مرتبہ کا سوال وہاں خلوص کہاں مدح گستری کے لیے

خلوصِ دل بھی ضروری ہے فکرِ مدح کے ساتھ جلاؤ شمع اندھیرے میں روشنی کے لیے

نماز و روزہ بھی واجب ہیں ان کے ساتھ مگر چنا گیا ہے ہمیں مدحتِ علیؑ کے لیے

مجھے علیؑ کی محبت نے سرشناس کیا چراغ عرش سے لایا ہوں روشنی کے لیے

امیر المومنین

نقابِ رُخ ہٹی ایمان کے عہدِ منوّر کی
جدارِ کعبہ شق ہوکر اِدھر سَر کی اُدھر سَر کی

دو عالم جگمگا اٹھے ہیں تکرارِ تجلّی سے
علیؑ کا روئے روشن اورنظریں ہیں پیمبرؐ کی

انہیں نظروں نے سب سے پہلے وجہُ اللہ کو دیکھا
نظر آئی اس آئینہ میں صورت آئینہ گر کی

نصیری کی یہ نافہمی ہے شاید اُس کو بھا جائے
خبر کیا ہم سے بندوں کو مزاجِ بندہ پرور کی

وہ بچہ کیوں نہ موزوں ہو نبوت کی گواہی کو
جسے چونکادیا خوشبو نے دامانِ پیمبرؐ کی

کسی کو حق نہیں ہے بحث کا دونوں کے رُتبے میں
خدا رکھے یہ دوفردیں ہیں لیکن ایک ہی گھر کی

قدم آگے کہاں بڑھتے درودیوارِ کعبہ سے
بلائیں لیں فطرت نے لی دیوار کی در کی

بھلا ایسی فضا میں آبِ زمزم کی حقیقت کیا
جہاں قدموں کو بوسے دے رہی ہوموج کوثر کی

کیے انکے لیے سامان کیا کیا دستِ قدرت نے
نبیؐ کی گود گہوارہ ہوا جبریلؑ کے پر کی

بشر کو معرفت حاصل نہ ہوگی ذاتِ حیدرؑ کی
سمجھ لے آدمی کس طرح منزل آدمی گر کی

کھلے ہیں اُس پہ کچھ اسرار حفظِ آدمیت کے
گدائی کی ہے برسوں جس نے شہرِ علم کے در کی

علیؑ کو چھوڑ کر قرآن سے ہے ربط بے معنی
اٹھالے وہ ضرورت ہو جسے بے روح پیکر کی

نمازیں وقت پر واجب ولا ہر وقت واجب ہے
عبادت ہے حقیقت میں ولا آلِ پیمبرؐ کی

علیؑ کا نام بھاری ہے متاعِ کن کے دفتر سے
جلالت دیکھنا اس لفظ آسان و سبک تر کی

جمال ایسا کہ اہلِ دل کی آنکھیں وجد کرتی ہیں
جلال ایسا کہ جھک جاتی ہیں نظریں ہر ستمگر کی

تعجب کیا مخالف سوتے سوتے چونک اٹھتے ہوں
عرب کے ذہن میں صدیوں رہی ہے جنگ خیبر کی

روش وہ تھی کہ جس پر دوستوں نے اپنی جانیں دیں
وہ جوہر تھی کہ دشمن کی زباں نے قدرِ جوہر کی

تعالی اللہ اُس کے صبر وضبط وشکر کی منزل
وہ منزل ہے جہاں خندق کی ہستی ہے نہ خیبر کی

امامِ حریت ایسا کہ جس کے جانشینوں نے
اشاعت کی درِزنداں سے تعلیمِ پیمبرؐ کی

جب اسکی آل نے عمریں گزاریں قید خانوں میں
ہوئی تب قدر انسانوں کو آزادی کے جوہر کی

وہ اپنے عہد میں اپنے لیے چھوٹے بڑے ہونگے
ہمارے دیدہ و دل میں وہی عظمت ہے گھر بھر کی

علیؑ کے سامنے کیا زور چلتا مالِ دنیا کا
ابوذر سے مقابل ہو کے طاقت گھٹ گئی زر کی

نہ ہو سکتے جہاں میں نسل و رہ کِ قوم کے جھگڑے
اگر نفسِ پیمبرؐ کو جگہ ملتی پیمبرؐ کی

مصلّے کی فضا سے جنگِ کے میداں میں لے آیا
بڑھا دی اس نے ہیبت نعرۂ اللہ اکبر کی

علیؑ کی روشنی میں پیروی کرتی اگر ملت
ظہورِ حجتِ حق تک ضرورت تھی نہ رہبر کی

ہزاروں بن گئے سرمایۂ نہج البلاغہ سے
نظر نیچی رہے گی علم کے ہر اک تونگر کی

خدا ذہنِ بشر کی پرورش کرنے نہیں آتا
ضرورت تھی اُسے اک کارفرما بندہ پرور کی

نہوتی منعم و مزدور کی دنیا میں آویزش
جو ارضِ خم پہ دنیابات سن لیتی پیمبرؐ کی

کسی دل کو مزے کیا دینگے بوسہ سنگِ اسود کے
تڑپ جب تک نہ ہو مولودِ بیت اللہ کے در کی

علیؑ کی مدح میں اسرار کھلتے ہیں دوعالم کے
نہیں یہ ذوق تو محدود ہے دنیا سخنور کی

اسی باعث تو پھر کوئی ہوا پیدا نہ کعبہ میں
کہ بیٹی ہی نہیں تھی دوسری کوئی پیمبرؐ کی

○

سیدۂ کونینؑ

اے کہ ہستی ہے تری نازِ رسولؐ بطحا
سیّدہ فاطمۂ زہراؑ و بتولؑ عذراؑ

تو ہی آفاق میں ہے مادرِ ملّت بخدا
تیری آغوش میں اسلام نے کی نشو و نما

اے کہ تو پیچ و خمِ چادرِ تطہیر میں ہے
نام لینے سے لرزتا ہے دلِ اہلِ ولا

صنفِ نسواں میں نہ ہو تکملۂ عزو شرف
تو اگر عالمِ امکاں میں نہو جلوہ نما

تیرے پاسنگ نہیں دخترِ حوّا کوئی
تیرا اسوۂ ہے فضائے دو جہاں میں تنہا

کس کو دنیا میں تاسّی تری ہوتی حاصل
کہ ترے نقشِ قدم تک بھی نہ پہنچی دنیا

ہاشمی رعب و جلالت ترے چہرے کی نقاب
منزلِ سجدۂ عفت تیرا نقشِ کفِ پا

برکتیں وحیِ الٰہی کی ترے گھر کا حصار
دامنِ عصمتِ مریمؑ ترے در کا پردا

در وہ در جس پر ملک آئے گدائی کے لیے
گھر وہ گھر جس سے بندھی خانۂ کعبہ کی ہوا

تیری مرضی پہ ہوا رحمتِ باری کا نزول
اذن لے کر ترے کاشانہ میں قرآں اُترا

ہے ترے دودھ کی تاثیر یہ قومی تعمیر
اللہ اللہ ترے خونیں کفن و سبز قبا

سر اٹھانے کی نہیں ملتِ بیضا کو مجال
کہ خمِ گردنِ اسلام ہے احسان ترا

بوالبشر اور ہے کچھ خیرِ بشر ہے کچھ اور
یہ شرف تیرے ہی در سے بشریت کو ملا

ترے پردے کو سمجھ سکتی ہے کیا عقلِ بشر
اہلِ محشر سے بھی محشر میں رہے گا پردا

تو ہے اے صلبِ علی کارِ نبوت کی شریک
تیرے ہی گھر میں امامت کی ہوئی نشو و نما

پہلے تو بعدِ محمدؐ ہوئی شایانِ درود
کہ ترا آلِ محمدؐ میں ہے نمبر پہلا

خالقِ حُسنِ علیؑ کو جو نہ پیدا کرتا
کوئی واللہ دو عالم میں ترا کفو نہ تھا

آکے خاموش جو بیٹھے رہے شاہِ مرداں
مرکزِ وحی نے مفہومِ خموشی سمجھا

نعمتِ آیۂ قرآن ترے روزہ کی سند
غیرتِ میوۂ جنّت تری فاقوں کا مزا

تری پیوندوں کی چادر غربا کی تسکین
سر سے ہٹ جائے تو خورشید نہو جلوہ نما

تری تہلیل سے جسمِ دو جہاں میں لرزش
تری تسبیح کہ جو عرش کا توڑے تارا

دہر میں اشجعِ عالم تری قسمت کا شریک
خلق کا مصلحِ اعظم تری گودی کا پلا

تری سطوت کی نشانی ترے گیارہ فرزند
ترے مہدیؑ سے ہے قائم روشِ ارض و سما

فاتحِ بدر کی تلوار سہیلی تیری
اُس کی قسمت کہ اٹھایا تری باتوں کا مزا

تیرے ایثار کی تفصیل حسینیؑ تنظیم
تیری محنت کا ثمر جلوہ گہہِ کرب و بلا

بھول کر تو نے نہ کی دولتِ دنیا پہ نظر
جوشنِ صبر و رضا تھے زر و زیور تیرا

تذکرہ مصحفِ باری میں ہے عظمت کا تری
ذکر تاریخ میں ہے آسیا گردانی کا

آئے جبریلؑ امیں عرش سے نسبت لے کر
یہ وہ رشتہ ہے جہاں بیچ میں تھی وحیٔ خدا

دست و پا چوم کے عصمت نے لگائی مہندی
چادرِ آیۂ تطہیر نے آنچل ڈالا

ہاشمی تیغوں کے سائے میں دلہن گھر سے چلی
لافتا کا جو علَم باندھ کے آئے سہرا

باپ کے گھر سے ملا بخششِ امت کا جہیز
دونو عالم نے کیا حدِ ادب پر مجرا

کیا تو ازن ہے میں قرباں نگہِ قدرت کے
خانہ زاد اپنا ہے اور بنتِ پیمبرؐ زہراؑ

شادیٔ رابطۂ آدمؑ و حوّا کی قسم
پھر دلہن ایسی ہوئی اور نہ دولہا ایسا

○

شہزادۂ صلح

عالمِ خلق پہ چھائی ہوئی وہ کُن کی صدا
رُخِ ہستی سے وہ غیبت کا سرکتا پردا

نشر گاہِ عدم آباد سے اعلانِ وجود
کروٹیں لیتی ہوئی صبحِ ازل کی دنیا

صورت و معنی و روح و بدن و مرگ و حیات
خوبی و زشتی و سنگینی و تری و خلا

مسلک و مقصد و مفہوم و مراد و میثاق
نکہت و نزہت و نسرین و نواسنج و نوا

زر و زردار و زمین و زمن و زیر و زبر
قسمت و قدرت و تانون و تاضی و قضا

علم و عقل و عمل و عزم و عیار و عنوان
صبر و سلح و صفت وصاعقہ و صور و صدا

جوہر و جلوہ و جوش و جرس و جہد و جہاد
دیدۂ و دانش و دارین و دل و درد و دوا

سوز و ساز و سخن و سامعہ و سیر و سکوں
راحت و رحمت و رنگ و روش و راہ و رضا

حیرت و حوصلہ و حرف و حکایات وحدیث
بارش و باغ و بہار و بدل و بذل بہا

طائر و طرہ وطور و طرف و طرز و طریق
شعلہ و شاہد و شہکار و شہید و شیدا

اک ارادہ میں یہ تخلیق کا طوفانِ عظیم
اک اشارہ میں یہ تشریح رموزِ اسماء

سانس لیتے ہوئے پانی پہ زمیں کا بستر
وزنِ کہسار دبائے ہوئے گیتی کا گلا

وہ ابھرتا ہوا سورج وہ تجلی کا پہاڑ
روشنی کا وہ مرتب وہ منظم دھارا

شام تک صبح سے کرنوں کا برستا ہوا مینہ
رات بھر تیز سیاہی کا اُبلتا دریا

کف گردوں پہ ستارے طبق ارض میں گل
شب کی چھاتی پہ دھرا چاند کا روشن مکھڑا

بارہنگامۂ تہلیل اٹھائے ہوئے عرش
رنگِ تقدیس میں ڈوبی ہوئی معصوم فضا

عرش و کرسی کی بنا لوح و قلم کی تشکیل
خود نمائی ہوئی جن آئینوں میں جلوہ نما

ہمت و حوصلہ انسان کا جبریل کی حد
عزمِ انساں سے لرزتی ہوئی طوبیٰ کی ہوا

آب و گل کی عظمت اور ملکوتی ماحول
زعمِ قدسی کا جمالِ بشری کو سجدہ

ایک ہلکی سی وہ لغزش وہ تقاضائے جلال
انقلاب ایسا کہ پھر آنکھ نے دیکھا نہ سنا

ذہنِ آدم میں وہ خاموش فضائے جنت
خیر و شر کی یہ گرجتی یہ برستی دنیا

دامنِ ارض پہ گرتے ہوئے پہلے آنسو
آہ جاں سوز و جگر سوز کا پہلا شعلہ

منزلِ عشق و محبت میں وہ پہلی افتاد
عرش سے فرش تک اک معرکہ درد و دعا

ہو چکا جمع یہ ساماں جو تصدق کے لیے
گلشنِ دہر میں آئے حسنِ سبز قبا

یہ وہ رحمت کا خزانہ تھا سماتے نہ کہیں
کون لیتا انہیں کودی میں پیمبرؐ کے سوا

دست بوسی کو بڑھے جذبۂ ذکر و تسبیح
فکرِ شاعر نے بھی اک مطلع نو نذر کیا

جادۂ سلح کے رہبر حسنِ سبز قبا
تو نے تخلیق کیا ولولۂ کرب و بلا

حق و باطل میں وہی فیصلہ کن بھی ٹھہری
جس لڑائی کا ترے صبر سے آغاز ہوا

سرکشی حق سے نہ باطل کی بڑھی تھی جب تک
حجتِ حق تھا جہاں میں ترا اُسوہ تنہا

کربلا میں تری تحریک ہوئی بار آور
صبر بڑھ کر تیرا شمشیر یداللہ بنا

نکلی ہے نیام سے اس وقت حسینی تلوار
جبکہ خُلقِ حسنی بھول گئی خَلقِ خدا

فاطمی صبر کا مظہر ہے تو پہلا بخدا
پھر یہ ورثہ ترا سجادؑ کو زینبؑ کو ملا

سبطِ اکبر ہے تو اللہ رے ترا عزّ و شرف
ایسی منزل میں جہاں کوئی نہ چھونا نہ بڑا

تو نے اس تختِ حکومت کو لگادی ٹھوکر
خونِ انسان ہی صدا جس کی بلندی سے گرا

آج بھی تیری امانت پہ فدا ہیں لاکھوں
سلطنت کا کوئی آفاق میں حامی نہ رہا

جانے کیا بیر ہے دنیا کو گھرانے سے ترے
معترض سلح پہ بھی جنگ پہ بھی ہے دنیا

جاہلوں کے لیے اب تک ہے یہی طرزِ جواب
کتنا محکم تھا وہ انداز خموشی تیرا

نقش اک اک دلِ عارف پہ تیرے نام کا ہے
تخت پر کوئی جو بد نام حکومت ہو تو کیا

قوم کے درد کا ہے تیری تاسّی میں علاج
جب یہ توفیق نہیں کوئی دوا ہے نہ دعا

تیرے پیرایۂ تبلیغ کے قابل ہی نہ تھی
یہ اُجالے کی مخالف یہ اندھیری دنیا

○

سید الشہداء

ذوقِ طاعت چاہتا ہے ایک سجدا اے حسینؑ
میں کہاں ڈھونڈوں ترا نقشِ کفِ پا اے حسینؑ

تجھ کو ہے فرزندیِ اسلام زیبا اے حسینؑ
تو کہ ہے ابناء نا میں جلوہ فرما اے حسینؑ

کچھ تجھے صدیاں گزر جانے پہ سمجھا اے حسینؑ
اب خراجِ معرفت دیتی ہے دنیا اے حسینؑ

پاؤں پھیلائے علیؑ و فاطمہؑ کی گود میں
تو رسولؐ اللہ کی زلفوں سے کھیلا اے حسینؑ

صحنِ مسجد تیری جولانگاہِ طفلی مرحبا
دامنِ فخرِ رسالت تیرا جھولا اے حسینؑ

تیری سیرت کا منادی ہے امامت کا نقیب
تجھ سے پہلے فرض تھا قرآں کا آنا اے حسینؑ

تیری ہستی ہے جہاں میں مرکزِ انسانیت
فاطمہؑ نے تجھ کو کس محنت سے پالا اے حسینؑ

بارہا تخیل میں دیکھا نبیؐ کے دوش پر
عرش سے بھی ہے تصور تیرا اونچا اے حسینؑ

حُسنِ یوسف ماند ہے عشقِ زلیخا مضمحل
اے مکمل حُسن اے عشقِ سراپا اے حسینؑ

ناز برداروں میں تیرے اک پیمبرؐ دو امام
تو عجب ماحول میں تھا ناز فرما اے حسینؑ

ہر افق پر ہے تری حُسنِ عمل کی روشنی
تو ہی دنیا کے اندھیرے کا اُجالا اے حسینؑ

تو زبانِ عصمتِ برحق پہ نفسِ مطمئن
تو نگاہِ عصمتِ مطلق میں یکتا اے حسینؑ

تیرے گیسو کی مہک جنت بہ جنت رہنما
تیری جلوہ کی جھلک دنیا بہ دنیا اے حسینؑ

گردشِ گردونِ گرداں ٹھوکروں میں ہے تری
دستِ قدرت میں ترے امروز و فردا اے حسینؑ

بیکسی کہہ دوں اسے یا شانِ یکتائی کہوں
تو نظر آیا ہے ہر منزل میں تنہا اے حسینؑ

اے زہے شانِ عمل تا حجتِ آخر کبھی
پھر نہ آیا کوئی بیعت کا تقاضا اے حسینؑ

ہیبتاً بالیں پہ شاہانِ جہاں قدموں میں ہیں
تیری نظریں دیکھتی ہیں دین و دنیا اے حسینؑ

تیری قربانی سے پہلے وہ اذاں ہو یا نماز
اب یہ تیرے نام کا بجتا ہے ڈنکا اے حسینؑ

آج سجدے ہو رہے ہیں تیری خاکِ پاک پر
یاد جو دنیا کو تیرا ایک سجدا اے حسینؑ

کوئی حد ہے تیرے استقلال وصبر و ضبط کی
تجھ سے تھا حق کی مشیت کا نہ پردا اے حسینؑ

وعدۂ طفلی کے دن سے لے کے سنہ اکسٹھ تلک
کربلا سے روز تیرا سامنا تھا اے حسینؑ

ہوگیا دم بھر میں حُر قیدِ غلامی توڑ کر
دل کی گہرائی سے جس نے بھی پکارا اے حسینؑ

آج ہیں جس راہِ آزادی پہ قومیں گامزن
تیرے قدموں نے بنایا ہے وہ رستا اے حسینؑ

زندگی ناحق پرستوں کو مصیبت ہوگئی
چار جانب سے ہے اب حق کا تقاضا اے حسینؑ

جرأت مظلوم ہو یا ہمتِ مزدور ہو
تو نے کھینچا تھا یہ مستقبل کا خاکا اے حسینؑ

اس زمانے کے سپاہی نے ترے اخلاف سے
بے تشدد جنگ کا انداز سیکھا اے حسینؑ

ہم کہاں ہیں اور تری ایثار کی منزل کہاں
کربلا تک ہی ابھی دیکھا ہے رستا اے حسینؑ

کاش ہم تصویر بن جاتے ترے مفہوم کی
کتنی جانیں دے کے تو نے ہم کو پایا اے حسینؑ

جی رہی ہے اک نگاہِ لطف کی امید پر
تیسری شعبان کی بزم تولا اسے حسینؑ

مدح گو سرمایہ داروں کا نہ شاہوں کا غلام
حجم بے زر ہی سہی شاعر ہے تیرا اے حسینؑ

○

شعاعِ لرزاں

(تضمین بر اشعار ہاتفی مرحوم و مغفور)

چو بر شاخِ نازک گلِ تر بلرزد
بہر نگۂ موجِ کوثر بلرزد

بہ اندازِ صد قلبِ مضطر بلرزد
چو شمشیر در دستِ حیدرؑ بلرزد

دل اندر درونِ غضنفر بلرزد

چو ایں را بہ لشکر فرازد بہ بالا چو آں را بہ خیبر فرازد بہ بالا
نشانِ نبیؐ گر فرازد بہ بالا سناں را چو بر سر فرازد بہ بالا
چو از بادِ صر صر صنوبر بلرزد

فلک خم ز اجلالِ محراب تیغش قمر چشمۂ مرتعش ز اب تیغش
تن کفر لرزاں بہ گرداب تیغش دلاور شجاعے کہ از تاب تیغش
درونِ شجاعانِ کشور بلرزد

بہ آں نقش پا جامِ جمشید باطل ز عدلش سرافگندہ کسرائے عادل
بیک نعل اسپش فدا ماہِ کامل ز دارائ تیغ او خصمِ را دل
چو وار از تیغِ سکندر بلرزد

بہ منبر نظر کن شکوہِ ولی را بہارِ علومِ خفی و جلی را
بہ میداں بہ بیں کار زارِ علی را چو در جنبش آرد رکاب یلی را
زمیں ہم چو صحرائے محشر بلرزد

منم آں کہ در بزمِ عشاق فردم ز سر تا بہ پا از غمِ ہجر دردم
ولے جرأتِ عشق مولا نہ کردم من آں کمترینہ غلامم کہ ہردم
دلم در بر از شوق قنبر بہ لرزد

تو در علم جبریل را رہنمائی تو در حلم آئینۂ مصطفائی
سوئے ہجم بیکس نظر کن کجائی زجودِ تو دستِ جوانمرد طائی
بہنگام بخشیدن زر بہ لرزد

○

نجم و شمسؒ

(تضمین بر اشعار شمس تبریزؒ)

ایں جادۂ تسلیم کہ بنمود علی بود ایں ذوق بہر دل کہ بیفزود علی بود

ہر آئینہ آئینۂ مقصود علیؑ بود　　شاہے کہ وصی بود ولی بود علیؑ بود
سلطان سخا و کرم و جود علیؑ بود

آں شاہ کہ از بدر و احد گشت مظفر　　دو کرد بیک ضربِ تنِ حارث خود سر
آں شیر کہ بشکست سرِ مرحب و عنتر　　آں قلعہ کشائے کہ درِ قلعۂ خیبر
برکند بیک حملۂ و بکشود علیؑ بود

بد منفعتِ دین ضرر قلعۂ خیبر　　تا اوجِ فلک شد خبر قلعۂ خیبر
دیدند ملک خم کمر قلعۂ خیبر　　آں قلعہ کشائے کہ درِ قلعۂ خیبر
بر کند بیک حملۂ و بکشود علیؑ بود

در منزلِ خم آمدہ فرماں پئے سرورؐ　　دادند نبیؐ تاجِ خلافت بہ برادر
ایں راز عیاں گشت ز ارشادِ پیمبرؐ　　جبریلؑ کہ آمد زبرِ خالقِ اکبر
در پیشِ محمدؐ بُد و مقصود علیؑ بود

از ماہی و تا ماہ سفر کردم و دیدم　　در بحر و بر و کوہ گذر کردم و دیدم
یک عمر بایں شوق بسر کردم و دیدم　　صد بار در آفاق نظر کردم و دیدم
از روئے یقیں درہمہ موجود علیؑ بود

از نورِ نبیؐ یافت ظہور آدم و عالم　　چوں نورِ نبیؐ نورِ علیؑ یک بُد و توام
اسناد قوی دارم و بے دغدغہ گویم　　صدبار در آفاق نظر کردم و دیدم
از روئے یقیں درہمہ موجود علیؑ بود

○

بانگِ درا

فطرت خدا کے راز اگر برملا کہے　　غنچہ کھلے چمن میں تو یامرتضیٰؑ کہے
دل میں خیال آئے تو صلِ علا کہے　　جلوہ نظر فروز کہیں ہو تو کیا کہے
آنکھیں کھلیں تو گود میں ختمِ رسلؐ کے تھے　　دل اس کو ابتدا کہے یا انتہا کہے
صورت وہ آنکھ نازشِ فطرت کہے جسے　　سیرت وہ قلب نازشِ ربِّ علا کہے

سمجھیں فرشتہ کیا تجھے اے برتر از مَلک
بالا تر از بشر تجھے انسان کیا کہے

گیسوئے منتشر ہیں کہ قرآں کی آیتیں
روح خلیل دیکھ کے صلِ علا کہے

تیری نگاہِ لطف ہے اک موجِ سلسبیل
اب مضطرب ہے دل کہ تبسم کو کیا کہے

معصوم نفس اُس پہ طبیعت کی سادگی
چہرہ پہ وہ جلال نصیری خدا کہے

ہمدم جہاں میں نور میں شامل نسب میں ایک
کس طرح کوئی تجھ کو نبیؐ سے جُدا کہے

بچپن میں کھیل تھا تو نبیؐ کی محافظت
جب ہوں جواں تو کیوں نہ ملک لافتا کہے

وہ نقشِ پا ہیں مہر نبوتؐ سے بھی بلند
کیوں مہر و مہ کو کوئی ترے نقشِ پا کہے

اللہ رے تیرے قولِ سلونی کی منزلت
ہو حوصلہ اگر تو کوئی دوسرا کہے

حُسنِ عمل پہ تیرے کرے ناز کبریا
قرآن تیرا قصۂ عہدِ وفا کہے

تعمیر قوم بُت شکنی بخشش و عطا
کونین کیوں نہ پھر تجھے دستِ خدا کہے

تھا جوشِ انتقام عرب کے خمیر میں
سیکھا ہے کس سے مسلک عفو و عطا کہے

ہے آج تک جو رایتِ اسلام سر بلند
کاندھے پہ کس کے پائی ہے نشوونما کہے

سکہ ہے کس کی تیغ کا تاریخ دے جواب
نعروں سے کس کے گونج رہی تھی فضا کہے

ہیں تیرے نقشِ پا پہ یہ قومی عمارتیں
آثار کہتے ہیں نہ کہے کوئی یا کہے

قانون بن گئے ترے الفاظ دہر میں
دشمن بھی سُن کے کیوں نہ درست اور بجا کہے

تیرا کلام دیکھ کے حیرت میں ہے جہاں
صدقت یا علیؑ نہ کہے دل تو کیا کہے

اک معجزہ ہے یہ ترے نفسِ عظیم کا
امت جو بے خبر ہو وہ مشکل کُشا کہے

تلوار نام لے کے اُٹھاتے ہیں حق پرست
ایسے بشر کو ناصرِ دینِ خدا کہے

شاہی اور اُس پہ فقر پسندی کسے نصیب
یہ شان ہو تو کوئی شۂ دوسرا کہے

آسائشیں تھیں تیری عبادت کے اہتمام
وہ مشغلے کہ مصحفِ حق ہل اتا کہے

بھولے نہ یہ کہ راکبِ دوش نبیؐ ہے تو
قصہ جو کوئی رفعتِ اسلام کا کہے

ہیں کھیل اُس کے واسطے خیبر کشائیاں
بازوئے مصطفیٰؐ جسے خلقِ خدا کہے

دشمن سے بھی سلوک تھا قاتل پہ بھی کرم
دنیا تری بلند نگاہی کو کیا کہے

ہے اُس سے بڑھ کے کون خلافت کا مستحق
نفسِ رسولؐ پاک جسے کبریا کہے

جاری ہو جن سے نغمۂ توحید خلق میں
ایسے لبوں کو مصدرِ حمدِ خدا کہے

تاریخ ابتدا سے ہو غیروں کے ہاتھ میں
پھر بھی ترے صفات حُسن برملا کہے

دُنیا ہو چُپ تو ارض و سما بولنے لگیں
اک اک زبان گنگ ترا ماجرا کہے

تقلید تیری چاہئے تنظیم ہے یہی
مغرب پرست قوم سے پر کوئی کیا کہے

ہر سانس میں ہو بوئے ولائے ابوترابؑ
اُبھرے جو نبض ڈوب کے یا مرتضاؑ کہے

اس جلوہ گاہ[1] ناز کے اللہ رے نصیب
جس کو زبانِ خلق نجف دوسرا کہے

کیا کیا نہ تیرے پاؤں نے طے کی ہیں منزلیں
سمجھے اگر کوئی تو ہر اک نقشِ پا کہے

آنکھیں ہزاروں فرش ہیں جلوہ نما ہو پھر
ایک ایک پائمال ترا مرحبا کہے

ہے ایک کیفیت میں رواں اپنا کارواں
کیوں نجمؔ منقبت کو نہ بانگِ درا کہے

○

پارۂ نور

اے وہ ہستی کہ ترا عکس نظر تھا سرِ طور
آج تک دہر میں ہے چشمِ تمنا مخمور

اے کہ حُسنِ پسِ پردہ کا تو آئینہ ہے
کچھ کچھ آتا ہے سمجھ میں ترا منشائے ظہور

تیرا مقدور محالات کو ممکن کرنا
تیرا مفہوم خیالات کو تفویضِ شعور

وہ بشر تو کہ عیاں جس سے صفاتِ باری
نورِ کونین میں اُس کا ہے تو ہے تیرا ظہور

تیرا گہوارہ شہنشاہِ رسلؐ کا دامن
لوریاں جلوہ گہِ غیب کے رازِ مستور

جگمگا دے گی زمانے کو ضیائے توحید
آج پھر ملتے ہیں بچھڑے ہوئے دو پارۂ نور

تو وہ ممکن ہے کہ ہے نازشِ ذاتِ واجب
تو وہ بے نفس کہ ہے ملتِ بیضا کا غرور

درد سرتا بہ قدم اور غریبوں کا سکون
ہمہ تن رنج و الم اور یتیموں کا سرور

---

[1] جوگی رم پورہ، ضلع بجنور، یوپی (انڈیا)

بے نیازی کو ترے عجز کے تیور محبوب
خاکساری سے تری عرش کو پستی منظور

لذتِ روح تری نکہت گیسوئے رسولؐ
قوتِ نفس تری یادِ الٰہی کا سرور

متصل تیری خلافت پہ نوائے قرآن
متحد تیری ولایت پہ صدائے جمہور

حیرتِ عالم قدسی تری شب بیداری
اور ترا خوابِ جوانی شبِ ہجرت کا ظہور

تیرے دس نور نظر تیری مثالِ ظاہر
ترا اک جلوۂ غائب ترا شہزادۂ نور

ڈھل کے لہجہ میں ترے وحیِ خدا کے الفاظ
کر گئے خلق میں قرآں کی فصاحت مشہور

تیری تلوار کے صدقہ میں مسلمانوں نے
لے لیا تختِ کیانی و سریرِ فغفور

کھا کے سجادہ پہ تلوار بتایا تو نے
جان دینے کا ہے راہِ خدا میں دستور

ننگ ہے اُس کا درِ غیر پہ سجدہ کرنا
نجمؔ اک آپ کی سرکار کا شاعر ہے حضور

○

حسین علیہ السلام

اے کہ تیرے خیال میں نشہ جامِ کوثری
آج ہے تیرے نام پر گردشِ نورِ ساغری

اے کہ تری نگاہ ہے معنیٔ بندہ پروری
چاہے تو ہر غلام کو بخش دے تاجِ قیصری

نازشِ دو دماں ہے تو ہاشمیوں کی جاں ہے تو
یوسفِ کارواں ہے تو جان و دلِ پیمبری

وارثِ صبر فاطمہؑ خلق حسنؑ کا آئینہ
حاملِ شانِ احمدیؐ صاحبِ وضع حیدریؑ

تیرا ظہور دلربا دعوتِ صد نگاہ و دل
تیرا ورود کربلا ہے تری فتح دلبری

شام تری امید کی گیسوئے قاسمؑ حسیں
صبح نشاطِ عید کی نور جمالِ اکبریؑ

دامنِ ناز کی کشش شانِ ارادتِ حبیب
تیرے نیاز کی روش تیری نمازِ آخری

جوش ترے مقال کا خطبۂ عابدِؑ حزیں
قید میں تھا پہ ڈال دی جسمِ عدد میں تھرتھری

عالمِ بیخودی ترا عشقِ خدا کی منزلیں
ہوش ترے خیال کا جذبۂ خلق پروری

طفلی میں عیشِ خواب کا سینہ سید البشرؐ — تکیہ ترے شباب کا قبضۂ تیغِ حیدری
تجھ سے ہے نامِ حریت تجھ سے نظامِ حریت — تو ہے امامِ حریت حُر ترا ایک لشکری
پھیلے ہوں مدتوں جو پاؤں ختمِ رُسلؐ کی گود میں — اُن میں نہ ہو تو ہو کہاں زورِ کمالِ رہبری
زر سے کیا ہے یوں حذر بانٹے ہیں تو نے گنجِ زر — تیرا وہ فقر ہی نہیں نام ہے جس کا بے زری
ارضِ بقیعِ پاک میں تجھ کو خبر ہے کیا ہوا — دستِ دراز کفر کی آہ وہ کینہ پروری
چونک کے خوابِ ناز سے دیکھ ہمارا حالِ زار — جن کو کیا تھا متحد آج ہے اُن میں ابتری
ظلمتِ کفر چھا چکی نام و نشاں مٹا چکی — چاند کو اپنے اب تو دے رخصتِ جلوہ گستری

نغمۂ منقبت میں ہجوم ہیچ ہے میرے سامنے
حسنِ بیانِ فرخیؔ زورِ کلامِ انوریؔ

○

عریضہ

(بہ حضور سرکار حجت العصر عجل اللہ ظہورک)

ایک ترا جمال ہے رونقِ بزمِ عنصری — تیری ضیا سے ضوفگن قصرِ دوازدہ دری
صانعِ خلق کی مثال خلق کی آنکھ سے نہاں — بوئے گلاب کی طرح قیدِ نگاہ سے بَری
عہدِ قدیم سرنگوں دورِ جدید منتظر — عالمِ حال مضطرب یہ تری شانِ دلبری
گیارہ امام کا خلف جس کا رسولؐ سا سلف — جانِ تقیؑ ذی شرف نورِ نگاہِ عسکریؑ
مثلِ تقیؑ حق نما رہرو منزلِ رضاؑ — حاملِ علمِ موسوئی وارثِ صدقِ جعفریؑ
حلم میں ثانیِ حسنؑ مثلِ حسینؑ صف شکن — زینِ عبا کا جان و تن سرو ریاضِ باقریؑ
تیرے کرم کی لہر میں جذبۂ خلقِ احمدیؐ — تیری نگاہ قہر میں جلوۂ تیغِ حیدریؑ
سلسلہ ہے خلیلؑ سے گیسوئے مشکبار کا — زلفِ معنبریں میں ہے بوئے خوشِ پیمبری
رفعتِ بوذری نثار تیرے مصاحبین پر — تیرے غلام مرحبا ختم ہے جن پہ قنبری

خم ہیں ہزار گردنیں یہ ترے نام کا اثر
ہیچ ہے تیرے سامنے دبدبۂ سکندری

حکمِ خدا کا منتظر فضلِ خدا سے منتظر
شیرِ خدا کا شیرِ نر قاطعِ نسلِ کافری

دین کی دواتِ نہاں فضلِ خدا نگاہباں
حجت وصاحب الزماں پیکرِ نورِ داوری

پردۂ غیب سے نکل بندِ نقاب توڑ دے
آ کہ ہمیں مٹا چکی چرخ کی فتنہ پروری

اپنے ملازمین کا حالِ تباہ دیکھ لے
ارضِ بقیع پاک کو ایک نگاہ دیکھ لے

○

جانِ بہار

نمودِ عالم ہُو تھی فضائے تیرہ و تار
نہاں تھے کتمِ عدم میں چراغ وشمع وشرار

میں جب بھی بھیج رہا تھا تسلّیاں پیہم
مری شعاعوں کا جب بھی زمیں پہ تھا انبار

تحیرات تھے پنہاں تجلّیات خموش
نہ آئینہ تھا کوئی اور نہ آئینہ رخسار

میں جب بھی حیرتی فطرتِ پریشاں تھا
مری نگاہ تھی سو آئینوں کی آئینہ دار

فقط تھی جلوہ نما ایک قدرتِ عریاں
نہ پردہ ور تھا کوئی اور نہ کوئی پردہ دار

مری نگاہ میں روشن تھے سینکڑوں جلوے
میں سات پردوں میں نظّارگی تھا لاکھوں بار

یہ کائنات تھی مصروف خوابِ محکم میں
میں جب بھی عالمِ افلاک میں تھا شب بیدار

جب ایک لفظ تھی مبہم یہ ہستیِ فانی
میں جب بھی معنی و انجم تھا بایں انوار

مجھے تھا عالمِ امکاں سے واسطہ جب بھی
جب آب وگل میں نہ تھے ربط وضبط کے آثار

ابھی تھے جذب وکشش سے کہیں عناصر دور
مری بقا کا ہے جذب وکشش پہ جب سے مدار

ابھی ہوئی تھی نہ ذرّات عقد کی ترتیب
کہ تھا میں رکنِ طلسم ثوابت و سیار

نئے نئے تھے یہاں اہتمام فطرت کے
میں انتظامِ فلک کا تھا جب بھی حصہ دار

سمٹ رہے تھے پریشان خاک کے ذرّے
مجسمہ تھا مرا جب بھی مجمع الانوار

ابھی سے زرد یلانِ عرب کے ہیں چہرے
نبیؐ کے ہاتھ میں گویا خدا کی ہے تلوار

بہت سی نسبتیں تھیں نام جب اسد پایا
خدا کا شیر نواسہ اسد کا شیر شکار

ازل کے سلسلۂ منتخب کی پہلی قسط
عرب کی کفر نشاں زندگی پہ پہلا وار

عجیب مطلع روشن کیا سپر و قلم
میں اپنی طبع خدا داد پر نہ کیوں ہوں نثار

ہوئی رسولؐ کی بعثت یہ جب ہوئے ہشیار
کہ مقتدا کو تھا ایسا ہی مقتدی درکار

جمالِ صورت زیبا سے نازشِ فطرت
کمالِ جلوۂ معنی سے مطلعِ الانوار

وقوف علمِ الٰہی سے بابِ شہرِ علوم
جلال وہیبت شاہی سے حیدرِ کرار

بناء مقصدِ اعلیٰ جہان کا مقصود
شریکِ قسمتِ زہراؑ رسولؐ کا دلدار

ظہور جلوۂ باقی طلسمِ فانی میں
ازل کے دن سے حیاتِ ابد ہے جس پہ نثار

ابو تراب، اسد، ایلیاء ابو سبطین
امین و صادق و ساقی و سید و سردار

علی و ہادی و مہدیؑ و کاسرالاصنام
شہید و شاہد و ساجد قسیم جنت و نار

مثیل عیسیٰ و خیر البشر امیر النحل
مقیم و قاعد و راکع امام عرش وقار

وحید و طاہر و صدیق و ناصر و فاروق
صفی و حجت و قاضی و سید الابرار

وصی ولی و حبیب دو زیر و ذوالقرنین
امیر و عابد و شیخ المہاجر و انصار

ذکی، خاتم نفس رسولؐ زوج بتولؑ
یداللہ و اسداللہ وقاتلِ کفار

اُسی کو تخت ہے زیبا اُسی پہ تاج نثار
رسولؐ کی جو سپر ہو خدا کی ہو تلوار

جہادِ نفس بھی تھا یہاں جہادِ سیف کے ساتھ
خطاب سیفِ خدا کے یونہیں نہیں حقدار

سبق دیا وہ عرب کو کہ یاد ہے اب تک
خدا کا نام خدا کے ہزبر کی تلوار

پڑھا دیے جسے دو حرف عقلِ کُل ٹھہرا
بڑھا دیا جسے سد رہ کا کردیا مختار

مٹا دیا جسے اُبھرا نہ وہ قیامت تک
بتوں نے خانۂ کعبہ میں پھر نہ پایا بار

ابھی ہے مدحت حاضر میں تر زباں ہونا
خدا کرے کہ وہ کرلیں پسند یہ اشعار

یہ دل کہ بسمل بیدست وپا ہے حاضر ہے
فقیر عشق ہوں میں کیا ہے قابلِ سرکار

صباح و شام میں ہے تیرے زلف و رُخ کی بہار
کہ تیرا نور ہی تھا نقش بند لیل و نہار

ترے قدوم سے آراستہ ہوئی دنیا
ترے ورود سے باغِ جہاں میں آئی بہار

ترا ظہور تھا تکمیلِ نوعِ انسانی
ترا وجود تھا دنیا میں جنت الابرار

خدا نے بھیج کے تجھ کو بچا لیا صد شکر
وگرنہ نسل کا آدم کی جاچکا تھا وقار

جہاں میں تجھ سے حقیقی مسرتیں پھیلیں
زمانہ ہے ابدی راحتوں کا شکر گذار

سکونِ قلب ملا تیرے آستانے سے
ترے بغیر تھی تکمیلِ عافیت دشوار

فلک کی بزم میں پایا تجھی کو صدر نشیں
زمیں کے فرش پہ دیکھا تجھی کو عرش وقار

جہاں جہاں نظر آیا نئے لباس میں تھا
جہاں جہاں تجھے دیکھا الگ تھا سب سے شعار

شہانِ دہر سے ممتاز تختِ شاہی پر
بساطِ فقر پہ سرتاج اولیاء کبار

خمِ ہلال نما منزلِ عبادت میں
جہادِ راہ خدا میں کھنچی ہوئی تلوار

رسولؐ پاک کی تصویر اوجِ منبر پر
عرب کی بزمِ فصاحت میں منتخب فقار

مقامِ درس میں استاد عقل اول کا
علومِ عقلی و نقلی میں واقفِ اسرار

خدا کے فضل سے یکتا معلم تہذیب
نبیؐ کے فیض سے اخلاق کا علم بردار

شریعتِ نبویؐ کا محافظ و حافظ
حکومتِ ازلی کا معاون و سردار

الٰہیات میں کامل سیاسیات میں فرد
وہ فلسفی کہ ارسطو کا فلسفہ بے کار

تو علمِ نحو کا موجد عروض کا مصلح
کہ آج تک ہے عرب کی زبان شکرگذار

زمانہ تیرا مقلد ہے تو مجدّد ہے
کہ آج نظم میں اخلاقیات کی ہے بہار

جہاں میں کی سنہ ہجری کی ابتدا تو نے
کہ جس پہ اپنی تواریخ کا ہے دار مدار

ترے مقولوں کے یورپ میں ترجمے پہنچے
یہ لوگ لے گئے چُن چُن کے کیا دُرِ شہوار

گہن بھی ہے ترا مدّاح کارلائل بھی
ہے اہلِ غرب میں طرزِ عمل کی تیرے پکار

ترے کلام میں سائنس کے نکات بھی ہیں
ہے تیری نہج بلاغت خزینۂ اسرار

کہیں پہ جاذبہ عامہ کی ہے تشریح
کسی جگہ فن کیمسٹری کے ذکر اذکار

زمانہ آج وہ نیوٹن کا مسئلہ کہہ دے — تری زباں سے جو اسلام کر چکا اظہار
بتا دیا ہمیں جو کچھ ہمارے قابل تھا — سکھا دیا ہمیں جو کچھ کہ تھا ہمیں درکار
عجیب طرز سے کی زندگی بسر تو نے — امیر تھا پہ غریبوں کی سی رہی رفتار
طعام گرم کی خواہش نہ آب سرد کا شوق — سدا رہا تجھے لذّات دہر سے انکار
فقیر سے تجھے رغبت یتیم سے اُلفت — خودی سے تھی تجھے نفرت خدا سے تھا سروکار
ترے ضمیر میں عالم کا درد تھا پنہاں — ترے خمیر میں شامل تھا جذبۂ ایثار
زمانہ جرأت اخلاق پر ہے حیرت میں — بشر کی فہم سے باہر ہے تیرا حسن شعار
عقیل کو کبھی تنبیہہ کی حسنؑ کو کبھی — کہ امرِ حق میں مروّت سے کچھ نہ تھا سروکار
رفاہِ خلق کی خاطر بنائے چاہ کہیں — کہیں غریبوں کی خاطر لگا دیے اشجار
دیا ہے تو ہی نے قاتل کو شیر کا کاسہ — دکھا تو دے کوئی ایسا ضمیر جوہردار
زمانہ دیکھے کہ حسنِ عمل ہے نام اس کا — بہت جہان میں تہذیب کی ہے آج پکار
ہے تیری ذات کمالات کا اک آئینہ — نگاہ غور سے دیکھا تو کھل گئے اسرار
تو اک ثبوت قوی ہے وجودِ باری کا — کمالِ حُسن سے حُسنِ ازل کا ہے اظہار
عجب ہی کیا ہے نصیری خدا جو کہہ اُٹھے — تو اہلِ ہند میں ہوتا تو مانتے اوتار
بکیف مدح ہوں غالبؔ کا ہمنوا اے حجمؔ — کہ باعلیؑ ولی مست و با خدا ہشیار
تمام مدح ہوئی پر ہوئی نہ مدح تمام — اب ایک رازِ دلی کا بھی میں کروں اظہار

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ درودیوار

○

روحِ سخن

حُسنِ اَزل تھا فقط غیرتِ صد انجمن — آپ تماشائی تھا آپ ہی جلوہ فگن

آپ ہی نظارہ تھا آپ ہی نظارگی
آپ ہی پروانہ تھا آپ ہی شمع لگن

جلوہ گہہ ناز میں کوئی نہ تھا دلفروش
خود ہی خریدار خود یوسفِ گل پیرہن

آپ ہی اک راز تھا آپ ہی تھا راز دار
آپ ہُوا پردہ در واقفِ سرو علن

علم سے گذرا یہ امر اُس کی مشیت میں جب
کھینچ دیا کن سے ایک دائرۂ انجمن

عالمِ اسرار سے عالم ذر بن گیا
تھا انہیں ذرّات میں رازِ زمین و زمن

ربط عناصر نے دی قوتِ صانع کی داد
خاک کا پتلا بنا صاحبِ کام و دہن

اک نگہِ لطف نے کیا سے یہ کیا کردیا
ماحصلِ آب و گل اور جناں کا چمن

خلقتِ پست وبلند ہوگئی محفل طراز
مل کے نشیب و فراز بن گئی یہ انجمن

آب ہوا زیر خاک فرش بچھا فرش پر
سبزہ کو نیند آگئی پایا جو آرام تن

آب و ہوا کو اُدھر حکمِ تصادم ملا
تازہ بخارات اُٹھے بن گیا چرخِ کہن

عالم ہُو تھا مگر اب یہ طلسمِ جہاں
منظرِ تاریک تھی شمع بغیر انجمن

جلوہ گہہِ خاص سے بھیج دیا اک چراغ
رونقِ فرشِ زمیں زینتِ چرخِ کہن

دیدۂ عبرت سے قبل بھیج دیں نیرنگیاں
شام چلی سوگوار صبح چلی خندہ زن

زیبِ قبا کر دیے کچھ گہرِ شب چراغ
سر سے جو پا تک سیاہ رات کا تھا پیرہن

اُف رے فریبِ نظر کھا گئے دھوکا خلیل
صانع ومصنوع میں ہونے لگا ریب وظن

کیں یدِ قدرت نے صَرف سیکڑوں صناعیاں
اک تن بے روح تھا پھر بھی جہانِ کہن

کرتا تھا جنگل کی شکل سارا جہاں سائیں سائیں
بولتی تصویریں تھیں قصرِ جناں میں مگن

عالم اسباب میں شستہ مذاقی نہ تھی
فطرتِ پُر ہول تھی دہر میں جلوہ فگن

موت کی سی خامشی ارض پہ تھی حکمراں
چرخ پہ تسبیح میں اہلِ فلک نعرہ زن

صبح کے چہرہ پہ یہ نور کا عالم نہ تھا
شب تھی کہ تیرہ لحد کھولے ہوئے تھی دہن

آگ نکلتی تھی گو جب بھی دل سنگ سے
پر دلِ پروانہ تک ہو نہ سکی شعلہ زن

تھے خس و خاشاک و خار لالۂ وگل کی جگہ
فصلِ بہاری سے تھا دور ابھی یہ چمن

اُس کو تھیں منظور پر دہر کی آرائشیں
آدم و حوّا چلے چھوڑ کے اپنا وطن

نالۂ پُر درد سے ہل گیا سارا جہاں
گریۂ آدم سے نام پڑگیا بیت الحزن

بوئے محبت اُڑی بس گئی دنیا تمام
تحفۂ جنت لیے آئے جو یہ مرد و زن

عالمِ طفلی میں تھی سایۂ بابا میں خلق
راہ ترقی میں تھے اہلِ جہاں گامزن

رشک نے قابیل کے ظلم کی ڈالی بِنا
دیکھتے ہی دیکھتے خلق کا بگڑا چلن

آفتیں آئیں ہزار رحلتِ آدم کے بعد
ساکنِ جنت کی نسل ہوگئی وقفِ محن

گھر کو ڈبونے اُٹھا نوح کا طوفاں کبھی
چادرِ آبی ہوئی اہلِ جہاں کا، کفن

باغ جہاں میں چلی گاہ ہوا شعلہ ریز
آتش گل بڑھ گئی پھونک دیا سب چمن

نعرہ ہمرنگ صورگاہ ہُوا بارِ گوش
مرگ قیامت نما پھیل گئی دفعتن

تخت کا کیا ذکر ہے تختے اُلٹتے رہے
حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے توبہ شکن

قہر خدا کو یونہیں ہوتی رہیں جنبشیں
یعنی سزا کفر کی پاتے رہے مردوزن

اُس کی عطا کا نہ تھا جب بھی حساب و شمار
روزِ ازل ہی سے تھا بحرِ کرم جوش زن

مستحقِ لطف تھی پر ابھی دنیا بہت
قابلِ اصلاح تھا اب بھی جہانِ کہن

بذل و عنایات کا اُس کی یہ تھا مقتضا
مومن و کافر کو امن ہو تہِ چرخِ کہن

فطرتِ مامور نے ویسے ہی ساماں کیے
اور ہی کچھ ہوگیا رنگِ زمین و زمن

ہوگئی پیدا تڑپ ذرۂ بے حس میں بھی
جلوہ گہہ قدس سے آئی جو سیدھی کرن

سارے حجاب اُٹھ گئے خیرہ ہوئی چشمِ شوق
اہلِ جہان چونک اٹھے راز کھلا دفعتن

رحمتِ اللعالمیں عالمِ اجسام میں
دیکھ کے حیرت یہ رنگ ہوگئی مہرِ دہن

ساز چھڑا نعت کا مست ہوئے وحش وطیر
نغمۂ لولاک سے گونج گیا ہر چمن

بزمِ فروز آخری شمع رسالت ہوئی
اپنی ہی حد میں مگر نور تھا جلوہ فگن

اپنی تجلی سے تھا آپ ابھی بہرہ ور
اپنی حقیقت پہ تھا آپ اُسے حُسنِ ظن

دل کا نگینہ کوئی نقش کے قابل نہ تھا
مُہرِ نبوت لیے تھا کوئی جلوہ فگن

رمز حقیقت کا تھا، تھا نہ حقیقت شناس
قحط سخن فہم سے تھا وہ سخن در دہن

راہ نما تھا مگر تھا نہ کوئی راہ رو
راہ شریعت کی تھی تھا نہ کوئی گام زن

خلق کا غمخوار تھا، تھا نہ مگر غم شریک
ایک نہ تھا کلمہ گو لاکھ تھے اہلِ سخن

بانیِ اسلام تھا، تھا نہ معاون کوئی
نعرۂ تکبیر تھا، تھا نہ کوئی نعرہ زن

جب رہی دس سال کی منزلِ بعثت کی راہ
تیس برس قبل کا پھر تھا جہانِ کہن

فطرتِ محکوم کے پھر وہی انداز تھے
رحمتِ معبود کا پھر وہی اگلا چلن

ہر در و دیوار پر وجد کی تھی کیفیت
نور کی ایک سیل سی خلق میں تھی موجزن

ہوگیا ہر دشت و در اُس کی جلالت سے پُر
ذرّے زبان بن گئے حمد کے نکلے سخن

عالمِ تکوین میں دوڑ گئی لہر سی
جسم خدا دوست میں خون ہُوا جوش زن

آئی زمیں پر بہار جلوہ گہِ قدس کی
رشکِ جناں بن گیا ملکِ عرب کا چمن

شام سے پیدا ہوئے خلق میں آثارِ صبح
صبح میں پیدا ہوا نور خدائے زمن

در ہوا پیدا نیا کعبہ کی دیوار میں
کعبہ میں پیدا ہوئے حیدر خیبر شکن

قلب میں پیدا ہوا ولولۂ منقبت
مطلع تو بن گیا جوشِ بہارِ سخن

گود میں لے دوڑ کر کیوں نہ رسولؐ زمن
مسلم اول ہُوا خلق میں جلوہ فگن

مسلم اول کہوں یا کہوں اسلامِ کُل
غزوہ خندق کے دن تھا جو نبیؐ کا سخن

گود میں محبوب کے جو بھی ہو محبوب ہے
مصحفِ معبود ہو یا ہو امامِ زمن

آگئیں قرآں سے قبل نور کی دو صورتیں
ایک وصیِ رسولؐ ایک رسولِؐ زمن

شانِ خدا دیکھ اے چشمِ حقیقت نگر
مسکنِ اصنام میں خلق ہُوا بُت شکن

کفر پہ اسلام کا وار یہ پہلا ہُوا
شہرۂ آفاق ہے قصۂ سیلی زدن

ایک طمانچہ سے منہ پھر گیا بوجہل کا
خوب مقابل ہوئے بت شکن و برہمن

جوشِ ولا میں عجب نعمتِ عظمیٰ ملی
مطلع تازہ ہُوا شاملِ سلکِ سخن

چاردہ معصوم میں نفسِ رسولؐ زمن
اول اثنا عشریا دومِ پنجتن

سرورق کائنات مفتخر شش جہات
عبد الٰہی صفات خاص خدائے زمن

نور نبیؐ کا شریک یک و تنہا شریک
معتمد لا شریک منتخب انجمن

صاحب لطفِ عمیم ابنِ کریم و کریم
دینِ خدا کا حکیم نبض شناسِ سخن

مظہرِ آیاتِ حق موجبِ اثباتِ حق
آئینۂ ذاتِ حق مثلِ رسولؐ زمن

سالکِ راہِ رضا شاغلِ بذل و عطا
شکر الٰہی غذا نور خدا پیرہن

سر ہے کہ سجدہ میں خم دل میں خیالِ کرم
پاؤں سے ثابت قدم ہاتھ سے خیبر شکن

آپ کو سمجھا ہُوا غیر کو بھولا ہوا
درد میں ڈوبا ہوا عشقِ خدا میں مگن

سب سے بڑا فلسفی سب سے بڑا منطقی
سب سے بڑا آدمی بعد رسولؐ زمن

قدسی و قدسی اساس نوری و نوری لباس
جوہر و جوہر شناس جلوہ و جلوہ فگن

نازشِ ربِ ودود از عدم و تا شہود
تجھ پہ سلام و درود جانِ رسولؐ زمن

جسم وہ اُٹھا حجاب کوئی ہُوا بے نقاب
دیکھ بہشتی شباب قدرتِ ربِّ زمن

مدحت حاضر میں پڑھ مطلع روشن کوئی
اہلِ نظر چونک اُٹھیں وجد کرے انجمن

کیوں ترے ہر لفظ پر ہو نہ فدا علم و فن
سامعۂ باطنی جب ہو ہنائے سخن

تزکیہ نفس ہی تھا ترا اک معجزہ
صاحبِ اعجاز تھا گرچہ تو بے ریب وظن

تابع فرماں تری قوتِ تحکیمِ نفس
تصفیۂ قلب سے واقف سرو علن

عالمِ اجسام پر غلبۂ روحانیت
مادیت پر دراز پنجۂ خیبر شکن

نقص کا امکاں نہ تھا اُف رے عروجِ کمال
ظاہر و باطن وہی قربِ خدائے زمن

مصلحِ عالم تھا تو مصلحِ اعظم کے بعد
تھا جو نبیؐ کا شعار تھا وہی تیرا چلن

تجھ سے ہُوا تکملہ مقصدِ اخلاق کا
باغِ جہاں میں کِھلا حُسنِ عمل کا چمن

پاک کیا تو نے ہی نفس و خیالات کو
دور کیا کفر کا سب نے لباسِ کہن

تھا عوض وانتقام اہلِ عرب کا شعار
تو نے سکھایا اُنہیں عفو و عطا کا چلن

کعبہ کے بت کچھ نہ تھے تو نے مٹایا اُنہیں
سب سے بڑے بُت جو تھے رسم و رواجِ کہن

مان لیا سب سے قبل کلمۂ توحید کو
تجھ سا نہ دنیا میں تھا نبض شناسِ سخن

تو تنِ اسلام میں روحِ رواں بن گیا
تجھ سے قوی ہوگئے، تھے جو ضعیف البدن

پیش کیا تو نے یوں خلق میں اسلام کو
حُسنِ عمل تھا ترا شاہدِ حسنِ سخن

حق پہ ہوئے مجتمع چار ہی فقروں میں سب
ہے ترے خطبہ کی داد طاعتِ اہلِ یمن

بزم ہو یا رزم ہو خواہ سفر یا حضر
محو تھے تعلیم میں تیرے زبان و دہن

تول دیا عقل پر شرع کے قانون کو
خوبیٔ اسلام پر دال ہوا ہر سخن

منظرِ فطرت پہ تھا گاہ تیرا تبصرہ
رفعتِ احساس پر تھا کبھی گرمِ سخن

قوتِ سائنس پر تو نے جو کھولی زباں
فلسفہ سقراط کا بھول گئے اہلِ فن

پاک تمدن ہوا تجھ سے عرب کو نصیب
بحرِ کرم سے ترے دُھل گئے عیبِ کہن

تو نے بتائی تھی جب وقت کی قیمت ہمیں
وقت پرستی ہے اب مغربیوں کا چلن

حرمتِ نسواں میں بھی تو نے ہی تقدیم کی
دعویِ تہذیب میں اب ہے جہاں نعرہ زن

تحتِ کلام خدا فوقِ کلامِ بشر
تیرے سخن پر ہے یہ تبصرۂ اہلِ فن

اہلِ ریاست ہیں آج تیری سیاست پہ دنگ
بن گیا قانون وہ منہ سے جو نکلا سخن

تیری حکومت میں تھے جوہرِ جمہوریت
تیری طبیعت میں تھا جذبۂ حب وطن

خامہ و تاریخ تھے قبضہ اغیار میں
محو نہ پر کر سکے تیرے صفاتِ حسن

مد نظر تھی تجھے منفعتِ عامّہ
گرچہ ہوئے بہرہ ور خاص خدائے زمن

تیری طبیعت پہ تھا اُس کی طبیعت کا عکس
وحی خدا بن گیا جس کی زباں پر سخن

تو فقرا کا انیس تو غربا کا جلیس
عاجز و درماندہ تھے تیرے کرم سے مگن

دشمن و قاتل کے بھی درد کا احساس تھا
اپنی مصیبت پہ تھا شکر خدائے زمن

خوف الٰہی میں تو رات کو گریاں ملا
صبح نے لب پر ترے حمد کے دیکھے سخن

اُن کی رعایت نہ کی تھے جو ترے جان و دل
جادۂ انصاف پر تو جو ہُوا گام زن

روزوں میں دن کٹ گئے فاقوں میں گذریں شبیں
پھر بھی بجز شکر کچھ منہ سے نہ نکلا سخن

اپنی شہادت کو جو فتح سے تشبیہہ دے
ایسا سپاہی کوئی ہے تہِ چرخِ کہن

لائیں تو اہلِ نظر سامنے ایسی مثال
ڈھونڈ لیں دنیا نئی یا کہ زمانِ کہن

ہے ترا نفسِ عظیم فکر جہاں سے بلند
معترف عجز ہوں کیوں نہ زبان و دہن

جوشِ مسرت ادب ہیں تن و جاں پر محیط
کیفیت مدح خود ہوگئی مُہرِ دہن

دل ترے فیضان سے حشرِ انوار ہے
حشرِ تجلّی میں گم شاعرِ شیریں سخن

○

صبحِ لطیف

مسجودِ عقل و ہوش ہی فطرت کو وہ جوہر دیا
خلّاقِ کیف و رنگ نے قطرہ میں طوفاں بھر دیا

اک پیکرِ موہوم کو دیں اس قدر رنگینیاں
دنیائے عیب و حسن کا اک جزو لازم کر دیا

چاروں عناصر مل گئے قائم ہوا عنواں نیا
جذب و کشش کے دور نے جب حکمِ صورت گر دیا

ایسی کرم کی وسعتیں بچھوا دیا فرشِ زمیں
یہ جوشِ فیضِ عام کا جس نے سمندر بھر دیا

ڈالی جہانِ پست میں اونچے پہاڑوں کی بنا
حدِ نظر ہوتے مگر گردوں سے نیچا کر دیا

جنگل کی مستانہ ہوا چشموں کے بہنے کی صدا
فطرت کی خاموشی میں بھی قدرت نے نغمہ بھر دیا

چاند آسماں پر رہ گیا بھیجی کہاں تک چاندنی
فرشِ زمیں میلا سا تھا اک دوسرا بستر دیا

افلاک نے تسبیح کی تارے نچھاور ہو گئے
دریا نے لب کھولے ہی تھے منہ موتیوں سے بھر دیا

حد سے بڑھا بحرِ کرم اور صبحِ صادق بن گیا
یعنی کہ دم بھر کے لیے دنیا کو جنت کر دیا

راتیں بنا دیں عیش کی پھر صبح ہونے کے لیے
تسبیح نکلی دل سے خود آرام یوں شب بھر دیا

ظالم کو خوابِ بد ہوا مظلوم کو آرامِ جاں
شب کی ہوائے سرد نے جھونکا جو خواب آور دیا

بھیجا نسیمِ صبح کو یہ چارہ سازی دیکھنا
بیمار کو بھی دو گھڑی آرام تکیہ پر دیا

جو لالۂ گلزار میں قدرت کی یہ فیاضیاں
ایک ایک مشتِ خاک کو ایک ایک مٹھی زر دیا

مٹی نکھر کر گل بنی دنیا معطر ہو گئی
تھا عنصری پیکر مگر جانِ لطافت کر دیا

شایانِ فصلِ گل نہ تھی عریانیِ صحنِ چمن
بیگانہ تھا سبزہ مگر فرشِ مکلّف کر دیا

یہ قوتِ نشوونما اک عنصرِ بے آب میں
ذرّے بگولے بن گئے جب خاک کو چکّر دیا

رگ رگ میں آب و گل ہی پر یہ مدرتِ جوشِ نمو
پھوٹی وہیں کونپل نئی جس شاخ میں نشتر دیا

ساری بہارِ زندگی گویا ہنسی میں لٹ گئی
غنچوں میں جتنا حُسن تھا صَرفِ تبسم کر دیا

اُس منزلِ مافوق کی کیا جانے کیا ہوگی بہار
عالم جو اس قابل نہ تھا وہ نعمتوں سے بھر دیا

شاید ہو زیبِ تاجِ سرابِ انتہا کی کیا خبر
یہ ابتدائے لطف ہے قطرہ کو گوہر کر دیا

ہر شکل سے پیدا کیا اک زندگی کا زمزمہ
جاں پیکر آدم کو دی یا نَے میں نغمہ بھر دیا

وہ وقت بھی کیا وقت تھا جب عشق کی تخلیق کی
کچھ گل میں خوشبو بن گیا کچھ جزو آدم کر دیا

آنکھیں تو زیبِ جسم تھیں ادراک کا جوہر نہ تھا
کی شمع روشن عقل کی گھر میں اُجالا کر دیا

یہ لینے والے کی سمجھ کر دے اگر مائل بہ شر
یہ دینے والے کا کرم پہلو میں دل بے شر دیا

چھوڑا بشر کی فہم پر دیر و حرم کا فیصلہ
مفہوم سجدہ خود بنا سجدہ کی خاطر سر دیا

مستور قوت ان میں ہے دل کھینچے والی کوئی
یہ تو میں کہہ سکتا نہیں آنکھوں میں جادو بھر دیا

ہے ابتدائے زندگی اک عالمِ معصومیت
انساں بنایا بعد ازاں پہلے فرشتہ کر دیا

جنت کی رعنائی لیے آیا شبابِ مضطرب
تخیل کی دنیا ملی جذبات کا محشر دیا

اس بزمِ رنگا رنگ میں حیراں نہ رہ جائے بشر
یوں رفتہ رفتہ دی سمجھ یوں علم خشک و تر دیا

خود فطرتی رہبر ہوئی دنیائے اسباب و علل
ہر ذہن کو آمادۂ فکر مسبب کر دیا

دنیا بسانے کے لیے راہِ تمدن کھول دی
انساں بنانے کے لیے اخلاق کا جوہر دیا

لطفِ بہارِ عیش کو اسبابِ غم پیدا کیے
وہبہ نشاط دائمی دو اک غموں کو کر دیا

رکھی زبان و نطق میں ترکیب اعجاز سخن
اک حرف مطلب کے لیے قبضہ میں اک دفتر دیا

اپنے غرور علم میں بھولے معلم کو بشر
دیں فلسفہ پر قوتیں منطق پر حاوی کر دیا

محبوب شکلیں مٹ گئیں الفت کے رشتے کٹ گئے
آنکھیں بشر کی کھل گئیں جب صبر کا جوہر دیا

ذرّے زمیں کے بن گئے ہر چند پتلے خاک کے
جولانیِ تخیل میں تاروں سے اونچا کر دیا

حیرت فرشتوں کو ہوئی انساں نوازی دیکھنا
پہلا ہی انسان تھا جسے اعزازِ پیغمبر دیا

اک نقشِ آب و رنگ ہے انسان کی ہستی ہی کیا
کارِ نبوت لے لیا اتنا توانا کر دیا

کس کی نظر تھی نوحؑ پر جو آدمِ ثانی ہوئے
دنیا بساوی دوسری کشتی کو کیا لنگر دیا

پردے کے اکثر تھے گلے پردہ بھی اک دن اُٹھ گیا
آ کر غشی نے بیچ میں اک اور پردہ کر دیا

کس رنگ میں داؤدؑ سے خدمات لیں توحید کی
ایک ایک گوشِ ہوش میں سچا ترنم بھر دیا

بخشش کی حد ہے بخش دیں اپنی صفاتِ خاص بھی
عیسیٰؑ کی باتیں دیکھیے مُردوں کو زندہ کر دیا

دنیا میں روح اللہ بھی آئے کلیم اللہ بھی
جو قوم جس کی اہل تھی ویسا اُسے رہبر دیا

کچھ نعمتیں مخصوص تھیں مخصوص لوگوں کو ملیں
اسلام سا مذہب ہمیں روشن سے روشن تر دیا

بندوں میں سب محسوب تھے سب پر کرم کی تھی نظر
مسلم مگر محبوب تھے محبوب پیغمبرؐ دیا

نکلی جبال و دشت سے اللہ اکبر کی صدا
اک اک زبانِ گنگ کو قدرت نے گویا کر دیا

ہیجان سا پیدا ہوا دنیائے آب و رنگ میں
اک نور کی صورت نے جب پیغامِ صورت گر دیا

ذرّے بھی اُبھرے خاک کے پیغام کی تعظیم کو
سوئی ہوئی فطرت اُٹھی حس بے حسوں میں بھر دیا

اس عالَمِ کہنہ سے اک عالم نیا پیدا ہوا
اخلاص نے کی رہبری ایماں نے دل میں گھر دیا

توحید کی آئی سحر تقدیس کی اُمڈیں شبیں
دنیا کے عرض وطول میں اک زمزمہ سا بھر دیا

معصوم کے سن کی طرح بڑھتی رہی نورانیت
مکہ کی قسمت کھل گئی تنویر سے گھر بھر دیا

چمکی بیاضِ دہر پر آخر کو وہ صبحِ لطیف
ہر ذرۂ ناچیز کو حسنِ مہ انور دیا

آفاق میں روشن ہوئی قندیلِ خورشیدِ فلک
رخصت ہوئی شب شدتِ انوار نے دن کر دیا

روشن چراغِ گل ہوا ہر کشورِ گلزار میں
بادِ صبا نے چھیڑ کر غنچہ کو شعلہ کر دیا

آباد وہ گھر بھی ہوا صدیوں سے جو تھا بے چراغ
قسمت صدف کی جاگ اُٹھی وہ بے بہا گوہر دیا

ہاشم کا گھر روشن ہوا ملت خلیل اللہ کی
مولا علیؑ کے نور نے کعبہ کو روشن کر دیا

مداح کے دل میں ہوا روشن چراغِ معرفت
اک مطلع نو فکر نے روشن سے روشن تر دیا

معصوم کی آغوش میں معصوم کو لا کر دیا
دولت خدا کے گھر کی تھی دامن نبیؐ کا بھر دیا

نور رسالتؐ سے ہوا نور امامتؑ متحد
اس اتحادِ حسن نے قوموں کو یک جا کر دیا

اک شان رب العالمین اک رحمت اللعالمین
تنزید کا اُن کو انہیں تقدیس کا پیکر دیا

تحریک کا ان کو انہیں تائید کا منصب ملا
ان کو نبوت کا وصایت کا انہیں کشور دیا

یہ صورتیں ہیں دیدنی جن پر ہو قرآں کا نزول
سمجھی تھی دنیا حسن کو یوسفؑ کا حصہ کر دیا

آدمؑ کی پیشانی میں تھا مفہومِ سجدہ ان کا نور
رتبہ قدم آدم انہیں آدمؑ سے بالا تر دیا

وہ روح ہے الفاظ میں خود بول اُٹھتا حرف حرف
ان کی فصاحت نے مگر قرآں کو صامت کر دیا

وہ مطلع روشن پڑھوں اے حسن معنی المدد
دل بول اُٹھیں حضار کے محفل کو روشن کر دیا

کھلتے ہی آنکھ آرام کو زانوئے پیغمبرؐ دیا
یا نقشبند حسن نے قرآں پہ قرآں دھر دیا

خالق کے گھر پیدا ہوئے اپنے نبیؐ کے گھر پلے
دنیا میں گھر اللہ نے دنیا سے بالا تر دیا

مطلوب کا مطلوب تھا حسنِ طلب کیا خوب تھا
محبوب کے محبوب کو جو کچھ دیا چن کر دیا

ہاتھوں کو دیدی مقدرت آنکھوں میں بھر دی معرفت
سجدہ نے پائی منزلت افسر کو ایسا سر دیا

لب مصدر حمد و ثنا دل مصرفِ صبر و رضا
بازو دیے خیبر کشا سینہ میں قرآں بھر دیا

سرِ خفی نصِ جلی پہلا ولی پہلا علی
کیا نام رکھا یا نبیؐ اعلیٰ سے مشتق کر دیا

یکتا امامِ اولیں مسند نشین و دل نشیں
وہ جانِ ایمان و یقیں ایماں دلوں میں بھر دیا

تعبیر حرفِ انما تفسیر رازِ ہل اتےٰ
وہ قبلہ و قبلہ نما سر نذرِ سجدہ کر دیا

مفہوم کن مقصود کل سرمایۂ ختم رُسلؐ
وہ جنت الاعلیٰ کا گُل خوشبو سے عالم بھر دیا

غمخوار و دمسازِ نبیؐ تنہا ہم آوازِ نبیؐ
رازِ خدا رازِ نبیؐ قدرت نے کیا رہبر دیا

ہے عقل کُل بھی مبتدی وہ انتہا کا منتہی
وہ فخرِ آدم آدمی دنیا کو جنت کر دیا

فخرِ سلف نامِ خدا نورِ نگاہ مصطفےٰؐ
بنت اسد کا لاڈلا جس نے لقب حیدرؑ دیا

یوں امرِ حق جاری کیا اپنا لہو پانی کیا
سب صرفِ حق کوشی کیا حق نے جو زور و زر دیا

کارِ براہیمی کیا کعبہ کو کعبہ ہی کیا
اصنام سے خالی کیا روحانیت سے بھر دیا

کہنے کی سو باتیں ہیں پر مسند کے قابل تھا وہی
ہجرت کی شب سرکار نے اپنا جسے بستر دیا

منظورِ اہلِ بزم ہے کچھ مدحتِ حاضر بھی ہو
پردہ وہ اُٹھا حجم وہ ساماں خدا نے کر دیا

یہ اتحاد جسم و جاں تیری ولا نے کر دیا
اقرارِ اُلفت لے لیا جب روح کو پیکر دیا

تیری ہی ذاتِ پاک تھی تصدیق کی روشن دلیل
دنیا کو جب اسلام نے تمییز خیر و شر دیا

ہر رنگ میں ہر وضع میں ہر شان میں تبلیغ کی
ہر فعل کو وابستۂ تعمیر قومی کر دیا

تختِ حکومت پر دیے حکام غافل کو سبق
آیا جو بزمِ فقر میں جوشِ قناعت بھر دیا

تلوار کی جنبش میں بھی دکھلا گیا شانِ کرم
دشمن کو موقع صلح کا پیش از وغا اکثر دیا

تعلیم سے تیری ہوئیں عقبیٰ کی امیدیں قوی
دنیا کو چشمِ ہوش میں خوابِ پریشاں کر دیا

تیری نگاہِ لطف ہے دنیائے دل کی عافیت
تو نے نویدِ امن دی جس نے دلِ مضطر دیا

باہر ہوئے کعبہ سے بت نکلا دماغوں سے فتور
مسکن جہاں تھا کفر کا ایمان کا گھر کر دیا

تیری بدولت آج تک ہیں مالکِ سیف وقلم
قبضہ ترے احسان نے مسلم کو دونوں پر دیا

اصلاح کی عادات کی تصحیح کی جذبات کی
آگاہ نیک وبد کیا احساسِ خیر و شر دیا

دختر کشی تھی جن کی خُو ان کو بنایا نفس کش
جو مردمی کی جان تھا مردوں کو وہ جوہر دیا

سولہ برس کی عمر میں یہ فیصلے کی قوتیں
توحید کے اقرار نے دنیا کو حیراں کردیا

ہے صفحۂ تاریخ پر ہر لفظ نقشِ کالحجر
دنیا مٹا سکتی نہیں جو نقش تو نے بھر دیا

اقوالِ فطرت بن گئے احکامِ حکمت بن گئے
تو نے شریعت کا سبق یوں عین فطرت پر دیا

ہو قوم بے پروا عرب پروانۂ شمع یقیں
اے جانِ ختم المرسلینؐ کیا دل میں جذبہ بھر دیا

زاہد سپاہی فلسفی حاکم ولی شاعر ادیب
کن مختلف اوصاف کا حق نے تجھے پیکر دیا

اب تک ہیں تیرے نام کے آفاق میں نعرے بلند
قدرت نے جوش اسلام کا سب یا علیؑ میں بھر دیا

نفس اور علاجِ نفس میں ہے کس قدر فرق عظیم
بعد نبیؐ چپ نے تری دنیا پہ ثابت کردیا

زور آگیا ایمان میں زردے کے تیرے نام پر
سائل بھی خوش مسئول بھی دونوں کا دامن بھر دیا

دنیا میں کس عنوان سے تو نے گزاری زندگی
کیا فقر و فاقہ کو شرف اورنگِ شاہی پر دیا

آغوش تیری وا رہی ہر دم یتیموں کے لیے
تیرے یتیموں کو عوض دنیا نے پر کیونکر دیا

ناظر ہیں دن تسبیح کے شاہد شبیں تہلیل کی
ذوقِ عبادت نے ترے دن رات یکساں کردیا

صبر و رضا کی منزلیں یوں مُسکراتے کاٹ دیں
جو زخم دل حاصل ہوا شکرِ خدا سے بھر دیا

یا تجھ کو ساری عمر میں خوف خدا رُلوا سکا
یا مرسلِؐ حق کو کفن تو نے بچشم تر دیا

اخلاق سکھلایا ہمیں قاتل کو دے کر جامِ شیر
یوں کسی نے جاں دے کر سبق اے مالکِ کوثر دیا

نکلا نہ تیری شان کا اولادِ آدمؑ میں جواں
جب تو لڑکپن میں وصی اپنا نبیؐ نے کردیا

خیرؐ البشر سمجھا تجھے یا مالک جن وبشر
فہم بشر سے مرتبہ خالق نے بالا تر دیا

اب مدح میں جوش آگیا آنکھیں کھلیں ہوش آگیا
جب تک رہا مدہوش میں پھولوں نے دامن بھر دیا

اب کیا مجال دم زدن ساکن قلم شاعر خموش
ترکیب عجز و شوق نے اک دوسرا پیکر دیا

حسن اور کمال حسن میں مخفی رہی طلعت تری
اتنا بھی تجھ سے آشنا تیری ولا نے کردیا

جلوۂ معصوم

قوتِ تخئیل سے کچھ کام لے کر دیکھیے
خوابِ خوش خواب پریشاں کوئی منظر دیکھیے

حیاتِ ذہن کی بیداریاں خطرہ میں ہیں
کس قدر بے حس ہیں سوتوں کو جگا کر دیکھیے

اک مرقع ایک صورت ایک ہیولیٰ تو بنے
پھر ہو کب ربطِ دماغ و دل میسر دیکھیے

دور کس حد تک ہیں دنیائے تخئیل کی حدیں
وسعتِ ہمت سے کم ہیں یا برابر دیکھیے

اپنی یہ دنیا سما سکتی ہے اس میں یا نہیں
یہ فسانہ مختصر ہوتا ہے کیونکر دیکھیے

پردۂ موہوم پر کس طرح کھنچتے ہیں خطوط
کام کیا کرتا ہے وہمی آئینہ گر دیکھیے

سطحِ بے بنیاد پر کیونکر اُبھرتے ہیں نقوش
نازکی کیوں کر اُٹھاتی ہے یہ لنگر دیکھیے

کس طرح مفہوم کرلیتا ہے پیکر اختیار
کس طرح مستور بن جاتا ہے مظہر دیکھیے

معنویت کی جگہ لیتی ہے صورت کس طرح
جسم سے کیونکر بدل جاتا ہے جوہر دیکھیے

کون پھیلاتا ہے احساسات میں اک روشنی
تیرگی کس طرح ہوتی ہے منوّر دیکھیے

کیسا حِس مستقل اور کس قدر بے اعتبار
ہے یہ فطرت کا عطیہ اس کے جوہر دیکھیے

ابتدا تخئیل میں مضمر ہے ہر تکمیل کی
نقشِ مانی دیکھیے یا صنعِ آذر دیکھیے

فکر کی نشوونما کا اس کو مرکز پایئے
ارتقا کی منزلوں میں اس کو رہبر دیکھیے

کیجئے گر اپنے علمی کارناموں پر نظر
فلسفہ کا مبتدا منطق کا مصدر دیکھیے

منتظم بزمِ تمدن میں سیاست میں شریک
نظم کی دنیا میں جانِ ہر سخنور دیکھیے

صنعتیں اس کی اُڑائے پھرتی ہیں انسان کو
آج دریا میں تو، کل موجِ ہوا پر دیکھیے

قوتیں سوتی ہیں سب شانِ تخئیل ہے وہی
خواب کے عالم میں اک دنیائے دیگر دیکھیے

خوابِ خوش میں اک تبسم وہ لبِ معصوم پر
دل یہ کہتا ہے یہ نظارہ مکرر دیکھیے

ہے تخئیل کی بدولت ہی تصوّر کی نمود
دیکھیے اس آئینہ میں اس کے جوہر دیکھیے

ایک کونے میں سما جاتے ہیں کوہِ پُرشکوہ
لہریں اک گوشہ میں لیتا ہے سمندر دیکھیے

منزلِ مقصود یا محبوب کا عشرت کدہ
دور والوں کو قریں سے بھی قریں تر دیکھیے

پاسباں ہیں اور نہ درباں مانعِ دیدارِ دوست
زندگی بھر کی ہو فرصت زندگی بھر دیکھیے

کیجئے سیرِ تصوّر خوشگوار و ناگوار
ہے یہ فطرت کا تقاضا دیکھیے پر دیکھیے

شکلیں اعمالِ زبوں کی نیکیوں کی صورتیں
دیدنی نا دیدنی مسرور و مضطر دیکھیے

بچئے خود اپنے خیالی پیکروں سے کس طرح
آنکھ اُٹھا کر دیکھیے گردن جھکا کر دیکھیے

ربط کیجے نا امیدی کی ڈراؤنی شکل سے
اک رُخی تصویریں اُمیدوں کی اکثر دیکھیے

واہمہ خلّاق ہے پھر وہ نہ کیوں خلّاق ہو
اس حقیقت میں نہاں یہ سرِّ اکبر دیکھیے

آنکھ سے پنہاں قلمکارِ تصوّر کی طرح
صنعتوں کو اُس کی ظاہر اس کو مضمر دیکھیے

روح ہے جو اور نہ پیکر اُس کی عظمت سوچیے
مادّہ ہے جو نہ جوہر اُس کے جوہر دیکھیے

خالقِ تخئیل بھی خالقِ محسوسات بھی
خود ہے باہر ان حدوں قیدوں سے کیونکر دیکھیے

اُس کی ہر مخلوق ہے تکمیل میں اپنی مثال
چشم پوشی کس سے کیجئے کس کے جوہر دیکھیے

روز پھیلاتے ہیں مہر و ماہ اپنی روشنی
نور کم ہوتا نہیں یہ شانِ داور دیکھیے

سیر کب سے ہو رہے ہیں تشنہ کامانِ جہاں
آج تک بھر پور دامانِ سمندر دیکھیے

اُٹ رہا ہے اور خزانہ میں کمی ہوتی نہیں
خاک کے ذرّات سے پیدا شِ زر دیکھیے

اب گئے ہیں روند کر ملکِ عدم کے قافلے
جی اُٹھا پھر سبزۂ پامال مڑ کر دیکھیے

شمع سے ہے عشق پروانہ کا قائم آج تک
ہر پتنگے میں وہی اک آگ مضمر دیکھیے

گُل کھلانے میں وہی فطرت نسیمِ صبح کی
آبِ نیساں سے وہی تخلیق گوہر دیکھیے

بوئے گل ہو یا کہ گُل ہو جب پریشاں ہو گئے
مادّہ میں مادّہ جوہر میں جوہر دیکھیے

اُٹھتے جاتے ہیں بشر قائم ہے ترتیبِ اُمور
ہے وہی صورت نظامِ زندگی گر دیکھیے

کیسی باترتیب محفل گنبدِ رقصاں میں ہے
حشر تک دنیا یونہی قائم زمیں پر دیکھیے

ایسے کامل اُس کے بندے جن سے قائم ہے زمیں
وہ کمال اور وہ جمالِ روح پرور دیکھیے

حُسنِ یوسف زہدِ عیسیٰ شانِ موسیٰ علمِ نوحؑ
منضبط اوصاف سے دفتر کے دفتر دیکھیے

جلوے جن آنکھوں نے دیکھے تھے وہ آنکھیں اور تھیں
یہ مناظر چودھویں صدی میں کیونکر دیکھیے

بیٹھیے غرقِ تصوّر ہو کے دنیا سے الگ
کس لیے اک اک کا منہ حیران و ششدر دیکھیے

سیرِ جنت کیجیے گر ایمانِ بالایقان ہے
ہے تخیّل پاک اگر پاکیزہ منظر دیکھیے

ہے اگر نعمت میسر رفعتِ احساس کی
کس جگہ ہے جنتِ ارضی زمیں پر دیکھیے

کون سے گوشہ میں ان کی جلوہ گاہِ ناز ہے
کس طرح ہوتی ہے رحمت کی نچھاور دیکھیے

وہ حرم والی زمیں وحدت سے متوالی زمیں
ہے جہاں پر احمدؐ و محمود کا گھر دیکھیے

سب سے پہلے یہ زمیں ہوگی رسالت کی گواہ
سنگریزے منہ سے بولیں گے یہیں پر دیکھیے

اس کی ندرت زا روش اس کی ولا پرور فضا
آج بھی کچھ کہہ رہی ہے بندہ پرور دیکھیے

گوشہ گوشہ سے اُبلتا ہے یہ اک سیلابِ نور
یا یہ اوڑھے آبِ کوثر کی ہے چادر دیکھیے

پھر خلیلی گلکدہ میں کوئی گُل کھلنے کو ہے
گلکدہ ہو یا دو عالم ہوں معطر دیکھیے

ان بنی ہاشم کے چہرہ ہیں دلوں کے آئینہ
دیکھیے صدق و صفا کے ان میں جوہر دیکھیے

ہیں ابوطالبؑ کے گھر میں کچھ مسرّت کے نشاں
کچھ متانت زا تبسم ہے لبوں پر دیکھیے

ہے کسی کے عقدۂ دل میں کشایش کی نمود
برہمی منقود ہے زلفِ معنبر دیکھیے

ہیں حرا کے غار میں سجدوں پہ سجدے شکر کے
خانۂ کعبہ میں ہے میلادِ حیدرؑ دیکھیے

ہے قلوبِ مستند میں جوشِ الفت کس قدر
حجم مطلع تو کوئی پُرکیف پڑھ کر دیکھیے

روئے حیدرؑ دیکھیے سوئے پیمبرؐ دیکھیے
دیکھ کر ماہِ رجب قرآں مقرّر دیکھیے

دس برس پہلے جہاں میں آگیا اسلام کیا
کس کو لپٹائے ہیں سینہ سے پیمبرؐ دیکھیے

کیوں نہ ہوں جوہر شناس آخر نبی ہونے کو ہیں
پتھروں میں سے یہ چُن لاتے ہیں گوہر دیکھیے

معرفت کا اور اک نور آرہا ہے نور پر
کہہ رہا ہے کچھ برادر سے برادر دیکھیے

دیکھنے قابل تو جب ہوگی پیمبرؐ کی خوشی
کب یہ بچہ ہو برابر کا برادر دیکھیے

ہے کسی امرِ اہم میں استعانت کی اُمید
صاف تیور کہہ رہے ہیں روئے انور دیکھیے

ان کا بڑھنا کیا فقط حکمِ خدا کی دیر ہے
کود میں آج اور کل دوشِ نبیؐ پر دیکھیے

ختم تھا ختمِ رسلؐ پر منصبِ پیغمبری
کردیا حق نے انہیں نفسِ پیمبرؐ دیکھیے

جمع ہیں اب شرح و مصحف بیچ میں کون آسکے
یاں مجال اتنی نہیں ہے آنکھ اُٹھا کر دیکھیے

بس انہیں دو صورتوں میں ختم ہے قرآں تمام
ہیں انہیں کے لعل لب قرآں کے مصدر دیکھیے

آتے ہی آغوش میں تھے بانیِ اسلام کی
نرغۂ اصنام سے نکلے ہیں کیونکر دیکھیے

بُت ہیں بے بس بُت شکن جاتا ہے کعبہ ہے خموش
اب یہاں کس شان سے آئے پلٹ کر دیکھیے

مطلعِ نو ہے کہ قولِ راکبِ دوشِ نبیؐ
پہلے مجھ سے سُنیے اور پھر آپ پڑھ کر دیکھیے

آیئے کعبہ میں اور معراجِ حیدرؑ دیکھیے
عرش پر ہیں پاؤں یا دوشِ نبیؐ پر دیکھیے

ابتدا کی انتہا ہے انتہا کی ابتدا
جز نبیؐ اتنا کوئی حق سے قریں تر دیکھیے

مقتدا بعدِ نبیؐ پہلا نبیؐ کا مقتدی
ہر طرح یعنی وہی قربِ پیمبرؐ دیکھیے

امرِ حق کی خواہشیں حق کے کرم پر نازشیں
راہِ دیں میں کاہشیں جذباتِ انور دیکھیے

ہاتھ میں قرآں رہا یا ذوالفقارِ برق زا
راسخون ولا فتیٰ میں شانِ حیدرؑ دیکھیے

آمرِ احد بعدِ نبیؐ بے جدّ و کد
سابقون ہے سند فرمانِ داور دیکھیے

خامشی امرِ حسن کویائی محبوبِ زمن
معنیِ قرآں سخن اوجِ سخنور دیکھیے

میہمان کعبۂ حق میزبانِ مصطفیٰؐ
یہ نشانِ منزلت یہ شانِ حیدرؑ دیکھیے

سید المسلم امامِ الاولیا صاحب لواء
اہمیت ان منصبوں کی ان کا لنگر دیکھیے

زوجِ زہراؑ خویشِ احمدؐ بوالحسینؑ و بوالحسنؑ
کیسے بے ہمتا یگانے ہیں میسّر دیکھیے

الامین والمصفی الساجد و المرتضےٰ
ہیں خطابِ پاک یا ہموزن گوہر دیکھیے

راجع الحق مرجع الحق ناصر الحق سیفِ حق
کیوں نہ سیفِ حق میں نامحدود جوہر دیکھیے

شرع و شارع شرح و شارح امر و آمر بالصوص
سربسر گنجینۂ اسرارِ داور دیکھیے

نور میں شامل نسب میں ایک قرآں میں شریک
کیوں نہ زیبا خلعتِ نفسِ پیمبرؐ دیکھیے

بزم میں ہمدم دغا میں ساتھ ہجرت میں معین
ان حدوں میں معنیِ نفسِ پیمبرؐ دیکھیے

متحد صبر و رضا میں فقر و فاقہ میں شریک
ہر کڑی منزل میں ہمراہِ پیمبرؐ دیکھیے

اُمتِ محبوبِ حق ہو یا سفینہ نوحؑ کا
فی سبیل اللہ ہر کشتی کا لنگر دیکھیے

مطلعِ نو سُن کے سُنیے مدحتِ طرزِ جدید
آیئے اس آئینہ میں اور جوہر دیکھیے

نسلِ آدم کی بنا کا سر اکبر دیکھیے
آدمی دیکھے ہیں لاکھوں آدمی گر دیکھیے

عقلی و نقلی عوالم کا مجاہد بے بدل
منتہائے فارسِ میدانِ خیبر دیکھیے

یک و تنہا مسافر خالص و یکتا مقیم
منزلِ تسلیم میں بعدِ پیمبرؐ دیکھیے

ہے جہاں دنیا گرفتار تردّد فی الکلام
شکرِ انعام الٰہی ان لبوں پر دیکھیے

اُس کے لفظوں سے کیے دنیا نے مستنبط علوم
منتہائے علم کس سے آنکھ لے کر دیکھیے

بیس جلدوں میں ہو جب تشریح خطبوں کی فقط
صورتِ کُن کیوں نہ ہر نقطہ میں دفتر دیکھیے

شعبی وسلمی بن عباس ابوالاسود کمیل
ریزہ خوار و خوشہ چین علم حیدرؑ دیکھیے

جس نے ان کی آڑ پکڑی دستگیرِ خلق ہے
اک زمانہ کو تصوف کا مسخر دیکھیے

شبلی ومعروف کرخی شمس تبریز و جنید
ہیں یہ کس آئینۂ عرفاں کے جوہر دیکھیے

قادری چشتی رفاعی نقشبندی شاذلی
سلسلہ کرتے ہیں اپنا ختم کس پر دیکھیے

آج ہے مغرب کو بیحد ناز تحقیقِ جدید
علمِ ہیئت میں ذرا ارشاد حیدرؑ دیکھیے

ڈھا دیا کس ہاتھ نے تعمیر بطلیموس کو
فلسفہ یونان کا ہے کب سے ابتر دیکھیے

نظم و اقوال و وصایا میں وہ تبلیغی نظام
یہ جہادِ بالقلم اللہ اکبر دیکھیے

بدر کے غزوہ سے لے کر غروۂ طائف تلک
ان کے کاندھے پر نشانِ فوجِ داور دیکھیے

جوش اور پھر جوشِ ایمانی علیؑ سے شیر کا
معجزہ کی آڑ میں کیوں فتحِ خیبر دیکھیے

جنگ میں ہے ہر لبِ مسلم کا نعرہ یا علیؑ
حشر تک یہ نصرتِ دینِ پیمبرؐ دیکھیے

مختصر دورِ حکومت میں یہ توسیعِ جہاد
سندھ کے میدان تک یلغارِ لشکر دیکھیے

غیر کے شوریٰ سے مستغنی نظامِ سلطنت
یہ ریاست یہ سیاست بندہ پرور دیکھیے

آج کی جمہوریت اس کی حکومت پر نثار
وہ مساوات اور وہ عدلِ روح پرور دیکھیے

ہیں ہر اک صیغہ پہ نظریں ہر نظر اصلاح کن
چار سالہ سلطنت اور اُس کے جوہر دیکھیے

باخبر افعال سے واقف دلوں کے حال سے
پرسشیں اعمال سے ہر ہر قدم پر دیکھیے

کیسے پتھریلے دلوں میں بو دیا تخمِ سلوک
اس حجازی قوم میں تنظیمِ حیدرؑ دیکھیے

جن کا مذہب تھا نسب تلوار زر زن انتقام
اُن کے لب پر نعرۂ اللہ اکبر دیکھیے

ابنِ حاتم کو انہیں سے دولتِ ایماں ملی
ہے کوئی دنیا میں ان سے بھی سخی تر دیکھیے

یہ مثالیں ہیں کہ جن پر ناز ہے اسلام کو
قصۂ ملبوس میں ترجیحِ قنبر دیکھیے

جذبۂ خیر خلائق حسرتِ تعمیرِ قوم
زندگی وقفِ رفاہِ عام یکسر دیکھیے

ایک سو چشمے نکالے موضع ینبیع میں
اہلِ حج پر یہ عطائے میرِ کوثر دیکھیے

عید کے دن بھی غذائے حیدرؑ اک نانِ خشک
فقر اُس کا جس کو سب کچھ ہو میسر دیکھیے

یا دعائے مستجب یا گریہ ہائے نیم شب
رات کی تنہا خموشی شغلِ سرور دیکھیے

قلب سے اظہارِ شوق آثارِ قدرت سے جواب
یہ نیاز و ناز کا معصوم منظر دیکھیے

لائیے کس کا کلیجا کس کی آنکھیں کس کا دل
ایسے روزہ دار کو فاقہ سے شب بھر دیکھیے

جز ردائے فاطمہؑ اسباب دنیا کچھ نہیں
ربن ہوتی ہے تو معصومہؑ کی چادر دیکھیے

ہے یہ نفسِ پاک تخیلِ دو عالم سے بلند
کیوں نہ ہر ہر لفظ میں عجزِ ثنا گر دیکھیے

بارک اللہ جلوہ فرمائے تصوّر ہے کوئی
مہر برلب شوق در دل نظم در بر دیکھیے

سُرخ بشرہ نرم بھوری آنکھ والا سادہ پوش
با ادب اے حجم یہ عظمت کا منظر دیکھیے

○

ترتیبِ مناظر

کچھ ایسا مضطرب ہے ذرہ ذرہ دشتِ فاراں کا
کسی خاکسترِ دل سے بنا ہے جیسے یہ صحرا

یہ نقشہ ہے کہ اُمیدوں پہ جیسے پھر گیا پانی
یہ صورت ہے کہ ارمانوں کی جیسے لُٹ گئی دنیا

شعاعِ مہر فطرت کا تبسم بن کے آتی ہے
مذاقِ بے محل سے جل رہا ہے سینۂ صحرا

وہ عالم ہے جہاں ہو اجتماعِ جسم وجاں مشکل
فقط حدِ نظر پر ہیں زمین وآسماں یک جا

کوئی حائل نہیں فطرت کی ترتیبِ مناظر میں
اب اک اہلِ نظر ہو اور یہ عالم بے حجابی کا

حقیقت بستیوں کی ایسے ویرانوں میں کھلتی ہے
ستارے ڈوبتے ہوں چین سے سویا کرے دنیا

امانت کی طرح مدت سے ہے آغوشِ ہستی میں
نہیں گویا اسے شرمندۂ نقشِ قدم ہونا

مناسب تھا الگ ہوتا اگر صحنِ دو عالم سے
کہاں لے جا کے رکھ دیتے زمیں کے دل کا ہے ٹکڑا

جو ملجائے مقدر سے جگہ سجدہ کے قابل ہے
خدا ایسا کرے بن جائے مرکز اہلِ قبلہ کا

یہ کس نے برق پاشی کی کہ ذرّے جگمگا اُٹھے
یہ کس نے سانس لی پھولوں کا خرمن بن گیا صحرا

یہ کس رُخ کی تجلی ہے یہ کس گیسو کی نکہت ہے
ہوا مخمور سرتا سر فضا معمور سر تا پا

عجب کیا گر دلوں کی بستیاں ویران ہو جائیں
ہوا ہے مائلِ صحرا نوازی حسن بے پروا

یہ ننھا سا مسافر کون ہے آغوش مادر میں
یہ کس نے کم سنی میں دشت غربت کا الم دیکھا

یہ تصویرِ خیالی ہے کہ کوئی آسماں والا
زمیں پر چاند کو آغوش میں لے کر اُتر آیا

پریشاں کس کا شیرازہ ہوا اے کاتبِ قدرت
یہ صورت نور کی آخر ورق ہے کس صحیفہ کا

جہاں کھچ کر چلا آئے ہُمکنے میں کشش اتنی
زمیں کا بھی جگر ہو چاک رونے میں اثر اتنا

مذاقِ سجدہ پنہاں ہو جبیں کو برتری ایسی
بنائیں خانۂ معبود ہاتھوں کو شرف ایسا

یہ بچہ اور یہ جنگل یہ کس ماں کا کلیجہ تھا
یہی بندے سکھاتے ہیں خدا کی راہ پر چلنا

عطش کے زور سے وہ ہونٹ پیڑائے ہوئے دونوں
کہ جیسے ہوگیا ہو خشک چشمہ آبِ حیواں کا

وہ عالم بے بسی کا ماں کی وہ حسرت بھری نظریں
وہ نازوں کے پلے بچے کا مرجھایا ہوا چہرا

سنبھل اے دستِ گلچینِ اجل یہ کیا قیامت ہے
ارے اس پھول سے ہوگی بہار جاوداں پیدا

امید اللہ کیسی چیز ہے پُر آرزو ماں نے
اٹھا کر خاک پر معصوم کو چاروں طرف دیکھا

توکّل پر قدم اُٹھے تو فطرت نے کہا دل سے
ذرا مڑ مڑ کے صورت بھی پسر کی دیکھتی جانا

سبق ملتا ہے اک دنیا کو جب اولادسی دولت
خدا پر چھوڑ دیتا ہے خدا کا ماننے والا

ادھر ماں نے تلاشِ آب میں زخمی کیے تلوئے
پہاڑوں کا جگر پتھر کا نکلا فیض کیا ہوتا

ادھر بچے نے افراطِ تعب سے ایڑیاں رگڑیں
کلیجہ دشت کا شق ہوگیا پانی اُبل آیا

اُدھر آنکھوں میں آنسو ہیں اِدھر ساغر بکف قسمت
اُدھر ہیں پاؤں میں چھالے اِدھر زیرِ قدم دریا

میسر ہوتی ہے قسمت سے ایسے پاؤں کی ٹھوکر
تبرک بن گیا ایک ایک قطرہ آبِ زمزم کا

زمینِ شور کے دن پھر گئے دنیا اُمنڈ آئی
اب معصوم سے مس ہو کے پانی ہوگیا میٹھا

غزالانِ عرب گھر چھوڑ کر جنگل میں آ بیٹھے
زہے حُسن تصرف کوئے جاناں بن گیا صحرا

اُسے منظور تھی خاطر امانت دارِ خالق تھا
سلف ساقیِ کوثر کا خلیل اللہ کا بیٹا

چلی معصومیت جب یوسفِ بے کارواں ہوکر
ہزاروں کردیے حسنِ ازل نے مشتری پیدا

وطن سے بوئے یوسف کھینچ کر یعقوبؑ کو لائی
ہوئے قسمت سے ابراہیم و اسمٰعیلؑ پھر یکجا

بہت جنگل ہوئے آباد اُن کے جاں نثاروں سے
انہیں ویرانیوں سے ہوگئیں آبادیاں پیدا

یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز کی ہوتی ہے تیاری
حدیں کھینچی گئی ہیں چھٹ رہا ہے دامنِ صحرا

پڑی ہے ارتباطِ آب و گل سے جان مٹی میں
گمان ہوتا ہے یہ اب ذرّہ ذرّہ منہ سے بول اُٹھا

نبوّت کے مقدس ہاتھ کس کا گھر بناتے ہیں
اُسے تو ادعائے لامکانی ہے مکاں کیسا

یہی وہ راز ہیں سینہ بسینہ جو پہنچتے ہیں
یہی وہ مسئلے ہیں آدمی کچھ کہہ نہیں سکتا

سنبھلتا اُس کا سنگِ آستاں اغیار سے کیونکر
پسینہ میں ہیں دو معصوم پیکر غرق سرتاپا

نبیؐ کے ذوقِ طاعت کی طرح بڑھتی ہیں دیواریں
علیؑ کے عین کی تصویر ہے محراب کا نقشا

خموشی تا کجا ضبط و تحمّل تا بہ کے آخر
جدارِ کعبہ جس دن مسکرائی اُٹھ گیا پردا

ہُوا تیار صدیوں پہلے کعبہ خیر مقدم میں
رجب کی تیرھویں کو نائبِ ختم الرسلؐ آیا

ضیا پھیلی ستارے مسکرائے شمع لہرائی
اُڑایا غنچہ ہائے باغ نے جوہر تبسم کا

نہا کر چشمۂ کوثر میں تنویرِ سحر آئی
دلِ فطرت نے اطمینان کی اک سانس لی گویا

دو عالم رہ گئے ذوقِ نظر سے آرزو بن کر
حریمِ ناز نے کس کو کلیجہ سے لگا رکھا

اُداسی سی برستی ہے مجازی جلوہ گاہوں میں
اُٹھائیں گل کے حسن و عشق اب پردہ حقیقت کا

کسی کا مصحفِ رُخ ہے کہ تمہیدِ رسالت ہے
اُمیدوں میں کسی کی ہوگئی اک زندگی پیدا

پئے تسکین ختمِ الانبیاؐ قرآن سے پہلے
علیؑ کی صورتِ دلکش میں پیغامِ عمل آیا

یہ بچہ پرورش پائے گا دامانِ رسالت میں
دو عالم جن سے وابستہ ہیں اُن زلفوں سے کھیلے گا

بتانِ کعبہ سب صدقے اُتارے جائیں گے اس پر
وہ دن آتے ہیں جب انگڑائیاں لے گا شباب اس کا

بہارِ صفحۂ تاریخ ہوں گی اس کی تصویریں
جب اس کے عہدِ زریں کا زمانہ نے ورق اُلٹا

احد کے بدر کے خیبر کے لکھے جائیں گے تیور
نبیؐ کے دوش پر کعبہ میں کھینچا جائے گا نقشا

لپٹ جائے نہ ان قدموں سے کیوں ہمت شکن منزل
وہ سالک ہے خدا کے گھر میں رکھا ہے قدم پہلا

تعالی اللہ ہے عنوان مدحت مطلعِ روشن
کہ لوحِ نور پر لکھا ہے بسم اللہ کا طغرا

ادا تھی اک اب معصوم کی معصوم ہی سمجھا
علیؑ کا مسکرانا رازِ اقرارِ رسالت تھا

یدِ قدرت کے اک نقطہ نے مملو کردیا دامن
مبارک بائے بسم اللہ قرآں ہوگیا پورا

امامت سے بہم ہوکر رسالت بڑھ گئی آگے
نبیؐ پر خاتمہ تھا ورنہ اجرائے شریعت کا

یہ آئینے ہیں عالم میں جمالِ ذات باری کے
زہے حسنِ مراتب نور اُس کا ہے ظہور ان کا

عجب کیا گر جھکیں پیشانیاں اقوام عالم کی
جو مسجودِ ملائک تھا ہوا وہ نور پھر یک جا

ہر اک جانب سے نظریں ہٹ کے اب مرکز پہ ٹھہریں گی
نگاہیں بھی پریشاں تھیں کہ نظارہ پریشاں تھا

ملائی آنکھ زورِ طبع نے خورشیدِ محشر سے
بڑھا سرمایۂ مدحت میں اک مطلع قیامت کا

بنائے منزلِ ہستی نمودِ عالمِ بالا
ہے ممنونِ یدِ الٰہی اُدھر عقبیٰ اِدھر دنیا

ہزبریشۂ غالب علیؑ ابن ابی طالب
بدل یک جان و دو قالب نبیؐ سے متحد ایسا

شرف قرآن سے ظاہر سیادت آن سے ظاہر
ریاست شان سے ظاہر جلالت نام سے پیدا

جبین اونچی جھکے ابرو بھرے شانے بھرے بازو
خلیلؑ اللہ کے گیسو رسولؐ اللہ کا نقشا

دل اک درد آشنا پیکر وفا کی روح سے مضطر
وصی اخلاص سرتا سر نبیؐ اشفاق سر تا پا

پیمبرؐ کا وہ کاشانہ وہ شمع دیں کا پروانہ
شبِ ہجرت کا افسانہ ہے جس کا خواب بے پروا

بہ اقوال و عمل صادق بہ حق واصل بحق ناطق
خدائے پاک کا عاشق رسولؐ اللہ کا شیدا

خموشی لذتِ ایماں تکلم شارحِ قرآن
تبسم رحمتِ یزداں فدا دنیا و مافیہا

قیامت کی رجز خوانی کہ قلبِ کفر ہے پانی
غضب کا جوشِ ایمانی کہ در شاہد ہے خیبر کا

جمالِ حق جمال اُس کا جلالِ حق جلال اُس کا
وہ معیارِ کمال اُس کا کہ اکملتُ لکم آیا

زمیں اُس کی زمن اس کا بہار اُس کی چمن اُس کا
دلِ مومن وطن اُس کا فدایش عالم جانہا

علیؑ کی ذات سے قائم نظامِ دفترِ عالم
علیؑ کے نام میں پنہاں رموزِ علم الاسما

یداللہ و لسان اللہ و عین اللہ کو دیکھو
حروف اولیں سے صاف ہوتا ہے علیؑ پیدا

ہُوا وہ نورِ حق ظاہر پڑھو اب مدحتِ حاضر
بڑا دربار ہے ملتا ہے پھر موقع کہاں ایسا

ہُوا اسلام کی تنظیم کا فرمان جب انشا
نبیؐ نے تیرے سر پر تاج رکھا اوّلیت کا

صحابہ میں یہ تیری منزلت از روئے حکمت تھی
بقولِ بو علی محسوس میں معقول تھا گویا

ترا حسنِ عمل چونکا رہا تھا سونے والوں کو
صداقت دیکھتی تھی مذہبِ اسلام میں دنیا

شبِ ہجرت پہ شب بیداریاں بھی ہوگئیں صدقے
عبادت بن کے نیند آئی تو کیسا بے خبر سویا

مقامِ فخر تھا پر شکر کا پلّہ رہا بھاری
صدائے لافتا آئی تو اشک آنکھوں میں بھر لایا

تری جانبازیوں نے روزِ خندق آبرو رکھ لی
وگرنہ لگ چکا تھا دامنِ اسلام میں دھبّا

وغا میں نعرۂ تکبیر سے پہلو بہ پہلو ہے
جہاں میں آج تک بجتا ہے تیرے نام کا ڈنکا

تری تبلیغ نے روحانیت کی روح پیدا کی
پڑی تھی پیکرِ رہبانیت میں زندگی مردا

ترے فاقوں نے کیا کیا زندگی بخشی غریبوں کو
تسلی دے رہا ہے آج تک حُسنِ عمل تیرا

قناعت نے صدا دی دور سے الفقرِ فخری کی
تری سرکار سے اپنا سا منہ لے کر پھری دنیا

غلط اندازِ نظریں ہوں تو دنیا پر نظر ڈالے
خزانہ دار قدرت کو خزانوں کی ضرورت کیا

بَری ہے سجدہ ہائے ناروا سے تیری پیشانی
عبادت کیوں نہ ہوتا روئے روشن پر نظر کرنا

جہادِ نفس میں تیری عظیم الشان تنہائی
وہ تنہائی کہ مشکل ہے سمجھنا اور سمجھانا

مصفا نفس پر دھاریں بہادیں اُس نے رحمت کی
خدا کے سامنے جب تو نے رازِ دل کیا افشا

تصور ہے ترا ڈوبا ہوا آثارِ قدرت میں
کہاں سے لائے آنکھیں اُس کی قدرت دیکھنے والا

مبارک جلوہ حُسنِ ازل کی آئینہ داری
مبارک تجھ کو دنیا میں مثالی آدمی ہونا

○

شمع حقیقت

پچھلے سے تلاطم ہے دریا میں قیامت کا
تفویض کیا تم نے کیا بار امانت کا

تائید کی خواہاں ہے ہر موج زباں بن کر
ہر قطرۂ بے مایہ طالب ہے اعانت کا

یہ چادر آبی پر گل کس نے کھلایا ہے
نقش اُبھرا ہے پانی پر انعام ہے فطرت کا

یہ دوش پہ لہروں کے کشتی ہے کہ گہوارہ
یا راز ہے سربستہ کوئی یَمِ قدرت کا

اسباب سے مستغنی منجدھار سے بے پروا
آخر یہ سفینہ ہے کس صاحبِ ہمت کا

کیا صاحبِ کشتی کی موجوں پہ حکومت ہے
گرداب کی گردن میں حلقہ ہے اطاعت کا

آنکھیں ہیں حبابوں کی مصروف نگہبانی
شورِ لبِ ساحل ہے اقرار حفاظت کا

خودموج ہوا اس کا رُخ دیکھ کے چلتی ہے
ہر جنبشِ موزوں ہے اظہار ارادت کا

وہ راز رواں پہنچا اک قصر کے دامن تک
بیدار ہوا جذبہ انسان کی حیرت کا

مانند دُرِ مقصد دریا سے کیا باہر
فطرت کا تقاضہ تھا منشا بشریت کا

انگشت لیے منہ میں اک طفل نظر آیا
جس وقت کھلا پردہ اسرارِ حقیقت کا

راضی برضا جیسے ہو مردِ خدا کوئی
جس طرح کوئی صابر تابع ہو مشیّت کا

اُس دور میں بچوں کے تھے طوق گلوخنجر
اونیٰ یہ نمونہ ہے انساں کی شقاوت کا

ہر عہد میں لکھا ہے تاریخ نے افسانہ
اک قوم کی غربت کا اک قوم کی قوت کا

تقدیر کہاں لائی خنجر سے بچانے کو
کیا دامنِ قاتل سے پیماں ہے حفاظت کا

فرعونِ زمانہ ہے جس قصر کا ہر ذرّہ
دعوے ہیں خدائی کے سامان بشریت کا

ہیں ایک ہی منزل میں مظلوم بھی ظالم بھی
بس کھیل ہے اب آگے اللہ کی قدرت کا

خاتونِ محل نے خود آغوش جووا کردی
اک لمحہ میں افسانہ تھا دور حکومت کا

یہ راز ہوا ظاہر اربابِ بصیرت پر
دل نرم بنایا تھا اِس دن ہی کو عورت کا

سامان مٹانے ہیں اک جھوٹی خدائی کے
اس زورِ تصرف سے منشا ہے یہ قدرت کا

کعبہ کی طرف آؤ اک اور سماں دیکھو
پایہ ہے بہت اونچا جس قصر کی رفعت کا

ایسے ہی خداؤں کی ہستی کے مٹانے کو
اس گھر میں بھی جلوہ ہے اک نور کی صورت کا

یہ فرق نمایاں ہے تقسیمِ مدارج میں
کو ایک ہی مقصد ہے دونوں کی ولادت کا

موسیٰ سا پیمبر ہے فرعون کے دامن میں
آغوشِ نبوت میں ہے چاند امامت کا

اے جلوہ گرِ کعبہ اک مطلع لاثانی
دنیا کو ہو اندازہ تائید کی قوت کا

کعبہ کو میسر ہے فخر اُس کی ولادت کا
رستہ ہے مرے دل سے سیدھا درِ دولت کا

اک شمع حقیقت ہے فانوس میں ضو افگن
ہے روح امامت کی پیکر بشریت کا

یہ حاصل قرآں ہے کعبہ میں جو آیا ہے
قرآن میں آئے گا حکم اس کی محبت کا

بس شانِ خدا کہہ کر چُپ رہ گئے دل والے
اُٹھا نہ اُٹھائے سے پردہ تھا شریعت کا

حقدار چلا گھر سے اللہ کے حق لے کر
مطلع دامانِ پیمبرؐ میں ہے اجر رسالت کا

چمکا وہ ستارہ سا پیشانیِ روشن پر
قرآں نے لیا بوسہ وہ چاند سی صورت کا

کچھ اس سے امیدیں ہیں سرکار کی وابستہ
فطرت کا تقاضا ہے کچھ جوشِ محبت کا

سر بیچ کے بھائی کی الفت کا عوض دیں گے
یہ بھی تو جواں ہوں گے وقت آئے تو بعثت کا

تا حجتِ آخر سب شیدائے نبیؐ ہوں گے
ہر فرد علیؑ ہوگا اس معدنِ رحمت کا

صورت گرِ معنی کے انعام پہ دل صدقے
محفوظ تھا یہ کب سے مطلع مری قسمت کا

دنیا میں ہے آوازہ قرآں کی فصاحت کا
معراج سنادے گی لہجہ اب قدرت کا

لفظوں میں کہے کیونکر تصویرِ شبِ ہجرت
ہے شان نبوت کی منصب ہے امامت کا

خورشید پلٹ آیا دروازۂ مغرب سے
قانون بدلتا ہے ان کے لیے فطرت کا

○

نغمۂ کوہسار

اور بڑھیں گی نزہتیں گلشنِ روز گار کی
حُسنِ ازل کو فکر ہے تکملۂ بہار کی

جوشِ حیاتِ نوعیاں عالمِ آب وگل سے ہے
دوڑ رہی ہیں بجلیاں قدس کے جلوہ زار کی

خاک جو تھی وہ پاک ہے آب میں آبِ کوثری
نور میں بجھ کے ضو بڑھی آتشِ بے قرار کی

تھی جو فضائے خلد میں شاہدِ گل سے ہم کنار
عنبر باد ہی نسیم جنت پُر بہار کی

آتش وآب وخاک وباد صرفِ نمودِ حسن ہیں
جب سے پڑی ہے داغ بیل گلشنِ روزگار کی

منزلِ ارتقا میں ہے نعرۂ یا صمد بلند
صورتِ گل ہیں کوششیں نشوونمائے خار کی

نقش پہ ہو رہا ہے نقش منزلِ کیف و رنگ میں
اُف رے قلم کہ حد نہیں قوتِ اختیار کی

پیکرِ عنصری میں ہے نورِ ازل کی روشنی
صورتِ آدمی میں ہے شان جمالِ یار کی

زیرِ فلک سرِ زمیں دور پہ ہو رہے ہیں دور
بزمِ جہاں مثال ہے عرصۂ کارزار کی

سینچ چکے نہالِ غم آدمِ اولیں کے اشک
ڈال چکے وہ داغ بیل عشق کے رہگذار کی

طور پہ بات ہو چکی غش سے نجات ہو چکی
چشمِ کلیم دے چکی داد جمالِ یار کی

سوزنِ وقت سی چکا چاک قبائے یوسفی
شان و نمود بڑھ چکی دامنِ تار تار کی

نار سے نور اُبل چکا آگ سے پھول اُبھر چکے
سیر خلیل کر چکے گلشنِ نو بہار کی

وقت بنا بگڑ چکا کفر کا پاؤں گڑ چکا
پھر ہے زمین منتظر قدرتِ کردگار کی

پھر نظر آ رہے ہیں کچھ ڈھنگ تغیرات کے
شعلہ بدل ہی پھر ہوا گلشنِ روزگار کی

ڈوب رہی ہے پھر فضا رنگِ تحیّرات میں
پھر ہیں شعاعیں مضطرب حُسن کے جلوہ زار کی

اپنی زباں میں کہتی ہے تاروں کی روشنی کچھ اور
شامِ فراق اب نہیں وضع میں سوگوار کی

خندۂ زیرِ لب ہے یا چرخ پہ ہے طلوعِ صبح
فردِ عمل دُھلی ہوئی یا کسی رستگار کی

زلفِ بدوش ہے کوئی دامنِ کوہسار میں
جیسے یہی ہے زندگی دامنِ کوہسار کی

گم ہے کسی کو خاک پر سربہ سجود دیکھ کر
آنکھ کھلی جو نیند سے ذرۂ بے قرار کی

رحمتِ حق دراز ہے کوہِ حرا کے غار میں
دیکھ رہا ہے ندرتیں منظرِ پُر بہار کی

رہبرِ خیال ہے عقل کی قوتِ صحیح
منزلیں ہو رہی ہیں طے وادیٔ اعتبار کی

تبصرۂ بسیط ہے فلسفۂ قدیم پر
پیشِ نظر ہے زندگی قومِ زبوں شعار کی

دل میں ہے کچھ امید پر نفسِ امید مُستتر
سب سے جُدا مثال ہے حالت انتظار کی

دامنِ کوہ سے ہوئی یک بیک اک صدا بلند
وقت کی خامشی نے لے نغمہ کی اختیار کی

لے کے سلامِ اولیں آیا پیامِ اولیں
شوق سے آ کے مل گئی شان اب اضطرار کی

کیفیت اک سما گئی ہر رگِ و موئے جسم میں
سیلِ محیط ہو گئی ہیبتِ کردگار کی

عالمِ نو میں آ گیا غارِ حرا کا گوشہ گیر
محو ہے حق نمائیاں دیکھ کے کوہسار کی

ایک صدا بلند ہے دشت و در و جبال سے
سب کو زبان مل گئی قدرتِ کردگار کی

حکمِ ادائے فرض نے دل کو کیا جو مضطرب
قوتیں اُس نے بھیج دیں ضبط کے اختیار کی

اوڑھ لپیٹ کر اُٹھا صاحبِ چادرِ حریر
آج کی شان شان ہے نائبِ کردگار کی

غار سے باہر آ گیا وارثِ منصبِ خلیل
دل میں تڑپ لیے ہوئے فکر بنائے کار کی

قلب میں رازِ منجلی جسم میں لرزشِ خفی
ساتھ لیے تجلّیاں عالمِ نور بار کی

رنگِ جہان بدل دیا نعرۂ لاالٰہ نے
حلم نے ڈال دی بِنا مذہبِ استوار کی

دیکھ کے نرمیِ زباں رو دیے سنگ دل عرب
سادگیِ کلام تھی جانِ کشود کار کی

مصحفِ پاک کی بنا تھا یہ تخاطبِ عظیم
ایک کتاب بن گئی حکمتِ کردگار کی

ماہِ عرب کے عکس سے لہریں اُٹھیں فرات میں
گنگ و جمن سے جا ملیں نیل سے آنکھ چار کی

کعبہ میں رہ گیا فقط اس کا ہی سنگِ آستاں
پاک ہوئی زمین یوں خانۂ کردگار کی

شان میں اپنی کم نہ تھا مکہ کی فتح کا بھی دن
قدر کی شب نے منزلت اور بھی آشکار کی

کود میں کھیلنے لگے باغِ علیؑ کے نونہال
پشت ہوئی قوی کچھ اور نائبِ کردگار کی

گلشنِ اصطفےٰ میں گو پھول کھلے ہزارہا
عید ہوئی غدیر پر تکملۂ بہار کی

قبلۂ دو جہان کا وہ کعبہ سے آخری وداع
حدِ نگاہِ لطف تک بھیڑ رفیق و یار کی

جلوہ گہہ خلیل میں راز و نیازِ رخصتی
دستِ دعا پہ بارشیں رحمتِ کردگار کی

منتظرِ ورود اُدھر خم پہ نوید ناگہاں
دشت کی خامشی میں بھی شان اک انتظار کی

ذرّوں کی چشمِ آشنا دیر سے ہے کھلی ہوئی
دور سے دیکھ لیں جھلک جلد کہیں غبار کی

ذوقِ چمن نے کی کمی شوق کے پاؤں تھم گئے
راہ یہ کس نے روک لی قافلۂ بہار کی

حکمِ جہاد لے کے کیا حاملِ وحی آ گئے
دوڑ گئی ہے لہر سی دور تک انتشار کی

ناقے جمے فرس تھمے نیزے جھکے قدم رُکے
سیلِ رواں ٹھہر گئی قدرتِ کردگار کی

فرشِ زمیں پہ ڈٹ گئے ملکِ عرب کے سادہ دل
کیسی ہوس ہوا نہ تھی زینتِ مستعار کی

چند کجاوۂ شتر منبرِ نور بن گئے
سادگیِ اصول پر خلق نے جاں نثار کی

تھام کے بازوئے علیؑ صرف بیاں ہوئے نبیؐ
دور تلک صدا گئی مرسلِؐ کردگار کی

ان کا عروج دیکھتا کوئی نگاہِ بد سے کیا
قہرِ خدا تھیں تیوریاں حاملِ ذوالفقار کی

میں نے کہا خوشی میں وہ مطلع بے پناہ تھم
اہلِ حسد سے داد لی قوتِ اختیار کی

شانِ نزول دیکھنا حکمِ ابد قرار کی
ختم ہیں آج نعمتیں خانۂ کردگار کی

دھوم تھی اہلِ رزم میں پہلے ہی کارزار کی
بزم بھی آج ہوگئی صاحبِ ذوالفقار کی

حد سے فزوں ہیں برکتیں حکمِ ابد قرار کی
وجہِ نشاط بن گیا فرقۂ اشکبار کی

تکملۂ حیات ہے تکملۂ اصول میں
تکملۂ اصول ہے جانِ اصول کار کی

دینِ خدا کا تکملہ حکمِ خلافتِ علیؑ
حدِ کمال کی قسم حد نہیں اقتدار کی

جانِ حجابِ قدس تھیں کل یہی صورتیں جو آج
امثلۂ عظیم ہیں قدرتِ آشکار کی

مصحف و شرح جمع ہیں بیچ میں کون آسکے
روزِ ازل سے ہے بنا رشتۂ استوار کی

نفسِ رسولؐ پاک کا جب سے یہ لے رہے ہیں مکس
پہلے پہل پڑی تھی جب ان پہ نگاہ پیار کی

سرمایۂ سخن

بڑھ کے جواں ہوئے تو ہیں قوتِ بازوئے نبیؐ
زینتِ دوش تھے کبھی زیبِ کبھی کنار کی

نام علیؑ کا لے تو دو مجمعِ اہلِ ذوق میں
لہر سی دوڑ جائے گی جذبۂ بے قرار کی

مطلع

صغرِ سنی میں کھیل تھا ان کا حفاظتِ نبیؐ
ننھی کلائیوں میں بھی شان تھی ذوالفقار کی

قوم کی خصلتوں سے دور قوم کی صحبتوں سے دور
مصلحِ قوم نے جگہ ڈھونڈھ کے اختیار کی

دیر سے حسنِ فکر کی مطلعِ نو پہ ہے نظر
چین تو لے سبک روی خامۂ زر نگار کی

عالمِ قدس میں نمود قدس کے جلوہ زار کی
بزمِ شہود میں بہار گلشنِ روز گار کی

مقصدِ ماسوا نبیؐ آئینۂ نبیؐ وصی
شان یہ ماسوا میں تھی صاحبِ ذوالفقار کی

صبحِ ازل کی ابتدا شامِ ابد کی انتہا
بزمِ شہود میں بنا رحمتِ کردگار کی

نائبِ صدرِ انجمن شامِ سلکِ پنجتنؑ
بنتِ رسول سی دُلہن جس شہِ ذی وقار کی

دوشِ نبیؐ کا بت شکن بدر و اُحد کا تیغ زن
نامِ خدا ابوالحسن دھاک ہے ذوالفقار کی

جامعِ مصحفِ کریم حاکم و احکمِ و حکیم
ذاتِ نمونۂ عظیم حکمتِ کردگار کی

ہاتھ معینِ انس و جن پایہ ثبات رات دن
قلب وہ قلبِ مطمئن جا نہیں انتشار کی

مسندِ فقر پر ولی اوجِ کمال پر علیؑ
کچھ ہے خفی تو کچھ جلی شان یہ اقتدار کی

صوم و صلوٰۃ میں نشاط سجدۂ حق میں انبساط
درد و دُعا سے انبساط وضع یہ تھی شعار کی

ہاتھ میں فتحِ خیبری پاؤں میں زورِ رہبری
چہرہ پہ نورِ داوری یاد میں کردگار کی

عالمِ نفسیات تھا ماہرِ ذہنیات تھا
حاوی کائنات تھا دھوم تھی اختیار کی

خوش نظر و نظر بلند سجدہ گزار و سر بلند
پست ہے جس سے ہر بلند شان ہے وہ شعار کی

حسن بہ ندرتِ جمیل زلف بہ فطرتِ خلیل
سارے عرب میں بے عدیل بات ہر ایک پیار کی

صبح و مسا دواں بہ حق لب بدعا زباں بہ حق
رو برضا و جاں بہ حق راہ میں کردگار کی

حصنِ ستم میں دیں پناہ فرشِ زمیں پہ عرش جاہ
فاقہ کشی میں بادشاہ شان یہ اقتدار کی

عمِ رسولؐ باپ بھی ماں کا بھی سلسلہ وہی
دونوں طرف سے ہاشمی وجہ یہ افتخار کی

نجم سنبھل کہ وقت اب مدحت حاضرہ کا ہے
گھیر چکیں تجلّیاں جلوۂ نور بار کی

علم و یقیں سے یوں بنا دین کی استوار کی
شرح بہ حد شرح کی حکمتِ کردگار کی

روح کا بوجھ گھٹ گیا قلب کا بار ہٹ گیا
ہے ترے حرف حرف میں روح وہ اعتبار کی

سلسلہ ارتباط کا عہدِ واحد کے درمیاں
تیرا کلام شرح ہے مصحفِ کردگار کی

حکمتِ اولیہ و فلسفۂ الٰہیہ
دونوں کے بُعد کی جہت خلق پہ آشکار کی

مصحفِ حق سے جا ملیں ترے بیاں کی وسعتیں
شرح سی شرح کر گیا حکمتِ کردگار کی

تو نے دیا عرب کو وہ درسِ تمدنِ صحیح
آج نگاہِ غیر میں وجہ ہے اقتدار کی

تو نے سکھا دیا اُنہیں علمِ سیاستِ مدن
جن کو تمیز تک نہ تھی فطرتِ مور و مار کی

حسن ہی حسن کر دیا ان کو نگاہِ لطف سے
جن کے دلوں میں حِس نہ تھی عیب سے ننگ و عار کی

ترکِ جہاد ہے تو ہو جوش و خروش ہیں وہی
راہ بتا گیا ہے تو نفس سے کار زار کی

بندۂ زر جو تھے اُنہیں عبدِ خدا بنا گیا
حبِ وطن میں ڈوب کر قوم کی ناؤ پار کی

قوتِ نفس کا اثر تیرے حدود علم میں
راہبری خیال کی بات تھی اختیار کی

قال سے حال متحد قول سے فعل متصل
ہاں بخدا یہی ہے شان ہادیٔ روزگار کی

قہر ہے قلبِ کفر کو نعرۂ یا علیؑ کی چوٹ
اس میں نہاں ہیں قوتیں قوم نحیف و زار کی

تیرے سلوکِ نرم سے کھل نہ سکیں جو گتھیاں
عقدہ کشائیاں ہوئیں نوک سے ذوالفقار کی

قوتِ باطنی لیے پنجۂ بت شکن بڑھا
مادّیت ہوئی فنا قومِ زبوں شعار کی

جنگ میں سرکشوں پہ وہ تیغ کے سخت سخت وار
فتح کے بعد نرمیاں خلق کی انکسار کی

گرمیِ جنگ میں یہ پاس فوجِ عدو کی پیاس کا
خوش مزگی تھی ناگوار شربتِ خوشگوار کی

تھا شبِ ہجرتِ نبیؐ اُس سے بلند تر جہاد
دوش بدوش مصطفیٰؐ تو نے جو کارزار کی

ایک عطیۂ خدا ایک عطیۂ رسولؐ
تیغ و علم نشانیاں ہیں تیرے اعتبار کی

تیرے ہی باغ کا ہے پھول رونقِ گلشن جہاں
شمع بنا ہوا ہے آج عالم تنگ و تار کی

اپنے اصول پر رہا وضع رسولؐ پر رہا
لاکھ ہوا بدل گئی گلشنِ روزگار کی

وقت صلوٰۃ ہم نوا تیرے زمین و آسماں
غرق اثر کلی کلی گلشنِ روز گار کی

مرکزِ انتہا میں گم معرفت خدا میں غرق
ذات بھی اپنی غیر تھی یاد میں کردگار کی

تیری دعا کے درد کا کون ومکاں پہ تھا اثر
خوفِ خدا میں تھا مثال عالمِ احتضار کی

رات کی خامشی میں وہ تیری ریاضتِ خموش
دور نگاہِ غیر سے یاد میں کردگار کی

گریہ نرم شب میں تھا خندۂ شکر کا مزا
کیفیتیں تھیں مستقل عالمِ اضطرار کی

عہدِ مدینہ کا لباس کوفہ کا تختِ سلطنت
ایسی معاشرت تو ہو دین کے تاجدار کی

تیرے ہی ہاتھ سے ہوا دفن وکفن رسولؐ کا
دیکھ لیں ذمہ داریاں قوم نے ورثہ وار کی

بعد نبیؐ لیا نہ کام قوتِ اختیار سے
قوتیں دیدنی ہیں یہ ضبط کے اختیار کی

انس تھا اُس یتیم سے ربط تھا اُس اسیر سے
آس نہ تھی جہان میں جن کو کسی سے پیار کی

اور معینِ نفس تھیں شکر کے اہتمام میں
فاقوں میں شب گذاریاں صبح کے روزہ دار کی

غیر مریض پر کرم گھر پہ مریض منتظر
بات فقط تھی وقت کی اصل نہیں انار کی

نفس عظیم ہے ترا ذات احد سے متصل
تھاہ بشر کو کیا ملے تلزم بے کنار کی

میری زباں تری ثنا یہ بھی ہے تیرا معجزہ
تاب نہیں ہے خود مجھے اپنے سخن کے بار کی

جوش ولا میں جم میں چھوڑ گیا خود اپنا ساتھ
حد مجھے روکتی رہی قوتِ اختیار کی

○

نازِ آفرینش

زہے لوح و قلم ایسے بھی نقطہ تھے مقدر میں
مہ و خور کی طرح چمکے جو حرفِ کُن کے دفتر میں

خوشا قسمت کہ بسم اللہ نے ترتیب عنواں کی
زہے ساعت یہ بات آئی مزاجِ بندہ پرور میں

بنایا حشر ساماں جامۂ صورت عطا کر کے
لیے بیٹھا تھا فتنہ شاہدِ تنہا نشیں بر میں

سنوارے دونوں گیسو دوش پر سلمائے فطرت نے
بقا نے جان ڈالی لیلیِ دوراں کے پیکر میں

زلیخائے ہوس کنعانِ حُسن و مریمِ عصمت
کسے جائے سخن حُسن مذاق آئینہ گر میں

ثواب و عیب ہیں دست و گریباں جنگ پیہم ہے
کہ اہلِ دل اور اصحابِ شکم ہیں ایک ہی گھر میں

حق و ناحق کی آویزش سے ہے ہنگامۂ ہستی
یہ غوغا ختم ہوگا جذب ہوکر شورِ محشر میں

دلیل اکثریتِ فیصلہ کُن ہو نہیں سکتی
کہ حق اکثر ہے کمتر میں مگر کمتر ہے اکثر میں

کنارِ خیر میں اک آب و گل کا جوہرِ قابل
اُدھر سو دامنِ گیتی کے دھبّے دامنِ شر میں

اُدھر سو خار اُگلتا ہے اگر ویرانۂ زشتی
اِدھر اک پھول کھلتا ہے کہیں خوبی کے پیکر میں

انہیں گلہائے معنی میں اضافہ کرنے آپہنچا
درِ بیت المقدس پر کوئی آغوشِ مادر میں

کرم اس کا مسلّم دیدنی ہے ہمّتِ سائل
دُرِ مقصود پھر واپس ہوا جیبِ سمندر میں

ہوئے گرم طلب لیلائے بے محمل کے دیوانے
بساطِ قرعہ اندازی بچھی خاصانِ داور میں

علَم ہوکر قلَم نے لی رضائے خامۂ قدرت
ستونِ امر خالق بن گیا پانی کی چادر میں

کنارِ مادرِ یحییٰ بنی گہوارۂ مریم
زہے طالع سعادت پر سعادت تھی مقدر میں

پرستاریِ صنعت کی پرستارانِ صانع نے
ہوا اک دانۂ تسبیح شاملِ سلکِ گوہر میں

اضافہ خادمانِ بیت میں اک صنفِ نازک کا
اشارہ تھا کہ ہے سب کی جگہ اللہ کے گھر میں

اگر ہے حسن پر اپنے تبختر ابنِ آدم کو
تو دیکھیے خوبیاں کیا کیا ہیں اس حوّا کی دختر میں

بشوقِ حمد سن بڑھنے لگا مثلِ شبِ اسریٰ
شباب آیا نہفتہ عصمت و عفت کی چادر میں

قدِ موزوں اطاعت کا الف افراطِ طاعت سے
خمِ ابرو رکوع و سجدۂ خلّاقِ اکبر میں

جبیں ایسی کہ جس کے نور سے سجدہ ہوئے روشن
وہ گیسو جور ہے جاروب کش اللہ کے گھر میں

پرستش ہے غلط کاروں میں تصویرِ خیالی کی
وہ عصمت آفریں نقشہ سماتا ذہنِ آذر میں

فدا اُس کنجِ تنہائی پہ صد ہا حجلۂ یوسف
بنائے حجرۂ مریم پڑی اللہ کے گھر میں

نہ تھے گوشِ صبا بھی نغمۂ تسبیح سے محرم
اک آئینہ تھا جو تھا محوِ یادِ آئینہ گر میں

نمایاں مسندِ خاکی پہ سجادہ قناعت کا
کشادہ نفس مرگ آرا جنابِ بندہ پرور میں

جہاں سے منہ پھرائے مہمانِ رازق مطلق
تو کاکل کے ثمر جنت کے میوے کشتیِ زر میں

دُرِ بحرِ طہارت نے کیا سامانِ غسل اک دن
پئے حفظِ مراتب بیتِ خالق سے گئیں گھر میں

یم پاکیزگی سے ہو کے مس پانی ہوا طاہر
زباں کھولی ہر اک قطرہ نے حمدِ ربِّ اکبر میں

غسالہ تھا اسی معصوم ہستی کے کفِ پا کا
بنا آبِ بقا جو چشمۂ خضر و سکندر میں

ادائے کار فرمانے یکا یک طرحِ نو ڈالی
نزول جوہرِ اول ہوا انساں کے پیکر میں

دکھائیں غیرتِ ناموس نے مردانہ وار آنکھیں
نگاہِ غیر سے بل آگئے عفتِ کے تیور میں

ہوئے فریاد کے پہلو عیاں لحنِ تکلّم سے
کہ ہے نسوانیت اک فطرتِ کمزور کے بر میں

زبانِ عقلِ کُل سے نغمۂ وحیِ خدا نکلا
ترنم ریز یا موجیں اُٹھیں تسنیم و کوثر میں

پیامِ شادمانی یا کہ پیغامِ الم کہیے
عطائے خاص ہے یا امتحاں بخشش کے پیکر میں

گوارا ہیں مثالِ نوش نیش طعنۂ اعدا
عمل حُسنِ عمل ہو سایۂ مرضیِ داور میں

ہُوا دوشیزگی کے عہد میں حکمِ خدا جاری
خدا کی شان روح اللہ آئے بطنِ مادر میں

بایں صورت جو کنعانِ عدم سے تا شہود آئے
جگہ پائے ولادت کی نہ بیتِ رب اکبر میں

تفوق دیکھنا بختِ اسد کا بختِ عمراں پر
نتیجہ دیکھنا تمہید کا اک مصرعۂ تر میں

پئے عیسیٰ زچہ خانہ نہ تھا اللہ کا گھر تھا
نصیری کا خدا پیدا ہوا اللہ کے گھر میں

چلا اک بے خطا ناوک کمانِ آفرینش سے
ترازو ہوگیا ایک ایک قلبِ عشق پرور میں

خبر کعبہ سے نکلی اور پہنچی قبلۂ دیں تک
لپٹ کر رہ گئی خوشبو سی دامانِ پیمبرؐ میں

نسیمِ جانفزا نے صبح جب اوراقِ گل کھولے
خدا کا نام ان کا ذکر تھا دفتر کے دفتر میں

بقدرِ ظرف عالم نے کیا کسبِ ضیا لیکن
مرقع رہ گئے دھندلے نگارستانِ آذر میں

شعاعِ مہر کی تقدیر قدموں کے لیے بوسے
اُبھر کر چشمۂ خاور سے ڈوبی حوضِ کوثر میں

زہے لیلائی جلوہ کہ محمل منہ سے بول اُٹھا
لسان اللہ نے جان ڈال دی کعبہ کے پیکر میں

حرم آئینہ خانہ بن گیا فیضِ تجلّی سے
نظر کو فرق مشکل ہوگیا دیوار میں در میں

دیا طبع سہی بالا نے کیا مطلع قیامت کا
حریصِ شعر اب ڈھونڈھا کریں دیوان محشر میں

زبان رحمت حق ہے دہانِ شیر داور میں
نبیؐ بھرتے ہیں دم اپنا یداللّٰہی کے تیور میں

یہ ہیں مافوق آب وگل نبیؐ آدم کو نسبت کیا
کہ یہ تھے نور کے عالم میں آدمؑ عالم زر میں

انہیں دو صورتوں میں ختم آیات الٰہی ہیں
انہیں آیات کی تفسیر ہے قرآں کے دفتر میں

نہاں دستِ یمیں میں سرنوشتِ عالم باقی
ودیعت انتظامِ دارِ فانی دستِ دیگر میں

رسالت ختم تھی فخرِ رسالت پر تو قدرت نے
امامت کی بنا رکھ دی رسول اللہ کے گھر میں

نگارستانِ آذر پھر سے کعبہ بننے والا ہے
بہم ہیں مشورے نفس پیمبرؐ اور پیمبرؐ میں

نکالے جائیں گے بت طاقِ کعبہ سے دماغوں سے
دماغوں میں بسے ہیں بیٹھ کر اللہ کے گھر میں

ثبات پا کا ملتا ہے صلہ آج اک مجاہد کو
فراز عرش پر کوئی قدم رکھتا ہے دم بھر میں

قدم بھی وہ قدم جو دے چکے ہیں امتحاں کتنے
احد کے معرکہ میں بدر میں خندق میں خیبر میں

مدینہ کے سفر میں آبلوں کی جن پہ یورش تھی
رواں کانٹوں پہ تھے تعمیل ارشادِ پیمبرؐ میں

شبِ پُرخوف ہجرت دیکھنے والوں نے دیکھی ہیں
نبیؐ کے خاص بستر پر نبیؐ کی سبز چادر میں

تعجب کیا اگر مُہرِ نبوت پر جگہ پائی
وہی ہیں مدتوں پھیلے ہیں آغوشِ پیمبرؐ میں

مرا عرشِ سخن میرے لیے تکیہ بنا سر کا
ہوا غرقِ تخیل میں جو فکرِ مدح دیگر میں

دل اور بے مدعا دل بندگیِ بندہ پرور میں
سند معصومیت کی اور لرزاں خوف داور میں

جمال ایسا کہ آسودہ نگاہیں بزمِ انور میں
جلال ایسا تکلم قید لب ہائے سخنور میں

وہ خاموشی جو قوت دار آوازوں پہ بھاری تھی
وہ گویائی کہ حکمت بولتی تھی جس کے پیکر میں

کرم ایسا کہ جس کے معترف تھے دشمنِ جانی
ابھی الفاظ ہیں محفوظ تاریخوں کے دفتر میں

نگاہِ غور دیکھے ذمہ داری ورثہ داری کی
وصی مصروف ہے تجہیز وتکفینِ پیمبرؐ میں

جو سچ پوچھو خلافت کی علیؑ سے ہوگئی زینت
خلافت آئی تھی کیا لے کے اس بے نفس کے گھر میں

علی کے نام تک نے آفتوں میں دن گذارے ہیں
مگر پھر بھی نمایاں ہی رہا عالم کے منظر میں

علیؓ اے تاجدارِ فاقہ کش اے جانِ پیغمبرؐ
پئے تسکیں ضرورت تھی تری بزم پیمبرؐ میں

علیؓ اے زخمیِ روزِ اُحد اے حرزِ پیغمبرؐ
خدا معلوم کیا ہوتا نہ ہوتا تو جو لشکر میں

ترے آثار سے اسلام کی تاریخ روشن ہے
ترے ایثار کی تصدیق ہے قرآں کے دفتر میں

نہیں دل معترف تیرا تو پھر اسلام کا دعویٰ
خدا کے گھر میں سرقہ ہے نگاہِ نکتہ پرور میں

تری تکبیر کی آواز میں تھی قوم کی قوت
تجھے میں ڈھونڈھتا ہوں نعرۂ اللہ اکبر میں

ترے دم سے رہی اسلام میں روحانیت باقی
نہیں گم ہو کے رہتی سلطنت میں مال زر میں

کہاں دنیا میں اپنے نفس کے پہچاننے والے
ترا نفس آئینہ ہوتا نہ کیوں عرفانِ داور میں

نہ تھی تیری حکومت میں ہوا سرمایہ داری کی
چراغِ عافیت روشن تھا ہر مزدور کے گھر میں

غلاموں کو ہے مشکل پاؤں پر اپنے کھڑا ہونا
قدم دوشِ ہوا پر تھے ترے میدانِ خیبر میں

ابھی تھیں تجھ سے وابستہ اُمیدیں قوم کی لاکھوں
لپٹ کر رہ گئیں قاتل کے زہر آلود خنجر میں

○

زمزمۂ رُوح

شبِ دراز میں نہاں جہانِ پُر بہار ہے
کسی کی زلفِ عنبریں نقابِ روزگار ہے

یہ عافیت کی روح ہے نمودِ خامشی نہیں
یہ شب کی تیرگی نہیں سکون کا حصار ہے

نفس نفس معیّن ہے سکون کے فروغ میں
ہوا کا مدّو جزر بھی تنِ فضا پہ بار ہے

خیال بھی کنارہ کش کہ خواب میں خلل نہ ہو
ہزار مسئلہ ہیں پر سحر کا انتظار ہے

تمام قوتیں ہیں گم مبادیاتِ روح کی
یہ رشتۂ شہود و غیب پھر بھی استوار ہے

تعلقات گھٹ گئے کہ اُس سے واسطہ بڑھے
سکون جتنا چھا رہا ہے روح بیقرار ہے

ورودِ لطف کے لیے کنارِ شوق وا کیے
برسم اشتیاق ہے بوضع انتظار ہے

تردّدِ ذات سے بری توہّمات سے جدا
کشش ہے اور تجلّیات اور امیدوار ہے

دراز زلف کون ہے یہ فرشِ خواب پر دراز
کہ جس کی نیند نیند کیا ہے راز کردگار ہے

سُلا چکی ہیں جسم کو ہَوا کی نرم تھپکیاں
اثر پذیر نفس ہے کہ محوِ انتظار ہے

وہ لہریں نور کی بڑھیں وہ لوحِ دل سے مس ہوئیں
اُبھر رہا ہے نقش یا کوئی پیامِ یار ہے

کمال جذب کر رہا ہے اکتسابِ معرفت
کسی کے نازِ حسن سے نیاز ہمکنار ہے

تجلّیوں نے کون سی یہ شکل اختیار کی
جگر ہے اپنا اپنا ہاتھ اور چھری کی دھار ہے

خلیلِ فرشِ خواب سے اُٹھے ہیں خواب دیکھ کر
نگاہیں کہتی ہیں کدھر ہمارا کلعذار ہے

محبتِ پدر کہاں چھری کہاں پسر کہاں
یہ امتحانِ سخت بھی جہاں میں یادگار ہے

اگرچہ فطرتِ بشر کا اور کچھ ہے مقتضا
نبیؑ کی شان کہہ رہی ہے خواب خوشگوار ہے

یہ رازِ حسن و عشق ہیں گمان و شک کو دخل کیا
وہ پھر کہیں یہ پھر سنیں اب اس کا انتظار ہے

کلیمِ حق سے پوچھیے مخاطبہ کی لذتیں
سوال بار بار ہے جواب باربار ہے

مطالبہ کی شان نے بڑھا دیا ہے ولولہ
جو پاؤں روبراہ ہیں تو دل بروئے کار ہے

اب اپنی شان ڈھونڈھتا ہے آفتاب ماہ میں
خلیلِ ہیں ذبیح ہیں پیامِ کردگار ہے

اس آئینہ کی چھوٹ ہے اُس آئینہ میں ضو فگن
نہ اس طرف غبار ہے نہ اُس طرف غبار ہے

خدا کی ایک راہ ہے خلیل دو ہیں سر بکف
رضا کی ایک شان ہے دو طرفہ آشکار ہے

اُدھر ہے ذوقِ مضطرب ادھر ہے چشمِ معترف
اُدھر نظر میں کیف ہے ادھر نظر میں پیار ہے

چمن اُجاڑنے کو خود اُٹھا ہے باغباں کہ جب
بہار کا شباب ہے شباب کی بہار ہے

پدر کے ساتھ میہمان جا رہا ہے لختِ دل
مگر یہ فطرتِ بشر کہ ماں کو اضطرار ہے

کسی نے جیسے کہہ دیا ہے کچھ دبی زبان سے
فراق کیا فراق کا خیال ناگوار ہے

چھری سے ریسماں سے ہے میہماں کو کام کیا
جواب کچھ سہی مگر سوال وزن دار ہے

نہ ہوگی سیر بوئے خوش سے آج مہر مادری
سحر سے زلفِ عنبریں کسی گلے کا ہار ہے

یہ سرفروش مردوں کے ہیں چہرہ مطمئن جو ہیں
مرادوں والی ماں کا ہے وہ دل جو بیقرار ہے

چلے ہیں کس شکوہ سے مسافرِ رہِ رضا
چھری کمر کی زیب ہے رسن گلے کا ہار ہے

نگاہیں وہ جھکی ہوئی نقیب عزمِ مستقل
قدم ہیں وہ تلے ہوئے ثبات بھی نثار ہے

بنا رہے ہیں راستہ کہ اور قافلہ بڑھیں — بتا رہے ہیں نقشِ پا یہ حق کی رہ گذار ہے
مِنیٰ کی منزل آگئی وہ ذرّے مسکرا دیے — کہ جیسے کوئی راز ہے اور اِن پہ آشکار ہے
وہ حلقۂ رسن بڑھے کہ دست و پا کو چوم لیں — اسیر اُن کا ہوگیا بشر تو رستگار ہے
وہ بندشیں جو کھول دیں ہزار عقدۂ دلی — انہیں سے عہد اور احد کا رشتہ استوار ہے
پدر کے ہاتھ میں چھری پسر زمیں پہ قبلہ رو — فلک پہ کوئی منتظر بحکمِ کردگار ہے
وہ منظر عجیب ہے کہ حیرتی ہیں دو جہاں — ہے جاذب نگاہ بھی اگرچہ دلفگار ہے
منازلِ نفوس میں عوالمِ عقول میں — زمیں سے لے کے تا فلک قیامت آشکار ہے
چھُری کسی پہ چل گئی مگر یہ ماجرا ہے کیا — ذبحِ سر بدوش ہیں زمین لالہ زار ہے
قبول سعی ہوگئی عوض میں دنبہ آگیا — اُسی نے خود بچالیا کہ اپنا جاں نثار ہے
زمانہ محو کر نہ دے کسی کی سرفروشیاں — بہ شکلِ عید آج تک جہاں میں یادگار ہے
یہ عید ہے مقدمہ اب اصل عید دیکھئے — ولادتِ حسینؑ سے زمانہ پُر بہار ہے
جدارِ کعبہ کس طرح کنارِ شوق وا کرے — کسی کے شوق میں خود آج شیرِ کردگار ہے
ملے نہ دیر میں خبر کھڑے ہیں خود قریبِ در — فدا اس انتظار کے نبیؐ کو انتظار ہے
یہ مطلعِ لطیف ہے کہ موتیوں کی ہے لڑی — گلے میں لیلیِ سخن کے یا گلوں کا ہار ہے
یہ اشتیاقِ دید ہے یہ ان کا انتظار ہے — کہ نفسِ مطمئن کو بھی کچھ آج اضطرار ہے
لبِ رسولؐ متصل ہیں گوشِ حق نیوش سے — دلِ بلالؓ کی طرح اذاں بھی بے قرار ہے
وہ آگئے حسینؑ لو حسنؑ کے ساتھ کھیلنے — کہوں کہ صحنِ مسجدِ نبیؐ کو انتظار ہے
کہوں حُسنؑ یا حُسینؑ نام بھی حَسین ہے — رسولؐ کی شبیہہ ہیں تو حُسن بھی نثار ہے
مرقعِ رسولؐ کا ہوا ہے آج تکملہ — ہے سال بھر کی جان ایک ایک شیر خوار ہے
حسنؑ تو سر سے تا کمر شبیہہ ہیں رسولؐ کی — کمر سے لے کے پاؤں تک یہ نوگلِ بہار ہے
بتول مانگتی ہیں کچھ نبیؐ سے ان کے واسطے — نگاہ میں ہے ماں کی سب جو اُنکا لاڈ پیار ہے
حسینؑ کے لیے طلب طلب بھی پھر بتول کی — وہ چیز کی ہے مرحمت رسولؐ کردگار ہے
کرم کی شان کی عطا حسینؑ نام رکھ دیا — شجاعت اپنی بخش دی جو آج یادگار ہے

یہ مقتضا ہے وقت کا وہ مطلعِ حسین پڑھوں
کہ جس کا حرف حرف ایک نقشِ اعتبار ہے

بنائے طولِ سجدہ ہیں جو شانِ سر گذار ہے
نہاں یہ ان کے کھیل میں بھی رازِ کردگار ہے

یہ گوشہ ہائے عافیت نصیبِ انبیاء نہ تھے
حسین کے لیے فقط یہہ فصلِ کردگار ہے

حسن کا بازوئے قوی علی کا ظلِ عاطفت
حبیبِ حق کا دوش ہے بتول کی کنار ہے

خدا نے وہ بھی دن کیا کہ پھول سہرے کے کھلے
عرب سے لے کے تا عجم بہار ہی بہار ہے

حسین پر نہ ٹھیرتی نگاہِ انتخاب کیوں
وہ بانوے عجم تو یہ عرب کا شہر یار ہے

یہ مطلعِ نفیس ہے کہ زمزمہ ہے روح کا
یہ طرزِ نو کی مدح بھی جہاں میں یادگار ہے

کچھ ایسا جاذبِ نظر حسین کا شعار ہے
جو ان کے دین میں نہیں دل اُن کا بھی نثار ہے

حسین پر نظر کرو مثال ہو کوئی تو دو
کرم کی شان دیکھ لو جو دل پہ اختیار ہے

چھپا کے منہ کو ہے عطا کہ دیکھنا نہیں روا
سوال کر رہا ہے جو غریب شرمسار ہے

کنیز نذر کر رہی ہے شاخِ گل حضور کو
وہ تحفہ جس کی آڑ میں دل امیدوار ہے

حسین کے تاثرات دیکھنے کی چیز ہیں
کنیز آج تک تھی آج صاحبِ اختیار ہے

حسین اے سُلالۂ رئیسِ منزلِ حرم
بنائے کعبہ آج تک تجھی سے استوار ہے

حسین تیرے ذکر سے رگوں میں دوڑتا ہے خون
حسین تیری یاد میں زمانہ بے قرار ہے

تجھے سلا کے اے حسین چونک اُٹھی ہیں ماتتیں
اب آنکھیں کھل چلی ہیں کچھ کہ یہ ترا وقار ہے

اُٹھ اب تو خوابِ ناز سے یہ فتح حق کی داد لے
جہاں کا ذرّہ ذرّہ آج تجھ سے شرمسار ہے

ورق ورق پہ ہو رہی ہے مُہر تیرے نام کی
تیرا فسانہ زینتِ بیاضِ روزگار ہے

حُراک غلام تھا ترا، کنیز تیری حریت
وہ حریت کہ جس کی آج خلق میں پکار ہے

قدم پہ تیرے لوٹتے ہیں آج تاجِ سلطنت
جو تیرا حق چھپا دیا تھا آج آشکار ہے

ترے سلام کو ہیں خم گدا بھی شہر یار بھی
ہیں جس کی مٹھیوں میں دل وہ سب کا تاجدار ہے

نہ سمجھیں اب تو قسمتیں بتا گیا ہے تو ہمیں
کہ مصرفِ حیات کیا ہے کیا اصولِ کار ہے

ہو اعترافِ بالعمل بھی محبتِ حسین کا
یہ عینِ معرفت نہیں کہ قوم اشکبار ہے

جو ادعائے زیست ہے علم بدوش بڑھ چلو
فنا کی حد سے متصل بقا کی رہ گزار ہے

○

شاہزادۂ نور

نہ ہوں مغرور نظریں وہمِ عرفانِ حقیقت سے
بہت جلوہ ہیں پوشیدہ ابھی چشمِ بصیرت سے

ابھی ڈھونڈے ہیں کتنے عقل نے گوشہ خیاباں کے
ابھی آنکھوں نے کیا پایا نگارستانِ فطرت سے

ابھی چمکی ہیں گہرائی میں دل کی بجلیاں کتنی
ابھی بدلے ہیں کتنے خواب تعبیرِ حقیقت سے

ابھی فکر و نظر نے کی ہے کتنی بادہ پیمائی
ابھی ہے ظرف کتنا آشنا ساقی کی ہمت سے

ٹٹولے ہیں ابھی تحقیق نے دل کتنے ذرّوں کے
اُتارے ہیں ابھی کتنے ستارے بامِ قدرت سے

کسی کے جلوۂ مستور پر بے اعتباری ہو
اُسے جو منزلوں پیچھے ہے خود اپنی حقیقت سے

کیا احساس نے کس دن مجسم نکہتِ گُل کو
تعارف جس کی سیرت سے ہے محرم ہیں صورت سے

درخشاں ہے وجودِ روح اک اک رگ سے پیکر میں
پر اب تک فلسفی محروم ہیں صاحب سلامت سے

بدل دیں جوہرِ قابل نے شکلیں نظمِ عالم کی
مگر باہر نہ آیا جوہرِ قابل طبیعت سے

بتائیں حسن کا نیرنگِ ظاہر دیکھنے والے
لطافت سے شناسائی ہے یا جانِ لطافت سے

شعاعِ نور عریاں کرنے والی ذرّہ ذرّہ کی
نقاب اپنی اُلٹ سکتی ہیں خود اپنی صورت سے

ہوا اتنی مجسم جو اُٹھالے بار طیارہ
لطیف ایسی کہ باہر ہے نگاہوں کی حکومت سے

وہ اک سیال دنیا موجِ طوفاں فتنۂ برقی
بڑھی یہ گرمیِ بازارِ عالم جس کی قوت سے

وہ دل میں گدگدی کرتی ہوئیں لہریں مسرت کی
جو بن جاتی ہیں ہونٹوں پر تبسّم اُس کی قدرت سے

غم و غصہ کا جذبہ درد کے اشک آفریں نشتر
بلا دیتے ہیں قصرِ عنصری کو اپنی قوت سے

وہ ظالم کارواں جو چھوڑ جاتا ہے نشاں ایسے
کہ مٹتے ہیں مگر کب وصل ہو کر خاکِ تربت سے

سراپا جلوۂ حیرت ہے اِن کی کارفرمائی
ابھی تک دامن آلودہ نہیں داغِ بصارت سے

وجود اک صورتِ قہری ہے غیبت اصل ہے جس کی
جو ہیں بے معرفت نا آشنا ہیں لطائفِ غیبت سے

ازل میں چشمِ صد نظارگی کو ہوش میں لا کر
کہیں اب کیا وہ خود پردہ میں ہیں پردہ کی قسمت سے

خبر آئی ہے پھر فاراں پہ تجدیدِ تجلی کی
سبکدوشی نہیں اب تک نگاہوں کی امانت سے

حجابِ جلوہ گاہِ ناز کی اک آخری جنبش
تعجب کیا اگر سجدہ کرالے چشمِ حیرت سے

ابھی ہے تشنۂ تکمیل ذوقِ مشرق و مغرب
برسنے ہی کو ہے پھر کوئی جھالا ابرِ رحمت سے

ازل کی صبح پھر آئے گی دور عاشقی بن کر
اٹھیں گے کروٹیں لے لے کے سُل خاکِ تربت سے

ابھی پھر دیکھنا ہے لیلیِ دوراں کو آئینہ
ہیں وابستہ امیدیں ایک نقشِ پا کی رویت سے

فضا خاموش فطرت گوش بر آواز ہے یعنی
چھڑے گا اور اک نغمہ ابھی سازِ حقیقت سے

عبث بیٹھے ہیں شوقِ دید والے فکرِ محشر میں
کہ پورا ہوگا یہ وعدہ مگر پہلے قیامت سے

بہت جلوے نمایاں ہو چکے اور ہونے والے ہیں
کسی کی شامِ ہجرت سے کسی کی صبحِ غیبت سے

سنبھال اے ساقیٔ روزِ ازل کیف دو عالم کو
کہ جھومیں گے ابھی رکن و مقام اک تازہ بیعت سے

نہیں موسیٰ تو کیا غش کھانے والے اب بھی جیتے ہیں
چراغِ طور ہوگا اب کے روشن اپنی قسمت سے

بہارِ عہدِ اوّل ہوگی کروٹ دورِ آخر کی
فضا اک بار پھر گونجے گی تصدیقِ رسالت سے

شریعت طے کرے گی پُر کرے گی منزلیں اپنی
محمدؐ کی امامت تک محمدؐ کی رسالت سے

کسی عارض پہ لہرائیں گے پھر گیسو پیمبرؐ کے
نبوت خود پکارے گی کہ رشتہ ہے امامت سے

نہ جانے تزکیہ کرنا ہے کتنا جذبۂ دل کا
بڑی مشکل سے آئے گا کوئی جلوت میں خلوت سے

ہوئی ذہنِ تولا پر ضیا پاشی تجلّی کی
ملا اک مطلعِ کیف آفریں سرکارِ حجت سے

کہ از عیسوی ظاہر ہے نازِ مہدویت سے
نبوت دو قدم رہ جائے گی پیچھے امامت سے

کمالِ مصطفائی ہے کمالِ حسنِ صورت سے
شبابِ لافتائی ہے جلال و رعب و ہیبت سے

وہی تیور کی پایانی وہی چتون کی شایانی
وہی فطرت کی یکسانی مساواتِ حقیقت سے

نبیؐ کی عمرِ بعثت ہے شبابِ جاوداں اس کا
مکلّف اس قدر صلِ علیٰ کیفِ محبت سے

جھلک دیتی ہوئی رُخ پر صباحت روئے حیدرؑ کی
گلِ رخسار پر اک تل پیمبرؐ کی ملاحت سے

بہ تقریبِ وراثت دو قبائیں جسمِ انور میں
مرصع اک رسالت سے مکلّف اک امامت سے

تخاطب کی جسارت ہے تقاضہ دردِ ملت کا
یہ مطلع ہے کہ دل نے آہ کی ہے دردِ ملت سے

تجھے مشکل ہے کیا جلوت میں آنا کنجِ خلوت سے
علیؑ سے تیغ لے اور اذن سرکارِ رسالتؐ سے

وہ ہر اک وار پر او دستِ حیدرؑ چومنے والی
نکل آمیان سے باہر تڑپ کر دردِ ملت سے

وہ آنکھیں تو نے دیکھی ہیں وہ نظریں تو نے پرکھی ہیں
ترے جوہر کو چمکاتی تھیں جو تابِ شجاعت سے

شریعت سے مذہب ہے طریقت سے مطلا ہے
رسالت سے مجلی ہے منور ہے امامت سے

بتا اے چھپنے والے نزع میں ہے قوم کی ہستی
حیاتِ مختصر سے ہو گلہ یا طولِ غیبت سے

تری آمد کا آوازہ محمدؐ کے گھرانے میں
سکونِ ہر دل مضطر رہا ہے روزِ بعثت سے

اب اعجاز پیغمبرؐ پہ مفہومِ تبسم تھا
کبھی توضیح سیرت سے کبھی تفسیرِ صورت سے

شبِ ہجرت کا تکیہ منزلِ نازِ رسالت میں
امینِ وحی کا نغمہ اب اسرار قدرت سے

سکون افروز تارا شام کے تاریک زنداں کا
فضائے غم میں لو دیتا ہوا شامِ مصیبت سے

امینِ علم حق آگتھیاں سُلجھا دماغوں کی
اُلجھ پڑتا ہے جہلِ علم پیغامِ شریعت سے

فضا تاریک مرکز دور گم گشتہ ہیں پروانے
بھٹکتے پھر رہے ہیں منزل شمع حقیقت سے

تلاطم خود بتاتا ہے ضرورت فرد کامل کی
کہ دنیا اب سنبھل سکتی نہیں ناقص حکومت سے

تری شاہی کا سکّہ ہے سکونِ قلب مومن کا
ملے گا تیرے ہاتھوں سے نہیں ملتا جو قسمت سے

امامت کو حکومت سے جدا سمجھا جدا رکھا
عوض لینا ہے تجھ کو اہلِ دنیا کی خیانت سے

نہیب جعفریؑ سے آ جلالِ حیدریؑ سے آ
بہت کچھ ہو چکیں ہیں دعوتیں خلق و مروت سے

تفوق نصرت دنیا سے ہے مغرب کو مشرق پر
شرف مشرق کو ہو مغرب پہ حاصل تیری نصرت سے

جگا دے خلق کو خونِ شہیداں کا عوض لے کر
کہ اب ہر موت کو تعبیر کرتے ہیں شہادت سے

دلوں میں بُت لیے کرتے ہیں کعبہ کی نگہبانی
تمسخر کر رہے ہیں آذری پندار قدرت سے

قرینہ ہے کہ بک جائے حرم اغیار کے ہاتھوں
کہ اب تحریم کعبہ گھٹ گئی تکریم دولت سے

جگا دے داستانِ غم سنا کر خستہ حالوں کی
لپٹ جا آ کے فرطِ ناز میں نانا کی تربت سے

اُدھر مسمار ہیں قبریں ترے اسلاف طاہر کی
اِدھر خالی ہیں نبضیں قوم کی دینی حرارت سے

○

بجائے نغمہ پیرائی رجز پڑھنے لگا ساقی
خدا حافظ ہے اب کشتیِ مئے کی ناخدائی کا

سنا ہوگا زبانِ دوست سے الفقر فخری بھی
مگر اس وقت نعرہ یاد ہے خیبر کشائی کا

جگر میں سنگِ خارہ کے وہ در آتا ہوا نیزہ
وہ تھرّانا جبل کا اور وہ کس بل کلائی کا

بنائی ہوگی ان ہاتھوں نے مسجد بھی مدینے کی
مٹانا پر نہ بھولے گا بتوں کی کبریائی کا

ارے توبہ وہ میدانِ وغا کی خاک پر سجدے
مقابل ان سے کیا کیجیے حرم کی جبہہ سائی کا

کسی کا بانکپن دیکھا ہے ساقی کی سفارت میں
وہ منظر وہ حیات افروز منظر کج ادائی کا

کہاں وہ عاصمی خود رفتگی ساحل نشینی کی
کہاں وہ مالکی انداز طوفاں آزمائی کا

کہاں وہ زیست کی کاوش میں حسرت کوشہ گیری کی
کہاں وہ موت کی ہلچل میں جذبہ خودنمائی کا

کہاں وہ زیرِ دیوارِ حرم بچھا ہوا بستر
کہاں وہ قصدِ مہر و ماہ تک پرچم کشائی کا

کہاں اک جلوہ گاہ ناز میں لرزش نگاہوں کی
کہاں تلوار کے قبضہ پہ بوسہ خود ستائی کا

مسلّم ہستیِ دل ادعائے زندگی برحق
وہاں کیا کیجیے دشمن جہاں بھائی ہو بھائی کا

جہاں اپنے سروں پر اپنی تلواریں برستی ہوں
جہاں پر زخم ہو درشن جھروکہ جگ ہنسائی کا

جہاں اپنے ہی دل رکھے ہوئے ہوں اپنے نیزوں پر
تماشا ہو رہا ہو دست و بازو کی صفائی کا

جہاں الجھے ہوئے ہوں اپنے ہاتھ اپنے گریباں میں
جہاں اغیار سے ہو آسرا عقدہ کشائی کا

جہاں غرقِ عرق ہو ملّتِ بیضا کی پیشانی
مقابل ہو جہاں کافر کے در پر جبہ سائی کا

جہاں لڑتے ہوں آپس میں مسلماں قبلہ رو ہوکر
جہاں ہو شملہ رو موضوع آپس کی لڑائی کا

جہاں جذبات اپنے اپنی فطرت کی مخالف ہوں
جہاں برپا ہو اک طوفان احساس ریائی کا

جہاں دل بن گئے ہوں گتھیاں دینی تکدر کی
جہاں ڈھونڈے نہ ملتا ہو کوئی پہلو صفائی کا

جہاں پہ درد سر ہو درد دل کا پوچھنا کیا ہے
کس و ناکس کے کاندھے پر ہے جھنڈا ناخدائی کا

یہ مشکل ہو جہاں مشکل میں جب ایسی نزاکت ہو
سہارا ڈھونڈیے کس رہنما کی رہنمائی کا

کوئی مشکل نہیں مشکل ازل سے سنتے آئے ہیں
علیؑ کی ذات پر ہے خاتمہ مشکل کشائی کا

علیؑ کعبہ میں ہیں دربار ہے مشکل کشائی کا
مسلمانو چلو موقع ہے قسمت آزمائی کا

مقدر نے دیا ہے بے تکلّف وہ حسیں مطلع
مناسب ہے کہ تاج سر بنے مدحت سرائی کا

ہوا اب خاتمہ جھوٹے خداؤں کی خدائی کا
یہ جلوہ ہے تبسم اس کی شانِ کبریائی کا

نگاہوں کی لطافت سے مرتب شیر کی ہیبت
نمایاں فاتحانہ رو میں پہلو دلربائی کا

جبینِ سجدہ فرما پر جلالت کی درخشانی
ہوائے درد میں روشن کنول فرماں روائی کا

بدورِ ہوشِ ہستی مطلقاً زیرِ قدم دنیا
بشانِ حق پرستی فیصلہ بے اعتنائی کا

کوئی دیدار پرغش تھا تو کوئی خود پرستی پر
بنایا اس کو آئینہ خدا نے خود نمائی کا

وہ بندہ ہے دکھا دو علم و دولت کے خداؤں کو
خدا کہلا کے بھی دعویٰ نہیں کرتا خدائی کا

شعورِ بندگی میں ہے نمودِ صاحبی کتنی
نمونہ بن کے دیکھیں اس کے دورِ ارتقائی کا

حکومت اس طرح اللہ کے بندوں پہ کرتے ہیں
حکومت اس نے کی پہلو بچا کر کبریائی کا

افق پر بزم مدحت کے وہ مطلع لے کے آیا ہوں
اجارہ مل گیا ملکِ سخن میں خود ستائی کا

فلک دینے لگا آنکھوں سے جذبہ ہم نوائی کا
کہا کیا دردِ دل منہ دیکھ کر بھائی نے بھائی کا

ابھی چونکا ہے گہری نیند سے آغوشِ قدرت کی
مچلتا ہے ابھی سے ولولہ قدرت نمائی کا

جلالت نے فضائے قدس میں کیا لوریاں دی ہیں
ہمکنے کی ادائیں ڈھنگ ہے زور آزمائی کا

وہ نازِ آفرینش جب چلا بزمِ حقیقت سے
یدِ قدرت نے سر پر تاج رکھا حق نمائی کا

نہیب و ہیبت و اجلال و سطوت نے سلامی دی
یدِ الٰہی نے پروانہ دیا خیبر کشائی کا

ادھر کون و مکاں صدقے اتارے حُسنِ فطرت نے
اُدھر حیرت نے آئینہ دکھایا دل ربائی کا

فرازِ عرش سے بارش ہوئی رحمت کے پھولوں کی
زمیں کے فرش سے نعرہ چلا اس کی دہائی کا

اسی بچہ نے حل کی پہلی مشکل ذوالعشیرہ میں
جوانی آگئی سہرا بندھا مشکل کشائی کا

سجایا طرۂ خیرالبشرؐ جس دن عمامہ پر
دوبالا ہوگیا جلوہ مزاج خوش ادائی کا

بدن پر چست آئی کیا قبا من کنت مولا کی
ہوا یوں تکملہ کونین کی فرماں روائی کا

زمیں پر اس نے اسلامی حکومت کی بنا رکھی
رسولؐ اللہ نے منصب دیا پرچم کشائی کا

ہوا یہ کالِ ایماں بن کے کالِ کفر پر غالب
کسی کے فرق پر اب تاج رکھ دو خودنمائی کا

نجانے کتنی راہیں کھول دیں تسخیرِ عالم کی
ہوس کوشوں نے ڈھرّہ لے لیا کشورکشائی کا

غریبوں کو مصیبت ہوگئی اسلام کی نعمت
سکونِ قلب رخصت ہوگیا ساری خدائی کا

بگاڑا ظلم نے آخر نظامِ کارفرمائی
عصائے آہ سے بدلا عصا فرمانروائی کا

وہ جذ بے سو گئے عہدِ ستم بیدار تھا جن سے
وہ تیور بجھ گئے غرّہ تھا جن پر کج ادائی کا

اصول اسلام کے بدلے زمیں بدلی فلک بدلا
شہنشاہی لیے پھرتی ہے اب کاسہ گدائی کا

وہ دھوکا بھی نہیں اب جس کو سمجھے تھے حقیقت ہے
بہت دن خواب دیکھا خود پرستی خودنمائی کا

یہ نزکِ قوم نازش بھی نہیں اب کم نصیبوں میں
گیا وہ دورِ خوں آشام طاقت آزمائی کا

مسلماں تھے کبھی دھبّہ ہیں اب ہستی کی دامن پر
نوازش کفر کی احسان اسلامِ ریائی کا

خدا پر طنز بھی کرنے لگا اب جوشِ بیتابی
کہ ساماں کفر سے کر دین کی عقدہ کشائی کا

کلیجوں سے دھواں اٹھنے لگے اے ساقیِ کوثر
خدارا شور سن ٹوٹے ہوئے دل کی دہائی کا

رہے گا تا کجا اب جلوہ گر خضرا کے معدن میں
وہ عالم تاب ہیرا تیرے تاجِ رہنمائی کا

○

خمِ غدیر

وہ ماہِ رجب مظہرِ اسرارِ الٰہی
عالم پہ برستے ہوئے انوارِ الٰہی

وہ ایک کے بعد ایک مہِ نور کا آنا
اللہ کے احسان محمدؐ کا گھرانا

تیرہ وہ رجب کی وہ محبت کا سندیسا
خدمت میں رسالتؐ کی امامت کا سندیسا

آغوش میں بھائی کی وہ ہنستا ہوا بھائی
کاشانۂ اسلام کی وہ گود بھرائی

وہ باڑھ پہ آیا ہوا طفلی کا زمانا
اسلام کی خدمت کا وہ پروان چڑھانا

بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی وہ جلوہ نمائی
آغوش سے وہ دوشِ پیمبرؐ پہ رسائی

وہ قوم کی تعمیر لڑکپن سے جوانی
ہوش آتے ہی آتے ہمہ گیری ہمہ دانی

وہ دین کی بڑھتی ہوئی رو کفر کا گھٹنا
حج کرکے وہ سلطانِ دو عالمؐ کا پلٹنا

بے چتر و ہوا دار وہ شاہانہ سواری
صدقے دلِ مخلوق فدا رحمتِ باری

وہ گرمئ رفتار سے گیتی کو تزلزل
ماہی نہ مراتب پہ قیامت کا تحمل

سیلاب کا طوفان کا انداز روانی
آئی ہوئی اسلام پر بھرپور جوانی

ایمان سے معمور سفینے کے مسافر
آئے ہوئے مکّہ سے مدینے کے مسافر

اک ایک جواں مرد عرب رستم دستاں
تا حدِ نظر دشت میں نیزوں کا نیستاں

وہ درد بدل تیغ بکف رہبر و راہی
وہ لفظ مسلمان کا مفہوم سپاہی

گھر کے لیے بے چین درِ دوست کے زائر
جیسے نگہِ شوق کے اڑتے ہوئے طائر

سورج وہ چمکتا ہوا وہ ٹھیک دوپہری
تپتی ہوئی کرنوں سے وہ میدان سنہری

ذرّے وہ دہکتے ہوئے جلتی ہوئی ریتی
لہراتی ہوئی دھوپ میں اسلام کی کھیتی

پھیلا ہوا جنگل میں فرشتہ کا سر رشتہ
آیا ہوا سرکار کی پیشی میں فرشتہ

وہ خم کی گزرگاہ پہ دربارِ رسالت
وہ خیرِ عمل تکملہ کارِ رسالت

شرمایا ہوا عرش کے ایوانوں کا منبر
وہ فرش عباؤں کا وہ پالانوں کا منبر

فرمان کے اعلان کی وہ سخت ضرورت
اٹھارویں تاریخ کی وہ نیک مہورت

وہ خوان تولا کے نمک خواروں کی ٹولی
کرّار کو گھیرے ہوئے جراروں کی ٹولی

میدان کو میخانہ بنائے ہوئے میخوار
زانو سے وہ زانو کو بھڑائے ہوئے میخوار

آہنگ نیا رنگ نیا ڈھنگ نرالے
تلوار کے آئینہ میں منہ دیکھنے والے

سمجھے ہوئے ساقی کی نوازش کا طریقہ
آنکھوں سے ٹپکتا ہوا پینے سلیقہ

احساس کے مارے ہوئے ایثار کے روگی
دنیائے محبت کے ستائے ہوئے جوگی

جرأت کے پرستار محبت کے پجاری
جیسے کسی ساونت کی تلوار دو دھاری

وہ سازِ محبت کا تولا کا ترانا
احرامِ غمِ عشق کا قرآن کا بانا

دیکھے ہوئے عالم کی سیاہی و سفیدی
اخلاص کی زنجیر میں جکڑے ہوئے قیدی

جب پاؤں اٹھائے تو کٹھن دیکھ کے رستا
سودانہ کیا نفس کے ارشاد پہ سستا

سینوں میں غمِ عشق کی اک آگ بھڑکتی
جذبات کو روکے ہوئے ایمان کی شکتی

کس در کے بھکاری ہیں تو کس گھر کے پریمی
بکھرے ہوئے اولادِ پیمبرؐ کے پریمی

یہ شانِ وفا ہو جو ہو مطلوب علیؑ سا
دیوار میں جس طرح پلایا ہوا سیسا

میداں کے وہ جانباز وہ محفل کے شرابی
تلوار وہ پہلو میں بغل دہ وہ گلابی

اک رشتہ میں گوندھے ہوئے تسبیح کے دانے
ساقی کی پُر آشوب محبت کے دوانے

سینوں میں دلوں کے وہ لچکتے ہوئے ساغر
اڑتی ہوئی مئے اور چھلکتے ہوئے ساغر

مخمور مئے عشق کے ویرانے کی مٹی
خوشبو سے مہکتی ہوئی میخانے کی مٹی

دولھا کی طرح بیچ میں ملّت کا دلارا
اسلام کی قسمت کا چمکتا ہوا تارا

ہمراہ عنایت نظری راہ نمائی
کونین کی فہرست لیے عقدہ کشائی

وہ علم کی شدت سے ضیا چہرہ کی دونی
زیبا سر پر نور پہ وہ تاجِ سلونی

دل میں نہ تکدر نہ زباں پر کوئی دکھڑا
توفیق خداداد سے ہنستا ہوا مکھڑا

روداد نہ حسرت کی نہ ارمان کی باتیں
اعوان سے انصار سے قرآن کی باتیں

اس شان کے نخچیر ہوئے کس کو میسر
فتراک میں بدر و احد و خندق و خیبر

ایماں کے ابھرتے ہوئے جذبات کا مالک
اسلام کی مشہور فتوحات کا مالک

بھائی پہ وہ بھائی کی نگاہوں کا قرینہ
ماتھے پہ محبت کی حرارت کا پسینہ

بندش میں لبوں کی وہ مچلتا ہوا نغمہ
من کنت کی بنسی سے نکلتا ہوا نغمہ

تیور بھی نئے لحن کا انداز بھی خاصہ
دو لفظ میں قانون الٰہی کا خلاصہ

ہمت کا وہ بل ماتھے پہ ڈالے ہوئے لفظیں
لنگر کو دو عالم کے سنبھالے ہوئے لفظیں

اکملت لکم کا وہ سرِ عرش سے آنا
اسلام کی تکمیل کا فرمان سنانا

اک لفظ میں بیدار وہ سوئے ہوئے کونین
وہ معنیٔ مولا میں سموئے ہوئے کونین

ساقی کو ملی خلق کے رندوں کی اہیری
لے ہوگئی قرآں کی حجازی سے غدیری

میخواروں کی اٹھی ہوئی نظریں وہ ادب سے
رکتی ہوئی سانسیں وہ مسرت کے سبب سے

وہ لطفِ نظر اس کا خدا خود جسے چاہے
قربان نگاہِ تو شوم باز نگاہے

○

مولائی

سنی مدحِ علیؑ ہم نے ستاروں کی زبانوں سے
خراجِ منقبت آیا زمیں پر آسمانوں سے

پڑھا ہے ہم نے سولی پر قصیدہ اپنے مولاؑ کا
کوئی پوچھے یہ عالم دردِ دل کے نکتہ دانوں سے

گلے کٹوا کے بھی اس منقبت سے ہم نہ باز آئے
علیؑ کے نام کی تبلیغ کی ہے قید خانوں سے

زبانیں کٹ گئیں جب مدح کے اقدامِ برحق پر
سنایا مطلعِ پُرنور آنکھوں کی زبانوں سے

جلایا اور دشمن کو قصیدہ پڑھ کے سولی پر
بہت گزرے ہیں ہنستے کھیلتے ان امتحانوں سے

نہ چھوڑی مدح کی صورت گری کیسا ہی وقت آیا
ولا کے راستہ میں ہاتھ دھو رکھے ہیں جانوں سے

ہماری قوم ہی اسلام کی سینہ سپر نکلی
کہیں جب تیر نکلے ظلم وظلمت کی کمانوں سے

خدا رکھے درِ دولت نہ چھوڑا ہم نے مولاؑ کا
بڑے وزنی پیام آئے تھے دولت کے ٹھکانوں سے

○

منقبت

جلوہ گر عشقِ علیؑ مرتضا آنکھوں میں ہے
میری پوری زندگی کا مدعا آنکھوں میں ہے

دونوں عالم نور میں ڈوبے نظر آتے ہیں آج
کون یہ میرِ عرب رنگیں قبا آنکھوں میں ہے

بے خودیٔ دل نے کس منزل میں پہنچایا مجھے
آج احساسِ شعورِ ارتقا آنکھوں میں ہے

جس کو قدرت نے چھپا رکھا ہزاروں سال تک
اے زہے قسمت وہ جلوہ بَرملا آنکھوں میں ہے

ساعتِ دیدار شاید آ گئی بالکل قریب
اب خدا رکھے دلِ دردآشنا آنکھوں میں ہے

میں نے بھولے سے بھی دیکھا تھا نہ دنیا کی طرف
آج آنکھوں کی حفاظت کا صلا آنکھوں میں ہے

لکھ رہا ہوں مطلعِ تیلوہ شاہد کا جمال
مقطع حبل المتیں صلِ علیؑ آنکھوں میں ہے

کیوں نہ برسے میری آنکھوں سے محبت کی شراب ساقیِ تسنیم و کوثر کی ولا آنکھوں میں ہے
ان کا گھر ہے وہ جدھر سے چاہیں گے آجائیں گے
کون جانے راستہ دل میں ہے یا آنکھوں میں ہے

○

قصیدہ

دماغ و فکر و قرطاس و قلم سے واسطا سمجھا
نہ سمجھا مدح کی ابجد بھی جب شاعر تو کیا سمجھا

وہ ہے تائل خدائے دوجہاں کی لامکانی کا
جو عرشِ حق کو اہلبیتؑ کی دولت سرا سمجھا

نہ پہنچے مدح کی منزل تک اصحابِ پیمبرؐ بھی
ابو ذر ہوں کہ سلماں کون ان کا مرتبا سمجھا

بڑی قیمت ہے ان لفظوں کی جو ہوں صرف مدحت میں
خوشا تقدیر شاعر شعر کا جو مقتضا سمجھا

کہی جس بوریے پر بیٹھ کر اک منقبت میں نے
اُسے میں تختِ شاہی سے بھی رتبہ میں سوا سمجھا

علیؑ کی منقبت سے فکر بیگانہ رہی جس کی
خدا جانے وہ حمد و نعت کا مفہوم کیا سمجھا

سخن سنجوں کی محفل میں وہ مطلع پیش کرتا ہوں
جسے میں اپنے زعمِ مدح گوئی میں نیا سمجھا

علیؑ سے جس کو نسبت ہے وہ اپنا مرتبہ سمجھا
سخنور اس کے در کا بادشہ کو بھی گدا سمجھا

تولا ے علیؑ سے میں نے دل کو دل بنایا ہے
اسی منزل میں قدرِ جوہرِ صدق و صفا سمجھا

تعجب ہے جو اس کے مرتبہ کو دوست کم سمجھے
شبِ ہجرت جسے دشمن محمد مصطفیٰؐ سمجھا

ہر اک میدان میں پہلو بہ پہلو جنگ کی جس نے
جلالت شاہِ مرداں کی وہی مردِ خدا سمجھا

علیؑ سوئے ہیں بستر پر نبیؐ کے جب شبِ ہجرت
ملک جبرئیل سا اس وقت معیارِ وفا سمجھا

یہ ایمانی ترقی اس کی ہی مرہونِ منت ہے
کہ انساں ہر نفس کو شاہراہِ ارتقا سمجھا

نبیؐ سا رہنما پاکر علیؑ سا مقتدا پاکر
میں اک اک زیست کے لمحہ کو انعامِ خدا سمجھا

رسالت کی ہوئی تکمیل تائیدِ امامت سے
امامت کو رسالت سے کوئی کیونکر جدا سمجھا

سمجھنے میں علیؑ کے صرف کر دی زندگی پوری
بڑی مشکل سے انساں زندگی کا مدعا سمجھا

مرے بالیں پہ لے آئی محبت ایک دن اس کو
جسے میں درد سمجھا تھا دمِ آخر دوا سمجھا

نقاب الٹا چراغ طور کا اس کی ولادت سے
کوئی سمجھا اسے جلوہ کوئی جلوہ نما سمجھا

علیؑ کے دشمنوں کی مدح سن کر صبر کیا معنی
غلط سمجھا اگر یہ مصرفِ صبر و رضا سمجھا

رہا محروم دو دن بھی جو شغلِ مدح گوئی سے
اُسے اے نجمؔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھا

○

منقبت

خدا کا گھر درِ دولت ہے دارائے امامت کا
کہ لہراتا ہے اب پرچم ید اللّٰہی حکومت کا

پجاری لرزہ براندام ہیں اور بت ہیں سکتہ میں
بہت اترا ہوا چہرہ ہے ہر مٹی کی مورت کا

وہ صدیوں کی خدائی ہاتھ سے جاتی ہے کچھ دن میں
نظر آتا ہے سایا سا کسی کے دستِ قدرت کا

نہ ہوگا فاتحہ خواں جن پہ کوئی یہ وہ قبریں ہیں
یہ صورت ہے کہ ہر بت میں ہے عالم سنگِ تربت کا

صدا ہو ہر شکست بت میں شاید کوسِ رحلت کی
عرب کی سرزمیں سے آگیا وقت ان کی رحلت کا

سہارا دینے والے خود گناہ گاروں میں نکلیں گے
جنازہ اٹھنے والا ہو گناہوں کی شریعت کا

بنایا خیر مقدم کو نیا در اس نے کعبہ میں
شگافِ خامۂ کن ہے نمونہ جس کی قدرت کا

خبر اک بار دیوارِ حرم کو توڑ کر نکلی
کہ اندازہ ہو دنیا کو مشیت کی مسرّت کا

خدا و مصطفےٰ کا عہد پورا ہونے والا ہے
گواہی دینے والا آگیا عہدِ رسالت کا

خدا کو پھر خدا کے گھر پہ یہ قبضہ دلائے گا
کسے معلوم کیا ہوگا صلہ اس حُسنِ خدمت کا

یہ نعمت مقصدِ اسلام ہے جانِ رسالت ہے
کہ ہے جس کے لیے پھیلا ہوا دامن رسالت کا

یہ مصحف آ گیا دنیا میں اس قرآن سے پہلے
کہ جس قرآن میں آئے گا حکم اس کی محبت کا

جسے سینہ سے لپٹائے ہوئے لاتے ہیں پیغمبرؐ
خلاصہ ہے یہی اللہ و پیغمبرؐ کی قوت کا

وہ بندہ ہے عوض لے گا بتوں سے بت پرستوں سے
حریمِ بندگی حق میں سرقہ کا خیانت کا

تعجب کیا خطاب آیا جو وہبہ اللہ کا اس کو
کہ چہرہ خود پتہ دیتا ہے شایانِ ریاست کا

بگاڑے ہیں اسی کے ہاتھ نے اصنام کے چہرے
بنایا ہے اسی کے ذہن نے آئین فطرت کا

کہا ہوگا اسی کے منہ سے حرفِ کن مشیت نے
اشارے سے بدل دیتا ہے جو قانون قدرت کا

اسی کے ہاتھ نے تعمیر تہذیب و تمدن کی
وہی دنیا میں خالق ہے شعورِ آدمیت کا

زمانے کی سیاست سے نہ تولو اس کے اسوہ کو
سیاست اس کی آئینہ ہے قرآنی صداقت کا

مقامِ ضبط کو سمجھو جہادِ صبر کو دیکھو
در خیبر سے اندازہ نہ کرنا اس کی قوت کا

سزا دی سرکشوں کو بزدلوں کی بخش دیں جانیں
شجاعانِ جہاں دیکھیں یہ مصرف ہے شجاعت کا

زبانِ علم سے پوچھو جہان علم سے پوچھو
زمانہ کس قدر ممنون ہے نہج البلاغت کا

جنھیں تم علم وفن کہتے ہو خانہ زاد ہیں اُس کے
مگر وہ علم وفن جن سے علاقہ ہے شرافت کا

کوئی لمحہ نہ تھا اس کا رفاہِ خلق سے خالی
لیا ہے جائزہ تاریخ نے اک ایک ساعت کا

فرشتوں نے شبِ ہجرت کہا ہوگا یہ آپس میں
یقیناً آدمی تھا مستحق تاجِ خلافت کا

عبادت کی فضا میں جاگنے والے کو نیند آئی
نئے پہلو سے جاگا ہے مقدر شامِ ہجرت کا

علی کہنا زباں سے کس قدر آسان ہے لیکن
دلِ انساں تصور کر نہیں سکتا جلالت کا

علی کے نام سے رونق کہیں آتی ہے چہرے پر
کہیں یہ نام سن کر رنگ اڑ جاتا ہے صورت کا

اندھیرے سے نکل کر اب یہ دنیا بھول بیٹھی ہے
وہ دنیا میں چراغاں کر گیا ہے علم وحکمت کا

شریعت کے خداوندوں میں سرگرداں ہوں مدت سے
کوئی ہلکا سا اک پرتو دکھا دے اس کی سیرت کا

بہت اس بت شکن کی قوم میں ہیں آج بت خانے
غرورِ علم کا بت ہے کہیں پندار دولت کا

اسی دن کو ہوئی تھی خم میں کیا تکمیل نعمت کی
تسلط نعمتوں پر ہے خداوندانِ نعمت کا

اسی خاطر مثالیں اس نے مزدوری کی چھوڑی تھیں
کہ جذبہ پالیے دل میں غریبوں سے کراہت کا

اثر اچھا لیا ملت نے فرمانِ مودت سے کہ آپس میں چلن ہی اٹھ گیا مہر ومحبت کا

جناب نجم یہ اندازِ مدحت کیا پسند آئے
ابھی دنیا کو اندازہ نہیں لطفِ حقیقت کا

○

منقبت

اندھیرا تھا اجالا ہوگیا مرضیٔ داور کا علیؑ کا نامہ سرنامہ بنا جب کُن کے دفتر کا
مجھے دل میں نظر آیا وہ جذبہ مدحِ حیدرؑ کا کہ جادہ دے دیا ذوقِ سخن کو زندگی بھر کا
نقابِ رخ جو الٹا صبحِ عاشورہ کے منظر کا مری پلکوں پہ روشن تھا ستارہ دیدۂ تر کا
اذاں ایسی جواں قامت نہ پھر سننے میں آئے گی شبابِ اکبرؑ کا تھا گویا شباب اللہ اکبر کا
امامت خلقتاً محدود تھی بارہ اماموں تک کیا دنیا نے یوں تقسیم جیسے مال ہو گھر کا
خبر دیتا ہے قرآں اپنے لفظوں اپنے لہجے سے یہ اندازِ تکلم ہے لسان اللہ کے گھر کا
جہاں میں وحدتِ عزم وعمل نے پھر نہیں دیکھا نمونہ جو زمینِ کربلا پر تھا بہتّر کا
کہاں اپنی نظر اس جلوۂ معصوم کے قابل دغا دے جائیں گی آنکھیں نقابِ رخ اگر سرکا
جلالت کی فضا سے اک عجب ماحول بنتا ہے جہاں میں نام لے لیتا ہوں عباسِ دلاور کا
مجھے جانا ہے ذکر وفکر سے آگے مرے مولاؑ سہارا چاہتا ہوں اک نگاہِ بندہ پرور کا

نمازِ مدح پڑھتا ہوں مودّت کے مصلے پر
دکھا دو نجم دنیا کو یہ رتبہ ہے سخنور کا

○

عرفانِ ابو طالبؑ

کوئی مانے نہ مانے آج ایمانِ ابوطالبؑ
مگر اسلام ہے تاریخ احسانِ ابو طالبؑ

اگر ہو جستجو میں رہبری اخلاص کی شامل
بہ فیضِ جستجو ہوتا ہے عرفانِ ابوطالبؑ

پیمبرؐ کی جگہ خطرے میں ڈالا اپنے بچوں کو
ذرا دیکھ اے مسلماں شان ایمانِ ابو طالبؑ

نبیؐ سے کوئی پوچھے کتنے جانبازوں کے حلقہ میں
رہے شعبِ ابوطالبؑ میں مہمانِ ابوطالبؑ

زباں پر اپنی کلمہ چشم پیغمبرؐ میں کچھ آنسو
دم آخر بہت تھا سازو سامانِ ابوطالبؑ

کچھ اس انداز سے ختمِ رسالت کی حفاظت کی
خدا سے جیسے تھا کچھ عہد و پیمانِ ابوطالبؑ

علیؑ سوئے ہیں کتنی مرتبہ فرشِ پیمبرؐ پر
ہوئی قربان کتنی مرتبہ جانِ ابوطالبؑ

خدا کو ہے خبر شعبِ ابوطالبؑ کی نسبت سے
ریاض خلد میں کتنے ہیں ایوانِ ابوطالبؑ

نگاہِ حق شناس اور عقل صحت مند سے پوچھو
ملیں گے کم جہاں میں مرتبہ دانِ ابوطالبؑ

کسی کا شک جب آیا بحث میں جی چھوٹ جائیں گے
خدارا بحث میں لاؤ نہ ایمانِ ابوطالبؑ

عقیدت ہے مجھے اے نجم پورے خانوادے سے
خدا کا شکر ہے میں ہوں ثنا خوانِ ابو طالبؑ

○

منقبت

تیرھویں رجب کی رات

دیدنی تھی وقت کی صورت گری کل رات کو
جاوداں سی ہوگئی تھی زندگی کل رات کو

ہوگیا برہم سکونِ جلوہ زارِ حُسن بھی
عشق کی قسمت سے وہ محفل جمی کل رات کو

رند و زاہد متحد شیخ و برہمن متفق
اللہ اللہ زورِ سلح و آشتی کل رات کو

آدمی تھے یا فرشتوں کے مقدس بھیس میں
یا فرشتے بن گئے تھے آدمی کل رات کو

محتسب کی چیرہ دستی رہ گئی منہ دیکھ کر
رندِ کوثر نوش نے آنکھوں سے پی کل رات کو

زاہدانِ خشک تھے ہاتھوں پہ دل رکھے ہوئے
بن گئی تھی حور شیشہ کی پری کل رات کو

پتھروں کے سخت سینوں سے اگلوائے ہیں دل
کیا مکمل تھا نظامِ دلبری کل رات کو

ہر پرستارِ محبت بندۂ آزاد تھا
بندگی سے دور تھی بیچارگی کل رات کو

ہوش والے زندگی کی چاندنی سمجھیں گے کیا
زندگی میں ہوگئی تھی چاندنی کل رات کو

اک تجلّی کی تمنا اک تمنا کا غرور
کون جانے بیخودی تھی یا خودی کل رات کو

ہر تلفظ میں ترنم ہر سخن میں شعریت
ہر دہن میں تھی زبانِ شاعری کل رات کو

جمع تھے قاآنی و عرفی ظہیر و انوری
حافظ و سعدی نظامی فرخی کل رات کو

وہ مرا ہر شعر موجِ کوثر و کوثر نژاد
میں نے خود بانٹے ہیں جامِ کوثری کل رات کو

سر پہ کج تھا تاجِ مدحت اور مرے قدموں میں تھی
طالبِ عزت کلاہِ خسروی کل رات کو

مجھ کو تھا حکمِ طلب یا کان بجتے تھے مرے
جیسے کعبہ نے مجھے آواز دی کل رات کو

اے تعالیٰ اللہ شانِ ابتلائے انتظار
اک وصی کا منتظر تھا اک نبی کل رات کو

ایک ہنگامہ فضائے عالمِ اجسام میں
عالمِ ارواح کی لشکر کشی کل رات کو

لڑکھڑاتے گر پڑے سجدے میں اصنامِ حرم
کھینچ لی کس نے بساطِ کافری کل رات کو

طینت فاضل کی رگ رگ میں خلوصِ مالکی
ذرّہ ذرّہ میں نیازِ قنبری کل رات کو

ہل اتی کی شان نے دیکھا سنور کر آئینہ
لافتی کی روح نے انگڑائی لی کل رات کو

حکمِ بلغ عالمِ اسرار میں بے چین تھا
بات پردہ ہی میں شاید رہ گئی کل رات کو

صبح دم وہ ناصرِ دینِ خدا آہی گیا
گونج اٹھی تھی صدائے یاعلی کل رات کو

○

منقبت

نغمۂ مستانہ

آج گھٹا کیا جھوم کے اٹھی　　کعبہ کا پردہ چوم کے اٹھی
مے جھومی پیمانہ جھوما　　سارا ہی میخانہ جھوما
ہر میکش آفاقی جھوما　　محفل جھومی ساقی جھوما
بربط جھومے مطرب جھومے　　فرد گنہ کے کاتب جھومے
مست آنکھوں کے آہو جھومے　　شانے جھومے گیسو جھومے
شب کے راگ سہانے جھومے　　شعلوں میں پروانے جھومے
ساری بلندی پستی جھومی　　ذرّہ ذرّہ ہستی جھومی
چرخِ بریں کے تارے جھومے　　جنت کے شہ پارے جھومے
مذہب کے دیوانے جھومے　　تسبیحوں میں دانے جھومے
درد کی منزل والے جھومے　　دل جھومے دل والے جھومے
رحمتِ حق کا بادل جھوما　　عرش پہ عقلِ اوّل جھوما
آج گھٹا کس شان سے اٹھی　　کس دل کس ارمان سے اٹھی
اٹھی اور فضا میں پھیلی　　خوب آغوشِ صبا میں پھیلی
دشت میں پہنچی کوہ میں پہنچی　　خلوت میں انبوہ میں پہنچی
خندق کے میدان کو تاکا　　خیبر کے سامان کو تاکا
بدر و احد کا نقشہ سمجھا　　دم بھر دیکھا بھالا سمجھا
دل میں دل کی تمنا مچلی　　منزلِ خم پر کیا کیا مچلی
غارِ حرا کا گوشہ دیکھا　　نورِ خدا کو تنہا دیکھا
دنیا سے منہ موڑ کے ٹھہری　　دستِ ادب کو جوڑ کے ٹھہری

لگائے پھرتے ہیں قرآن کو جو سینوں سے
وہ کاش صرف مودّت کے نکتہ داں ہوتے

ادب نواز نہ ہوتا جو بابِ علم نبیؐ
یہ زور و شور زبان و بیاں کہاں ہوتے

صحیح پڑھتا نہ قرآں کی آیتیں کوئی
جو علمِ نحو میں مولاؑ نہ دُرفشاں ہوتے

علیؑ کی مدح میں چپ رہ گیا پہنچ کے وہاں
جہاں مجھے مرے الفاظ بھی گراں ہوتے

خدا سے ربط نہ ہوتا بغیر عترت کے
اگر ہزار بھی قرآن درمیاں ہوتے

جگہ فرزوقؔ و دعبلؔ کی حجمؔ کو ملتی
قریبِ طائرِ سدرہ کچھ آشیاں ہوتے

○

منقبت

تیری خاطر نذر لایا ہوں ولائے بوترابؑ
اے خدائے عشق برحق اے خدائے بوترابؑ

اے اسیرِ آب و گل نا آشنائے بوترابؑ
خاک ہے اس زندگی پر بے ولائے بوترابؑ

سجدہ گاہِ حُسن روئے حق نمائے بوترابؑ
بوسہ گاہِ عشق دامانِ قبائے بوترابؑ

ذرۂ ناچیز ہوں ذرّوں میں گھل مل جاؤں گا
ہے کہیں میری جگہ اے خاک پائے بوترابؑ

صف شکن مشکل کشا اہلِ قلم معمارِ قوم
اللہ اللہ بازوئے زور آزمائے بوترابؑ

ان کا جلوہ کبریائی میری نظریں مضمحل
دیکھتا کیا نزع کی مشکل میں آئے بوترابؑ

عام منبر سے جدا ہے میثمی منبر کی شان
دار پر ہوتی ہے تفسیرِ ولائے بوترابؑ

راہ میں آہی گیا ورنہ حقیقت کچھ نہیں
کیا در خیبر پہ قوت آزمائے بوترابؑ

یہ شبابِ شعر و نغمہ یہ صدائے لافتیٰ
مرحبا اے عندلیبِ خوش نوائے بوترابؑ

اس کے دروازے کی چوکھٹ تک رسائی ہے تری
آ قدم لے لوں میں تیرے اے گدائے بوترابؑ

وہ زباں دانِ محبت ہے خدا کے فضل سے
حجمؔ کا ورثہ ہے اندازِ ثنائے بوترابؑ

○

منقبت

جب سے درِ علیؑ پر فخرِ گدا گری ہے
پیشی میں دست بستہ دنیا کھڑی ہوئی ہے

خلقِ محمدیؐ ہے شمشیرِ حیدریؑ ہے
آباد یہ گھرانا کس چیز کی کمی ہے

اب نزع کی ہے ساعت اور لب پہ یا علیؑ ہے
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ حرفِ آخری ہے

مولاؑ کو جانتے ہیں پہچانتے نہیں ہیں
آنکھوں کا دوش کیا ہے ذہنوں کی مفلسی ہے

اب خاک مل گئی ہے خاکِ درِ نجف میں
وہ بندگی تھی اور یہ مفہوم بندگی ہے

خاموش تھا میں اب تک اب چیخ اٹھوں گا یارب
سب کچھ میں کھو چکا ہوں نسبت بچی ہوئی ہے

توحید کی ہے محفل بدنام فرقہ بندی
قرآں کی سورتوں میں اخلاص کی کمی ہے

بادہ وہی غدیری نشہ وہی فقیری
ہم رند ہی نہ بدلے دنیا بدل رہی ہے

میخانۂ نجف سے جنت میں بھیجتے ہیں
کیوں اے مئے تولا میری جزا یہی ہے

دیوانہ ہوں علیؑ کا اب مجھ سے کچھ نہ پوچھو
اب عشق میں اضافہ اور عقل میں کمی ہے

دامن سے منسلک ہیں جذب و سلوک دونوں
تکیہ ہے خاک پر یا مسند بچھی ہوئی ہے

آئے فرشتے اس کے در پر سوال کرنے
انسانیت نے اس کے گھر میں پناہ لی ہے

سلجھے گی یہ کسی دن پوچھو لسانِ حق سے
اب تک صدائے کُن کی گتھی پڑی ہوئی ہے

میں نے درِ نجف پر سر رکھ دیا ہے اپنا
دنیا گناہ سمجھے نیت ثواب کی ہے

میخانہ نجف سے جنت میں پہنچتے ہیں
کیا جرم ہے محبت جس کی سزا ملی ہے

○

منقبت

اس ذات کی مدحت میں رواں میرا قلم ہے
پہلا بھی اور آخر بھی جو مولودِ حرم ہے

دنیا میں وہ پیرایۂ تکمیلِ رسالت
رحمت کے تسلسل کی وہ تاریخِ جلالت

انداز سرِ شام سے بدلا ہوا شب کا
سر سجدہ میں رکھے ہوئے وہ چاند رجب کا

صورت گرِ آئین خوش انجام کی آمد
اصنام کے نرغہ میں وہ اسلام کی آمد

کعبہ کی طرف دل کے تقاضوں کا اشارا
جذباتِ مودت کا وہ بڑھتا ہوا دھارا

توفیقِ خدا داد سے باندھے ہوئے رشتے
دربار یداللہ کا پہرے پہ فرشتے

ماحول کی تسکین کو فطرت کے دلاسے
کہسار لرزتے ہوئے آمد کی فضا سے

اُترا ہوا ہر اک بتِ طناز کا چہرہ
بگڑا ہوا مستقبلِ بت ساز کا چہرہ

تیرہ وہ رجب کی وہ محبت کا سندیسہ
خدمت میں رسالت کی امامت کا سندیسہ

محفوظ رہا نام بھی وہ حق کا ولی ہے
اس سلسلہ نور کا پہلا یہ علی ہے

کونین سمٹ آئیں نہ کیوں راہ گزر میں
یہ پہلی ہی تقریب ہے اللہ کے گھر میں

احساس معطل ہے یہاں ہوش و خرد کا
اللہ زچہ خانہ ہے یہ بتِ اسد کا

کس شان کا انسان ہے کس شان کی خاطر
بنوایا تھا گھر اپنا اس انسان کی خاطر

آئینہ در آئینہ ہے فطرت کا محافظ
انسان ہے انسان کی عظمت کا محافظ

○

منقبت

مسکراتے ہیں نبیؐ کعبہ کا حاصل دیکھ کر
صورت و سیرت میں خود اپنا مقابل دیکھ کر

عشق نے سر رکھ دیا قدموں پہ منزل دیکھ کر
حسن نے دل دے دیا انسان کامل دیکھ کر

دینِ حق نے سانس لی دنیا میں آزادی کے ساتھ
کافری نے کروٹیں لیں اپنا قاتل دیکھ کر

اک نبیؐ تھا اک ولی تھا حق کی قرباں گاہ پر
مسکرایا دیر تک بسمل کو بسمل دیکھ کر

کرگیا تطہیر کعبہ حُسنِ مولودِ حرم
ذرّہ ذرّہ کو خرابِ نقشِ باطل دیکھ کر

یا علیؑ تھے یا محمدؐ چودھویں معصوم تک
ہر خالق تھم گیا تحصیلِ حاصل دیکھ کر

قصر لرزے بت گرے سینوں میں دل تھرا گئے
ایک ٹھوکر ماردی دنیا کو غافل دیکھ کر

چل پڑا اس کے اشارے پر سفینہ شکر کا
درد کا بے تھاہ دریا غم کا ساحل دیکھ کر

ایک دل والے نے اپنا دل بھی شامل کردیا
ایک دل کو ساری دنیا کے مقابل دیکھ کر

مشتری ہے خود ازل سے خالقِ جن و بشر
ان کی چاہت دی بشر کو بھی مگر دل دیکھ کر

دستِ ہمت پر تصدق ہوگئیں آسانیاں
حلِ مشکل دیکھ کر حالِ مشکل دیکھ کر

خم کا وہ منبر وہ چاند آگے وہ پیچھے آفتاب
محوِ حیرت ہوگئی محفل کی محفل دیکھ کر

سر جو چوکھٹ پر نجف کی رکھ دیا نیند آگئی
پاؤں پھیلائے تولاؔ نے بھی منزل دیکھ کر

مشکلیں دنیا کی اور مشکل کشا سے التماس
چھانٹ لی ہر ایک مشکل اس کے قابل دیکھ کر

○

منقبت

اے صلِ علیٰ جلوۂ جانانہ علیؑ کا
قرآن ہی قرآن ہے افسانہ علیؑ کا

دشمن ہوں کہ ہوں دوست دعا دیتا ہوں سب کو
اللہ بنا دے تمہیں دیوانہ علیؑ کا

جبرئیلؑ حضوری میں ہیں میں دور ہوں لیکن
میں بھی ہوں تڑپتا ہوا پروانہ علیؑ کا

ممنون ہے امداد کا ہر ایک پیمبرؑ
مذکور ہے افسانہ در افسانہ علیؑ کا

کہتی ہے جسے فکر و نظر نہجِ بلاغہ
رندوں کی زباں میں ہے وہ میخانہ علیؑ کا

کعبہ میں ولادت ہوئی مسجد میں شہادت
اللہ کا گھر بن گیا کاشانہ علیؑ کا

حق یہ ہے کہ سرکارِ نبوت کے سوا نجمؔ
معیارِ فضیلت کوئی سمجھا نہ علیؑ کا

○

منقبت

فراریوں سے ہے غفلت نہ زخمیوں سے غرض
کسی کو بھی کبھی دیکھا نہیں ونا کرتے

نہ ہوتا راہ نما گر علیؑ کا علم و عمل
کبھی نہ ذہن تقاضائے ارتقا کرتے

خدا نے خود شبِ ہجرت علیؑ پہ ناز کیا
ملک نہ حشر تک اندازۂ وفا کرتے

جو لوگ کرتے ہیں بلغ کی اور کچھ تفسیر
وہ حق سمجھتے تو قرآں سے بھی گلا کرتے

مخالفوں کو یہ توفیق ہی ہوئی نہ کبھی
زباں کو حرفِ مودت سے آشنا کرتے

زہے مراتب و اعزاز اہلِ بیتِ نبیؐ
یہ جیسی چاہتے تشکیل ماسوا کرتے

مباہلہ سے وہ باز آگئے بہ خیر سبھی
محال تھا کہ نصارا مقابلا کرتے

کہاں وہ خاک کے پتلے کہاں یہ نورِ خدا
نہ بچتا ایک مسیحی جو بددعا کرتے

○

قصیدہ

حسن کی ہے جلوہ گاہ عشق میں ہوں نعرہ زن
ہیں مرے صوم و صلوٰۃ ذکرِ حسینؑ و حسنؑ

زہدِ شب زندہ دار دیکھ مری زندگی
ہے اسی تسبیح میں رازِ زمین وزمن

تجھ کو خبر بھی نہیں کب سے ہے بچھی ہوئی
تیرے مصلّے کے پاس میری بساطِ سخن

زہدِ ریائی ہے اور نغمہ سرائی ہے اور
وہ ہے تری خستگی یہ ہے مرا بانکپن

میرے تخیّل میں ہے مدح کی وہ چاندنی
بستر راحت کوئی جیسے کنارِ لبن

نازِ تولا کہاں زعمِ مصلا کہاں
میں ہوں سخن برزباں تو ہے سخن در دہن

عرش سے لانے کو ہوں فرش پہ کچھ آیتیں
سجدہ گہہ فکر میں ہے مرا ذوقِ سخن

نغمۂ جبرئیلؑ ہے مطلعِ تازہ میرا
شاملِ تسبیح کر حاصلِ مُلکِ سخن

منزلِ مقصد میں ہیں ایک حسینؑ و حسنؑ
ایک شہیدِ عراق ایک شہیدِ وطن

شرحِ جمیل و جمال معنیٔ حُسن و حسنؑ
بانیِ اسلام کے یوسفِ گلپیرہن

پہلا مرقّع ہے تو مقصدِ کونین کا
شکل بھی تیری حَسیں نام بھی ترا حسنؑ

کس کی یہ طاقت کہ ہو تجھ پہ کوئی حرف زن
صلح حدیبیہ کا صلح میں تری چلن

وزن میں کچھ کم نہیں تیرا جہادِ خموش
دل میں رہی عمر بھر کرب و بلا موج زن

تختِ حکومت پہ ہو ننگِ حکومت کوئی
تختِ امامت پہ ہے تو ہی امامِ زمن

مصحفِ عصمت کی کود نازِ رسالت کا دوش
طورِ تجلا نثار تو ہے وہ جلوہ فگن

عافیتِ ہل اَتا تیری غذائے لطیف
آیۂ تطہیر کی شان ترا پیرہن

تیری نگاہوں کا نور جلوۂ خلقِ عظیم
جذبۂ دل کا وفور ہمّتِ خیبر شکن

صبر کی مظہر ہوئی فرض شناسی تری
آمرِ فکر و نظر عارفِ سِر و علن

عیش فدا غم فدا ہستی آدم فدا
جانِ دو عالم فدا جانِ رسولؐ زمن

خوانِ کرم کا ترے ہے وہ اک ادنیٰ فقیر
جس سے اسیرانِ دہر پست ہیں بے ریب وظن

دیکھ کے اہناءنا ست ہے نبضِ سخن
مصحفِ معبود پر کوئی نہیں طعنہ زن

کون ترے حلم کا اہل تھا اس دور میں
عہد شکن تھا کوئی کوئی تھا بیعت شکن

صلح پہ بھی معترض جنگ پہ بھی معترض
حیف وہ قلب و دماغ حیف وہ کام و دہن

تیری شجاعت میں شک جس کو ہو بزدل ہے خود
فاتحِ اعظم ہے تو اے دلِ خیبر شکن

دست و بغل ہے تو ہیں جادۂ شمشیر سے
صبر کی منزل کڑی ضبط کا رستہ کٹھن

سامنے ہے کربلا دیکھ لیں اہلِ نظر
معرکہ عاشور کا غزوۂ جانِ حسنؑ

معجزۂ نفس تھا تیرا قرار و قیام
شامِ غریباں بنی جب تیری صبحِ وطن

○

منقبت

پائی تھی نہ قرآں نے ابھی صورتِ فرماں
بے چین تھا ادھ بیچ میں تطہیر کا اعلاں

پردے میں تھا پر واقفِ اسرار تھا ہر لفظ
ہر لمحہ پہ بول اٹھنے کو تیار تھا ہر لفظ

حرفوں کو مسرت کہ میں لفظوں سے مشرف
آیت کی صدا تھی کہ ہوں تاج سرِ مصحف

وقت آیا کہ جبرئیلؑ بھی پھولوں نہ سمائے
قرآن پہ تطہیر کی چادر لیے آئے

دو سطریں یہ آیت کی تھیں ایماں کا خلاصہ
قرآں تھا رحل اور یہ قرآں کا خلاصہ

جس کے لیے مخصوص تھا یہ فخر یہ اعزاز
تاریخ ہوئی اس کی ولادت سے سرفراز

وہ شکر بہ لب عالمِ اسلام کی تاریخ
اسلام پہ اللہ کے انعام کی تاریخ

تاجِ سرِ تقویم وہ تقدیس کی ساعت
شہزادیٔ کونین کا ہنگامِ ولادت

لرزاں وہ فضا میں سحرِ نور کا آنچل
پھیلا ہوا جنت کی کسی حور کا آنچل

وہ کیف کا عالم نہ اُجالا نہ اندھیرا
دنیا میں وہ اسلامِ حقیقی کا سویرا

وہ اک خمِ تعظیم دو عالم کی نظر میں
پہلی وہ خوشی بانیٔ اسلام کے گھر میں

دنیا میں ظہورِ شرفِ مریم وسارہؑ
تقدیرِ امامت کی نبوت کا سہارا

شاعر کی زباں منزلِ افسانۂ رحمت
محفل میں چھلکتا ہوا پیمانۂ رحمت

وہ گردشِ ساغر میں شریعت کی روانی
میخانے میں کوثر کا برستا ہوا پانی

فردوس بکف گلشنِ شاداب تولا
صلوٰۃ کا غُل نشۂ اربابِ تولا

اک اک شجرِ رونقِ صد وادیٔ ایمن
خوشبو سے مہکتا ہوا پھولوں کا نشیمن

بلبل کی زباں پر وہ قصیدہ کا ترنم
جاگی ہوئی کلیوں کا متانت سے تبسم

ہر بات میں پاسِ ادب وحفظِ مراتب
مدحت کی تلاوت میں وہ آوازِ مناسب

انسان سے کیا اس کے مراتب کا بیاں ہو
اے صلِ علیٰ گیارہ اماموں کی جو ماں ہو

خدمت کے لیے آئے ہوئے روحِ امیں تک
بیٹھی ہوئی اک ڈاک فرشتوں کی زمیں تک

ہیبت سے جگہ چھوڑ کے ہٹتا ہوا باطل
بڑھتا ہوا حق اور سمٹتا ہوا باطل

احسان ہے اس گوہرِ پاکیزہ صدف کا
پروردہ ہے اسلام اسی بیتِ شرف کا

آئینۂ کردار میں تنویرِ پیمبرؐ
ہر شان ہر عنوان سے تصویرِ پیمبرؐ

کیا طبقۂ نسواں کی ہدایت کا ہے ساماں
ہاتھ آسیا گرداں میں زباں تاریِ قرآں

کونین ہیں زہراؑ کے اس اعزاز پہ ششدر
حسنینؑ کی فردوس ہے اک گوشۂ چادر

موجود پیمبرؐ بھی ہیں اور اس پہ یہ رفعت
تطہیر کی محفل میں ملی اس کو صدارت

اسلام کی تنظیم ابھی تک تھی ادھوری
کاشانۂ زہراؑ میں یہ دولت ہوئی پوری

ہے اس کی ولا خُلد میں جانے کا ذریعہ
ہم کیا ہیں پیمبرؐ بھی تمام اس کے ہیں شیعہ

منصب نہ سہی پھر بھی کیا کارِ نبوت
بچوں میں بھی اس گھر کے ہیں آثارِ نبوت

جاری ہیں ہر اک دور میں قدرت کے فرامین
سب اس کی کنیزی میں ہیں عالم کی خواتین

نسواں میں ہے تبلیغ کے دستور کی خالق
خود نور ہے اور سلسلۂ نور کی خالق

مالک ہے وہ کونین کی کچھ اس میں ہے شک بھی
ہمت ہے تو چھینے کوئی جنت کا فدک بھی

دربار خلافت کا تھا ہیچ اس کی نظر میں
حق اپنا جتایا بھی تو اللہ کے گھر میں

آواز بھی اس کی نہ گئی گوشِ جہاں میں
خطبہ دیا پیغمبرؐ آخر کی زباں میں

لہجے کی وہ تمکین وہ تقریر کے تیور
اٹھی در و دیوار دماغوں کے ہلاکر

دامن پہ حکومت کے رہا داغ فدک کا
تاحشر ہے اب شعلہ بدل باغ فدک کا

اُمت ترے صدقے گلِ ریحانِ پیمبرؐ
تو محسنِ اسلام ہے اے جانِ پیمبرؐ

فطرت ہمہ تن کوش ہے ہاں اور نہیں پر
تو چاہے تو فردوس اُتر آئے زمیں پر

تخلیق کے منشور کی اے آیتِ محکم
صدقے میں ترے خلق ہوئے ہیں یہ دو عالم

قرباں ترے شہزادوں پہ جنت کے چمن ہیں
تیرے گُلِ مقصود حسینؑ اور حسنؑ ہیں

عزت میں پیمبرؐ کا الم ہوگیا تازہ
جس شب کو مدینہ میں اٹھا ترا جنازہ

○

منقبت

میرا مطلع ہے طلوعِ آفتابِ معرفت
حُسن کی تنویر ہے اور عشق کی تفسیر ہے

کیا عجب ہے حُسن کی شہرت جو عالم گیر ہے
یہ خدائے حُسن کے محبوب کی تصویر ہے

شہریارِ سلح کا مسلک گریباں گیر ہے
آج کس کس ذہنیت میں امن کی تدبیر ہے

آیۂ تطہیر میں شامل ہے اس کا ذکر کیا
میرا شہزادہ سراپا آیۂ تطہیر ہے

بانیِ اسلام بوسے اس زباں کے کیوں نہ لے
جس زباں سے اعتبارِ نعرۂ تکبیر ہے

معتبر ہے اس کے جلوے سے کتابِ کائنات
ہر ورق پر حُسن کی اک منفرد تصویر ہے

کل علیؑ تھے آج ہیں دوشِ پیمبرؐ پر حسنؑ
اب حسینؑ آنے کو ہیں کچھ دن ہی کی تاخیر ہے

اے مسلماں منزلت اس خانوادہ کی نہ پوچھ
اللہ اللہ دوشِ فخرِ انبیاؐ جاگیر ہے

آج بھی اس کے گھرانے کی شجاعت کے طفیل
اس نئی دنیا میں ذکرِ جوہرِ شمشیر ہے

اس کے صدقے میں ملا ہے منصبِ انسانیت
اس کا احساں گردنِ انساں میں اک زنجیر ہے

روحِ آزادی فدا اس پائے در زنجیر پر
اس کی الفت جس کسی کے پاؤں کی زنجیر ہے

جس زباں کا روزمرّہ بھی ہے قرآں کی مثال
اُس زباں کو ان لبوں سے نسبتِ تقریر ہے

دل جگر کے اس نے ٹکڑے رکھ دئے بنیاد میں
کیا یونہیں کامل خدا کے دین کی تعمیر ہے

اس خوشی کے دور میں ذکرِ مصائب کیا کروں
منقبت ہے یا صدائے نالۂ شب گیر ہے

عظمت اس معصوم کی انساں سمجھ سکتا نہیں
کیا خبر انسانیت کو کیا حدِ تطہیر ہے

وہ اگر چاہے بدل سکتا ہے تقدیری نظام
اس کی انگلی رہنمائے خامۂ تقدیر ہے

اس خلافت کی حقیقت کیا ہے اس کے سامنے
جب امامت اور رسالت اس کی اک جاگیر ہے

اس کی سلح برمحل کا بھی ہے آوازہ وہاں
جس جگہ آوازۂ تہلیل ہے تکبیر ہے

اہل ایسی منزلت کا ہرکس و ناکس نہیں
عشق ہے محدود اس کا حسن عالم گیر ہے

اس کے نامِ پاک کی تاثیر کا کیا پوچھنا
جس کے مداحوں کے ایک اک لفظ میں تاثیر ہے

جینے والو ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہ دو
کوئی اس پر جان دینے کی اگر تدبیر ہے

فضلِ خالق سے مرے افکار میں اشعار میں
فلسفہ ہے تجمّ غالبؔ کا زبانِ میرؔ ہے

○

منقبت

اسلام کی تاریخ کا وہ عہد یگانہ
دنیا میں وہ قرآن اُترنے کا زمانہ

مرکز سے وہ الطاف و عنایات کی بارش
وہ بانیٔ اسلام پہ آیات کی بارش

مخمور عبادت سے فضا شام و سحر کی
دن تشنگیٔ صوم کا شب دیدۂ تر کا

ڈوبا ہوا نصفِ رمضاں نور کی رَو میں
خیرو برکت ماہِ دو ہفتہ کے جلو میں

لہروں پہ لیے چاند کو گردوں کا سمندر
پھولا ہوا جس طرح کنول تال کے اندر

آنکھیں کبھی کھولے کبھی موندے ہوئے تارے
سب وقت کی مایا نہ ہمارے نہ تمہارے

تسبیح میں تہلیل میں گم بوذر و سلماں
بھولے ہوئے اپنے کو ریاضت میں مسلماں

آیاتِ الٰہی سے بھری قلب کی جھولی
آواز پیمبرؐ کی اور اللہ کی بولی

الفاظ کے پیکر میں وہ معنی کی تجلی
فرمان کا فرمان تسلی کی تسلی

تخئیل سے آگے کبھی انسان کی منزل
ہر گام پہ ہر سانس پہ قرآن کی منزل

ابجد کو شرف ناز لسانِ عربی کو
تسلیم سماعت کی زبانِ عربی کو

لہجہ میں مٹھاس اور زبانوں میں لطافت
رگ رگ میں سمائی ہوئی روزوں کی حرارت

پگھلی ہوئی شمعوں کی طرح قلب میں نرمی
روزوں کی حرارت میں عرب دیس کی گرمی

دنیا میں وہ اک طفلِ حق آگاہ کی آمد
وہ سلح کے شہزادۂ ذی جاہ کی آمد

عالم میں وہ تبلیغِ شریعت کا تسلسل
دس بیس گھرانوں پہ تولد کا توکل

وہ خلق کی تسکین مروت کا دلاسا
اللہ کے محبوب پیمبرؐ کا نواسا

جس نے دلِ ملت میں محبت کا بھرا رنگ
وہ جس کی خدا داد حکومت کا ہرا رنگ

آغوشِ پیمبرؐ میں اثر حُسن کا دونا
اسلام کی قربانیِ اعظم کا نمونا

اللہ نے قرآں کی طرح نام اُتارا
اللہ کے بندوں نے حسنؑ کہہ کے پکارا

اللہ نے چاہا جسے اس نام کے صدقے
جس کام کو پیدا ہوئے اس کام کے صدقے

تصویرِ جواں مردیِ تسلیم و رضا کی
پہلی وہ کڑی سلسلۂ کرب و بلا کی

آنگن میں جو مسجد کے نہ تھا کھیلنے والا
قدرت نے بنایا انہیں اس گھر کا اُجالا

ملت کی شبِ تار جوانی پہ جب آئی
اسلام کی تاریخ میں وہ شمع جلائی

تقلید محمدؐ تھی جو تائید علیؑ تھی
جو دستِ رسالتؐ سے حدیبیہ میں جلی تھی

○

منقبت

مرا دل فدائے امامِ حسنؑ ہے
زباں ہے مری اور نامِ حسنؑ ہے

جو والفجر چہرہ ہے واللیل گیسو
یہ صبحِ حسنؑ ہے وہ شامِ حسنؑ ہے

وہ دوشِ پیمبرؐ پہ جلوہ فگن ہیں
خبر کس کو تھی یہ مقامِ حسنؑ ہے

حسینؑ و حسنؑ کی محبت میں گزرے
یہی زندگی کا نظامِ حسن ہے

مری جنگ یا صلح کچھ ہو کسی سے
بنامِ حسینؑ اور بنامِ حسنؑ ہے

بہت کچھ سنے گا بہت کچھ سہے گا
کہ نجمِ سخنور غلامِ حسنؑ ہے

○

منقبت

صورت ہے ایک حُسن کہو یا حسنؑ کہو
کیوں جان ایسے نام پہ رکھ دوں نہ وار کے

خالی ہیں جام نشہ نہ گھٹ جائے میکشو
طاقِ ولا سے لاؤ صراحی اتار کے

آفاق میں علیؑ کا ولی عہد آگیا
لو آج دن بھی پھر گئے لیل و نہار کے

رحمت کی ہے یہ شان کسی کو خبر نہ تھی
سب منتظر تھے رحمتِ پروردگار کے

اک دن یہ ہوں گے دوشِ پیمبرؐ پہ جلوہ گر
کیوں لائے کوئی عرش سے کرسی اتار کے

بڑھ جائے گی کچھ اور بھی کعبہ کی آب و تاب
آئیں گے جب قبائے امامت سنوار کے

کیا انتظار ہوگا نہ ماں باپ کو مگر
یادِ خدا میں کٹ گئے دن انتظار کے

○

خالقِ نجات

پردہ تھا اک ازل کا زمیں تھی نہ آسماں
پردہ کا لفظ بھی رخِ معنی پہ ہے گراں

جنبش نہ اضطراب نہ لرزش نہ احتجاج
جیسے ہو کوئی قاہر و جابر نگاہ باں

کیونکر کہوں کہ معنیٔ بے لفظ تھے محیط
اب آئے ہیں یہ لفظ و معانی کشاں کشاں

شاعر اگر غبار کی دنیا کہے اسے
عارف کے سوزِ قلب سے اٹھنے لگے دھواں

اس سے بلند جا نہ سکی فکر آب و گل
کچھ ہے ضرور جس سے یہ سب کچھ ہوا عیاں

کب قدرتِ نگاہ ہوئی خلق کیا کہیں
نادیدنی جو تھا وہی دیکھا نہیں سماں

یہ ذوقِ حسن کاری و تخلیق دیکھنا
واجب ہو جس کے ذہن میں ممکن نہ ہو جہاں

اک نور کی لکیر سے پیدا ہوئی حیات
ظلمت کو کیا شعور کہ یہ نور تھا کہاں

دو ہستیاں نگاہ میں آئیں بلند و پست
اک اضطراب میں سوئے پستی رواں دواں

جو افتتاح جادۂ پیغمبری کرے
اس ہستی بلند کی اللہ رے عزو شاں

خورشید آگے آگے دکھاتا ہوا چراغ
پیچھے قمر بھرے ہوئے تاروں سے جھولیاں

سجدوں کا جیبِ فخر میں رکھے ہوئے خراج
اونچی جبیں پہ تاج خلافت کا ضوفشاں

یہ شان اور دانۂ گندم کا دل پہ داغ
یہ روحِ کائنات یہ احساسِ جانستاں

سوئے زمیں چلے جو مسافر بہشت کے
آواز دی فلک نے مودت نگاہباں

منظر ہوا نگاہ میں تبدیل یک بیک
طوفاں تھا اک عذاب کا قرآن درمیاں

پستی میں عجز تھا نہ بلندی میں افتخار
ہمدوش ہوگئے تھے زمیں اور آسماں

دوزخ سوادِ آب کے چھینٹوں سے مضطرب
خورشید کی زبان پہ تسبیح الاماں

کیا دیدنی تھا ایک سفینہ کا حوصلہ
موجوں کی جس نے توڑ کے رکھ دیں کلائیاں

حیرت سے دیکھتے تھے ستارے جھکے ہوئے
لہروں کی حرب وضرب میں کشتی کا آشیاں

سرکش وہ اک حباب وہ اک ڈوبتا شباب
وہ میرِ کاروانِ بغاوت کہ الاماں

کشتی سے ناخدا کی وہ حسرت بھری نظر
وہ ہر نظر تعلقِ خاطر کی داستاں

وہ احتجاج بارگہِ بے نیاز میں
دو ٹوک وہ جواب وہ احساس امتحاں

طوفاں ہوا جو سرد تو اک طفلِ مہ جبیں
ذرّات کے ہجوم میں تھا حمد بر زباں

چلتی ہوئی زبان پہ توحید کا سبق
باندھے ہوئے کھلونوں کی مانگوں میں رسّیاں

آتش عقب میں پھول اگلتی ہوئی مگر
پھولوں پہ آب ورنگ تھا شعلے تھے نیم جاں

اک اک قدم جوانی و پیری کا انقلاب
ہر لمحہ آزمایش و ہر لحظہ امتحاں

اپنے گلے پہ آپ ہی رکھے ہوئے چھری
اپنی ہی جان آپ ہی قسمت سے جانستاں

وہ یک بیک نوازشِ ذبحِ عظیم سے
اک بے بساط خنجر و گردن کے درمیاں

اس حیرتِ نظر سے جو رخصت ہوئی نظر
زور آزما تھا راہ میں اک حُسن بے اماں

مفہومِ حق روی سے جذباتِ راستی سے
بیگانہ ہو چلی تھی انساں کے دل کی دھڑکن

وہ لے گیا بچا کر اک پورے کارواں کو
ہر موڑ پر تھے کتنے فکر و نظر کے رہزن

کیا بیر ہے نہ جانے دنیا کو اس کے گھر سے
کچھ سلح کے مخالف کچھ جنگ سے ہیں بدظن

نظریں اٹھائیں کیونکر تاریک دور والے
اسوہ حسین کا ہے مانند روزِ روشن

ہر عہد میں غم اس کا تائید اہلِ حق ہے
باطل سے جنگ ہے یہ فریاد ہے نہ شیون

جو اس کا ہے مخالف محمود ہے نہ احمد
فطرت نہیں چھپاتا ناموں کا رنگ روغن

حق کے غلام بھی ہیں حق سے مخالفت بھی
رہبر کا بھیس بدلے ملتے ہیں کتنے رہزن

ایماں فروشیوں کی بھڑکی ہے آگ جب سے
ابنِ کثیر جیسے بنتے رہے ہیں ایندھن

ہوجاتی ہے یہ بدعت جب دل جلا ہوا ہو
مدح حبیب میں بھی آتا ہے ذکر دشمن

اس کی ولا کا صدقہ دو مشغلے ہیں میرے
یا مدح کا ترانا یا آنسوؤں کی سمرن

عشق حسین میں ہے اے عجم اب یہ منزل
مدت سے آرزو ہے دل کی بوجہ احسن

روحی فداک کہہ کر پھر کچھ نہ کہہ سکوں میں
جب موت آکے توڑے اس زندگی کے بندھن

سولی پہ بھی قصیدہ ساقی ہی کا سنایا
تیغِ زباں سے اپنی کٹ کٹ گئے ہیں دشمن

میخانہ ولا کو ہونے دیا نہ ویراں
محفل میں روشنی کی دل کا جلا کے روغن

ساقی کے گھر ولادت ہے آیۂ مسرت
ممکن ہے غرق مئے ہوں میخوار تا بہ گردن

ساقی بھی آج شاید کر جائے چشم پوشی
رندوں کے شور و غل پر منظور ہو نہ قدغن

○

منقبت

صبر کی شمشیر والے درود و غم کے تاجدار
ہے تری تلوار میں بھی کاٹ مثلِ ذوالفقار

تیری ماں وہ ذی شرف ہے نواسوں کی ہے ماں
اے عرب کے شاہزادے اے عجم کے شہریار

قید خانے میں تجلّی چہرہ پُرنور کی
حریت کی شان سے روشن جہانِ تنگ و تار

بعد تیرے سات اماموں نے کیا زنداں پسند
دین و دنیا میں میسر کس کو ایسے ورثہ دار

ایک ہی دن کے لیے تھی جنگِ عاشورہ مگر
آج تک جاری ہے تیری انقلابی کارزار

جھومتے جاتے ہیں جس پر آج آزاد و اسیر
اِک اشارہ تیرے نقشِ پا کا ہے وہ رہ گذار

وہ دعاؤں کا صحیفہ وہ زبورِ اہلِ دل
جس کے اک اک حرف پر صدقے بیاضِ روزگار

بے تشدد جنگ سیکھی تجھ سے اہلِ ہوش نے
آج تیرے صبر کے جوہر ہوئے ہیں آشکار

کل حقارت سے جسے دیکھا تھا اہلِ شام نے
وہ اسیری آج ہے سرمایۂ صد افتخار

ضبط سے تیرے نمایاں اضطرابِ کائنات
بے کسی میں تیری پنہاں انقلابِ روزگار

لاکھوں بوسے تیرے زخمی پاؤں کی زنجیر پر
جس کی ہر آواز تھی تجھ کو نوائے خوش گوار

نجم اس کی نذر ہے یہ زلزلہ انگیز نظم
جس کی حسرت ناک خاموشی تھی طوفاں درکنار

○

منقبت

صادقِ آلِ محمدؐ وارثِ خیرالانام
حُسنِ مطلق کے پیمبر عشقِ برحق کے امامؑ

لو لگا کر تجھ سے روشن ہے طریقت کا چراغ
درس لے کر تجھ سے قائم ہے شریعت کا نظام

ساری دنیا خوشہ چیں ہے اے خداوندِ علوم
کس کو ہے معلوم تیرے علم و حکمت کا مقام

یہ امامت کا تسلسل ہے رسالتؐ کا فروغ
اے امامؑ ابن امامؑ ابنِ امامؑ ابن امامؑ

پانچ پشتوں سے ذخیرہ کر رہی تھی کائنات
پھر بھی تیری منزلت کی داستاں ہے نا تمام

جھک رہی ہیں گردنیں دانشورانِ خلق کی
کتنے ملکوں کتنی قوموں تک ترا پہنچا پیام

چاندنی سی کھل رہی ہے ترے ذکر و فکر کی
لے رہا ہے وقت تیرے دشمنوں سے انتقام

توحدِ فاصل ہے اک عبد واحد کے درمیاں
کلمۂ توحید سے پوچھے کوئی تیرا مقام

منحصر اس امر پر ہو اک نگاہِ لطف اگر
آج کردوں اپنی ساری خواہشوں کا قتلِ عام

اہلِ دل کو ایسی دولت سے بچائے کردگار
بےخبر ہیں منزلت سے تیری دولت کے غلام

فکر ہے مدحت میں عاجز دم بخود ہوش و خرد
منزلِ حق کے مہ کامل ستاروں کا سلام

○

منقبت

فروغِ ملّت بیضا

شریعتوں کا خلاصہ ہیں جعفرِ صادقؑ
امامِ اہلِ تولا ہیں جعفرِ صادقؑ

رسالتوں کی ہوئی شرح جن کے لفظوں سے
وہ علم و فضل کا دریا ہیں جعفرِ صادقؑ

شرافتوں کے پیمبر نجابتوں کے امین
امینِ وحی کے مولا ہیں جعفرِ صادقؑ

ارادتوں میں ہے ان کی نگاہِ لطف سے جاں
عقیدتوں کی تمنّا ہیں جعفرِ صادقؑ

لطافتیں ہوئیں جن کے وجود سے قائم
حبیبؐ حق کا سراپا ہیں جعفرِ صادقؑ

ریاضتوں کو ملا ہے انہیں کے در سے شرف
رئیسِ کشورِ تقویٰ ہیں جعفرِ صادقؑ

حقیقتوں کی مفسّر ہے جو دو عالم میں
وہی حقیقتِ کبریٰ ہیں جعفرِ صادقؑ

جلالتیں نہ ہوں کیوں ان کے در پہ سربسجود
جلالِ خالقِ یکتا ہیں جعفرِ صادقؑ

انہیں کے نقشِ قدم پر طریقتیں ہیں رواں
رہِ سلوک میں تنہا ہیں جعفرِ صادقؑ

بلندیاں انہیں جھک جھک کے کررہی ہیں سلام　　فرازِ عرش کا تارا ہیں جعفرِ صادقؑ
صداقتوں کی تجلّی ہے ان کا حُسنِ سخن　　حجابِ قدس میں گویا ہیں جعفرِ صادقؑ
تمام روشنیاں ہیں انہیں کے نور سے نجم
فروغ ملت بیضا ہیں جعفرِ صادقؑ

○

منقبت

لسانِ قدرت یکتا امامِ جعفرؑ صادق　　بحق ساکت بحق گویا امامِ جعفرؑ صادق
خدا چاہے اگر بن جائے میرا دل محبت میں　　تمہارے نام کا طغرا امامِ جعفرؑ صادق
محبت ہو تو بالاتر ہے نعماتِ دو عالم سے　　تمہارے در پہ اک سجدا امامِ جعفرؑ صادق
تمہاری اک جھلک پر اک نظر پر اک اشارے پر　　فدا دنیا و مافیہا امامِ جعفرؑ صادق
قبائے صدق بَر میں تاج ہے سر پر ولایت کا　　امامت ہے تمہیں زیبا امامِ جعفرؑ صادق
مرا دل کب سے قدموں میں پڑا ہے پاک ہونے کو　　ذرا پامال کردینا امامِ جعفرِ صادقؑ
مصایب سینکڑوں ہیں غم ہزاروں مشکلیں لاکھوں
تمہارا نجم ہے تنہا امامِ جعفرؑ صادق

○

منقبت

اے کہ تجھ کو مہد میں آیا امامت کا پیام
تجھ پہ عمرِ خضر صدقے اے مرے کمسن امام

تیری صورت پر درود اور تیری سیرت پر سلام
حُسن مطلق کے پیمبر عشقِ برحق کے امام

عہدِ طفلی پر ترے برنائی و پیری نثار
چھ برس کی عمر اس پرشش جہت کا انتظام

لے کے بیٹھی ہوگی خود روحِ نبیؐ آغوش میں
اے تعال اللہ تری مسند نشینی کا نظام

کھیل کے دن سن فریضہ قوم کی تنظیم کا
وہ لڑکپن اور وہ سنجیدگی کے صبح و شام

آٹھ پشتوں سے ذخیرہ کر رہی تھی کائنات
پھر بھی تیری منزلت کی داستاں ہے نا تمام

○

منقبت

مصدرِ کمال

خرامِ ناز میں نہاں سکونِ روز گار ہے
ضرور کوئی آئے گا زمانہ بیقرار ہے

وہ آئے گا پھر آئے گا یہ قول ہے قرار ہے
کسی کے دل کو ہو نہ ہو ہمیں تو اعتبار ہے

بزرگ جن کے عمر بھر اٹھا گئے ہیں زحمتیں
رہیں ذرا وہ چین سے یہ کس کو نا گوار ہے

کہیں کچھ اور شان سے کہیں کچھ اور نام سے
تمام کائنات کو اسی کا انتظار ہے

فراق میں بھی اس کے ہیں عجب طرح کی لذتیں
خدا کی شان دیکھنا کہ درد خوشگوار ہے

ازل میں اس کے سامنے وجودِ آب و گل ہوا
کھلی ہوئی نگاہ میں بیاضِ روزگار ہے

نگاہ روبرو ہیں سب زمین ہو کہ آسماں
شہود و غیب ہر جگہ نظر بروئے کار ہے

ہمیں نہیں ہیں سامنے نظر کا سامنا بھی ہے
ہماری ہی طرف سے کچھ یہ طولِ انتظار ہے

حجاب اُس طرف کہاں وہ نورِ کردگار ہے
اِدھر ہی چشمِ شوق پر یہ پردۂ غبار ہے

اسی کا ظلِ عاطفت بقائے نور و نار ہے
پیمبرِ حیات ہے حیات بھی نثار ہے

حیات اس کی پیروی ہے موت اس سے بے رخی
وہ زندگی کی جیت ہے یہ زندگی کی ہار ہے

ازل سے نفسِ پاک میں ہیں جوہرِ پیمبری
رسالت اس کی ہے نہاں امامت آشکار ہے

دماغ و دل میں متحد رسالتیں امامتیں
زبان پر خلاصۂ پیامِ روزگار ہے

شباب لافتیٰ بھی ہے مزاجِ ہل اتیٰ بھی ہے
یہ شان کہہ رہی ہے خود نبیؐ کا ورثہ دار ہے

زہے شکوہِ خسروی کہ دستِ حق پرست میں
کتاب ہے رسولؐ کی علیؑ کی ذوالفقار ہے

حکومت اس کی دیدنی ہے کشورِ حجاب میں
جھلک بھی جبر کی نہیں یہ حُسنِ اختیار ہے

تباہ کار فلسفے نہ شعلہ بار حکمتیں
نظر نظر لطافتیں قدم قدم بہار ہے

مجال کیا ہے تھم سکے گھڑی بھر اس کے سامنے
جو منبروں پہ وزن ہے جو مسندوں پر بار ہے

نہ مصلحت نوازیاں نہ مسئلہ طرازیاں
دل اس کے عہد میں ہے جو زباں سے ہمکنار ہے

پیامِ امن لائے گا وہ خلق کے لیے مگر
یہ بات ہی کچھ اور ہے جو سر بدن پہ بار ہے

متاعِ حق کے سامنے جھکیں گے دولتوں کے سر
یہ کل کا ہے مقدمہ جو آج کارزار ہے

جگہ بنائی جائے گی غریب قوم کے لیے
وہ آنکھ خون روئے گی نظر سے جس کو عار ہے

گئی ہوئی تو ہے خبر یہ مصدرِ کمال تک
حکومتوں کے نقص کا زمانہ سوگوار ہے

بدل رہا ہے کروٹیں حسینؑ کا لہو ابھی
حسینؑ کی عزا کو بھی اسی کا انتظار ہے

سمجھ غمِ حسینؑ سے مسرتِ ظہور کو
خزاں کی جب یہ شان ہو بہار پھر بہار ہے

○

عہدِ اضطراب

نقابِ رخ الٹ دو حشر اٹھا رکھا ہے دنیا نے
زمانہ مضطرب بیٹھا ہے دیکھیں کون پہچانے

یہ دردِ عشق کی ہے کونسی منزل خدا جانے
تمہارے نام پر سجدا سا کر لیتے ہیں دیوانے

گھٹا صبر و تحمل بڑھ گئی وحشت کی آبادی
یہ دن آخر دکھایا وعدۂ امروز و فردا نے

ہمیں تسکین کیونکر ہو کہ بندے ہیں محبت کے
رموزِ پردہ داری آپ سمجھیں یا خدا جانے

یہ عہدِ زندگی ہے کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے
ذرا سی بات پر تیور بدل جاتے ہیں دیوانے

نکلتے ہیں تو گھر سے سر بکف ہو کر نکلتے ہیں
کہ جیسے در پہ حاضر ہے کوئی زنجیر پہنانے

نہ جانے کون سے نقطہ پہ ہے نشہ تولّا کا
لگا رکھا ہے میخانہ اٹھا رکھے ہیں پیمانے

فقط صلوٰۃ کے نعرے نہیں اب ذکرِ خیبر پر
دلِ اب انگڑائیاں لیتے ہیں سن سن کر یہ افسانے

بہت صدیاں گزر جانے پہ اشکِ غم کی رُت بدلی
دیا ہے پیرہن شعلوں کا دردِ کار فرمانے

خدا رکھے تمہیں نے ہدیۂ توفیق بھیجا ہے
منظم ہو چکے بکھرے ہوئے تسبیح کے دانے

ضیا پھیلے تو کھل جائے حقیقت خود پرستوں کی
کسے معلوم ہے آتش بجاں کتنے ہیں پروانے

اُلٹ جائیں گے سب پردے جو خضرا کا حجاب اٹھا
ہزاروں کعبۂ دل میں چھپا رکھے ہیں بت خانے

جسارت دیدنی ہے بے حقیقت مے فروشوں کی
مئے انگور کے چھینٹے اب کوثر کے افسانے

لپٹ جائیں گے ذرّے طیبۂ فاضل کے دامن سے
رہیں گے دور ہی قدموں سے بیگانے تو بیگانے

ازل سے معرفت حاصل ہے ہم کیوں ہچکچائیں گے
مزا بیعت کا جب ہے ہاتھ کو جب ہاتھ پہچانے

ودیعت کر دیا نظمِ دو عالم کار فرمانے
تمہیں آؤ تو آؤ گتھیاں ذہنوں کی سلجھانے

یہ دنیا بھی تمہاری ہے تم اس گھر کے بھی مالک ہو
ذرا دیکھو تو کیا صورت بنا رکھی ہے دنیا نے

نہ راس آیا کوئی طرزِ حکومت ملک ہستی کو
وہ عقلیں تھک گئیں جن کو چنا تھا اہلِ دنیا نے

زمانہ ڈھونڈتا ہے ایک مسلک امن و راحت کا
کہاں ہے فطرتِ اسلام کی نازش خدا جانے

خدارا اب سکونِ دل کی دولت لے کے آجاؤ
مکمل ہو چکے سب اضطرابِ غم کے افسانے

ترقی لے گئی تھی خیر سے جتنی بلندی پر
اسی پستی میں پھینکا ہے وہیں سے نازِ بیجا نے

○

منقبت

غضب کا معرکہ تھا اور قیامت کی صف آرائی
ہوئی اسلام اور انسان میں جس دن شناسائی

معاذ اللہ پورا عالمِ قدسی مخالف تھا
فلک پر دیدنی تھی خاک کے پتلے کی تنہائی

اکیلا آدمی مافوقِ مخلوقات کا نرغہ
سکوں خوابِ عدم کا اور یہ ہنگامہ آرائی

نئی دنیا نئی محفل نئی آنکھیں نیا منظر
نظر کے ساتھ ہی آثار نے لڑ نیکی ٹھہرائی

مسافر اجنبی اور صحبتِ ناجنس ارے توبہ
ستارے ہنسنے والے مہر ومہ خالی تماشائی

اُدھر پھیلی ہوئی جنت ادھر بھڑکا ہوا دوزخ
دوراہے پر یکا یک روح اور پیکر میں یکجائی

مزاجِ نور برہم آب وگل کی شمع روشن سے
روش بدلے ہوئے اپنی ہوائے محفل آرائی

عجب ماحول میں آنکھیں کھلیں مقصودِ قدرت کی
جہالت سرکشی کفرانِ نعمت ناشکیبائی

فضائے شکر میں اٹھتی ہوئی لہریں شکایت کی
زبانِ جملہ پر بدلا ہوا انداز گویائی

گناہِ رشک جولاں مرکز تقدیس وعصمت میں
خدا کے گھر میں نافرمانیِ پندار خودرائی

سماعت بہرہ ور آوازۂ صورِ تکبّر سے
بغاوت کی ادا کاری سے لطف اندوز بینائی

نظامِ جلوہ گاہ قدس کے بگڑے ہوئے تیور
مقامِ بحث میں وارد اصولِ ناصیہ سائی

فرشتوں کا وطن انسان اورنگِ صدارت پر
وہی مرکز نگاہوں کا وہیں ذہنوں کی یکجائی

سرِپُر نور پر سجتا ہوا دیہیم حکمت کا
امانت دار کاندھوں پر قبائے علم و دانائی

محبت احسن تقویم کا ڈالے ہوئے آنچل
قدِ آدم شبابِ اصطفاؐ کی جلوہ آرائی

چراغِ وادیٔ سینا کو لو دیتی ہوئی نظریں
جبیں کے طور سے روشن جلالِ کارفرمائی

متاعِ ہوش میں اسرار کرّمنا بنی آدمؑ
سرورِ کوش اِنّـــی جَـــاعِـلٌ کی نغمہ پیرائی

لطافت ذہن کی سرمایہ دارِ علم الاسما
نفختُ فیہ من روحی کی پیکر میں توانائی

ظہور اپنا خداوندی کے منصب کی بلندی سے
نشیبِ عبدیت میں ماسوا کی بزم آرائی

نیازِ حاملانِ عرش وکرسی اپنی خدمت میں
خدا کے سامنے بندے کی چوکھٹ پر جبیں سائی

وہ یکسر گردنیں جھکتی ہوئی بیگانہ سازوں کی
نظر پہلے پہل جبری حکومت کی تماشائی

سزائے سرکشی کا وہ جلالت آزما منظر
نمودِ اختیارات جہانداری و دارائی

یہ مشتِ خاک اور سجدہ میں لا ہوتی و ناسوتی
کہاں تک دل نہ کرتا کبر و نخوت کی پزیرائی

جوانِ حالات و کیفیات میں سوتے سے چونکا ہو
تعجب ہے اگر اس کو نہ ہو پندارِ یکتائی

ہزار اسباب تھے ایسے نہ بدلا پر مسبب سے
محمدؐ کا سلف آلِ محمدؐ کا تولائی

یہی آلِ محمد ہیں شرافت نسلِ آدم کی
یہی گھر ہے جہاں انسانیت نے پرورش پائی

نظر والے مکمل جلوہ انسانیت دیکھیں
مبارک صبح میلادِ حسینؑ ابن علیؑ آئی

ولادت کی خبر پہنچا کے دربارِ رسالت میں
مدینہ کی ہوا پیغمبری پر اپنی اترائی

سفیرِ فکر بہر نذر لایا وہ نیا مطلع
اُبھر کر فطرتِ شاعر نے خود تعظیم فرمائی

حسینؑ آئے بقائے دینِ فطرت کی نوید آئی
نبیؐ نے فاطمہؑ کے سامنے پھر کود پھیلائی

ضیائے حُسن سے والفجر کی صورت پہ نور آیا
نگاہِ لطف سے واللیل کے پیکر میں رعنائی

صلائے عام دی والعصر بن کر جس کے اسوہ نے
زبانِ حق نے جس کے عصرِ روشن کی قسم کھائی

حبیبِ حق کو پھر ایسا کوئی تحفہ نہیں آیا
سلام آئے پیام آئے بہت وحی خدا آئی

دیا آغوش پیغمبرؐ میں کھیلے صحنِ مسجد میں
نبیؐ کے گھر کی دولت تھی خدا کے گھر کو ہاتھ آئی

نبیؐ کے دوش کو اہرِ رسالت بن کے زینت دی
تبسم نے کلام اللہ کی تفسیر فرمائی

نہائے چشمۂ تطہیر میں سنورے مودّت سے
تڑپ کر آیۂ ابناونا نے کود پھیلائی

متانت دی لڑکپن کو شریکِ ہل اتا ہو کر
اسی عنوان سے بڑھتا گیا ذوقِ خود آرائی

ملائیں ان سے نظریں یا حُسن نے آئینہ دیکھا
ظہور اپنا ہی پایا اپنی ہی صورت نظر آئی

زبانِ قدس ہر دم منتظر تھی ان کے اسوہ کی
اِدھر میدان میں اترے اُدھر آیت اتر آئی

زہے تقدیر جن آنکھوں نے دیکھا ہو یہ نظارہ
ہنسے ہوں گے بہت بھائی کی صورت دیکھ کر بھائی

بڑھا سن جس قدر ان کا بڑھی اسلام کی قوت
شبابِ دینِ حق بن کر جوانی کی بہار آئی

خدا کی راہ میں باندھے گئے عقدِ محبت بھی
چلی یاں حُسن والوں کی نہ سلمائی نہ لیلائی

پیمبرؐ بھی شہادت کے شرف میں ہو گئے شامل
نواسے کی ادا نانا کو کچھ ایسی پسند آئی

اسی قائد کا نعرہ تھا اسی کی گونج ہے اب تک
یہ آزادی زمانہ آج ہے جس کا تمنائی

فضائے جنگ میں مانی ہوئی شانِ جہاد اس کی
مسلّم اُس کی قرباں گاہِ آزادی میں یکتائی

تلاطم آج تک ہے اس کی طوفاں آزمائی کا
لرزتا ہے حسینی مجلسوں سے چرخِ مینائی

دو عالم کے فدا کاروں کی قربانی یہ بھاری ہے
حصارِ ظلم میں اس کی عظیم الشان تنہائی

وہی نقشِ قدم ہیں رہنما ہمت کی راہوں میں
زمانہ کی سر آنکھوں پر ہے اس کی جادہ پیمائی

سبق لیتے ہیں در پردہ اسی کے کارناموں سے
ترقی خواہ قوموں میں قیادت کے تمنائی

حسین ابن علی اے نورِ وحدت روح یکتائی
مبارک تجھ کو تیرہ سو برس سے کار فرمائی

ترے دم سے غریبوں کی زباں پر حرفِ حق آیا
ترے تیور سے مظلوموں کے دعوے میں توانائی

عیاں تجھ سے ارادت کے سبب ہر آنکھ میں آنسو
نہاں تیری محبت کے لیے ہر دل میں گہرائی

نہ جانے ہند کی مٹی کو کتنا عشق ہے تجھ سے
مسلمانوں کا کیا ہے ذکر ہندو ہیں تو لائی

محبت میں یہ دل ہے بے خبر نفسِ محبت سے
سمجھتا ہی نہیں کمبخت سودائی تو سودائی

ابھی ہم کربلا سے تیری منزل تک کہاں پہنچے
ابھی ہے صرف ارض کربلا تک جادہ پیمائی

ابھی کیا ذکر ہے مرنے کا جینا بھی نہیں آیا
ابھی ہیں زندگی کے معرکوں میں ہم تماشائی

نگاہیں دیکھتی ہیں اب دماغ اب فکر کرتا ہے
ترے مقصد سے کچھ کچھ ہو چلی ہے اب شناسائی

○

درشن کا سویرا

شعبان وہ اسلام کا ممدوح مہینا
تقویم کی خوش وضع انگوٹھی پہ نگینا

دنیا وہ اندھیرے میں اجالے میں دوعملی
مغرب سے شبِ ماہ کی اوڑھے ہوئے کملی

وہ شب کہ شب قدر کو بھی دیدکا ارماں
وہ چودھویں تاریخ کے ماتھے پہ چندرماں

چاندی سے جبیں چاند کی سجدوں سے مطلا
تسبیح ستاروں کی تجلی کا مصلا

دل کو نگہ شوق کا ہر بار ٹھوکا
پٹ کھولے ہوئے یمنۂ شعباں کا جھروکا

وہ گوشۂ مغرب سے کوئی جھانکنے والا
پچھّم میں وہ پورب کے تبسم کا اجالا

بھٹکے ہوئے بھولے ہوئے کھوئے ہوئے دونوں
وہ تیرگی وہ نور سموئے ہوئے دونوں

جیسے کوئی پگھلائے ہوئے نور کا ساگر
اس ڈھب کا اندھیرا کہ ہر اک چیز اُجاگر

شبنم کے گہر رحمتِ معبود کے حوالے
سورج کی اترتی ہوئی کرنوں کے حوالے

وہ صبح جسے خود یدِ قدرت نے سنوارا
انگڑائیاں لیتا ہوا وہ صبح کا تارا

وہ وقت کہ سجدے رخ گیتی کو نوازیں
اسلام کی دنیا میں نمازیں ہی نمازیں

توحید کے نغموں کی وہ تکرار سہانی
وہ زور اذاں کا وہ اقامت کی جوانی

اخلاص کی خوشبو سے وہ پھولوں کا مہکنا
تکبیر کی آواز پہ کلیوں کا چٹکنا

ترتیل وہ الحمد کی عنوان گزارش
وہ منزل آخر وہ تشہد کی سفارش

وہ دوش پہ لہروں کے تلاوت کی صدائیں
وہ بار اٹھائے ہوئے قرآں کا ہوائیں

رحمت کی گزر گاہ تولا کے اشارے
تقریب دعاؤں کی درودوں کے سہارے

انوار کی بارش کرمِ ایزد باری
تکمیلِ کرم مہدیِ ہادیؐ کی سواری

دلبندو دلِ آرام پیمبرؐ کی ولادت
ہمصورت وہمنام پیمبرؐ کی ولادت

ماحول کو معصوم بنائے ہوئے معصوم
معصوم کو سینہ سے لگائے ہوئے معصوم

وہ جلوۂ قائم وہ قیامت کا تبسم
آغوشِ امامت میں امامت کا تبسم

وہ حسن کہ تعینِ سن و سال سے بالا
رخسار کے اک تل سے دو عالم میں اجالا

سیرت کی زمانے میں بہت روز سے سن گُن
صورت کا وہ عنوان کہ اللہ جمیلؐ

بکھرائے ہوئے دوش پہ زلفیں وہ خلیلی
آنکھوں کی طرف دیکھ کے کونین نے پی لی

وہ ذہنِ خدا داد رسولؐ ازلی کا
دل فاطمہؑ کا درد حسینؑ ابن علیؑ کا

چتون کا اشارہ علمِ اسلام کی جانب
تیور وہ قیامت کے نظر شام کی جانب

یہ بات نہ پائی کسی جرأت کے دھنی میں
غصہ وہ بجھایا ہوا خُلقِ حسنی میں

وہ دبدبۂ قیصری وسطوتِ شاہی
فطرت میں یداللہ کی اسلام پناہی

وہ روحِ عمل ولولۂ داد رسی میں
دنیا کو بدل دیں گے یہ ٹھانے ہوئی جی میں

تفریق کم و بیش مٹانے کا ارادہ
اقوام کو اک سطح پہ لانے کا ارادہ

ان قدموں سے لپٹے ہوئے جادہ پہ تصدق
دنیا مرے مولا کے ارادہ پہ تصدق

کردار بہت قوم کا ابتر ہے اب آجا
غیبت میں تری راج لٹا جاتا ہے راجا

ہر شب کو یہ سمجھا کے سلاتا ہے اندھیرا
جیتے ہیں تو ہوگا ترے درشن کا سویرا

پل بھر کو نہ ہاتھوں سے عناں صبر کی چھوٹی
گیارہ سو برس بیت گئے آس نہ ٹوٹی

کمزور ہیں غیرت سے گڑے جاتے ہیں صاحب
دنیا سے بہر حال لڑے جاتے ہیں صاحب

مرتے ہوئے دم عشق کا بھرتے ہی رہے ہیں
خاکسترِ مقتل سے ابھرتے ہی رہے ہیں

کس کس نے ہوا ظلم کی بدعت کی نہ باندھی
کس روز چلے گی تری تلوار کی آندھی

دنیا تری منگتا تری مجرائی ہے داتا
ہر قوم میں آمد کی خبر آئی ہے داتا

سیدھی ہے رہِ مہر وفا پھیر نہیں ہے
دل کو ہے یقیں دیر ہے اندھیر نہیں ہے

O

منقبت

اللہ رے تیری وسعت اے جلوۂ جانانہ
ہر مذہب و ملت میں آمد کا ہے افسانہ

کیا شمع سے نسبت دوں کیا طور کے شعلہ سے
جس نورِ مجسم کا جبریل ہو پروانہ

جانے بھی تو کیا جانے سمجھے بھی تو کیا سمجھے
غافل کو خبر کیا ہے کس خم سے ہے میخانہ

رستی ہے لہو بن کر تہذیب کی مے ساقی
دنیا کا تمدن ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ

انسان مکمل آ دنیا کو محبت دے
غارت گرِ انساں ہے کا فعل حکیمانہ

پھر یاد دلا اپنی بہکی ہوئی ملت کو
مومن کے فرایض کا بھولا ہوا افسانہ

مالک کی وہ شہ زوری اور فرش زمیں بستر
سلماں کی وہ مزدوری اور منصب شاہانہ

اب آ کے عوض لے لے سفاک حریفوں سے
تیرہ سو برس دیکھے انداز کریمانہ

یہ بارہواں ساقی ہے کیا تیغ و سپر باندھے
اے عشق وفا پیشہ اک نعرہ مستانہ

ساقی کو ذرا آکر میخانہ سجانے دو
اس وقت بڑھا دیں گے پیاسوں کا عزاخانہ

شبیرؑ کے ماتم میں صادقؑ کی محبت میں
روتا ہوا عاقل ہوں ہنستا ہوا دیوانہ

○

امامِ منتظرؑ

جب توجہ آنے والے کی اِدھر ہوجائے گی
دل کو دل سے راہ ہوتی ہے خبر ہوجائے گی

آنے والے اب شریعت معتبر ہوجائے گی
تیرہ معصوموں کی محنت بارور ہوجائے گی

یک بہ یک تطہیر احساسِ بشر ہوجائے گی
ذہن میں اِک چاندنی سی جلوہ گر ہوجائے گی

راستے میں اتنے سجادے بچھائے جائیں گے
ہر نمازِ شوق حرفِ معتبر ہوجائے گی

آئنہ بندی کریں گے دہر کی شمس و قمر
ظلمتِ شب صبح سے شیروشکر ہوجائے گی

صبح کا منہ آبِ کوثر سے دُھلایا جائے گا
رات شبنم کے وضو سے بہرہ ور ہوجائے گی

جوہرِ صدق وصفا کے ہوں گے پہرے ہرطرف
امن کا گھر زندگی کی رہگزر ہوجائے گی

صبح کو ہوگا ظہور اس جلوۂ معصوم کا
شام تک زیبا بہ اندازِ دگر ہوجائے گی

کلمۂ توحید بن جائے گی پوری کائنات
محو سجدہ اِک نظر میں ہر نظر ہوجائے گی

سانس بھی لے گا نہ کوئی دینِ فطرت کے خلاف
اس قدر تطہیر افکارِ بشر ہوجائے گی

غرق ہوگا سامعہ کیفِ حدیثِ دوست میں
ہر نظر مفہومِ فرووسِ نظر ہوجائے گی

خیر و شر کا مسئلہ دم بھر میں حل ہوجائے گا
ساری دنیا اُمّتِ خیرالبشر ہوجائے گی

اپنی اپنی حد میں ہوں گے حکم کے سب منتظر
دم بخود تا بندگیٔ سیم و زر ہوجائے گی

آیتیں قرآن کی جیسے مجسم ہوگئیں
زندگی انسان کی یوں معتبر ہوجائے گی

بیٹھتے اُٹھتے زباں کا ورد ہوگا یا علی
معرفت عترت کی معیارِ بشر ہوجائے گی

سورۂ الحمد کی تفسیر بن جائیں گے ہم
قومِ شیعہ پاک سے پاکیزہ تر ہوجائے گی

تین سو تیرہ سپاہی لے کے آئے گا فقط
پوری دنیا کفر کی زیروزبر ہوجائے گی

اس جبیں پر ڈال دیں گے بل یہ آب و گل اگر
روح بحر و بر خلافِ بحر و بر ہوجائے گی

قوم یوں بے چین ہوگی دیکھ کر شانِ جہاد
جیسے اس کے دست و بازو کو نظر ہوجائے گی

کارنامہ جن کا ہے یومِ عدوئے اہلِ بیت
ان کی یہ خدمت مکمل دار پر ہوجائے گی

ختم ہوجائیں گے سارے دشمنانِ شیرِ حق
قسطِ آخر جب رواں سوئے سقر ہوجائے گی

آخری اِک ہوگا ماتم فاطمہؑ کے چاند کا
کائناتِ دردِ دل زیروزبر ہوجائے گی

مدح میں ہے جن کی توحید و رسالت ہم زباں
شاعری موقوف ان کی مدح پر ہوجائے گی

○

روح کی فریاد

گیارہ سو سال سے ایک آنے والے کے انتظار میں.....

بدلا ہوا ہے دہر کا عنواں ترے بغیر
امکانِ زیست ہے عَدَمِ امکاں ترے بغیر

تنظیمِ شش جہات میں آثارِ بے رخی
تقویمِ کائنات پریشاں ترے بغیر

بالاتفاق رقص مہ و مہر بے محل
بے اعتبار گردشِ دوراں ترے بغیر

پژمردہ نے میں شورشِ نغمات مضمحل　　افسردہ مے میں جوشِ بہاراں ترے بغیر
برہم سی ہے زمین پہ ترتیبِ شمع و گل　　دھندلا سا ہے فلک پہ چراغاں ترے بغیر
بے کیفِ وقت نظر و زحمتِ خیال　　بے لطف ارتعاشِ رگ جاں ترے بغیر
بے آب چشمِ شوق کی گوہر فشانیاں　　بیقدر حُسنِ چاک گریباں ترے بغیر
بے حصر نازِ حسرت و ارمان و آرزو　　بیجا نوازشِ سر و ساماں ترے بغیر
سر پھوڑنے کا زعم تڑپنے کی بیکلی　　عہدِ جنوں گناہ بداماں ترے بغیر
بیجا توقعات کی تمکین بے خودی　　باطل تصورات فروزاں ترے بغیر
ادراک بے ضرورت واحساس بے محل　　بے ربط امتزاجِ تن وجاں ترے بغیر
اتری ہوئی نگاہ سے ہر موجِ دردِ دل　　ایک ایک آہِ تشنۂ طوفاں ترے بغیر
کھویا ہوا زبان پہ افسانۂ فراق　　سہما ہوا ملالِ فراواں ترے بغیر
معیار سے گرے ہوئے تسکین واضطراب　　درمان و درد دست وگریباں ترے بغیر
اٹھی ہوئی نگاہ کی جنبش ترے لیے　　سمٹا ہوا سوال کا داماں ترے بغیر
ہر ہر قدم پہ عقل کی بدلی ہوئی روش　　بگڑا ہوا مزاجِ نگہباں ترے بغیر
آزردۂ کشاکشِ عہدِ حیات ہوں　　مشکل ترے بغیر نہ آساں ترے بغیر
امید یک نظر میں ہر آئینۂ جمال　　ایک ایک میری جان کا خواہاں ترے بغیر
رخصت طلب ہے آج غمِ ہوش و ہوشِ غم　　دو اک گھڑی کا اور ہوں مہماں ترے بغیر
ٹھہرا نہ ایک وضع پہ سو بار ہوچکا　　کافر ترے بغیر مسلماں ترے بغیر

کچھ دن سے تیری یاد کی محفل اداس ہے
اب چل بسے گا تجمّ غزلخواں ترے بغیر

○

منقبت

رسوا ہو عین چوک میں اسلام کا نشاں
گھر میں خدا کے کفر کی تبلیغ الاماں

منبر کا احترام نہ مسجد کی آبرو
باطل پہ جمع ہوگئے کعبہ کے پاسباں

تقریر کے لحاظ سے ہر بات بے محل
مصرف کے اعتبار سے ہر لفظ رائے گاں

مذموم طرزِ فکر سے سہما ہوا دماغ
بے ربطیٔ سخن سے لرزتی ہوئی زباں

تاریک راستوں میں ضلالت کی پیروی
بھٹکا ہوا منازلِ عصمت سے کارواں

نکلے ہوئے پناہِ رسالت پناہ سے
چھوڑے ہوئے خلافت برحق کا آستاں

اقدامِ ناروا پہ یگانوں کا احتجاج
اٹھتی ہوئی خود اپنے ہی حلقہ سے انگلیاں

ماہِ رجب کے دور میں توہین لفظ یوم
یعنی بھری بہار میں افسانۂ خزاں

قرآن کی فضا میں ابو جہل کا مقام
تکبیر کے حصار میں ناقوس نغمہ خواں

ابلیس کی جبیں سے سوال شعاعِ نور
افلاسِ ذہن و فکر پہ اخلاص کا گماں

پیغمبرِ گناہ سے بخشش کا آسرا
دوزخ کی آگ سے طلبِ راحت جناں

فرعون کی مدد سے رسائی کلیم تک
یوسف کے بدلے اک حبشی روحِ کارواں

لکھنے کو اسم پاک محمدؐ سکونِ روح
فرمانِ کلٹا کی اذیت سے نیم جاں

حدِ گناہِ فکر ثنائے امیر شام
دور از ثوابِ مدحتِ مولائے دوجہاں

دشمن سے اہلبیت کے اقرارِ دوستی
یہ بات سنیوں کی شریعت میں ہے کہاں

ان کی نگاہ میں ہے یہ تحریک ناروا
اس کے خلاف سب علما دے چکے بیاں

چہروں پہ سنیت کا جو عرصے سے تھا نقاب
لو ہو گیا اُتر کے عقیدے کا ترجماں

کیونکر سکونِ قلب سے سنتے خدا پرست
وہ بات جو مزاجِ مشیت پہ ہو گراں

آخر نوائے حق نے کیا اس طرح نزول
جیسے گریں گناہ کے خرمن پہ بجلیاں

عباسؑ کے غلاموں نے کس بل دکھا دیئے
عباسؑ کے جلال کا کیا کیجئے بیاں

نسبت مجھے بھی ہے بنی ہاشم کے چاند سے
میں بھی ہوں اس جری کا اک ادنیٰ سا مدح خواں

دشمن کو اس کی تیغ سے یوں مل گئی اماں
یہ شیر تھا حسینؑ کے مقصد کا راز داں

شبیرؑ کے کرم سے ہے توحید سربلند
عباسؑ کے علم سے ہے اسلام کا نشاں

اس کا علم ہے رونق ہر منبر و ضریح
وہ آج بھی ہے دینِ خدا کا نگاہباں

وہ سورہا ہے کون جبیں جس کی چھو سکے
عباسؑ ذی شرف کی جلالت کا آستاں

آیا بھی وہ نہ تھا ابھی بزمِ شہود میں
ارشاد فاطمہؑ نے کیا میں ہوں اس کی ماں

پیغمبرِ وفا ہے وفا کا امام ہے
کونین میں ہے اس کی امامت بھی جاوداں

عباسؑ کی مثال علیؑ کے سوا کہاں
رستم سے کیوں مثال دوں قرآن درمیاں

لپٹی ہوئی علم سے ہے اسلام کی حیات
پرچم کے زیر سایہ شریعت ہوئی جواں

اس کا خیال آتا ہے حرفِ وفا کے ساتھ
ذہنوں میں علقمہ کی اُبھرتی ہے داستاں

اس منصبِ جلیل کے قابل تھا اور کون
شبیرؑ کی نظر میں تھیں حیدرؑ کی انگلیاں

صورت وہ تھی کہ حسن تھا یوسفؑ کا دم بخود
قوت یہ تھی کہ شیر کی جیسے کلائیاں

اس کے تصرفات کو حاصل ہوا فروغ
معصوم و حق طراز نگاہوں کے درمیاں

مشکل کشا کا لال بھی مشکل کُشا بھی ہے
کیونکر نہ پھر ہو قبلۂ حاجاتِ آستاں

○

منقبت

السلام اے شرفِ جوہرِ شمشیر زنی
اے علمدار و سپہدار حسینؑ ابن علیؑ

اے شجاعت کے جمالِ ابدی و ازلی
آفرینش نے بھی خود بڑھ کے سلامی تجھے دی

سر اٹھایا تو بہت ظلم کی رو بڑھ نہ سکی
کجکلاہی سے تری ہوگئی دنیا سیدھی

میں خداوند وفا کہہ کے بھی کچھ کہہ نہ سکا
تو نے تشکیل وفا اس نئے عنوان سے کی

بانکپن دیکھ کے گھبرا گئے افکار و عقول
شان ہوتی ہے خدا ساز مجاہد کی یہی

روزِ عاشور کے طوفانِ جلالت کی قسم
نہ ہوئی آج تک الفاظ میں تصویر کشی

جسے گہوارۂ اصغرؑ میں سلا آیا تھا
اب دریا بھی تو چونکی نہ تری تشنہ لبی

درِ شبیرؑ سے کیا آنکھ ملاتا کوئی
تیرے دم تک تری ہیبت کی نگہبانی تھی

کربلا کے لیے محفوظ تھا یہ عز و شرف
جنگ صفین وجمل کی ترے قابل ہی نہ تھی

مردِ میدانِ شجاعت شہِ مرداں کے خلف
تجھ سے مردانِ خدا کرتے ہیں ہمّت جلی

اللہ اللہ ترا زاویۂ فکر و نظر
روشِ اہلِ وفا نقشِ قدم تک نہ گئی

بازوؤں کی ترے تفسیر کوئی کیا کرتا
یہ شجاعت کے صحیفہ میں ہیں آیاتِ جلی

ڈبڈبائے ہوئے تھے اشک سکینہؑ شاید
علقمہ دیکھ رہی تھی تری آنکھوں میں تری

فضلِ خالق سے ابوالفضلؑ ملا تجھ کو خطاب
پھر ترے بعد کسی کو یہ بزرگی نہ ملی

پوچھتا کیا ہے زمانہ ترا اندازِ خرام
دھار تلوار کی جادہ ہے روش صف شکنی

آلِ ہاشم کے قمر چاندسی صورت والے
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

سجدے کرتا ہے ترے در پہ ہر اک مصرعِ نو
میرے جذبے ہیں نرالے مری توفیق نئی

میں ہوں خلّاقِ معانی تری مدحت کے طفیل
دُرِ مضموں سے بھری رہتی ہے دل کی جھولی

میں جسے چاہوں بناؤں اسے سلطانِ سخن
میری تحویل میں ہے مُلکِ سخن کی شاہی

ہو جو بیگانہ روی سے یہ زمانہ ہے خلاف
سب ترے علم میں ہے حجمؔ کی آشفتہ سری

○

قصیدہ

یہ بار گہِ عرش نشاں منزلِ عظمت
صدیوں سے ہے میخانۂ اربابِ مودّت

پینے کو یہاں ملتی ہے اُس ہاتھ سے واعظ
کونین کی طاعت سے گراں جس کی ہے ضربت

چمکا ہوا میخاروں کا ہے اخترِ اقبال
اس بزم سے ہے چاند ستاروں کو عقیدت

راضی ہیں جو مداحوں سے احمد بھی علی بھی
اس بزم کو بخشا ہے کمال ازرہِ شفقت

ملت پہ جو ہوگا کرمِ داورِ محشر
طبقہ یہ چلا جائے گا سیدھا سوئے جنت

بھائی ہے وہ سردار جوانانِ جناں کا
منسوب ہے جس سے یہ علم یہ در دولت

اس بزم پہ رکھتے ہیں نظر لطف و کرم کی
سرکارِ ابو القاسم و دارائے رسالت

یہ بزمِ ادب سلسلۂ نور ہدا ہے
اس بزم سے ملتی ہے زمانہ کو ہدایت

یہ ہے وہ مقام شرف و بابِ تقدس
زائر کو عبادات سے ملتی نہیں فرصت

حلقہ کسی ماتم کا کبھی دور فضائل
قرآن کی تفسیر قصیدہ کی تلاوت

میخانہ کا میخانہ ہے کعبہ کا ہے کعبہ
پڑھتی ہیں نمازیں یہاں رندوں کی جماعت

ساقی بھی سخی رند بھی پیرو ہیں اسی کے
پھیلاتے ہیں دنیا میں شبِ جمعہ کی برکت

کم حوصلہ و تنگ نظر کوئی نہیں ہے
پیاسے ہوں جو آجائیں یہاں عام ہے دعوت

ہوجاتا ہے ہم ایسے فقیروں کا بھی پھیرا
محسوس جو ہوتی ہے کبھی نشہ کی قلت

ساقی سے جو لیتے ہیں چھلکتا ہوا ساغر
وہ رند ہیں بڑھ جاتی ہے نبضوں کی حرارت

دوگھونٹ میں چہروں پہ پڑھیں نور کی لہریں
چھپتی ہی نہیں بادہ و ساغر کی شرافت

میخانے کبھی بند نہ ہونے دیے ہم نے
جاری رہی ہر دور میں ساقی کی شریعت

پیتے تھے ہم اس وقت بھی سر بیچ کے اپنا
پہرے پہ تھے جلاّد مخالف تھی حکومت

کج تھیں اسی تیور سے جبینوں پہ کلاہیں
چہروں پہ وہی میکدۂ خم کی جلالت

مقتل میں بھی تھا بادہ گساری کا قرینہ
زنداں میں بھی بچھی ہوئی تھی مسندِ عشرت

ہاتھ اپنے کٹائے کبھی اک جام کی خاطر
جان اپنی لگادی کبھی اک گھونٹ کی قیمت

کیا جوشِ تولّا میں سنائے ہیں ترانے
سولی پہ بڑھی اور کبھی نشّہ کی حرارت

ساقی کی ثنا کی ہے ہر اک خطرۂ خوں نے
جب موجِ زباں بھی نہ رہی منہ میں سلامت

پھر آج بہ بانگِ دہل اے دوست پئیں گے
واجب ہے ہر اک دور میں اعلانِ مودت

اسلام نے پھر ورد کیا نادِ علیؑ کا
اک اور علیؑ کی ہوئی دنیا میں ضرورت

صلوٰۃ کے نعروں کی ذرا لے تو بڑھا دو
مطلع وہ سناتا ہوں جو ہے نازشِ مدحت

مطلع

عباسؑ مزاج شرف و معنیٰ عظمت
اجلال مشیت ہے تری شانِ جلالت

تو ہے وہ تری جس نے حدیں توڑ کے رکھ دیں
سنتے تھے کہ محدود ہے انسان کی طاقت

اے نورِ ازل تو نے لباسِ بشری میں
کس درجہ بڑھایا ہے وقارِ بشریت

اے جانِ وفا تیری اجازت ہو تو کہہ دوں
زیبا ہے لقب تیرا علمدارِ محبت

قائم ہے ابھی تک ترے آثار سے دنیا
زندہ ہے ابھی تک ترے ایثار سے ملت

بے جان میں جان آگئی سقّہ جو بنا تو
کیا مشک کو اعزاز ملا تیری بدولت

سمجھی تھی یہ دنیا ترے اقدام سے پہلے
مفہومِ وفا اور نہ معیارِ شجاعت

اللہ رے بزرگی تری ماہِ بنیِ ہاشم
نو مہرِ امامت ہیں ترے قائلِ عظمت

اے مصحفِ اخلاصِ عمل حُسن کی صورت
رایت ہے ترے دوش پہ قرآن کی آیت

طوبیٰ نے کیا جھک کے سرِ چرخ سے مجرا
دیکھا جو ترے حُسنِ عمل کا قد و قامت

اس مرکزِ قوت کی ثنا کس سے ہے ممکن
ہو جس کی حفاظت میں پیمبرؐ کی امانت

ورثہ میں علیؑ عقدہ کشائی بھی حلم بھی
تیرے لیے مخصوص تھی یہ شانِ وراثت

اللہ رے وفا ہاتھ نہ پانی کو لگایا
دریا کی ہر اک موج کو بوسہ کی تھی حسرت

کرّار کے دلبند تری شان ہے یہ بھی
قبضہ ہے علم پر ترا تا قربِ قیامت

یہ تجھ کو شہادت سے فضیلت ہوئی حاصل
یا تیری شہادت پہ شہادت کو فضیلت

ہنگامۂ ساحل میں وہ تلوار چلائی
اٹھ جائے کبھی جیسے بگڑ کر یدِ قدرت

اب اور کوئی حق کا علمدار نہ ہوگا
لیں گے ترے ہاتھوں سے علم حضرتِ حجتؑ

اسلام کے دل کفر کے ماحول میں پہنچا
لہروں پہ ترے خون کی پیغامِ شریعت

روضہ پہ لرزتی ہوئی اٹھتی ہیں نگاہیں
تیرہ سو برس بعد بھی ہے آج یہ ہیبت

غصہ نہ دلائے جو کوئی دشمنِ شبیرؑ
سر تا بقدم تو ہے محبت ہی محبت

○

منقبت

ثنائے ثانیِ زہراؑ میں کیا کروں تحریر
کہ خامہ لکھتا ہے ہر پھر کے آیۂ تطہیر

مقامِ حلم میں ہے حلمِ فاطمہؑ کی نظیر
جلال اس کا ہے بالکل جلالِ خیبر گیر

قلم اٹھاتا ہوں تھم تھم کے یوں بہ پاسِ ادب
پڑی ہے جیسے مرے پائے فکر میں زنجیر

ظہور اس کا ہے اس طرح بزمِ ہستی میں
حجابِ نور میں جیسے پیمبری کا ضمیر

اسی کے دم سے ہوئی فتح جنگِ کرب و بلا
کہ اس کا صبر ہے تکمیلِ مقصدِ شبیرؑ

کلام موجبِ صبر و سکونِ اہلِ حرم
نگاہ باعثِ تسکینِ اصغرؑ بے شیر

اسی کے ذہن اسی کے دماغ نے کی ہے
بنائے مجلس و ماتم سے قوم کی تعمیر

یہ اہتمام نہ کرتی جو اس کی فکر و نظر
تو بھول جاتا زمانہ شہادتِ شبیرؑ

مدینۂ نبویؐ ہو کہ شام کا دربار
کہیں بصورتِ قرآں ہے وہ کہیں تفسیر

وہ عالمہ نہ کسی سے لیا سبق جس نے
کہ اس کے ساتھ ہوئی خلق علم کی تنویر

لرز لرز گئے دیوار و در دماغوں کے
دیارِ شام میں اس دبدبہ سے کی تقریر

وہ ہے بزرگ دو عالم میں نو اماموں کی
پھر اس کے بعد کسی کو ملی نہ یہ توقیر

امامِ وقت بھی تھے اس کی ہی حفاظت میں　　سپرد اس کے تھی ایک اک امانتِ شبیرؑ
اب اس کے بعد میں اے نجم کیا کہوں آخر
فضائے رعب و جلالت ہے میری دامن گیر

○

منقبت

شرف کچھ کم نہیں عونؑ و محمدؑ کی ولادت کا　　مدینہ میں اضافہ ہوگیا نور اور نکہت کا
بنی ہاشم ہیں اس پر مرتبہ پایا شہادت کا　　نہ ہو کیوں غلغلہ پھر حُسن صورت حُسن سیرت کا
ابھی آتا ہے یہ تحفہ نگارستانِ معنی سے　　ترو تازہ ہے گلدستہ بہارستانِ مدحت کا
دوگانہ شکر کا پڑھنا ہے مدحت کے مصلّے پر　　خدا نے دن دکھایا شاہزادوں کی ولادت کا
کسی کو کیا خبر دو ناصرِ شبیرؑ آئے ہیں　　فقط زینب کو اندازہ ہے چہروں کی جلالت کا
وفا پر دے کے جانیں عین ایامِ جوانی میں　　بہت معیار اونچا کردیا انساں کی عظمت کا
یہ بالاتر ہیں آدم سے یہ نازِ آدمیت ہیں　　غلاموں کو ملا ہے ان سے منصب آدمیت کا
کبھی تو مدحِ اہل بیت میں بھی صرف کر واعظ　　جو طعن و طنز سے مل جائے تجھ کو وقت فرصت کا
تشدد لاکھ ہو ہم پر تدارک کچھ نہیں ہوتا　　نمونہ دیکھ لیجیے آج اسلامی حکومت کا
گزرتی ہے جو ہم اہل ولا پر ہم ہی واقف ہیں　　ہمیں ہے فخر حاصل جذبۂ حق کی حفاظت کا
کڑکتی بجلیوں کا ان کی تلواروں میں عالم ہے　　ابھی کمسن ہیں لیکن وار کرتے ہیں قیامت کا
میں نجم اپنا فریضہ جانتا ہوں یہ ثنا کوئی
مرا مقصد نہیں اظہار اپنی قابلیت کا

○

قوم کی ماں

اے علیؑ کی لاڈلی آغوشِ زہراؑ کی پلی
ہو بہو صورت میں زہراؑ اور تیور میں علیؑ

اپنے بھائی کی بہن روحِ بہارِ کربلا
پیکرِ ہمت شریکِ کارزارِ کربلا

کیا صفیں الٹی ہیں جرأت کے گواہوں نے ترے
دودھ کی طاقت دکھادی کچلا ہوں نے ترے

تیرے اک خطبہ سے کوفہ میں دہائی ہوگئی
لب کشائی کیا ہوئی خیبر کشائی ہوگئی

تیرے لہجہ سے لسان اللہ کا لحن آشکار
اے غریبِ کربلا قرآن کی سرمایہ دار

تیرا اسوہ زندگی ہے حریت کے نام کی
قید میں مشکلکشا تھی ملتِ اسلام کی

نقص آسکتا ہے عزت کے خزانے میں کوئی
جیسے قرآں جا کے رکھ دے قید خانے میں کوئی

صنفِ نسواں کو ترے ہم صنف ہونے پر ہے ناز
اے حرم کی قافلہ سالار و عقلِ کارساز

علم تکوینی ہے تیرا اور عمل حُسنِ عمل
اللہ اللہ کربلا کی آخری مشکل کا حل

تیری ہستی آیۂ تطہیر کی تفسیر تھی
تیرے چہرہ کی جلالت چادرِ تطہیر تھی

تو نے مجلس کی بنا سے قوم کی تعمیر کی
قوم کی ماں اور بیٹی شاہِ خیبر گیر کی

○

منقبت

آ گیا ہوں مدحِ اصغرؑ تک بعنوانِ حسین
شکر کے سجدے میں ہے اب میرے خامہ کی جبیں

اس کی صورت نے دکھایا جلوۂ حُسن آفریں
عشق صادق ہو تو بے دیکھے بھی آتا ہے یقیں

اے سراپا حُسن اصغرؑ اے علیؑ چار میں
تیری ہی صورت میں نکھرا حُسن صورت آفریں

مدح کے عالم میں ہر مصرعہ پہ ہل جاتا ہے دل
میرے دل کی جنبشیں لکھ لیں کراماً کاتبیں

اللہ اللہ اک تبسم میں یہ طاقت یہ جلال
تھی امامت درمیاں ورنہ الٹ جاتی زمیں

داد دیں حُسنِ عمل کی اس کے پیغمبرؐ امام
میری کیا ہستی کہوں میں آفریں صد آفریں

منفرد ہے ذاتِ اصغرؑ ورنہ دو اس کا جواب
جانشیں ہے کون اس کا وہ ہے کس کا جانشیں

کون ہے شبیرؑ کے ہاتھوں پہ ساحل نے کہا
موج دریا نے صدا دی رحمتہ للعالمیں

بس نہ تھا کچھ ورنہ جب ہاتھوں پہ لائے ہیں حسینؑ
جی کڑا کر کے اٹھا ہی لیتے جبریلؑ امیں

شاعرِ یورپ ثنا خواں ہے زہے شانِ عمل
ساری دنیا میں مثال ایسی نہیں ملتی کہیں

مطمئن بیٹھا ہوں میں اس کی محبت کے طفیل
دل کے احساسات میں اب کوئی گنجایش نہیں

جس زمین شعر میں کرتا ہوں مدحِ اہل بیتؑ
یوں بھلی لگتی ہے جیسے ہو وطن کی سرزمیں

شغلِ مدحت میں فرشتہ موت کا آیا اگر
میں کہوں گا اک ذرا ٹھہرو ابھی فرصت نہیں

تیرا محتاجِ کرم ہوں ورنہ اے عرشِ آستاں
میں تیرے در پہ کھڑے ہونے کے بھی قابل نہیں

ہند میں جیسے ہیں ایسے چاہنے والے کہاں
تو کہیں تیرے پرستاروں کی منزل ہے کہیں

اہل بیتِ مصطفیٰؐ میں کیا سوال امتیاز
اک علیؑ اولیں ہے اک علیؑ چار میں

منقبت کرتا ہوں اس مصرعہ پہ کاشیؔ کے تمام
السلام اے سایہ ات خورشیدِ رب العالمیں

○

منقبت

دینِ فطرت جو کرے گا استوار آ ہی گیا
دردِ دل کے تکملہ کا ذمہ دار آ ہی گیا

ہم نہ کہتے تھے جسے آنا ہے آئے گا ضرور
جان صدقے دل فدا آنکھیں نثار آ ہی گیا

جب ضرورت اک علیؑ کی پھر ہوئی میدان میں
چھ مہینے کا علیؑ مردانہ وار آ ہی گیا

نعرۂ صلواۃ کی محفل میں بارش ہوگئی
ذکر اس کا صورتِ ابرِ بہار آ ہی گیا

پندرہ ماہ رجب کی تجھ دعوت جب ملی
اور کچھ دن زندگی کا اعتبار آ ہی گیا

○

منقبت

مظہرِ معصومیت اے فاطمہؑ کی ورثہ دار
کون پاسکتا ہے تیری منزلِ صبروقرار

راہِ حق میں ہرقدم ایثار کی تفصیل تھا
تیرا منصب مقصدِ شبیرؑ کی تکمیل تھا

تیرے لفظوں نے لسان اللہ کی تفسیر کی
اپنے بابا کی زباں سے کی جہاں تقریر کی

سوئے میداں اذنِ جنگِ کربلا لے کر گئے
تجھ سے اٹھارہ بنی ہاشم رضا لے کر گئے

تیری عزت پر درود اور تیری عظمت پر سلام
تیرے سایہ میں پلا کونین کا چوتھا امامؑ

خاصبانِ شام و کوفہ کی سماعت دنگ تھی
تیرے اک اک لفظ میں کیا بے تشدد جنگ تھی

○

منقبت

عباسؑ ہیں نظر میں ولا کا شباب ہے
سوتا ہوں جاگتا ہوں تصوّر ہے خواب ہے

مدّاح جس کا ہوں وہ جلالت مآب ہے
دیکھوں تو کون کون مرا ہمرکاب ہے

حاصل ہے جس کو مدح کی منزل میں دستِ غیب
اس کے ثناگروں میں وہی کامیاب ہے

میں ہوں اس اجتہاد کی مسند پر جلوہ گر
میرے مقلدوں میں ہر ایک انتخاب ہے

ہم بزم میگساروں سے الجھے نہ ہم کبھی
سلجھاتی ہے دماغ یہ ایسی شراب ہے

پہنچے کوئی ضرر بھی جو اپنوں کے ہاتھ سے
ہم وہ ہیں انتقام سے بھی اجتناب ہے

تابِ سخن بھی قوتِ بازو بھی ہے مگر
یہ صبر و ضبط بہرِ حصولِ ثواب ہے

غیروں کا مسئلہ ہو تو وہ اور بات ہے
لیکن مصالحت بھی شریکِ نصاب ہے

اے دوست اہلِ بیتؑ کے اسوہ پر کر نظر
حاصل اگر تجھے شرفِ انتساب ہے

تقلیدِ اہلِ بیتؑ عمل میں نہ کی اگر
پھر مدح کا صلہ بھی خیال اور خواب ہے

عالم میں کربلا کے مجاہد ہیں انتخاب
عباسؑ ان مجاہدوں میں انتخاب ہے

آساں نہیں ہے اس کی جلالت پہ تبصرہ
دل کو مقامِ مدح میں بھی اضطراب ہے

نسبت سے اس کی فضل و شرف کو ملا وجود
قسمت ہے ان کی اس سے جسے انتساب ہے

اس کی نظر میں ساحل و میدان بے بساط
دریا بھی اس کے سامنے چشمِ پُر آب ہے

صورت کی شان یہ ہے کہ یوسفؑ ہیں دم بخود
سیرت کا حسن جان و دلِ بوترابؑ ہے

آنکھیں نبوت اور امامت کی ہیں نقیب
پیشانیٔ بلند خدا کی کتاب ہے

کیا اس کی معرفت کا ہے عالم نہ پوچھیے
سوچا تو صبحِ نور ہے دیکھا تو خواب ہے

تو فاتحِ فرات ہے عباسِ ذی شرف
کس کو ہُوا نصیب جو تیرا خطاب ہے

اس کی ولا میں حجم عرض ہے کہ ہے خلوص
در پیش ابھی یہ مرحلہ احتساب ہے

○

طرحِ نو

تو لا آج کیوں ہنگامہ زا ہنگامہ پرور ہے
یہ کس وحشی کی آمد سے درِ زنداں پہ محشر ہے

یہ کس نے بابِ زنداں کو بنایا بابِ آزادی
وہ زنداں کی تمنا میں ہے جو زنداں سے باہر ہے

یہ کس نے تشنگیِ غم کا آئینِ کہن بدلا
نیا اقدام کس کا مسلکِ ہر قلب مضطر ہے

یہ کس نے اپنا فرمانِ اسیری خود کیا جاری
یہ کس کو عشق کے پندار کی دولت میسر ہے

یہ کس خوددار نے گھر سے نکل کر موت کو ٹوکا
یہ آساں زندگی بے مدعا دل کس کو دوبھر ہے

قفس یہ کس نے ڈھونڈا ہے اودھ کی راجدھانی میں
کوئی نغموں کا متوالا کوئی بانکا سخنور ہے

سپاہی وضع رند اور مردِ میدانِ عمل شاعر
یہ کون اس دور آخر میں فروقی کی جگہ پر ہے

قلم شعلے اگلتا ہے خدا محفوظ ہی رکھے
محبت نے لیا ہے امتحاں آپے سے باہر ہے

مہ و خورشید سے اونچی کلاہِ فخر ہے جس کی
وہ کیا جانے کہ محبس کی زمیں پر یا فلک پر ہے

نظر کی زد سے موجوداتِ عالم ہٹ گئے ہوں گے
نظر کی مسکراہٹ میں کوئی دنیائے دیگر ہے

تخیل عالمِ ارض و سما سے بڑھ گیا ہوگا
کہ آخر شاعرِ فطرت ہے فطرت کا پیمبر ہے

وہ زنداں ہی سہی اپنی زمیں ہے اپنا بستر ہے
وطن کی خاک پر تکیہ وطن کی خاک پر سر ہے

زہے تقدیر پہنایا ہے زیور ہم صفیروں نے
نہ ہتکڑیوں میں کس ہے اور نہ زنجیروں میں لنگر ہے

عجب کیا بار ہو جاتی اسیری غیر ہاتھوں سے
بہت دلکش نمودِ اختیارِ بندہ پرور ہے

درِ دولت سے کتنا فاصلہ ہے بابِ زنداں کا
خدا آباد رکھے ایک ہی گھر ایک ہی در ہے

ہمیں وہ پیکرِ تصویر سمجھے یہ نہ سمجھے تھے
خموشی کے بھی کچھ معنی ہیں جب تک حد کے اندر ہے

چمن میں ہیں تو کانٹوں پر بھی نیند آجائے گی شاید
بہر صورت بہر پہلو وطن آغوشِ مادر ہے

یہ مانا آج ہم قیدی ہیں وہ آزاد ہیں لیکن
دلوں کو وزن کر لیں ذوقِ آزادی برابر ہے

معاذ اللہ کیا کیا ناز تھے گھر کی حکومت پر
حکومت پا کے ہم سمجھے حکومت کا جدا گھر ہے

ہماری خاک پر سو بار بنیادِ چمن رکھ دیں
اُصولاً بل ہی جائے گا جو پھل جائے مقدر ہے

مٹا کر ہم کو باقی کوئی رہ جائے تو ہم خوش ہیں
چلو ذروں سے پوچھ آئیں ہمالہ کس کے بل پر ہے

ولادت اس کی برحق ہے ظہور اس کا مقرر ہے
کہ اس کی ذات سے دنیا کا مستقبل مقدر ہے

یہ شانِ ورثہ داری کس کو عالم میں میسر ہے
نظر کرار کی زہراؑ کا دل ذہنِ پیمبرؐ ہے

براہ راست ہے ہر سلسلہ ذہنی لطافت کا
امامت اس کا منصب ہے رسالت اس کا جوہر ہے

ذرا آنے تو دو قبضہ تک اس کے دستِ قدرت کو
ابھی تو اس کا تکیہ ذوالفقارِ حیدریؑ پر ہے

مزاج اپنا بدل دے گا لپٹ کر اس کے قدموں سے
زمانہ وہ زمانہ جو بدل جانے کا خوگر ہے

بڑی زحمت اٹھائی ہے ترے اجداد نے مولاؑ
خدا رکھے ترا آرام لینا کس کو دوبھر ہے

کسی کا انتظار اس دورِ ہستی نے نہیں دیکھا
حکومت میں تری کس زندگی کا رازمضمر ہے

پسِ پردہ بھی سب ہیں متفق تیری سیادت پر
ہر اک ملت میں تیرا نام باعنوان دیگر ہے

دلِ خیبر شکن توفیق دے خیبر کشائی کی
کہ اب ہر اک قدم پر زندگی میدانِ خیبر ہے

اسی عزت کے لگ بھگ شان کے پہلو بہ پہلو ہو
خوشا قسمت اگر انجام وضع کربلا پر ہے

یہ دنیا آزمایش کررہی ہے نوجوانوں کی
یہاں عاشور کے دن کا سبق بچوں کو ازبر ہے

بہت ہیں مرنے والے مر کے جینا چاہنے والے
ابھی غمخواری اکبرؑ پرستاری اصغرؑ ہے

اسی مٹی سے پھر انگڑائی لے کر قوم اٹھے گی
بگڑ جانا غلامِ خلق بن جانے سے بہتر ہے

○

ہمہمہ

زمانہ جنگ کا ہے مسئلہ زور آزمائی کا
مئے لاسیف سے بھرتا ہوں ساغر لافتائی کا

کہاں تک شقشقہ یکسر لہو کا گھونٹ ہے واعظ
خدارا چھیڑ دے اک ہمہمہ کشور کشائی کا

تغزل زیرِ رخصت زمزمہ برخواست محفل سے
سبق ہے میکشوں میں زور بازو کا کلائی کا

ابلتی ہے شرابِ زندگی جذبے ابھرتے ہیں
تہوّر سے بدلتا ہوں تکلف خوشنوائی کا

نکل آیا جو میخانہ سے تقوا کی سپر لے کر
کسی کے وار کو موقع نہ دوں گا خود نمائی کا

منقبت

آیا مری زباں پہ جب مدح کا ترانہ
روحی فداک کہہ کر چپ رہ گیا زمانہ

میرے نصیب میں تھا مطلع یہ عارفانہ
مصرع ہیں مدح کے دو یا عید کا دوگانہ

میری زباں پہ اس کی مدحت کا ہے ترانہ
جس کو لسانِ قدرت کہتا ہے ہر زمانہ

گزرے مَلک بھی میرے باغِ سخن کی حد سے
ممکن ہے اک نظر بھی ڈالی ہو طائرانہ

جس کو خدا بہت سے انسان کہہ رہے ہوں
کیا اس کی مدح میں ہو گنجایشِ فسانہ

جو خارجی ہیں وہ ہیں خارج از آدمیت
اس کے محبّ ہیں ورنہ بیگانہ و یگانہ

عیدِ صیام کیا ہے کیا عیدِ ماہ قرباں
اس عید پہ تصدق ہر عید ہر زمانہ

اس عید نے بنایا سرمایۂ حقیقت
یہ عید گر نہ ہوتی اسلام تھا فسانہ

وہ کون سو رہا تھا خیبر کو فتح کرتا
ہوتی یمن میں کس کی تقریر عالمانہ

بعدِ نبیؐ خلافت ہر رُخ سے ہے علیؑ کی
کس نے لگادیا یہ غیروں کا ساخسانہ

دام و درم سے اپنے علم وعمل سے اپنے
مولاؑ نے بھر دیا ہے اسلام کا خزانہ

دنیا میں بات رکھ لی اسلام کی علیؑ نے
گزرا ہے اے مسلماں ہر دور ظالمانہ

اک وار کی بھی حد تک اس نے پہل نہیں کی
جنگیں بہت لڑی ہیں لیکن مدافعانہ

جب بھی اسی کے سب سے بڑھ کر رہے فضائل
جب کھل گیا حدیثیں ڈھلنے کا کارخانہ

تسلیم کررہے ہیں ہم اس کی حکمرانی
تا حشر جس کا پوتا ہے صاحبِ زمانہ

مدحت نہ کی علیؑ کی گر آخری نفس تک
یہ مرگِ شاعری ہے اور خبطِ شاعرانہ

یہ فتح یا بیاں تھیں سب اس کے دم قدم سے
رکھ دو کسی کے سر پر اب تاجِ فاتحانہ

چوتھا خلیفہ اس کو کہدوں خدا نہ کہدوں
اس سے کہیں ہے بہتر یہ مدحِ کافرانہ

ہر شجرۂ تصوّف اس تک پہنچ رہا ہے
لیکن کہی کسی نے یہ بات منصفانہ

مجرم ہوں میں غلو کا قصراُن کو ہو مبارک
ہے دینِ شیخ صاحب اب درسِ ناصحانہ

مدحت کو اس کے آگے میری زباں نہ کھلتی
قسمت سے کر رہا ہوں توصیفِ غائبانہ

ہر اک صفت پہ اس کی دل بولتا ہے میرا
وہ اور ہوں گے جن کا مسلک ہے راویانہ

ہندی سہی مگر ہوں مولا کے در کا شاعر
عرفی سے ہو رہی ہے چشمک معاصرانہ

میں مدح کر رہا ہوں بے فکر اجر و اجرت
کس کو نصیب ہے یہ اندازِ شاعرانہ

ہاں اے سفیرِ فطرت بن جائے نظم میری
ایمان کا وظیفہ اسلام کا ترانہ

کہنے کی بات کہہ دوں بگڑے کوئی تو بگڑے
مجھ کو نہیں گوارا توصیف تاجرانہ

جب حق کا مسئلہ ہو ڈرتا نہیں کسی سے
ورنہ میری روش ہے اکثر مصالحانہ

جو درد کا ہے مالک اس کی پناہ میں ہوں
مجھ کو مٹائے گی کیا بے دردیِ زمانہ

جنت کی نکہتوں نے جادے بنا دیے ہیں
ہے اس کے مدح گو کا پھولوں میں آشیانہ

اونچا کر اور اونچا یہ منقبت کا پرچم
مائل بہ سرکشی ہے کچھ روز سے زمانہ

اعدا کی سرزنش کو دے وہ قلم میں قوت
جو موسوی عصا کا زندہ کرے فسانہ

میری خصوصیت ہے تخلیق وضع نو کی
اوروں کو ہو مبارک انداز عامیانہ

یوں ہے رواں ولا میں میرا قلم خراماں
جیسے کسی حسیں کی رفتارِ والہانہ

ہوتی ہے بار اکثر حق بات سامعہ پر
کہہ دیجیے قصیدہ ہے یہ مناظرانہ

○

منقبت

حُسنِ حسنؑ کی مدح میں گزرے اگر حیات
ہر روز روزِ عید ہو ہر شب شبِ برات

پیغامِ صلح پر جو کیا اس نے التفات
کتنی بلند ہوگئی انسانیت کی بات

تا حشر احترام کریں گے خدا پرست
بخشا ہے اس نے سلح کو وہ خلعتِ حیات

پاکیزگی روح بعید از تصورات
پیکر کے اعتبار سے روحِ جمالیات

حق ناشناس کے لیے اک زہر ہے یہ بات
اس گھر کے اعتبار سے قائم ہے کائنات

عشرہ کے دن بھی صبر کیا یہ ہے اور بات
ورنہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں تقدیرِ کائنات

جھوٹی روایتوں کا ہے یوں سامعہ پہ ہات
کانوں سے ان کے دور ہی رہتی ہے حق کی بات

اس بزمِ عطر بیز میں کیا ان کے نام لوں
بُو دیتے ہیں فساد کی جن کے تصورات

تیرہ سو سال سے ہے سِوا فاصلہ مگر
اژدر کی طرح رینگ کے پہنچی ہے ان کی بات

ملتے ہیں ایسے آج بھی ملّائے کم سواد
جن کے خلافِ آلِ پیمبرؐ ہیں درسیات

جن کی بغل میں ایسی کتابیں ہیں شرم سار
ہے علم پہ عذابِ خدا جن کا التفات

خامہ لرزتا ہے کوئی آیت لکھیں اگر
قرآن کانپتا ہے لگاتے ہیں جب یہ ہات

مولاؑ کے دشمنوں کی صفائی کے ہیں گواہ
ان کی زباں سے تنگ ہے الفاظ کی حیات

روزہ نے بھول کر بھی لگایا نہ ان کو منہ
فاقہ کے بھی ہوئے نہ میسّر توجہات

ان کی نماز رسم ہے ان کی دعا ہوس
ہوں دشمنِ حسینؑ سے جن کو توقعات

الفت معاویہ سے عقیدت یزید سے
جیسے یہی تھے دینِ خدا کے مطالبات

آبِ وضو کو ان سے تنفر ہے اس قدر
بے زار جیسے لشکرِ اشرار سے فرات

دشمن کا اہلبیتؑ کے آتا ہے جب خیال
جی چاہتا ہے چھوڑ دوں لفظی تکلفات

خود روک دیتی ہے مجھے تہذیبِ اہلبیتؑ
رہ جاتا ہے تڑپ کے ہجومِ تاثرات

اسلام کو مٹائے گا بوجہل وقت کیا
مدحِ حسنؑ ہے ملتِ اسلام کی حیات

بھرتا ہے دم حسینؑ کا زورِ یداللہی
خلقِ پیمبریؐ کو حسنؑ سے ملا ثبات

ایسے حسینؑ کا نام نہ کیوں کر حسینؑ ہو
جو کائناتِ حُسن ہے جو حُسنِ کائنات

ماحولِ ظلم و جور میں تکمیلِ صبر سے
پورے کیے ہیں دینِ خدا کے توقعات

اس قوم نے دیا ہے ہمیں کربلا کا غم
تیرے کرم سے جس کو دوبارہ ملی حیات

میں سوچتا ہوں عرض ہی کردوں حضورؑ میں
دل سے تڑپ کے آہی گئی جب لبوں پہ بات

مولا ترے کرم کا یہ مصرف نہ ہو کہیں
مل جائے نار سے نہ عدو کو ترے نجات

مردانِ حق پسند میں کیا اس کا تذکرہ
اوڑھے ڈوپٹہ پھرتا ہے جو مردِ بدصفات

اپنے خیال خام میں اسلام کی سپر
اسلام کی نظر میں اسیرِ توہمات

جس سے اویسؔ وبوذرؓ وسلماںؓ تھے جرعہ کش
اب بھی کھلا ہوا ہے وہ میخانۂ صفات

اسلام جب دورا ہے پہ تھا صلح و جنگ کے
ٹھہری تھی اس کے فیصلہ پہ امرِ حق کی بات

دونوں نواسے پشت پہ سجدے میں تھے رسولؐ
کیا یہ بھی ہیں عبادتِ حق کے لوازمات

ہر اک بشر کو اس کی محبت نہیں نصیب
اہلِ ولا کے ساتھ ہے اہلِ ولا کی بات

فردوسِ اہل دل ہے مودّت کی زندگی
اس زندگی میں دن ہے نہ اس زندگی میں رات

ہم مجرم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

○

قصیدہ

حمد کی تحریک ہے جس میں وہ منظر دیکھئے
حُسنِ اکبرؑ مصرفِ اللہ اکبر دیکھئے

نورِ خالق ہے تصور میں وہ آسکتا نہیں
ہو تصوّر پر جو تابو زندگی بھر دیکھئے

شبّرؑ وشبیرؑ مل کر ہیں پیمبرؐ کی شبیہ
یہ مگر تنہا ہیں تصویرِ پیمبرؐ دیکھئے

بیچ میں معراج کی شب کا سا پردہ بھی نہیں
کس قدر اللہ سے ہے قربِ اکبر دیکھئے

ملتی جلتی ہے ذرا تشبیہ کامل تو نہیں
زلف و رُخ میں صبحِ خلدو شامِ کوثر دیکھئے

صوتِ اکبرؑ لحنِ پیمبرؐ کا ارکانِ اذاں
مجملاً بھی ذکر ہے کیا روح پرور دیکھئے

تاقیامت ایک حل ہے حسرتِ دیدار کا
مدح کے لفظوں میں جذباتِ ثنا گر دیکھئے

جنگ سے کتنا اہم تھا اذنِ میداں کا سوال
کرلیا اُس شیر نے یہ معرکہ سر دیکھئے

رائے صائب ہے یہی وصف دیانت ہو اگر
سارے مداحوں کو اس منزل میں یکسر دیکھئے

سب برابر ہیں یہاں چھوٹا بڑا کوئی نہیں
اتباعِ سیرتِ آلِ پیمبرؐ دیکھئے

مدحتِ آلِ نبیؐ ہی ہے نمودِ شاعری
غور سے معیارِ افکارِ سخن ور دیکھئے

کربلا کا واقعہ ہے درد افزائے غزل
درد ہے اردو ادب کا خاص جوہر دیکھئے

نازشِ آئینِ فطرت کیوں نہ ہو ان کا وجود
کس قدر احسان ہیں انسانیت پر دیکھئے

اک مسلسل مسئلہ ہے اس کی مدحت کی شراب
خلقتِ اوّل سے اب تک دورِ ساغر دیکھئے

کوئی موقع جاں نثاری کا جو آجائے کبھی
یہ بڑی خوش قسمتی ہے جان دے کر دیکھئے

سر بہ سجدہ خامہ دل بے تاب لرزش ہاتھ میں
مدح کے میدان میں عجزِ سخنور دیکھئے

○

منقبت

داستاں اصغرؑ کی ہے تفسیرِ قرآنِ کریم
اس کی انگلی کا اشارہ ہے صراطِ مستقیم

باپ کے ہاتھوں پہ اس کی سربلندی تھی عظیم
اب مزا دیتا نہیں افسانۂ طور و کلیم

سب سے کم سن تھا یہی مردِ صراطِ مستقیم
کیا عجب اصغرؑ اگر ہو معنیٔ ذبحِ عظیم

جذبۂ درد محبت پہ ہے احسانِ عظیم
دل کسی کا ہو اگر اس کی محبت میں دونیم

چھ مہینہ میں علی اصغرؑ کی قدرت دیکھنا
بن گئی گہوارے سے میداں تک اک مردِ عظیم

کیا ہاتھوں ہاتھ پہنچا جنگ کے میدان میں
پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی اس کے راہِ مستقیم

مجھ کو حاصل ہے یہ اصغرؑ کی ثنا میں امتیاز
مری اک اک سانس ہے فردوس کی موجِ نسیم

روکنے کا قصد ماں نے اور نہ بہنوں نے کیا
اللہ اللہ کس قدر اصغرؑ کا تھا عزمِ صمیم

درد کی دنیا ابد تک لا نہیں سکتی مثال
اک تبسم کر گیا ہے اس کا وہ کارِ عظیم

ہمتیں اس نے بڑھا دیں صاحبانِ عزم کی
اس کے صدقے میں ہوئے ہیں سینکڑوں کارِ عظیم

جان دے کر ذہنِ انسانی کو روشن کر دیا
اے شہید ابن شہید اور اے کریم ابن کریم

جسم میں تائل نہیں ہوں انکسار و عجز کا
میں ہوں سلطانِ سخن اور فکرِ برحق ہے ندیم

○

منقبت

کیا پوچھتے ہو شان علیؑ کے فقیر کی
میرے لیے کھلی ہوئی مئے ہے غدیر کی

دل پر مرے نظر ہے صغیر و کبیر کی
اس خُم میں بھی شراب بھری ہے غدیر کی

زاہد کے لب پہ جنت و کوثر کا ہے سبق
میں اس سے بات پوچھ رہا ہوں غدیر کی

آئے فرشتے عرش سے تسبیح چھوڑ کر
کیا بات سیدہؑ تری نانِ شعیر کی

ہے کون دستگیر یداللہ کے سوا
دستِ خدا ہے شان مرے دستگیر کی

چاہو جسے امیر بنالو برائے نام
آئی نہیں ہے بات جنابِ امیرؑ کی

اہلِ عزا سے آنکھ پھرائیں گے کیوں علیؑ
جاؤں گا نذر لے کے غمِ دل پذیر کی

کیا ذکرِ خلد کا یہ نہ سونگھیں گے بوئے خلد
کہہ دو منافقوں سے دعا ہے فقیر کی

یاں کون سی کمی ہے نصیری کو کیا کہیں
واعظ کسے خبر ہے کسی کے ضمیر کی

پڑھتا ہوں میں نمازِ ولا جس پہ رات دن
منزل ہے آسماں سے بلند اس حصیر کی

○

قصیدہ

زبانِ کلک سے آواز بسم اللہ کی آئے
سخن کے شہپروں سے جب صدائے یا علی آئے

بہ فیضِ مدحِ حُسن و عشق کی صورت گری آئے
شعورِ فکر کے چہرے پہ نور آگہی آئے

ضعیفی کا زمانہ ہے شبابِ شاعری آئے
مری ہر بیت میں یارب جمالِ یوسفی آئے

کرم سے اس کے ہوں سرمایہ دار اس کی تولا کا
جگہ اتنی کہاں جو میرے گھر میں مفلسی آئے

ادب سے ہو نشستِ الفاظ کی قرطاس مدحت پر
مضامیں لے کے دامن میں مری شائستگی آئے

ہر اک تشدید بے گانہ مفہومِ تشدّد سے
حسینؑ کی مدح میں بھی رنگ صلح و آشتی آئے

علَم بردار ہوں توحید کے جتنے الف آئیں
رسالتؐ کا تصدق ذوقِ معنی پروری آئے

رہے نظروں کا مرکز بائے بسم اللہ کا نقطہ
امامت کے قدم چھوکر قلم کی رہبری آئے

میں شعری آیتوں میں روح بھرتا ہوں مودّت کی
وہ کیا جانیں جنہیں الفاظ کی صورت گری آئے

مقامِ نازِ ابراہیم جس کا خوان نعمت ہو
سخاوت نے دعا کی تھی کوئی ایسا سخی آئے

زہے قسمت جو دم بھر کو مرا سر ہو قدم ان کے
وہ سر ہے دردِ سر جس پر کلاہِ خسروی آئے

کہوں وہ فاطمہؑ کے لاڈلے کی مدح میں مطلع
کہ ہنستا کھیلتا مجھ تک غرورِ شاعری آئے

مشیت تھی خدا کی روشنی پر روشنی آئے
نبیؐ تو آچکے دنیا میں تصویرِ نبیؐ آئے

عجب کیا ہے محبت میں اگر دیوانہ ہو جاؤں
تعجب کیا قدم لینے اگر فرزانگی آئے

دمِ آخر مرے لب پر یہ حرفِ آخری آئے
حسینؑ کا نام لوں پھر موت آئے زندگی آئے

ذرا کردار کا بھی آئینہ ہمراہ لانا ہے
مقابل میں جو کوئی دیدنی نادیدنی آئے

صلوٰۃ و صوم سے جو کم سمجھتا ہو ولا ان کی
خدارا سامنے کوئی نہ ایسا اجنبی آئے

دو پارہ کل ہوا تھا آج سو ٹکڑے نہ ہو جائیں
جو ہمت ہو مقابل چودھویں کا چاند بھی آئے

وہ محرابِ حرم ابرو جلالت خیز پیشانی
نظر پڑتے ہی ہر اک دل میں ذوقِ بندگی آئے

وہ بالا تر ہے سب سے آدمی ہو یا فرشتہ ہو
فرشتہ جس کی خدمت کو بشکلِ آدمی آئے

نبیؐ مرکب بنے ہوں جن کی خاطر صحنِ مسجد میں
کسے اس ماہِ کامل سے خیالِ ہمسری آئے

چراغ طور ہو مدحت کی اک اک بیت میں روشن
وہ چاہے تو دلِ شاعر میں ایسی روشنی آئے

محبت ان کی مانگی جائے جب اجرِ رسالتؐ میں
تو دامن اپنا پھیلا کر نہ کیوں پیغمبری آئے

کوئی رتبہ سمجھ سکتا ہے کیا اس کی امامت کا
گلے جس کو لگانے کے لیے پیغمبری آئے

قرینہ سے پیمبرؐ کو بھی اس کی آرزو ہوگی
امامت کے فلک پر چاند نکلے چاندنی آئے

حسنؑ نے صلح کر کے آبروِ اسلام کی رکھ لی
جب آیا جنگ کا موقع حسینؑ ابنِ علیؑ آئے

حسنؑ کے دشمنوں کو یہ سزا ملنا ضروری ہے
بھرا ہو گھر میں سیم و زر تو دینی مفلسی آئے

مجھے تو مدح کے جادہ کی منزل تک پہنچنا ہے
خودی آئے مری تقدیم کو یا بے خودی آئے

بہارِ جاوداں ہر لفظ ہے اس مدحِ عظمیٰ کا
یہ ایسے گل نہیں جن پر پژمردگی آئے

مسلمانوں میں تھے اہلِ نظر بھی دیکھنے والے
کوئی بولا نبیؐ آئے کوئی بولا علیؑ آئے

ثناخواں ہوں گے بے گنتی جلوسِ حشر میں اس کے
خدایا اس سواری میں ہماری یاد بھی آئے

ہزاروں پھول کھل جائیں چمن زارِ عقیدت میں
نئی جنت بنے جب اس کے ہونٹوں پر ہنسی آئے

مخالف کج روی کے پھیر میں گم ہو گئے آخر
حسنؑ کی سمت جو آئے براہِ روشنی آئے

حسنؑ تو آ چکے اب حکمِ حق آنے ہی والا ہے
علیؑ کے گھر میں تصویرِ پیمبر دوسری آئے

زیارت ہو مرے مولاؑ کی مجھ کو موت سے پہلے
خدا ایسا کرے اک دن غرورِ زندگی آئے

اُسے تھا انتظار ایسے مقدس گھر میں آنے کا
جہاں جبریلؑ حاضر ہوں جہاں قرآن بھی آئے

زبانیں روک لیں اپنی لسان اللہ کے دشمن
مزاجِ دوست میں ایسا نہ ہو پھر برہمی آئے

اسی اک سلسلہ کے واسطے پر نظمِ قدرت ہے
امامت ظاہری آئے رسالت معنوی آئے

رہے اے حجمؔ کیوں خالی صدارت بزمِ مدحت کی
ہمارے بعد کوئی اور قسمت کا دھنی آئے

○

منقبت

چار دن بھی نہ ملا آلِ نبیؐ کو آرام
سال بھر ہم کو رُلاتی ہے حدیثِ اسلام

غم ہی ہر دور میں ساتھی ہے علیؑ والوں کا
کبھی آجاتا ہے قسمت سے خوشی کا بھی پیام

اُم کلثومؑ کی تاریخ ولادت ہے آج
آج کا دن ہے محبوں پہ خدا کا انعام

دوسری ثانی زہراؑ ہے بہ اوصافِ تمام
اُم کلثومؑ پہ واجب ہے درود اور سلام

○

عروس الکلام

تم تو ہوتے ہی نہ تھے آنکھ سے میری اوجھل
پھر مجھے دردِ جدائی سے کیا کیوں بیکل

تم کبھی تھے میرے کاشانۂ دل کی زینت
تم سے آباد جو تھا اب ہے وہ اُجڑا سا محل

قصرِ کسریٰ تمہیں عاشق کا سیہ خانہ تھا
بوریے کو میرے سمجھا کئے فرشِ مخمل

بزمِ جم سے بھی سوا تھی میری محفل کی بہار
تم تھے پہلو میں تو جنگل میں تھا مجھ کو منگل

مجھ کو یاد آتی ہیں رہ رہ کے پیاری باتیں
شوخیاں تھیں جو قیامت تو غضب تھی چھل بل

بے حجابانہ دکھایا کبھی روئے روشن
اور شرما کے کبھی لے لیا منہ پر آنچل

میری سوتی ہوئی تقدیر جگانے کے لئے
کبھی خلوت میں چلے آئے پہن کر چھاگل

اللہ اللہ کہ پہلے تھی وہ شورا شوری
اب یہ ہے بےُمکی زیست میں جس سے ہے خلل

آج بھولے سے بتاؤ تو کدھر آنکلے
وہ بہانے گئے کس سمت کدھر لیت ولعل

آج کیا اپنے تغافل سے پشیمان ہوئے
آج کیوں آئے ہو ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

کس ادا سے یہ کہا اُس نے چڑھا کر تیوری
ہم کو بھاتی نہیں اک آنکھ یہ باتیں مہمل

جب سنے تجھ سے تو شکوہ کے شکایت کے کلام
نہ قصیدہ نہ رباعی نہ مخمس نہ غزل

بات سن غور سے اب چھوڑ بس ان قصّوں کو
لازم انسان کو ہے دنیا میں کرے نیک عمل

عہدِ طفلی سے فن شعر کا ہے شوق تجھے
اور سمجھتا ہے کہ میں ہوں شعرا میں اکمل

تیری غفلت کی قسم کھایئے سچ ہے یہ اگر
ہے کہاں ہوش بھی ہے کچھ تجھے گمنامِ ازل

عرش سے فرش تک اس جشنِ مبارک کی ہے دھوم
آج کعبہ میں ہے میلادِ امامِ اول

سُن کے یہ مدحتِ مولیٰ کی ہوا چلنے لگی
مطلع صاف میں مضمون کے اُمڈے بادل

مدح ہے شیرِ خدا کی مجھے لکھنی منظور
اے قلم ہوش میں آ، ہوش میں آ ہاتھ سنبھل

کعبتہ اللہ میں اصنام گرے منہ کے بھل
بُت شکن آیا پڑی لات و ہبل میں ہلچل

منبرِ عرش عُلا تختِ امامِ اوّل
باغِ فردوسِ بریں چرخِ نہم شیش محل

خدمتِ نخلِ امامت سے یہ حاصل ہوا پھل
شاخِ طوبیٰ پہ بنا طائرِ سدرہ کا محل

اصل جس نخل کی ہے خاص خدا کے گھر میں
بارامامت کا اٹھائے ہوئے کوپل کوپل

وہ سلیمانؑ ہیں ہے یہ ابر بنا جن کی بساط
خیمہ ہے، چرخِ بریں آپ کا دَل بادل

وہ بہادر یہ دلاور ہے کہ جس کے آگے
جرأت رستم و بہمن کے فسانے ہیں زٹل

ہے اس کے لیے اتممت علیکم آیا
دین اُسی کی تو نیابت سے ہوا ہے اکمل

ایسا عالم کہ پڑھا علم نے جس کا کلمہ
ایسا استاد کہ شاگرد ہے عقلِ اوّل

جس سے بیعت کی امامت نے بھی خود ایسا امام
جس کی امداد کا محتاج رہا ہر مرسل

قاتلِ مرحب و غارت گر کفر و الحاد
اشجع ملکِ عرب فاتح صفین و جمل

ایسے دشمن ہوئے حضرت کے سب کہ روزِ غدیر
دیکھ کر نورِ بغل ہوگئے منہ زیر بغل

کون اس رتبہ کا ہے بعدِ رسولؐ الثقلین
جس کا ایک وار عبادت سے جہاں کی افضل

ہے اسی طرح ثلاثہ پہ علیؑ کی تفضیل
جس طرح تینوں کتابوں سے ہے قرآں افضل

اب کوئی مدحتِ حاضر میں رقم کر مطلع
کان میں آکے یہ فرما گئے عقلِ اوّل

ساقیا آج پلانے میں نہ کر لیت ولعل
کعبہ سے اُٹھ کے وہ میخانہ پہ جھومے بادل

آج میخوار کو میخانہ کی کنجی مل جائے
آج دیدے مرے قبضہ میں صراحی بوتل

ترے الطاف کا اے ابرِ کرم ہوں پیاسا
موج ایسی کبھی آجائے کہ بھر دے بلتھل

ہے یہ منظور فلک تک ترا شہرہ پہنچے
آج بھر جائے ثریا کی بھی خالی بوتل

آج زاہد کی بھی کچھ بدلی ہوئی ہے نیّت
آج بچ کر نہ نکل جائے یہ نا کام ازل

ہو نہ ہو جام میں پابند تکلّف ہی نہیں
ہو اگر حکم ترا منہ سے لگالوں بوتل

نشہ ہوجائے تو اس شان کا مطلع لکھوں
ہو گماں سب کو کہ ہے نادِ علی کی ہیکل

اے نصیری کے خدا عبدِ خداوندِ ابل
مظہرِ آیتِ حق نفسِ نبیؐ مرسل

دیکھ لیں تیرے فقیروں کو اگر اہلِ دول
بیچ دیں فقر کے بدلے میں امارت کے محل

تو ہی مختار ہے دوزخ کا تو ہی جنت کا
تیری عقبیٰ میں حکومت ترا دنیا میں عمل

آنکھ کھولی تو محمدؐ سے ہوئیں چار آنکھیں
نور خالق کا بنا آنکھ کا تیری کابل

ماہ ہے چاندنی کا پھول ترے گلشن میں
مہر روشن ہے تری بزم کا ادنیٰ سا کنول

بہرہ ور ہوتی نہ اخلاق و ادب سے دنیا
جلوہ افروز نہ ہوتا جو ترا حُسنِ عمل

ہے یہ فیضِ قدمِ پاک سے زوروں پہ بہار
طعنہ زن خلد پہ ہوتا ہے نجف کا جنگل

تیرے انصاف کی دنیا میں نہ چلتی جو ہوا
قصۂ باز و کبوتر بھی نہ ہوتا فیصل

راہ بھولے ترا زائر جو اندھیرے کے سبب
ساتھ ہو مہرِ فلک شب کو جلا کر مشعل

تیری اُلفت میں جو ہوجائے بشر دیوانہ
اُس پہ سو جان سے قربان ہو عقلِ اوّل

تیری زلفوں کی سیاہی شبِ معراجِ رسولؐ
تیرے چہرے کی ضیا نورِ خداوندِ ابل

مجرم ہے اک ترا ادنیٰ سا گدا یا مولاؑ
ہے غنی دولتِ ایماں سے ہے یہ عید اقل

اہلِ دنیا کو نہ لایا کبھی میں خاطر میں
کبھی بھولے سے نہ کی مدحت ارباب دول

فیض آباد میں لے آیا ہے شوقِ مدحت
نظرِ لطف رہے بہر خداوندِ ابل

شرم خادم کی سخن فہموں کے آگے رہ جائے
چار پشتوں سے ہے مدّاح یہ گمنامِ ازل

○

چودھویں کا چاند

ہوئی مصروفِ راحت لیلیِ شب لے کے انگڑائی
خدیو ماہ ہارا شاہِ مشرق نے ظفر پائی

دکھائی صبحِ صادق نے جو اپنی شکل نورانی
صبا کچھ سامرہ سے آج اتراتی ہوئی آئی

نہیں ہیں بے سبب بے وجہ یہ اٹھکھیلیاں اس کی
غدیرِ خم کے رندوں کے لیے مژدہ کوئی لائی

عجب مژدہ ہے گوشِ ہوش سے اے سننے والے سُن
حقیقت کی نظر سے دیکھ او چشمِ تماشائی

جنابِ مہدیِ دیں کا زمانہ میں قدم آیا
اُٹھیں تعظیم کی خاطر جو ہیں حضرت کے شیدائی

یہ وقتِ عیش ہے اے جحم پڑھ وہ دھوم کا مطلع
کہ جس کو سُن کے بھولیں لن ترانی اپنی سوسائی

زمانہ میں جو نورِ حق کے آنے کی خبر پائی
کلیم اللہ نے جلوہ سے پہلے آنکھ جھپکائی

وہ آئے جن کا آنا تھا مناسب باغِ عالم میں
وہ آئے جن کے آنے سے زمانہ میں بہار آئی

نہیں آسان صورت دیکھ لینا چھپنے والوں کی
کسی کا جذبِ الفت ہے کسی کی جلوہ آرائی

مرے اُستاد زادے آئے یہ روح الامیں بولے
ہمارے مقتدا آئے یہ عیسیٰ کی صدا آئی

شجاعت نے کہا فخرِ شجاعانِ جہاں آیا
سخاوت نے کہا اب چیز کیا ہے حاتمِ طائی

صدا یہ علم نے دی عالمِ علم نبیؐ آیا
صدا یہ حلم نے دی میں نے ان سے منزلت پائی

کہا یہ خضر نے خضرِ طریقت ہے یہی میرا
زمانہ کو تو میں نے اس نے مجھ کو راہ دکھلائی

کہا اعجاز نے اک اس کی ٹھوکر نے تو اتمِ عیسیٰ
برابر ہو نہیں سکتے جو دکھلائے مسیحائی

کہا فتح وظفر نے فتح کر لے گا یہ عالم کو
قیامت آئے گی اس شیر نے جب کی صف آرائی

کہا وحدت نے ہمسر کون ہے اس کا زمانہ میں
اسی بندہ سے ظاہر ہے خدا کی شانِ یکتائی

کہا انصاف نے نوشیرواں کو کیا لیاقت تھی
اسی کے فیض سے میں نے جہاں میں آبرو پائی

کہا یوسفؑ نے سرتاجِ حسینانِ جہاں یہ ہے
تصدّق ہے اسی کا میری رعنائی و زیبائی

جب ان کا عہد آیا پاؤں پھر کیا کفر کے جمتے
ہٹا تھرّ اکے پیچھے رعب نے جب آنکھ دکھلائی

قدم جب آکے چومے فتح و نصرت نے بہادر کے
تو خود اقبال نے اقبال کی اس کے قسم کھائی

فلک پر خوف سے خورشید تھراتا ہوا نکلا — جلالت دیکھ کر چکر میں آیا چرخِ مینائی
مشابہ دستِ حق سے ہاتھ دیکھا جب کہ حضرت کا — تڑپ کر تیغِ حیدرؑ میان سے باہر نکل آئی
فلک سے بھی اُدھر آوازۂ صلِ علیٰ پہنچے — تولّا کچھ حقیقت میں اگر ہے او تولّائی
خوشی سے جمِ شیعوں کو مبارکباد دیتا ہے — حضورِ شاہ میں پھر عرض کرتا ہے یہ شیدائی
اُڑیں گی اب کہاں تک دھجیاں حبیب وگریباں کی — کہاں تک مشغلے ڈھونڈھا کریں گے روز سودائی
کہاں تک ضبط اب صبر وتحمل ہو نہیں سکتا — تمنّا ہی تمنّا میں رہیں گے کیا تمنّائی

کہیں ایسا نہ ہو مشتاق آنکھیں بند ہو جائیں
اُٹھا دے اب حجابِ نور او محوِ خود آرائی

○

زمزمہ

پھر بہار آئی ہے ساقی لا چھلکتے جام دے — کب سے کرتا ہے طلب یہ رندِ مے آشام دے
آج مجھ کو کچھ نہیں اندیشۂ انجام دے — ہاں نہ کر اب پیش وپس لیکر خدا کا نام دے

کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو فتح

آج ہر مومن کے چہرہ سے مسرت ہے عیاں — آج آپس میں گلے ملتے ہیں سب پیر وجواں
آسماں پر آج ہیں سارے فرشتے شادماں — آج دنیا میں نظر آتا ہے جنت کا سماں

کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو فتح

آج بھائی کو کیا اپنا نبیؐ نے جانشیں ہوگئے حکم خدا سے حاکمِ دنیا ودیں
دوست ہیں سب شادوخرم ہل رہے ہیں اہلِ کیں پھر گئی ان کی دوہائی آسماں سے تا زمیں
کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

آج اپنا جوش دکھلادے مری طبعِ رواں کھینچ دے تصویرِ محفل تا کہ سب ہوں شادماں
سب کو آجائیں نظر منبر پہ شاہِ انس و جاں لوگ بول اُٹھیں کہ کہتے ہیں اسے جادو بیاں
کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

ہوگئے منبر پہ لو فخرِ دو عالم جلوہ گر وہ اُٹھایا آپ نے بھائی کا بازو تھام کر
وقتِ خاموشی نہیں اے عاشقانِ پُر جگر گونج جائے نعرۂ صلوٰۃ سے ہر دشت ودر
کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

لو وہ حضرت کی سپیدیِ بغل ظاہر ہوئی آگئی آواز کانوں میں رسولؐ اللہ کی
لو نبیؐ نے کردیا حیدرؑ کو آج اپنا وصی لووہ سن لونوبتِ من کنت مولیٰ بج گئی
کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

لو صدائیں وہ مبارکباد کی آنے لگیں لو وہ آوازیں فلک سے جاکے ٹکرانے لگیں
نذر کو جنت سے حوریں کشتیاں لانے لگیں بلبلیں بھی یہ ترانہ باغ میں گانے لگیں
کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

آسماں نے اپنے سب اختر نچھاور کردیے پیشِ حضرت ہدیۂ دریا نے موتی دھردیے
شاعروں نے جب قصیدے نذر سرتا سر دیے شہؐ نے ایک ایک بیت پر جنت میں سوسو گھر دیے

کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

جز ائمہ یہ نہیں کرتا کسی کی بھی ثنا جھوم کر اپنا قصیدہ پڑھ رہا ہے برملا
حجم بھی لے گا مقرر اپنے آقا سے صِلا تم بھی ہاں اے اہلِ محفل جوش میں کہدو ذرا

کیوں نہ مصروفِ طرب ہوں عاشقانِ حیدرؑ
آج اُمت کی ملی شیرِ خدا کو انصری

○

منقبت

منصور ہوا تختِ خلافت پہ جو قابض کچھ اور بھی مضبوط ہوئی ظلم کی بنیاد
غیروں کی حکومت تھی مدینہ پہ نبیؐ کے اک گوشہ میں اولادِ پیمبرؐ بھی تھی آباد
اس شان سے سادات کا اک قافلہ نکلا تاریخ کے صفحات پہ لکھی گئی روداد
اونٹوں پہ مقید حسینِ پاک کے فرزند زنجیروں میں جکڑی ہوئی معصوم کی اولاد
زلفوں میں وہ نکہت کہ مدینہ کو نہ بھولی شکلوں کی یہ صورت کہ حسینوں کو رہیں یاد
سجدوں کی موالات سے پیشانیاں روشن روزوں کی مدارات سے لاغر تن ناشاد
قرآں کی تلاوت سے ہر اک لفظ میں تاثیر حق گوئی کی قوت سے اسیری میں بھی آزاد
کردار کے انداز کی چہروں پہ جلالت فطرت میں پیمبرؐ کی طرح حلمِ خدا داد
اخلاق کی تکمیل سے انسان مکمل اجداد کے اوصاف سے سرمایۂ اجداد
دینے اُنہیں تسکین چلے حضرتِ صادقؑ بے چین ہوئے سُن کے جو معصوم یہ روداد
فرماتے تھے انصار نے پورا نہ کیا عہد کیا قول پیمبرؐ کو دیا تھا نہ رہا یاد

یہ حال مدینہ میں ہو اولادِ نبیؐ کا
اور شہر میں موجود ہو انصار کی اولاد

مجبور قضا و قدر انسان ہے ورنہ
واللہ مرے دل میں بھی تھی حسرتِ امداد

یہ کہہ کے بڑھے عمِ مکرم کی طرف آپ
چاہا کوئی تسکین کا کلمہ کریں ارشاد

اک فوج کے سرہنگ نے معصوم کو روکا
سختی سے ہوا صرف سخن بانیِ بیداد

خاموش پھرا گھر کی طرف حجتِ خالق
ناشاد کو ظالم نے کیا اور بھی ناشاد

جنبش ہوئی اک بار اُدھر قہر خدا کو
کچھ دور گیا تھا نہ ابھی فوج کا جلاد

اک لمحہ میں بے جان ہوا اونٹ سے گر کر
با آلِ نبیؐ ہر کہ در افتاد بر افتاد

○

منقبت

محوِ طاعت تھے حضرتِ صادقؑ
ہو رہے تھے خدا سے راز و نیاز

تھی ضیا بار مسجدِ نبویؐ
حجتِ عصر پڑھ رہے تھے نماز

اک مسافر تھا خوابِ غفلت میں
صحنِ مسجد میں ایک سمت دراز

نیند سے یک بیک جو آنکھ کھلی
وہم تھا فہم میں خلل انداز

شک ہوا یہ کہ میرا زادِ سفر
چل دیا لے کے کوئی دست دراز

دیکھ کر محوِ طاعت خالق
آیا نزدیک افتخارِ حجاز

بولا حضرتؑ سے میرا کیسۂ زر
آپ ہی نے لیا ہے بندہ نواز

شرفِ معرفت نہ تھا حاصل
چھان ڈالے تھے کو عراق و حجاز

نا شناسِ مدارجِ سرکار
جب کہ سمجھانے سے نہ آیا باز

لایا بیت الشرف میں ساتھ اُسے
دودمانِ نبیؐ کا مایۂ ناز

دے دیا ایک کیسۂ پُر زر
کہ سخاوت میں تھا یہ گھر ممتاز

اپنی جائے قیام پر آیا
جب وہ کیسہ لیے بہ فخر و ناز

دیکھا رکھا ہے اپنا کیسۂ زر
شرم سے رنگِ رُخ نے کی پرواز

اُلٹے قدموں پھرا لیے کیسہ
تاکہ واپس کرے بہ عجزو نیاز

سُن کے سب حال اُس مسافر سے
یوں ہوا دُرفشاں وہ فخرِ حجاز

اہلِ بیتِ رسولؐ ہیں ہم لوگ
ہم میں سب ہیں رسولؐ کے انداز

دے چکے جو وہ پھر نہیں لیتے
جانتے ہیں اِسے عراق و حجاز

ہم ہیں ابرِکرم زمانے میں
قطرہ از ما بما نہ گردد باز

○

شاعر

عجب یہ دور ہے شاعر کی زندگی کے لیے
بنے ہوئے ہیں اکھاڑے سخن وری کے لیے

رکھا تھا دوش پہ قدرت نے سراہی کے لیے
تلاش ہوتے ہیں موضوع سرکشی کے لیے

غزل کی حد میں بھی جائز یہ جوڑ توڑ نہیں
شعورِ مدح اور آپس میں دشمنی کے لیے

ہر ایک اپنے کو استادِ فن سمجھتا ہے
یہاں جگہ ہے نہ عرفیؔ نہ انوریؔ کے لیے

جہاں ہو پیشِ نظر اپنے مرتبہ کا سوال
وہاں خلوص کہاں مدح گستری کے لیے

یہ ایک فرض ہے شاعر ہو یا مقرر ہو
دلیل نازش و سازش نہیں کسی کے لیے

بنائے مدح پہ جنگ وجدل ہو اپنوں میں
مقام شرم ہے ایسی سخن وری کے لیے

ستم یہ ہے کہ جو فکرِ سخن سے ہیں محروم
وہ رعب اپنا جماتے ہیں برتری کے لیے

کسے خبر تھی کہ آئے گا اپنے ہی ہاتھوں
یہ وقت ملتِ مظلوم جعفری کے لیے

خلوصِ دل بھی ضروری ہے فکرِ مدح کے ساتھ
جلاؤ شمع اندھیرے میں روشنی کے لیے

نماز و روزہ بھی واجب ہیں ان کے ساتھ مگر
چنا گیا ہے ہمیں مدحتِ علیؑ کے لیے

کیا وہ مطلعِ نو فکر نے سپردِ قلم
جو اک ثبوت ہے ایمان و آگہی کے لیے

کُھلی ہے راہِ مودت کی ہر کسی کے لیے
اگر ہے دل شہِ مرداں کی پیروی کے لیے

مجھے علیؑ کی محبت نے سر شناس کیا
چراغ عرش سے لایا ہوں روشنی کے لیے

وہ زمزمے کی ہو محفل کہ ہمہمے کی فضا
ملا ہے نطق زباں کو علیؑ علیؑ کے لیے

مقام مدح میں سوداؔ ہوں یا وہ انشاؔ ہوں
ہر ایک وقف رہا مدح گستری کے لیے

فتیحؔ و میرؔ و منیرؔ اور آتش و ناسخؔ
شرف ملا انہیں مدحت کی زندگی کے لیے

ذرا اندھیرا سا دیکھا جو بزمِ مدحت میں
انیسؔ اور دبیرؔ آئے روشنی کے لیے